

اندھ رات کا بیڑ

سیمائے نزل



1

وہیباچہ

محترمہ سیما غزل کا ایک اور طویل ناول پیش خدمت ہے۔ اس سے پہلے ”کال ہیل“، ”کند“ اور ”کوری آنکھیں“ قارئین میں قبولیت عام کی سند پاچکے ہیں۔ موصوفہ نے اپنی کامیابیوں کے سفر کو جہاں سے چھوڑا تھا وہیں سے آگے بڑھایا ہے اور اپنے معیار کو برقرار رکھتے ہوئے ایک اور شاہکار تخلیق کیا ہے۔ محترمہ سیما غزل ان محدودے چند لکھاریوں میں سے ہیں جن کا نام کسی کتاب کی کامیابی کی ضمانت ہوتا ہے۔ یہ ناول جاگیردارانہ نظام کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ قیام پاکستان کے وقت یہی جاگیردار جو پاکستان کے قیام کے سخت مخالف تھے۔ جب ان کی مخالفت کے باوجود پاکستان بن گیا تو اس ٹولے نے بھی نقاب بدل لیا اور پاکستان کے بھی خواہ بن کر پاکستان کا رخ کر لیا۔ انگریزوں کی چچہ گیری اور غداری کے صلے میں جاگیریں انعام میں پانے والے یہ مٹھی بھر جاگیردار پاکستانی سیاست پر چھا گئے اور ہر آنے والی حکومت ان کے ہاتھوں میں کھلونا بن گئی۔

یہ انہی لوگوں کی کہانی ہے جنہوں نے کمین یا کمی کی اصطلاح ایجاد کی اور محنت کشوں کو کمی کمین کا نام دے دیا۔ یہ لوگ اپنے اپنے علاقوں میں بے تاج بادشاہ بنے بیٹھے ہیں اور نسل در نسل حکومت کر رہے ہیں۔ یہ اپنے علاقوں میں سکول نہیں بننے دیتے کہ اگر کمی کمینوں کے بچے لکھ پڑھ گئے تو ہماری خدمت کون کرے گا اور ہماری بادشاہی کس پر ہوگی۔ ان کے اپنے قانون ہیں اور اپنی جیلیں ہیں۔ حق بات کرنے والے کو باغی قرار دے کر دوسروں کے لئے ”عبرت“ کا نشان بنا دیا جاتا ہے۔

یہ کہانی ایسے ہی ایک پُر عزم نوجوان کی ہے جو نسل در نسل منتقل ہوئی غلامی کی زنجیریں توڑنے چلا تھا مگر فرعون وقت کو بھلا یہ کیسے گوارہ ہوتا۔ اُس نے ”آزادی“ کی طرف جانے والا ہر راستہ بند کر دیا اور صرف ایک راستہ کھلا رکھا جو گھوم پھر کر اس کی غلامی کی طرف آتا تھا۔ یہاں سے ایک ایسی کشمکش شروع ہو گئی جس نے اس شاہکار کہانی کو جنم دیا۔

محترمہ سیما غزل نے جو موضوع چنا ہے وہ کوئی نیا نہیں ہے اس پر بے تماشاً لکھا گیا ہے لیکن انہوں نے اس موضوع پر جس انداز سے قلم اٹھایا ہے اس میں ایک نیا پن پایا جاتا ہے۔ دیہاتی ماحول اور کلچر پر جس خوبصورتی سے لکھا ہے اس سے اُن کے مشاہدے کی قوت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ ان کا یہ قلمی جہاد قبول فرمائے ان کے زورِ قلم میں اضافہ فرمائے۔

ہم امید کرتے ہیں کہ محترمہ کا آنے والا ناول ”زرد پتوں کا بھنور“ بھی ان کی لگاتار کامیابیوں کا تسلسل ثابت ہو۔

ادارہ

میں نے جس گاؤں میں آنکھ کھولی تھی، وہ میرے حساب سے کسی جنت سے کم نہیں تھا۔ میرا باپ وہاں کے زمیندار کا کمدار تھا۔ میری ماں بھی اس کی حویلی میں کام کرتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ میں ماں کی انگلی پکڑے جب پہلی بار زمیندار کی حویلی میں گیا تو وہ پہاڑ جیسی حویلی دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ آسمان سے باتیں کرتی ہوئی لال پکی اینٹوں کی حویلی کے چاروں طرف بڑے بڑے اور گھنے درخت لگے تھے۔ ان درختوں کے جھنڈ میں سے کہیں کہیں سے بڑی بڑی کھڑکیاں نظر آتی تھیں جن پر اندر کی طرف بڑے بڑے پردے پڑے رہتے تھے۔

حویلی اندر سے بھی اتنی ہی خوبصورت تھی۔ گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی دائیں جانب زمیندار کی کاریں کھڑی کرنے کی جگہ تھی اور بائیں جانب بڑا سا باغ بنا ہوا تھا جسے وہ سب لان کہتے تھے۔ اس لان میں اتنے خوبصورت پھول لگتے تھے کہ میں اماں کا ہاتھ چھڑا کر سیدھا اس طرف بھاگ گیا تھا۔ میں پھول توڑنے ہی والا تھا کہ اماں نے لپک کر مجھے پکڑ لیا۔

”حرامزادے..... جان سے مروائے گا کیا؟“

اور میں نے حیرت سے ماں کے چہرے کو دیکھا تھا جس پر پیلا ہٹ چھائی ہوئی تھی اور آنکھیں حلقوں میں پھیلی ہوئی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ بھلا میرے پھول توڑنے سے اماں کیسے جان سے مرجاتی۔

”اماں، کیا تیری جان اس دیو کی طرح ان پھولوں میں ہے؟“ میں نے معصومیت سے

پوچھا تو وہ بے ساختہ ہنس پڑی اور اس نے مجھے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

”نہیں بیٹا۔ اس میں ہماری جانیں بھلا کیسے ہو سکتی ہیں۔ ہماری جانیں تو زمیندار کے ہاتھ میں ہیں اور یہ پھول سارے زمیندار کے ہیں۔ اگر ہم سے کسی پھول کو نقصان پہنچا تو..... وہ ہمیں جان سے مار دے گا۔“

”میں نقصان تو نہیں پہنچا رہا تھا اماں..... میں پھول توڑ کر اپنے پاس رکھ لیتا۔ گھر لے کر جاتا۔“

”نہیں بیٹا! یہ زمین زمیندار کی ہے، یہاں اگنے والی ہر چیز اسی کی ہے، ہم اس سے اجازت لئے بغیر کچھ بھی نہیں لے سکتے۔“ اس نے دکھ سے کہا تھا۔

پھر جوان ہونے تک مجھے یہی سکھایا اور بتایا جاتا رہا کہ سب کچھ زمیندار کا ہے ہمارا کچھ بھی نہیں۔ اماں وہاں رات دن کام کرتی، میں اس کی بغل میں بیٹھا حویلی میں کھیننے والے ان بچوں کو دیکھتا رہتا جن کے کپڑے شاید جنت سے آتے تھے اور جن کے چروں پر روشنی سی ہوتی تھی۔ ان کے پیراٹنے صاف ہوتے تھے کہ میں انہیں گھنٹوں دیکھتا رہتا اور جوتے تو ایسے تھے کہ میں نے پورے گاؤں میں کسی کے پاس بھی نہیں دیکھے تھے۔ میرے پاس تو بہت دنوں تک چپل بھی نہ رہے، پھر زمیندارنی نے ہی ایک روز اماں کو اسٹنچ کے دوپٹی والے چپل دیئے کہ سردی بہت ہے تیرا بچہ ننگے پیر آتا ہے۔

بہت دنوں تک تو میں نے وہ سفید چپل اس ڈر سے نہ پہنے کہ خراب ہو جائیں گے۔ حویلی کے گیٹ تک بغل میں دبائے رکھتا اور گیٹ سے اندر آتے ہی پہن لیتا کہ اگر زمیندارنی نے دیکھ لیا تو ناراض ہوگی۔ حویلی سے باہر نکلتے ہی انہیں جھاڑ کر اپنی بغل میں رکھ لیتا اور گھر جاتے ہی سب سے پہلے اپنے چپلوں کو دھو کر کپڑے سے خشک کر کے رکھ دیتا۔

وہ چپل کیا آئے تھے میری دن رات کی مصروفیات ہی بدل گئی تھیں۔ میں نے گاؤں کے ہر بچے کو گھر لاکر کونے میں رکھے چپل دکھائے تھے۔ جنہیں دیکھ کر بچے خوش بھی ہوتے اور جل بھی جاتے۔

اماں بھی خوش تھی اور ابا بھی بہت خوش ہوا تھا۔ اس نے تو زمیندارنی کو بہت سی دعائیں بھی دی تھیں۔ پھر جس روز زمیندارنی کے گھر راجو پیدا ہوا اس روز اس نے اماں

اور ابا کے علاوہ مجھے بھی نئے کپڑے بنا کر دیئے۔ اس روز تو جیسے گاؤں بھر میں عید منائی گئی۔ سارے گاؤں میں چاول بٹے۔ جن میں گوشت کی بڑی بڑی بوٹیاں پڑی تھیں۔ اماں کو تو کافی بڑی دیگچی بھر کے چاول ملے تھے۔ میں نے دو دن تک کھائے۔ یوں تو اماں روز ہی حویلی سے کھانا لاتی تھی مگر زیادہ تر دال اور سبزی ہوتی تھی جو حویلی کے نوکروں کے لئے پکا کرتی تھی۔ حویلی میں نوکر بھی تو بہت تھے۔

زمیندارنی کی خدمت پر ہی تین عورتیں معمور تھیں، باہر مردانے میں چار نوکر تھے ڈرائیور الگ تھے۔ کبھی کبھی جب اماں چھوٹی زمیندارنی کے پاؤں دبا کر دیتی تھی تو وہ خوش ہو کر اسے گھر والوں کے لئے پکا ہوا سالن یا میرے لئے کوئی کپڑا لے کر دیتا بھی دے دیا کرتی تھی۔ بڑی زمیندارنی سے چھوٹی زمیندارنی زیادہ اچھی تھی۔

میں نے شاید آپ کو بتایا نہیں کہ زمیندار نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی سے تین بیٹیاں تھیں پر کوئی بیٹا نہ تھا۔ شاید اسی لئے زمیندار سلطان دین محمد نے، نہر کے پار والے گاؤں کے تحصیلدار کی بیٹی سے دوسرا بیاہ کر لیا تھا۔ زمیندار کی دوسری بیوی ریشماں عمر میں اس سے بہت چھوٹی تھی اور خوب صورت بھی بہت تھی۔ صرف وہی تھی جو زمیندار کے منہ پر اونچی آواز میں بات کر لیا کرتی تھی ورنہ تو کسی کی مجال نہ تھی جو نگاہ اٹھا کر اونچی آواز میں بات بھی کر لے۔

چھوٹی زمیندارنی ریشماں نے جب راجو کو جنم دیا تو زمیندار نے اپنی مونچھیں بڑھا کر اور اونچی کر لیں۔ اس کی پگڑی کا شملہ پھیل کر موز کی دم جیسا ہو گیا۔ شملے پر بنی سنہری پٹی کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے مور ناچ رہا ہو۔

اس کے جھکے ہوئے شانے چوڑے ہو گئے، اور یہ سب تو ہونا ہی تھا۔ پچاس سال کے زمیندار کے گھر جب بیٹا پیدا ہو جائے تو ایسا ہوتا ہی ہے۔ اس کی آواز میں ایک خاص طرح کی گرج پیدا ہو گئی۔ شاید یہ بیٹے کا غرور ہو۔

اُس روز وہ سب سے اس طرح مل رہا تھا جیسے کسی محاذ سے غازی بن کر لوٹا ہو۔ میں نے نئے کپڑے پہن کر دل سے دعا مانگی تھی کہ اللہ میاں زمیندار کے گھر ہر روز بیٹا پیدا ہو۔ میری دعا سن کر چولھے کے پاس بیٹھی اماں اور قریب ہی بیڑھی پر بیٹھا ابا بہت ہنسے تھے۔ میں جھینپ گیا تھا۔

اُس روز حویلی میں چراغاں کیا گیا تھا۔ اماں اور ابا دونوں کو چھٹی مل گئی تھی اور بہت دنوں کے بعد میں نے اپنے ماں باپ کے ساتھ سارا دن گزرا تھا۔ اُس روز اماں نے ہمیں سویاں پکا کر کھلائی تھیں۔

”ابا! جب میں پیدا ہوا تھا تو تم نے چاول بانٹے تھے اور دیئے جلائے تھے؟“ میں نے سویاں کھاتے ہوئے پوچھا۔

”ہمارے ایسے نصیب کہاں؟“ ماں نے چولہے سے جلتی لکڑیاں نکال کر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے جواب دیا۔

”اری بد بخت کیوں ایسی باتیں کرتی ہے بچے کے ساتھ؟“ ابا نے نرم لہجے میں کہا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”بیٹا ہم دیا کیوں جلاتے بھلا ہمارے گھر تو چاند اترتا تھا۔ تو چاند ہی تو ہے تیری روشنی سے یہ سارا گھر جگمگ کرنے لگا تھا۔ اس روز اللہ میاں نے بارش برسا دی تھی۔ سال بھر سے بارش نہیں ہوئی تھی۔ زمیندار کی فصلیں سوکھتی جا رہی تھیں۔ تیرے پیدا ہونے کی خوشی میں جو بارش برسی تو زمین سے سونا ابل پڑا تھا۔ سارے گاؤں والوں نے اس روز عید منائی تھی۔ بھنگڑا ڈالا تھا، اتنی گندم اور آٹا چاول نکلا تھا کہ زمیندار کے گودام بھر گئے تھے۔ اس طرح ہم نے بہت خوشی منائی تھی۔“ اس نے مجھے پیار کرتے ہوئے بتایا تو میری آنکھوں میں چمک بھر گئی تھی۔ مجھے لگا جیسے میں راجو سے بھی زیادہ اہم ہوں۔ میرے پیدا ہونے پر تو اللہ میاں نے بارش بھی کی تھی۔

”میرا بیٹا کوئی راجو سے کم ہے کیا؟ وہ زمیندار کے گھر کا چراغ ہے تو تو میرے گھر کا چاند ہے۔“ اماں نے میرے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر چوم لیا۔ ایسا کرتے وقت اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ مجھے لگا جیسے وہ رو رہی ہے۔ میں نے اسے غور سے دیکھنا چاہا وہ شاید سمجھ گئی تھی کہ میں اس کی آنکھوں میں کچھ تلاش کر رہا ہوں۔ فوراً بولی۔ ”بالے کے ابا، لکڑیاں بہت گیلی تھیں، دھواں بھر گیا آنکھوں میں۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنی چادر سے آنکھیں رگڑ لیں، اور میں مطمئن ہو گیا۔ ویسے بھی ماں اور باپ کی آنکھوں میں اتنا پانی دیکھنے کا تو میں عادی ہو گیا تھا۔ بچپن میں تو میں اسے پانی ہی سمجھتا تھا مگر یہ بات تو مجھے بہت دیر بعد سمجھ آئی تھی کہ یہ آنسوؤں کے قطرے ہیں جو ان دونوں کی آنکھوں میں ٹھہر کر رہ گئے ہیں۔ نہ خشک ہوتے ہیں اور نہ زمین پر ٹپکنے کی ہمت رکھتے ہیں۔

یہ بات بھی مجھے بڑے ہو کر پتا چلی کہ میرے ماں باپ کے کیسے ارمان تھے کہ وہ اپنے بیٹے کو کسی شہر میں لے جا کر پالیں جہاں وہ بابوؤں کی طرح رہے گا، اسکول جایا کرے گا اور پھر کسی سرکاری دفتر میں اونچی سی میز پر بیٹھ کر کام کرے گا۔ مگر ایسا ہو نہیں سکا۔ وجہ یہ تھی کہ میری پیدائش پر میری ماں مرتے مرتے بچی تھی، اور اسے بچانے کے لئے پیسہ زمیندار نے دیا تھا۔ ابھی تو میرا باپ اپنے باپ کا قرضہ بھی چکا پایا تھا کہ یہ قرضہ بھی اس پر چڑھ گیا۔ زمیندار اپنے کمدا روں کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ برے وقت میں کام آتا تھا مگر حساب کتاب کا بہت پکا تھا۔ گاؤں کے کئی آدمی ایسے تھے جو ہوش سنبھالنے کے بعد قرضہ چکانے کے لئے زمیندار کے مزارعے بن گئے تھے تو جھکی ہوئی کمر اور رعشہ زدہ ہاتھ لئے آج تک اپنے پچھلوں کے اور خود اپنے قرضے اتار رہے تھے۔ برا وقت کس پر نہیں آتا؟ اور ہم جیسے لوگوں پر تو زیادہ تر برا وقت ہی رہتا ہے۔ سو زمیندار کا قرضہ اتارتے اتارتے وہ مٹی میں سو جاتے مگر پیچھے اپنی اولاد چھوڑ جاتے جو ان کا قرضہ اتارنے کو حویلی بلالی جاتی اور پھر یہ سلسلہ چلتا رہتا۔

میرا باپ بھی قرضے میں جکڑا ہوا تھا، مجھے لے کر کہیں نہ گیا۔ گاؤں میں اس وقت کوئی اسکول نہ تھا، البتہ مولوی صاحب کے پاس بہت سے بچے قرآن پڑھنے جاتے تھے ابا نے مجھے بھی وہاں بٹھادیا۔ میں اپنا سبق پڑھ کر سپارہ ہاتھ میں لئے حویلی پہنچ جاتا جہاں اماں بے چینی سے میرا انتظار کر رہی ہوتی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر سکون چھا جاتا۔ پھر ہم دونوں سورج کی ڈھلتی کرنوں کو دیکھتے ہوئے گھر واپس آ جاتے۔ ابا ہمیشہ اندھیرا ہونے پر آتا تھا۔ اسے مہمانوں کے بستر بچھانے پڑتے تھے انہیں کھانا دینا پڑتا تھا وہ جلدی آ بھی نہیں سکتا تھا۔

میں سات برس کا تھا جب صفرا پیدا ہوئی۔ صفرا کی پیدائش پر بھی اماں کی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ ابا نے زمیندار سے گڑغڑا کر رحم کی بھیک مانگی تھی۔

”ارے تو کیوں پیدا کرتا ہے بذات کسی دن ہاتھ دھو بیٹھے گا بیوی سے۔“ زمیندار نے کڑک کر کہا تھا۔

”نہیں مالک ایسا نہ کہیں، میں تباہ ہو جاؤں گا، اسے بچالیں۔“ ابا زمیندار کے قدموں میں گر گیا۔

اسی وقت زمیندار نے ڈرائیور کو بلا کر ہدایات دیں اور میں پہلی بار موٹر میں بیٹھا۔ میں اور ابا دونوں کچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ مجھے تو گاڑی میں بیٹھ کر بہت اچھا لگا تھا۔ نرم نرم اچھلنے والی سیٹیں تھیں اور کھڑکی سے باہر جب میں نے سب چیزوں کو تیزی سے پیچھے بھاگتے دیکھا تو بے ساختہ ہنس پڑا تھا۔

ڈرائیور نے پلٹ کر مجھے گھورا۔ ابا نے میرا ہاتھ دبا کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور میں دبک کر کونے میں بیٹھ گیا تھا۔ ڈرائیور کی لال لال آنکھوں سے مجھے ویسے بھی ڈر لگتا تھا۔ ہم گھر پہنچے تو اماں کے پیچھے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں حیران تھا کہ اماں کو کیا ہو گیا۔ ماسی میراں نے جلدی سے دروازہ کھولا اور ابا کو لئے اندر چلی گئی۔

مجھے ماسی میراں پر بہت غصہ آیا کیوں کہ اس نے مجھے نہ اماں کے کمرے میں جانے دیا اور نہ ابا اور اماں کے ساتھ گاڑی میں بیٹھنے دیا۔ میں چلا تو اس نے مجھے گود میں بھر لیا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ابا اماں کو لے کر چلا گیا۔ میں نے ماسی میراں کے پیٹ میں بہت سی لاتیں ماری، اس کے بال کھینچ لئے مگر اس نے مجھے نہ چھوڑا۔ میں زور زور سے رو رہا تھا۔

”بالے تجھے پتا ہے اماں کہاں گئی ہے؟“

میں نے جواب دینے کی بجائے اور زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ ”اچھا یہ بتا تجھے ننھی سی پیاری سی بہن چاہئے یا بھائی؟“ اس کے اس سوال نے مجھے حیران کر دیا۔ میں اچانک خاموش ہو گیا۔

”پتا ہے اماں اور ابا مناسا بچے لینے گئے ہیں۔ تو بتا تجھے کیا چاہئے؟“ ”بھائی؟“ ”بہن؟“ ”ماسی مجھے ایسی چھوٹی سی بہن چاہئے جیسے..... جیسے دینو کی بہن ہے نا ویسی..... بلکہ اس سے بھی اچھی۔ وہ بہت اتراتا ہے مجھے پیار بھی نہیں کرنے دیتا۔“

”ہاں..... یہ ٹھیک ہے“ تیری بہن اس سے بھی زیادہ پیاری ہوگی تو وہ جل جائے گا؟ ہیں نا؟“

”ہاں.....“ میں نے ہتھیلیوں سے آنسوؤں کو پونچھ لیا۔ اب میں بہت خوش تھا۔ مجھے یہ غم نہ رہا کہ میں گاڑی میں ابا اور اماں کے ساتھ کیوں نہ گیا۔

سارا دن گزر گیا، رات آگئی مگر نہ ابا آیا اور نہ اماں۔ میں ابا اور اماں سے زیادہ اپنی ننھی سی بہن کا انتظار کرتا رہا۔ رات گئے تک ماسی سے پوچھتا رہا اور وہ مجھے ہسلاتی رہی، وہ میرے گھر میں تالا لگا کر مجھے لئے ہوئے اپنے گھر آگئی۔ کھانا کھلا کر مجھے بستر پر لٹا دیا اور پریوں کی کہانی سنانے لگی، وہ پریوں کی کہانی سنا رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ میری بہن بھی تو پری ہوگی، خوب صورت سی، میں اس سے کھیلا کروں گا، اسے پیار کیا کروں گا۔

یہی باتیں سوچتے سوچتے میں سو گیا۔ اگلی صبح میں بہت رویہ، پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ میں اماں اور ابا سے الگ ہوا ہوں۔ ماسی میراں اور اس کی بیٹی سوہنی نے مجھے بہت ہسلایا، حالانکہ سوہنی مجھ سے تین چار مہینے چھوٹی تھی مگر وہ مجھے ایسے چپ کر رہی تھی جیسے دادی اماں ہو۔ میرے آنسو اپنی نرم ہتھیلی سے پونچھتے ہوئے کہتی۔ ”بالے تم روؤ گے تو تمہاری آنکھوں سے سارے موتی گر جائیں گے۔ میں بھی روتی ہوں تو اماں ناراض ہو جاتی ہے کہتی ہے تم سارے موتی گرا دو گی تو ہم اور غریب ہو جائیں گے۔“

اس کی اس بات نے مجھے ڈرا دیا۔ میں صرف غرمت سے ہی ڈرتا تھا، میں نے سبھی کو غرمت سے سسے دیکھا تھا اس لئے میں فوراً خاموش ہو گیا۔

”کیا آنکھوں میں موتی ہوتے ہیں؟“ میں نے جلدی سے آنسو صاف کر کے سوہنی سے پوچھا۔

”ہاں اور کیا..... ماسی..... اماں کہتی ہے..... تم چاہے پوچھ لو؟“ اس نے ایسے کہا جیسے اس کے پاس معلومات کا خزانہ ہو۔ اس لمحے میں نے خود کو اس سے کم تر محسوس کیا۔ وہ مجھے کھینچتی ہوئی ماسی کے پاس لے گئی۔ ”اماں، بالے کو بتاؤ کہ آنکھوں میں موتی ہوتے ہیں نا جو رونے سے گر جاتے ہیں۔“

ماسی نے ہم دونوں کو اپنے بازوؤں میں بھر لیا اور بولی۔ ”ہاں بالے، بچوں کی آنکھوں میں موتیوں کے خزانے ہوتے ہیں جو رونے سے مٹی میں مل جاتے ہیں۔ اب نہیں مرونا بس شام تک تیری اماں ایک پیاری سی گڑیا لے کر آجائے گی۔“

”اس گڑیا کی آنکھوں میں بھی موتی ہوں گے؟“ ”ہاں کیوں نہیں؟ اب جاؤ تم اور سوہنی کھیلو میں روٹی ڈال دوں۔“ میں اور سوہنی گلی میں لگے پپیل کے گھنے پیڑ کے نیچے آ بیٹھے۔

”سوہنی میری آنکھوں میں موتی نظر آتے ہیں کیا؟“

”ہاں آں“ وہ میری آنکھوں میں جھانکے لگی۔ ”ہاں نظر تو آتے

ہیں پر.....“

اسی وقت میں نے دور سے گاڑی آتے دیکھی اور سوہنی کی بات سننے بغیر بھاگ اٹھا۔ میرا خیال صحیح تھا۔ ابا اور اماں آگئے تھے۔ ان کے ساتھ وہ پیاری سی پری بھی تھی جسے میں نے رات بھر خواب میں دیکھا تھا۔ ذرا سی دیر میں بہت سے لوگ ہمارے گھر جمع ہو گئے۔ ماسی اور سوہنی بھی آگئی۔ میں تو اس گڑیا سی بہن کو دیکھ کر پاگل ہو گیا تھا۔ وہ دینو کی بہن سے بہت زیادہ پیاری تھی، نرم نرم سی۔ میں نے سب سے پہلے اس کی آنکھوں میں موتی دیکھنا چاہے مگر اس نے تو آنکھیں ہی نہ کھولیں۔

اماں کی طبیعت بہت خراب تھی۔ ابا کام پر جاتا تھا مگر بہت جلد آ جاتا تھا۔ ماسی میراں گھر کا سارا کام کرتی تھی۔ روٹی اور سبزیاں بھی وہی پکاتی تھی۔ میں اور سوہنی سارا دن اس پیاری سی پری کو دیکھتے رہتے تھے پھر اماں نے بتایا اس پری کا نام صفرا ہے۔ اماں بہت دنوں تک بستر پر پڑی رہی۔ ابا بے حد پریشان رہتا تھا۔ اس بار زمیندار کا قرضہ بہت زیادہ ہو گیا تھا اور اماں کی حالت ٹھیک نہ تھی اس لئے وہ کام پر جانے کے قابل بھی نہ تھی بلکہ اسے ابھی دوا کی ضرورت تھی اور زمیندار نے مزید قرض دینے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ باتیں مجھے اس وقت پتا چلیں جب ابا اماں کو بتا رہا تھا۔

”ابا!..... میں بڑا ہو جاؤں گا تو سب لوٹا دوں گا زمیندار کو۔“ میں نے ایک دم کہا تو ابا چونک اٹھا۔ ”نہ پتہ ڈرانے والی باتیں نہ کر، اللہ نہ کرے کہ میں قرض چھوڑ کر مروں اور تو اس خوفناک رستی میں جکڑا جائے۔ بس کچھ روز تک میرے ساتھ کام کر پھر ہم قرضہ چکا کر شہر چلیں گے، وہاں میں کوئی اچھا سا کام کر لوں گا پھر ہم بھی چین سے زندگی گزاریں گے۔“

مگر چین سے زندگی گزارنے کی خواہش ایک ایسا خواب تھی جس کی تعبیر الٹی ہوتی ہے۔ اماں کا علاج زمیندار ہی نے کروایا اور یوں رستی کے بل سانپ کی سی گرفت اختیار کرتے چلے گئے۔

میں تھوڑا سا بڑا ہوا تو ابا کے ساتھ مردانے میں کام کرنے لگا اور اماں صفرا کی انگلی

پکڑے حویلی کے گیٹ میں گم ہونے لگی۔ اب دوپٹی کے سفید چپل زمیندارنی صفرا کو دیا کرتی تھی اور میں اتنا ہی خوش ہوتا جتنا پہلے ہوتا تھا۔

مردانے میں بہت کام ہوتا تھا۔ ابا تھک جاتا تھا۔ وہاں آنے والے مہمانوں کو ناشتے کرانے سے لے کر رات کو ان کی ٹانگیں دبانے تک ابا دہرا ہو جاتا تھا۔ میں بھی پھر کی بنا رہتا تھا۔ کبھی حویلی سے پانی کا جگ لاؤ، کبھی روٹی اور بھلجی لاؤ کبھی حقہ گرم کر کے لاؤ اور کبھی قریب کی دکان سے سگریٹ، لیکن اس طرح ابا کو فائدہ ہو گیا تھا۔ میں چھوٹا تھا، اتنا کام کرتا تو آئے گئے لوگ میری مٹھی میں روپیہ دو روپیہ رکھ دیا کرتے تھے۔ اکثر کھانے کی چیزیں بھی دے دیا کرتے تھے۔ میں وہ سارے پیسے ابا کو دے دیتا۔ اماں ابا کی کمائی تو زمیندار کاٹ لیا کرتا تھا قرضے میں، رات کی روٹی اماں حویلی سے لے آتی، میرے ہاتھ میں آنے والے یا ابا کو مہمانوں سے ملنے والے پیسے صاف بچ جاتے تھے جو ہمارے دوسری انتہائی ضروریات کے کام آتے۔ اماں ان پیسوں میں سے بھی کچھ نہ کچھ بچا لیا کرتی تھی۔ دن یونہی گزرتے رہے۔ راجو نے بیٹھنا شروع کر دیا پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ سرکنے، چلنے اور پھر بھاگنے لگا۔ زمیندار جب راجو کو مردانے میں لاتا تو مہمانوں کو دکھانے اور خود پیار کرنے کے بعد مجھے دے دیا کرتا تھا۔ میں اسے بھلاتا اور اس کو دی جانے والی چیزیں چپکے چپکے کھا جاتا تھا۔

رفتہ رفتہ راجو کے سب کام میرے ذمے ہو گئے۔ اس کے کپڑے دھونا، جوتے صاف کرنا، اس کے سر میں تیل کی مالش کرنا، نہانے سے پہلے بدن پر تیل ملانا۔ کام زیادہ ہوئے تو زمیندار نے میری پگار بھی مقرر کر دی۔ اس روز میں بہت خوش ہوا، میری پگار مجھے تو نہیں ملنا تھی، مگر اس طرح قرضہ جلدی اتر جاتا اور میں ابا اور اماں کے خوابوں کی تعبیر تلاش کرنے نکل سکتا تھا۔

پھر راجو کے چھوٹے چھوٹے جوتے حویلی کے کباڑ خانے میں ڈھیر ہوتے گئے اور اس کی چار پائی کی لمبائی بڑھ گئی تو مجھ وقت کے گزرنے کا احساس ہونے لگا۔ میرے ہاتھ پاؤں بھی بڑے بڑے ہو گئے تھے۔ میں نے ہمیشہ راجو کے پرانے جوتے اور کپڑے استعمال کئے تھے ہمیشہ انہیں پن کر خوش ہوا تھا مگر اب جب بھی راجو مجھے اپنے پرانے کپڑے یا جوتے دیتا تو میں افسردہ ہو جاتا تھا۔ جی چاہتا کہ میں دکان سے نیا کپڑا لے کر کوئے پر بیٹھ

درزی سے سلوا کر پنوں مگر رستی کے بل ابھی کھلے نہ تھے۔

صفرا چادر اوڑھ کر باہر نکلنے لگی تو اچانک میری سوچ کا انداز بدل گیا۔
”اماں کل سے صفرا تیرے ساتھ حویلی نہیں جائے گی۔“ میں نے رات کو کھانا کھاتے ہوئے کہا تو اماں چونک اٹھی۔

”کیوں بھاء جی؟“ صفرا نے ابا کے بستر پر رضائی ڈالتے ہوئے پوچھا۔

ابا کی آنکھوں میں چمک کے ساتھ ساتھ خوف بھی تھا اور اماں حیران نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

”بس میں نے کہا جو..... تو اب وہاں نہیں جائے گی۔ گھر میں رہا کر۔“ میں نے نگاہیں چراتے ہوئے جواب دیا۔

”پاگل ہوا ہے کیا؟“ اماں نے سر جھٹک کر کہا۔ ”زمیندارنی کو کیا جواب دوں گی اور ابھی تو قرضہ.....“

”بس بس.....“ میں نے اماں کی بات کاٹ دی۔ ”قرض میں چکا دوں گا۔“ یہ کہہ کر میں نے برتن چولھے کے پاس رکھے اور کھلی کر کے ہاتھ پونچھتا ہوا ابا کی چارپائی پر جا بیٹھا۔ ”میں ٹھیک کہتا ہوں نا ابا؟“ میں نے ابا سے پوچھا جو آسمان پر تیرتی بدلی کو حسرت سے دیکھ رہا تھا۔

”ہوں..... پر بیٹا کچھ دن کی تو بات ہے۔ پھر میں صفرا ہی کو نہیں تیری ماں کو بھی منع کر دوں گا بس ہم دونوں کمائیں گے۔“

”مگر ابا.....“

”بیٹا میں ابھی زندہ ہوں۔ تجھ سے زیادہ دیکھتا اور محسوس کرتا ہوں کہ صفرا بڑی ہو گئی ہے پر اسے یہاں اکیلے گھر میں چھوڑنا بھی تو ٹھیک نہیں ہے نا؟“

ابا ٹھیک کہہ رہا تھا۔ یہ بات تو میں نے سوچی ہی نہیں تھی۔ میں خاموش ہو گیا۔ صبح صفرا نے مجھے چائے کا پیالہ دیتے ہوئے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”بھاء جی.....“

میں اماں کے ساتھ.....؟“

”صفرا تجھے اچھا لگتا ہے ان موٹی موٹی عورتوں کی خدمت کرنا جو ہم سب کا خون پی رہی ہیں؟“

”اچھا کے لگتا ہے بھاء جی پر یہاں سارا دن کیا کروں گی۔ سب ہی تو چلے جاتے ہیں۔“ اس نے منہ پھلا کر کہا تو مجھے اس پر پیار آ گیا۔
”اچھا اچھا ٹھیک ہے مگر وہاں زیادہ دل نہ لگانا.....“ میں نے دو مہینے بعد تجھے گھر پر بٹھا دوں گا سمجھیں!“ اور صفرا خاموش ہو گئی۔

☆=====☆=====☆

اس روز راجو اپنے اسکول سے واپس آیا تو اس کے ساتھ کچھ مہمان لڑکے بھی تھے۔ راجو دسویں کا امتحان دے رہا تھا۔ حویلی کے چکھلے حصے میں راجو کا ایک کمرہ تھا جس میں کتابیں اور میز کرسی رکھے تھے اسے وہ لوگ اسٹڈی روم کہتے تھے۔ وہ اپنے مہمانوں کے ساتھ اس اسٹڈی روم میں چلا گیا۔

چلتے چلتے مجھے گلاس اور برف لانے کو کہہ دیا۔ میں حویلی سے گلاس اور برف لے گیا۔ کمرے میں پہنچا تو اس کے ہاتھ میں شراب کی اتنی بڑی بوتل دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ وہ سب کے سب اونچے قمقمے لگا رہے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے سارے گلاس بھرے اور میرے سامنے ہی شراب پینے لگے۔ میں حیرت سے سب کو دیکھ رہا تھا۔ ان لڑکوں کی عمر ایسی نہیں تھی کہ یہ شراب پیئے، وہ لوگ تو امتحان دے رہے تھے انہیں تو پڑھنا چاہئے تھا۔ میں حیران کھڑا یہ سب سوچ رہا تھا کہ اچانک راجو کی نظر مجھ پر پڑی

”اے..... کیا کھڑا مکر مکر دیکھ رہا ہے۔ باہر جا کر بیٹھ، اور دیکھ ہم سب پڑھ رہے ہیں سمجھ ہمارا امتحان ہے نا اس لئے۔“ اس نے مجھے آنکھ مار کر کہا اور سب لڑکے مجھے دیکھ کر ہنس پڑے۔ ”خبردار اس طرف کوئی نہ آئے۔“

میں چپ چاپ باہر آ گیا۔ خوف نے میری زبان گنگ کر دی تھی۔ میں جانتا تھا کہ زمیندار کو اگر پتا چل گیا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے تو قیامت آجائے گی۔ راجو سے بے انتہا پیار کرنے کے باوجود وہ یہ برداشت نہیں کرے گا کہ سترہ سالہ راجو شرابی بن جائے۔ اس کو تو اپنے اکلوتے بیٹے سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں۔ میں نے اکثر زمیندار کو مہمانوں سے کہتے سنا تھا کہ کچھ بھی ہو، میں نے اتنا لاڈ نہیں کیا کہ میرا بیٹا بگڑ جائے وہ ایسے دیسے چکروں میں بالکل نہیں ہے۔

اب اگر اسے معلوم ہو جاتا تو قیامت تو آتا ہی تھی۔ راجو کے ساتھ ساتھ میری بھی کھال اکھیڑ دی جاتی۔ سچ تو یہی ہے کہ مجھے اپنی زیادہ فکر تھی۔ راجو کا کیا ہے مار پڑتی بھی تو دوسرے لمحے پیار امند آتا اور بڑے سے بڑا ڈاکٹر بلا لیا جاتا، پھلوں کا رس اور مرغی کی یخنی دو دن میں اس کی طاقت بحال کر دیتی، مگر میں..... میں تو اگلے روز کی چھٹی بھی نہ کر پاتا۔

وہ دن تو جیسے تیسے گزر گیا۔ راجو کے مہمان رات گئے اپنی کار میں بیٹھ کر چلے گئے، راجو وہیں زمین پر لڑھک کر سو گیا اور میں ساری رات پہرہ دیتا رہا۔ باہر ایک کرسی پر بیٹھے بیٹھے میرا جسم اکڑ گیا۔ نیند سے سر اور آنکھیں بو جھل ہو رہی تھیں مگر میں سو نہیں سکتا تھا۔ رات کو اگر کوئی اس طرف آ جاتا تو غضب ہو جاتا۔ راجو کے حکم کے مطابق میں نے حویلی میں کہہ دیا تھا کہ راجو آج اسٹڈی روم ہی میں سوئے گا اس لئے کوئی اسے دیکھنے بھی نہ آیا۔

صبح جب راجو کی آنکھ کھلی اور وہ باہر آیا تو اس نے مجھے اسی طرح بیٹھا پایا جیسا اس نے رات کو دیکھا تھا۔ اس نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ اندر گویا بھونچال آیا ہوا تھا۔ کتابیں کہیں پڑی تھیں اور گلاس کہیں۔

”بالے، یہاں کی صفائی کر دو“ اور یہ لو.....“ اس نے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر میری مٹھی میں دبا دیا۔ نوٹ دیکھتے ہی ایک لخت میری ساری تھکن، نیند اور کسمندی غائب ہو گئی۔ میں نے راجو کا شکریہ ادا کیا اور جلدی جلدی چیزیں سمیٹنے لگا۔

☆=====☆=====☆

زمیندار کا جتنا اپنے بیٹے پر گھمنڈ بڑھ رہا تھا اتنا ہی راجو تاریک راہوں کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے کئی مرتبہ راجو کو سمجھانے کی کوشش کی مگر مسئلہ یہ تھا کہ میں اس کا رازدار ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا ملازم بھی تھا اور کسی ملازم کی نصیحت سننا ان کے لئے تذلیل کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ میں نے شروع شروع میں کوشش کی پھر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

اب میری آمدنی زیادہ ہو گئی تھی۔ مجھے راجو اچھی خاصی رقم دے دیا کرتا تھا۔ خدا گواہ ہے میں نے اس رقم کو کبھی خود پر یا اپنے گھر والوں پر خرچ نہ کیا۔ وہ ساری رقم

قرضے میں دے دیتا تھا۔ زمیندار حیران تھا کہ اتنی تیزی سے قرضہ کیسے اتار رہا ہوں۔ ظاہر ہے قرضہ اتر جانے کا مطلب تھا ہم سب کی آزادی اور ہماری آزادی زمیندار کی آزادی اور حاکمیت کے لئے خطرہ تھی۔

جس روز میں نے زمیندار کو قرضے کی آخری قسط دے کر اماں اور صفرا کی آزادی مانگی، اس روز اس کی آنکھوں میں شعلے سے لپک گئے مگر اس نے منہ سے کچھ نہ کہا۔ رقم لے کر اسے گنا، منشی کو بلا کر حساب مانگا، اور رقم پوری ہونے پر بولا۔ ”ٹھیک ہے بالے..... اب تیری مرضی ہے کہ تو اماں اور صفرا کو بھیجے یا نہیں مگر تو گھر کا خرچ کیسے چلائے گا؟“

”چوہدری جی، اللہ کرے گاسب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب تو ابا بھی بہت بوڑھا ہو گیا ہے میں سوچتا ہوں شہر جا کر کہیں مزدوری کر لوں گا۔ ابا کے پیچھے پھرے بھی خراب ہو گئے ہیں، اس کا علاج بھی کرالوں گا۔“

پھر تو مجھے اپنے چاروں طرف شعلے ہی اٹھتے محسوس ہوئے۔ مجھے لگا کہ میں زیادہ دیر کھڑا رہا تو وہ مجھے جلا کر بھسم کر دے گا۔

میں الٹے قدموں واپس آ گیا۔ زمیندار کی بڑی بڑی گہری آنکھیں مسلسل مجھے اپنی پشت پر سراسرتی محسوس ہوئیں۔ میرا دل حلق میں دھڑک رہا تھا۔ حویلی سے دور نکل آیا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ پیاس سے میری زبان پر کانٹے اگ آئے تھے۔ میں دائیں طرف ڈھلوان سے اترتا ہوا نہر پر پہنچ گیا۔

نہر پر سوہنی اور صفرا پانی بھر رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر صفرا بھاگتی ہوئی میرے قریب آ گئی۔

”کیا ہوا بھاء جی؟“ اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ وہ جانتی تھی کہ آج میں اس کی اور ماں کی آزادی مانگنے گیا ہوں۔ آج میں نے اماں اور صفرا دونوں کو حویلی جانے سے روک دیا تھا۔

”مجھے پیاس لگی ہے۔“ میں نے سوہنی کی طرف دیکھتے کہا۔

سوہنی مجھے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں جانے کیا بات تھی کہ میرا دل آہستہ سے دھڑک اٹھا، لمحے بھر کو دھڑکن ٹھہری اور پھر چل پڑی۔ لگا جیسے میرے

سینے میں کچھ ہوا ہے۔ کوئی ایسی بات جس سے میں انجان تھا۔
”بالے.....“ صفرا نے میری آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔
میں اور سوہنی دونوں ہی چونک اٹھے۔

”کیا ہو گیا تمہیں بھاء جی؟ ارے یہ سوہنی ہے کیا پہچانا نہیں؟“

”نہیں..... میں جانتا ہوں پر ایک دم اتنی بڑی کیسے ہو گئی؟“ میں نے بات بنائی
ورنہ جی تو یہی چاہا تھا کہ کہہ دوں۔ ”آج ہی تو پہچانا ہے اسے۔“ مگر میں دل کی بات نہ کہہ
سکا۔

”لے بالے پانی تو پی لے۔“ اس نے پانی سے بھرا مٹکا آگے بڑھایا، میں نے دونوں
ہاتھوں کو ملا کر پیالہ بنایا اور منہ سے لگا لیا۔ میں جانے کتنی دیر تک پانی پیتا رہا، میری
آنکھیں سوہنی کے سنہرے پیروں سے لپٹ کر رہ گئی تھیں اور پیاس بجھنے کا نام ہی نہ لیتی
تھی۔

”بھاء جی..... بس کر مر جائے گا پانی پی پی کر.....“ صفرا نے جھٹکے سے مجھے
کھینچ لیا۔

”اتنا پیاسا تھا تو؟“ سوہنی نے مجھے حیرت سے دیکھا۔

مجھے یوں لگا جیسے میں جلتی دھوپ میں کسی پتھریلے علاقے میں اگا کیکر کا درخت
ہوں، جو اتنے بہت سے پانی کے بعد بھی سوکھا کا سوکھا رہ گیا ہو۔

”تم نے بتایا نہیں بھاء جی..... کیا ہوا؟“ صفرا نے مجھے چونکا دیا۔

”میں نے قرضہ اتار دیا صفرا، اب تجھے اور اماں کو حویلی جانے کی ضرورت نہیں۔“

”ہائے جی؟“ وہ اچھل پڑی۔

”ہاں اور تو گھر جا میں تھوڑی دیر میں گھر آتا ہوں۔ ابا آئے تو اسے روک لینا۔“

”ابا تو کب کا آگیا۔ اسے بہت زور کی کھانسی انھی تھی، اور ہاں بھاء جی اسے کھانسی

کے ساتھ خون بھی آیا تھا۔ تو حکیم جی سے دوا لیتا آ۔“

میں ابا کے بارے میں سن کر پریشان ہو گیا تھا۔ میں ویسے بھی بازار جا رہا تھا۔ اب تو
حکیم کے پاس جانا بھی ضروری ہو گیا تھا۔

سوہنی اور صفرا گھر کی طرف چلی گئیں تو میں بازار چلا گیا۔ میں نے گھر کے لئے

گوشت خریدا، اماں گاجر گوشت بہت اچھا پکاتی تھی۔ اب تک گھر میں پکنے کی نوبت تو نہ
آئی تھی مگر حویلی میں پکایا ہوا گاجر گوشت مجھے اور ابا کو بہت پسند تھا۔ میں کھانے کے لئے
چیزیں خرید کر حکیم صاحب کے پاس چلا گیا، انہوں نے دوا دی اور ابا کو لانے کے لئے کہا۔
میرے پاس اب بھی تقریباً ساٹھ روپے بچے ہوئے تھے۔ ساٹھ روپے اُس وقت
بہت ہوتے تھے، میں نے صفرا کے لئے رولڈ گولڈ کے جھٹکے لئے اور سوہنی کے لئے
پازیب۔

یہ خریدنے کے بعد میں بہت دیر تک سوچتا رہا کہ میں نے سوہنی کے لئے پازیب
کیوں خریدا اور میں اسے کس طرح دوں گا۔ اسی سوچ میں گم میں نے اماں کے لئے
چھینٹ کا کپڑا خریدا اور ابا کے لئے دھوتی بھی خرید لی اور گھر کی طرف چل پڑا۔
گھر میں داخل ہوا تو ہر شخص کو میرا انتظار تھا۔ اماں تو دروازے سے لگی کھڑی
تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، میں نے پہلی بار اس کی پلکوں پر
ٹھہر جانے والے قطروں کو یوں برستے دیکھا تھا۔ آج تو وہ آزاد تھی نا..... آج تو وہ کھل
کر آنسو بھی بہا سکتی تھی وہ مجھ سے لپٹ گئی۔

”ارے میرا جوان..... میرے گھر کا رکھوالا آگیا۔“ ابا نے بستر سے اٹھتے ہوئے
کہا۔ ”اری اندر تو آنے دے۔ کیوں بد شگونی کرتی ہے۔“ وہ چیخا۔

اسی وقت میری نظر اس کونے میں پڑی جہاں چوکھا رکھا تھا اور جس میں لکڑیاں
سلگ رہی تھیں، سوہنی پیڑھی ڈالے بیٹھی تھی۔

اماں مجھے لئے ہوئے اندر آگئی۔ آنسو اب بھی بہہ رہے تھے۔

”اماں روؤ نہیں، دیکھ تو تیری آنکھوں کے سارے موتی گر گئے۔“ میں نے کن
انکھوں سے سوہنی کی طرف دیکھتے ہوئے زور سے کہا۔

سوہنی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ سر جھکا کر پیر کے ناخن کریدنے لگی۔
صفرا پاس کھڑی، بڑے پیار سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے ہاتھ میں پکڑا تھیلہ اسے
دے دیا، گھر میں داخل ہونے سے پہلے میں نے پازیب نکال کر اپنی واسکٹ میں رکھ لی
تھی۔ ”اس میں سے سامان نکال لے۔“ میں نے صفرا سے کہا۔

”ہائے کیا ہے..... کیا لایا ہے؟“ صفرا نے لپک کر تھیلہ لیتے ہوئے پوچھا۔

گی۔ ”صغرا نے جواب دیا۔ اور مجھے یوں لگا جیسے میری قسمت کے سارے در آج ہی کھل گئے ہوں۔ یہ سوچ کر ہی میں خوش ہو گیا کہ سوہنی سویرے تک مجھ سے قریب رہے گی۔ ایک ہی چھت کے نیچے۔ ایک دیوار کے پیچھے، صغرا اور اماں ساتھ والے کمرے میں سوتی تھیں اور میں ابا اور اس کمرے میں۔

صغرا چائے کا پیالہ لے آئی۔ ”بھاء جی، اماں تو تھिला کھولنا بھول گئی۔ تم کھولو نا؟“

”ارے اماں تھिला نہیں کھولا تم نے..... لاؤ مجھے دو۔“

اماں نے چونک کر تھिला کھول دیا۔ جھمکے دیکھ کر صغرا جھوم اٹھی۔ زندگی میں پہلی بار اس کے لئے کوئی نئی چیز خریدی گئی تھی۔ اماں کے چہرے پر اچانک روشنی سی چھا گئی۔ چیخٹ کا کپڑا اور دھوتی دیکھ کر اس نے میری بلائیں لے لیں۔ جہاں ذرا دیر پہلے سناٹا تھا وہاں اچانک مسکراہٹیں بول اٹھیں۔ ابا بھی کھل اٹھا تھا۔

میں نے سوہنی کی طرف دیکھا جو حسرت سے صغرا کو جھمکے پہننے دیکھ رہی تھی۔ میں دل ہی دل میں ہنس پڑا۔ اسے تو گمان بھی نہ ہو گا کہ میں اس کے لئے پائل لایا ہوں۔ میں نے سوچا اور نگاہیں اس کے گدرائے ہوئے پیروں پر جمادیں۔ ان پیروں میں پائل کتنی پیاری لگے گی۔

”چائے پی پٹر، ٹھنڈی ہو جائے گی۔“ ابا کی بات سن کر میں چونک اٹھا۔

اماں فوراً ہی چولھے کے پاس جا بیٹھی۔ وہ بڑے چاؤ سے گاجر کا گوشت پکا رہی تھی۔

میں ابا کے پاس ہی دیوار سے کمر نکا کر بیٹھ گیا۔

ہم شہر جانے کا پروگرام بنانے لگے۔ ابا ٹھہرنا تھا کہ پہلے تو چلا جا۔ میں کچھ اور دنوں تک زمیندار کے پاس کمانا رہوں گا پھر جب تو کام پر لگ جائے اور رہنے کا ٹھکانا بنالے تو پھر ہم بھی آجائیں گے، مگر میں تو اس کا علاج کرانا چاہتا تھا۔ ایسی حالت میں اگر وہ زمیندار کی خدمت کرتا رہے گا تو کیا ہو گا۔ میں نے اسے کہا بھی مگر بات اس کی بھی ٹھیک تھی۔ صغرا اور اماں کو اکیلا چھوڑنا، پھر بغیر ٹھکانے کے شہر نکل جانا بھی بے وقوفی تھی۔ میں نے ابا کو بتایا کہ میرے پاس ساٹھ روپے ہیں جو میرے لئے کافی ہیں، ابا مطمئن ہو گیا۔ ہم بہت دیر تک روشن مستقبل کی باتیں کرتے رہے۔

گھنٹے بھر بعد ہی اماں نے کھانا تیار کر لیا۔ ہم سب نے مل کر کھانا کھایا۔ آج ایسا لگ

”ادھر دے.....“ اماں نے تھिला صغرا کے ہاتھ سے جھپٹ لیا اور ابا کی چپائی کے قریب بچھی چٹائی پر بیٹھ گئی۔ میں بھی ابا کی چارپائی پر جا بیٹھا۔ صغرا میرے قریب کھڑی تھی، اس کی بے چین نگاہیں اس تھیلے پر لگی ہوئی تھیں جس کی گرہ اماں کھول رہی تھی۔

”چل جا کے بھائی کے لئے چائے بنا دے، اس میں جو کچھ بھی ہے وہ باہر نکل آئے گا۔ تو کیوں پریشان ہوتی ہے۔ دیکھ لینا بعد میں۔“ ابا نے صغرا سے کہا۔ پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”بیٹا کیا تو قرض پورا کر آیا..... صغرا بتا رہی تھی کہ.....“

”ہاں ابا۔ میں نے زمیندار سے یہ بھی کہہ دیا کہ اب اماں اور صغرا حویلی نہیں جائیں گی اور میں سب کو لے کر شہر چلا جاؤں گا۔ تیرا علاج بھی کرانا ہے۔“

ابا نے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھا۔ ”تو..... تو نے یہ سب کہہ دیا؟“ اس کی خوف میں لپٹی ہوئی آواز آئی۔

”ہاں..... کہہ دیا۔“

”مگر پٹر تو اسے نہیں جانتا..... وہ شیطان ہے شیطان، یہ تو نے اچھا نہیں کیا۔ اچھا پھر..... وہ کیا بولا؟“

”کچھ نہیں، کیا بولتا؟ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔ میں نے کوئی جرم تو نہیں کیا، اور اب ہم اس کے غلام تو نہیں رہے۔ ہاں جب تک ہم گاؤں میں ہیں اس کے پاس کام کروں گا، جب شہر جانے کی تیاریاں ہو جائیں گی تو چھوڑ دوں گا۔“

”کچھ بھی نہیں بولا؟“ اماں نے حیرت سے پوچھا۔ ”اللہ خیر کرے۔“

میں نے اماں کو تسلی دی مگر اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ ابا پر بھی خاموشی چھا گئی تھی

میں گھبرا سا گیا، سناٹا ایسا تھا جیسے طوفان آنے والا ہو۔

شام گہری ہو گئی مگر سوہنی اب تک یہیں پر تھی۔ مجھے حیرت ہوئی اور میں نے بات بدلنے کو اس سے ماسی میراں کی خیریت پوچھی۔

”وہ ساتھ والے گاؤں گئی ہے۔ میری ماسی کی طبیعت خراب ہے نا..... سویرے آجائے گی۔“ سوہنی نے دھیسے لہجے جواب دیا۔

”تو ایسی رہے گی کیا؟“ مجھے حیرت ہوئی۔

”نہیں بھاء جی، ماسی سوہنی کو ہمارے پاس چھوڑ گئی ہے۔ یہ میرے ساتھ رہے

رہا تھا جیسے میں بادل ہوں، ہلکا پھلکا، کھلے آسمان میں تیرتا ہوا۔ کھانا کھا کر اماں برتن دھونے چلی گئی، صغرا بستر لگانے لگی۔ میں آنگن میں کھڑا چاند دیکھ رہا تھا کہ سوہنی آگئی۔ وہ شاید گھر جا رہی تھی۔ دروازے پر پہنچی تو میں نے آواز دے لی۔

”کہاں جا رہی ہے؟“

”یہ تالا ڈال دوں درمیں۔“ اس نے منھی میں پکڑے تالے کو دیکھا۔

”بالے، اس کے ساتھ چلا جا۔ ایک رضائی بھی لے آنا، سویرے سویرے ٹھنڈ ہو جاتی ہے اور یہ کہتی ہے چادر اوڑھ کر سو جاؤں گی۔ جھلی کہیں کی۔“ اماں نے وہیں سے آواز دے کر کہا۔

میں نے موقع غنیمت جانا اور اس کے ہاتھ سے تالا لے کر باہر نکل آیا۔

”پھر تو چلا جا۔“ سوہنی نے جھجک کر کہا۔

”ہوں تاکہ لوگ مجھے چور سمجھیں..... اور مجھے کیا پتا کہ رضائی کہاں رکھی ہے۔ میں اندر نہیں جاؤں گا۔ ہاں..... ساتھ چل۔“ وہ مجھے دیکھتی ہوئی باہر آگئی۔

اس کا گھر چند قدم ہی دور تھا۔ وہ خاموشی سے تیز قدموں سے چلتی ہوئی دروازے تک پہنچ گئی اور کنڈی کھول کر چھپاک سے اندر گھس گئی۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کس طرح بات کروں۔ میں نے جیب میں پڑی پائل کو چھوا اور خود کو ہمت دلائی۔

اتنی دیر میں سوہنی رضائی لے آئی۔ میں کھلے دروازے میں کھڑا تھا۔

”ہٹ نا..... رستہ دے۔“

”سوہنی..... میں..... تیرے لئے یہ لایا ہوں۔“ میں نے پائل نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔

اس نے حیرت سے میرے ہاتھ میں بھتی ہوئی پائل کو دیکھا جو چاند کی روشنی میں اس کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھی۔

”میرے لئے..... کیوں؟“

”پتا نہیں..... بس تو جلدی سے اسے چھپا دے۔ گھر میں رکھ دے۔“

”مگر اماں..... وہ پوچھے گی تو؟“

اور میں نے گھبرا کر پائل واپس جیب میں رکھ لی۔ ”اچھا..... پھر چل.....“

میں اس سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ ”بالے..... یہ پائل تو صغرا کو دے دے نا!“

”نہیں..... میں تیرے لئے لایا ہوں۔ اسے کیوں دے دوں۔“

”نہیں..... تو صغرا کو دے دے پھر وہ مجھے دے دے گی۔“ اس نے جھجک کر کہا۔

میں یہ ترکیب سن کر اچھل پڑا۔ ”ہاں یہ ٹھیک ہے۔“ پھر میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”تو اسے پنپنے کی نا؟“

اس نے شرما کر سر جھکا لیا۔ میری ہمت بڑھی۔

”اور..... اور جب پنپنے کی تو مجھے یاد بھی کرے گی؟“

اس نے لمحہ بھر کو مجھے دیکھا اور رفتار تیز کر دی۔

”آہستہ چل سوہنی۔ دیکھ میں شرما رہا ہوں نا پھر تو تجھ سے بات بھی نہیں کر سکتا۔ بس اتنا بتا دے کہ..... تو.....“

”بالے..... تجھے کیا ہو گیا ہے۔ آج دن میں بھی تو..... جب پانی پی رہا تھا تو.....“

”پتا نہیں کیا ہو گیا ہے، بس کچھ ہو گیا ہے۔ تو بتا مجھے یاد کرے گی؟“

وہ خاموش رہی، گھر قریب آگیا۔ دروازے کی چوکھٹ پر کر رک اس نے میری آنکھوں کی طرف دیکھا۔

”میں تو..... اب بھی یاد کرتی ہوں۔ تب تو بہت یاد کروں گی۔“ اس نے سرگوشی میں کہا اور پھر چھپاک سے اندر گھس گئی۔

میراجی چاہا کہ میں خوشی سے ناپنے لگوں۔ آج کا دن میرے لئے خوشیوں کا طوفان ساتھ لایا تھا۔ اتنی خوشیاں کہ مجھ سے سنبھالی بھی نہیں جا رہی تھیں۔ اگر اماں نے آواز نہ دے لی ہوتی تو شاید میں وہیں کھڑا آسمان پر اڑتی بدلیوں کو دیکھتا رہتا۔

اس رات میں دیر تک جاگتا رہا۔ دیوار کے اس پار سے مجھے سوہنی اور صغرا کے ہنسنے کی آواز سونے ہی نہیں دے رہی تھی۔ اماں اور ابا سو چکے تھے۔ میں دبے پاؤں آنگن میں نکل آیا۔ میں نے صغرا کے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر صغرا کو اشارہ کیا۔

”چھی..... شیت.....“

”کیا ہے؟“ صفرا نے آنکھیں مٹکا کر آہستہ سے کہا۔

میں نے اسے باہر آنے کا اشارہ کیا۔

وہ خزا کرتی ہوئی باہر آ گئی۔

”تم لوگ سوئی کیوں نہیں؟“ میں نے مصنوعی غصے سے پوچھا۔

”تم کیوں نہیں سوتے؟“ اس نے کمر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

میں گڑ بڑا گیا۔ ”اچھا سن..... دیکھ ایک وعدہ کر.....“

”کیسا وعدہ؟“

”یہ کہ میری بات کسی کو نہیں بتائے گی۔“

”کون سی بات..... کیا تمہاری بھی کوئی بات ہے؟“

”تمہاری بھی کیا مطلب؟“

”ابھی ابھی سوہنی بھی یہی کہہ رہی تھی۔ اس نے بات پوری نہیں کی تھی کہ تم آ

گئے۔ آخر چکر کیا ہے؟“ اس نے میری آنکھوں کے آگے ہاتھ نچاتے ہوئے پوچھا۔ اس

کی آنکھوں میں اچانک شرارت ناچنے لگی۔

”اچھا اچھا اب زیادہ جاسوسی نہ کر..... دیکھ صفرا، میں نے آج سوہنی کو تیرے

ساتھ دیکھا تھا نا، پھر میں بازار چلا گیا تھا۔ تیرے لئے جھمکے خریدے تو..... مجھے اس بے

چاری پر بھی ترس آ گیا۔ میں نے اس کے لئے بھی یہ پائل خرید لی۔ اب اسے سب کے

سامنے دیتے ہوئے شرم آ رہی ہے۔ تو اسے دے دے۔“ میں نے جیب سے پائل نکال

کر صفرا کی طرف بڑھا دی۔

”ہائے میں مر گئی۔ اس کے لئے اتنی پیاری پائل اور میرے لئے بڑے ہوئے

جھمکے اور تم کو اس پر ترس آ گیا تھا یا.....؟“

میں اسے مارنے لپکا مگر وہ بھاگ کر کمرے میں چلی گئی۔

پائل صفرا کو دے کر وہ اضطراب کم ہو گیا جو میں کچھ لمحوں پہلے محسوس کر رہا تھا۔

میں دبے پاؤں واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔

اچانک تیز ہوائیں چلنے لگیں۔ کھڑکی کے پٹ بولے تو ابا اچھل کر اٹھ بیٹھا۔ ”کون

ہے..... کون.....؟“

”کوئی نہیں ابا..... ہوا ہے۔“ میں نے اٹھ کر کھڑکی بند کرتے ہوئے جواب دیا۔

میری نگاہ باہر آسمان پر پڑی تو میں حیران رہ گیا۔ جہاں کچھ دیر پہلے چاند چمک رہا تھا وہاں

اب گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اور بجلی کوند رہی تھی۔ ”شاید برسات ہو گی۔“ میں بڑبڑایا۔

”برسات..... یہ موسم تو نہیں برسات کا..... اگر برسات ہو گئی تو غضب ہو

جائے گا کھڑی فصلیں تباہ ہو جائیں گی۔“ ابا نے رضائی کو اپنے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔ ہواؤں

میں خنکی بڑھ گئی تھی۔

”ابا تیری کون سی فصل کھڑی ہے جو تو پریشان ہوتا ہے۔“ میں پھر بستر پر آ بیٹھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے برسات شروع ہو گئی۔ ذرا سی دیر میں سب جل تھل ہو گیا۔ اماں

اور صفرا وغیرہ بھی اٹھ گئے۔ اتنے شور میں نیند آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ہم سب ابا کے کمرے میں بیٹھ گئے۔ تیز ہوائیں، ٹین کی چھتوں پر بوندوں کا شور اور

دروازے کھڑکیوں کے بولتے ہوئے پٹ، عجیب سا شور تھا، خوفناک اور سہا دینے والا۔ اسی

وقت گاڑی رکنے کی آواز نے ہم سب کو چونکا دیا۔ میں اور ابا ایک دوسرے کی طرف

دیکھنے لگے۔

اچانک کسی نے پوری طاقت سے دروازہ دھڑ دھڑایا۔ ہم سب ہی اچھل پڑے۔

صفرا اور سوہنی تو اچھل کر اماں سے لپٹ گئیں۔

میں دروازے کی طرف لپکا۔

”ایسے نہ پتر..... کوئی لاٹھی لے لے، کیا پتا کون ہو؟“ ابا چلایا۔

میں نے کونے میں پڑی چارپائی کی پٹی اٹھائی اور بھگتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔

اماں ابا صفرا اور سوہنی کمرے کے دروازے پر کھڑی خوف سے دروازے کو تک رہی

تھیں۔ ”کون ہے؟“

”دروازہ کھولو۔“ ایک کرخت آواز سنائی دی۔

”کون ہے نام بتاؤ۔“ میں نے تیز آواز میں جواب دیا۔

”پولیس!“ دوسری طرف سے گرج دار آواز کے ساتھ ہی کسی نے دروازے پر

ٹھوکر ماری۔

میں نے روتے ہوئے ہوئے گھر والوں پر آخری نگاہ ڈالی اور جیب میں بیٹھ گیا۔
میں گھر والوں کو جس حالت میں چھوڑ کر آیا تھا وہ مجھے بے چین کئے ہوئے تھی۔
میں سوچ رہا تھا کہ خوشیاں کتنی ناپائیدار ہوتی ہیں۔ کچھ دیر پہلے ہم سب کس قدر خوش
تھے مگر اب میں تیز بارش میں سنبان اور کچے رستے پر پولیس کی حراست میں تھانے جا رہا
تھا۔ وہاں میرے ساتھ جو کچھ ہونا تھا میں اس سے خوب واقف تھا۔ میرا خون کھول رہا تھا
مگر میں جانتا تھا کہ میرے کھولتے ہوئے خون سے مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا اس لئے خود
کو سنبھالنا بہت ضروری تھا۔ زمیندار اس علاقے کا بے تاج بادشاہ تھا اس کے سامنے میری
کوئی حیثیت نہ تھی مجھے خود پر قابو رکھنا تھا۔

تھانے پہنچ کر جو ننھی زمیندار جیب سے باہر آیا میں اس کے قدموں میں گر گیا۔
”چوہدری جی..... میں نے تو آپ کی حویلی کے قریب سے کوئی سوکھاتا بھی نہیں
اٹھایا۔“

”چل بے..... زیادہ ڈراما نہ کر، ابھی کھال میں بھس بھری جائے گی تو سب اگل
دے گا۔“ انسپکٹر نے میری کمر بٹلات ماری، اس کے بوٹ کی نوک میری پٹلی میں لگی اور
میری آنکھوں میں رنگین تارے سے تاج گئے۔
زمیندار بالکل خاموش تھا۔ انسپکٹر نے مجھے کونے میں کھڑا کر دیا اور خود سامنے کی
کرسی پر بیٹھ گیا۔

”اب بول..... چوری کا مال کہاں ہے؟“
”تھانے دار جی میں سچ کہتا ہوں میں نے چوری نہیں کی۔ آپ میری اور میرے گھر
کی تلاشی لے لیں۔ میں چور نہیں ہوں۔“
پیچھے کھڑے سپاہی نے میری کمر پر ڈنڈا دے مارا۔ ”اوئے اتنا بول جتنا پوچھا
جائے۔“

میں دہرا ہو گیا۔ ڈنڈا اسی جگہ پڑا تھا جہاں کچھ دیر پہلے انسپکٹر کے بوٹ کی نوک لگی
تھی۔
”میں چلتا ہوں انسپکٹر..... آپ اپنی کارروائی پوری کر لیں۔“ زمیندار نے اپنی
مونچوں کو بل دیتے ہوئے کہا۔

میں نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ سامنے پولیس کی جیب کھڑی تھی۔ دروازہ
کھولتے ہی انسپکٹر نے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ ”گرفتار کر لو اسے!“
میں بھونچکا کھڑا تھا۔ ابا اور اماں چیختے ہوئے بارش میں نکل آئے۔ صغرا آکر مجھ سے
لپٹ گئی۔

”کیا کیا ہے اس نے..... کیوں لے جا رہے ہو اسے؟“ اماں چیخ اٹھی۔
”چوہدری صاحب کے گھر چوری ہو گئی ہے۔“ انسپکٹر نے بڑی بڑی مونچھوں پر ہاتھ
پھیرتے ہوئے صغرا کی طرف دیکھا جو میرے سینے سے لپٹی کھڑی تھی۔
”چوری..... پر یہ چور نہیں ہے۔“ ابا نے لرزتے ہوئے دروازے کے پٹ کو
پکڑ لیا۔

”نہیں ہے تو بھی پتا چل جائے گا۔ اس وقت تو ہم گرفتار کر رہے ہیں، تفتیش ہوگی
تو سب سامنے آ جائے گا۔ چل بے.....!“ انسپکٹر نے مجھے گھورتے ہوئے جواب دیا۔
صغرا چیخ چیخ کر رونے لگی۔ اماں بھی تڑپ اٹھی تھی۔
انسپکٹر نے آگے بڑھ کر مجھے بازو کی طرف کھینچا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ چوہدری سے
ہماری آزادی برداشت نہیں ہو سکی۔ اس نے میرے خلاف چال چلی ہے مگر میں کچھ بھی
نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے صغرا سے خود کو الگ کیا۔ اماں کو تسلی دی، ابا کی طرف دیکھا، اس
کی آنکھوں میں تشویش تھی۔

میں نے پلٹ کر سوہنی کی طرف دیکھا وہ منہ پر ہاتھ رکھے ہلکے ہلکے رو رہی تھی۔
میں دھیرے سے اس کی طرف بڑھا۔ ایسا کرنے کے لئے مجھے انسپکٹر سے اپنا بازو
چھڑانا پڑا جو اس نے کافی پس و پیش کے بعد چھوڑا۔
”نہ رو سوہنی..... ورنہ سب موتی گر جائیں گے۔ یہ سب موتی میرے ہیں۔“
میں نے دھیرے سے کہا۔ وہ اور زور سے رونے لگی۔

اسی وقت مجھے انسپکٹر نے پکڑ کر کھینچ لیا۔ سب لوگ بارش میں بھگ رہے تھے مگر
کسی کو پروا نہ تھی۔ میں باہر آیا تو جیب میں چوہدری صاحب خود بیٹھے تھے۔ اسے دیکھ کر
میرا خون کھول اٹھا جی چاہا کہ اس کی لمبی لمبی مونچھیں پکڑ کر اتنا کھینچوں کہ وہ اکھڑ کر میرے
ہاتھ میں آجائیں مگر میں اس وقت بے بس تھا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں لاک اپ میں ٹھنڈی زمین پر پڑا تھا۔ میری ناک اور ہونٹوں سے نکلنے والا خون زمین پر جم چکا تھا۔ میرے حلق میں کانٹے چھ رہے تھے اور سارا بدن درد کر رہا تھا۔ میری ایک آنکھ بھی سوج گئی تھی۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر کراہ کر رہ گیا، میرے بدن نے ہلنے سے انکار کر دیا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے سر اٹھا کر دیکھا، سلاخوں کے اس طرف پڑے اسٹول پر ایک سپاہی اونگھ رہا تھا۔ میں نے آواز دینا چاہی مگر پیڑائے ہوئے ہونٹوں نے بھی کھلنے سے انکار کر دیا، شدید درد اٹھا تھا میں سسکاری لے کر رہ گیا۔

جانے کتنی دیر میں بے سدھ پڑا رہا، پیاس نے بے چین کیا ہوا تھا۔ میں نے ہمت کر کے زمین تھپتھپائی۔ آواز سن کر وہ سپاہی چونکا ہو گیا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور بندوق کو میری جانب تان کر آگے آگیا۔

میں نے اشارے سے اس سے پانی مانگا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا پھر دبے قدموں ایک طرف چلا گیا۔ کچھ دیر بعد آیا تو اس کے ہاتھ میں جگ تھا۔ اس نے مجھے سلاخوں کے قریب آنے کا اشارہ کیا، میں دکھتے ہوئے بدن کو گھسیٹا ہوا سلاخوں کے قریب آگیا۔ سپاہی خوفزدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ دوسرے سپاہیوں سے خوفزدہ ہے، ممکن ہے اسے منع کیا گیا ہو مگر وہ رحمدل آدمی تھا۔ میرے قریب آتے ہی اس نے جگ کو سلاخوں سے لگا دیا۔ میں نے منہ کھولا اور پانی کی دھار میرے منہ پر گرنے لگی۔ پانی پی کر میں کافی حد تک سنبھل گیا۔ سپاہی نے جلدی سے جگ واپس رکھ دیا اب وہ لاک اپ میں گرے ہوئے پانی کو خوفزدہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

”اسے صاف کر دے ورنہ تیرے ساتھ میرا بھی حشر ہو جائے گا۔“ اس نے سرگوشی میں کہا۔

میں نے چاروں طرف دیکھا، کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے میں گرا ہوا پانی صاف کرتا۔ پھر اچانک میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی میں سرکتا ہوا اس پانی پر بیٹھ گیا اور بیٹھے بیٹھے زمین کو اپنے کپڑوں سے رگڑنے لگا۔ سپاہی کی آنکھوں میں اطمینان پھیل گیا۔ میرے سارے کپڑے گیلے ہو گئے تھے مگر اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

اب میں کافی حد تک ہوش میں آگیا تھا۔ میں نے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ لاک

”ٹھیک ہے جی آپ مطمئن رہیں۔ بہت جلد آپ کا سامان مل جائے گا۔ ہمارے لائق کوئی اور خدمت ہو تو بتائیں۔“

”بس شکریہ..... میری یہ رقم مل جائے یہی کافی ہے۔“ اس نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا اور میری طرف سرد نگاہوں سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں برف سی جی محسوس ہوئی۔ وہ سارے شعلے سرد پڑ چکے تھے جو میں نے آخری مرتبہ اس کی آنکھوں میں لپکتے دیکھے تھے۔

میں پھر اس کے قدموں سے لپٹ گیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ چلا گیا تو میری شامت آ جائے گی۔ ”چوہدری جی میرا اعتبار کریں جی..... مجھے معاف کر دیں۔ میں نے آپ کی چوری نہیں کی مگر میں پھر بھی آپ کی پائی پائی چکانے کو تیار ہوں۔ مجھے یہاں چھوڑ کر نہ جائیں۔ مجھ پر رحم کریں چوہدری جی، میرے بوڑھے ماں باپ آپ کو دعائیں دیں گے، چوہدری جی.....“

”تم جانتے ہوں میں حساب کتاب کا بہت پکا ہوں۔ پائی پائی تو میں وصول کر ہی لوں گا مگر..... میں اپنے گاؤں میں کسی چور کو برداشت نہیں کر سکتا تم یہاں ٹھیک ہو..... تمہارے لئے یہی جگہ صحیح ہے۔“ اس نے خوفناک مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا اور جھٹکے سے پیر میرے ہاتھ کی گرفت سے چھڑا کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

اس کے جاتے ہی مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ گھونسلوں اور لاتوں کی بارش ہو گئی مجھ پر۔ ”سالے جس تھالی میں کھاتا ہے اسی میں چھید کرتا ہے۔ بدکردار، بے غیرت شرم نہیں آئی اس حویلی سے چوری کرتے سالے جہاں کے نمک سے تیرے اور تیرے گھر والوں کی ہڈیاں بنی ہیں۔ حرامزادے۔“

”مجھے گالی نہ دو انسپکٹر.....“ اس نے پھر مجھ پر گھونسلوں کی بارش کر دی۔ میری ناک سے خون بننے لگا، ہونٹ پھٹ گیا، چکر سے آگے مگر میں مضبوطی سے قدم جمائے کھڑا رہا۔ میرا سارا بدن نفرت سے سلگ اٹھا۔ یہ نفرت شاید میری آنکھوں سے اہل رہی تھی کیوں کہ انسپکٹر میری آنکھوں کو دیکھ کر پاگل ہو گیا، اندھا ہو گیا اور مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میرے بدن کو پتلی میں ڈال کر پیسا جا رہا ہو پھر آہستہ آہستہ مجھ پر غشی طاری ہو گئی اور مجھے ہوش نہ رہا۔

اپ کے سامنے لمبی راہداری تھی جس کے دونوں جانب کمرے بنے ہوئے تھے۔ دور کہیں سے ہنسنے اور باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ہلکی روشنی کا بلب جل رہا تھا جو اندھیرے کو ختم کرنے میں ناکام تھا۔ میں نے دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ سواتین بج رہے تھے تیز ہواؤں کے چلنے کی آواز کے ساتھ ساتھ بارش کی آواز آرہی تھی۔ کسی کسی وقت بجلی چمکتی تو دور تک کا حصہ لمحہ بھر کو نظر آتا پھر گھر اندھیروں میں ڈوب جاتا تھا۔

میں نے چہرے کو مقبض کے دامن سے پونچھا تو میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اسی وقت ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک سپاہی نے جھانک کر دیکھا۔
”کیا ہے بے..... کیوں ڈکار رہا ہے..... سالے ابھی کس بل نکال دوں گا حرامی کہیں کلا.....“ اندر سے ہنسنے کی آواز آئی اور اس نے دروازہ بند کر لیا۔

میں غصے میں بل کھا کر رہ گیا۔ مجھ پر پھر غشی طاری ہو رہی تھی۔ جانے میں کب سو گیا، سچ کہتے ہیں نیند کانٹوں پر بھی آجاتی ہے۔ صبح میری آنکھ شور سے کھلی۔ ابھی ہلکا ہلکا سویرا ہوا تھا۔ میں نے کان آوازوں پر لگا دیئے۔ کوئی رو رہا تھا۔ کسی عورت کی آواز تھی۔ میرے اندر بے چینی سے پھیل گئی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

آوازیں قریب آتی جا رہی تھیں، پھر جیسے آوازیں رک گئیں، مجھ سے کافی دور، مجھے کوئی نظر نہ آیا مگر اب میں آواز پہچان گیا تھا۔ وہ اماں کی آواز تھی، جو بری طرح رو رہی تھی۔

”مجھے میرے بیٹے سے ملنے دو تھانے دار جی..... میں قسم کھاتی ہوں، وہ چور نہیں ہے..... جھوٹ بولتا ہے زمیندار۔ اسے چھوڑ دو، تھانے دار جی۔“
”او بڈھی خاموش بیٹھی رہ، زیادہ بک بک کرے گی تو نکال دوں گا تھانے سے۔“
کسی سپاہی نے گرج کر کہا۔ یہ دھمکی سن کر اماں ایسے چپ ہو گئی جیسے کبھی بولی ہی نہ ہو، جیسے ہمیشہ سے گونگی ہو۔

”تھانے دار جی! بالے کی ماں سچ کہتی ہے..... میرا بالا چور نہیں ہے۔ کسی اور نے چوری کی ہوگی۔ زمیندار کو غلطی لگی ہے۔“ ابا نے لجاجت سے کہا۔
”غلطی لگی ہے..... زمیندار کو؟ ابے اس نے خود اپنی آنکھوں سے بونا چراتے

دیکھا ہے۔ وہ تو لٹکارا بھی تھا مگر تیرا بیٹا بھاگ گیا۔ پورے اٹھارہ ہزار روپے تھے اس بڑے میں۔ اٹھارہ ہزار.....“

”چوہدری مجھے باہر آنے دے..... پھر دیکھ میں کیا کرتا ہوں۔“ میں زیر لب بڑبڑایا۔ میں جانتا تھا کہ چوہدری کا اس ڈرامے سے کیا مطلب ہے وہ ہم میں سے کسی کو آزاد کرنا نہیں چاہتا تھا

اماں کی سسکیاں ہوا کے دوش پر مجھ تک پہنچیں تو بے ساختہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”خداوند..... یہ کیسا انصاف ہے..... یہ کیسا اندھیر ہے میرے مالک، ہم نے کیا جرم کیا ہے جس کی سزا ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔“ میرا دل سینے میں چیخ رہا تھا مگر لب خاموش تھے۔

اسی وقت قدموں کی آواز آئی۔ میں سرگھٹنوں میں دے کر بیٹھ گیا۔ میں جانتا تھا کہ ابا میری حالت دیکھ کر دیوانے ہو جائیں گے میرا سارا چہرہ سو جا ہوا تھا۔
قدموں کی آواز تیز ہو گئی، سسکیاں بھی تیز ہو گئی تھیں۔ ”بالے..... میرے بچے.....“ اماں مجھے دیکھ کر دور ہی سے پکار اٹھی۔ میں بے اختیار ہو کر سلاخوں کے قریب آ گیا۔

”اماں.....“ میرے ہونٹوں سے سسکاری نکلی۔
اماں میرے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی چیخ اٹھی۔ ”ہائے میرا لال..... ہائے میرا بچہ، میں واری ہو جاؤں چندا، ہائے کیسا ظلم کیا ہے اس بے گناہ پر..... ارے ظالمو! خدا کا خوف بھی نہ کیا..... ہائے میں کیا کروں..... مجھے موت کیوں نہ آگئی اسے دیکھنے سے پہلے.....“ وہ سینے پر ہاتھ مار مار کر یکن کر رہی تھی، اور ابا آنسو بھری آنکھوں سے مجھے تنک رہا تھا۔ اس کی کمر ایک رات میں دہری ہو گئی تھی۔ آنکھیں حلقوں میں دب کر رہ گئی تھیں۔ اس نے سلاخوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

”او بڈھی داویلا نہ کر..... جلدی مل اور جا ادھر سے۔“ ایک سپاہی نے اماں کو جھاڑا۔

”چپ کر بالے کی ماں..... ورنہ وہ ملنے بھی نہ دیں گے۔“
ابا نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا اور اماں سسم کر خاموش ہو گئی۔ آنسو اب بھی اس

کے چہرے پر بہہ رہے تھے۔ اس نے دوپٹہ منہ میں ٹھونس کر زبردستی اپنی آواز دہائی تھی۔
”ابا..... تو اماں کو یہاں کیوں لایا ہے؟“

”یہ مانتی ہی نہ تھی..... ساری رات دروازے سے لگی بین کرتی رہی۔ کیا کروں پتر..... صغرا کو چپ کراؤں، سوہنی کے آنسو پونچھوں، اس جھلی کو تسلی دوں یا..... اپنے بوڑھے وجود کو..... سنبھالوں.....“ وہ ایک دم بلک اٹھا۔

”ابا..... تو ذرا بھی فکر نہ کر..... میں چور نہیں ہوں۔ خدا جانتا ہے۔ وہ میری مدد کرے گا ابا..... تو بس اماں اور صغرا..... اور سوہنی کو چپ کرا اور خود بھی تسلی رکھ، میں آ جاؤں گا سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ میں نے کھوکھلی آواز میں کہا۔ میں جانتا تھا کہ چوہدری کے جال سے زندہ نکل جانا کسی مجھڑے سے کم نہیں۔

ابا تو مجھ سے زیادہ جانتا تھا۔ اس نے تو اپنی عمر کے سارے برس اسی حویلی میں گزارے تھے جہاں زمیندار سلطان دین محمد سے پہلے اس کا باپ راج کیا کرتا تھا۔

”تو بہت معصوم ہے پتر..... تو کچھ بھی نہیں جانتا، میں نے ان لوگوں کے سامنے بڑے بڑے پہاڑ جیسے آدمیوں کو پانی ہوتے دیکھا ہے۔ اپنی آنکھوں کے سامنے ان مظلوموں کے گھر جلتے دیکھے ہیں، حویلی کے تہ خانوں میں ان معصوم بچیوں کی چیخیں سنی ہیں پتر، میری آنکھوں نے کئی بار قیامت دیکھی ہے، میرے کانوں نے صورتوں کی بھیانک آواز کئی بار سنی ہے، وہ صورتوں جو زمیندار پھونکا کرتے ہیں اور جنہیں سن کر پہاڑ سے دل روٹی کے گالوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں پتر..... تو نے یہ سب کیوں کیا، تو نے زمیندار سے شہر جانے کی بات ہی کیوں کی، ہم چپکے سے نکل جاتے..... اب..... اب کیا ہو گا بالے..... میں صغرا کو کہاں چھپاؤں گا۔ میرے گھر کی تو دیواریں بھی نیچی ہیں اور در بھی کمزور ہیں۔ بتا میں کیا کروں..... بتا.....؟“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا مگر اس کے رونے کی آواز اس کے سینے میں چکرا رہی تھی یا صرف میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ اسے تو بہت برس کی پریکٹس تھی آواز دبانے کی مگر اماں کی سسکیاں نکلتیں تو دیواریں لرز جاتی تھیں۔

ابا کی خوفناک باتوں نے مجھے دہلا دیا۔ صغرا کا معصوم چہرہ میری نگاہوں میں جم کر رہ گیا۔ ”اگر صغرا کو کچھ ہوا ابا..... یا اس نے میرے گھر کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا“

..... میں اس کی حویلی کی اینٹ سے اینٹ بجادوں گا۔ میں اسے تباہ کردوں گا ابا..... اس کی نسلیں تک پیدا نہیں ہوں گی، دیکھ لینا۔“ میں نے پھر کر کہا۔ غصے سے میرا سارا بدن پھٹنے لگا۔

”نہ پتر..... خدا کے واسطے ایسی باتیں منہ سے نہ نکال۔ ہم تباہ ہو جائیں گے.....“ اماں نے سہم کر کہا اور ابا نے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”میرے بڑھاپے پر رحم کر بالے.....“ وہ سر جھکا کر رو پڑا۔ بوڑھے باپ کو ہاتھ جوڑے دیکھ کر مجھ میں طوفان سے اٹھنے لگے۔ میں نے سلاخوں سے ہاتھ نکال کر ابا کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

”میں کیا کروں ابا.....؟“ میں بے بسی سے رو دیا۔

”تو خود کو قابو میں رکھ..... بس خاموش رہ..... اپنی آنکھوں میں جلتے شعلوں کو سرد کر لے۔ میں زمیندار کے پاس جاؤں گا۔ اس کے پاؤں پکڑ لوں گا۔ اس سے رحم کی بھیک مانگوں گا پتر..... مجھے یقین ہے وہ تجھے معاف کر دے گا۔ ہماری قسمت میں غلامی ہی لکھی ہے بیٹا۔ تو اپنی قسمت کیسے بدل سکتا ہے؟“ وہ مجھے سمجھاتا رہا اور میں سر جھکائے اپنی قسمت پر ماتم کرتا رہا۔

کچھ دیر بعد ہی سپاہی آ گیا۔ وہی سپاہی جس نے رات مجھے پانی پلایا تھا۔ اس کی آنکھوں میں افسوس تھا۔ اس نے نرمی سے ابا کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”چلو بابا.....“

نام ختم ہو گیا ہے۔ انسپکٹر آ گیا تو..... میں نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تیرتی نمی نے مجھے بڑا سہارا دیا۔ یہاں کوئی تو تھا جو ہمارے دکھ کو محسوس کر رہا تھا۔

”جا ابا..... صغرا اکیلی ہو گی۔ اسے کبھی اکیلا نہ چھوڑنا۔“ میری بات سن کر ابا چونک اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف ناپنے لگا۔ ”چل بالے کی ماں..... بالا ٹھیک کتا ہے۔ ہم سے غلطی ہوئی..... جلدی چل۔“ اور اماں روٹی ہوئی، تڑپتی ہوئی واپس چلی گئی۔

ان کے جانے کے بعد ہر طرف سناٹا چھا گیا مگر میرے اندر بلا کا شور تھا۔ کل رات کے شور سے زیادہ، ایک خوفناک طوفان تھا جو میرے اندر جوش مار رہا تھا۔

تھانے میں سناٹا تھا، میرے خیال میں انکپٹر ابھی آیا نہیں تھا اور عملے کے دوسرے افراد سو رہے تھے۔ صرف دو سپاہی جاگ رہے تھے جن میں سے ایک میرا پرہ دے رہا تھا اور دوسرا جو شاید باہر کا پرہ دے رہا تھا اور کبھی اس کا سایہ راہداری میں بھی نظر آ جاتا تھا۔

میں خاموش بیٹھا غلا میں گھور رہا تھا۔ صفرا کی معصوم باتیں اور اس کی معصوم ہنسی مجھے رہ رہ کر خوفزدہ کر رہی تھی۔ جانے کب میری آنکھوں سے آنسو بنے لگے۔

”تم تو بہت اونچے اور کڑیل جوان ہو..... تم کیوں روتے ہو؟“ میرے قریب سے آواز آئی۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا، ہمدرد سپاہی سلاخوں کے پاس کھڑا تھا۔

”اسی پر تو آنسو بہا رہا ہوں۔“ میں نے آستین سے آنکھیں رگڑتے ہوئے جواب دیا۔

”شیت..... آہستہ.....“ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا۔ ”میری مانو تو تقدیر سے لڑنے کی کوشش نہ کرو۔ زمیندار سے معافی مانگ لو ورنہ..... تمہارا باپ ٹھیک کہتا ہے کہ وہ سب کچھ تباہ کر دے گا۔ تم پہلے آدمی نہیں ہو، تم سے پہلے بھی وہ لوگ یہاں لائے گئے ہیں جنہیں نے اس کی غلامی کا طوق گردن سے نکال پھینکا تھا اور اپنی تقدیر خود بنانے چلے تھے۔“

میں نے خاموش نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ”تم سب لوگوں سے اس قدر مختلف کیوں ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”تم بھی تو مختلف ہو!“

میں خاموش ہو گیا

”آج سے بائیس برس پہلے میرے بھائی نے بھی زمیندار کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔“ اس نے دھیمے سے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

میں چونک اٹھا۔ اس کی ہمدردی کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔

وہ چند لمحے خاموش رہ کر بولا۔ ”اس کو بھی ہم سب نے سمجھایا تھا۔ میرے باپ نے زمیندار سے معافی مانگی مگر میرا بھائی..... اسے اپنی جوانی اور جوش کا غور لے ڈوبا۔ ایک روز ایسی ہی طوفانی رات میں وہ مارا گیا۔ گاؤں بھر میں شور مچ گیا کہ حویلی میں ڈاکو

آئے تھے، زمیندار کی آنکھ کھل گئی تو بھاگ گئے اور..... بھاگتے بھاگتے انہوں نے میرے بھائی کو گولی مار دی جو رات گئے ساتھ والے گاؤں سے واپس آ رہا تھا۔ ہم سب جانتے ہیں کہ وہ ڈاکو باہر سے نہیں آئے تھے بلکہ حویلی کے نیچے بنے ان کالے اور تاریک کمروں سے نکلے تھے جو ان کی پناہ گاہ ہیں۔ دن کی روشنی میں نظر آنے والے معزز مہمان رات کی تاریکی میں چروں پر نقاب ڈالے، زمیندار کی حاکمیت کو مضبوط بنانے نکلے ہیں اور اگلے روز لوگوں کی گردنوں میں پڑے غلامی کے طوق اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔“ وہ خاموش ہوا تو مجھے صرف دلوں کے دھڑکنے کی آواز سنائی دی۔

گہرا سناٹا تھا، اتنا گہرا کہ میں سانس لیتے ہوئے بھی ڈرنے لگا کہ شور ہو گا۔

”تم خاموش رہے.....؟“ میں نے سرگوشی کی۔

”ہاں..... میرے گھر دو جوان بہنیں تھیں، ایک بیوہ اور دو معصوم بچے تھے

اور..... بھائی کی بیوہ کو.....“ وہ بولتے بولتے سہم کر چپ ہو گیا۔

”ہاں، کیا ہوا اسے؟“

”اسے..... کسی نے برباد کر کے..... قتل کر دیا۔ اس کی لاش جھاڑیوں میں

پڑی ملی۔ پھر..... میں خاموش ہو گیا۔ سب خاموش ہو گئے۔“

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ چیونٹیاں سڑ رہی تھیں لگیں بدن پر۔ میں نے آسمان کو دیکھنا چاہا جو مجھ سے بہت دور تھا، میری نگاہ راہداری سے ہوتی ہوئی اس دروازے کی طرف بڑھی جس کے اوپر درختوں میں چھپا کہیں کہیں آسمان نظر آ رہا تھا۔ اس پر پھیلنے والا سویرا بھی مجھ سے دور تھا۔ میں نے آنکھیں موند لیں۔

”تمہاری بھی بہن ہے؟“

”نام نہ لو اس کا۔“ میں پوری قوت سے چیخ پڑا۔

وہ سہم کر چپ ہو گیا۔ میں نے پلٹ کر دیوار پر گھونسنے برسانے شروع کر دیئے۔ میرا ہاتھ لولہمان ہو گیا، منہ سے کف جاری ہو گیا، اور آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ میں نے گرتے گرتے شور سنا اور اپنے بازوؤں پر کسی کی گرفت محسوس کی پھر مجھے ہوش نہ رہا۔

مجھے ہوش آیا تو میرے چاروں طرف سپاہی جمع تھے۔ میرے چہرے پر شاید پانی کے

چھیننے مارے گئے تھے، چہرہ گلیا ہو رہا تھا۔ مجھے ہوس میں آتا دیکھ کر وہ سب مجھ سے دور ہو گئے۔

”سریہ ہوش میں آ گیا ہے۔“ کسی کی آواز آئی۔

”ہوں..... پانی ڈالو اس پر۔“ گرج کر کہا گیا۔

کسی نے پھر پانی پھینکا۔ میں نے چہرہ دوسری طرف کر لیا۔

”اٹھو.....“ وہی گرج دار آواز سنائی دی اور ساتھ ہی کسی نے میری پیل پر

ٹھوکر ماری اور میں بلبل کر اٹھ بیٹھا۔ وہ انسپکٹر تھا۔

”ہوش میں آ جاؤ بیٹا ورنہ چڑی ادھیڑوں کا سمجھے۔“ پھر وہ سپاہی سے مخاطب ہوا۔

”اسے میرے کمرے میں لاؤ۔“ یہ کہہ کر وہ ایڑیوں پر گھوم گیا۔

سپاہیوں نے مجھے دروازے کی طرف دھکیلا۔ ہم راہداری عبور کر کے انسپکٹر کے

کمرے میں داخل ہو گئے۔ ”ہاں..... اب بولو پیسے کہاں ہیں؟“ انسپکٹر نے قریب آتے

ہوئے پوچھا۔

”میرے پاس صرف پچاس ساٹھ روپے ہیں بس..... میں نے چوری نہیں کی۔“

”چوری تو تم نے کی ہے۔ صرف یہ بتاؤ کہ رقم کہاں گئی؟“ انسپکٹر نے پاس پڑی

کرسی پر ایک ٹانگ رکھ لی اور جھک کر کہنی اس کے گھٹنے پر نکالی۔

میں نے خاموش نگاہوں سے اسے دیکھا اور جبرے بھیج لے۔ یہاں اپنی صفائی پیش

کرنا بیکار تھا۔

میری خاموش نگاہوں نے اسے بھڑکا دیا۔ اس نے آگے بڑھ کر میرے چہرے پر

گھونسا مارا۔ پھٹا ہوا ہونٹ جس پر اب خون جم چکا تھا ایک بار پھر پھٹ گیا اور خون ٹپک

کر میری قمیض پر گر گیا۔ میں پھر بھی خاموش رہا۔

”بولتا کیوں نہیں، سالے میں نے تو مردوں کی بھی زبان کھلوائی ہے۔ تو کیا چیز

ہے؟“ اتنا کہہ کر وہ پھر مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ وہ مجھے مار مار کر تھک گیا مگر بند ہونٹوں کو نہ کھلوا

سکا۔

کچھ دیر بعد ایک سپاہی اند آیا۔ ”سرزمیندار کا بیٹا راجو آیا ہے۔“

”بلاؤ۔“ انسپکٹر نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

راجو کی آمد کا سن کر مجھے کچھ اطمینان ہوا۔ میں اس کا راز دار تھا شاید اسے مجھ سے

ہمدردی ہو۔ میں نے سوچا۔

راجو اندر داخل ہوا، اس نے ایک سرسری نگاہ مجھ پر ڈالی اور انسپکٹر کے سامنے والی

کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”رقم کا کچھ پتا چلا؟“ راجو نے پوچھا۔

”پتا کیا چلنا ہے جی، میرا خیال ہے کہ اس کے ساتھ کوئی اور بھی شریک تھا، رقم اسی

کے پاس ہوگی۔ دیسے آپ فکر نہ کریں آپ کی رقم آپ کو واپس مل جائے گی۔“

”چھوٹے صاحب میں چور نہیں ہوں آپ تو جانتے ہیں۔“ میں نے بڑی امید سے

راجو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”چپ چاپ کھڑا رہ ورنہ زبان گدی سے کھینچ لوں گا۔“ انسپکٹر نے گرج کر کہا۔

”انسپکٹر صاحب میں بالے سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں، اکیلے میں..... اگر آپ

اجازت دیں تو۔“

”ارے اجازت کیسی چھوٹے صاحب، آپ حکم کریں۔“ انسپکٹر نے اپنی کیپ سر پر

بجالتے ہوئے کہا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

”بالے، تم بابا کو جانتے ہو وہ نرم دل کے آدمی ہیں مگر حساب کتاب میں بڑے پکے

ہیں۔ اگر تم ان کی رقم واپس کر دو تو وہ تمہیں معاف کر دیں گے۔“

”صاحب جی..... آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں نے چوری نہیں کی، خدا کی قسم

میں نے چوری نہیں کی۔“

”تم اپنی ضد پر اڑے رہے تو.....“

”یہ ضد نہیں صاحب جی، سچ ہے..... رقم میرے پاس نہیں ہے۔“

”تو پھر..... تمہاری مرضی۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میں بابا سے بڑی مشکل سے

اجازت لے کر آیا تھا ورنہ وہ تو معاف کرنے کے قائل ہی نہیں ہیں۔“

”میں جانتا ہوں کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔“ میں نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مجھے

ہی کچھ کرنا پڑے گا۔“

وہ چونک اٹھا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”مطلب بتانے کا میں قائل نہیں چھوٹے صاحب۔ مطلب ذرا دیر سے سمجھ میں

آئے گا۔“ میں نے غراتے ہوئے جواب دیا۔

”ہوں..... ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا دماغ ابھی ٹھیک نہیں ہوا“ تمہارے باپ کا دماغ تو درست ہو گیا ہے۔ تمہاری ماں اور بہن اس وقت حویلی میں ہیں اور تمہارا باپ..... میرے باپ کی ٹانگیں دبا رہا ہے۔ خون تھوکنے کے باوجود اس کی خدمت میں لگا ہوا ہے۔“

راجو کی بات نے میرے اندر آگ بھردی اور پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ ہوش تو اُس وقت آیا جب میرے جسم پر شدید ضربیں پڑیں اور مجھے پوری طرح گرفت میں لے لیا گیا۔ میری آنکھوں میں بھرا ہوا اندھیرا چھٹا تو سامنے راجو زخمی حالت میں کرسی پر بیٹھا تھا اس کی ایک آنکھ کے کچھ اوپر کا حصہ پھٹ گیا تھا، اس کی بانجھوں سے خون بہہ رہا تھا اور میں سپاہیوں کے بازوؤں میں جکڑا ہوا تھا۔

”حرامزادے! تو نے اپنی موت کو دعوت دی ہے، اب دیکھ میں کیا کرتا ہوں۔ تیری نسلوں تک کو تباہ کر دوں گا حرامی۔“

راجو نے ہونٹوں پر سے خون صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔ ایک سپاہی فوری طبی امداد کے تحت اس کی آنکھ کا زخم صاف کر کے اس پر منجھڑ لگا رہا تھا۔

اس نے مجھے گالی دی تو میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ ”مجھے آزاد کر، پھر دیکھ کس کی تسلیں تباہ ہوتی ہیں۔“

میرے تھوکنے نے جلتی پر تیل کا کام کیا وہ بے قابو ہو کر مجھ پر جھپٹا، میرے دونوں ہاتھ سپاہیوں نے پکڑے ہوئے تھے، اس نے میرے پیٹ پر گھونٹے مارنے شروع کر دیے۔ میرے بال پکڑ کر میرا سر دیوار سے ٹکرا دیا اور میں بے ہوش ہو گیا۔

ہوش آیا تو میں لاک آپ کے ٹھنڈے فرش پر پڑا تھا۔ رات ہو چکی تھی۔ سناٹا طاری تھا، دور سے کبھی کبھی کتوں کے بھونکنے کی آواز سنائے کو چیرتی ہوئی نکل جاتی تھی۔ کچھ دور اسٹول پر جو سپاہی بیٹھا تھا وہ کل والا سپاہی نہیں تھا۔ مجھے سخت پیاس لگی ہوئی تھی میں نے ہمت کر کے اسے آواز دی۔

میری آواز سن کر وہ قریب آ گیا۔ ”کیا ہے؟“ اس نے کرخت آواز میں پوچھا۔

”پانی..... مجھے پیاس لگی ہے۔“

”نکو اس نہ کراؤئے..... میں تیرے باپ کا نوکر ہوں، چپ چاپ پڑا رہ، کھانا پینا تو اب تیرے خاندان والوں پر بھی حرام ہو چکا ہے سالے تو کیا چیز ہے؟“

سپاہی کی بات نے میرے بدن میں سنسنی پھیلا دی۔ میں بے چین ہو کر اٹھ بیٹھا میں نے چاروں طرف دیکھا، دور دور تک کوئی نہ تھا میں وہیں کوئی نہ دیک کر بیٹھ گیا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا میری بے چینی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ سپاہی کی بات سن کر میں نہ صرف پیاس کو بھول گیا بلکہ اپنے بدن میں اٹھتی ہوئی میسوں کا بھی مجھے خیال نہ آیا۔ بس ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔

میں گھر والوں کی خیریت معلوم کرنا چاہتا تھا مگر کوئی ایسا نہ تھا جو مجھے ان کی خبر لا کر دیتا۔ ایسی بے بسی کا عالم تھا کہ میں بے اختیار گھٹنوں میں سر دے کر رو دیا۔

اس لمحے دور سے بوٹوں کی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ میں نے سر اٹھایا، خوشی کی ایک لہر سی مجھ میں دوڑ گئی۔ کل والا سپاہی آ رہا تھا۔ شاید پہلے والے سپاہی کی ڈیوٹی کا وقت ختم ہو رہا تھا۔ میں ویسے ہی کونے میں بیٹھا رہا۔ وہ دونوں کچھ دیر باتیں کرتے رہے پھر پہلے والا سپاہی اپنی بندوق کاندھے پر ٹانگ کر باہر کی طرف چلا گیا اور کل والا سپاہی میرے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

”پانی.....“ میں نے سلاخوں کے قریب آ کر کہا۔

وہ دھیرے سے مسکرایا۔ ”اس نے تمہیں پانی نہیں دیا ہو گا!“

میں نے سر ہلایا۔ وہ ایک جانب بڑھ گیا۔ چند لمحوں بعد ہی وہ پانی سے بھرا جگ لے آیا۔ میں نے سیر ہو کر پانی پیا اور آستین سے منہ پونچھتے ہوئے اس کی طرف تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”رسول بخش۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”رسول بخش تم بہت اچھے آدمی ہو۔ میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ میرا ایک کام اور کر دو گے؟“

”کیسا کام؟“

”میرے گھر والوں کی کچھ خبر لا دو۔ مجھے ان کی طرف سے فکر ہو رہی ہے۔“

آج..... آج میں نے راجو کو زخمی کر دیا۔ زمیندار کے بیٹے کو۔“

وہ اچھل پڑا۔ ”تم نے..... تم نے اسے زخمی کر دیا؟“

”ہاں۔“ میں نے اسے ساری زوداد سنا دی۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر

گزر گیا۔

”تم بہت بہادر ہو مگر..... بہت بے وقوف بھی ہو۔ تم نے یہ نہیں سوچا کہ

تمہارا بوڑھا باپ تمہاری بہن کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ اس کے کمزور بازوؤں میں اتنا دم

نہیں ہے کہ وہ راجو اور زمیندار کے پالے ہوئے غنڈوں سے زور آزمائی کر سکے۔ تمہیں

ابھی کچھ صبر کرنا چاہئے تھا۔“

”اب تو جو ہونا تھا ہو گیا۔ مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔ مجھے بہت فکر ہے گھر کی۔“

”اس وقت تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ کل صبح میں معلوم کر لوں گا۔ میرا جانا تو خطرناک

ہے۔ میں اپنے بھانجے کو بھیج کر معلوم کراؤں گا۔ تم اس وقت فکر چھوڑ دو۔ تمہاری فکر

ان کی تقدیر تو نہیں بدل سکتی۔“

میں خاموش ہو گیا۔

”تم نے کچھ کھایا؟“

”نہیں..... کل سے اب تک بھوکا ہوں۔ گھر سے کوئی آتا تو لاتا..... معلوم

نہیں ان کے ساتھ کیا بیٹی!“

”کچھ دیر اور صبر کرو۔ میں تمہارے لئے گھر سے کھانا لاتا ہوں۔“

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے کھانے کا ذکر کیا تو میرے پیٹ میں اینٹھن

شروع ہو گئی، وہ ٹھیک کہتا تھا کہ صبر کرو، ابھی اتنی رات نہیں ہوئی تھی، کوئی بھی کسی

وقت آ سکتا تھا۔

میں خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ کہیں دور کسی کمرے سے باتیں کرنے کی آواز آرہی

تھی۔ اچانک کسی گاڑی کی آواز آئی پھر تیز قدموں کی آواز سنائی دی۔ رسول بخش نے

اچانک کھڑے ہو کر سیلوٹ مارا۔ میں سمجھ گیا کہ انسپکٹر آ رہا ہے۔ وہ بہت خواتخوار انسپکٹر

تھا۔ اس کی آمد کا سن کر ہی میرا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے جس طرح میری پٹائی کی تھی

میرا بدن اب بھی اس کی دہائی دے رہا تھا۔ میں نے لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔

انسپکٹر کے آنے سے پورے تھانے میں پھونچال سا آگیا۔ بہت سے سپاہی اچانک

اپنے کمرے سے نکل آئے۔ تین چار سپاہی انسپکٹر کے ساتھ ہی آئے تھے۔ جن کی بھاگ

دوڑ مجھے بھی نظر آرہی تھی۔ انسپکٹر کا کمرہ میری آنکھوں سے اوجھل تھا مگر رات کے

سانے میں اس کی گرجتی ہوئی آواز دور دور دور تک سنائی دیتی تھی۔ اس وقت بھی وہ سب پر

بری طرح چنگھاڑ رہا تھا۔ ذرا دیر بعد ہی سپاہی اپنی بندوقیں لے کر تیار ہو گئے اور پھر یکے

بعد دیگرے دو تین گاڑیوں کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ انسپکٹر نے چلتے چلتے تھانے

میں موجود سپاہیوں کو الرٹ رہنے کی ہدایت کی اور گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا۔

گاڑی کے انجن کی آواز کافی دیر تک سنائی دیتی رہی۔ تھانے میں رہ جانے والے

سپاہی زور زور سے باتیں کرنے لگے تو مجھے معلوم ہوا کہ گاؤں کے قریب ڈاکوؤں کی

موجودگی کی اطلاع ملی ہے۔ ہمارے گاؤں کی بائیں طرف گئے کے کھیت تھے جو دور تک

چلے گئے تھے۔ جہاں گئے کے کھیت ختم ہوتے تھے وہاں سے گھنا جنگل شروع ہو جاتا تھا جو

تقریباً گیارہ بارہ میل تک پھیلا ہوا تھا اور پہاڑیوں کے دامن میں جا کر ختم ہوتا تھا۔ آگے

پہاڑی سلسلہ تھا۔

اسی جنگل میں ڈاکوؤں نے پناہ لی تھی اور انسپکٹر ان ڈاکوؤں کی سرکوبی کو گیا تھا۔ اس

کے خبرنے اطلاع دی تھی کہ ڈاکو آج رات اس گاؤں کے گرد گھیرا ڈال کر حملہ کریں

گے۔

کافی دیر تک وہ سپاہی راہداری میں کھڑے باتیں کرتے رہے۔ رسول بخش بھی ان

کے پاس کھڑا تھا۔ مجھے سخت بھوک لگنے لگی تھی۔ میں دل میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ یہ

سب اپنے کمرے میں چلے جائیں۔

اسی وقت میں نے قدموں کی آواز سنی۔ سپاہیوں کی نگاہیں دائیں جانب اٹھ گئیں

جہاں بیرونی دروازہ تھا۔ ”کیا ہے..... کون ہو تم؟“ ایک سپاہی نے اپنی بندوق تاننے

ہوئے گرج کر پوچھا۔

جواب میں جو آواز میں نے سنی، اس نے میرے دل کی دھڑکن تیز کر دی۔ وہ

نسوانی آواز تھی مگر الفاظ میری سمجھ میں نہ آئے۔

”یہ وقت ہے آنے کا؟“ اسی سپاہی نے کڑک کر کہا۔

”یہ روٹی لائے ہیں اس کے لئے، وہ کل سے بھوکا ہے۔“ آواز قریب آچکی تھی۔
میں پہچان گیا۔ وہ ماسی میراں تھی۔

”تلاشی لو ان کی۔“ اسی سپاہی نے دوسرے سے کہا۔

کچھ دیر بعد رسول بخش انہیں لئے ہوئے لاک آپ کے قریب آ رہا تھا۔ ماسی میراں کے ساتھ سوہنی بھی تھی۔ وہ دونوں چادر میں لپٹی میرے قریب آ گئیں۔

”ماسی..... اتنی رات کو تم لوگ کیوں آئے ہو۔ کس کے ساتھ آئے ہو؟“

”فیما نیل گاڑی لے کر اسی طرف آ رہا تھا۔ اسے گندم کی بوریاں گودام سے اٹھانا تھیں۔ مجھے پتا چلا تو میں بھی آ گئی۔“ ماسی میراں نے رسول بخش کو دیکھتے ہوئے جواب دیا اور رومال میں بندھی روٹی میری طرف بڑھا دی۔

”اسی کے ہاتھ بھیج دیتی۔ تجھے سوہنی کو لے کر یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔“

رسول بخش واپس جا کر ان سپاہیوں کے قریب کھڑا ہو گیا تو میں نے سوہنی کی طرف دیکھا۔ اس کا رنگ پیلا ہو رہا تھا اور آنکھوں میں آنسو تھے۔

”سوہنی کو کیوں لائی ہے؟“

”اسے اکیلا کیسے چھوڑتی؟“

”اماں، ابا اور صفرا.....“

”وہ لوگ نہیں ہیں۔“ اس نے سرگوشی کی۔ ”یہی خبر دینے تو آئی ہوں۔ کل رات زمیندار کے آدمی آکر تیرے بابا کو حویلی لے گئے تھے۔ وہ رات بھر واپس نہ آیا۔ صفرا اور تیری ماں بہت پریشان تھے۔ آج صبح تک بھی وہ نہ آیا تو تیری ماں پریشان ہو گئی۔ وہ حویلی جانے والی تھی کہ راجو جیب میں کچھ آدمیوں کو لے کر آیا اور صفرا اور تیری ماں کو ساتھ لے گیا۔ کہتا تو وہ یہ تھا کہ بابا کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ زمیندار نے کہا ہے اکیلا وہاں رہنا ٹھیک نہیں، پر اس کی آنکھوں میں خون اترتا ہوا تھا۔ بالے مجھے تو بہت خوف آ رہا تھا۔ میں نے صفرا کو روکنا چاہا تو وہ بولا۔ ”چوری کے کیس کی تفتیش بھی کرنا ہے۔ تھانے میں جانے سے اچھا ہے کہ تم لوگ حویلی چلو۔ وہیں تھانے دار آئے گا تو سب پوچھ لے گا۔“

ماسی میراں بول رہی تھی اور میری کنپٹیاں سلگتی جا رہی تھیں۔

”پھر.....“ ماسی کے خاموش ہونے پر میں نے پوچھا۔ میرے لہجے میں سخت

اضطراب تھا۔

”وہ کہتا تھا پولیس گھر کی تلاشی بھی لے گی۔ وہ لوگ سہم کر چلی گئیں۔ نہ جاتیں تو زبردستی لے جاتا۔ چلتے چلتے اس نے مجھ سے کہا تھا کہ شام کو واپس آ جائیں گی مگر..... وہ لوگ اب تک واپس نہیں آئے۔“
میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

”صبر بالے۔ یہاں کوئی ہنگامہ نہ کرنا۔“ اس نے فوراً کہا اور میں نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا۔ وہ ٹھیک کہتی تھی۔ خاص طور پر ان دونوں کی موجودگی میں کوئی ہنگامہ کرنا انہیں بھی مصیبت میں ڈال سکتا تھا۔ خدا جانتا ہے کہ اس وقت میں نے کس قدر مشکل سے خود کو قابو میں رکھا تھا۔

”اب تو جائے گی کیسے؟“

”باہر فیما کھڑا ہے۔ ڈرپوک کہیں کا اندر بھی نہیں آیا۔“ ماسی نے کہا۔

”ٹھیک ہے تو اب جا..... اللہ بیلی.....“ یہ کہہ کر میں نے سوہنی کی طرف دیکھا جو ابھی تک منہ پر ہاتھ رکھے رو رہی تھی..... ”مجھے معاف کر دینا۔ میں تجھے ایک لمحہ بھی خوشی نہ دے پایا۔ مگر..... میں..... آؤں گا سوہنی۔ انتظار کرنا۔“

میری بات سن کر ماسی میراں نے حیرت سے پہلے مجھے اور سوہنی کی آنسو بھری آنکھوں کو دیکھا۔ پھر جیسے وہ سب کچھ سمجھ گئی اس نے دھیرے سے سوہنی کو گلے سے لگا لیا اور بازوؤں میں لئے ہوئے واپس چلی گئی۔

انہیں واپس جاتا دیکھ کر رسول بخش میرے قریب آ گیا۔

”روٹی آگئی گھر سے..... خیریت ہے سب؟“

”نہیں..... رسول بخش، تم ٹھیک کہتے تھے۔“ پھر میں نے اسے ساری بات بتا دی۔ وہ بھٹی بھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے ساتھ ساتھ میرے لئے گہرا تاسف تھا۔

”رسول بخش کیا تم بھائی کا بدلہ نہیں لینا چاہتے؟“ اچانک میں نے سوال کیا۔

وہ چونک اٹھا۔ پھر اس کے چہرے پر یکایک مایوسی چھا گئی۔ ”میں اکیلا ہوں بالے..... اور..... ساری دنیا زمیندار کے ساتھ ہے، قانون کے محافظ بھی۔“

”میں تمہارے ساتھ ہوں رسول بخش۔“ میں نے جوش سے کہا۔ میرے ذہن میں جو بات آئی تھی وہ رسول بخش کی مدد کے بغیر بیکار تھی۔

”میں سمجھا نہیں..... تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”تم میرا ساتھ دو رسول بخش، میں اور تم دونوں زمیندار سے چوٹ کھائے ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے کہ میرا بوڑھا باپ مر جائے اور میری معصوم بہن ان درندوں کے ہاتھوں تباہ ہو جائے مجھے یہاں سے نکال دو۔“

رسول بخش خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے سلاخوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ خون میری کپٹیوں میں ٹھوکریں سی مار رہا تھا۔

”بولو رسول بخش..... کیا تم چاہتے ہو کہ میری بہن تباہ ہو جائے تمہارے بھائی کی بیوہ کی طرح..... میرا بوڑھا باپ بھی تمہارے بھائی کی طرح مارا جائے اور یہ درندے آزاد رہیں..... دوسروں کی عزتوں اور زندگیوں کو لوٹنے رہیں۔ کل تمہاری بچی جوان ہوگی تو تم ٹولی پر لٹکا دیے جاؤ گے۔ تم یہاں سلاخوں کے پیچھے کسی بے گناہ اور بے بس انسان کی رکھوالی کرتے رہو گے اور لٹیرے تمہارا گھر لوٹ لیں گے۔ کیا تم یہی سب چاہتے ہو رسول بخش..... بولو..... میرا ساتھ دو، میری مدد کرو رسول بخش.....“

میں سرگوشی میں بولتا رہا اور رسول بخش کا رنگ خوف سے پیلا پڑتا گیا۔ آنکھیں پھیل کر جیسے سارے جہاں پر چھا گئیں مگر اس کے لب نہ کھلے۔

”رسول بخش..... آج سے بہتر موقع تمہیں نہیں ملے گا۔ آج یہاں کوئی بھی نہیں سوائے ان دو سپاہیوں کے۔ مجھے آزاد کر دو رسول بخش ورنہ میرے گھر پر قیامت گزر جائے گی۔ خدا کے واسطے..... میرے بھائی..... میرے دوست.....“ میں اس کی خاموشی سے گھبرا کر رو دیا۔ میں جانتا تھا کہ یہ وقت گزر گیا تو میں کچھ بھی نہ کر سکوں گا۔ میری بھوک پیاس ختم ہو گئی تھی۔ مجھے صرف ایک بات یاد تھی کہ صغرا، اماں اور بابا حویلی میں قید ہیں۔ میں ان سلاخوں کو توڑ کر نکل جانا چاہتا تھا۔

اچانک رسول بخش کے چہرے پر خوف کی جگہ عزم پھیل گیا، اس کی آنکھیں سرد ہو گئیں اور جڑوں کی ہڈیاں ابھر آئیں، وہ دھیرے سے میرے قریب آ گیا۔ میں امید و بیم

کی حالت میں اسے دیکھ رہا تھا۔

”بالے۔ یہ پستول میں تجھے دے دوں گا، تو اسے میرے سر پر مار کر زخمی کر دینا اور میری جیب سے چابی نکال کر لاک آپ کھول لینا مگر دیکھ پستول اتنی زور سے مارنا کہ میں بے ہوش ہو جاؤں ورنہ سوچ لے میری خیر نہیں ہے۔“ رسول بخش کی بات سن کر میں نہال ہو گیا۔

”پہلے روٹی کھالے۔ تو کل سے بھوکا ہے۔ کمزوری ہو گئی تو کیسے مقابلہ کرے گا اور یہ رکھ لے۔“ اس نے اپنی جیب سے سو روپے نکال کر میری مٹھی میں دبا دیئے۔

مجھے بھوک تو نہیں تھی مگر رسول بخش ٹھیک کہتا تھا۔ مار کھا کر مجھے ویسے ہی کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے جلدی سے ماسی میراں کا لایا ہوا رومال کھولا اور بیٹھ کر روٹی کھانے لگا۔

میں چند منٹوں میں فارغ ہو گیا۔ دوسرے سپاہی شاید سو چکے تھے۔ دور تک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں کھانا کھا کر تیار ہو گیا۔ رسول بخش نے آہستہ سے لاک آپ کھول دیا اور چابی وہیں نیچے آہستہ سے رکھ دی اور پستول کو میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں لمحہ بھر کو جھپکا۔

”مار بالے..... جلدی کر..... کوئی آ جائے گا۔“ اس نے سرگوشی کی اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ میں الجھ کر رہ گیا۔ میرا ہاتھ نہیں اٹھ رہا تھا مگر یہ ضروری تھا ورنہ رسول بخش مارا جاتا۔ میں نے ہمت کی۔

”شکریہ رسول بخش، میں تجھے کبھی نہیں بھولوں گا۔ مجھے معاف کر دینا۔“ یہ کہہ کر میں نے پوری طاقت سے پستول کا پچھلا حصہ اس کے سر پر دے مارا۔ وہ لہرا کر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ میں نے اسے اسی حالت میں چھوڑا اور دبے قدموں تھانے کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ جوں جوں میں آگے بڑھ رہا تھا، میرے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ کپٹی میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ اگلا کمر ان دو سپاہیوں کا تھا، میرا سارا دھیان اسی کمرے کے دروازے پر لگا ہوا تھا۔ میں سرکتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ان لوگوں کو ابھی سے کچھ پتا چل جائے ابھی تو مجھے بہت سے کام کرنا تھے، اگر ابھی میرے فرار کا راز کھل جاتا تو وہ لوگ مجھے انتقام لینے سے پہلے ہی گھیر لیتے۔

میں بے آواز قدموں سے وہ راہداری عبور کر آیا۔ بیرونی حصے میں آتے ہی میں دیوار کے ساتھ دبک گیا۔ میرا سانس بری طرح پھول رہا تھا۔ میں نے لمحہ بھر کو رک اپنا سانس قابو میں کیا اور چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ چند قدم دور اللہ دینو کا تنور تھا جو اس وقت سرد پڑا تھا۔ میں رینگتا ہوا تنور تک پہنچ گیا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ میں دبے پاؤں تنور کی دوسری جانب پہنچ گیا۔ یہاں سے جانے والی کچی پگڈنڈی سیدھی حویلی کو جاتی تھی۔ میں پگڈنڈی پر چلنے کی بجائے جھاڑیوں اور درختوں کے درمیان سے ہوتا ہوا حویلی کی طرف بڑھا۔

”پہلے گھر دیکھ لے بالے..... شاید وہ لوگ واپس آ گئے ہوں۔“ میرے اندر ایک سرگوشی ابھری۔ میں نے اپنا رخ تبدیل کر لیا اب میں گھر کی طرف جا رہا تھا۔ تیز قدموں سے چلتا ہوا میں گھر کے قریب پہنچا۔ دور ہی سے مجھے احساس ہو گیا کہ وہاں صرف ویرانی ہے اور کچھ نہیں، پھر بھی میں نے دروازے کی جھلکی سے جھانک کر دیکھا، آنگن خالی تھا۔ سامنے والی کوٹھری کا دروازہ چوٹ کھلا تھا۔ ابا کا گلاس اور لالین آنگن میں اوندھے پڑے تھے اور لالین کا تیل کچی زمین پر بڑا سادھہ چھوڑ کر جذب ہو چکا تھا۔ میں ابھی پلٹنے والا ہی تھا کہ میرا ہاتھ دروازے پر پڑا اور وہ کھلتا چلا گیا۔

اس کا مطلب ہے ابا وغیرہ کو زبردستی لے جایا گیا ہے اگر وہ اپنی مرضی سے جاتے تو در بند کر کے جاتے۔ میں نے سوچا اور کھلے دروازے میں داخل ہو گیا۔ چاند کی ہلکی ہلکی روشنی میں آنگن اجڑا اجڑا نظر آ رہا تھا۔ میں نے لالین اٹھا کر دیکھا۔ تیل بالکل ختم ہو چکا تھا۔ میں چوڑھے کے قریب جا بیٹھا۔ میں نے ٹٹول کر ماچس تلاش کی اور کوٹھری میں چلا آیا۔ اماں کے بکسے کھلے پڑے تھے۔ ابا کی دوا کی شیشی ٹوٹی ہوئی پڑی تھی۔ صفرا کی چادر پلنگ سے نیچے لٹک رہی تھی۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ ہر چیز اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی تھی یوں لگتا تھا جیسے تلاشی لی گئی ہو۔

دوسرے کمرے میں کچے پیالے ٹوٹے پڑے تھے ان کے قریب ہی صفرا کی کانچ کی چوڑیاں ٹوٹی پڑی تھیں جو ابانے اسے پچھلی عید پر لا کر دی تھیں اور جنہیں صفرا بہت سنبھال کر اوپر بنے ریک پر کانچ کی برنی میں رکھتی تھی۔ میں نے ماچس کی تیلی جلا کر ان بکھری ہوئی چوڑیوں کو دیکھا اور چونک اٹھا۔ ان ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے قریب ہی میرا لایا ہو

جھکا پڑا تھا۔ میں نے جھک کر جھکا اٹھا لیا۔ میرا خون کھول رہا تھا۔ جی چاہتا تھا اڑ کر حویلی پہنچ جاؤں اور سب کچھ تس تس کر دوں۔ انہوں نے میرا گھر لوٹ لیا تھا، میں ان کا سب کچھ لوٹ لینا چاہتا تھا۔ انہیں نیست و نابود کر دینا چاہتا تھا۔

میں زیادہ دیر وہاں کھڑا نہ رہ سکا۔ میں نے جھکا جیب میں ڈال لیا اور ماچس بھی، پھر میں دبے قدموں دروازہ بھینچ کر باہر آ گیا۔ میری نگاہ سامنے سوہنی کے دروازے پر پڑی جس کی جھریوں سے روشنی کی لکیریں سی باہر آرہی تھیں۔ میں دبے پاؤں اس طرف بڑھ گیا۔

دروازے پر پہنچ کر میں نے آہستہ سے در کھٹکایا۔
”اماں..... اماں..... کوئی ہے.....“ سوہنی کی خوف زدہ آواز سنائی دی تھی۔

ماسی میراں تیزی سے دروازے کے قریب آ گئی۔ ”کون ہے؟“ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔
”بالا.....“

میری آواز سن کر اس نے جھٹ سے دروازہ کھول دیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔ میرے اندر آتے ہی اس نے دروازہ بند کیا اور مجھے کھینچتی ہوئی اندر کوٹھری میں لے گئی۔

”بالے..... تو کیسے آیا؟“
”میں وہاں سے بھاگ کر آیا ہوں ماسی مجھے بتا کیا ہوا..... سب لوگ کہاں گئے۔“
”میں نے تجھے بتایا تھا نا کہ راجو اور اس کے حواری آ کر سب کو حویلی لے گئے۔“
”بالے انہیں بچالے..... خدا کے واسطے انہیں بچالے۔“ ماسی میراں ایک دم رو پڑی۔
”تجھے دیر ہو گئی تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔“

سوہنی بھی اس کے پیچھے کھڑی رو رہی تھی۔
میں بے قرار ہو کر کھڑا ہو گیا۔ ”میں جا رہا ہوں ماسی..... یا تو انہیں بچا کر لے آؤں گا یا..... خود بھی مر جاؤں گا۔“
”تو دعا کر ماسی، دعا کر.....“ یہ کہہ کر میں نے

ایک نظر سوہنی کو دیکھا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

آسمان پر کہیں کہیں بادل تیر رہے تھے۔ بادل کا کوئی آوارہ نکلنا کبھی چاند کو چھپا لیتا تو اندھیرا چھا جاتا۔ میں اندھیروں میں رہنے کا عادی تھا، میرے لئے تو یہاں کے سارے رستے جانے پہچانے تھے۔ میں تیز قدموں سے اس کچے رستے پر چل پڑا جو حویلی کو جاتا تھا۔

پندرہ بیس منٹ کا یہ راستہ صدیوں پر پھیلا ہوا لگ رہا تھا۔ میری پنڈلیوں میں اینٹھن سی ہو رہی تھی مگر میں لمحہ بھر کو بھی نہ رکا۔

”تجھے دیر ہو گئی تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔“ ماسی میراں کا یہ جملہ میرے پورے وجود میں گونج رہا تھا۔ نہ معلوم کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ مجھے دیر ہو گئی ہے۔

دور ہی سے حویلی کی بتیاں نظر آنے لگیں۔ میں نے رفتار آہستہ کر لی۔ میں نے ایک مکان کی دیوار کی آڑ میں کھڑے ہو کر حویلی کا جائزہ لیا۔ بیرونی گیٹ بند تھا۔ مراد نے کا دروازہ البتہ کھلا ہوا تھا۔ میں جانتا تھا کہ شہر سے آنے والے مہمان دیر سے سونے کے عادی ہیں۔

میں دبے پاؤں آگے بڑھا اور مردانے حصے کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا کھڑکی سے قریب ہو گیا۔ کھڑکی کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا اندر سے باتیں کرنے کی آواز آرہی تھی۔ میں نے خود کو ذرا سا اوپر اٹھایا اور اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ اندر چارپائی پر کوئی آدمی لیٹا تھا۔

رفیق اس کی ٹانگیں دبا رہا تھا اور نور نبی حقے کی آگ کرید کر اسے تازہ کر رہا تھا۔ ”رات حویلی کے پچھلے حصے میں سے کسی عورت کے چیخنے کی آواز آرہی تھی۔ کیا ہو گیا تھا؟“ مہمان نے نور نبی سے پوچھا۔ نور نبی اور رفیق بھی زمیندار کے ملازم تھے۔

”کچھ نہیں جی..... ہم نے تو ایسی کوئی آواز نہیں سنی۔“ نور نبی نے حقے کی چلم پر پھونک مارتے ہوئے کہا۔

”نہیں..... نور نبی..... کچھ تھا تو..... میں نے خود سنا تھا۔ بس اندھیرا اتنا تھا کہ اس طرف جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔“ مہمان نے جواب دیا۔

”چھوڑیں جی..... ایسی آوازیں تو آتی ہی رہتی ہیں۔ ہمارے تو کان عادی ہو گئے

ہیں۔“ رفیق نے بھی ہوئی آواز میں کہا۔

”بک بک نہ کراوے۔ تجھے کہاں سے آتی ہیں آوازیں۔ اپنی زبان بند رکھ ورنہ کانوں کے ساتھ ساتھ زبان بھی بند کر دی جائے گی۔“ نور نبی نے ڈانٹ کر کہا۔

”صاحب جی، آپ یہ زمیندار سے پوچھئے گا۔ ہمارے پاس ان باتوں کا جواب نہیں۔“ نور نبی اتنا کہہ کر اٹھ گیا۔ مہمان چپ رہا

میں اگلے قدموں پیچھے سرک گیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ حویلی کے پچھلے حصے میں راجو کا اسٹڈی روم ہے وہیں سے آوازیں آئی ہوں گی۔ وہ لوگ وہاں شرابیں ہی نہیں پیتے تھے، رنڈیاں بھی لے کر آتے تھے۔

میں آہستہ آہستہ درختوں کے جھنڈ میں سے ہوتا ہوا اسٹڈی روم کی طرف بڑھا۔ وہاں ہر طرف اندھیرا تھا۔ کوئی آواز یا کوئی آہٹ نہ تھی۔ میں سخت مضطرب تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اب، اماں اور صغرا کو کہاں تلاش کروں، حویلی تو اتنی بڑی تھی کہ میں نے بھی اندر سے پوری نہیں دیکھی تھی۔ انہیں تلاش کرنا آسان نہ تھا اور میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا۔ پولیس کسی وقت بھی میرے پیچھے آ سکتی تھی۔

میں دبے قدموں اسٹڈی روم کی اس کھڑکی تک پہنچا جس کے قریب باہر کی جانب بیٹھ کر میں پہرہ دیا کرتا تھا۔ وہ اس وقت اندر سے بند تھی۔ میں نے پہلے دروازے کو کھولنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ پھر میں کھڑکی کی جانب آیا۔ اسی وقت مجھے اندر آہٹ محسوس ہوئی۔ یوں جیسے کوئی چیز زمین پر گھسیٹی گئی ہو۔ میں ساکت رہ گیا۔ میں نے اندر کی آواز سننے کی کوشش کی مگر دوبارہ آواز نہ آئی۔ میں نے کھڑکی کی پٹ اندر کی طرف دبائے۔ دونوں پٹوں کے درمیان اتنی جگہ بن گئی کہ میں اپنی انگلیاں ڈال کر چٹخنی گرا سکتا تھا۔

میں نے دونوں انگلیوں کی نمد سے چٹخنی گرا دی۔ چٹخنی گرنے کی آواز کسی ہم سے کم نہ لگی اور میں تیزی سے نیچے بیٹھ گیا۔ پستول اب بھی میرے ہاتھ میں تھا۔ میں کسی بھی صورت حال سے نمٹنے کے لئے چوکنا تھا۔

کافی دیر گزر جانے کے بعد بھی کوئی آواز نہ سنائی دی تو میں آہستہ سے کھڑا ہو گیا۔ میں نے اسی آہستگی کے ساتھ کھڑکی کا پٹ کھول دیا اور کھڑکی کی چوکھٹ پر ہاتھ رکھ کر اندر

کود گیا۔

ایک ہلکی سی چیخ سنائی دی جیسے کسی نے منہ پر ہاتھ رکھ کر چیخ ماری ہو۔ اندر اندھیرا تھا۔ میں میز کی آڑ میں ہو گیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

کمرے میں میرے علاوہ کوئی اور بھی تھا، اس کا احساس مجھے بڑی شدت سے ہو رہا تھا مگر جو کوئی بھی تھا وہ مجھ سے بھی زیادہ خوف زدہ تھا۔ میں نے جیب سے ماچس نکالی مگر اسے جلانے کی ہمت نہ کر سکا، اگر میں ماچس جلاتا تو لمحہ بھر میں میری جگہ میری لاش پڑی ہوتی۔ یہ خیال آتے ہی میں نے ماچس پھر جیب میں رکھ لی اور اسی اندھیرے میں آگے بڑھنے کا فیصلہ کر لیا۔ کچھ دیر اندھیرے میں رہنے سے میری آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو گئیں۔ اب کمرے میں رکھی میز کرسی اور کونے میں پڑے بیڈ کا دھندلا خاکہ واضح نظر آ رہا تھا۔

میرے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ میں جانتا تھا کہ اسٹڈی روم میں ایک دروازہ حویلی کے اندر کھلتا ہے۔ اس دروازے کو میں نے ہمیشہ بند دیکھا تھا۔ اس اندھیرے میں مجھے وہ دروازہ صاف دکھائی دے رہا تھا کیوں کہ اندر روشنی ہو رہی تھی اور دروازے کی جھریوں سے روشنی کی کرنیں ریگتی ہوئی اسٹڈی روم میں داخل ہو رہی تھیں۔ روشنی بے حد دھندلی تھی لگتا تھا جیسے اندر کوئی مٹی کا دیا جل رہا ہو۔

میں سرکتا ہوا آگے بڑھا۔ ابھی میں بیڈ سے کافی فاصلے پر تھا کہ اچانک میں کسی انسانی جسم سے ٹکرایا۔ میں دہشت زدہ ہو گیا اور خود کو بڑی تیزی سے ایک طرف لڑھکا دیا تاکہ میں اس شخص کے حملے سے خود کو محفوظ رکھ سکوں۔ میری قلابازی کی آواز کے علاوہ کوئی آواز یا حرکت نہ ہوئی، میں حیران تھا۔ یہ میزا وہم نہیں تھا بلکہ میں نے اس انسانی جسم کے لمس کو محسوس کیا تھا۔

مجھے حیرت ہوئی کہ اس شخص نے حرکت کیوں نہیں کی، اچانک مجھے خیال آیا کہ ممکن ہے راجو کا کوئی شرابی ساتھی ہو جو زیادہ پی جانے کی وجہ سے بے ہوش پڑا ہو۔

میں ہمت کر کے پھر اسی جگہ آ گیا۔ اب میں نے آہستہ سے ہاتھ بڑھایا، وہ انسانی جسم ہی تھا مگر اتنا سرد جیسے برف کی سل ہو۔ میں نے گھبرا کر ہاتھ کھینچ لیا۔

اسی لمحے بیڈ پر حرکت محسوس ہوئی، اور عجیب سی آواز ہوئی جیسے دبی دبی سی سسکی نکلی ہو، میں بیڈ سے قریب تھا اس لئے آواز سن کر اچھل پڑا۔ آواز کسی عورت کی تھی۔ میں اب بے قابو ہو چکا تھا۔ میں نے پستول کو بیڈ پر پڑے شخص کی طرف تان لیا اور دوسرے ہاتھ سے ماچس نکالی۔

ماچس جلائی تو یوں لگا جیسے کسی نے مجھ پر قیامت توڑ دی ہو۔ بیڈ پر اماں رسیوں سے جکڑی پڑی تھی۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ اس نے جونہی مجھے دیکھا مچل پڑی۔ تیلی سے میرا ہاتھ جل گیا۔ میں نے جلدی سے تیلی پھینکی اور اس کی طرف لپکا۔

”اماں..... اماں.....“

”ہوں..... اونہ.....“ وہ ایک بار پھر مچلی۔ میں نے جلدی سے اس کے منہ سے کپڑا نکالا۔ ”بالے.....“ بالے تو اب آیا ہے بالے، دیکھ تو تیرا باپ تیرا رستہ دیکھتے دیکھتے مر گیا.....“ اس نے فرش کی طرف اشارہ کیا، وہ بری طرح رو رہی تھی۔

میرے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ میں نے پلٹ کر فرش پر دیکھا۔ اندھیرا ہونے کے باوجود مجھے وہاں ایک ڈھیر سا پڑا دکھائی دیا۔ میں اس طرف لپکا۔ ماچس کی تیلی جلائی۔ وہ انسانی جسم جو کچھ دیر پہلے مجھ سے ٹکرایا تھا۔ میرے باپ کا تھا۔ میں بلک کر اس کے سرد جسم سے لپٹ گیا۔

”بالے..... اسے بچالے۔“ اماں نے پیچھے سے مجھے کھینچ لیا۔

میں جھٹکے سے اٹھ گیا۔ ”کون اماں..... صغرا.....؟“

”ہاں..... وہ درندے اسے جنگل میں لے گئے ہیں۔ میری بچی کو بچالے

بالے..... یا..... اسے جان سے مار دے۔ گولی مار دے اسے جا..... چلا جا.....“ وہ پاگلوں کی طرح چیخنے لگی۔

میں بھی پاگل سا ہو گیا۔ اس وقت مجھے یہ احساس نہ رہا کہ ہماری آوازیں دوسروں تک پہنچ جائیں گی۔ میں اماں کو وہیں چھوڑ کر چھلانگیں لگاتا ہوا جنگل کی طرف بھاگ۔ حویلی سے جنگل کا راستہ بہت دور نہ تھا۔ کچھ ہی دیر میں اس راستے پر پہنچ گیا۔ میں ہاتھ میں پستول لئے سرپٹ بھاگا جا رہا تھا۔ مجھے کچھ ہوش نہ تھا صرف صغرا کی معصوم صورت میرے سامنے تھی اور اماں کے یہ الفاظ کہ اسے بچالے۔

اچانک چاروں طرف روشنی چھا گئی۔ چاند بدلیوں میں سے نکل آیا تھا۔ رستہ روشنی ہوا تو میں نے رفتار اور تیز کر دی۔ جنگل شروع ہوتے ہی مجھے راجو کی جیب نظر آ گئی۔ میں وہیں دبک گیا اور کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا مگر دور دور تک سنا تھا۔ میں جھاڑیوں میں دبکا آگے بڑھتا رہا۔

کافی اندر جا کر مجھے چونک جانا پڑا۔ وہ چھوٹا سا کچا مکان تھا جس میں روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے ساری عمر اسی گاؤں میں گزاری تھی مگر کبھی اس طرف نہ آیا تھا اور نہ ہی مجھے گمان تھا کہ یہاں کوئی مکان بھی ہو گا۔ کچھ اور آگے بڑھا تو مجھے آوازیں سنائی دیے لگیں، قہقہے میری سماعت سے نکلے تو مجھ میں بجلی سی بھر گئی۔ میں بڑی سرعت سے مکان کے قریب پہنچ گیا۔

میں نے بجائے دروازے کی طرف جانے کے مکان کی پچھلی طرف کا رخ کیا۔ کھڑکی بند تھی مگر جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ میں نے اندر جھانکا اور پھر خون میری آنکھوں میں اتر آیا۔

نیچے بھیچائی پر صفرا پڑی تھی۔ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ رنگ پیلا پڑ چکا تھا اور آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

اس کے قریب ہی راجو اور اس کے پانچ دوست بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ میں تیزی سے دروازے کی طرف آیا۔ میں ابھی دروازے پر پہنچا ہی تھا کہ مجھے صفرا کی چیخ سنائی دی جو مجھے پکار رہی تھی۔

میرے ہوش اڑ گئے۔ میں نے ایک زوردار ٹھوکر ماری، خستہ حال دروازہ میری ایک ہی ٹھوکر سے گر گیا۔ میں نے راجو وغیرہ کو کچھ سوچنے کی مہلت نہ دی اور فوراً ہی ان کے سروں پر پہنچ گیا۔

وہ سب اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ صفرا مجھے دیکھ کر چیخنے لگی۔ ”بھاء جی..... مجھے بچالو..... بھاء جی۔“

میں نے گولی چلانے کی بجائے راجو کے پیٹ میں گھما کر لات ماری۔

”حرامزادے..... تو سمجھتا ہے کہ تو جو چاہے کر لے گا، تجھے کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے ان سب کی طرف پستول تان لی۔ ”اگر کسی نے ہلنے کی کوشش

کی تو..... بھون کر رکھ دوں گا۔“ میں نے غرا کر کہا اور صفرا کی طرف بڑھا۔ میں نے جلدی سے اس کے ہاتھ کھولے۔ وہ مجھ سے لپٹ گئی اور اسی وقت راجو وغیرہ کو موقع مل گیا، کسی نے ریو اور نکال لیا تھا۔ فائر کی آواز ہوئی اور میں اچھل کر ایک طرف ہو گیا۔ صفرا بھی چیختی ہوئی کھڑکی کی طرف بھاگی۔

اب میں پوزیشن لے چکا تھا۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر فائر کر دیا۔ جس لڑکے کے ہاتھوں میں ریو اور تھا وہ لوٹ کر گرا۔ ”خبردار“ میں بے دریغ گولی مار دوں گا اگر کسی نے حرکت کی۔“

یہ کہہ کر میں کھڑکی کی جانب سرکا۔ ”صفرا کھڑکی کھول.....“ میں نے نگاہیں ان لوگوں پر جمائے ہوئے کہا۔

صفرا نے کھڑکی کھول لی۔

”باہر کود جا صفرا۔“

اس نے میری بات پر عمل کیا۔

”راجو..... میں چاہوں تو تجھے اسی وقت جان سے مار سکتا ہوں مگر میں تجھے اتنی آسانی سے نہیں ماروں گا حرامزادے..... تجھ سے تو مجھے اپنے لمحے لمحے کا حساب لینا

ہے۔ اپنے باپ کی موت بدلہ لینا ہے۔ اپنے گھر کی تباہی کا بدلہ، اپنی خوشیوں کی بربادی کا بدلہ، اپنی تینیس برس کی خدمت کا معاوضہ وصول کرنا ہے راجو، اپنے بوڑھے باپ کی ہڈیوں کے درد کی لہر لہر کا معاوضہ تجھ سے اور تیرے باپ سے وصول کرنا ہے۔ میری بہن کو یہاں تک لانے اور میری عزت پر ہاتھ ڈالنے کا حساب تو میں تیری بیٹیوں سے لوں گا راجو..... دعا کروں گا کہ تیرے بیٹیاں پیدا ہوں تاکہ میں تجھے ہتاسکوں کہ عزت کے کہتے ہیں کُتے.....“ اتنا کہہ کر میں نے راجو کی ٹانگ کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔

”آہ.....“ وہ ٹانگ پکڑ کر زمین پر لڑھک گیا۔ ”بالے مجھے معاف کر دے..... معاف کر دے.....“

”معاف کردوں..... تجھے..... نہیں کتے، حرامی..... تو معاف کئے جانے کے قابل نہیں ہے۔“ میں نے آگے بڑھ کر اس کے بال پکڑ لئے۔

”بھاء جی..... بھاء جی.....“

میں اچھل کر کھڑکی کی طرف بھاگا۔ صفرا کی چیخوں نے مجھے جھنجھوڑ دیا تھا۔ میں کھڑکی سے کود کر باہر پہنچ گیا۔ راجو کا چوکیدار صفرا کا منہ بند کئے اسے ایک طرف گھسیٹ رہا تھا۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اس پر گولی چلا دی۔

وہ اچھل کر گرا۔ میں نے صفرا کو گھسیٹا

اسی وقت جنگل گولیوں کی آواز سے گونج اٹھا۔ ادھر راجو کے ساتھی چیتھے ہوئے میرے پیچھے بھاگے۔ میں صفرا کو لے کر جنگل میں اندر کی طرف بھاگا۔ یوں لگتا تھا جیسے پورے جنگل میں گولیاں چل رہی ہوں۔ چاروں طرف سے، میں بوکھلا کر پلٹا اور درختوں کے جھنڈ میں گھس گیا۔ اس طرف غضب کا اندھیرا تھا۔ میں صفرا کو پکڑے اندر ہی اندر بڑھتا چلا گیا۔

اچانک مجھے انسپکٹر کی آواز سنائی دی جو چیخ چیخ کر مجھے باہر آ جانے کو کہہ رہا تھا۔ میں رکے بغیر آگے بڑھتا چلا گیا۔ مجھے یاد آ گیا کہ انسپکٹر ڈاکوؤں سے مقابلے کے لئے اسی جنگل میں آیا ہوا تھا۔ اسے بھی میرے بارے میں خبر مل چکی تھی۔ اب پولیس کے علاوہ راجو کے ساتھی بھی میرے تعاقب میں تھے۔ میں جلد از جلد پہاڑیوں تک پہنچ جانا چاہتا تھا مگر صفرا سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ میں اسے گھسیٹ رہا تھا۔

”بھاء جی..... میں نہیں چل سکتی۔ تو چلا جا..... ورنہ وہ لوگ تجھے مار دیں گے۔“

”نہیں صفرا..... تجھے لینے تو آیا تھا میں، پھر تجھے کیسے چھوڑ دوں پگلی۔“
”وہ تجھے مار دیں گے۔ بھاء جی..... تو چلا جا.....“ صفرا نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔

اسی وقت بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں اور صفرا جھاڑیوں میں دبک گئے۔ اچانک ٹارچ روشن ہو گئی۔ میرا سانس رک گیا۔ روشنی کا دائرہ آہستہ آہستہ اس جھاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا جس میں ہم دیکے بیٹھے تھے۔ میں نے چاہا کہ گولی چلا دوں مگر میں رک گیا۔ فالٹو گولیاں میرے پاس نہیں تھیں اور اب تک میں دو گولیاں ضائع کر چکا تھا۔ میں نے گولی نہیں چلائی۔ میں کسی صورت ان لوگوں کے ہاتھ نہیں آنا چاہتا تھا۔ گولی چلانے پر وہ میری پوزیشن سے واقف ہو جاتے اور مجھے گھیر لیتے۔

میں نے سوچ لیا تھا کہ جان دے دوں گا مگر ان کے ہاتھ نہیں آؤں گا۔ میں خاموشی سے دبا رہا۔ خدا میرے ساتھ تھا۔ روشنی کا دائرہ مجھ سے دور ہو گیا۔
”یہاں کوئی نہیں ہے۔“ ایک آواز سنائی دی جو ہم سے بہت قریب تھی۔
”تلاش کرو۔ چاروں طرف پھیل جاؤ۔ بچ نہ سکے۔“ انسپکٹر کڑکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

”سر آگے جانا خطرناک ہے۔ اس طرف ڈاکو ہیں۔“

”میں جانتا ہوں۔ تم دائیں جانب سے آگے بڑھو۔“ انسپکٹر نے کہا اور پھر قدموں کی آوازیں دور ہوتی چلی گئیں۔ میں جان گیا تھا کہ آگے ڈاکو ہیں مگر مجھے انسپکٹر اور زمیندار کے آدمیوں سے ہر حال میں بچنا تھا۔ میں صفرا کو لئے پہاڑیوں کی سمت بڑھنے لگا۔ وقت گزرتا رہا، سناٹا گہرا ہو گیا۔ کبھی کبھی سوکھی جھاڑیوں کے چرمانے کی آواز سنائی دیتی اور بس۔ میں تقریباً ایک گھنٹے بعد پہاڑیوں کے دامن میں پہنچ گیا۔

اب مجھے ان پہاڑیوں کے اوپر چڑھنا تھا۔ پہاڑیوں کے اُس طرف جانا ضروری تھا، یہاں تو انسپکٹر اور زمیندار کے کتے ہماری بو سونگتے پھر رہے تھے۔

صفرا کی حالت بہت خراب تھی۔ اس کے پیروں میں کانٹے چبھے ہوئے تھے۔ اسے چلنے میں بہت دشواری ہو رہی تھی مگر وہ بے چاری پھر بھی ہمت سے کام لے رہی تھی۔ ہم نے اب آہستہ آہستہ پہاڑی پر چڑھنا شروع کر دیا۔ بارش کی وجہ سے پہاڑی پر کائی جی ہوئی تھی، پاؤں جمانا بے حد دشوار ہو رہا تھا۔ میں آہستہ آہستہ اوپر چڑھ رہا تھا، صفرا مجھ سے آگے تھی۔ میں اسے اوپر چڑھنے میں مدد دے رہا تھا۔

”بھاء جی..... مجھ سے نہیں ہوتا۔“ وہ رو پڑی۔

”ٹھہر جا صفرا میں آگے آ جاؤں پھر تجھے اوپر کھینچ لوں گا۔“ یہ کہہ کر میں صفرا سے آگے ہو گیا۔ بائیں جانب ایک چھوٹا سا غار بنا ہوا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہاں پہنچ کر میں کچھ دیر ٹھہر جاؤں تاکہ صفرا کو کچھ آرام مل سکے۔ جونہی میں اس سے آگے چڑھا، فائر کی آواز آئی اور ساتھ ہی صفرا کی چیخ گونجی۔ میں نے جھپٹ کر صفرا کا بازو پکڑ لیا ورنہ وہ گر جاتی۔
”خود کو پولیس کے حوالے کر دو بالے۔ تمہیں چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔“ انسپکٹر کی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی پہاڑی کے اوپر سے فائرنگ شروع ہو گئی۔

گہری رات میں چاروں طرف جنگو سے اڑتے محسوس ہو رہے تھے۔ شاید ڈاکوؤں نے پولیس پر حملہ کر دیا تھا۔ پولیس بھی ان کے مقابلے پر ڈٹ گئی۔ میں نے اس ہنگامے سے فائدہ اٹھایا اور صفرا کو اوپر کھینچ لیا۔ ”صفرا..... صفرا.....“

مگر وہ خاموش تھی۔ میں گھبرا گیا۔ اسے لٹا کر میں نے ماپس کی تیلی جلائی اور چیخ پڑا۔ صفرا بے سندھ میرے سامنے پڑی تھی۔ اس کی پشت سے خون بہہ رہا تھا۔ میں نے کان اس کے سینے سے لگا دیا۔ اس کی نبض ٹوٹی، جو بہت آہستہ چل رہی تھی۔

اسے پانی کی ضرورت تھی جو میرے پاس نہیں تھا۔ میں نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ اس میں اب بھی حرکت نہ ہوئی۔ میں پاگل ہو گیا۔ میں نے باہر نکل کر ساری گولیاں نیچے کی طرف چلا دیں۔ اب پستول خالی ہو چکا تھا۔ میں پھر بھاگ کر اندر آیا جہاں صفرا بے حس و حرکت پڑی تھی اس کے چہرے پر سکون چھایا ہوا تھا۔

ماپس کی آخری تیلی کی روشنی میں وہ بے حد پُر سکون لگ رہی تھی۔ میں اس سے لپٹ کر رو دیا۔

اچانک کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں اچھل پڑا۔ سر اٹھایا تو ایک لمبا تڑنگا آدمی چہرے کو پکڑے سے چھپائے، ہاتھ میں بندوق پکڑے کھڑا تھا۔

”کون ہے یہ.....؟“ اس نے بندوق کی نال سے صفرا کی طرف اشارہ کیا۔

”میری..... میری بہن صفرا.....؟“

”اٹھاؤ اسے..... جلدی وقت کم ہے۔“

یہ کہہ کر وہ غار سے باہر چلا گیا۔ نیچے کی جانب اس نے یکے بعد دیگرے دو فائر کئے اور مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے فوراً صفرا کو کندھے پر ڈال لیا۔

وہ جو بھی تھا میرے لئے فرشتہ رحمت ثابت ہوا تھا۔ ورنہ میں تو ہار چکا تھا۔ صفرا زخمی حالت میں پڑی تھی اور میرا پستول خالی ہو چکا تھا اگر یہ شخص نہ آ جاتا تو شاید پولیس مجھے ایک بار پھر گرفتار کر لیتی۔

میں صفرا کو لئے ہوئے باہر آ گیا۔ ہم آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے لگے۔ صفرا کو لے کر اوپر چڑھنا بڑا مشکل تھا مگر وہ شخص میری مدد کر رہا تھا۔ چوبیشن ایسی تھی کہ ہم کسی وقت بھی گولیوں کی زد میں آ سکتے تھے۔ کبھی کبھی تو اسے بندوق کو کندھے پر لٹکا کر مجھے سارا دینا

پڑتا تھا۔ نیچے سے اب بھی گولیاں چل رہی تھیں۔

”تم دائیں طرف سے گھوم کر پیچھے چلے جاؤ۔ وہاں ہمارے دوسرے ساتھی ہیں۔ جلدی کرو، میں انہیں روکتا ہوں۔ اسے فوراً لے جاؤ۔ ورنہ یہ مر جائے گی۔ جلدی.....“

میں لمحہ بھر کو سن رہ گیا۔ صفرا کی موت کا خیال آتے ہی مجھ میں بجلیاں سی بھر گئیں اور میں نے رفتار تیز کر دی۔ اب قدرے ہموار رستہ شروع ہو گیا تھا مگر بارش کی وجہ سے پھسلن بہت تھی۔ میں اسی جانب بڑھ گیا جس جانب اس شخص نے اشارہ کیا تھا۔ وہ شخص وہیں کونے میں دبکا فائرنگ کر رہا تھا۔ پولیس والوں کی تمام توجہ اسی جانب تھی۔ میں اس بوچھاڑ سے محفوظ تھا۔ میرے پیر زخمی ہو چکے تھے، نوکیلے پتھروں نے میرے پیروں کو لہولہا کر دیا تھا۔ پھر صفرا کو اٹھا کر چلنا اور بھی مشکل ہو گیا تھا مگر تقریباً چند رہ منٹ بعد ہی میں ایک کھلے علاقے میں پہنچ گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہاں سے پہاڑیوں کو تراش دیا گیا ہو۔ یہ جگہ ایک چھوٹی سی وادی بن گئی تھی جو چاروں طرف سے پہاڑیوں سے گھری ہوئی تھی۔

میرا سانس بری طرح پھول رہا تھا۔ بدن پسینے سے شرابور تھا۔ مجھے ابھی تک اس شخص کے ساتھی نظر نہیں آئے تھے۔ اب ہمت جواب دیتی جا رہی تھی مگر صفرا کو مدد کی ضرورت تھی۔ اسی خیال سے میں آگے بڑھا۔ ابھی چند ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ اچانک دائیں جانب کے کناؤ سے دو آدمی میرے سامنے آ گئے۔ دونوں نے میری جانب بندوقیں تانی ہوئی تھیں۔ میں انہیں دیکھ کر گھبرا گیا۔

”خبردار..... ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو.....“

میں بوکھلا کر پیچھے ہٹ گیا۔ ”وہ..... وہ تمہارا ساتھی.....“

”کون ہو تم..... اور یہ.....؟“ ان میں سے ایک نے گرج کر پوچھا۔

”میں بالا ہوں..... یہ صفرا ہے میری بہن..... زخمی ہے، اسے مدد کی

ضرورت ہے ورنہ یہ مر جائے گی..... گولی لگی ہے اسے۔“ اسی وقت دو آدمی اور

میرے سامنے آ گئے۔ وہ چاروں مجھے خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔

”اسے بچالو..... مجھے اس نے..... اس نے کہا تھا..... یہ مر جائے گی

..... میں بالا ہوں، پولیس..... وہ زمیندار کے آدمی، تمہارے ساتھی نے.....
اچانک مجھے احساس ہوا کہ سب گہری خاموشی سے میری طرف دیکھ رہے ہیں اور
میرے منہ سے بے ربط جملے نکل رہے ہیں۔ میں اول فول کے جا رہا ہوں۔ میں ایک دم
خاموش ہو گیا۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میں نے اس شخص سے نام نہ پوچھ کر بڑی غلطی
کی ہے۔ اگر میں اس سے نام پوچھ لیتا تو یہ لوگ مجھ پر اعتبار کر لیتے۔ اسی وقت وہ شخص
بھی آگیا۔ میری جان میں جان آئی ورنہ ان پتھر چہرے والوں کی سرد مہری نے تو مجھے دہلا دیا
تھا۔

”جانے دو اسے۔“ اس نے ان چاروں کو دیکھ کر کہا۔ ”اور سنو منگی، تم اور سلطان
پولیس کو اس طرف آنے سے روکو، دوسری طرف نکل جاؤ..... فائرنگ کرتے رہو
..... ان کی توجہ دوسری جانب ہو جانی چاہئے۔“

”اس طرف قادر اور کریم ہیں۔“ ایک نے جواب دیا۔
”میں جانتا ہوں مگر تم جاؤ۔ جو بھی سامنے آئے بھون کر رکھ دینا اور سنو راجہ کہاں
ہے؟“

”اندر ہے۔“ مختصر جواب ملا اور ان چاروں میں سے دو آدمی اس طرف چلے گئے
جہاں کے لئے میرے محسن نے انہیں کہا تھا۔
”آؤ.....“ اس شخص نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ میرے کندھے شل
ہو چکے تھے، قدم ڈنگا رہے تھے، ایک قدم بھی چلنا دو بھر ہو رہا تھا مگر میں نے ہمت کی اور
اس کے پیچھے چل پڑا۔

ہم چند قدم بعد ہی ایک ایسی جگہ پر پہنچ گئے جسے غار کہا جاسکتا تھا مگر یہ غار بہت بڑا
تھا۔ اس کے دوسری طرف بھی دہانہ تھا جس پر پتھر رکھ کر بند کیا گیا تھا مگر اب بھی اتنی جگہ
تھی کہ ایک آدمی با آسانی اس جگہ سے گزر سکتا تھا۔ اندر فرش پر گھاس پھیلی ہوئی تھی۔
جگہ جگہ بڑے بڑے پتھر رکھے تھے جن پر مختلف چیزیں اور برتن رکھے ہوئے تھے۔ لگتا تھا
یہ ان کا مستقل ٹھکانہ ہے۔

”اسے یہاں لٹا دو۔“ میرے ساتھ آنے والے شخص نے گھاس کی طرف اشارہ
کیا۔

میں نے صفرا کو وہاں لٹا دیا۔ اس جگہ روشنی کم تھی مگر اس کم روشنی میں بھی صفرا کا
سفید چہرہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے اسے تھپتھپایا۔ ہلایا، آوازیں دیں مگر صفرا میں کوئی حرکت
نہ ہوئی۔ ”اسے..... دیکھو.....“ میں نے گھبرا کر سر اٹھایا اور اپنے چاروں طرف
کھڑے آدمیوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

وہ پانچ تھے جو میرے قریب کھڑے حیرت سے مجھے اور صفرا کو دیکھ رہے تھے۔
”گرم پانی لاؤ۔“ ایک اونچے قد کے آدمی نے کہا اور آستین چڑھا کر صفرا کے قریب
بیٹھ گیا۔ اس نے صفرا کو پشت کے بل لٹایا اور اس کے زخم کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس نے
باقی لوگوں کو باہر بھیج دیا تھا۔ صرف وہی شخص ہمارے قریب رہ گیا تھا جو مجھے اور صفرا کو
یہاں تک لایا تھا۔

ذرا دیر بعد ایک شخص گرم پانی لے آیا۔ میں نے اس اونچے قد کے آدمی کو غور
سے دیکھا جو کسی ماہر ڈاکٹر کی طرح صفرا کے زخم کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس کی کشادہ پیشانی پر
گھنے اور سیاہ بال بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں اتنی بڑی اور گہری سیاہ تھیں کہ میں نے
آج تک ایسی آنکھیں نہیں دیکھیں تھیں۔ اس کے چہرے پر بلا کا رعب تھا۔ آواز بھی
بہت گرج دار تھی۔ اس کے چہرے پر سیاہ موٹھیں اور سیاہ داڑھی نے رعب پیدا کیا تھا۔
اس نے آگ جلانے کو کہا تو میرا محسن اسٹو لے آیا۔ اس نے جلدی جلدی مٹی
کے تیل کے اس چولہے میں ہوا بھری اور پھر تیلی دکھادی چولہا تیز آواز سے جل اٹھا۔

چند لمحوں وہ تیز دھار والا چاقو آئینے پر رکھے رہا پھر اس نے بڑے ماہرانہ انداز میں
صفرا کے زخم میں سے گولی نکال لی۔ میں دانت بھیجنے صفرا کو دیکھتا رہا مگر اس میں کوئی حرکت
نہ ہوئی۔ مجھے خوف آنے لگا، صفرا کی اس بے جسی سے، اس خاموشی سے۔

اس نے زخم کو دھو کر اس پر عجیب سا مرہم لگایا اور روٹی کا پھلایا رکھ کر اسے ٹیپ
سے چپکا دیا۔

”اس کے پاؤں بھی زخمی ہیں۔“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ چند لمحوں مجھے گھورتا رہا پھر رعب دار آواز میں بولا۔
”تو مرو ہے یا عورت؟“ اس کے لہجے میں ناراضگی تھی۔

”میں..... اس وقت صرف بھائی ہوں صاحب.....“

وہ دو منٹ جڑے بھیجنے مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے صفرا کے پیروں سے کانٹے نکال کر ان پر بھی مرہم لگا دیا۔ وہ کھڑا ہو کر کپڑے سے ہاتھ پونچھے لگا۔

”یہ..... یہ بے حس کیوں..... یہ ٹھیک ہے نا..... ٹھیک ہو جائے گی؟“
”پتا نہیں.....“ اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ”جو ہم کر سکتے تھے کر دیا..... اب جو کچھ کرنا ہے خدا نے کرنا ہے.....“ یہ کہہ کر وہ ایک بڑے سے پتھر پر جا بیٹھا۔

میں بے دم سافرا کے قریب جا بیٹھا۔ اس کے معصوم چہرے پر کرب تھا۔ میری آنکھیں بھیگ گئیں تو میں نے سرگھٹنوں میں دے لیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ لوگ مجھے روتا دیکھیں۔

”لے چائے پی.....“
میں نے سراٹھا کر دیکھا میرا محسن تام چینی کا مگا ہاتھ میں لئے کھڑا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر مگا اس سے لے لیا۔ وہ میرے قریب ہی بیٹھ گیا۔ ”اب بول کیا چکر ہے..... تو کون ہے اور یہ سب کیسے ہوا؟“

پھر میں نے دھیرے دھیرے اسے ساری کہانی سنا دی۔ جب میں نے بتایا کہ راجو صفرا کو اٹھا لایا تھا اور اس کو لوٹنا چاہتا تھا کہ میں پہنچ گیا تو وہ کشادہ پیشانی اور رعب دار چہرے والا غرا اٹھا۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس نے پاس پڑے ہوئے پتھر کو زور دار ٹھوکر ماری، پتھر میرے چائے کے گگ سے ٹکرایا اور مگا فرش پر لڑھک گیا۔ اس کی حالت کسی شیر کی سی ہو رہی تھی۔ وہ تیز قدموں سے ٹھلنے لگا۔ اس کی آنکھیں ایک دم سرخ ہو گئیں اور چہرے پر زلزلے کے سے آثار پیدا ہو گئے۔
میں سہم کر چپ ہو گیا۔

”یہ راجہ ہے..... ہمارا سردار..... اس کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا تھا مگر اس نے خود ہی ان دردوں کے پنجنے میں پھنسی اپنی بہن کو گولی مار دی۔ اگر نہ مارتا تو.....“
جائے کیا ہو جاتا۔ ان لوگوں نے اس کے بھرے گھر کو آگ لگا دی تھی۔ بھائی، بھابھ بھتیجا اور ماں باپ سب زندہ جل گئے یہ پاگل ہو گیا اس نے زمیندار کے آٹھ آدمیوں کو قتل کر دیا اور پھر..... ڈاکو بن گیا۔ ہم سب ان بڑے لوگوں کے ڈسے ہوئے ہیں۔“ میرے

محسن نے سرگوشیوں میں بتایا۔ میرے بدن میں جھرجھری دوڑ گئی تھی۔ میں نے نگاہ اٹھا کر اس بہر شیر کو دیکھا جس کی حالت آہستہ آہستہ معمول پر آرہی تھی پھر اچانک وہ پُرسکون ہو گیا۔ ایک دم خاموش، جیسے پتھر گیا ہو۔

دیر ہو گئی تھی مگر صفرا اب تک بے ہوش پڑی تھی۔ میں ٹھنکی باندھے اسے دیکھ رہا تھا۔ میرا محسن قریب ہی فرش پر پڑی گھاس پر لیٹا ہوا چاقو سے ایک لکڑی کو چھیل کر اسے نوکیلا بنا رہا تھا۔ راجہ پتھر سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ اس نے سیاہ رنگ کا فیض شلوار پہنا ہوا تھا۔ سیاہ رنگ کی ایک چادر اس کے کندھوں پر پڑی تھی۔ ایک کندھے پر بندوق اور دوسرے کندھے پر گولیوں کی پٹی تھی۔ پیروں میں بھاری بوٹ تھے اور ایک ہاتھ میں فیروزے کی بڑی سی انگوٹھی تھی۔

اس کے بڑے بڑے ہاتھوں اور موٹی موٹی انگلیوں کو دیکھ کر ہی اس کی بے پناہ طاقت کا اندازہ ہوتا تھا۔ میں اس کی شخصیت سے بے انتہا متاثر ہو گیا تھا۔ مجھے اس کے مضبوط اور سپاٹ چہرے پر صرف اس کی آنکھوں میں زندگی نظر آئی تھی، سسکتی مگر ٹھانٹیں مارتی زندگی۔ زندگی سے پیار اور نفرت دونوں تھی ان آنکھوں میں۔ میں نے اتنی بے ترتیب آنکھیں آج سے پہلے کسی چہرے پر نہ دیکھی تھیں۔ ایسی گہری اور بولتی بلکہ چیختی ہوئی آنکھیں کہ جن کو دیکھ کر آدمی کے پورے وجود میں شور سا بلند ہو جائے۔ میں بھی خود میں ویسا ہی شور محسوس کر رہا تھا ایسے جیسے سمندر کی بھری ہوئی موجیں پتھر کی چٹانوں سے سرپھوڑ رہی ہوں۔ بے پناہ خاموشی میں اٹھتا ہوا شور مجھے بے چین کر رہا تھا۔

”ام..... اماں.....“ صفرا کی آواز پورے غار کی خاموشی کو چیر گئی۔
”صفرا..... صفرا میری بہن..... کیسی ہے تو.....؟“ میں بے اختیار اس پر جھک گیا۔ راجہ نے چونک کر آنکھیں کھول دی تھیں اور میرا محسن اٹھ بیٹھا تھا۔

”پپ..... پانی.....“ صفرا کے پپڑائے ہوئے ہونٹ ہلے۔
مجھ سے پہلے ہی میرے محسن نے اٹھ کر چھاگل میری طرف بڑھا دی۔ میں نے پانی کی چھاگل صفرا کے سوکھے ہونٹوں سے لگا دی۔ اس نے گھونٹ بھر پانی پیا اور کمزوری سے آنکھیں بند کر لیں۔

میرے محسن نے، جس کا نام تو نہ معلوم کیا تھا مگر راجہ نے اسے خان کہہ کر مخاطب

کیا تھا، روٹی میرے ہاتھ پر رکھ دی جس میں پنیر کا ٹکڑا لپٹا ہوا تھا۔ ”یہاں اس کے سوا کچھ نہیں..... یہی کھلا دو، کچھ طاقت آجائے گی۔“

میں نے اس سے روٹی لے لی اور چھوٹا سا نوالہ بنا کر صغرا کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس نے چونک کی آنکھیں کھولیں اور منہ میں نوالہ رکھ لیا مگر وہ اس سے چبایا نہیں جا رہا تھا۔ شاید اسے چبانے سے تکلیف ہو رہی تھی۔ روٹی بھی تو بہت سخت تھی۔ میں نے بے بسی سے خان کو دیکھا۔ اس نے کندھے اچکا کر صغرا کی طرف دیکھا۔

”نہیں..... نہیں ہوتا.....“ صغرا نے تھکن سے پُور لہجے میں جواب دیا۔

میں نے روٹی ہاتھ سے رکھ دی اور اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ صغرا نے آہستہ سے سر گھما کر چاروں طرف دیکھا۔ غار میں اس وقت راجہ اور خان کے سوا کوئی نہ تھا۔ اچانک وہ خوف زدہ ہو گئی۔ اس کی دھندلائی ہوئی آنکھوں میں ہزاروں سوال چھلک آئے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ خود کو ان لوگوں میں دیکھ کر سہم گئی ہے۔

”یہ..... یہ ہمارے محسن ہیں صغرا..... انہوں نے تیری اور میری جان بچائی ہے ورنہ پولیس اور زمیندار کے آدمی ہمیں پھر پکڑ لیتے۔“

پھر شاید اسے سب کچھ یاد آگیا۔

”بھاء جی..... اماں..... اور بابا.....؟“ وہ ایک دم رو پڑی۔

”بابا.....!“ میرے منہ سے ایک کراہ نکلی۔ ”بابا اب دنیا میں نہیں رہا صغرا اور اماں..... انہی درندوں کی کچھار میں رہ گئی۔ اس نے مجھے رکنے ہی نہ دیا تیرے بارے میں بتایا تو میں..... میں بھی پاگل ہو گیا..... سب کچھ بھول گیا اور اسے وہیں چھوڑ آیا..... جانے وہ کس حال میں ہو گی مگر..... میں..... میں جاؤں گا..... اسے لے کر آؤں گا۔ ہاں اسے وہاں چھوڑنا ٹھیک نہیں ہے۔ وہ اسے بھی مار دیں گے۔“ میں بے ساختہ کھڑا ہو گیا۔

”پاگل ہو گیا ہے تو.....؟ وہ اب تک مریچی ہو گی اور نیچے پولیس ہے۔ ہمارے آدمی اب بھی مقابلہ کر رہے ہیں، اگر وہ لوگ گھیرا توڑ چکے ہوتے تو ہمیں اطلاع کرنے ضرور آتے۔“ خان نے کہا۔

”مگر اماں.....“ صغرا نے اسے خوف زدہ نگاہوں سے دیکھا۔

”مجھے افسوس ہے..... مگر ہم اس وقت اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ سویرا ہونے والا ہے۔ رات سے پہلے ہم یہاں سے نکل بھی نہیں سکتے اور ویسے بھی اب یہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں۔ تم لوگ چاہو تو رک سکتے ہو۔“ خان نے بے تعلقی سے کہا۔

”خان ٹھیک کہتا ہے صغرا، ہم اس وقت کچھ بھی نہیں کر سکتے، بس خدا سے دعا کرو.....“ میں نے دھیرے سے جواب دیا اور صغرا رو پڑی۔ اسی لمحے اچانک ایک دھماکے کی آواز آئی۔ میں اچھل کر کھڑا ہو گیا مگر مجھے فوراً ہی ساکت ہو جانا پڑا۔ راجہ نے ایک بار پھر پاس پڑے پتھر کو زور دار ٹھوکر ماری تھی اور وہ پتھر چٹان سے ٹکرا، گونج دار آواز پیدا کرتا ہوا زمین پر آگرا تھا۔

”اسے خاموش کراؤ۔“ اس نے غراتے ہوئے لہجے میں خان سے کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ صغرا سہم کر چپ ہو گئی۔ میں حیران کھڑا اس جانب دیکھ رہا تھا جس طرف راجہ گیا تھا۔

”یہ..... کسی کو روتا نہیں دیکھ سکتا اور..... خاص طور پر کسی عورت کے رونے کی آواز سن کر پاگل ہو جاتا ہے۔ تم گھبراؤ نہیں۔ راجہ دل کا بہت اچھا اور نیک ہے۔ مگر..... کچھ کھسکا ہوا ہے۔ تم..... مت گھبراؤ۔“ خان نے مجھ سے اور صغرا سے کہا اور راجہ کے پیچھے باہر چلا گیا۔

”بھاء جی..... یہ..... یہ کون لوگ ہیں.....؟“

”یہ ڈاکو ہیں صغرا..... وہی ڈاکو جن سے پولیس مقابلہ کر رہی تھی۔“ پھر میں نے صغرا کو سب تفصیل بتائی کہ کس طرح خان اچانک آگیا تھا اور ہم کس مشکل اور دشواری سے اسے یہاں تک لائے اور پھر کس طرح راجہ نے اس کی پشت سے گولی نکالی تھی

صغرا حیران آنکھوں سے ساری بات سنتی رہی۔ ”ان لوگوں سے تو یہ ڈاکو اتنے ہیں.....“ اس نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

”بس اب تو چپ رہ، آرام کر، تجھے اتنا بولنا نہیں چاہئے۔ سو جا..... معلوم نہیں ہمیں کب یہاں سے جانا پڑے، تجھے اس حالت میں لے کر جانا بہت مشکل ہو گا۔“ میں نے اس کے رخسار کو تھپتھپایا۔

اس نے فرماں برداری سے فوراً ہی آنکھیں نموند لیں۔ میں چپکے سے باہر چلا آیا۔ ایک طرف راجہ اور خان کھڑے تھے۔ گرمی خاموشی تھی۔ گولیاں چلنے کی آواز بھی اب نہیں آرہی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد دو آدمی نیچے سے اوپر آگئے، آنے والوں نے آواز دے کر اپنے بارے میں بتا دیا تھا ورنہ شاید خان آہٹ پر گولی چلا دیتا۔

”کیا ہوا؟“ خان نے آنے والے سے پوچھا۔
”شاید وہ لوگ تھک گئے ہیں خان..... لیکن واپس نہیں گئے۔“
”ٹھیک ہے، اب فائرنگ نہ کرو، گولیاں ضائع کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ہم پھر کسی وقت ادھر آئیں گے۔“

آج کا دن ہمیں بہر حال یہیں گزارنا ہے۔ پھرا کھڑا دینا۔
”جی خان، وہاں عبدال بشیر اور دوسری طرف کریمو اور اللہ داد ہیں۔ میں نے ہدایت کر دی ہے وہ چوکنے رہیں گے۔ دو گھنٹے بعد ہم ڈیوٹی بدل لیں گے۔“ آنے والے نے کہا۔

راجہ ویسے ہی کھڑا دور آسمان پر ٹٹانے والے آخری ستارے کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک وہ میری طرف پلٹا۔ ”کیا نام ہے تیرا؟“

”جی بالا..... صاب..... اقبال نام ہے، سب لوگ بالا کہتے ہیں۔“
”بس یہی پچی ہے؟“ اس نے غار کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔
میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ صغرا کی طرف ہے۔ ”جی..... گھر میں سے تو یہی پچی ہے پر.....“

”پر کیا؟“ اس نے حسبِ عادت اکھڑے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
”اماں..... سوہنی اور ماسی میراں ابھی گاؤں میں ہیں۔“ میں نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

”سوہنی اور ماسی میراں کون ہے؟“
”جی سوہنی..... میری ہے.....“ میں پورا جواب نہ دے سکا اور خاموش ہو گیا۔

”ہوں..... تیری منگ ہے؟“ اس نے پُر سوچ انداز میں دیکھا۔
”جی..... بس یہی سمجھ لیں اور میراں اس کی ماں ہے۔“

”زمیندار جانتا ہے یہ بات؟“
”نہیں..... جی اسے کچھ پتا نہیں..... ابھی تو کسی کو بھی کچھ نہیں پتا.....“

”پھر ان کی فکر چھوڑ دے۔ وہ فی الحال محفوظ رہیں گی مگر تیری ماں.....“
”میں اس کے لئے بہت پریشان ہوں صاب.....“ ماں کے ذکر نے مجھے بے چین کر دیا۔

”کیا نام تیری ماں کا؟“
”جی زینب نام ہے مگر سب اسے زیو کہتے ہیں۔“
”سلطان کو پتا سمجھا دے اپنے گھر کا بھی اور وہ کون ہے..... تیری منگ..... کیا نام ہے اس کا.....؟“
”سوہنی..... سوہنی نام ہے۔“

”ہاں سوہنی کا۔ سلطان سویرے گاؤں جائے گا اگر موقع مل گیا تو..... پتا کر لے گا ان کا.....“ اس نے کہا اور ایک دم خاموش ہو گیا۔ کچھ سوچنے لگا۔
پھر ہم اندر آگئے۔ صغرا بے خبر سو رہی تھی۔ میں وہیں قریب ہی چٹان سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ راجہ اور خان اندر آچکے تھے جبکہ منگی اور سلطان غار کے دہانے پر پڑے پتھروں پر بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔ اندھیرا آہستہ آہستہ ملگبا ہوتا جا رہا تھا۔ آسمان پر ٹٹانے والے ستارے بھی دھندلے ہوتے جا رہے تھے۔

مجھے سخت بھوک لگی تھی مگر میں جانتا تھا کہ یہاں کچھ مل جانا بہت مشکل ہے۔ روٹی اور پیاز کا ٹکڑا اب بھی صغرا کے پاس گھاس پر رکھا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر وہ اٹھا لیا اور آہستہ آہستہ اس کے نوالے چبانے لگا۔ سوکھی روٹی اور پیاز کے ٹکڑے نے مجھ پر غنودگی طاری کر دی۔ میں کئی راتوں کا جاگا ہوا تھا۔ اس وقت سویا تو ایسا بے سندھ ہو گیا کہ گھنٹوں ہوش نہ آیا۔

ہوش مجھے اپنے جھنجھوڑے جانے پر آیا۔ خان مجھ پر جھکا ہوا مجھے آوازیں دے رہا

تھا۔ اس کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔ میں اچھل کر اٹھ بیٹھا۔
”کک..... کیا ہے؟“

”تمہاری بہن.....“ اس نے صفرا کی طرف اشارہ کیا۔

”کیا ہوا؟“ میں بے ساختہ چیختا ہوا اس کی طرف لپکا۔ راجہ اس کے قریب بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔

”صفرا..... صفرا.....“ میں نے اسے بلایا، آوازیں دیں مگر وہ یونہی بے سندھ پڑی رہی۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ اس کا جسم ٹھنڈا ہے، ’خ‘ جیسے وہ برف کی بنی ہوئی ہو۔

میں پتھر اگیا۔ مجھے ابا کا جسم یاد آگیا جس سے میں اندھیرے کمرے میں ٹکرا گیا تھا۔ وہ بھی تو برف کی طرف لگا تھا مجھے..... پھر کیا.....؟ ”نہیں..... نہیں.....“ راجہ..... خان..... یہ نہیں ہو سکتا..... یہ ہو گیا تو..... میں ساری دنیا کو آگ لگا دوں گا راجہ..... سب کو زندہ جلا دوں گا، کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا.....“ میں چیخ کر کھڑا ہو گیا۔

صفرا کے قریب بیٹھتے ہوئے مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ میں اس حقیقت سے نگاہیں چرا رہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ مجھے اس کی موت کا یقین ہو جائے۔ میں پاگلوں کی طرح پورے غار میں چکرا رہا تھا۔

”بالے..... جو حقیقت ہوتی ہے وہ..... حقیقت ہوتی ہے۔ تو خود کو سنبھال.....“ خان نے مجھے دونوں کندھوں سے پکڑ کر بھیگے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں بھاگ کر راجہ کے پاس چلا گیا جو صفرا کے پاس سے اٹھ کر ایک اونچے پتھر پر جا بیٹھا تھا اور غار کے دہانے سے نظر آنے والا روشن آسمان دیکھ رہا تھا۔

”راجہ..... دیکھو یہ کیا کہہ رہا ہے..... تم دیکھو راجہ وہ ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے وہ..... وہ تو سو رہی ہے۔ میں نے کہا تھا سونے کو.....“

”مرگئی ہے وہ.....“ راجہ ایک دم پلٹ کر چیخ اٹھا۔
”نہیں..... جھوٹ بولتے ہو تم لوگ۔“ میں ہوش کھو بیٹھا۔ میں نے چٹان پر

کے برسانا شروع کر دیئے۔

راجہ نے جھپٹ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا، جو زخمی ہو چکا تھا۔ ”بالے..... ہوش میں آ..... بچوں کی سی باتیں نہ کر، تجھے انتقام لینا ہے، ہوش کھو بیٹھا تو وہ سب بھی چھین جائے گا جو بچ گیا ہے، ابھی تیری ماں ان درندوں کے پاس ہے، تیری سوہنی تیرا انتظار کر رہی ہے۔ تو نہیں جائے گا تو وہ بھی مرجائے گی.....“ ماں کا خیال آتے ہی میں رو پڑا اور اتنی زور سے رویا کہ باہر سے منگی اور سلطان بھی گھبرا کر اندر آ گئے۔

”کیا ہوا؟“ سلطان نے مجھے حیرت سے دیکھتے پوچھا۔
”کچھ نہیں!“ خان نے جواب دیا اور میرے قریب چلا آیا، پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ وہ جانے کیا کیا کہتا رہا مگر مجھے کچھ سنائی نہ دے رہا تھا۔ میں صفرا کے پاس جا بیٹھا۔ اس کے معصوم چہرے پر گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔ روشنی ہوئی تو مجھے اس کا زخمی کان نظر آیا۔ شاید کسی نے اس کے کان سے وہ جھکا اتار لیا تھا جو وہ اس روز پنپے ہوئے تھی۔ بے ساختہ میرا ہاتھ جیب کی طرف بڑھ گیا۔ دوسرا جھکا میری جیب میں تھا۔ میرا جی چاہا کہ میں اڑ کر حویلی پہنچ جاؤں اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں۔ راجہ کی آنکھیں اپنی انگلیوں سے نکال لوں۔ زمیندار کی داڑھی نوج لوں۔ اس کے گھر میں آگ لگا دوں مگر..... میں اس وقت کتنا بے بس تھا۔ میں صفرا سے لپٹ کر روتا رہا اور خان مجھے تسلی دیتا رہا۔ راجہ مجھے سرخ آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تو نہیں تھے مگر پھر بھی اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی لگ رہی تھیں۔

”صفرا..... بہن میں نے تو سونے کو کہا تھا..... اور تو..... تو.....“ میں رلک رہا تھا۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے اس سے بہت سی باتیں کیوں نہ کیں۔ کیوں اسے سونے کو کہا..... کیوں اٹھ کر باہر چلا گیا۔

”بالے..... بس کر..... مرد بن مرد، عورتوں کی طرح بسورتے ہوئے مرد کسی قابل نہیں ہوتے۔“ راجہ نے آہستہ سے کہا مگر اس کی آواز پورے غار میں گونج اٹھی۔
”میرے سامنے میری بہن کی لاش پڑی ہے راجہ..... اگر میری جگہ تو ہوتا تو..... تو بھی پاگل ہو جاتا۔ چار دن میں میرا گھر بکھر گیا، میرا باپ مر گیا، ماں قید ہو گئی، میرا بھرا گھر ختم ہو گیا اگر یہ سب..... یہ سب تیرے ساتھ ہوتا تو کیا تو یونہی پتھر بنا رہتا۔ یہ تیری بہن نہیں ہے نا..... اس لئے تو ایسی باتیں کر رہا ہے..... اگر

یہ..... یہ.....

”بس کر.....“ خان ایک دم چیخ اٹھا۔ راجہ تیزی سے باہر چلا گیا۔

میں خاموش ہو گیا مگر میری آنکھوں سے بننے والے آنسو نہ تھے۔ خان کچھ دیر مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھتا رہا پھر وہ بھی باہر چلا گیا۔ میں صغرا کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لئے وہیں بیٹھا رہا۔

آدھے گھنٹے تک کوئی بھی غار میں نہ آیا اور میں اپنے خوبصورت ماضی کو یاد کر کے روتا رہا..... بابا کو، اماں کو، ہنستی مسکراتی اور مجھے چڑاتی ہوئی صغرا کو اور سوہنی کو..... جانے کتنی دیر بیت گئی، صغرا کا جسم برف کی سل بن گیا۔ جانے رات کس وقت اس نے مجھ سے منہ موڑ لیا تھا، جانے کتنی دیر گزر چکی تھی۔

اچانک آہٹ سن کر میں چونک اٹھا۔ خان میرے قریب کھڑا تھا۔ ”اٹھ بالے..... قبر تیار ہے، اسے اٹھالے۔“

”قبر.....!“ میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر سامنے پڑی صغرا کو تنکے لگا۔

”ہاں قبر..... تیری بہن شاید گاؤں سے دور نہیں جانا چاہتی تھی۔ اس لئے تو یہاں..... چل اٹھ، ہم یہاں زیادہ دیر نہیں رک سکتے۔ پولیس ہمارے اس ٹھکانے سے واقف ہو چکی ہے۔ ممکن ہے وہ لوگ شہر سے مدد بلا لیں۔ ہمیں یہاں سے جلد ہی روانہ ہو جانا چاہئے۔“

میں نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

”چل بالے..... تو تو سمجھ دار ہے، سب کچھ جانتا ہے پھر کیوں حجت کرتا ہے۔ شکر کر کہ تو اپنی بہن کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتار رہا ہے ورنہ اگر اپنے باپ کی طرح اسے بھی وہاں چھوڑنا پڑتا تو.....“

اور میرے بدن میں جھرجھری دوڑ گئی۔ میں آہستہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے آخری مرتبہ صغرا کی پیشانی کو پیار کیا اور اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھ ڈالے۔ ”یہ آخری آنسو تھے صغرا جو میں نے تجھ پر بہا دیئے..... اب ان آنکھوں سے صرف شعلے نکلیں گے جو ہر اس شخص کو جلا دیں گے جس کی نگاہیں بھی تیری طرف اٹھی تھیں۔ خدا حافظ صغرا.....“

خان نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلکا سا دباؤ ڈالا جیسے تسلی دے رہا ہو۔ میں نے پلٹ کر اسے دیکھا اور دھیرے سے مسکرایا۔

”شباباش میرے شیر..... مرد کو ایسا ہی ہونا چاہئے اور یہ تو راجہ کو کیا کہہ رہا تھا۔ بچے، اس نے تو اپنے سامنے بھرا گھر جلتے دیکھا ہے۔ جلی ہوئی ان لاشوں کو دیکھا ہے جو چند لمحوں پہلے پیاری پیاری صورتوں میں اس کے چاروں طرف گھوم رہی تھیں، اس کی بیوی، اس کی محبت جو ماں بننے والی تھی وہ بھی ماری گئی تھی۔ اسے ایسی حالت میں جھاڑیوں میں گھسیٹا گیا تھا۔ لہو لہان کر دیا تھا اسے۔ وہ بھی رویا تھا مگر اس کی آنکھوں سے آنسو نہیں شعلے نکلے تھے۔ اس کے منہ سے بین نہیں شیروں کی سی دھاڑ نکلی تھی پھر اس نے سب کچھ تس تس کر دیا تھا۔ اپنے دشمنوں کو کتوں کی موت مار دیا۔ ذبح کر دیا انہیں اور اب..... اب پولیس سے بچتا پھر رہا تھا کہ اسے ہم لوگوں کی شکل میں کچھ اور مظلوم مل گئے، ہم سب کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ کسی نہ کسی شکل میں، اور راجہ..... اس کی زندگی کا مقصد اب صرف مظلوموں کی مدد کرنا رہ گیا ہے۔ وہ تو تیرے دشمنوں کو بھی چیر پھاڑ کر رکھ دے گا۔ اس لئے نہیں کہ وہ تیرے دشمن ہیں، اس لئے کہ وہ انسانیت کے دشمن ہیں، ظالم ہیں، پیسے اور حیثیت سے دنیا کی ہر چیز خریدنے کا گھمنڈ رکھتے ہیں۔ تو اسے نہیں جانتا، میں نے اسے صغرا کے سرہانے روتے دیکھا تھا بالے..... اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے۔ تو نہیں جانتا اسے..... وہ سمندروں جیسا پُر شور اور پُر سکون ہے، اس کے وجود میں غموں کے دریا بہتے ہیں پھر بھی وہ خود کو چٹانوں ایسا مضبوط رکھتا ہے مگر پتھر بھی تو پکھل جاتا ہے بالے، اگر پانی کا قطرہ اس پر مسلسل گرتا رہے تو پتھر میں بھی سوراخ کر دیتا ہے۔ چل..... وہ انتظار کر رہا ہے۔“

میں خان کی باتیں سن کر تھرا اٹھا تھا۔ میں تو بھول گیا تھا کہ راجہ خود بھی چوٹ کھایا ہوا ہے۔ مجھے خود پر غصہ آگیا۔ میں نے جانے اسے کیا کہہ دیا تھا۔ میں شرمندہ بھی تھا۔ میں صغرا کو اٹھا کر باہر لے آیا۔ سورج نہیں نکلا تھا مگر چاروں طرف شفق پھیلی ہوئی تھی۔ خان کے ساتھیوں نے قبر تیار کر لی تھی۔ سب کے چہروں پر حزن تھا۔ سب کی نگاہیں غم تھیں مگر راجہ کا چہرہ پتھر جیسا ہو رہا تھا۔ اس کے جڑے بھنچے ہوئے تھے۔

میں نے دھیرے سے صغرا کا بدن قبر کے قریب رکھ دیا پھر میں راجہ کے قریب گیا،

میں اسے سے معافی مانگتا چاہتا تھا مگر حلق سے آواز نہیں نکلی، اس نے میری طرف دیکھا، دھیرے سے مسکرایا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ یوں جیسے اس نے معافی مانگنے سے پہلے ہی معاف کر دیا ہو۔ وہ مجھے لئے ہوئے صفرا کے قریب آیا۔

”یہ..... یہ چہرہ یاد رکھنا بالے اور یہ بھی کہ جب یہ چہرہ بولتا تھا، ہنستا تھا، یا باتیں کرتا تھا تو کیسا پیارا لگتا تھا تجھے..... اگر یہ چہرہ بھول گیا تو سب کچھ بھول جائے گا اور جب تو یہ سب کچھ بھول جائے گا تو سب سے پہلے بے غیرت کئے والا میں ہوں گا، مار مار کر تیرا چہرہ بگاڑ دوں گا، سن لیا تو نے، اسے یاد رکھنا اور ان لوگوں کو کتوں کی موت مارنا جنہوں نے تجھ سے وہ ہنستا مسکراتا چہرہ چھین کر یہ بے جان اور سرد چہرہ تجھے دیا ہے۔“

میں نہ چاہتے ہوئے بھی رو پڑا۔

”رو لے..... آج تجھے رونے کی آزادی ہے بالے..... اس لئے کہ ابھی تیری بہن تیرے سامنے ہے مگر سن اگر آج کے بعد رویا تو.....“ اس کی آواز بھرا گئی وہ مجھے چھوڑ کر ایک دم پلٹ گیا۔ دور چلا گیا۔

چاروں طرف گہری خاموشی تھی۔ میری سسکیاں تھیں اور بس۔

پھر میں نے جانے کس طرح خود کو سنبھال لیا، صفرا کو قبر میں اتارا تو میرا دل بیٹھ گیا، میرے بدن میں درد کی لہریں اٹھنے لگیں۔ میں نے بڑی مشکل سے اس کی قبر پر مٹی ڈالی اور پھر ایک طرف ڈھے گیا۔

میں کتنی دیر غشی میں پڑا رہا اس کا مجھے اندازہ نہ ہوا۔ یوں لگتا تھا جیسے میرا ذہن سو رہا ہے، میں کچھ بھی سوچنے اور سمجھنے سے قاصر تھا۔ بس آنکھیں تھیں جو ان سب کو سامان سمیٹتے ہوئے دیکھتی رہیں۔

”ہمارے ساتھ چلے گیا بیس بیٹھا رہے گا؟“ راجہ نے قریب آکر پوچھا۔ شاید راجہ کے لہجے کی آنچ تھی جس نے میرے سرد جسم میں حرارت دوڑا دی۔

”یہاں کس کے پاس بیٹھوں گا؟“ میں نے دھیرے سے جواب دیا۔

”پھر اٹھ..... تیار ہو جا۔“

میں آہستہ سے اٹھ گیا۔ میں نے کپڑے پر لگی مٹی جھاڑی۔ صفرا کی قبر کے سرہانے بڑا سا پتھر رکھا اور نکلتے ہوئے سورج کو دیکھنے لگا۔ اچانک میں نے خود میں عجیب سی تبدیلی

محسوس کی، یوں جیسے اب تک کا بالامیرے جسم سے نکل کر ہوا میں تحلیل ہو گیا ہو اور میں..... میں کوئی اور ہوں مضبوط اور پتھر کی طرح سخت، میری آنکھیں خشک تھیں، دل میں غم کا احساس تک نہ تھا۔ بس ایک آگ تھی جو مجھ میں دھیرے دھیرے سلگنے لگی تھی۔

سب لوگ چلنے کے لئے تیار تھے، میں بھی ان لوگوں کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ راجہ ان سب کو راستے کے متعلق ہدایات دے رہا تھا۔ اس وقت وہ اس راجہ سے قطعی مختلف لگا جو چند لمحے پہلے دیکھ رہا تھا۔

وہ نو آدمی تھے اور اب مجھے ملا کر دس ہو گئے تھے۔ مجھے سلطان کہیں نظر نہ آیا۔

”سلطان کہاں ہے؟“ میں نے خان سے پوچھا

”وہ گاؤں گیا ہے، وہاں کی خبر لے کر ہم سے آگے کہیں آ ملے گا۔ تو فکر نہ کر میں نے اسے تیرے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا اور تیری ماں کے بارے میں بھی..... اس کا نام زینب ہے نا؟“

”ہاں!“

”میں نے بتا دیا ہے اور گاؤں کون سا ایسا بڑا ہے، وہ سب کچھ معلوم کر لے گا، ہم پھر کسی وقت آئیں گے، سب حساب چکنا ہو جائے گا تو فکر نہ کر۔“ خان نے مجھے تسلی دی۔

”مگر ہم جائیں گے کہاں؟“

”یہ فکر تجھے نہیں کرنی۔ ہمارے ساتھ رہنا ہے تو کوئی سوال نہ کرنا۔ ایک بات سمجھ لے ہم ظالم کے دشمن ہیں، چاہے وہ کتنی ہی معصوم شکل کا کیوں نہ ہو۔ تجھے اگر ہم پر اعتبار ہے تو ہمارا ساتھ دینا ورنہ تیرا راستہ الگ ہمارا الگ.....“

”نہیں نہیں خان..... ایسی بات نہیں ہے..... آئندہ کوئی سوال نہیں کروں گا۔ میں تم لوگوں جیسا ہوں، تم ہی لوگوں کے ساتھ رہوں گا، جو تم لوگ کہو گے وہی کروں گا۔“

”کوئی جبر نہیں ہے، تم جب چاہو اپنا راستہ بدل سکتے ہو، ہم جانے والے کو کبھی نہیں روکتے، اور آنے والے کو خوش آمدید کہتے ہیں۔“ خان نے میری آنکھوں میں دیکھتے

ہوئے کہا۔

”چلو خان.....“ راجہ نے اسے آواز دی۔

ہم دونوں اسی طرف بڑھ گئے۔ میں کبھی بھی ان پہاڑیوں کی طرف نہیں آیا تھا مگر خان وغیرہ جس طرح اندر کی طرف سفر کر رہے تھے اور جس طرح راستہ مڑتے تھے انہیں دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ جگہ ان کی دیکھی بھالی ہے۔ ہم کافی دیر تک پتھریلی چٹانوں کے درمیان چلتے رہے۔ پھر ایک اونچا پہاڑ ہمارے سامنے آگیا۔

”ہمیں اس پہاڑ کی دوسری طرف جانا ہے۔ اس پہاڑ کی دوسری طرف چھوٹی سی بستی ہے۔ اس بستی میں ہمیں لاری مل جائے گی۔“ خان نے شاید میری آنکھوں میں سوال پڑھ لیا تھا۔

میں خاموش رہا۔ پہاڑ پر چڑھنا مجھے دشوار لگ رہا تھا، شاید اس لئے کہ میرے پیر پہلے ہی زخمی تھے۔ ہم تین گھنٹے کی محنت کے بعد پہاڑ کی دوسری طرف پہنچ گئے۔

دوسری طرف کا منظر دیکھ کر میں حیران ہو گیا۔ اتنی خوبصورت وادی کہ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ پہاڑ کے ساتھ ہی دریا بہہ رہا تھا یا شاید چشمہ تھا..... جو کہیں سے بہت چوڑا اور کہیں سے بہت پتلا تھا۔ ہم نے وہاں سے اسے پار کر لیا جہاں اس کا پاٹ چوڑا نہیں تھا۔ دھوپ تیز ہو گئی تھی۔ ہوا بھی بہت تیز تھی۔ ہم سب وہیں رک گئے یہاں شاید کوئی خطرہ نہیں تھا اس لئے کہ ان سب کے چہروں پر جو ایک چوکنا پن تھا وہ ختم ہو چکا تھا۔ وہ سختی بھی ختم ہو چکی تھی جو میں نے اب تک ان چہروں پر پھیلی دیکھی تھی۔

ہم سب نے تمام چھاگلین پانی سے بھر لیں۔ وہ پانی بہت میٹھا اور ٹھنڈا تھا۔ خان نے فیض اتار کر پتھروں پر پھینک دی اور شلوار کو اونچا کر کے پانی میں اتر گیا۔

اسے دیکھ کر میں بھی کپڑوں سمیت پانی میں اتر گیا، کپڑوں کو مل کر دھویا اور خوب نہایا۔ راجہ اور اس کے دوسرے ساتھی وہیں کنارے پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

کچھ دیر بعد میں نے منگی کو بستی کی طرف جاتے دیکھا جو یہاں سے نظر آ رہی تھی۔ حالانکہ وہ یہاں سے کافی دور تھی اور مکان چھوٹے چھوٹے نظر آ رہے تھے۔ میرے ہونٹوں پر پھر سوال چلا مگر میں نے منہ بند رکھنا ہی مناسب سمجھا۔

ہم تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے وہاں رہے۔ پھر منگی آگیا۔ اس نے جانے راجہ سے کیا کہا کہ

راجہ فوراً اکھڑا ہو گیا۔

”چلو.....“ اس نے کہا اور سب کھڑے ہو گئے۔ میرے اور خان کے کپڑے تیز دھوپ اور تیز ہوا سے سوکھ چکے تھے۔ ہم نے سب سامان اٹھالیا اور آگے پیچھے بستی کی طرف چل دیئے۔ بستی اتنی دور نہ تھی جتنی میں سمجھ رہا تھا۔ ہم آدھ گھنٹے ہی میں بستی میں پہنچ گئے۔ یہاں کے مقامی لوگ سرائیکی پنجابی میں بات کر رہے تھے۔ پنجابی میری مادری زبان تھی اس لئے میں سمجھ رہا تھا بس کچھ الفاظ ایسے تھے جو میری سمجھ نہیں آتے تھے مگر پھر بھی جملے سے میں بات کا مفہوم سمجھ لیتا تھا۔

بستی میں داخل ہوتے ہی مجھ پر حیرت کے دورے سے پڑنے لگے۔ لگتا تھا جیسے ساری بستی والے راجہ کو جانتے ہیں۔ وہ سب ہی اسے اپنے درمیان دیکھ کر حیران اور خوش تھے۔ وہاں کا بچہ بچہ راجہ کو جانتا تھا۔ اسے دیکھتے ہی بستی کی عورتیں بچے، بوڑھے اور جوان سبھی اس کے گرد جمع ہو گئے۔ ذرا سی دیر میں تقریباً ہر گھر سے اس کے لئے دعوت آ گئی، ہر شخص اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے جانا چاہتا تھا۔

”کون ہے رے..... کون آیا ہے؟“ اچانک ایک لرزتی ہوئی آواز آئی۔ وہ ایک بہت ضعیف اور کمزور بوڑھا تھا جو آنکھوں پر ہاتھ رکھے سب کو غور سے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”باباجی، راجہ آیا ہے۔“ کسی نے زور سے کہا، شاید وہ بوڑھا بہرہ بھی تھا۔ میں نے دیکھا راجہ اس کے قدموں میں جھک گیا تھا۔ اس نے بوڑھے کے پیر چھوئے اور زور سے بولا۔ ”باباجی، میں ہوں..... تیرا پتر.....“

”اور اس بوڑھے کی ساری جھریوں میں مسکراہٹ ریگ آئی۔“ اودہ پتر تو..... بہت انتظار کیا اس بار تیرا، ریشماں بھی یاد کر رہی تھی تجھے..... اتنے دن کہاں تھا؟“

”کچھ کام تھے بابا۔ چل گھر چلتے ہیں۔“ اس نے بوڑھے کو سہارا دیا اور میں نے دیکھا سب کے چہروں پر مایوسی چھا گئی مگر کسی کے چہرے پر ناگواری نہیں تھی۔ ذرا دیر بعد وہ سب بھی ان کے پیچھے بوڑھے کے گھر کی طرف چلے دیئے۔

اچانک پاگل کے شور سے میں چونک اٹھا۔ سامنے کی کوٹھڑی کے پیچھے سے ایک لڑکی بھاگی چلی آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پانی کی چھوٹی سے مٹکی تھی، چھینٹ کی پھول

دار بڑی سی چادر میں وہ کوئی پھول ہی لگ رہی تھی۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا اور چہرے پر ہزاروں رنگ چمک رہے تھے۔

اس کے گورے پیروں میں پائل دیکھ کر مجھے سوہنی یاد آگئی۔ جانے اس کے چہرے پر کون سا رنگ ہو گا؟ میں نے دکھ سے سوچا۔

”اوہ راجہ..... تو.....“ وہ بھاگتی ہوئی راجہ کے قریب آگئی۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ پیار تھا۔

”کیسی ہے تو؟“ راجہ نے سرسری اور اکھڑے ہوئے انداز میں پوچھا اور جواب لئے بغیر بوڑھے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اسے چارپائی پر بٹھایا۔

اتنی دیر میں اس لڑکی نے دیوار کے ساتھ کھڑی ہوئی دوسری چارپائی بھی وہیں گھر کے سامنے بچھا دی اور پھر جانے کہاں سے لوگ بہت سی چارپائیاں اٹھالائے ساتھ ہی کھانے پینے کی ڈھیروں چیزیں بھی۔ لگتا تھا جس کے گھر میں اس وقت جو کچھ موجود تھا سبھی کچھ اٹھالیا تھا۔

ہم سب نے سیر ہو کر کھانا کھایا اور وہیں ان چارپائیوں پر ڈھے گئے۔ مجھے تو کافی عرصے بعد پیٹ بھر کر روٹی ملی تھی میں روٹی کے نشے میں چور ہو کر بے خبر ہو گیا۔ میری آنکھ کھلی تو وہ سب کھل کر قہقہے لگا رہے تھے۔ میں نے جانے کتنے دنوں کے بعد قہقہے سنے تھے۔ آنکھ کھلتے ہی میں نے مسکراتے ہوئے چہرے دیکھے تھے میرے سارے وجود میں فرحت دوڑ گئی۔ میں نے خود میں نیا پن محسوس کیا۔ حیرت تو مجھے یہ دیکھ کر ہوئی کہ راجہ جیسا پتھر بھی اونچے قہقہے لگا رہا تھا۔

میں نے دیکھا وہ سب گھیرے کی شکل میں بیٹھے ہیں اور ایک چودہ پندرہ برس کا لڑکا سب کے درمیان ناچ رہا ہے، ٹھکے لگا رہا ہے اور عورتوں کی نقل اتار رہا ہے جس پر وہ سب بے طرح ہنس رہے تھے۔

وہ لڑکی جسے دیکھ کر سوہنی یاد آئی تھی کوٹھڑی کے دروازے سے نکلی کھڑی تھی۔ اس کی نگاہیں اب بھی راجہ پر نکلی ہوئی تھیں اور ان آنکھوں میں ویسی ہی روشنی تھی جیسی میں نے سوہنی کی آنکھوں میں اس وقت دیکھی تھی جب اس نے کہا تھا کہ میں تمہیں بہت یاد کروں گی۔ بے اختیار میری نگاہ اس کے پیروں کی طرف گئی۔ اس کے

پیروں میں پڑی پائل ساکت تھی مگر نگاہیں کچھ کہہ رہیں تھیں۔

راجہ ان نگاہوں سے بے خبر اونچے قہقہے لگا رہا تھا۔ میں نے راجہ کی اس لڑکی سے بے رخی پہلی ہی نظر میں بھانپ لی تھی۔ میں یہ بھی سن چکا تھا کہ راجہ جس لڑکی سے محبت کرتا تھا اس سے شادی کر لی تھی اور جب وہ ماں بننے والی تھی تو کسی نے اسے مار دیا تھا۔ مجھے اس لڑکی سے ہمدردی محسوس ہوئی جو پتھر میں جونک لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ جانے اس نے راجہ سے کیسی امیدیں وابستہ کی ہوں گی مگر میں جانتا تھا کہ راجہ دوسری ٹاپ کا آدمی ہے۔

مجھے اٹھا دیکھ کر خان نے اشارہ کر کے مجھے اپنے قریب بلا لیا۔ میں اس کے قریب جا بیٹھا۔ بڑی سی پتیلی میں چائے تیار تھی۔ خان نے کچی چینی کے پیالے میں چائے انڈیل کر مجھے دی۔ ہم سب رات گئے تک بیٹھے رہے۔ راجہ گاؤں والوں سے فرداً فرداً خیریت پوچھتا رہا۔ وہاں دو خاندانوں کے درمیان شاید جھگڑا ہو گیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو معاف کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ راجہ نے ان دونوں کو بٹھا کر ان کا معاملہ نمٹایا۔ وہ ایک دوسرے پر آنکھیں نکال رہے تھے۔ سر جھکائے راجہ کا فیصلہ سنتے رہے اور پھر جیسا اس نے کہا انہوں نے سر جھکا کر قبول کر لیا۔

یہ سب ہی کچھ مجھے حیران کرنے کے لئے کافی تھا۔ ہزاروں سوال تھے جو میرے ذہن میں کیڑوں کی طرح کلبلا رہے تھے۔ مثلاً یہ کون لوگ تھے، راجہ کا ان سے کیا تعلق تھا وہ سب لوگ راجہ کی اتنی عزت کیوں کر رہے تھے جیسے بس وہی ان کا بزرگ ہو۔ میں ان سب سوالوں کے جواب چاہتا تھا۔ میں چائے پی کر ایک طرف چارپائی پر جا بیٹھا۔ راجہ ان دونوں خاندانوں کے بزرگوں سے بات چیت کر رہا تھا۔ اس کے باقی ساتھی ادھر ادھر ہو کر گپ شپ میں مصروف تھے۔ خان مجھے اکیلا دیکھ کر میرے قریب آگیا۔

”کیا بات ہے بالے! کیا سوچ رہا ہے؟“

”کچھ نہیں خان، یہاں میرے لئے ہر قدم پر حیرت منہ پھاڑے کھڑی ہے۔ تم نے مجھے سوال کرنے کے لئے منع کیا تھا مگر.....“ میں جھجک کر خاموش ہو گیا مبادا خان ناراض ہو جائے۔

”میں جانتا تھا۔ میں نے تیرے چہرے پر ہی سارے سوال پڑھ لئے تھے۔ پوچھ کیا

پوچھنا چاہتا ہے۔“ اس نے ٹانگیں سمیٹ کر کہا اور چارپائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔
”یہ..... یہ سب کون ہیں..... اور ان سب کا راجہ سے کیا تعلق ہے؟“

”یہ بہت لمبی کہانی ہے مگر میں تجھے موٹی موٹی باتیں بتا دیتا ہوں۔ یہ چھوٹی سی ہنستی مسکراتی ہنستی جو تو دیکھ رہا ہے یہ پہلے ایسی نہیں تھی یہاں ایک ہندو بننے کا راج تھا۔ یہ ساری زمین جس پر یہ لوگ آباد ہیں اس کی تھی۔ وہ ساری بستی کا بے تاج بادشاہ تھا۔ یہ لوگ چھوٹے موٹے کام کیا کرتے تھے اور اپنی زندگی چین سے بسر کرتے تھے مگر اس بننے نے آہستہ آہستہ ان سب کو روٹی کا لالچ دے کر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ان کو جی کھول کر پیسہ دیا اور پھر سود کی صورت میں ان سے ان کی زندگی تک وصول کر لی۔ یہ ساری زمین خرید لی اور پھر وہ مالک بن بیٹھا۔

ہندو تھا اس لئے اس نے جو رواج یہاں پر عام کیا وہ بھی وہی تھا جو وہ چاہتا تھا یا جو ان کے مذہب اور ان کے کلچر کا حصہ تھا۔ یہ جاہل اور آن پڑھ لوگ آہستہ آہستہ اس کے غلام ہوتے چلے گئے۔ وہ ہر وقت سادھو بنا رہتا اور ایسے ایسے جادو دکھاتا کہ لوگ سم کر اسے اپنا آن داتا سمجھنے لگے۔ وہ عیاش آدمی تھا، اپنی ہوس کو پورا کرنے کے لئے اس نے ہر رات کو ایک لڑکی اٹھانا شروع کر دی۔ رات کے اندھیرے میں غائب ہونے والی لڑکی صبح گھر پہنچ جاتی تھی مگر ایسی حالت میں کہ اس کی زبان بند ہوتی، آنکھیں پھٹی ہوئی اور وہ کچھ بھی بتانے یا سمجھانے سے قاصر ہوتی پھر اسی رات وہ بستی کے کنویں میں چھلانگ لگا کر اپنی جان دے دیتی تھی۔

بستی کے لوگوں کو معلوم ہی نہ ہو سکا کہ ان کی بیٹیاں کون لے جاتا ہے، کون انہیں لوٹا ہے اور کیوں وہ واپس آ جانے کے باوجود کنویں میں چھلانگ لگا کر اپنی جان دے دیتا ہیں

یہ آج سے دو برس پہلے کی بات ہے ہم اسی طرح سفر کرتے ہوئے یہاں پہنچے تھے ہم دور دور کے بھوکے پیاسے تھے۔ ہم دوسری طرف سے آئے تھے اس لئے چشمے کے بارے میں علم نہ تھا۔ بستی سے کچھ ہی دور ایک بڑا گھنا اور سایہ دار درخت تھا، ہم سب اسی درخت کے نیچے بیٹھے تھے، ہم نے ایک آدمی کو کھانے کا سامان لانے کے لئے بستی کا طرف بھیج دیا تھا۔ اسے گئے ابھی آدھا گھنٹا بھی نہ گزرا تھا کہ اچانک ہم نے دور سے ایک

لڑکی کو آتے دیکھا، اس لڑکی کی شاید ہم پر نگاہ نہیں پڑھی تھی۔ ہم سب اسے دیکھ رہے تھے ہمیں حیرت تھی کہ تنہا لڑکی اس ویرانے میں کہاں آ رہی ہے۔ وہ ہم سے کچھ دور پیڑوں کے ایک جھنڈ کے قریب رک گئی جو یہاں سے صاف نظر آ رہا تھا۔ ہم نہیں جانتے تھے کہ جھنڈ کے قریب کوئی کنواں ہے۔ وہ لڑکی کچھ دیر خاموش کھڑی خلاؤں میں دیکھتی رہی پھر اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ گری اور غائب ہو گئی۔

ہم سب اس طرف بھاگے اٹھے۔ قریب جا کر ہمیں معلوم ہوا کہ وہاں ایک بہت گہرا کنواں تھا اور وہ لڑکی کنویں میں چھلانگ لگا چکی ہے۔ ابھی ہم لوگوں کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا تھا کہ بستی کے بہت سے لوگ روتے پیٹتے کنویں تک پہنچ گئے۔ یہ جو بڑھا ہے نا، جس کے پیر راجہ نے چھوئے تھے۔ یہ اسی لڑکی کا باپ ہے جس نے کنویں میں چھلانگ لگائی تھی، اور رہنماں اس کی چھوٹی بہن ہے، یہ لوگ بھی بستی والوں کے ساتھ تھے اور رہنماں تو ایسے رو رہی تھی جیسے آسمان ہی گرا دے گی۔ بڑھے کی حالت خراب تھی۔ تبھی ہمیں یہ ساری داستان بستی والوں سے معلوم ہوئی راجہ تو غصے سے پاگل ہو گیا تھا۔ وہ تو پہلے ہی عورت پر ظلم کرنے والوں کو چیر پھاڑ کر رکھ دینے والا بھیڑیا تھا، یہ کہانی سن کر اس نے کچھ بھی نہ سوچا اور اسی رات ہندو بننے کے ساتھ ہی اس کے گھر کا ہر مرد موت کے گھاٹ اتار دیا۔ عورتوں اور بچوں سے اس نے کہہ دیا کہ دو دن کے اندر اندر بستی خالی کر دیں ورنہ ان کا انجام بھی ٹھیک نہ ہو گا۔

وہ لوگ اپنا سب کچھ چھوڑ کر اور جان بچا کر یہاں سے چلے گئے۔ اس روز کے بعد بستی میں امن ہو گیا۔ ساری بستی راجہ کی گرویدہ ہو گئی اور آج تک یعنی دو سال سے یہاں کسی کی جرات نہیں ہوئی کہ کسی پر ظلم کر سکے۔ ممکن ہے یہ راجہ کا خوف ہو یا..... بہرحال ہم جب بھی یہاں سے گزرتے ہیں اس بستی میں ضرور آتے ہیں۔“

خان نے اپنی بات ختم کی تو مجھے لگا جیسے میں کوئی ظلماتی کہانی سن رہا تھا۔ اس ظلماتی کہانی کا ہیرو راجہ تھا، ایک ایسا شہزادہ جو شہزادیوں کو کالے اور خوف ناک دیو سے بچاتا جس کا کوئی بھی مقابلہ نہیں کر پاتا۔ میں نے راجہ کے لئے اپنے دل میں بے پناہ محبت محسوس کی۔

”کیا اس ہنگامے میں پولیس کو کچھ خبر نہ ہوئی؟“ میں نے سوال کیا۔

”کیوں نہیں..... پولیس آئی تھی۔ اس نے اپنی سی کوشش بھی کی قاتلوں کی پکڑنے کی مگر ساری بستی نے قاتلوں سے لائق ظاہر کی۔ سبھی نے کہہ دیا کہ وہ کچھ نہیں جانتے۔ پولیس بھی ہندو بننے کے مظالم سے واقف تھی، اس کے پاس دولت کے علاوہ تعلقات کے ہتھیار بھی تھے اور ان تعلقات کی وجہ سے پولیس بھی اس پر ہاتھ ڈالنے ہوئے گھبراتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ معمول کی کارروائی کے سوا کوئی تفتیش نہ ہوئی اور کیس فائل کر دیا گیا اور اس روز کے بعد دہشتی کی ہر لڑکی محفوظ ہو گئی۔ وہ خونی کنوار پاٹ دیا گیا جس نے سارے لوگوں کو خوف زدہ کیا ہوا تھا۔“

میں لمبی سانس لے کر رہ گیا۔ رات کافی گہری ہو چکی تھی۔ آنکھیں نیند سے بو جھل ہو رہی تھیں۔ میں خاموشی سے آنکھیں بند کر کے سو گیا۔ پیدل چلنے کی تھکن نے مجھے جلد ہی بے خبر کر دیا۔

صبح ہم بستی والوں کو خدا حافظ کہہ کر پھر سفر پر روانہ ہو گئے۔ سب ہی پوری نیند سوئے تھے اس لئے سب تازہ دم تھے۔ بستی والوں نے کھانے پینے کا بہت سامان ہمارے ساتھ کر دیا تھا۔ ہم آدھے گھنٹے بعد ہی سڑک پر پہنچ گئے۔ یہاں سے ہمیں لاری اڑنے تک جانا تھا تقریباً پندرہ منٹ چلنے کے بعد ہم لاری اڑے پہنچ گئے۔

صبح سویرے کا وقت تھا، لاری اڑے پر اتار رش نہیں تھا۔ اڑے کے سامنے ایک پٹرول پمپ تھا جو اس وقت سسٹن تھا۔ دوسری طرف ایک ہوٹل تھا جس میں چند لکڑی کی کرسیاں اور میز پڑی تھیں پورے ہوٹل میں تین آدمی تھے۔ ایک میزوں، کرسیوں کی صفائی کر رہا تھا۔ ایک موٹا سا آدمی غالباً چائے بنا رہا تھا اور تیسرا آدمی بیچ پر لیٹا اوگھ رہا تھا۔

ہم سب بھی اس ہوٹل میں جا بیٹھے۔ اونگھنے والا آدمی فوراً پھرتی سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں ملیں اور فوراً ہمارے لئے مزید کرسیاں لے آیا۔ پورے ہوٹل کی کرسیاں ایک ہی دائرے میں ڈال دیں۔ جو آدمی چائے بنا رہا تھا اس نے فوراً ہمیں گن کر چھوٹے چھوٹے گلاس نکال لئے اور ہماری طرف دیکھنے لگا۔ خان نے کرسیاں لانے والے کو دس چائے کا آرڈر دیا۔

دس چائے کا آرڈر سنتے ہی موٹے آدمی کے چہرے پر ایسی طمانیت پھیل گئی جیسے اسے برا بزنس مل گیا ہو۔ اس نے سر کا اشارہ کیا اور پھرتی سے چائے بنانے لگا۔

لاری اڑے پر صرف دو لاریاں کھڑی تھیں اور دونوں کے ڈرائیور بس کے اندر ہی سیٹ پر سو رہے تھے۔ ہم جانتے تھے کہ مسافر جب تک پورے نہیں ہوں گے لاری نہیں چلے گی۔ ہم وہاں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ آہستہ آہستہ مسافر آنا شروع ہو گئے۔ ہوٹل کے تمام بیچ اور کرسیاں بھرنے لگیں بلکہ ہوٹل والے کو اپنی چارپائی بھی وہاں ڈالنا پڑی۔ ذرا دیر بعد میری نگاہ لاری کی طرف اٹھی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ ڈرائیور تیار ہے یا نہیں کہ اچانک نہ معلوم کیوں اس لڑکی کو دیکھ کر بے چین ہو گیا۔ وہ سفید چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ اس کے ساتھ ایک عورت اور ایک مرد بھی تھا۔ عورت کی آنکھوں میں چوکنہ پن تھا۔ مرد کی آنکھوں کی عیاری بھی صاف محسوس ہو رہی تھی مگر لڑکی کی آنکھوں میں خوف کے ساتھ ساتھ بے طرح معصومیت تھی۔ نہ جانے کیوں اس کی خوف زدہ نگاہوں نے مجھے بے چین کر دیا۔

اس کے ساتھ والی عورت نے اسے کچھ کہا، وہ اور خوف زدہ ہو گئی اس نے چادر کو سر پر کچھ اور جھکا لیا اور سمٹ کر بیٹھ گئی۔ مجھے اس عورت کے بات کرنے کا انداز اور مڑ کے چاروں طرف دیکھنے کا انداز کچھ عجیب سا لگا۔ یوں جیسے وہ کچھ چھپا رہے ہیں، میں نے غور سے ان کی حرکات کو نوٹ کرنا شروع کر دیا۔

وہ لڑکی جب بھی سر اٹھا کر کسی طرف دیکھتی، عورت اسے کہنی مارتی اور اس کی طرف دیکھے بغیر کچھ زیر لب کہتی جسے سن کر لڑکی کا رنگ سفید ہو جاتا اور وہ جلدی سے چہرہ جھکا کر بیٹھ جاتی۔ میری بے چینی شدید ہو گئی تو میں نے خان کی توجہ اس جانب دلائی۔ پہلے تو خان نے ہنس کر ٹال دیا مگر کن آنکھوں سے ان کی جانب دیکھ لیتا تھا۔ پھر اچانک ہی وہ چوکنہ ہو گیا۔ اس نے راجہ کے کان میں کچھ کہا۔ میں نے دیکھا کہ خان کی بات سن کر راجہ نے بھی اس طرف دیکھنا شروع کر دیا ہے جہاں وہ تینوں بیٹھے تھے۔ اس کی آنکھوں میں حسرت محسوس تھی۔ اس کے جڑے بچھنے ہوئے تھے۔

اچانک ڈرائیور نے آواز لگائی، لوگ اپنا سامان اٹھا کر لاری کی طرف بڑھ گئے۔ ہم سب لوگ بھی لاری میں جا بیٹھے۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ مجھ سے آگے والی سیٹ پر وہ عورت

اور لڑکی بیٹھے تھے۔ مرد ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا، خان اپنی سیٹ چھوڑ کر اس مرد کے برابر میں جا بیٹھا۔

بے چینی پھر مجھ میں سراٹھانے لگی۔ لگتا تھا جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ لاری چل پڑی، جو لوگ اب تک زور زور سے بول رہے تھے، لاری چلتے ہی خاموش ہو گئے۔ بعض لوگ تو اونگھنے لگے تھے۔ میری نگاہیں سامنے والی سیٹ پر نکلی ہوئی تھیں، وہ معصوم صورت پہلو پر پہلو بدل رہی تھی۔ وہ کھڑکی کی طرف بیٹھی تھی۔ اس کا شیشہ بند تھا۔ شیشے پر اس کا عکس صاف نظر آ رہا تھا۔ نہ معلوم کیوں مجھے لگا جیسے اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں بھرا پانی سورج کی کرنوں سے چمک رہا ہے۔ ایک شعاع سی نکلتی اور مجھ میں پھیل جاتی تھی۔ مجھے سوہنی کی آنسو بھری آنکھیں یاد آ رہی تھیں۔ میں اس کے خیالوں میں کھو گیا۔ ”سیدھی بیٹھ حرام خور..... زیادہ مظلومیت نہ دکھا، ٹھیک سے بیٹھ، اگر کسی نے روتے دیکھ لیا تو..... یاد رکھ جان سے مار دوں گی۔“

لڑکی کے برابر بیٹھی عورت نے غالباً کہنی مار کر لڑکی سے کہا تھا۔ لڑکی نے لمحہ بھر کو پہلو بدلا اور سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ میں نے چونک کر راجہ کی طرف دیکھا راجہ اسی جانب کان لگائے بیٹھا تھا۔ بہ ظاہر اس کی نگاہیں کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھیں مگر اس کے چہرے سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا دھیان اسی لڑکی اور عورت کی طرف تھا۔

”پی..... پیاس لگی ہے۔“ لڑکی کی لرزتی ہوئی آواز آتی۔
”چپ بیٹھ..... اسٹاپ آئے گا تو ملے گا پانی..... میں کیا منکا لے کر چلی ہوں تیرے لئے۔“ اسی عورت نے غرا کر جواب دیا۔

”میرا حلق.....“ اس نے گلے پر ہاتھ رکھ کر دبے دبے لہجے میں کہا۔
”گھونٹ دوں گی تیرا حلق حرامزادی.....“ تو نے جس مصیبت میں ڈالا تھا ہمیں اگر وہ راشی نہ ملتا تو جانے کیا ہوتا۔ چپ چاپ بیٹھی رہ۔“ اس عورت کے انداز میں نفرت بھری تھی۔
وہ لڑکی کسمسا کر رہ گئی۔

راجہ نے پہلو بدلا۔ اس کے جبڑے بھینچ گئے۔ اس کے منہ سے عجیب سی غراہٹ نکلی۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، خان کے چہرے پر بھی پریشانی پھیل گئی تھی۔ یہاں

کوئی ہنگامہ کرنا خطرناک بھی ہو سکتا تھا مگر راجہ کا کچھ پتا نہ تھا۔ نہ معلوم کب وہ اپنا ہوش کھو بیٹھا اور کوئی نئی پریشانی کھڑی ہو جاتی۔ میں نے راجہ کی طرف دیکھا اس نے بہت جلد خود کو نارمل کر لیا تھا۔ مجھے اس کی سمجھ داری سے خوشی ہوئی۔

کچھ دیر بعد لاری رک گئی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے، میں تو پہلی بار اپنے گاؤں سے باہر نکلا تھا۔ لاری جہاں رکی تھی وہاں ایک چھوٹا سا ریسٹوران تھا تقریباً گیارہ بجے تھے۔ ہم سب لاری سے نیچے آ گئے۔ ایک طرف گھنے درخت کے نیچے کچھ کرسیاں پڑی تھیں۔ ہم سب وہاں بیٹھ گئے۔ بہت سے مسافر لاری ہی میں بیٹھے رہے۔ ہوٹل سے چائے منگوا کر ہم چائے پینے لگے۔ میری نگاہ اس کھڑکی کی جانب اٹھ گئی جہاں لڑکی بیٹھی تھی وہ اب تک وہیں تھی البتہ اس کے ساتھ والی عورت کہیں دکھائی نہ دی۔ خان کے برابر بیٹھا مرد بھی کہیں دکھائی نہ دیا۔

میں راجہ سے ایک منٹ کی اجازت لے کر اٹھ گیا۔ میں سیدھا ریسٹوران میں گیا اور یہ دیکھ کر میرا خون کھول گیا کہ وہ عورت اور مرد دونوں وہاں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ میں گلاس میں پانی لے کر باہر آ گیا۔ میں سیدھا اس کھڑکی کی جانب بڑھ گیا۔ لڑکی میرے ہاتھ میں پانی کا گلاس دیکھ کر ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی اور حسرت سے گلاس کو دیکھ رہی تھی۔

”پانی.....“ میں نے گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
”جی..... جی..... یہ میرے لئے.....؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔
”جی ہاں..... آپ کو پیاس لگی تھی نا؟“

”جی.....“ اتنا کہہ کر اس نے جلدی سے گلاس میرے ہاتھ سے لے لیا اور ایک گھونٹ میں سارا گلاس خالی کرنے کی میری طرف بڑھا دیا۔ ”اور..... اور پانی۔“
مجھے دکھ ہوا..... وہ اس قدر پیاسی تھی اور وہ عورت..... میرا جی چاہا کہ میں اس عورت کا گلا گھونٹ دوں۔ میں پھر ریسٹوران میں گیا اور گلاس بھر کر پانی لے آیا۔ اس نے دوسرا گلاس بھی جلد ہی خالی کر کے میری طرف بڑھا دیا۔

”شکریہ بھیا..... بہت پیاس لگی تھی۔“ اس نے ہونٹ صاف کرتے ہوئے کہا۔
”آپ کہاں جا رہی ہیں؟“

”جی..... پپ..... پتا نہیں.....“ اس نے جواب دیا اور گھبرا کر ریستوران کی طرف دیکھنے لگی۔

”آپ کو نہیں پتا کہ آپ کہاں جا رہی ہیں؟“ میں نے کن انکھیوں سے ریستوران کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

وہ اور زیادہ گھبرا گئی۔ وہ بار بار ریستوران کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اس عورت اور مرد سے ڈر رہی ہے۔

”آپ کے ساتھ کون ہے؟“

”جی..... وہ..... وہ جو عورت یہاں تھی نا..... وہ..... آپ چل جائیں..... وہ آگے تو.....“ وہ روہانسی ہو گئی۔

”آپ ان سے ڈرتی ہیں؟“ میں نے اس کی گھبراہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”جی..... وہ مجھے بہت ماریں گے..... بس آپ چلے جائیں۔“ اس نے ان کہہ کر منہ پھیر لیا۔

میں نے اس طرف نگاہ ڈالی جہاں راجہ اور اس کے دوسرے ساتھی بیٹھے ہوئے تھے۔ سب کی نگاہیں میری جانب اٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک نظر اس لڑکی کی طرف دیکھا جو سر جھکائے بیٹھی تھی۔

میں قدم بڑھانے والا تھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو کا ایک ننھا سا قطرہ ٹپک گیا۔ ”جو کچھ ہے مجھے بتائیے“ میں آپ کی مدد کروں گا۔“ میں نے کھڑکی سے قریب ہو کر کہا۔

”میری کوئی مدد نہیں کر سکتا، پلیز.....“ آپ چلے جائیے۔“ اس نے آنسو پونچھتے ہوئے سرگوشی کی اور کھڑکی سے دور ہو کر بیٹھ گئی۔ اس وقت ریستوران سے وہ عورت اور مرد باہر آ گئے۔ اب وہاں رکنابیکار تھیں اپنے ساتھیوں کے پاس چلا آیا۔

راجہ نے استغفامیہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

”کوئی گڑبڑ ہے۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”ہوں..... یہ تو میں جانتا ہوں پر کیا گڑبڑ ہے، کچھ بتایا اس نے؟“ راجہ -

پوچھا۔

”نہیں..... وہ بہت خوفزدہ ہے۔“

”دنیا کی ہر لڑکی خوفزدہ ہوتی ہے، مگر بات کیا ہے؟“

”میرا خیال ہے وہ عورت اس کی کوئی نہیں ہے۔ شاید اسے اغوا.....“

”اونہ..... جب اس نے کچھ بتایا ہی نہیں تو خواخواہ قیاس آرائی سے فائدہ!“ خان نے منہ بنا کر کہا۔

”پھر کیا بات ہوئی؟“ راجہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ سب مسافر لاری کی طرف جا رہے تھے۔ ہم سب بھی اس طرف چل دیئے۔

میں نے راستے میں راجہ کو اپنی اور اس کی گفتگو بتائی۔ لاری میں ہم پھر اسی طرح بیٹھ گئے۔ وہ لڑکی اور عورت میرے سامنے والی سیٹ پر تھیں، اور راجہ کا سارا دھیان اسی طرف تھا۔

لاری آہستہ روی سے سیاہ سڑک پر چل رہی تھی۔ ہلکے ہلکے جھکولے اونگھ طاری کر رہے تھے۔ میرا ذہن ماضی کے درپچوں سے دور تک دیکھنے سننے اور محسوس کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

آج میں شہر جا رہا تھا۔ شہر، جہاں کا خواب میرے بوڑھے ماں باپ نے دیکھا تھا۔ وہ شہر لے جا کر اپنے بیٹے کو بابو بنانا چاہتے تھے، تعلیم دلانا چاہتے تھے تاکہ ان کا بیٹا سرکاری

دفتر میں اونچی کرسی پر بیٹھ کر کام کر سکے مگر اس خواب کی تعبیر کیسی بھیانک تھی۔ میں شہر تو جا رہا تھا مگر ڈاکو بن کر، مجھے یقین ہے میرے ماں باپ کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ

ان کا سیدھا سادہ اور فرماں بردار بیٹا ایک روز ڈاکو بن جائے گا

ٹھیک ہے کہ میں نے اب تک کسی کو نہیں لوٹا تھا۔ کسی گھر سے کچھ نہیں چرایا تھا مگر میں ایک بات جانتا تھا کہ میں ان لوگوں کی پناہ میں تھا جو ڈاکو کہلاتے تھے۔ جنہوں نے

لوگوں کو لوٹا تھا اور جن کو عام لوگ اور پولیس ڈاکو کے نام سے یاد کرتی تھی۔ مجھے بھی پولیس سے بچنا تھا۔

ہم رات گئے ایک ایسے علاقے میں داخل ہو گئے جہاں کی روشنیاں دور سے ستاروں کا جھنڈ معلوم ہو رہی تھیں۔ میں نے اتنی زیادہ روشنیاں کبھی بھی نہیں دیکھی تھیں۔ میرے گھر میں تو لائٹ ہی نہیں تھی، میں تو حویلی میں جلنے والی چارپانچ تیلوں کو ہی

میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا تھا کہ وہ عورت تیز قدموں سے بڑھتی ہوئی لاری سے نیچے اتر گئی۔ میں اس کے پیچھے لپکا۔ لاری سے اتر کر میں نے ادھر ادھر دیکھا پھر اچانک میری نگاہ ایک ٹیکسی پر پڑی۔ وہ دونوں اس میں بیٹھ چکی تھیں۔ مرد پہلے ہی اگلی سیٹ پر براجمان تھا۔ وہ لڑکی میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں التجا تھی، پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے ٹیکسی آگے بڑھ گئی۔ میں ہاتھ میں کانڈ کا پرزہ لئے کھڑا رہ گیا۔

”کیا ہے..... ہونق بنا کیوں کھڑا ہے؟“ راجہ نے میری پشت پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

”وہ..... راجہ وہ لڑکی.....“

”ابے تو اب تک اس لڑکی کے چکر میں پھنسا ہوا ہے۔ میں خواہ مخواہ کسی کے معاملے میں ٹانگ نہیں اڑاتا۔ ہاں اگر اس نے کہا ہوتا تو.....“ راجہ نے میری بات کاٹ کر کہا۔

”یہ کانڈ دیا تھا اس نے..... اترتے وقت..... معلوم نہیں کیا ہے، مجھے تو پڑھنا نہیں آتا۔“ میں نے کانڈ راجہ کی طرف بڑھا دیا۔

راجہ نے میرے ہاتھ سے کانڈ جھپٹ لیا اور اونچی آواز میں پڑھنے لگا۔ ”میرا نام سکیڈ ہے۔ یہ لوگ مجھے زبردستی ہیرا منڈی لے جا رہے ہیں مجھے بچالو۔“

یہ سنتے ہی میں نے پلٹ کر اس طرف دیکھا جس طرف وہ ٹیکسی گئی تھی۔ اب وہاں ہزاروں گاڑیاں تھیں مگر وہ ٹیکسی نہیں تھی۔

”تُو نے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا!“ راجہ نے تیز لہجے میں کہا۔ اتنی دیر میں ہمارے سب ساتھی آگئے۔ خان شاید منہ دھونے چلا گیا تھا۔ وہ کچھ دیر بعد منہ پونچھتا ہوا واپس آیا تو راجہ نے اسے سب کچھ بتا دیا۔

”خان وہ لوگ اسے زبردستی اسے لے گئے ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ شاید اسے اغوا کیا گیا ہے۔“ اب کیا ہو گا۔

”کچھ نہیں ہو گا۔ جب ہم ہیرا منڈی جائیں گے تو اسے بھی دیکھ لیں گے۔“ خان نے نارمل انداز میں جواب دیا۔

”کیا تم جانتے ہو کہ اسے کہاں لے گئے ہیں۔“ میں نے خوش ہو کر پوچھا۔

چراغوں سمجھتا رہا تھا اتنی بہت سی بتیاں دیکھ کر حیران رہ گیا۔

لاری شہر میں داخل ہوئی تو یوں لگا جیسے ہم شور و غل کے سمندر میں اتر گئے ہوں۔ سڑکوں پر ہزاروں لوگ تھے۔ بہت سی گاڑیاں تھیں، سینکڑوں دکانیں تھیں۔ میرے اندر ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ میں دونوں جانب کی کھڑکیوں سے باہر دیکھ رہا تھا، کبھی ایک کھڑکی سے کبھی دوسری کھڑکی سے

”شہر پہلی بار آیا ہے؟“ راجہ نے شاید میری حرکتوں سے محسوس کر لیا تھا۔

”ہاں..... یہاں تو بہت رش ہے۔“ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”اچھی طرح شہر گھوم لینا ورنہ تیرے چہرے پر جی حیرت ہم سب کو پکڑوا دے گی سمجھے! گاؤں سے تیرے فرار کی اطلاع شہر پہنچ چکی ہو گی۔“

راجہ کی بات سن میں فح ہو گیا۔ ساری حیرت اور ساری خوشی ہوا ہو گئی۔ ”پھر..... مجھے یہاں کیوں لے آئے؟“ میں نے ذوقی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”یہاں کچھ لوگوں سے حساب بیاق کرنا ہے۔ پھر کیا تو ساری عمر جنگلوں میں گزارنا چاہتا ہے! خود کو نارمل رکھ کچھ نہیں ہو گا۔“ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”کیا رکھوں؟“

”نارمل..... یعنی ٹھیک رکھو..... میرا مطلب ہے اتنی حیرت سے ہر چیز کو نہ دیکھ۔ خواہ مخواہ لوگوں کی نظروں میں آجائے گا۔“ اس نے جواب دیا۔

میں نے گھبرا کر اپنی نگاہیں جھکا لیں۔ لاری کی رفتار اور آہستہ ہو گئی تھی۔ رش بہت زیادہ تھا۔ میں خود کو بقول راجہ کے نارمل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ذرا دیر بعد لاری ایک جگہ رک گئی۔ سب مسافر اپنا اپنا سامان اٹھا کر اترنے لگے۔ میرے سامنے بیٹھی ہوئی عورت اور لڑکی بھی کھڑی ہو گئیں۔ ان کے ساتھ کا مرد پہلے ہی لاری سے اتر چکا تھا۔ عورت لڑکی کا ہاتھ پکڑے اس سے آگے آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسی وقت کسی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ وہ لڑکی باقی نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے کانڈ کا ایک پرزہ میری مٹھی میں دبا دیا۔ ابھی

وہ سب ہی ہنس پڑے۔ میں جھینپ گیا۔

”ہاں جانتے ہیں..... وہاں ہر لڑکی ایسے ہی لائی جاتی ہے۔“ خان نے ہنس کر کہا۔ مجھے یہ سن کر بہت حیرت ہوئی بلکہ یہ دیکھ کر زیادہ حیرت ہوئی کہ ان سب کو معلوم ہے کہ وہاں لڑکیاں اغوا کر کے لائی جاتی ہیں پھر بھی یہ ان کی مدد نہیں کرتے۔ حالانکہ راجہ نے کہا تھا کہ وہ ظالموں کا دشمن ہے۔ ان لڑکیوں کو اغوا کرنے والے ظالم ہی تو تھے پھر..... میں سوچتا رہ گیا۔

”چل بعد میں دیکھیں گے۔“ راجہ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

خان ایک ٹیکسی والے سے بات کر رہا تھا۔ اس نے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مگر نے دوسری ٹیکسی بھی روک لی تھی۔ ہم دونوں ٹیکسیوں میں آگے پیچھے چل پڑے۔ تقریباً بیس پچیس منٹ بعد ہم ایک ایسے علاقے میں داخل ہو گئے۔ جہاں بڑے بڑے گھر بنے ہوئے تھے۔ میں حیران تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں سب سے بڑا گھر صرف چوہدری کا دیکھا تھا، جسے سب کی حویلی کہتے تھے مگر یہاں تو اس سے بھی بڑے اور خوبصورت گھر بنے ہوئے تھے۔

ہماری ٹیکسی ایک خوبصورت سے گھر کے سفید گیٹ پر رک گئی۔ دوسری ٹیکسی بھی ہمارے پیچھے ہی رک گئی تھی۔ خان نے دونوں ٹیکسیوں کو کرایہ دیا اور سفید گیٹ کی طرف بڑھ گیا، ہم سب اس کے پیچھے تھے۔

ذرا دیر بعد اس نے گیٹ کے دائیں جانب لگا بٹن دبایا جس کے ساتھ ہی کہیں دور سے گھنٹیاں سی جھتی سنائی دیں۔ کچھ دیر بعد ایک آدمی گیٹ کے قریب آیا، اس نے ایک نگاہ ہم سب پر ڈالی پھر راجہ کو دیکھ کر مسکرایا اور گیٹ کھول دیا۔ ہم ایک دوسرے کے پیچھے چلتے ہوئے اس اونچے سے برآمدے تک پہنچ گئے جو سامنے ہی نظر آ رہا تھا اور جس میں بید کی کرسیاں پڑی تھیں، کرسیوں کے بیچوں بیچ ایک بڑی گول میز پڑی تھی جس پر بہت سے اخبار اور رسالے رکھے تھے۔

گیٹ کھولنے والے شخص نے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم سب وہیں بیٹھ گئے۔ وہ شخص دوبارہ اندر چلا گیا۔ برآمدے میں بڑے بڑے فانوس جل رہے تھے، میں نے فانوس بھی پہلی بار دیکھے تھے میں حیرت سے انہیں تک رہا تھا کہ اچانک راجہ نے میرے پیر پر پیر

ارا۔ میں چونک پڑا۔ اس نے مجھے گھورا اور میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور ایک کچیم کچیم آدھی باہر آ گیا۔ وہ سفید شلوار قمیض پہنے ہوئے تھا۔ گورا رنگ، سیاہ بال اور گھنی داڑھی میں وہ بہت پُر وقار لگ رہا تھا۔ راجہ کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ راجہ انہیں دیکھ کر کھڑا ہو گیا، اس کی تقلید میں ہم سب بھی کھڑے ہو گئے تھے۔ آنے والے شخص نے راجہ کو سینے سے لگا لیا۔

”کیسے ہو بیٹا۔ بہت روز ہو گئے تھے، میں تو تمہاری طرف سے پریشان ہو گیا تھا، اور

یہ تم لوگوں نے حلیہ کیا بنایا ہوا ہے!“ اس نے انتہائی شفیق لہجے میں پوچھا۔

”بس جی..... بڑا لمبا سفر کر کے آئے ہیں۔ سیدھے یہیں آ گئے اس

لئے.....“ راجہ نے بات ادھوری چھوڑ دی اس کے چہرے پر شرمندگی تھی۔

”اچھا کیا کہ یہاں آ گئے۔ یہ بھی تمہارا گھر ہے۔ چلو پہلے تم لوگ نمدھولو پھر کھانے

کی ٹیبل پر باتیں ہوں گی۔“ یہ کہہ کر انہوں نے کسی یعقوب کو آواز دی۔ یعقوب ایک

مضبوط بدن کا ٹھکنا سا آدمی تھا۔ وہ آتے ہی ذرا سا جھکا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

”یعقوب، پچھلے حصے کو کھول دو، کمروں کی صفائی کراؤ اور ان لوگوں کے نہانے کا

بندوبست کرو۔ یہ سب یہیں رہیں گے۔“ انہوں نے ہم سب کو محبت سے دیکھتے ہوئے

کہا۔ یعقوب پھر جھکا اور واپس چلا گیا۔ اسی وقت گیٹ کھولنے والا شخص ایک ٹرائی میں

چائے اور ٹھنڈی بوتلیں لے آیا۔

”بھئی تم لوگوں کو جو پسند ہو لے لو۔“

”آپ نے تکلف کیا بیگ صاحب!“ راجہ نے کہا۔

”ارے..... یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ تم لوگوں کے لئے میں تکلف کروں

گا، چلو پی لو پھر یعقوب تمہیں تمہارے کمروں تک پہنچا دے گا اور ہاں..... کپڑے

وغیرہ ہیں تمہارے پاس؟“

”نہیں بیگ صاحب..... ہم نے بتایا تھا نا کہ ہم سیدھے.....“

”اچھا اچھا ٹھیک ہے.....“ انہوں نے راجہ کی بات کاٹ دی۔ ”وہ بھی ہو جائے

گا۔ ”وہ مسکرائے اور خان سے مخاطب ہوئے۔ ”اور خان بیٹا تم کیسے ہو..... اور ہاں تمہارے باپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟“

”جی ان کا تو انتقال ہو گیا تھا۔“

”ہیں..... کیسے؟“ وہ تقریباً اچھل پڑے۔

”جی..... بس..... وہ..... انہیں زہر دے دیا گیا تھا۔“ خان نے سر جھکا کر

جواب دیا۔

”اوہ..... تو کیا قادر نے.....“

”جی.....!“ خان نے بات پوری ہونے سے پہلے جواب دیا۔

میں یہ سب گفتگو حیرت سے سن رہا تھا کہ اچانک دروازہ کھلا اور میں حیران رہ گیا۔

میں نے عورت کا یہ روپ پہلی بار دیکھا تھا۔ یوں تو میں نے سبھی کچھ پہلی بار دیکھا

تھا مگر عورت کا یہ انداز میں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا۔ وہ ایک خوبصورت اور

گوری چٹھی عورت تھی بلکہ لڑکی تھی مگر اس نے مرزا نہ لباس پہنا ہوا تھا۔ کالی پیٹت اور

سفید دھاریوں والی کالی شرٹ اور کالے ہی رنگ کے کپڑے کے بوٹ تھے۔ مردانہ لباس

پر اس کے بڑے بڑے اور گھنے بال بہت عجیب لگ رہے تھے جو اس نے کھول کر پشت پر

ڈالے ہوئے تھے۔

”انکل.....“ اس نے کہا پھر وہ ہم سب کو دیکھ کر جھجک گئی۔

”ہاں بیٹا، کیا بات ہے، بولو یہ سب میرے بیٹے ہیں۔“ بیگ صاحب نے شفقت سے

کہا۔

انکل مجھے ایرپورٹ جانا ہے اور گاڑی ابھی تک نہیں آئی۔ وقار کا کہیں پتا نہیں

ہے، میں ہر جگہ ٹیلی فون کر چکی ہوں۔ اگر ہمیں دیر ہو گئی تو..... بہت برا ہو گا۔“ اس

نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔

”ہوں.....“ بیگ صاحب نے پُر سوچ انداز سے اسے دیکھا۔

”ایئرپورٹ پر کون ہے؟“

”کوئی فیصل مسعود نام کا آفیسر ہے۔“

”ٹھیک ہے تم میری گاڑی لے جاؤ۔ میں قدیر کو فون کرتا ہوں، وہ پہنچ جائے گا۔“

قدیر کو پہچانتی ہوں..... جس کے بالوں کی ایک لٹ بالکل سفید ہے؟“

”جی ہاں انکل..... مگر پیلز جلدی کیجئے گا۔ اگر دیر ہو گئی تو.....“

”تم فکر نہ کرو۔ جاؤ میں ابھی فون کرتا ہوں۔“ انہوں نے جیب سے گاڑی کی

چابیاں نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

اور میں ہونقوں کی طرح اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا جو نہ صرف مردانہ کپڑے پہنے

ہوئے تھی بلکہ مردوں کی طرح گاڑی چلاتی ہوئی گیٹ سے باہر نکل گئی تھی

میں گیٹ پر اڑتی ہوئی دھول کو دیکھ رہا تھا کہ بیگ صاحب کی آواز نے مجھے چونکا

دیا۔

”بیٹا تم لوگ یعقوب کے ساتھ چلے جانا، نما دھو کر آرام کرنا پھر کھانے کی سیٹیل پر باقی

باتیں ہوں گی ٹھیک ہے!“ راجہ اور خان کے ساتھ ساتھ ہم لوگوں نے بھی سر ہلایا۔ وہ

اٹھ کر اندر چلے گئے۔

کچھ دیر بعد ہی یعقوب آگیا۔ ہم سب اس کے ساتھ بنگلے کے پچھلے حصے میں آ گئے۔

جہاں غالباً صرف مہمانوں کے ٹھہرنے کو کمرے بنے ہوئے تھے۔ یہ سب کمرے ایک ہی

لائن میں تھے، ہر کمرے میں دو بیڈ اور دو کرسیوں کے علاوہ ایک گول سی میز اور ایک ایسی

ٹیبیل بھی تھی جس پر آئینہ لگا ہوا تھا۔

پانچ کمرے تھے اور ہم سب دس آدمی تھے۔ ہر کمرے میں دو دو آدمی رہ سکتے تھے۔

میری خواہش تھی کہ خان میرے ساتھ رہے۔ خان نے بھی شاید میرے احساسات کو

محسوس کر لیا تھا وہ مسکرا کر میرے ساتھ آگیا۔

”میں تیرے ساتھ اس لئے آیا ہوں کہ تجھے ان سوالوں کے جواب دے سکوں جو ہر

وقت تیری آنکھوں میں اٹلتے رہتے ہیں۔“ اس نے ہنس کر کہا۔

میں بھی ہنس کر چپ ہو گیا۔ ہر کمرے میں ایک غسل خانہ تھا جسے خان نے ہاتھ

روم کہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ہاتھ روم جا رہا ہوں راجہ پوچھتے تو بتا دینا۔ باقی سب لوگ

بھی کمروں میں چلے گئے تھے۔ کچھ دیر بعد یعقوب ہاتھوں میں ایک گٹھرا سا اٹھائے ہوئے

آیا۔ میں نے دیکھا وہ کپڑے تھے اس نے دو جوڑے شلوار قمیض میرے بیڈ پر رکھ دیئے

اور بولا۔ ”ایک جوڑا خان کو دے دینا اور ایک تم پہن لینا۔“

ہلکے آسمانی رنگ کا سوٹ میں نے اپنے لئے رکھ لیا۔ مجھے یہ رنگ بہت پسند تھا اور میں ہمیشہ سوچا کرتا تھا کہ اگر کبھی قسمت نے ساتھ دیا تو اس رنگ کے کپڑے بنواؤں گا۔ کچھ دیر بعد خان نما کر تولیہ لپیٹے ہوئے باہر آگیا۔ ”کپڑے آگئے؟“

”ہاں خان..... یہ لوگ بہت اچھے ہیں۔ اتنے امیر ہیں مگر رعب بالکل نہیں جھاڑتے اور دیکھو تو وہ یعقوب میرے لئے بھی کپڑے دے گیا ہے۔ مگر سنو..... ایسا تو نہیں کہ بیگ صاحب بھی چوہدری کی طرح بعد میں قرضہ وصول کرنے کے لئے ہمیں غلام بنالیں۔“ میں نے اپنی تشویش ظاہر کی۔

”ارے نہیں.....“ وہ ہنس دیا۔ ”یہ لوگ ایسے نہیں ہیں۔ بیگ صاحب بھی ظالموں کے دشمن ہیں، وہ ہماری ہر طرح مدد کرتے ہیں۔ دراصل ان کا بہت بڑا بزنس ہے۔ روپے پیسے کا تو حساب ہی نہیں ہے، راجہ نے ایک مرتبہ ان کی جان بچائی تھی بس اسی وقت سے انہوں نے راجہ کو اپنا بیٹا بنالیا تھا۔ ہم سب بھی راجہ کے ساتھ تھے، ہمیں بھی وہ بچوں کی طرح چاہتے ہیں۔“ خان نے کپڑے پہنتے ہوئے بتایا۔

”بزنس کیا ہوتا ہے؟“

کاروبار..... ان کا کارخانہ ہے جہاں کپڑے کی چیزیں بنتی ہیں جو یہ پاکستان سے باہر بھیجتے ہیں۔

”یہ تمہارے والد کو بھی جانتے ہیں کیا؟“

”جانتے تو نہیں ہیں مگر ان دنوں میرا باپ ہسپتال میں تھا، میں راجہ اور منگی ہسپتال جا رہے تھے کہ راستے میں ایک شخص نے جو جھاڑیوں میں چھپا ہوا تھا، بیگ صاحب پر فائرنگ کر دی تھی۔ ہم قریب ہی تھے۔ راجہ نے عقاب کی طرح اس شخص کو دبوچ لیا تھا۔ گولی بیگ صاحب کی گاڑی کے اگلے شیشے پر لگی تھی مگر بیگ صاحب بال بال بچ گئے تھے۔ انہوں نے اتر کر ہمارا شکریہ ادا کیا اور اپنی گاڑی میں ہمیں ہسپتال چھوڑا تھا۔ ہم نے ان سے کہا تھا کہ ہمیں ہسپتال جانا ہے ورنہ وہ تو ہمیں اپنے ساتھ گھر لانا چاہتے تھے۔“

”اور وہ آدمی..... جس نے گولی چلائی تھی؟“

”اسے ہم نے باندھ کر ڈوکی میں ڈال دیا تھا۔ اسے بیگ صاحب اپنے ساتھ ہی لے

گئے تھے کہہ رہے تھے کہ اسے پستول سمیت تھانے میں پہنچاؤں گا۔“

”اور.....“

”بس.....“ خان نے ہاتھ اٹھا کر میری بات کاٹ دی۔ ”اب بس کر ساری باتیں آج ہی پوچھ لے گا! جا کر نما اور کپڑے بدل۔ ابھی بیگ کا بلاوا آجائے گا۔“

میں سعادت مندی سے غسل خانے چلا گیا۔ نہادھو کر اور نئے کپڑے پہن کر میں خود کو ہلکا چمکا محسوس کر رہا تھا۔ جب میں نے خود کو پورے قد کے آئینے میں دیکھا تو لمحہ بھر کو ٹھنک کر رہ گیا، میں تو خود کو بھی نہیں پہچان پایا تھا۔

”واہ..... پورا شہزادہ نکلا ہے تو تو!“ خان نے ستائشی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ میرے کندھے اونچے ہو گئے۔ وہ ہنس پڑا۔ ”ہمارے ساتھ رہے گا تو یہی عیش ہوں گے۔“

”سچ خان، میں تو پہلی بار دنیا دیکھ رہا ہوں۔ کاش صفرا اور..... اماں ابا بھی ہوتے تو..... تو.....“

”بس اب رونے کی کوشش نہ کرنا۔“ خان نے تنبیہ کی۔

میں نے فوراً خود کو سنبھال لیا۔ اسی وقت یعقوب آگیا۔

”کھانا کھالیں۔ صاحب انتظار کر رہے ہیں۔“

ہم دونوں باہر آئے تو باقی ساتھی بھی تیار تھے۔ راجہ نہادھو کر بہت ہی اچھا لگ رہا تھا۔ اس کا رنگ نکھر آیا تھا اور بالوں سے مٹی نکلی تو وہ اور زیادہ سیاہ لگنے لگے تھے۔ ہم سب یعقوب کے پیچھے چلتے ہوئے ایک بہت بڑے کمرے میں پہنچے جہاں ایک بہت ہی بڑی میز رکھی تھی۔ اس میز کے گرد بارہ کرسیاں رکھی تھیں اور کالج کے خوبصورت برتن پوری ٹیبل پر رکھے ہوئے تھے۔ کمرے میں عجیب سی خوشبو پھیلی تھی۔ ایک بہت بڑا فانوس ٹیبل کے پیچوں بچ لٹک رہا تھا۔ دائیں جانب دیوار کے ساتھ ایک بہت بڑی الماری رکھی تھی جس پر سامنے کی طرف شیشہ لگا تھا اور اندر رکھے خوبصورت چینی کے برتن شیشے میں سے صاف نظر آ رہے تھے۔ اسی الماری پر ایک بڑے سے منہ کے برتن میں رنگ برنگے بھول سجے ہوئے تھے۔ مجھے تو یوں لگ رہا تھا جیسے میں کسی ایسے محل میں آگیا ہوں جیسے محل کے قلعے مجھے اماں سنایا کرتی تھی۔ مگر وہ محل تو دیو کے ہوتے تھے، وہی دیو جو شہزادیوں

مگر میں تو امیر لوگوں سے پہلے ہی بہت ڈرا ہوا تھا۔ بظاہر شفقت دکھانے والے کیسے کیسے ظالم ہوتے ہیں اس کا اندازہ تھا مگر میرا حلق خشک ہو گیا تھا۔

”بیگ صاحب، میں کل بتاؤں گا آپ کو اس سلسلے میں۔ دراصل بالے.....“

”ہاں ہاں ٹھیک ہے۔“ انہوں نے راجہ کی بات کاٹ دی۔ ”تم بات کر لینا۔ مجھے یقین ہے بلا بیٹا انکار نہیں کرے گا۔“ انہوں نے مجھے محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ چائے پی کر ہم سب اٹھ گئے اور پھر اپنے کمروں میں چلے آئے۔ میں اور خان ابھی بیٹھے ہی تھے کہ راجہ آگیا۔ وہ مجھے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

”کیوں بالے..... بیگ صاحب کے ساتھ رہے گا؟“

”میں ان کو نہیں جانتا.....“

”تو ہمیں کون سا جانتا ہے؟“ اس نے حسبِ عادت اکھڑے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

میں لاجواب رہ گیا۔

دیکھ بالے..... ہمارے پیچھے ہر وقت پولیس رہتی ہے، ہم جنگلوں، بیابانوں میں بھوکے پیاسے چھپتے پھرتے ہیں، کبھی پولیس ہمیں گھیر لیتی ہے اور کبھی ہمارے دشمن، گولیاں چلتی ہیں تو جان کے لالے پڑ جاتے ہیں ہماری زندگیوں کا کوئی بھروسہ نہیں، تو یہاں رہے گا تو ہر طرح محفوظ رہے گا۔“

”مگر راجہ میں یہاں..... تیرے ساتھ اس لئے تو نہیں آیا تھا کہ یہاں آکر دشمنوں سے چھپ کر بیٹھ جاؤں۔ مجھے تو بدلہ لینا ہے، تو نے ہی تو کہا تھا کہ صفرا کو بھول مت جانا، اگر بھول گیا تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔“

”میں کب کہتا ہوں کہ اسے بھول جاؤ، وہ تو ہم سب کو یاد رہے گی جھلے..... کچھ روز یہاں رہے گا تو مدد بدھ آجائے گی۔ پھر ابھی تک سلطان واپس نہیں آیا۔ میں اس کی طرف سے پریشان ہوں۔ کہیں وہ پولیس کے ہتھے نہ چڑھ گیا ہو۔ وہ آئے گا تو تیری ماں اور تیری منگ کی خیریت پتا چلے گی۔ سلطان سیدھا بیس آئے گا جبکہ ہمیں صبح سویرے یہاں سے نکلنا ہے، ابھی خان کے دشمنوں سے نمٹنا ہے، پھر ہم بھی جلد واپس آئیں گے۔ میں تجھے اپنا ٹھکانہ دکھا دوں گا، پھر تو جب چاہے ہمارے پاس آ سکتا ہے۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ تو بیگ صاحب کے پاس رہ جاؤ، یہ بہت اچھے آدمی ہیں تیرا ہر طرح خیال

کو قید کر لیا کرتا تھا۔ میں مہسوت سا خان کے پیچھے چلتا ہوا ہر چیز کو حیرت سے دیکھتا ہوں کرسی پر جا بیٹھا۔ باقی سب بھی بیٹھ گئے۔

نبیل سے مختلف کھانوں کی خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔ مجھے زور کی بھوک لگ گئی۔ حالانکہ چند لمحے پہلے تک مجھے بھوک نہ تھی۔ سب خاموش بیٹھے تھے۔ کمرے میں صرف دیوار پر لٹکی گھڑی کی ٹک ٹک گونج رہی تھی۔

میں نے چاروں طرف دیکھا، بیگ صاحب نہیں تھے؟ شاید وہ سب انہی کا انتظار کر رہے تھے کچھ دیر بیگ صاحب آگئے۔ ”ارے بھئی شروع کرو..... میں تو تم لوگوں کے آنے سے پہلے ہی کھا چکا ہوں۔ میں تو گیارہ بجے تک کھانا کھا لیتا ہوں۔ بسم اللہ کرو۔“ ان کے کہنے کے بعد سب نے کھانا شروع کیا۔ میں تو سر جھکا کر کھانے میں مصروف ہو گیا۔ بیگ صاحب اور راجہ باتیں کر رہے تھے۔ میں نے دھیان نہ دیا کہ کیا باتیں ہو رہی ہیں مگر اپنا نام سن کر چونک گیا۔ راجہ بیگ صاحب کو میرے بارے میں بتا رہا تھا اور بیگ صاحب تاسف سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ نوالے میرے حلق میں اٹکنے لگے۔ میں نے بہ مشکل کھانا ختم کیا۔

کھانے کے بعد چائے آگئی۔

”راجہ..... ایک درخواست کروں تم سے؟“ اچانک بیگ صاحب نے کہا۔

”آپ حکم کیجئے!“ راجہ نے جوابا کہا۔

”یہ لڑکا..... کیا نام ہے اس کا..... ہاں بالا..... بالے کو میرے پاس چھوڑ جاؤ۔“

میرے ہاتھ میں چائے کا کپ لڑ گیا۔ راجہ نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی اور خاموش ہو گیا۔

”بھئی دیکھو نا..... یہ پہلی مرتبہ شر آیا ہے، تم کہتے ہو کچھ بھی نہیں جانتا، کچھ روز میرے پاس رہے تو کچھ سوجھ بوجھ آجائے گی، کچھ خود اعتمادی پیدا ہوگی اس میں۔ میں اسے فیکٹری کے کام میں لگا دوں گا، کچھ بن جائے گا یہ۔“

میرا جی چاہا کہ انکار کر دوں۔ راجہ اور خان وغیرہ سے تو میرا واسطہ پڑ چکا تھا، کچھ کچھ جان گیا تھا انہیں مگر بیگ صاحب کو میں بالکل نہیں جانتا تھا۔ وہ بہت شفیق لگتے تھے

رکھیں گے۔“

وہ بولتا رہا اور میں سر جھکائے سنتا رہا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ جنگلوں جنگلوں پھرنے سے بہتر تھا کہ میں یہاں رہتا، کچھ سیکھ لیتا، سمجھ لیتا تاکہ اپنے دشمنوں سے بدلہ لے سکوں۔

”راجہ ٹھیک کہتا ہے بالے..... ہم جو زندگی گزارتے ہیں وہ بہت کٹھن ہے۔ تیرے بس کی بات نہیں۔“ خان نے راجہ کی حمایت کی۔

”ٹھیک ہے راجہ مگر..... یاد رکھنا مجھے صنرا کے قاتلوں سے اور اپنے باپ کے قاتلوں سے بدلہ لینا ہے اور تو میرا ساتھ دینے کا وعدہ کر چکا ہے۔“

”راجہ مرد ہے بالے اور مرد کبھی اپنا وعدہ نہیں بھولتا۔“ راجہ نے میرے کندھے پر اپنا بھاری ہاتھ رکھ کر کہا۔

رات گہری ہو گئی تھی، نرم نرم بستر دیکھ کر ویسے ہی بدن میں تھکن سی دوڑ گئی تھی۔ راجہ کے جاتے ہی میں بستر پر لیٹ گیا۔ خان بھی لیٹ کر کچھ سوچنے لگا۔

”خان.....!“

”ہوں!“

”تو نے اپنے بارے میں تو بتلایا ہی نہیں۔ تیرے باپ کو کس نے زہر دیا تھا اور..... کیا اب تو اکیلا ہے؟“

”میں اکیلا نہیں ہوں بالے..... اس دنیا میں کہیں نہ کہیں میری ایک بہن بچی ہے، جو میرا انتظار بھی کر رہی ہو گی، مگر.....“

”میں سمجھا نہیں خان، دنیا میں کہیں نہ کہیں..... کیا تو نہیں جانتا وہ کہاں ہے؟“

”وہ نو برس کی تھی جب اسے اغوا کر لیا گیا تھا۔ ہم دونوں بارش میں بیر ہوٹا ڈھونڈنے نکلے تھے۔ وہ چلتے چلتے تھک گئی تو میں نے اسے ایک درخت کے نیچے بٹھا دیا۔“

کہہ دیا کہ میرا انتظار کرنا میں کچھ دیر میں بیر ہوٹیاں لے کر آؤں گا۔ پھر میں بیر ہوٹیاں ڈھونڈتا ہوا دور تک نکل گیا۔ مجھے وہ رستہ ہی یاد نہ رہا جہاں میں شانی کو چھوڑ آیا تھا۔ مجھے کہیں نہ ملی تو میں روتا ہوا گھر بھاگا۔ پھر ہم سب نے مل کر اسے تلاش کیا وہ درخت

مل گیا جہاں میں نے اسے چھوڑا تھا، اس کے پاس جو بیر ہوٹیاں تھیں وہ وہیں زمین

ریگ رہی تھیں مگر شانی کا کہیں پتا نہ تھا۔

پھر ہم نے اسے ہر جگہ تلاش کیا، مگر..... جانے اسے آسمان کھا گیا یا زمین نکل گئی۔ میں اُس وقت بارہ برس کا تھا، اُس وقت سے آج تک مجھے چین نہیں آیا ہر دم یہی خیال رہتا ہے کہ وہ میرا انتظار کر رہی ہو گی۔ میری ماں اس غم میں بیمار ہو کر مر گئی۔ میرا باپ اپنے علاقے کا بڑا زمیندار تھا۔ میرا چچا میرے باپ کی زمین پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ بہن کے بھو جانے اور ماں کے مرجانے کے بعد تو اس نے کوششیں تیز کر دیں تھیں۔ پھر ایک روز اس نے مجھے اور میرے باپ کو زہر دے کر مارنا چاہا، ہمارا کھانا پینا ساتھ ہی تھا۔ اس کی بیوی پکاتی تھی۔ اُس روز بھی حسب معمول ہمارا کھانا نوکر دے گیا تھا۔ میں اور بابا کھانے بیٹھے تھے کہ میرا ایک دوست آگیا، میں اٹھ کر باہر چلا آیا مگر بابا نے کھانا کھالیا۔ میں کچھ دیر بعد کمرے میں واپس آیا تو بابا زمین پر بے ڈھب پڑا تھا۔ اس کے منہ جھاگ سے نکل رہے تھے، آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ میں اسے دیکھ کر پاگل ہو گیا۔ اس وقت اپنے ایک دوست کی مدد سے میں نے اسے ہسپتال پہنچایا جہاں دو دن زندگی اور موت کشمکش میں رہ کر بابا انتقال کر گیا۔“

خان دم بھر کو راکو تو مجھے احساس ہوا کہ میری آنکھوں سے بننے والے آنسو میرا چہرہ بھلو گئے ہیں۔ ”پھر.....؟ پھر کیا ہوا.....؟“

پھر اس سے پہلے کہ میرا چچا مجھے بھی جان سے مار دیتا میں رات کے اندھیرے میں وہاں سے نکل بھاگا۔ راجہ میرا پرانا دوست تھا۔ اس کو جب معلوم ہوا کہ چچا نے میرے

باپ کو راستے سے ہٹا دیا ہے، تو اس نے مجھے اپنے ساتھ رہنے پر مجبور کر دیا۔ میں تھانہ پکھری کرنا چاہتا تھا مگر راجہ نے مجھے سمجھایا کہ یہ سب بیکار ہے دنیا صرف پیسے کا ساتھ دیتی

ہے۔ چچا ہر حال میں جیت جائے گا اس کے پاس پیسہ تھا جبکہ میں تو بابا کی موت کے بعد بالکل اگلا ہو گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ چچا سب کچھ اپنے نام کرا لے گا اور اگر اسے میرا پتا

مل گیا تو مجھے بھی جان سے مروا دے گا۔ اس لئے میں نے اس طرف کا رخ نہیں کیا۔ میں پہلے اپنی بہن کو ڈھونڈنا چاہتا ہوں پھر چچا سے حساب بے باق کروں گا۔“ وہ خاموش ہوا تو

نفاذ میں ریلتی خاموشی کی گھوں گھوں میری کپٹیوں میں گھومتی محسوس ہوئی۔ دور کہیں سے گھنٹی کی آواز سنائی دی، ہم دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا

”تین بج گئے؟“ میں نے سراسرتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”معلوم نہیں..... میرے لئے تو وقت ٹھہرا ہوا ہے۔ وہیں..... اسی درخت کے نیچے..... میری بہن کی پُرشوق آنکھوں کی پتلیوں پر جن میں ڈھیر ساری بیرہوئیاں جمع کرنے کی خواہش تھی..... یہ بچہ بے بالے..... میں ابھی تک اسی لمحے کی قید میں ہوں۔ وہ لمحہ جس سے پہلے گزرنے والے لمحے نے میرا بچپن اور میری زندگی کی ہر خوشی سمیٹ لی اور جانے کہاں چھپ گیا..... مجھے لگتا ہے جیسے یہ سب..... جو ہو رہا ہے..... جو گزر رہا ہے وہ میرا محض خواب ہے میری آنکھ کھلے گی تو میں اس لمحے کی نرم گیلی ریت پر ننگے پاؤں کھڑا ہوں گا اور اس گھنے بیڑ کی چھاؤں میں بیٹھی شانی مجھے کہے گی ’پابی..... جاؤ نا..... بیرہوئیاں لاؤ.....‘ مگر بالے..... اب میں اسے چھوڑ کر نہیں جاؤں گا..... اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے خون آشام لمحے کی قید سے نکال لوں گا..... بالے..... میں اسے نکال لوں گا..... تو دیکھ لینا..... میں ایسا کر لوں گا.....“

میں ڈر گیا..... جانے وہ کیا کیا کہہ رہا تھا، عجیب سی باتیں کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ اچانک کھڑا ہو گیا۔ ٹہلنے لگا تیز قدموں سے، وہ اب بھی کچھ کہہ رہا تھا مگر اتنا آہستہ کہ میں کوشش کے باوجود سن نہیں پا رہا تھا۔

”خان!“ میں نے اسے پکارا

”ہوں!“ وہ چونک گیا۔

”سو جاؤ خان..... تین بج چکے ہیں۔“ میرے لہجے میں خوف تھا اور آنکھیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے لمبا سانس لیا۔ ”ہاں سو جاؤ۔“

میں چپکے سے بستر پر لیٹ گیا۔ وہ بھی خاموشی سے لیٹ گیا۔ میں نے دزدیدہ نگاہوں سے اسے دیکھا، اس کی آنکھیں بند تھیں مگر چہرے پر تناؤ تھا۔ مجھے خان کی باتیں سن کر بہت دکھ ہوا تھا۔ میں جانتا تھا کہ بہن کی محبت کیا ہوتی ہے۔ میری صغرا ابھی تو مجھ سے بچھڑ گئی تھی۔ مگر اسے تو میں نے خود اپنے ہاتھوں سے زمین کی گود میں اتارا تھا۔ وہ محفوظ تو تھی مگر شانی..... جانے کن عذابوں سے گزر رہی ہو گی۔ یہاں جن بہنوں کے بھائی نہیں ہوتے، جن بیٹیوں کے باپ نہیں ہوتے انہیں دنیا کیسے کیسے عذاب دیتی ہے۔ اس کا

اندازہ مجھے تھا۔ ”خدا کرے وہ جہاں بھی ہو خیریت سے ہو۔“ میرے دل سے دعا نکلی۔

میں خان اور شانی کے بارے میں سوچتا ہوا جانے کب سو گیا۔ بہت روز بعد ایسا سکون اور اتنا نرم بستر میسر آیا تھا نیند ایسی ٹوٹ کر آئی کہ خان کے جھنجھوڑنے پر ہی آنکھ کھلی۔

”دس بج رہے ہیں دس.....“ خان نے زور سے کہا۔

میں نے کسمسا کر آنکھ کھول دی۔

”تو تو ایسے کہہ رہا ہے جیسے مجھے سویرے سویرے کھیت پر جانا ہو۔“

”تجھے تو شاید اب کہیں نہیں جانا مگر ہمیں جانا ہے۔ راجہ انتظار کر رہا ہے۔“

میں اچھل کر اٹھ بیٹھا۔ ”کہاں جانا ہے؟“

”یہ تو نہیں معلوم مگر..... جانا ہے بس۔“

”خان میرا دل نہیں مانتا..... نہ معلوم میں یہاں کیوں رہنا نہیں چاہتا۔“

”ہر نئی جگہ آدمی کے لئے اجنبی ہونے کی وجہ سے ایسی ہی اوٹ پٹانگ باتیں سوچنے

پر مجبور کر دیتی ہے۔ اٹھ راجہ انتظار کر رہا ہے۔“

میں جلدی سے ہاتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ میں پانچ منٹ میں تیار ہو گیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ راجہ سے صاف صاف کہہ دوں گا کہ میں یہاں نہیں رکتا چاہتا۔ ہم پھر اسی کمرے میں آگئے جہاں رات سب نے کھانا کھایا تھا۔ راجہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کرسی پر بیٹھا تھا۔ بیگ صاحب اور وہ مرد نما لڑکی بھی موجود تھی مگر اس وقت وہ بالکل مختلف لگ رہی تھی۔ اس نے سفید کرتا شلوار اور گلابی پھولوں والا بڑا سا دوپٹا اوڑھ رکھا تھا۔ اس وقت وہ مجھے اچھی لگی۔ سیدھی سادی سی، معصوم سی، مگر اتنے بہت سے مردوں میں بیٹھی وہ عجیب سی لگی۔

ہمارے گاؤں میں تو لڑکیاں پردہ نہ کرنے کے باوجود بھی کبھی مردوں کے درمیان نہیں بیٹھتی تھیں۔ میرے داخل ہوتے ہی بیگ صاحب بولے۔

”لو بھئی ہمارا بیٹا بھی آگیا۔ میں ابھی اسی کے بارے میں بات کر رہا تھا۔“ انہوں نے

اس لڑکی سے مخاطب ہو کر کہا پھر مجھ سے گویا ہوئے۔

”بھئی بالے، یہ فاریہ ہے، میری بھتیجی..... میرے مرحوم بھائی کی پہلی اور آخری

نشانی۔ اب یہی میرا سب کچھ ہے۔ میری اپنی تو کوئی اولاد نہیں ہے میں نے اسے اپنی بیٹی بنالیا تھا اور اب خدا نے تمہاری شکل میں بیٹا بھی دے دیا ہے۔ سبحان اللہ خدا واقعی سب کی سنتا ہے۔ سب کو سب کچھ دیتا ہے بس مانگنے والا سلیقے سے مانگے تو.....

میں ان کے قریب خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں تو کچھ اور سوچ کر آیا تھا مگر بیگ صاحب کی باتوں نے مجھ سے میری ہمت ہی چھین لی۔ میری زبان پر تالے ڈال دیئے میں نے نگاہ اٹھا کر راجہ کی طرف دیکھا جو چپتی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا یوں جیسے میرے دل کا سب حال جانتا ہو۔

”چلو بھی ناشتا کرو ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“ بیگ صاحب نے سب سے کہا۔

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ صرف برتنوں کی آوازیں تھیں یا دیوار پر لٹکی اس خوبصورت گھڑی کی جس سے لوہے کی کئی زنجیریں نکل کر نیچے تک آرہی تھیں۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد ہم ناشتے سے فارغ ہو گئے۔

”چلو باہر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔“ بیگ صاحب اٹھتے ہوئے بولے۔

ہم سب ان کے پیچھے چلتے ہوئے ایک بڑے سے لان میں آگئے جہاں ملازم پہلے ہی بہت سی کرسیاں ڈال چکے تھے۔

”ہاں اب بتاؤ..... کیا پروگرام ہے؟“ بیگ صاحب نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”بس بیگ صاحب، ہمیں کچھ کام ہے۔ انشاء اللہ جلد ملاقات ہو گی۔“ راجہ نے جواب دیا۔

”کسی چیز کی ضرورت ہو تو ہمیں بتاؤ۔“ انہوں نے کہا۔

”مہربانی بیگ صاحب، آپ کی شفقت ہی بہت ہے۔ بس آپ ہم سب کے لئے دعا کیجئے گا۔“

”میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں بیٹا۔ خدا کرے تم لوگ خوش رہو۔“ اتنا کہہ کر انہوں نے جیب سے ایک لفافہ نکال کر راجہ کی طرف بڑھایا۔

”اسے رکھ لو..... شاید تمہارے کام آئے۔“

”یہ کیا ہے؟“ راجہ نے پوچھا

”کچھ تھوڑی سی رقم ہے راجہ.....“

”بیگ صاحب..... ہم اس لئے تو نہیں آئے۔“

”میں جانتا ہوں راجہ..... مگر باپ کی حیثیت سے دے رہا ہوں۔“

”میرے پاس ہیں بیگ صاحب“

”میں جانتا ہوں۔ یہ بھی میں جانتا ہوں کہ اس وقت تمہاری جیب میں کچھ نہیں ہے۔“

میں یہاں سے سیدھا گھر جاؤں گا بیگ صاحب، وہاں سب کچھ ہے۔“ راجہ کا لہجہ اکڑا ہوا تھا۔

”یہ بھی تمہارا گھر ہے بیٹا، اجنبیوں سی باتیں کرتے ہو تو تکلیف ہوتی ہے۔ پھر آؤ تو لوٹا دینا۔ حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ اتنے لمبے رستے میں کچھ بھی ہو سکتا ہے رکھ لو.....“

شباباش.....“ بیگ صاحب کے اصرار نے راجہ کو مجبور کر دیا۔ اس نے جھپکتے ہوئے وہ لفافہ لے لیا۔

”اب اجازت ہے.....؟“ وہ اٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی باقی سب کھڑے ہو گئے۔ میرا دل چاہا کہ میں راجہ کو اشارہ کروں کہ میں بھی ساتھ جاؤں گا مگر اس سے پہلے ہی راجہ نے کہا۔ ”بالے میں جلدی دوبارہ آؤں گا۔ اگر تم یہاں خود کو مطمئن سمجھو تو رک جاؤ ورنہ.....“

میں خوش ہو گیا۔ گویا راجہ نے یہاں رکنا یا نہ رکنا میری مرضی پر چھوڑ دیا تھا۔ میں اگلی بار اس سے کھل کر کہہ سکتا تھا کہ میں یہاں نہیں رہنا چاہتا۔

وہ لوگ چلے گئے۔ مجھے اپنا آپ خالی خالی سالگا۔ جیسے سب کچھ اچانک مجھ سے چھن گیا ہو۔ میں اکیلا رہ گیا ہوں..... راجہ اور خان..... اور وہ سب جو میرے کوئی نہیں تھے پھر بھی مجھے اپنے اپنے سے لگے تھے۔ جن کے ساتھ رہ کر میں نے کبھی خود کو تنہا نہیں سمجھا تھا ان سب کے جاتے ہی میں اکیلا ہو گیا تھا۔

”کچھ سوچ رہے ہیں آپ؟“

میں چونک پڑا وہ لڑکی میرے سامنے کرسی پر بیٹھی تھی۔ بیگ صاحب معلوم نہیں کب چلے گئے تھے مجھے احساس بھی نہ ہوا۔

”جج..... جی..... جی نہیں..... میں تو بس..... جی وہ.....“
میرے حلق میں کانٹے پڑ گئے۔

وہ دھیرے سے مسکرائی۔

”آپ شہر میں پہلی دفعہ آئے ہیں۔ انگل بتا رہے تھے۔“

”جج پہلی..... دفعہ۔“

”پھر تو میں آپ کو سارا شہر گھماؤں گی۔ یہ بہت خوب صورت جگہ ہے۔ خاص طور پر راوی کا کنارہ..... مجھے بہت پسند ہے۔ جب چاند پورا ہوتا ہے تو میں رات کو وہاں ضرور جاتی ہوں۔“

”بیگ صاحب بھی جاتے ہیں؟“

وہ ہنس پڑی ہے۔ ”انگل..... وہ تو کہیں جاتے ہی نہیں۔“

”پھر آپ کیسے جاتی ہیں؟“

”میں..... اکیلی..... اکیلی جاتی ہوں۔ مگر اب آپ کے ساتھ جاؤں گی۔“

”اکیلی.....؟ رات کو.....؟“

”یہ شہر ہے بالے صاحب..... یہاں اکیلے جانا کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ ویسے

آپ کا نام بہت عجیب سا ہے..... کاش آپ کا کوئی اور نام ہوتا۔“

”جج میرا نام اقبال ہے۔ ماں اور ابا مجھے بلا کہتے تھے۔“

”اقبال..... ہاں یہ اچھا نام ہے مگر بلا..... ٹھیک نہیں ہے۔“ اس نے منہ بنا

کر کہا۔

”تو اقبال صاحب آج شام کو ہم باہر چلیں گے۔ کسی اچھے سے ریسٹوران میں کھانا

کھائیں گے اور پھر رات کو میں آپ کو راوی کا کنارہ دکھاؤں گی، وہ کنارہ جہاں سے شاید

پہلی بار کائنات میں زندگی نے جنم لیا تھا اور شاید یہیں زندگی دم توڑ دے گی۔“

”جج..... اگر بیگ صاحب اجازت دیں گے تو.....“

”ان کی فکر نہ کرو..... جو میں کہتی ہوں وہی وہ کہتے ہیں اور جو وہ کہتے ہیں میں

وہی کرتی ہوں۔ تمہیں زندگی کے نشیب و فراز دکھانا اب میری ذمہ داری ہے۔“ اس

نے مسکرا کر جواب دیا۔

اسی وقت گیٹ پر گاڑی کا پارن سنائی دیا۔ ہم دونوں نے چونک کر اس طرف دیکھا۔

وہ کالے رنگ کی بڑی سی گاڑی تھی۔ جس کے شیشے سیاہ رنگ کے تھے اور اندر کا کچھ نظر

نہیں آ رہا تھا۔ چونکدار نے بڑھ کر گیٹ کھولا اور مودب کھڑا ہو گیا۔ فاریہ بھی اٹھ کھڑی

ہوئی۔ اس کے چہرے پر خوشی کے ساتھ ساتھ جوش بھی تھا۔

”اقبال تم اپنے کمرے میں جاؤ میں کچھ دیر بعد تم سے وہیں آ کر ملتی ہوں۔ میرے

کچھ مہمان آئے ہیں۔“ اتنا کہہ کر وہ تیز قدموں سے پورچ کی طرف بڑھ گئی جہاں وہ

گاڑی ٹھہر گئی تھی۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میری نگاہ گاڑی کی طرف اٹھ

گئی تھی جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس میں سے جو شخص اتر رہا تھا اسے دیکھ کر میں

حیران رہ گیا میں نے شاید اتنا خوبصورت آدمی زندگی میں پہلی دیکھا تھا۔ وہ سفید سوٹ میں

لبوس تھا۔ اس کے ہاتھ میں خوبصورت چھتری تھی۔ انگلیوں میں خوبصورت قیمتی انگلیاں

اور گلے میں سونے کی موٹی سی زنجیر تھی۔ اس کا چہرہ اتنا چمک دار تھا کہ نگاہ پھسلتی محسوس

ہوتی تھی۔ میں دم بخود رہ گیا۔ اس کے بال بے حد خوبصورت تھے سفید اور کالے، چمک

دار لچھوں کی صورت بکھرے بکھرے تھے۔ میں آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس

کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ مجھے لگا جیسے وہ مجھے دیکھ کر چونک پڑا ہو۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں

عجیب سی چمک پیدا ہو گئی۔

اسے اپنی طرف متوجہ پا کر میں تیز قدموں سے کوٹھی کے پچھلے حصے کی طرف بڑھ گیا

جہاں میرا کمرہ تھا۔ وہی کمرہ تھا جس میں رات میں اور خان سوئے تھے۔

”اے بوائے.....“ اس نے مجھے پکارا۔ میرے بدن میں تھر تھری دوڑ گئی۔ قدم

یوں رک گئے جیسے زمین نے جکڑ لئے ہوں میں پلٹ کر اسے دیکھنے کی ہمت نہیں کر سکا۔

”اقبال..... یہاں آؤ.....“ فاریہ کی نرم آواز نے میرا پتھر پلین ختم کر دیا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ”جج میں؟“ میں نے سینے پر انگلی رکھ کر پوچھا۔

”ہاں تم.....!“ اس آدمی نے میری طرف اشارہ کیا۔

میں لرزتے قدموں سے ان کی طرف بڑھ گیا اس وقت کوٹھی کا اندرونی دروازہ کھلا

اور بیگ صاحب باہر آ گئے۔

”بہادر صاحب!“ اتنا کہہ کر وہ گاڑی کی طرف لپکے۔ ”آپ..... مجھے اطلاع کر دی ہوتی..... آپ نے زحمت کی..... آئیے تشریف لائیے..... آئیے آئیے.....“

”پراسا کنویں کے پاس آتا ہے بیگ صاحب..... کنویں کو نہیں بلاتا.....“ انہوں نے ہنس کر کہا اور پلٹ کر گاڑی کے اندر بیٹھے شخص کو اشارہ کیا۔ میں گاڑی کے قریب پہنچ گیا تھا اس لئے اس کے اندر کی تمام چیزیں میری نگاہ میں تھیں۔ سامنے کی سیٹ پر ایک خزانہ سی شکل کا آدمی بیٹھا تھا جس کے زانو پر ایک بریف کیس رکھا ہوا تھا۔ پچھلی سیٹ پر ایک براؤن سا خوف ناک شکل والا کتا زبان نکالے ہانپ رہا تھا۔ اس کے برابر میں ایک اٹھار انیس برس کی نازک سی، پیاری سی لڑکی بیٹھی تھی جس کا ایک ہاتھ کتے کی کمر پر رکھا تھا۔ ان کے قدموں میں ایک سیاہ رنگ کا لوہے کا بکس تھا جس کا کچھ حصہ ہی مجھے نظر آیا تھا۔

میں ہاتھ باندھ کر اس کے قریب کھڑا ہو گیا۔ اسی وقت وہ بریف کیس والا شخص اتر آیا اور ڈرائیور کو نیچے آنے کا اشارہ کیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ لڑکی اور کتا بھی نیچے آ گئے۔ بیگ صاحب نے آگے بڑھ کر اس لڑکی کو ریسو کیا۔ فاریہ بھی اسے گلے ملی۔ کتا خاموش تھا۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ مجھے دیکھ کر بھی کتے کے تاثرات نہیں بدلے تھے۔ جبکہ میں اس کے لئے قطعی اجنبی تھا اور اسی وجہ سے اس سے ڈر رہا تھا۔

اس بات کو شاید سبھی نے محسوس کیا۔ اس سفید پوش شخص کے علاوہ بیگ صاحب، فاریہ اور وہ لڑکی بھی حیرت سے کبھی مجھے اور کبھی کتے کو دیکھ رہے تھے۔

”یہ کون ہے بیگ.....!“ اس شخص نے جسے بیگ صاحب نے بہادر صاحب کہا تھا۔ پوچھا۔

”اس کا نام اقبال ہے سب اسے بلا کہتے ہیں۔ راجہ کو تو آپ جانتے ہیں نا! اس کا ساتھی ہے، راجہ سے میں نے اسے مانگ لیا تھا۔ اب یہ میرے پاس ہی رہے گا۔ بڑی لمبی کہانی ہے اس کی، تفصیل سے بتاؤں گا۔ آپ اندر تشریف رکھیے۔“ بیگ صاحب نے کہا۔

”ٹھیک ہے چلو سیمیں.....“ انہوں نے لڑکی سے کہا، پھر وہ بیگ صاحب کی

طرف متوجہ ہوئے۔ ”بیگ صاحب، قریشی واپس جائے گا۔ سامان ایئر پورٹ پہنچا تھا۔ اگر آپ قدیر صاحب سے کہہ دیں تو..... آسانی ہو جائے گی۔ دراصل میرا آدمی ہسپتال میں پڑا ہے۔ اسے ہارٹ اٹیک ہو گیا تھا وہ چھٹی پر ہے ورنہ آپ کو زحمت نہ دیتا۔“

”کیسی باتیں کرتے ہیں آپ صاحب بہادر..... ہم اور آپ دو ہیں کیا.....!“ میرا اور آپ کا کام ایک ہی تو ہے۔“ انہوں نے ہنس کر کہا اور ان سب کو لئے ہوئے کو بھی کی طرف چل پڑے۔ وہ شخص جسے بہادر صاحب نے قریشی کہا تھا وہی تھا جو زانو پر بریف کیس لئے چوکنا نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اس وقت گاڑی سے باہر تھا اور بہادر صاحب کے پیچھے کسی پالتو کتے کی طرح چل رہا تھا۔ اس کی نگاہیں اب بھی ادھر ادھر حرکت کر رہی تھیں۔ وہ نہ جانے کیا تلاش کر رہا تھا۔ مجھے کسی نے بھی آنے کو نہیں کہا تھا اس لئے میں وہیں کھڑا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ سب اندر چلے گئے ڈرائیور اب بھی اپنی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ سب کے اندر جاتے ہی اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور سگریٹ نکال لیا اور دوسری جھینیں ٹٹولنے لگا، پھر اس نے مجھے قریب آنے کا اشارہ کیا۔

”ہوں؟“ میں نے قریب جا کر پوچھا۔

”ناچس ہوگی آپ کے پاس؟“

”نہیں میں سگریٹ نہیں پیتا۔“

”عجب آدمی ہو.....!“ اس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھ کر کہا۔

”پھر کیا پیتے ہو۔“

”ٹھنڈا پانی اور..... لی.....“ یہاں پانی تو ملتا ہے مگر لی ابھی تک نظر نہیں آئی۔

”نظر آئے گی بھی نہیں.....“ یہاں سونا پینے والے لوگ رہتے ہیں۔ چاندی پینے والے نہیں۔“ وہ ہنسا۔

میں اس کا مطلب نہیں سمجھا تھا اس کے لہجے میں حقارت تھی۔ انداز دوستانہ نہیں تھا۔ میں نے وہاں رکنا مناسب نہیں سمجھا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

میں اپنے کمرے میں پہنچا تو ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ میں بستر پر لیٹ گیا۔ سونے سے میری طبیعت گھبرا گئی تھی۔ اماں کی یاد آئی تو میں تڑپ کر اٹھ بیٹھا جانے وہ کس حال

میں ہوگی۔ ان خالوں نے اسے زندہ چھوڑا ہو گا یا نہیں..... سوہنی کیسی ہوگی؟ ماسی میراں کب تک میرا انتظار کرے گی۔ یہ وہ سوالات تھے جو مجھ میں طوفان اٹھا گئے۔ میں نے اپنے آپ کو بے حد بے بس محسوس کیا۔ میں باختیار انسان ہونے کے باوجود کسی بے جان تنکے کی طرح کہاں سے کہاں تک پہنچ گیا تھا۔ میرا جی چاہا کہ میں بھاگ جاؤں۔ یہاں عیش کرنے سے تو بہتر تھا کہ میں اپنی ماں کو بچاتے ہوئے جان دے دیتا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں نے راجہ سے کیوں نہ کہا کہ مجھے بھی ساتھ لے لے۔ یہاں رہ کر تو میں اور زیادہ بے بس ہو گیا تھا۔ چوہدری کی غلامی کے بعد بیگ صاحب کی غلامی قبول کر لی تھی میں نے۔ صرف فرق اتنا ہی تھا کہ یہاں مجھ پر ظلم کرنے والا، گالیاں دینے والا کوئی نہ تھا۔ یہ لوگ مجھے محبت اور شفقت سے قیدی بنائے ہوئے تھے اور چوہدری..... میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

اسی وقت مجھے دروازے پر آہٹ محسوس ہوئی۔ کسی نے بڑھ کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ ”کون؟“

”یعقوب سرا“

میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا تھا۔ وہ بڑا سایکٹ لئے کھڑا تھا۔ یہ آپ کے لئے ہے سر..... بیگ صاحب نے کہا ہے کہ شام کو آپ تیار رہیے گا۔ ”یعقوب نے مودبانہ انداز میں کہا اور ہینڈ بیگ بڑی احتیاط سے ٹیبل پر رکھ دیا۔ ”ٹھیک ہے تم جاؤ۔“

اس کے جاتے ہی میں نے آگے بڑھ کر پیکٹ اٹھا لیا اس میں گہرے نیلے رنگ کا سوٹ تھا۔ پینٹ اور کوٹ، ہلکی نیلے رنگ کی قمیض، گہرے نیلے رنگ کی ٹائی اور جوتوں کا ڈبا بھی موجود تھا جس میں میرے سائز کے کالے رنگ کے جوتے بھی تھے۔ یہ سب دیکھ کر میرے ہاتھ اور پاؤں خوشی سے پھول گئے۔

ایسے کپڑوں کا تصور میں نے تو خواب میں بھی نہیں کیا تھا۔ یہ میری حیثیت سے کیس بڑھ کر تھا۔ میرے بدن میں اچانک پھرتی آگئی۔ میں نے وہ سوٹ پیکٹ سے نکال لیا۔ میں اسے پہن کر دیکھنا چاہتا تھا مگر اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی میں نے گھبرا کر پیکٹ ٹیبل پر رکھ دیا۔

”میں آسکتی ہوں!“ فاریہ نے دروازہ کھول کر جھانکا۔ ”جی..... جی آئیے جی۔“

وہ اندر آگئی۔ ”مسٹر اقبال“ مجھے انکل نے آپ کے بارے میں تفصیل سے بتایا ہے مجھے بہت افسوس ہوا۔ آپ اپنی ماں کے لئے فکر مند ہیں؟“ اس نے میری ڈھکتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ میں تڑپ اٹھا۔

”اسی لئے تو میں یہاں رکنا نہیں چاہتا تھا جی..... میرا ایک ایک لمحہ میری ماں کی فکر میں بھرا ہوا ہے۔ مجھے ایک پل بھی چین نہیں ہے جی..... میں اپنی ماں کو لانا چاہتا ہوں۔ اسے اور سوہنی کو..... اور..... ماسی میراں کو، سب کو..... میری زندگی میں یہ تین ہستیاں ہی سب کچھ ہیں جی۔“ میری آواز بھرا گئی اور آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے۔

”ارے ارے مسٹر اقبال آپ تو رو رہے ہیں۔ مرد روتے تو نہیں ہیں۔“ ”کیوں مرد انسان نہیں ہوتے؟ انہیں دکھ نہیں ہوتا کیا..... کیا وہ تکلیف کو محسوس نہیں کر سکتے؟“

”یہ بات نہیں ہے، تکلیف تو انہیں بھی ہوتی ہوگی مگر ان میں صبر زیادہ ہوتا ہے، عورت سے زیادہ..... وہ کوشش کریں تو سب کچھ کر سکتے ہیں۔ وہ طاقت ور ہوتے ہیں مسٹر اقبال آپ بھی طاقت ور ہیں۔ آپ بھی بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ ان سب ہستیوں کو لا سکتے ہیں جو آپ کی زندگی میں اہم ہیں مگر یوں نہیں..... پلاننگ کر کے..... ہر چیز طریقے سے، سلیقے سے کی جاتی ہے اور وہ سلیقہ میں آپ کو سکھاؤں گی۔ چوہدری طاقت ور ہے، پیسے والا ہر چیز خرید سکتا ہے گواہیاں، وکیل، جج اور..... اور سارا قانون، آپ کو اس سے مقابلہ کرنے کے لئے اس سے زیادہ طاقت ور بننا ہے۔ اس سے زیادہ پیسے والا..... تاکہ آپ قانون کی اس سے زیادہ بولی لگا سکیں۔ تب آپ جیت جائیں گے۔ سب کچھ آپ کے قدموں میں ہو گا۔ سب کچھ.....“

اس کی باتوں نے میری ہمت توڑ کر رکھ دی۔ میں نے خود کو زیادہ بے بس محسوس کیا۔ جو کچھ وہ کہہ رہی تھی وہ ناممکن تھا۔ نہ میں طاقت ور تھا اور نہ میرے پاس دولت تھی جس سے میں سب کچھ خرید سکتا۔

”کیا آپ نہیں چاہتے کہ آپ اس سے اپنا حق، اپنی ماں اور اپنی محبت چھین سکیں، اپنی سسک سسک کر مر جانے والی بہن اور باپ کا بدلہ لیں؟“

اس نے پھر ضرب لگائی میرے دماغ پر، میرے دل پر، خون میری کپٹنیوں پر ٹھو کریں مارنے لگا۔ ”کیوں نہیں جی..... میں تو چاہتا ہوں کہ اس کی نسلوں کو بھی جنم رسید کر دوں..... انہیں کتے کی موت ماروں۔ انہیں، جنہوں نے مجھ سے میری زندگی چھین لی۔ میرے باپ اور میری بہن کو مجھ سے دور کر دیا۔ میری ماں اور میری محبت کو قید میں جکڑ لیا..... میں جانتا ہوں جی، ماں کے ساتھ ہی انہوں نے ماسی میراں اور سوہنی کو بھی اٹھالیا ہو گا..... میں انہیں لانا چاہتا ہوں، چاہے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے، میں خود کو تباہ کردوں گا مگر میں انہیں زندگی کی ریگینیاں دوں گا۔ ایک بھر پور زندگی دوں گا جی.....“

”یہ بات ہوئی نا..... مردوں والی۔ ٹھیک ہے مسٹر اقبال، اب ہم کام کی بات کرتے ہیں۔“ وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوئی، اس کی نگاہیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کی اس بات نے مجھے حیران کر دیا جو باتیں ہم کر رہے تھے۔ یہ بات اس سے بہت مختلف تھی عجیب سی،

”میں سمجھا نہیں جی!“

”تم مجھے مس فاریہ کہہ سکتے ہو اقبال، دیکھو اقبال، تمہیں چوہدری کا مقابلہ کرنے کے لئے طاقت اور دولت کی ضرورت ہے۔ اگر یہ دونوں چیزیں میں تمہیں فراہم کر دوں تو.....؟“

”جج..... جی..... مس..... فاریہ آپ جو کچھ کہہ رہی ہیں میں اسے سمجھا نہیں، طاقت اور دولت آپ کیسے دے سکتی ہیں؟“

”اس پر بعد میں بات ہوگی، پہلے تم میری بات کا جواب دو۔“

”تو..... تو ظاہر ہے کہ میں اپنی خواہش پوری کر لوں گا، اپنی ماں، سوہنی اور ماسی میراں کو لے آؤں گا۔“

”تم اس کے لئے کیا کر سکتے ہو؟“

”آپ کیا چاہتی ہیں؟“ میں نے زچ ہو کر کہا۔

”دیکھو اقبال، دولت اور طاقت یوں بانٹی تو نہیں جاتی۔ اس کے لئے تمہیں خود کام کرنا پڑے گا۔ ہماری فیکٹری بچے جہاں لیدر کی چیزیں بنتی ہیں۔ تمہیں اس فیکٹری میں کام کرنا ہو گا۔“

”مگر جی..... میں تو کام نہیں جانتا۔ بس اوپر کا کام کر سکتا ہوں اگر آپ مجھے.....“

”سکھادیں گے“ اس نے میری بات کاٹ دی۔

”پھر میں وعدہ کرتا ہوں جی کہ آپ کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دوں گا، زندگی بھر احسان مانوں گا آپ سب کا۔“ میں نے خوش ہو کر کہا۔

”میں تم سے صرف ایک وعدہ چاہتی ہوں۔“

”حکم کریں جی۔“

”وفاداری! لوگ تمہیں لالچ دیں گے ہم سے زیادہ پیسے کا مگر یاد رکھو پیسہ بہت طاقت ور سہی مگر ہے بری چیز۔“

”آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں جی..... میں چوہدری جیسے شخص کی وفاداری میں اپنی آدھی سے زیادہ زندگی گزار سکتا ہوں جس نے کسی پل مجھے خوشی نہ دی تو بھلا آپ کا ساتھ کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟“

”بس تو پھر ڈن!“

”جی!“

”ڈن..... یعنی یوں سمجھو کہ کام شروع..... ٹھیک؟“

”جی آپ حکم کریں بس.....“

”اچھا چلو کھانا کھا لو۔“ اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہم دونوں پھر کھانے کے کمرے میں آگئے۔ وہاں بہادر صاحب اور بیگ صاحب کے علاوہ وہ لڑکی بھی تھی جس کو بہادر صاحب نے سیماں کہہ کر مخاطب کیا تھا۔“

”آؤ بھئی..... ہم تم لوگوں کا انتظار کر رہے تھے۔“ بیگ صاحب نے ہمیں دیکھتے ہی کہا۔

”کھانے کے دوران میں خاموشی رہی، میں سر جھکائے کھانا کھا رہا تھا۔ یہ دوسرا دن تھا

اور سچ پوچھتے تو میں نے اب تک پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا تھا۔ مجھے ان تکلفات کی عادت کہاں تھی۔ چچے، کاٹنا اور چھری..... اور یہ سب، جن کے سامنے تھوک نکلنے کی ہمت بھی نہ ہوتی تھی۔ میں بہت آہستہ کھانا کھاتا تھا اور سب کھا کر اٹھ جاتے تو مجھے بھی اٹھنا پڑتا، میں چارپائی پر آلتی پالتی مار کر کھانا کھایا کرتا تھا اب یوں کرسی پر بیٹھ کر مجھ سے کھایا ہی نہیں جاتا تھا۔

کھانے کے فوراً بعد چائے آگئی تھی۔ فاریہ اور سیمال نارنگی کا رس پی رہی تھیں مجھے چھاچھ یاد آگئی۔ کاش کھانے کے بعد چھاچھ مل جاتی یا لسی مل جاتی تو مزہ آ جاتا۔ میں نے دل میں سوچا اور اسی تکلف سے چائے کی چسکیاں لینے لگا۔ ”فاریہ کیا ہوا؟“ بیگ صاحب نے فاریہ سے پوچھا۔

”کامیابی!“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

”ٹھیک ہے..... ویری گڈ، اس کا تو امکان تھا، مگر اس قابل بنانا تمہارا کام ہے۔“ ”فکر نہ کریں، یہ میری ذمہ داری ہے اور میں اب تک کسی کام میں ناکام نہیں ہوئی۔ صرف پندرہ روز چاہئیں۔“

”ویری گڈ..... میں تمہیں ایک مہینہ دیتا ہوں۔“

”تھینک یو انکل.....“

بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی مگر جانے کیوں مجھے لگا جیسے میرے ہی سلسلے میں بات ہو رہی ہے۔

چائے پینے کے بعد بیگ صاحب کھڑے ہو گئے۔ ”اچھا بیٹے اب تم آرام کرو، شام کو ملاقات ہوگی اور ہاں..... یہ فاریہ کہہ رہی تھی کہ تم لوگ شام کو گھومنے جا رہے ہو۔“

”جی..... جی یہ کہہ رہی ہیں..... میں تو.....“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے..... بہت اچھا ہے، کچھ روز تم گھوم پھر لو پھر میں تمہیں فیکٹری لے چلوں گا۔ کام بھی تو کرنا ہے نا.....!“

”جی!“ میں نے سر جھکا کر کہا۔

”اچھا تو پھر تو شاید صبح ہی ملاقات ہوگی! چلو ٹھیک ہے بس تم اسے اپنا گھر ہی سمجھو

کسی چیز کی ضرورت ہو تو یعقوب سے کہہ دینا۔“ یہ کہہ کر وہ لوگ کمرے سے چلے گئے۔ میں بھی ان کے کے پیچھے باہر چلا آیا۔

”شام کو تیار رہنا..... بلکہ یعقوب آجائے گا تمہارے پاس، تیار ہونے میں مدد کرے گا میں ٹھیک پانچ بجے آؤں گی..... اوکے؟“

آخری لفظ میری سمجھ میں نہیں آیا پھر بھی میں نے سر ہلا دیا۔

میں کمرے میں آکر لیٹ گیا۔ شام کا انتظار کرنے لگا جو بہت دور نہیں تھی، لیٹے لیٹے ہی شام ہو گئی۔ ساڑھے چار بجے ہی یعقوب آگیا۔ اس کے ہاتھ میں چائے وغیرہ کے برتن اور بکٹ وغیرہ تھے۔

”چائے پی لیں پھر تیار ہو جائیے گا۔“

”سنو! مجھے..... یہ باندھنا نہیں آتی۔“ میں نے ٹائی کر طرف اشارہ کیا۔

وہ مسکرایا۔ ”میں آپ کو خود تیار کرا دوں گا۔“

میری جان میں جان آئی ورنہ سوٹ پہننا ہی مجھے عذاب لگ رہا تھا۔ میں نے چائے پی، بکٹ کی پلیٹ صاف کر دی اور نہانے چلا گیا۔ نہا کر نکلا تو یعقوب موجود تھا۔ اس نے سوٹ پر استری کر دی تھی میرے باہر آتے ہیں اس نے پیٹ تھما دی۔ میں پھر ہاتھ روم میں چلا گیا۔ پن کر باہر آیا تو اس نے مجھے شرٹ، پھر ٹائی اور پھر کوٹ پہنا دیا۔ جوتے پن کر میں آئینے کے سامنے آیا تو دم بخود رہ گیا۔ میرے سامنے بالا نہیں کوئی بابو کھڑا تھا، بالکل انگریز.....

یعقوب نے ایک پینٹ کھول کر ایک خوبصورت شیشی نکالی اور اس کا ڈھکنا کھول کر بٹن دبایا اور خوشبو کا ایک فوارہ سا نکل پڑا۔ میں خوشبو میں نہا گیا۔

”باہر آپ کو کوئی پہچانے گا نہیں سرا!“

میں دھیرے سے مسکرایا۔

ٹھیک پانچ بجے فاریہ آگئی۔ مجھے دیکھ کر لمحہ بھر ٹھکی پھر ہنس پڑی۔ ”ونڈر فل..... یو آر لوکنگ ویری اسمارٹ۔“

”جی! کیا کہا جی آپ نے؟“

”جی کچھ نہیں مسٹر اقبال..... یہ سب چھ بھی تم سمجھنے لگو گے، تم اندر سے بھی

”میسیح.....؟“

بڑھا دیا۔

وہ میری بات سن کر بہت دیر تک ہنستی رہی۔ ”پاگل ہو تم“ بھوکا رہنے کی کیا بات ہے۔ خیر اس وقت تو تمہاری خواہش پوری کر دیتی ہوں کسی ایسی جگہ لے چلتی ہوں جہاں تم پیٹ بھر کر کھانا کھا سکو مگر تمہیں اس طرح کھانے کی عادت ڈالنا پڑے گی۔ تم خواہ مخواہ خوف زدہ رہتے ہو۔ ٹیبل پر بیٹھنے کے بعد اپنی توجہ کھانے پر رکھا کرو لوگوں پر ہنسنے کی بجائے ان کی بات سنو۔

”مسٹر جیک یہ مسٹر اقبال ہیں، ہمارے نئے ساتھی۔“ فاربیہ نے اردو میں کہا۔
میں تو تھوک نکل کر رہ گیا۔

”کیسے ہیں آپ؟“ اس نے صاف اردو میں پوچھا۔

میں حیران رہ گیا۔ اتنی صاف اردو تو شاید میں بھی نہیں بول سکتا تھا۔

”جج..... جی اچھا ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟“ میں نے بہ مشکل کہا۔

”بہت اچھا ہوں۔“ اس نے ہنس کر جواب دیا۔ میں جھینپ گیا۔ شاید میں نے اسے

غلط جواب دیا تھا۔ فاربیہ نے میرے جھینپ جانے کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اس نے فوراً بات

بدل دی۔ اب وہ انگریزی میں بات کر رہی تھی جس کا ایک لفظ بھی میرے پلے نہیں پڑا

تھا۔ میں صرف ان کے لہجے اور چہرے کے تاثرات ہی پڑھ سکتا تھا۔ فاربیہ غصے میں لگ

رہی تھی اس کی آنکھوں میں بجلیاں سی لپک رہی تھیں، ذرا دیر پہلے مسٹر جیک کو دیکھ کر

خوش ہو جانے والی اور اس قدر نرمی سے تعارف کرانے والی کو اچانک کسی بات پر غصہ آ

گیا تھا جبکہ مسٹر جیک کا چہرہ سفید ہو گیا اس کی آنکھوں میں خوف کے ساتھ ساتھ التجا بھی

تھی مگر فاربیہ وہ تو دکھتا ہوا انگارہ بنی ہوئی تھی۔ اس کا لہجہ دھیمّا تھا مگر اس میں چھری کی

سی کاٹ تھی۔ میں خاموش بیٹھا رہا تھا ویٹر چائے رکھ گیا تھا۔ فاربیہ نے لمحہ بھر کو خاموش

کر مجھے دیکھا۔ مسکرائی۔ ”تم چائے پو مسٹر اقبال، مائنڈ نہ کرنا ہم ذرا کاروباری باتیں کر

رہے ہیں“

”جج.....“ میں اور کچھ نہ کہہ سکا۔

اس نے مجھے خاموش اور ساکت دیکھ کر چائے کے برتن اپنے سامنے سرکا لئے اور

چائے بنا کر ہمیں دے دی۔ مسٹر جیک ابھی تک سر جھکائے بیٹھتے تھے۔ فاربیہ نے چائے کو

پیالی ہونٹوں سے لگائی، اس کے چہرے سے غصے کے اثرات کچھ کم ہو گئے تھے۔ مجھے دیکھ

کر مسٹر جیک گھگھکیانے کے انداز میں کچھ گٹ پٹ کرنے لگا۔ فاربیہ نے انہیں پھر تہ

لہجے میں جواب دیا۔ وہ صاحب فاربیہ کا جواب سنتے ہی کھڑے ہو گئے وہ اتنے بوکھلائے

ہوئے تھے کہ مجھ سے خدا حافظ بھی کرنا انہیں یاد نہیں رہا۔ ان کی آنکھوں میں بے پنا

خوف تھا اور چہرہ جو بالکل سرخ تھا وہ سفید ہو رہا تھا۔ انہیں اس قدر خوف زدہ دیکھ کر میڈ

بے حد حیران تھا۔ ایک ہٹا کٹا مرد وہ بھی انگریز اور فاربیہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”چلو مسٹر اقبال۔ میرا موڈ بہت خراب ہو گیا ہے۔“
میں خاموشی سے اٹھ گیا۔

ہم گاڑی میں بیٹھے تو ہمارے درمیان گہری خاموشی طاری تھی حالانکہ میں نے سوچ

تھا کہ فاربیہ سے کچھ ذاتی باتیں کروں گا، اس سے پوچھوں گا کہ اماں کو کس طرح وہاں سے

لایا جائے گا۔ سوہنی اور ماسی میراں کا کیا ہو گا۔ وہ دولت اور طاقت مجھے کتنے برسوں میں

لمے گی، مگر اس کا تو موڈ واقعی بہت خراب تھا۔ وہ بہت تیز گاڑی چلا رہی تھی۔ اس کے

ہونٹ ہینچے ہوئے تھے۔ پیشانی پر سلوٹیں اور آنکھوں میں گہری سوچ تھی۔ ہم بہت جلد

کوٹھی پہنچ گئے۔

”اے مسٹر اقبال، پھر کبھی سسی، راوی کا کنارہ اتنے خراب موڈ میں مجھے.....“

زہر لگتا ہے۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”ایک بات پوچھوں.....؟“ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”ہوں..... تم کیا پوچھنا چاہتے ہو! مسٹر اقبال میں چھوٹے سے فائدے کے لئے

بڑا نقصان برداشت نہیں کرتی۔ مسٹر جیک نے بہت بڑی غلطی کی ہے جس نے میرا نقصان

کر دیا اور بس۔“

انتاکہ کروہ رکی نہیں، اس وقت اس میں بلا کی رعونت تھی، میری ہمت کچھ اور

پوچھنے کی نہیں ہوئی۔ میں تھکے تھکے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ کمرے

میں پہنچ کر میری نگاہ وال کلاک پر پڑی، پونے بارہ بجے تھے۔ مجھے اتنی جلدی بہت سادقت

گزر جانے پر حیرت ہوئی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ کوٹھی پر اتنی خاموشی کیوں طاری ہے۔

میں نے کپڑے بدلے اور بستر پر لیٹ کر گزرنے والے دن کا لمحہ لمحہ سوچنے لگا۔

فاربیہ جسے میں ایک فیشن ایبل لڑکی سمجھا تھا، ایک ہی دن میں اس کی اہمیت واضح ہو چکی

تھی۔ ہوٹل والے کا اسے دیکھ کر متدب ہو جانا، مسٹر جیک کا سفید پڑ جانا، یہ سب معمولی

باتیں نہ تھیں۔ میں اس معاملے کو سلجھانے کی کوشش کرتا ہوا سو گیا۔

اچانک کسی وقت میری آنکھ کھل گئی۔ نہ معلوم کیا وجہ تھی، میں بہت دیر تک نہیں

کچھ پایا تھا کہ ایسا کیوں ہوا۔ ذہن میں کہیں دور یہ احساس تھا کہ کوئی ایسی بات ہوئی ہے

جس سے میری آنکھ کھل گئی..... یا..... مجھے اٹھایا گیا ہے مگر میرے کمرے میں کوئی

نہ تھا۔ میری نگاہ کھڑی پر پڑی رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ساڑھے تین بج رہے تھے۔ میں اٹھ کر دروازے پر آگیا میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ باہر گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف جھینگروں کے بولنے کی آوازیں تھیں جو بولتے بولتے اچانک خاموش ہو جاتے تو خاموشی کا احساس اور بڑھ جاتا اور رفتہ رفتہ خوف میں بدلنے لگتا تھا میں چند لمحے تک وہیں کھڑا چاروں طرف دیکھتا رہا، نہ کوئی آواز آئی اور نہ کوئی اور ایسی چیز سامنے آئی جس سے مجھے کچھ اندازہ ہوتا۔ میں الجھا الجھا سا کچھ دیر وہیں کھڑا رہا پھر دایرہ کمرے میں آگیا۔ نہ معلوم کیوں اچانک مجھے لگا جیسے کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔ میرے بدن پر چیونٹیاں سی ریگ گئیں۔ میں چونکا ہوا گیا مجھ سے لیٹنا نہ گیا۔ میں نے پورے کمرے میں نگاہ دوڑائی بائیں جانب ایک بڑی سی کھڑکی تھی جس پر گہرے سبز پردے تھے دائیں طرف چھت سے کچھ نیچے ایک روشن دان تھا جس پر لوہے کی گرل لگی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ وہ دروازہ تھا جسے میں ابھی بند کر کے آیا تھا کمرے میں کوئی ایسی چیز یا جگہ نہ تھی جہاں کہہ کے چھپنے کا امکان ہو۔ میں اپنی طرف سے اطمینان کر کے دوبارہ لیٹ گیا۔ میں نے ذہن میں آنے والے تمام خیالات کو وہم سمجھا اور آنکھیں موند لیں۔

”جھی..... شی..... شیت.....“

میں اچھل کر بیٹھا۔ آواز بہت واضح تھی، جیسے کہیں قریب سے آئی ہو۔ میں نے گھوم کر کھڑکی کی طرف دیکھا اور میری آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ کھڑکی میں اس لڑکی کا چہرہ نظر آ رہا تھا جسے میں نے بہادر صاحب کی گاڑی میں کتے کے ساتھ بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ مجھے مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی اور میں حیرت سے کھڑا دیکھ رہا تھا کہ باہر تو بہت گہرا اندھیرا ہے ایک چھوٹا سا، ٹمٹما سا بلب اس برآمدے میں تو لگا ہوا تھا جہاں میرے کمرے کا دروازہ کھلتا تھا مگر کونے کا کمرہ ہونے کی وجہ سے بائیں جانب جس طرف کھڑکی تھی وہاں کوٹھی کے احاطے کی اونچی دیوار تھی۔ میرے کمرے کی اس کھڑکی سے صرف چند فٹ کے فاصلے پر یہ حصہ میں نے دن میں اس وقت دیکھا تھا جب میں نے جس سے گھبرا کر کھڑکی کھول دی۔ وہاں لکڑی کے چند تختے، چند اینٹیں اور بجری کا چھوٹا سا ڈھیر تھا اور بس۔ سامنے اونچی دیوار تھی جس پر کالج کے بہت سے نوکدار ٹکڑے لگے ہوئے تھے۔ یہ ٹکڑے پوری دیوار پر تھے، شاید اس لئے کہ چور دیوار پھاند کرنے آ سکے۔

”اے..... فلاسفر..... مجھے اندر آنے کو نہیں کہو گے؟“

”جج..... جی..... آئیے مگر..... نہیں..... آپ جایئے بہت رات ہے اس وقت..... جایئے آپ.....“ مجھے بیگ صاحب اور بہادر صاحب کا خیال آ گیا۔ میں بوکھلا گیا تھا۔ اتنی رات کو نہ جانے وہ کیسے چلی آئی تھی۔ گھر کے لوگ کہاں تھے۔ مجھے بہت سخت خوف محسوس ہوا اگر اسے کسی نے یہاں دیکھ لیا تو..... تو کیا ہو گا۔ اس خیال سے میرے پسینے پھوٹ گئے۔

”تم آدمی ہو یا جلیبی..... آئیے..... جایئے..... ہاں نہیں.....“ یہ کہتی ہوئی وہ ہاتھوں پر زور ڈال کر اچکی اور دوسرے ہی لمحے وہ کمرے کے اندر تھی۔ میری نگاہیں بندھ گئی۔

”بی بی..... خدا کے واسطے..... آ..... آپ چلی جائیں..... وہ..... آپ نہیں سمجھتیں..... بیگ صاحب اور وہ.....“

”تم کیا مجھے بے وقوف سمجھتے ہو؟“ اس نے بے تکلفی سے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”توہ جی..... میری ایسی مجال کہاں..... بس آپ سویرے آئیے گا..... رات کے وقت.....“ میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ میں آخر کیا کروں۔

”یہ تم عجیب عجیب سی باتیں نہیں کر رہے؟ تم مجھ سے خوفزدہ ہو یا مجھے خوف زدہ کر رہے ہو؟“

”نہیں جی..... ہاں جی وہ میں..... ٹھیک ہے آپ یہاں رہیں میں جاتا ہوں۔“ میں تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔

وہ اچھل کر میرے اور دروازے کے بیچ آ کر کھڑی ہو گئی۔

”میں غلطی کو دھراتی نہیں ہوں مسٹر جمال..... ایک مرتبہ تمہارے راستے سے ہٹ کر دھوکا کھا چکی ہوں اور اتنی عقل مجھ میں ہے کہ میں دوبارہ ایسا نہ کروں۔“

”آں..... جمال.....! میں..... بلا ہوں جی..... اقبال نام ہے میرا۔“

”اوہ..... تو تم اب اقبال بن گئے ہو؟ کمال ہے دو برس پہلے تمہارا نام جمال تھا۔ تم بہت ویل آف تھے اب تم غالباً کوئی دیہاتی بن گئے ہو، غریب ماں باپ کے بیٹے، آن

گیا۔ اگر یہ پاگل ہے تو کچھ بھی کر سکتی ہے اس خیال نے مجھے اور نڈھال کر دیا۔
 ”بی بی..... میں آپ سے صبح بات کروں گا۔“ میں نے گھگھکھاتے ہوئے کہا۔
 ”جی!“ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، آنکھیں چمکنے لگیں۔

”جی..... جی۔“

”وعدہ؟“

”وعدہ!“

وہ ایک دم بدل گئی۔ خوش ہو گئی۔

”کل صبح ہم باہر چلیں گے، میں صبح سویرے ٹوی کو نہلانے لے جاتی ہوں نا.....“

”جی جی بکے..... ٹھیک ہے، میں گیٹ کے پاس لان میں تمہارا انتظار کروں گی۔ آنا

ضرور.....!“

”جی..... ضرور۔“ میں نے فوراً سر ہلا دیا

”اوکے، سی یو.....“ وہ اتنا کہہ کر دوبارہ کھڑکی کی طرف بڑھی اور میرے دیکھتے

ہی دیکھتے کھڑکی سے باہر کود گئی۔ اس کے باہر جاتے ہی بستر پر گر پڑا۔ میرا سانس ایسے پھول

رہا تھا جیسے میں میلوں سے بھاگتا ہوا آیا ہوں۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کسی کو پتا نہیں

چلا ورنہ قیامت آ جاتی۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی چار بج کر پچیس منٹ ہوئے تھے اور وہ

مجھے صبح چھ بجے گیٹ پر پہنچے کو کہہ کر گئی تھی۔ میں نے لپک کی کھڑکی بند کر دی، دروازے

پر لاگ لگایا اور بستر پر گر کر اس آفت کے بارے میں سوچنے لگا جو ابھی ابھی کود کر کھڑکی

سے باہر گئی تھی۔ جانے کیا کیا کہہ رہی تھی، میں نے تو دھیان سے سنا بھی نہیں اور سنا تو

سمجھا ہی نہیں میرا سارا دھیان تو باہر لگا ہوا تھا کہ کوئی آنہ جائے، کوئی دیکھ نہ لے، میں

عجیب مصیبت میں پڑ گیا تھا۔ پتا نہیں کہ اس بارے میں فاربیہ یا بیگ صاحب کو بتانا چاہئے یا

نہیں..... میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کون ہے، کیا چاہتی ہے اور کیا کرے

گی؟

پڑھ..... میں تمہارے بارے میں سب کچھ سن چکی ہوں مسٹر..... اقبال.....

مگر میں تمہیں پہلی نگاہ میں ہی پہچان گئی تھی، میں بھی اور ٹوی بھی..... لیکن میں۔

یہ بات کسی پر ظاہر نہیں کی..... لوگ ٹوی کے نہ بھونکنے سے حیرت زدہ تھے مگر

نہیں..... میں وجہ جان چکی تھی۔ مسٹر جمال..... میں تمہیں صرف یہی بتانے آ

ہوں کہ..... میں تمہیں اب جان گئی ہوں اب میں تمہیں کھو دینے کی غلطی کبھی نہ

کروں گی مجھ سے بچ کر بھاگنے کی کوشش نہ کرنا اگر تم نے ایسا کیا تو..... شاید

پچھتانے کے لئے بھی زندہ نہ رہو جبکہ میں چاہتی ہوں کہ تم زندگی بھر اپنے کئے

پچھتاتے رہو۔ مجھے مئی کی چٹین یاد ہیں مسٹر جمال..... ان کی وہ کراہیں بھی جو آ

تک ان کے کمرے میں گونجتی ہیں۔ جس طرح میں تم سے محبت کرنے پر مجبور ہوں بالکل

اس طرح میں مئی کی چیخیں اور کراہیں سننے پر مجبور ہوں۔ میں چاہوں تو بھی ان سے

نہیں بھاگ سکتی۔ میں سمجھی تھی کہ گھر بدل لینے سے نجات پالوں گی..... مگر وہ میرا

خام خیالی تھی، خوش فہمی تھی میری، وہ آوازیں تو خود مجھ میں بس گئی ہیں۔ ہواؤں پر

رچی ہوئی ہیں۔ آسمانوں سے ٹپکتی ہیں۔ زمینوں سے اگتی ہیں۔ میں ان سے کیسے نجات

سکتی ہوں..... کیسے.....؟“

وہ بول رہی تھی اور میں کانپ رہا تھا۔ جانے وہ کیا کہہ رہی تھی، کیا کچھ سمجھ رہی

تھی، مجھے اس کی بکواس کی پروا نہیں تھی۔ مجھے تو صرف ڈر تھا تو بیگ صاحب کا بہادر

صاحب کا اور..... اور فاربیہ کا؟

”حیرت ہے مسٹر جمال، تم جیسے نڈر اور بہادر کا رنگ اس وقت پھیلا ہو رہا ہے

تمہارے چہرے پر تو گلاب کھلتے تھے۔ آنکھوں میں تارے ٹوٹا کرتے تھے۔ کیا ہوئے

گلاب؟..... وہ تاروں کی دھنک؟..... وہ ہنسی کی جھنجھناتی ہوئی آواز جو ماما

لاش پر یوں برس رہی تھی جیسے کسی نے موتیوں کی مالا توڑ دی ہو.....“

اس کے لمبے میں بلا کا جنون تھا، آنکھوں میں بھیگی بھیگی سی آنچ تھی۔ جیسے بوندوں

کے پس منظر میں کہیں گیلی لکڑیاں سلگ رہی ہوں مگر میں چاہتا تھا کہ وہ بس چلی جائے، کہ

بھی طرح، کسی بھی طریقے سے، وہ جانے کس جمال کا ذکر کر رہی تھی۔ شاید جمال مجھ سے

ملتا جلتا ہو..... یا وہ..... وہ لڑکی ہی پاگل ہو، یہ خیال آتے ہی میں مزید خوف زدہ

نہیں آنکھوں سے غائب ہو چکی تھی۔ میں کرسی پر جا بیٹھا۔ میں پریشان تھا کہ صبح

کیا ہو گا۔ وہ لڑکی صبح ملنے کو کہہ چکی ہے اگر میں نہ گیا تو ممکن ہے کہ وہ یہاں چلی آئے

اور اگر وہ آگئی تو بیگ صاحب اور فاربیہ کے ناراض ہونے کا خطرہ بھی تھا۔ میں فاربیہ سے

وفاداری کا وعدہ کر چکا تھا اسے توڑ دینا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ وفاداری کے معنی میرے نزدیک یہی تھے کہ میں مالک کی مرضی کے بغیر ایک قدم بھی نہ اٹھاؤں، میں عجیب شش و پنج میں تھا۔ وقت کب بیت گیا؟ احساس نہ ہوا، وال کلاک نے چھ گھنٹے بھی بجائے تھے مگر جانے میں کیوں نہ سن سکا، شاید اس لئے کہ میں نے سماعت کے دروازے بند کر لئے تھے یا شاید خوف نے مجھے بہرہ کر دیا تھا کچھ بھی تھا وقت گزر چکا تھا۔

یعقوب نے دروازہ کھٹکھٹایا تو سوا آٹھ بج رہے تھے وہ اسی وقت مجھے اٹھایا کرتا تھا، مگر آج میں سویا ہی کب تھا؟ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تھا۔ رُے میں ایک پلیٹ میں ایک لفافہ بھی تھا۔ ”یہ آپ کے لئے ہے سر، سیمیں بی بی نے دیا تھا۔“

”ٹھیک ہے تم جاؤ۔“ میں نے اس کے ہاتھ سے رُے لے کر کہا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے لفافہ کھولا۔ اندر ایک خط تھا۔ جسے میں پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ تھوڑی بہت اردو پڑھنا مجھے آتا تھا مگر پھر بھی میری سمجھ میں بہت سے الفاظ نہیں آئے۔ میں نے خط پلیٹ کر جیب میں رکھ لیا۔

میں چائے پی رہا تھا تو دروازے پر دستک ہوئی۔ میں سمجھا یعقوب برتن لینے کے لئے آیا ہے۔ میں نے اونچی آواز میں اسے اندر آنے کو کہا۔

دروازہ کھلا اور فاربیہ اندر آگئی۔

”جی..... آپ؟“ میں جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

”وہ کیوں آئی تھی؟“ فاربیہ نے تیز نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

”جج..... جی پتا نہیں۔ آپ بیٹھیں میں آپ کو سب کچھ بتاتا ہوں۔“ اب اس سے کچھ چھپانا بیکار تھا اس لئے میں نے الف سے لے کر یے تک ساری کہانی فاربیہ کو بتا دی اور جیب سے وہ خط بھی نکال کر اسے دے دیا۔

فاربیہ کے چہرے کا وہ تناؤ ختم ہو گیا جو اندر داخل ہوتے وقت میں نے محسوس کیا تھا۔ وہ بڑے غور سے خط پڑ رہی تھی۔

میں اس انداز پر بوکھلا گیا۔

”تم بہت کام کے ہو مسٹر اقبال، اب بازی میرے ہاتھوں میں ہے۔ میں..... میں نہیں خوش کروں گی.....“

”کیا ہو گی جی..... میں سمجھا نہیں!“

”سب سمجھ جاؤ گے۔ چلو میرے ساتھ۔“ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہم باہر آئے اور وہ مجھے لئے ہوئے کوٹھی کے اندر زونی حصے میں آگئی۔ اس کمرے میں، میں پہلی بار آیا تھا۔ کرا کسی محل کا سا لگ رہا تھا۔ بہترین قالین اور قیمتی فرنیچر، دیواروں پر لگی بڑی بڑی تصویریں بہت خوبصورت تھیں کمرے کی ہر چیز ایسی تھی جو میں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ پوہدری کی حویلی میں بھی نہیں۔

”یہاں بیٹھو، میں ابھی آتی ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ اندر چلی گئی۔ میں کمرے کی ہر چیز کو غور سے دیکھنے لگا۔ چند منٹ بعد وہ وہاں آگئی بیگ صاحب بھی اس کے ساتھ تھے۔

”بھئی بات کیا ہے..... بات تو بتاؤ۔“

”آپ نے اقبال کو غور سے دیکھا۔“

”کیا مطلب؟“ وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگے۔

”یاد کریں، کوئی ایسی بات، کوئی ایسا چہرہ جو اقبال کے چہرے میں آپ کو نظر آئے۔“

بیگ صاحب مجھے غور سے دیکھنے لگے، ان کی آنکھوں میں گہری سوچ تھی۔ میرے ہاتھوں میں پسینا آ گیا۔ میں عجیب سی کیفیت میں مبتلا تھا۔ میں کسی تصویر کی طرح سامنے بیٹھا تھا اور ان دونوں کی نگاہیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

اچانک بیگ صاحب کی آنکھوں میں بجلی سی کوند گئی۔

”اوہ..... تمہارا مطلب ہے کہ..... جمال؟“

”ونڈر فل..... میں نے آپ کو یہ بات اس لئے نہیں بتائی کہ ممکن ہے میرے

بتانے سے آپ کی آنکھیں وہی دیکھنے لگیں جو میں نے کہا ہو مگر اب..... اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میرا خیال صحیح تھا۔ حیرت ہے یہ خیال ہمیں پہلے کیوں نہیں آیا۔ سیمیں سے پہلے۔“

”تک..... کیا لکھا ہے جی؟“ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

وہ مسکرائی۔ اس نے بڑی گہری نگاہوں سے مجھے دیکھا، سر سے پاؤں تک جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو یا جیسے کوئی قربانی کا بکرا خریدتے وقت گھوم پھر کر ہر طرف سے دیکھتا ہے۔

”سیمماں کے ذہن پر تو وہ چہرہ سوار ہے، اس لئے وہ“ بیگ صاحب بات ادھوری چھوڑ کر سوچنے لگے۔

”آپ بھی وہی سوچ رہے ہیں جو میں نے سوچا ہے۔ ہم اقبال کو بڑی آسانی سے جمال بنا سکتے ہیں اور یہ دیکھئے۔“ اتنا کہہ کر فاریہ نے وہ خط بیگ صاحب کی طرف بڑھا دیا۔

”یہ کیا ہے۔“

”خط سیمماں کا، جو اس نے یعقوب کے ہاتھ اقبال کو بھیجا تھا۔“ پھر فاریہ نے سیمماں کے میرے کمرے میں آنے کا سارا واقعہ سنا دیا۔

بیگ صاحب نے واقعہ سن کر پُر سوچ انداز میں سر ہلایا۔

”اس کا مطلب ہے کہ بہادر ہمیں چھٹ کر رہا ہے۔ سیمماں نے اتنا بڑا قدم اس کی مرضی کے خلاف نہیں اٹھایا ہو گا۔“

”ظاہر ہے اب بتائیے کہ کیا کرنا ہے؟“

”تم سوچو۔“

”میرے خیال میں ہم اقبال کو وہاں بھیجیں، ڈرامے کے سارے سین آہستہ آہستہ ہمارے سامنے آجائیں گے۔“

”مگر پہلے اسے ٹرینڈ تو کرو اس طرح تو یہ“

”یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ پندرہ دن میں سب کچھ سیٹ ہو جائے گا۔“

”ٹھیک ہے اس کی ضرورتوں کا خیال رکھو۔ اسے شاید کچھ مانگنے اور کہنے کی عادت نہیں ہے۔“

میں اس ساری گفتگو کے دوران میں اپنے آپ کو قطعی بے وقوف لگ رہا تھا۔ ان کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ یہ سب کچھ کیا چکر ہے۔ سیمماں کون ہے، اس نے جو کچھ کہا تھا وہ کیا تھا، جمال کون ہے اور فاریہ اور بیگ صاحب مجھے کس چکر میں استعمال کر رہے ہیں۔ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

مجھے سیمماں کا بھی ڈر تھا اگر وہ سامنے آگئی تو صبح گیٹ پر نہ پہنچے پر کیا قیامت اٹھائے گی مگر ابھی تک سیمماں یا بہادر صاحب نہیں آئے تھے۔ نہ ہی پورچ میں ان کی گاڑی نظر

آئی تھی۔

”مس فاریہ، مس سیمماں نظر نہیں آئیں۔“

”وہ لوگ جا چکے ہیں۔ چلو تم ناشتا کر لو پھر ہمیں چلنا ہے۔ آج بہت سے کام نمٹانے ہیں۔“ فاریہ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

ہم کھانے کے کمرے میں آ گئے۔ ملازم ناشتا لگا چکے تھے۔ بیگ صاحب، میں اور فاریہ ناشتا کرنے لگے۔ اسی وقت ایک ملازم اندر داخل ہوا۔ اس نے بیگ صاحب سے کچھ کہا۔

”بلاؤ اسے“ بیگ صاحب نے فوراً جواب دیا۔

میں خاموشی سے سر جھکائے ناشتا کر رہا تھا کہ چند منٹ بعد ملازم پھر اندر آیا اور اس نے دروازے کی طرف منہ کر کے کسی کو اندر آنے کو کہا۔

میں نے نگاہ اٹھائی اور دوسرے ہی لمحے اچھل پڑا۔ سامنے سلطان کھڑا تھا، وہی سلطان جسے راجہ نے اماں اور سوہنی کا حال پتا کرنے میرے گاؤں بھیجا تھا۔

”سلطان سلطان تم نے اتنے دن لگا دیئے اماں کیسی ہے، کہاں ہے اور ماسی میرا، سوہنی بولو نا؟“

میں فاریہ اور بیگ صاحب کی موجودگی کو فراموش کر چکا تھا۔

”اقبال، اسے بیٹھنے تو دو“ بیگ صاحب کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”بالے تیری ماں“

”کیا ہوا میری ماں کو بول نا؟“ میں نے اس کی بات کو کاٹ کر پوچھا۔

”وہ دیوانی سی ہو گئی ہے۔ ماسی میراں کے پاس ہے، سوہنی اور ماسی میراں اس کا بہت خیال رکھتی ہیں۔ وہ ہر وقت تیرا اور صفرا کا انتظار کرتی ہے جبکہ گاؤں والوں کا خیال ہے تم دونوں مر چکے ہو۔ چوہدری بھی شاید اسی لئے مطمئن ہے اور شاید اسی وجہ سے اُس نے تیری ماں کو بے ضرر سمجھ کر چھوڑ رکھا ہے، وہ کسی کو کچھ بتانے کے قابل بھی نہیں اور بھلا بتا کر بھی چوہدری یا راجو کا کیا باگاڑ لے گی سارا گاؤں ان سے دیتا ہے اور گاؤں میں ایک لڑکا ہے نا وہ جو سپاہی ہے غلام رسول وہ کبھی کبھی اسے ملے آتا ہے تو وہ خوش ہو جاتے ہیں۔ میں نے اسے تیرے بارے میں نہیں بتایا ورنہ

چوہدری اور راجو کو بھی پتا چل جاتا اور.....

”پالے..... تم رو رہے ہو؟“ بیگ صاحب نے دھیرے سے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تب مجھے احساس ہوا کہ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے جلدی سے آستین سے آنسو صاف کر لئے کن آنکھوں سے فاریہ کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر گہری اداسی تھی اور آنکھوں کے کنارے گیلے تھے۔

”پالے..... رونا مردوں کا کام نہیں ہے۔“ سلطان نے کہا۔

”نہیں اقبال اب کبھی نہیں روئے گا۔“ فاریہ نے پُر عزم لہجے میں کہا۔ ”میں جا کر

اقبال کی ماں، ماسی اور سوہنی کو لاؤں گی۔“

اتنا سنتے ہی میرے ہونٹ پھیل گئے میرا جی چاہا کہ زور زور سے ہنسنے لگوں مگر میں نے اپنے آپ پر قابو رکھا۔ خوشی سے میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ فاریہ یہ کر سکتی ہے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ جو کچھ کہتی ہے اسے پورا کرنے کی ہمت بھی رکھتی ہے۔

”اقبال تم فکر نہ کرو، میں سلطان کے ساتھ جاؤں گی، اسی ہفتے..... آج یا کل اس لئے نہیں کہ ہمیں کچھ بہت ضروری کام ہیں اور پھر تمہارے لئے گھر کا انتظام بھی تو کرنا ہے نا..... ماں کو اور سوہنی کو کہاں رکھو گے؟“

خوشی سے میری بری حالت تھی۔ مجھ سے بولا بھی نہیں گیا۔

”ٹھیک ہے سلطان، تم ہاتھ منہ دھو کر کچھ دیر آرام کرو، کھانے پر ملاقات ہو گی۔“ بیگ صاحب نے سلطان سے کہا اور یعقوب کو بلا کر سلطان کے لئے کمر اٹھولنے کی ہدایت کی۔

سلطان یعقوب کے ساتھ چلا گیا۔

”ٹھیک ہے فاریہ تم جو مناسب سمجھو کرو، مگر ہر بات میرے علم میں رکھنا، تاکہ.....“

”پلیز نوٹ انکل..... فی الحال تو میں اقبال کے لئے فلیٹ کا بندوبست کرتی ہوں تاکہ وہ دل لگا کر مطمئن ہو کر میرے ساتھ کام کر سکے۔“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر بعد ہم وہاں سے اٹھ گئے۔ فاریہ نے مجھے تیار ہونے کو کہا، میں سیدھا کمرے میں گیا۔ سلطان کا کمرہ بند تھا۔ شاید وہ سو رہا تھا۔ میں تیار ہو کر باہر آیا تو فاریہ گاڑی میں میرا انتظار کر رہی تھی۔ میرے بیٹھتے ہی اس نے گاڑی اسٹارت کر دی۔ کچھ دیر بعد ہم ایک چوڑی سڑک سے گزر رہے تھے۔ جس کی دونوں اطراف میں اونچے اونچے درخت لگے ہوئے تھے۔ دھوپ تیز ہونے کے باوجود سڑک پر ٹھنڈک تھی۔

”مس فاریہ میں سیمیاں اور بہادر صاحب کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔“ میں نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

”ہاں اقبال، جو سوالات بھی تمہارے ذہن میں ہوں، پوچھ لو، میں خود بھی یہی چاہتی ہوں کہ تم حالات کو اچھی طرح سمجھ لو۔ اس طرح تمہیں کام کرنے میں آسانی ہو گی۔ سیمیاں بہادر صاحب کی مرحوم بہن کی بیٹی ہے۔ سیمیاں کا باپ اس کے بچپن ہی میں اس کی ماں کو طلاق دے کر لندن چلا گیا تھا۔ اس نے سیمیاں کے لئے بہت کچھ چھوڑا تھا لیکن چلے جانے کے بعد اس نے کوئی تعلق نہ رکھا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ سیمیاں کا اصل باپ نہیں تھا۔ بہادر صاحب کے پاس کچھ بھی نہ تھا وہ حیدر آباد میں رہتے تھے جہاں شہر سے دور ان کی کچھ زمین تھی اس پر ان کا گزارا تھا، پھر اچانک ان کی بہن یعنی سیمیاں کی ماں کو کسی نے قتل کر دیا۔ سیمیاں کہتی ہے کہ یہ قتل جمال نے کیا ہے۔ جمال سعدیہ کے دیور کا بیٹا تھا۔ جو سیمیاں سے محبت کرنے لگا۔ وہ سیمیاں سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر سعدیہ تیار نہ تھی شاید اسی وجہ سے اسے قتل کر دیا گیا۔ مگر..... اس کے قتل کی اصل وجہ میں جانتی ہوں۔ سیمیاں سے شادی نہ کرنے کی وجہ تو بظاہر ایک بہانہ تھا۔ بہر حال جمال ملک سے فرار ہو گیا۔ جمال ہو ہو تمہاری شکل کا تھا۔ اس لئے سیمیاں کو تم پر جمال کا دھوکا ہوا ہو گا۔ اس نے یہ بات بہادر صاحب کو بتائی ہو گی۔ بہادر صاحب اپنی بہن کی موت کے بعد لاہور چلے آئے حیدر آباد میں وہ خاصی مشکل زندگی گزار رہے تھے۔ یہاں آکر جو ان کو عیش ملا اس کو چھوڑ کر جانا ان کے بس کی بات نہ تھی ویسے بھی سیمیاں کا دنیا میں ان کے سوا کوئی نہ تھا، وہ بیس رہ گئے بلکہ انہوں نے اپنی فیملی کو بھی بلوا لیا۔ اب سیمیاں کی ساری دولت اور سعدیہ کا ناجائز کاروبار سب انہی کے ہاتھ میں ہے وہ یہاں کے بے تاج بادشاہ بن گئے۔ وہ معصوم سی سیمیاں جسے کبھی اس کی ماں نے اپنے کالے کاروبار کے بارے میں کچھ

نہیں بتایا تھا۔ اب بہادر صاحب کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنی ہوئی ہے۔ وہ اپنی ماں سے زیادہ ذہین اور پھر پتلی ثابت ہوئی ہے اب وہ نہ صرف کاروبار کے بارے میں جانتی ہے بلکہ دولت کی ہوس نے اسے اندھا کر دیا ہے اور یہ سب بہادر کی تربیت کا نتیجہ ہے۔

ہم نہیں چاہتے کہ سیماں ایسی معصوم لڑکی مزید اس خزانہ بڑھے کے ہاتھوں برباد ہو مگر مشکل یہ ہے کہ سیماں یہ بات نہیں سمجھتی۔ بہادر نے اسے ہم لوگوں سے متفرک رکھا ہے وہ ہمیں اپنا حریف سمجھتی ہے ہم نے بھی اپنی صفائی پیش نہیں کی۔ ہمارا مطلب صرف اور صرف اسے بربادی سے بچانا ہے۔“

فارسیہ خاموش ہوئی تو مجھے چونک جانا پڑا۔ ہم راوی کے کنارے پہنچ چکے تھے۔ منظر بے حد خوبصورت تھا مگر میرا دھیان تو سیماں اور بہادر صاحب پر تھا۔ میں اس وقت لطف اندوز بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ فارسیہ نے ایک گھنے درخت کے نیچے گاڑی کھڑی کر دی تھی۔

”مس فارسیہ..... سیماں کی ماں کا کیا کاروبار تھا جسے اب بہادر صاحب چلا رہے ہیں!“

”وہ پاکستان سے ہیروئن اسمگل کرتی تھی اور قیمتی پتھروں کی خرید و فروخت کا کام کرتی تھی۔“

”ہیروئن؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا میں نے یہ نام پہلی مرتبہ سنا تھا۔ میرے گاؤں میں ایسی کسی چیز کے بارے میں شاید کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔

”ہاں ہیروئن اقبال، یہ بہت خطرناک چیز ہے، زہر..... ایسا زہر جو قوموں کو کھوکھلا کر دیتا ہے اس کا عادی انسان دھیرے دھیرے موت کی طرف بڑھتا ہے وہ اپنا ضمیر بچ دیتا ہے۔ چنگی بھر ہیروئن کے لئے وہ اپنے بچے بھی بیچ دیتے ہیں۔“

میں حیرت سے سن رہا تھا۔ فارسیہ نے ہیروئن کے بارے میں مجھے بڑی تفصیل سے بتایا مگر میں بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا میں کسی ایسی چیز کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

”تمہیں یقین نہیں آ رہا! چلو میں تمہیں ایسے ہی ایک آدمی سے ملاتی ہوں جو ہیروئن کا عادی ہے جس کی بیوی اور بچے فاقے کرتے ہیں۔ سسک کر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مگر وہ ضمیر فروش شخص گھر کے برتن تک فروخت کر دیتا ہے۔ میں اس کی بیوی سے ایک ہسپتال میں ملی تھی جو اپنا مرنے والا بچہ لئے ہسپتال کے گیٹ پر بیٹھی تھی۔ اس کے

پاس بچے کی دوا کے پیسے نہیں تھے میں نے اس کے بچے کا علاج کروایا۔ اسے دوا لے کر دی اور اس سے شوہر کے بارے میں پوچھا تو وہ مجھے اپنے گھر لے گئی، وہاں میں نے ہیروئن کی تباہ کاری کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ شخص جس کا بچہ مر رہا تھا جس کی بیوی ہسپتال کے گیٹ پر بیٹھی بھیک مانگ رہی تھی وہ گھر کے آگن میں بیٹھا ہیروئن پی رہا تھا۔ مطمئن اور ہر چیز سے بے فکر، بیوی کو دیکھتے ہی اس نے اسے گالیاں دینا شروع کر دیں وہ اس سے پیسے مانگ رہا تھا۔ تاکہ مزید ہیروئن پی سکے۔

یہ زہر بہادر جیسے ضمیر فروش نہ صرف ملک سے باہر بھیج کر کثیر زر مبادلہ کما رہے ہیں بلکہ اپنے ملک کے ان معصوم بچوں اور لوگوں کو بھی اس کی لت ڈال رہے ہیں جو ہمارے ملک کے مضبوط ستون بن سکتے ہیں جو پاکستان کا مستقبل ہیں۔ کسی ماں کا بیٹا، کسی عورت کا سہاگ اور کسی بہن کا بھائی ان درندوں کی سفاکی سے محفوظ نہیں ہے۔ اقبال، میں ان کے منصوبوں کو خاک میں ملانا چاہتی ہوں۔ میں ان لوگوں کے خون آشام بچوں سے اپنے ملک کے معصوم بچوں کو بچانا چاہتی ہوں۔ تم..... تمہیں اس کام میں میرا ساتھ دینا ہے، بولو میرا ساتھ دو گے؟“

”مس فارسیہ آپ حکم کریں بس..... میں آپ کے ساتھ ہوں، موت ہی مجھے میرے عہد سے ہٹا سکتی ہے ورنہ دنیا کی کوئی طاقت مجھے میرے عہد سے نہیں ہٹا سکتی۔ میں وہی کروں گا جو آپ کہیں گی۔“ میں نے پُر عزم لہجے میں جواب دیا۔

”تھینک یو مسٹر اقبال، مجھے تم سے یہی امید تھی۔ اب سنو۔ سیماں تمہیں جمال بنا کر استعمال کرنا چاہتی ہے وہ جانتی ہے کہ تم جمال نہیں مگر وہ تمہیں بلیک میل کرے گی۔ تمہاری جمال سے مشابہت نے ہی اسے اس پلان پر عمل کرنے کا خیال دلایا ہو گا۔ میں چاہتی ہوں کہ تم اس سے ملو اس نے خط میں تمہیں ملنے کو لکھا ہے۔ ایڈریس بھی دیا ہے اور نمبر بھی۔ تم اس پر یہی ظاہر کرو گے کہ تم اس کی باتوں سے خوف زدہ نہ گئے ہو۔ وہ تمہارے بارے میں تفصیل سن چکی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ تم بڑی مصیبتوں سے گزرے ہو اور تمہیں ڈرا دھمکا کر اپنے کام میں لایا جاسکتا ہے۔ وہ تم سے ہمارے بارے میں بہت سی باتیں کرے گی۔ ہمیں غلط ثابت کرنے اور تمہیں غیر محفوظ ہونے کا احساس دلانے گی۔ تمہیں اپنے لئے کام کرنے پر مجبور کرے گی، تم اس کی باتیں مان لینا۔ اس پر بالکل ظاہر نہ

کرنا کہ تم اس کے یا بہادر کے بارے میں سب کچھ جانتے ہو۔ اس طرح ہمارا کام آسان ہو جائے گا۔ میں تم سے خود ہی مل لیا کروں گی۔ بس ایک بات یاد رکھو کہ ہمیں سیماں کے پلان کو تباہ کرنا ہے ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈلوانا ہیں تاکہ وہ مزید معصوم لوگوں کو تباہ نہ کر سکیں۔“

”جیسا آپ کہیں گی ویسا ہی ہو گا مس!“

”شاباش‘ اب ایک بات اور‘ آج سے تمہاری ٹریننگ شروع۔ میں نے ایک خاتون کو آج شام بلایا ہے۔ وہ تمہیں انگریزی پڑھائے گی اور ڈرائیونگ سکھائے گی۔ کل ہم شاہنگ کریں گے۔ تمہارے لئے ضرورت کی چیزیں خریدنا ہیں۔ فلیٹ کا انتظام بھی کرنا ہے۔ وہ میں شام تک کر لوں گی۔ میں نے ایک جگہ بات کی ہوئی ہے شام تک مجھے جواب مل جائے گا۔ انشاء اللہ ہم کل رات کو وہاں جائیں گے۔ ٹھیک..... تم پڑھنے کے لئے تیار ہونا؟“

”جی!“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”اوکے اس وقت تو ہم واپس گھر چلتے ہیں کل میں تمہیں مینا سے ملواؤں گی۔“

”مینا کون ہے جی؟“

”وہی ہیروئن پینے والے کی بیوی۔ بچاری، محنت مزدوری کر کے بچوں کا پیٹ پالتی

ہے۔“

یہ کہہ کر فاریہ نے گاڑی اشارت کی۔ درمیان میں وہ ایک مرتبہ پھر اسی ریستوران میں گئی تھی جہاں ہم نے اُس روز چائے پی تھی اور جہاں وہ انگریز فاریہ سے ڈر گیا تھا۔ وہ تقریباً پندرہ منٹ تک اندر رہی پھر واپس آئی اور گاڑی اشارت کر کے گھر کی طرف چل پڑی

ہم آدھے گھنٹے بعد ہی گھر پہنچ گئے

میں اپنے کمرے میں گیا تو سلطان میرا منتظر تھا۔ مجھے بھی اس سے بہت سی باتیں کرنا تھیں۔ اسے دیکھ کر میں خوش ہو گیا۔ ”بیٹھو سلطان۔ بیگ صاحب کے سامنے میں تم سے کچھ بھی نہیں پوچھ سکا تھا۔ اب مجھے ایک ایک بات بتاؤ۔ ایک ایک لمحے کی تفصیل تاکہ میرے دل کو قرار آ سکے۔“ میں نے بے تابانہ انداز میں کہا۔

”ہاں بالے میں جانتا تھا۔ اس لئے تو آیا ہوں۔ تو بتا..... وہ سب کہاں ہیں؟ راجہ کہاں گیا؟ اور تو..... تو یہاں کیوں ہے؟“

میں نے سلطان کو ساری بات سنائی۔

”بالے یار..... پتا نہیں کیا بات ہے پر مجھے یہ لوگ اچھے نہیں لگے۔ میں بیگ صاحب سے شاید تیسری بار ملا ہوں، مگر جانے کیوں مجھے اندر سے یہ احساس ہوتا ہے جیسے بیگ صاحب کے شفیق چہرے کے پیچھے کوئی خوفناک چہرہ ہے، جیسے یہاں سب غلط ہو رہا ہے۔“

”ارے نہیں یار یہ تیرا وہم ہے..... یہ لوگ..... یہ لوگ تو فرشتے ہیں فرشتے۔ بیگ صاحب اور..... وہ مس فاریہ، وہ کہتی ہیں کہ اگلے ہفتے وہ خود تیرے ساتھ جا کر میری ماں اور سوہنی وغیرہ کو یہاں لے آئیں گی۔ سوچ تو سلطان بھلا میں نے انہیں کیا دیا ہے میرے لئے وہ سب کچھ کیوں کر رہی ہیں، کیا لالچ ہے انہیں!..... کچھ بھی نہیں، میرے پاس ہے ہی کیا جو میں انہیں دے سکتا ہوں۔ یہ سب کچھ وہ اللہ واسطے کر رہے ہیں۔ سلطان، اور اللہ واسطے وہی کرتا ہے جو خوف خدا رکھتا ہو، خدا کے بندے کو خوش رکھ کر آخرت میں اس کا صلہ چاہتا ہو، یہ لوگ اتنے امیر ہیں انہیں بھلا دنیا میں اور دولت لے کر کیا کرنا ہے۔“

سلطان نے عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ یوں جیسے میں کوئی دیوانہ ہوں۔ پاگل ہوں۔

”کیا دیکھ رہا ہے اس طرح؟“

”کچھ نہیں..... بالے خدا کرے تو سچ کہتا ہو۔ معلوم نہیں راجہ کو کیا ہو گیا ہے۔ اسے تو آدمیوں کی بڑی پہچان تھی۔“ اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

”سلطان، تو غلط سمجھ رہا ہے، چھوڑ ان باتوں کو۔ بتا ماں مجھے یاد کرتی ہے؟ سوہنی..... وہ کیسی ہے؟“ میں نے اس کے قریب ہو کر پوچھا۔

”ماں تو ہر آہٹ پر دوڑتی ہے بالے، وہ سمجھتی ہے کہ تو..... تو صغرا کو لینے گیا ہے بس ابھی آجائے گا۔ میں تیرا دوست بن کر گیا تھا مجھے بھی یہی کہہ کر بٹھالیا گیا تھا کہ بلا ابھی آتا ہے بہن کو لینے گیا ہے۔“ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ماں صغرا کا انتظار

کر رہی ہے، اسے بیٹے پر کتنا مان ہے کہ وہ بس کی حفاظت کرے گا مگر اسے کیا معلوم کر اس کا پہاڑ سا بیٹا موت کے راستے میں بھر بھری دیوار بن کر رہ گیا ہے ”اور..... سوہنی.....؟“

”وہ..... وہ تو چپ تھی۔ خاموش پتھریلی، اس کی آنکھوں میں ایک دیا سا ٹمٹما لگتا تھا، انتظار کا، یا آس کا، معلوم نہیں اس کے دل میں کیا ہے اس کے لب تو پتھرائے ہوئے تھے۔ بالے میں جتنی دیر وہاں بیٹھا اسے خاموش ہی دیکھا۔ ہاں البتہ ماسی میراں مجھے تجسس سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے..... میں نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ اس لئے کہ چوہدری وغیرہ تجھے مردہ سمجھے ہوئے ہیں۔ وہ آئے تھے ماں کے پاس، سارے محلے کے سامنے تیرے جیل سے فرار ہونے اور پھر پولیس مقابلے میں کام آ جانے پر افسوس کرنے۔ وہ ماں اور ماسی میراں کو کچھ پیسہ بھی دے گئے تھے۔ ان کا یہ کردار بہت خوفناک ہے مگر گاؤں کے سادہ لوگ اسی خباثت کی وجہ سے انہیں دیوتا بنا کر پوجتے ہیں۔ وہ ان کی معصوم آنکھوں کو کیسا دھوکا دیتے ہیں۔“

”میں..... میں انہیں گاؤں والوں کے سامنے ہی کتنا بنا دوں گا سلطان، ان کی یہ کاریوں کا بھانڈا پھوڑ دوں گا۔ میں انہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تم دیکھ لینا.....“ غصے سے میری مٹھیاں بھینچ گئیں۔

سلطان نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”میں تیرے ساتھ ہوں بالے۔ میں جو دکھ تیری ماں اور سوہنی کی آنکھوں میں دیکھ آیا ہوں اسے بھول جانا میرے بس میں رہا نہیں۔ میں دنیا میں اکیلا ہوں۔ ایک ماں کی خاطر میری جان بھی چلی گئی اور اسے خوشی مل گئی تو سمجھوں گا سب کچھ مل گیا۔ میں کرشن نگر میں رہتا ہوں بالے، تجھے گھر کا پتا لکھ کر دے رہا ہوں۔ وقت ملے تو میرے پاس ضرور آنا، مجھے اپنا بھائی سمجھ، تو یہاں اکیلا نہیں ہے میں تیرے ساتھ ہوں۔“

”شکریہ سلطان..... میں..... میں تجھے ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ آؤں گا ضرور تیرے پاس۔“

سلطان کھڑا ہو گیا۔

”تو جا رہا ہے؟“

”ہاں یار کچھ کام ہیں اور پھر اپنوں سے ملے زمانے ہو گئے ان سے بھی تو ملنا ہے نا۔“

”اپنے.....؟ ابھی تو تو کہہ رہا تھا کہ.....“

”میرے اپنے وہ لوگ ہیں جو میرے چاروں طرف رہتے ہیں، میرے دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں، یعنی محلے والے۔“ وہ ہنس کر بولا۔

”اوہ..... سچ وہی لوگ تو اپنے ہوتے ہیں۔“

پھر سلطان چلا گیا۔ میرے ذہن میں ماں کا اداس اور منتظر چہرہ گھوم گیا، سوہنی کی غم ناک اور پتھرائی نگاہیں چھوڑ کر، میں بے دم سالیٹ گیا۔ دن کے ڈھائی بجے یعقوب کھانے کے لئے کہنے آیا تو میں نے اپنا کھانا وہیں کمرے میں منگوا لیا۔ میں بہت تھکن اور بے چینی سی محسوس کر رہا تھا۔ کھانا کھا کر لیٹ گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ جب ماں یہاں آ جائے گی اور مجھے یہاں اکیلا دیکھے گی تو اس کی کیا حالت ہو گی۔ اسے کیسے بتاؤں گا کہ صغرا اسے، مجھے اور ہم سب کو چھوڑ کر جا چکی ہے۔ کیسے بتاؤں گا کہ اس کے پاؤں کانٹوں سے زخمی تھے، وہ اس قابل ہی کہاں تھی کہ وہ زندگی کی اتنی لمبی مسافت طے کرتی؟ میں جانے کیا کیا سوچتا رہا اور وقت دیوار پر لگی اس شیشے کی گول چکی میں قید ہونے کے باوجود گزرتا رہا۔ کھڑکی کے پردے سے چھن کر آنے والی دھوپ کی تیزی میں کمی ہو گئی۔ پرندوں کے چچھمانے کی آوازیں تیز ہو گئیں۔ میں یونہی بے سدھ بستر پر پڑا ماضی کے دکھتے لمحات کو سوچتا رہا۔

دروازے پر ہونے والی دستک نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو ایک انگریز عورت کو اپنے سامنے دیکھ کر بوکھلا گیا۔

”مسٹر اقبال ٹم ہے؟“ اس نے انگریزی لہجے میں پوچھا۔

”جج..... جی..... ہاں جی میں ہوں۔“

”بوائے ہم مسز مائیکل ہے۔ تم کو پڑھانا اور ٹرینڈ کرنا مانگتا ہے۔“ اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

تب مجھے یاد آیا کہ مس فاریہ ان کا ذکر کر چکی تھیں۔ ”آئیے..... اندر آئیے۔“ میں نے انہیں اندر آنے کا راستہ دیا۔ اسی وقت مس فاریہ بھی آ گئیں۔

”مسٹر اقبال، انہی کا ذکر میں نے کیا تھا۔ یہ تمہیں پڑھائیں گی اور ڈرائیونگ بھی

سکھائیں گی۔ دیکھو اقبال، ان کا کہا ہوا ہر لفظ تمہارے علم میں اضافہ کرے گا۔ اس لئے تمہاری ساری توجہ انہی کی جانب ہونا چاہئے۔“

”جی مس فاریہ!“

”میں چلتی ہوں، یعقوب چائے لے آئے گا۔“

”تھینک یو مس فاریہ، چھائے اچھے چیز ہائے۔“ مسز مائیکل نے مسکرا کر کہا۔

مسز مائیکل چونتیس پینتیس برس کی خوبصورت چہرے اور متناسب جسم کی مالک تھی۔ پہلے روز اس نے پڑھانے کی بجائے ادھر ادھر کی بہت سی باتیں کیں، کچھ مجھ سے پوچھا اور کچھ اپنے ملک اور لوگوں کے بارے میں بتایا۔ وہ ہر بات اور واقعے کو بڑی تفصیل سے اور ٹھہر ٹھہر کر بتا رہی تھی۔ اس کے بات کرنے کا انداز بہت اچھا تھا میں بہت جلد اس کی باتوں کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے لگا۔ اس کی باتوں اور قصوں میں بلاشبہ بڑا علم چھپا ہوا تھا۔ میں اس سے پہلے روز ہی مانوس ہو گیا۔ ہم نے ساتھ چائے پی۔ چائے پینے کے دوران میں اس نے مجھے چھوٹی چھوٹی باتوں پر ٹوکا مگر اس کے ٹوکے کا انداز بھی بڑا شفیق اور محبت آمیز تھا۔

رات کا کھانا بھی ہم نے ڈائننگ روم میں ساتھ ہی کھایا۔ تمام چیزیں ایسی تھیں جو چھڑی اور کانٹے، چمچے سے کھائی جاتی ہیں۔ پہلے تو میں کافی زروس ہوا پھر آہستہ آہستہ مجھ میں خود اعتمادی پیدا ہونے لگی۔ مسز مائیکل اور میرے درمیان جو جھجک تھی وہ بھی دور ہو گئی۔ وہ کسی بچے کی طرح ہی مجھے سمجھا رہی تھی۔

اگلے روز مس فاریہ مجھے بازار لے گئیں اور انہوں نے میرے لئے اتنا کچھ خریدا کہ میں خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کرنے لگا۔ اتنی بڑی بڑی دکانوں سے اتنا قیمتی سامان خریدنے کا تو میں خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس روز گھر آ کر میں نے نماز پڑھی اور سجدے میں گر کر خدا کا شکر بجالایا جس نے مجھے زمین سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیا تھا۔

پندرہ روز میں ہی میں نے اپنے اندر زمین و آسمان کا فرق محسوس کیا۔ اب میں بہت خود اعتمادی سے بات کرتا تھا۔ میری تو چال ہی بدل گئی تھی۔ لباس اور وضع قطع تو بالکل ہی بدل گئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اب اگر میں اپنے گاؤں چلا جاؤں تو شاید کوئی بھی مجھے

پہچان نہ سکے۔ سوہنی بھی نہیں شاید ماں بھی ایک لمحے کو دھوکا کھا جائے اور اگر چوہدری یا راجو مجھے اس حال میں دیکھ لے تو ان کی تو گھگھکی بندھ جائے گی۔

مس فاریہ بہت خوش تھیں۔ انہیں میرے اتنی جلد بدل جانے کی توقع نہ تھی۔ ”اقبال تم نے کمال کر دیا۔ سچ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم..... تم میں اتنی کوالٹی ہے۔“

”تھینک یو میڈم!“ میں نے سر کو ذرا سا خم کر کے جواب دیا۔ وہ میرے اس انداز پر بڑی دیر تک ہنستی رہی۔ ”تمہارے ساتھی اور تمہارے گاؤں والے تمہیں پہچاننے سے انکار کر دیں گے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے میڈم۔ ویسے سارا کریڈٹ مسز مائیکل کو جاتا ہے جنہوں نے مجھ پر اتنی محنت کی۔“

”مجھے یقین تھا..... میں انہیں جانتی ہوں۔ اچھا جناب اب آپ ذرا تیار ہو جائیں۔ ہمیں جانا ہے۔“

”کہاں میڈم؟“

”ایک جگہ..... ضروری تو نہیں تمہارے ہر سوال کا جواب دوں!“

”سوری میڈم..... ریلی آئی ایم ویری سوری۔“

”سو آل رائٹ!“ انہوں نے بڑی خوشی سے جواب دیا۔

میں ان سے اجازت لے کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ پندرہ منٹ بعد تیار ہو کر باہر نکلا تو مس فاریہ میری منتظر تھیں۔

”عالبابا گاڑی تم ڈرائیو کرو گے!“

”نو میڈم..... میں آپ کے سلسلے میں رسک نہیں لے سکتا۔ فی الحال میں جب تنہا ہوتا ہوں تو ڈرائیو کرتا ہوں لیکن بہت جلد میں آپ کو خود ڈرائیو کر کے لے جاؤں گا۔ میرا مطلب ہے گاڑی میں ڈرائیو کروں گا۔ مگر آج نہیں پلیز.....“

”اوکے..... مگر اس کام کو بھی جلد نمٹا دو۔“ اس نے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

”جی میڈم!“ میں دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔

مس فاریہ نے گاڑی اشارت کی۔

”اب خود کو کیسا محسوس کر رہے ہو؟“

”بہت ہلکا پھلکا..... خود اعتمادی پیدا ہو گئی ہے مجھ میں۔ میرا خیال ہے کہ میر بہت کچھ سیکھ سکتا ہوں۔“

”ویری گڈ‘ میں یہی سننا چاہتی تھی۔ اقبال آج تمہیں سیمال کو فون کرنا ہے۔ اسے بتانا کہ اتنے دن تم خوفزدہ ہونے کی وجہ سے فون نہیں کر سکے اور تم سوچ رہے تھے کہ تمہیں فون کرنا چاہئے یا نہیں‘ تمہیں میرا اور بیگ صاحب کا ڈر تھا۔ آج تم نے اسے فون کر لیا تو ظاہر ہے وہ تمہیں آنے کو کہے گی تم اس سے وعدہ کر لینا کہ تم ضرور آؤ گے۔ مگر ایک شرط پر کہ وہ یہ بات کسی کو نہیں بتائے گی یعنی مجھے یا بیگ صاحب کو‘ گویا تم سب سے چھپ کر اس سے ملنا چاہتے ہو۔ پھر تم وہاں جانا وہ مزید تمہیں خوفزدہ کرنے کی کوشش کرے گی۔ ممکن ہے اپنی ماں کا قاتل بنا کر تمہیں پکڑوانے کی دھمکی بھی دے۔ اس کا مقصد تمہیں خوفزدہ کرنا ہے اور تم ہو جاؤ گے۔ وہ جو کچھ آفر کرے اسے کچھ پس و پیش کے بعد قبول کر لینا اور اس پر یہی ظاہر کرنا کہ ہم نے تمہیں گھریلو ملازم کی حیثیت سے رکھا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم میری بات سمجھ رہے ہو؟“

”جی میڈم بہت اچھی طرح..... فون مجھے کب کرنا ہو گا؟“

”آج رات‘ گھر سے۔ بات جلدی جلدی اور گھبرا کر کرنا جیسے تم موقع مل جانے؛ گھر سے ٹیلی فون کر رہے ہو اور تمہیں ڈر ہے کہ کوئی آنہ جائے۔ کہہ دینا کہ ہم لوگ باہر گئے ہوئے ہیں۔ ٹھیک.....!“

”اوکے میڈم.....“

اچانک اس نے گاڑی روک دی۔ وہ ایک اونچی رہائشی عمارت تھی‘ جس کے گراؤنڈ فلور پر دکانیں تھیں۔ ”آؤ.....“

میں اتر گیا۔ ہم دونوں عمارت کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں سیڑھیاں تھیں اور سیڑھیوں کی دائیں جانب لفٹ تھی۔ فاریہ نے لفٹ کا بٹن دبایا۔ چند منٹ بعد ہی لفٹ نیچے آ گئی۔ لفٹ میں ایک لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ جو فاریہ پر نگاہ پڑنے ہی کھڑا ہو گیا۔ اس نے ادب سے سلام کیا اور ایک طرف ہو کر ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔

”یہ بلڈنگ انکل کی ہے۔“ فاریہ نے کہا۔

مجھے حیرت ہوئی۔ یہ بہت بڑی بلڈنگ تھی۔ ہم ساتویں منزل پر لفٹ سے باہر آ گئے۔ غالباً یہ عمارت کی آخری منزل تھی۔ لفٹ کے باہر ایک خوبصورت سادہ دروازہ تھا جس پر پیتل کا ایک بڑا سا کنڈا لٹک رہا تھا فاریہ اس دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ فاریہ نے بڑھ کر کنڈا ہلایا۔

چند منٹ بعد ہی دروازہ کھل گیا۔ سامنے سفید کپڑوں میں ملبوس ایک پندرہ بیس برس کا لڑکا کھڑا تھا فاریہ کو دیکھتے ہی وہ ذرا سا جھکا اور ایک طرف ہو گیا۔ ہم آگے پیچھے اندر داخل ہو گئے۔ فلیٹ اندر سے بے حد خوبصورت تھا۔ اندر قیمتی فرنیچر لکھا ہوا تھا اور ہمارے پیروں کے نیچے دبیز قالین بچھے ہوئے تھے۔ فلیٹ کی سجاوٹ قابل دید تھی۔

”مسٹر اقبال..... یہ آپ کا فلیٹ ہے۔“ مس فاریہ نے مسکرا کر کہا۔

”جی..... مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ میں گھوم گھوم کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ ”مم..... مس فاریہ..... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں..... آپ مذاق.....“

”جی نہیں..... میں مذاق کے موڈ میں کم ہی ہوتی ہوں۔ یہ سچ ہے کہ یہ آپ کا فلیٹ ہے۔ یہاں آپ رہیں گے۔ چند دن بعد یہاں ٹیلی فون بھی لگ جائے گا۔ اس لڑکے کا نام شاہد ہے۔ یہ آپ کا ملازم ہے۔ آپ کی ضرورتوں کا خیال رکھنے کے علاوہ کھانا پکانا بھی اس کا کام ہے اور دوسری خوشخبری یہ بھی ہے کہ آپ کل صبح فیکٹری بھی جا رہے ہیں۔ آپ کو فیکٹری کا کام بھی تو سمجھنا ہے نا؟“

فاریہ نے مجھے پورا فلیٹ دکھایا۔ فلیٹ میں تین بیڈ رومز تھے۔ ایک میرا اور ایک شاہد کا اور ایک بیڈ روم خالی تھا۔ فاریہ نے کہا کہ یہ تمہاری ماں کا بیڈ روم ہے۔ یہ اس وقت تک بند رکھنا ہے جب تک تمہاری ماں نہ آ جائے۔

میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں فاریہ کے قدموں میں گر کر شکریہ ادا کروں مگر میں جانتا تھا کہ فاریہ اس ادا کو پسند نہیں کرے گی۔ خوشی کے مارے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ میں نے برداشت کیا اور اٹھ کر ہاتھ روم چلا گیا۔ میں نے وہاں خدا کا شکر ادا کیا اور

چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے اور منہ پونچھتا ہوا باہر آ گیا۔

شاہد چائے کا سامان لے آیا تھا۔ ہم نے چار کرسیوں والی چھوٹی سی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر چائے پی۔ چائے پیتے ہی فارسیہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اقبال! چلو، تمہیں کل شام تک یہاں شفٹ ہو جانا چاہئے۔“

ہم وہاں سے چلے آئے۔ بیگ صاحب سے ملاقات ہوئے تین دن گزر چکے تھے۔ اب جو ہم گھر پہنچے تو بیگ صاحب لان میں ٹہل رہے تھے۔ ہماری گاڑی دیکھتے ہی لپک کر ہمارے قریب آ گئے۔ فارسیہ نے انہیں دیکھ کر گاڑی وہیں روک دی بیگ صاحب کے ہاتھ میں اخبار تھا۔

”کیا بات ہے انکل؟ آپ پریشان ہیں!“

”یہ..... یہ دیکھو۔“ اتنا کہہ کر انہوں نے اخبار فارسیہ کے سامنے کر دیا۔ اخبار پر سامنے ہی اس انگریز آدمی کی تصویر تھی جسے میں فارسیہ سے خوفزدہ ہو کر بھاگے دیکھ چکا تھا۔ اس ریسٹوران میں جہاں میں نے پہلی بار فارسیہ کے ساتھ چائے پی تھی۔

”کیا ہوا اسے؟“ فارسیہ نے اطمینان سے پوچھا۔

”مر گیا..... بلکہ مار ڈالا گیا۔“ بیگ صاحب نے بھرائے ہوئے انداز میں کہا۔

”آپ نے مارا ہے؟“ فارسیہ نے اسی اطمینان سے پوچھا۔

”کک..... کیا کہہ رہی ہو..... میں کیوں ماروں گا اسے.....“ وہ گہرا کر

ایک دم پیچھے ہٹ گئے۔

”تو پھر آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟ موت آئی تھی مر گیا، یہاں ہزاروں آدمی روز

مرتے ہیں یا مار ڈالے جاتے ہیں۔ آپ کس کس پر پریشان ہوں گے۔“

”فارسیہ تم..... تم سمجھ نہیں رہی ہو..... یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔“

پر بات آ سکتی ہے۔“

”اندر جائیے آپ..... میں وہیں آ رہی ہوں۔“ اس کے لہجے میں تحکم تھا۔

میرے بدن میں جانے کیوں سردی لہر دوڑ گئی۔ شاید اس کے لہجے میں چھپی سفاکی سے۔

مجھے محسوس ہوا جیسے میری پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آئے ہوں۔ میں نے

اختیار ہتھیلی سے پیشانی رگڑی۔ فارسیہ نے ایک دم گاڑی چلا دی۔ بیگ صاحب اچھل کر

پیچھے ہٹ گئے تھے ورنہ وہ گاڑی سے ٹکرا کر گر جاتے۔

فارسیہ نے گاڑی پورچ میں کھڑی کی۔ میں فوراً ہی اتر کر باہر کھڑا ہو گیا۔ میرا خیال تھا

وہ کچھ کہے گی، مگر اس کا موڈ بہت خراب ہو چکا تھا۔ اس کے ہونٹ بھیچے ہوئے تھے۔

آنکھوں میں چنگاریاں سے سلگتی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ کچھ کہے بنا برآمدے کی طرف

بڑھ گئی۔ بیگ صاحب تیز قدموں سے اس کی طرف لپکے ان کا چہرہ سفید ہو رہا تھا اور وہ

کانی بوکھلائے ہوئے لگ رہے تھے۔

میں چند منٹ وہیں کھڑا رہا پھر الجھے ذہن کے ساتھ کمرے میں آ گیا۔ وہ شخص مر گیا۔

بلکہ مار ڈالا گیا تھا جسے چند روز پہلے ریسٹوران میں جیتے جاتے دیکھا تھا جو مضبوط مرد ہونے

کے باوجود فارسیہ جیسی نازک اندام لڑکی سے خوفزدہ ہو گیا تھا۔ وہ فارسیہ سے خوفزدہ کیوں

تھا؟ یہ سوال سانپ بن کر میرے ذہن میں پھنکائیں مارنے لگا تھا۔

میں کمرے میں آ کر کپڑے بدلے بغیر ہی بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ مجھے اس کی موت کی خبر

سن کر دکھ ہوا تھا۔ بیگ صاحب کو بھی دھچکا لگا تھا۔

مگر فارسیہ اتنی مطمئن کیوں تھی؟ اسے دکھ کیوں نہیں ہوا..... اور..... بیگ

صاحب کہہ رہے تھے کہ ہم پر بھی بات آ سکتی ہے۔ یہ خیال آتے ہی میرے رونگٹے

کھڑے ہو گئے۔ اُس روز فارسیہ کے ساتھ میں بھی تھا۔ جب وہ ریسٹوران میں ہم سے ملا

تھا۔ بہت سے لوگوں نے ہمیں دیکھا ہو گا اور اب جبکہ وہ قتل ہو چکا ہے اس کے قتل کی

تفتیش کی جائے گی اور..... پھر ریسٹوران کے لوگ بتائیں گے کہ وہ اس روز.....

میں گہرا کر اٹھ بیٹھا۔ اس سے آگے سوچنے کی مجھے ہمت ہی نہ ہوئی۔

”یارب..... خیر کرنا..... جانے میں کن چکروں میں پڑ گیا ہوں۔ الٹی

پروردگار مجھ پر رحم کرنا۔“ میں نے دل سے دعا کی۔ میرا دل بہت گہرا رہا تھا۔ جی چاہتا تھا

کہ میں بھاگ جاؤں، اپنے گاؤں جہاں سکون تھا، چین تھا، اپنا گھر اور گھر کی خوشیاں تھیں

مگر..... اب تو وہاں بھی امان نہیں ہے، وہ گھر اور گھر کی خوشیاں تو جانے کب کی تباہ

ہو چکی تھیں۔ وہ پُر سکون لہجے میری دسترس سے بہت دور جا چکے تھے۔ گہرا ہٹ اتنی بڑی

کہ میں اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

مزمائیل کی آمد نے طبیعت کی بے چینی کو کچھ کم کر دیا۔ ورنہ لگتا تھا جیسے طوفان

ساہے جو مجھے بہا کر کہیں دور لے جائے گا۔ مسز مائیکل حسب سابق اپنا سبق لے کر بیٹھ گئیں کچھ دیر تو طبیعت اس طرف مائل ہی نہ ہوئی مگر رفتہ رفتہ میں نے پڑھائی میں دلچسپی لینا شروع کر دی دو گھنٹے کے بعد ہم ڈرائیونگ کے لئے نکل گئے۔ مسز مائیکل بڑے دھیمے لہجے میں بات کر رہی تھیں۔ ذہن کو تھپکنے والے انداز میں، کچھ ہی دیر بعد میں نے اس ٹینشن سے نجات پالی جو مجھے بے چین کئے ہوئے تھی۔

آج مسز مائیکل مجھ سے بہت خوش تھیں کہ میں نے ڈرائیونگ میں کوئی غلطی نہیں کی تھی جس پر انہیں ٹوکنا پڑتا۔ ”اوہ بوائے ابھی تم ایک دم پرفیکٹ ہے۔“

”تھینک یو..... میں روزانہ ایک گھنٹا تنہا گاڑی ڈرائیو کرتا ہوں مسز مائیکل۔“
 ”اوہ ریئلی؟ تم بہت اسٹبل جنٹ ہے بوائے۔ بہت بہترین لائف گزارے گا تم۔“
 ”خدا کرے ایسا ہو مسز مائیکل۔ مجھے تو لگتا ہے کہ زندگی مجھے گزار دے گی۔“ میں نے لمبی سانس لے کر کہا۔

”وہاٹ؟“

”کچھ نہیں!“ میں نے مختصر سا جواب دیا۔

”دیکھو بوائے تم بہت اپ سیٹ ہے، یہ لائف ہے، یہاں تم اکیلا نہیں ہے، دوسرا لوگ بھی ہے، سب اپنا اسٹائل میں لائف گزارتا ہے کبھی کبھی دوسرا لوگ بھی تو اپ سیٹ ہوتا ہے۔“

میں چونک اٹھا۔ اس نے صحیح کہا تھا۔ جس طرح میں دوسروں کی وجہ سے پریشان ہوں بالکل اسی طرح بہت سے لوگ میری وجہ سے بھی تو پریشان ہوں گے پھر میں..... میں کیوں اپ سیٹ ہوں؟

”ویل مسٹر اقبال ہم کو یہاں ڈراپ کرو۔“ مسز مائیکل نے اچانک ہی کہا۔

میں نے گاڑی روک دی۔

”اوکے سی یو ٹو مورو۔“

”اوکے سی یو۔“ میں نے جواباً کہا اور مسز مائیکل کو وہاں اتار کر گاڑی آگے بڑھا دی۔ گھر جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا ابھی صرف سات بجے تھے۔ ایک گھنٹا میرے پاس تھا میں یونہی بے مقصد سڑکوں سے گزرتا رہا۔ اچانک ایک جگہ چوراہے پر میری نگاہ پڑی

جہاں گھاس میں سلطان لینا سڑک پر گزرنے والے ٹریفک کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے گاڑی ایک کنارے روک دی۔ اس کارنر پر لمبی والے کی دکان تھی میں نے لمبی کا ایک گلاس بنوایا اور آہستہ آہستہ پینے لگا۔ اسی وقت سلطان اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر انگڑائی لی اور چوراہے کی دائیں جانب جانے والی پتلی سے گلی میں مڑ گیا۔ میں نے جلدی سے لمبی کے پیسے دیئے اور خود بھی اسی طرف چل دیا۔ مگر میرے قریب پہنچنے تک وہ غائب ہو چکا تھا۔ لوگوں سے معلوم کرنے پر پتا چلا کہ میں کرشن نگر میں کھڑا ہوں۔ سلطان نے اپنے گھر کا ایڈریس دیا تھا، مگر اس وقت وہ پرچی میری جیب میں نہیں تھی جس پر مکان نمبر وغیرہ لکھا تھا۔ میں نے ریٹ وائچ پر نگاہ ڈالی ساڑھے سات بجے تھے۔ اس وقت اس کا گھر تلاش کرنا بیکار تھا۔ ظاہر ہے کہ مجھے اس کے پاس بیٹھنا بھی پڑتا اور اتنا وقت میرے پاس تھا نہیں۔ میں واپس گاڑی کے پاس آ گیا۔ میں نے دروازہ کھولا اور گاڑی اشارت کر دی۔

گاڑی آہستہ رفتار سے چلاتا ہوا میں کوٹھی پہنچ گیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ فاریہ کا موڈ اب کیسا ہے، بیگ صاحب سے اس کی کیا بات ہوئی اور سیماں کو فون کرنے کا پروگرام ہے یا نہیں۔ مگر میں اپنے وقت پر گھر پہنچ گیا تھا۔ فاریہ کی گاڑی پورچ میں موجود تھی۔ میں بہت تھک گیا تھا اس لئے سیدھا کمرے میں چلا آیا۔ کمرے میں آ کر میں نے کپڑے تبدیل کئے اور لیٹ گیا۔ شاید مجھے تھکن کی وجہ سے نیند آگئی۔ ساڑھے آٹھ بجے یعقوب نے مجھے اٹھایا اور بتایا کہ مس فاریہ ڈائننگ روم میں میرا انتظار کر رہی ہیں۔

میں ڈائننگ روم میں داخل ہوا تو وہاں فاریہ اکیلی تھی۔ میں نے اس کے چہرے سے اس کے موڈ کا اندازہ لگانا چاہا مگر میں اپنی کوشش میں ناکام رہا، وہ اس وقت کچھ لکھنے میں مصروف تھی۔ میں خاموشی سے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ فارغ ہو گئی۔

”کیسے ہو؟“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”ٹھیک ہوں اور آپ؟“

”میں بھی..... آج تمہیں فون کرنا ہے۔“

”جی میں منتظر تھا۔“

وہ انہی اور اس نے کارنر ٹیبل پر رکھا فون سنٹرل ٹیبل پر رکھ دیا۔ ”میں نمبر ملاتی

گیا۔ پتا نہیں پھر چھٹی ملتی ہے یا نہیں۔ ٹھیک؟“
”جی بہتر۔“

فارہ کھڑی ہو گئی۔ ”مجھے اب کچھ کام ہیں تم آرام کرو۔“ یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔
میں پھر اپنے کمرے میں آ گیا۔ بستر پر لیٹا تو پھر نیند آ گئی۔ ایسا سویا کہ دوسرے دن اٹھ بجے
انٹا۔ یعقوب نے بتایا کہ وہ کھانا لے کر آیا تھا مگر میں نے دروازہ نہیں کھولا تھا۔ اس نے
کڑکی سے جھانک کر دیکھا اور مجھے سوتے سے اٹھانا بہتر نہیں سمجھا۔ یہ اس نے اچھا ہی
کہا۔ کیسی گہری نیند تھی۔ تمام رات ٹوٹ کر سویا تھا۔ شاید اس لئے طبیعت بڑی ہلکی پھلکی
نہی۔ منہ دھو کر ناشتے کی ٹیبل پر پہنچ گیا۔ بیگ صاحب موجود تھے۔ مگر بڑے پڑمردہ سے
چہ اتر ا ہوا تھا ان کا۔ مجھے دیکھ کر کسی خاص گرم جوشی کا اظہار نہیں کیا۔ میرے سلام کا
باب دے کر چائے کی چسکیاں لینے لگے۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھے۔ میں خاموش سے
ہانٹا کرنے لگا۔

”ارے تم..... اقبال، تم یہاں بیٹھے ہو فارہ تمہارا فیکٹری میں انتظار کر رہی ہو
گی۔“ ایک دم انہوں نے چونکتے ہوئے کہا۔ ”اوہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ وہ مجھ سے کہہ کر
گئی تھی کہ تمہیں جلد از جلد فیکٹری بھیج دوں۔“ میں چائے چھوڑ کر اٹھ گیا۔ تیز قدموں
سے کمرے میں آ گیا اور تین منٹ میں تیار ہو کر آ گیا۔ بیگ صاحب کا ڈرائیور تیار تھا۔
مجھے دیکھتے ہی اس نے گاڑی اشارت کر دی۔ ہم پندرہ منٹ میں ہی فیکٹری پہنچ گئے۔
گیٹ پر موجود ایک شخص نے اپنی رہنمائی میں مجھے فارہ کے کمرے تک پہنچا دیا۔
”میری منتظر تھی۔“ تم لیٹ ہو گئے ہو؟“

اس نے سپاٹ لمبے میں کہا۔
”جی مجھے علم نہیں تھا کہ یہاں پہنچنا ہے۔ جیسے ہی بیگ صاحب نے بتایا میں فوراً چلا
آیا۔“

”کیا ہو گیا ہے انکل کو۔ بالکل لاپرواہ ہو گئے ہیں۔ جن باتوں کو سیریس لینا چاہئے
انہیں نہیں لیتے۔“ وہ بڑبڑائی۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔ وہ مختلف فائلوں پر دستخط کر رہی
تھی۔ ایک صاحب انہیں فائل اٹھا کر دے رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ فارغ ہو گئی۔
”چلو.....!“ اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

ہوں۔“ اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
میں قریب سرک آیا۔ اس نے نمبر ملایا اور ریسیور میرے ہاتھ میں دے دیا۔ دوسری
طرف رنگ جا رہی تھی۔

”ہیلو!“ کچھ دیر بعد دوسری طرف سے ایک بھاری مردانہ آواز سنائی دی۔

”ہیلو جی! وہ..... مس سیمیاں ہیں؟“

”آپ کون ہیں؟“ آواز پھر آئی۔

جی..... وہ..... میں جی اقبال.....

”اوہ ہولڈ کرو۔“

میں انتظار کرنے لگا۔ فارہ مجھے گہری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد سیمیاں
کی مترنم آواز سنائی دی۔ ”کون بول رہا ہے؟“
”میں جی اقبال ہوں۔ آپ نے کہا تھا جی فون کرنے کو..... اس روز.....“
میں ڈر گیا تھا جی اس لئے نہیں آیا۔“

”بے وقوف ہو تم۔ ان چوہوں سے کیا ڈرنا، خیر کیسے ہو تم؟“

”اچھا ہوں جی۔ میں بند کر رہا ہوں جی وہ لوگ آ جائیں گے۔“

”ارے بند نہ کرنا۔ تم میرے پاس کب آرہے ہو۔ دیکھو اقبال مجھے تم سے بہت
سی ضروری باتیں کرنا ہیں۔ تمہارے فائدے کی باتیں ہیں۔ نہیں آؤ گے تو بہت بڑا نقصان
اٹھاؤ گے۔“

”آؤں گا جی پر ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جب چھٹی ملے گی تو آؤں گا۔“

”سنو میں پرسوں تمہارا انتظار کروں گی۔ شام کو۔ کسی طرح بھی آ جانا۔“

”اچھا جی میں بس بند کر رہا ہوں۔ گاڑی آئی ہے جی شاید وہ لوگ آ گئے۔“ یہ کہہ

کر میں نے خدا حافظ کے بغیر ریسیور کرڈیل پر رکھ دیا۔

”ونڈر فل..... اچھی ایکٹنگ تھی۔ ایک دم جاہل لگ رہے تھے۔“ فارہ ہنس

دی۔ ”کیا کہہ رہی تھی؟“

میں نے فون پر ہونے والی ساری باتیں اسے بتا دیں۔

”تم پرسوں نہیں کل ہی شام کو پہنچ جانا۔ کہہ دینا کہ چھٹی مل گئی ہے اسی لئے میں آ

”مسٹر اقبال، یہ آپ کا کمرہ ہے۔ یہ چیئر آپ کی ہے، فی الحال آپ آفس مینجر کی حیثیت سے یہاں کام کریں گے۔ کام کے بارے میں پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ عذرا آپ کو سب کچھ بتا دے گی۔ اب آپ اس چیئر پر تشریف رکھیں۔ کچھ دیر بعد عذرا آپ سے مل لے گی۔ اور ہاں اس اوپر کی دراز میں آپ کے وزٹنگ کارڈ رکھے ہیں۔ اوکے سی

اس سے پہلے کہ مجھ پر جنونی کیفیت طاری ہو جاتی میں نے خود کو سنبھال لیا۔ مجھے راتوں اور چوہدری کا خیال آگیا جو مجھ سے میری رعنائیاں چھیننے کے ذمے دار تھے۔ ان کا

فارسیہ مجھے ایک ایک چیز کے بارے میں بتا رہی تھی۔ جب ہم سلامتی کرنے والوں کے قریب آئے تو میری نگاہ انتہائی دائیں جانب رکھی مشین کو چلانے والی لڑکی پر پڑی اور میں اچھل پڑا۔

”اقبال یہ عذرا ہے۔ ہماری بہترین ورکر..... میں اس کے بارے میں پھر کبھی بتاؤں گی فی الحال اتنا کافی ہے کہ یہاں تمہیں جو کچھ کرنا ہے اس کے بارے میں عذرا ہی تمہیں سب کچھ بتائے گی۔ گویا فیکٹری کے معاملات میں یہ تمہاری مدد کرے گی۔“

”چلو اقبال..... میں تمہیں کرا دکھا دوں۔“

میں چونک پڑا۔

خیال آتے ہی دکھ غصے میں ڈھل گیا اور میری تمام جنونی کیفیت گویا میری مٹھی میں سمٹ آئی اور بند مٹھی کو میں نے اتنی طاقت سے میز پر مارا کہ باہر کھڑا چپراسی فوراً ہی اندر آ گیا۔

”نہیں سر!“

”آں.....“ میں چونک اٹھا۔

وہ میرے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی چونک گیا۔ ”سر آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“

”آں.....؟ ہاں..... پانی پلاؤ۔“ میں نے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا۔

وہ تیزی سے باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد آیا تو اس کے ہاتھ میں ٹھنڈے پانی کا گلاس تھا جسے میں ایک ہی گھونٹ میں پی گیا۔ وہ میرے سامنے منسوب کھڑا رہا۔ میں نے گلاس اس کی جانب بڑھا دیا۔

”سر..... آپ کی طبیعت.....“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”چائے مل سکے تو.....“

”کیوں نہیں سر..... ابھی لیجئے۔“ وہ پھرتی سے باہر چلا گیا۔

پانی پی کر میری کیفیت کچھ بہتر ہو گئی تھی۔ شاید اس لئے بھی کہ ان قاتل سوچوں سے چھٹکارا مل گیا تھا۔ میں نے خود کو قابو میں کر لیا تھا۔ چپراسی جلد ہی چائے لے آیا۔ میں چائے کی چسکیاں لے رہا تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

”کم ان!“ میں نے اونچی آواز میں کہا۔

دروازہ کھلا اور چپراسی اندر آ گیا۔ ”سر! مس عذرا آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔“

”ہاں انہیں اندر بھیج دو..... اور سنو، ان کے لئے بھی چائے لے آؤ۔“

”اوکے سر!“ وہ اٹھ کر قدموں گھوما اور اس نے دروازہ کھول کر عذرا کو اندر آنے کا

اشارہ کیا۔

”ہیلو مس عذرا..... آئیے۔“ میں کھڑا ہو گیا۔

”تھینک یو۔“ وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”اور کیا ایکٹیویٹیز ہیں آپ کی؟“

”بس کام اور..... کام اور کام۔“ وہ ہنس کر بولی۔

”ہوں..... گویا آپ چوبیس گھنٹے کام کرتی ہیں۔“

”جی..... ہاں یوں ہی سمجھ لیجئے۔ یہاں سے جا کر بھی بہت سے کام میرے منتظر

ہوتے ہیں۔“

”کہاں جا کر؟“

”گھر اور کہاں؟“

”گھر..... آپ کا گھر؟“

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا، شاید میرے لہجے کی چھین محسوس کر لی تھی اس

لئے۔

”جی ہاں..... میرا گھر ویسے آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“

”مس عذرا سوری، آپ میری بات کا مطلب غلط نہ لیں۔ میرا مطلب تھا کہ

عورت کا گھر تو وہی ہوتا ہے جو اس کا اپنا ہو، غالباً آپ شادی شدہ نہیں ہیں؟“

”اوہ.....“ وہ ہنس دی۔ ”آپ کے سوال کا انداز عجیب تھا۔ آپ ٹھیک کہتے

ہیں، وہ میرا گھر نہیں ہے۔ میں اپنی خالہ کے ساتھ رہتی ہوں۔ میرے ماں باپ بھی نہیں

ہیں۔“

”اوہ سوسائڈ.....“

”تھینک یو میڈم!“ عذرا نے جواباً کہا۔ ”مجھے اجازت دیں تو.....“

”ہاں ضرور مجھے تمہاری یہی بات اچھی لگتی ہے کہ تم وقت کو ضائع نہیں کرتیں،

ایسے لوگ ہمیشہ کامیاب رہتے ہیں۔“ عذرا کے جانے کے بعد فاریہ نے مجھے غور سے

دیکھا۔

”اقبال تمہاری آنکھیں تمہارے چہرے کے تاثرات کا ساتھ نہیں دے رہیں۔ لگتا

ہے الجھے ہوئے ہو، کیا بات ہے؟“

”میڈم، آپ عذرا کے متعلق بتانا چاہتی تھیں اگر کچھ بتا دیں تو شاید میری الجھن

رفع ہو جائے۔“

”کیا مطلب؟ کیا یہ الجھن عذرا سے متعلق ہے؟“

”جی میڈم..... آپ نے جب سے میری ملاقات عذرا سے کروائی ہے میں الجھن میں ہوں۔ میں آپ کے قریب کسی بھی ایسے شخص کو دیکھنے کا خواہش مند نہیں ہوں جو جھوٹ بولتا ہو۔“

”کیا تم عذرا کو جانتے ہو؟“ اس نے چونک کر مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”شاید.....“

”کیسے؟“

پھر میں نے فاریہ کو بس والا واقعہ سنا دیا۔ ”اس کا نام عذرا ہے یا سکیئر..... میں نہیں جانتا مگر مجھ سے جھوٹ بولنا ضروری نہیں تھا۔ میں اس کے لئے ایک اجنبی شخص تھا۔ اس کا نام کچھ بھی ہو مجھے اس سے غرض نہ تھی۔ شاید اس نے آپ سے جھوٹ بولا ہو۔“

”ہوں..... تو وہ تم تھے.....“ فاریہ نے لمبی سانس لے کر کہا۔

”جی؟“

”عذرا نے مجھے بتایا تھا۔ ویسے تمہاری بات پر خوشی ہوئی کہ تم میرے قریب کسی جھوٹ بولنے والے کو پسند نہیں کرتے۔ عذرا نے مجھ سے جھوٹ نہیں بولا ہے اقبال۔ اس نے جو کچھ بتایا ہے اس کی میں تصدیق کر چکی ہوں۔ یہ سچ ہے کہ اس عورت اور مرد سے اس کا کوئی تعلق نہیں سوائے اس کے کہ وہ انہیں بچپن سے دیکھتی چلی آرہی ہے۔ انہی لوگوں نے اسے پالا پوسا اور پڑھایا لکھایا ہے مگر دل پر شیطان کا قبضہ ہوتے کتنی دے لگتی ہے۔ کسی نے اس عورت کو جسے عذرا ماں سمجھتی تھی بھڑکایا کہ اتنی خوبصورت لڑکی کو لٹے پھوٹے گھر میں کیوں بیٹھی ہو۔ اس کی خوبصورتی تو تمہیں بنگلا اور گاڑی تک دے سکتی ہے۔ اسی لالچ میں وہ عورت اسے یہاں لے آئی۔ وہ یہاں اس سے پیشہ کرنا چاہتی تھی مگر یہ اتفاق تھا کہ پہلے روز ہی میری ملاقات ہو گئی۔ عذرا کی تمام رام کہانی سن کر میں نے اس کی مدد کا وعدہ کر لیا اور اس کی ماں سے کہہ دیا کہ عذرا تمہیں اتنا کم کر دے گی کہ تم عیش سے زندگی گزار سکو مگر اسے اس کی مرضی کے خلاف استعمال کرنے کی کبھی کوشش نہ کرنا ورنہ میں دونوں کو جہنم رسید کر دوں گی۔ وہ دونوں ڈر گئے اور اب عذرا ہر ماہ تین ہزار روپے ان کی ہتھیلی پر رکھ دیتی ہے۔ ابھی اسے دوسری تنخواہ

ہی ملی ہے مگر وہ لوگ اب خوش ہیں۔“

فاریہ خاموش ہوئی تو سناٹا چھا گیا۔

”مس فاریہ اگر وہ عورت مس عذرا کی کوئی نہیں تو پھر اس کے ماں باپ

.....؟“

”ان کے بارے میں عذرا نہیں جانتی جب چھوٹی تھی تبھی سے یہ عورت اور مرد اس کے ساتھ ہے۔ اسی عورت نے بتایا تھا کہ وہ اس کی مرحوم بہن کی بیٹی ہے مگر اس بات پر نہ مجھے اعتبار ہے اور نہ عذرا کو مگر وہ عورت اس کے سوا کچھ نہیں بتاتی۔ خیر وقت ملا تو اصل بات بھی اگلا لیں گے۔ بہر حال عذرا ان دونوں کی اتنی ہی عزت کرتی ہے جتنی ماں باپ کی کی جانی چاہئے۔“

مجھے عذرا کے اکیلے پن کا شدت سے احساس ہوا شاید اس لئے کہ اس عذاب سے میں بھی گزر رہا تھا۔

اسی وقت چہرہ اسی نے دروازے پر دستک دی۔ میرے اجازت دینے پر وہ چائے کی رے لئے اندر آ گیا۔ چائے کے ساتھ سمو سے بھی تھے جنہیں دیکھتے ہی مجھے بھوک محسوس ہونے لگی۔ میں نے ناشتا پوری طرح کیا ہی کب تھا کہ بیگ صاحب نے یہاں بھیج دیا۔

ہم چائے پینے کے دوران میں باتیں کرتے رہے۔ عذرا نے میرے بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کی۔ وہ بہت جلد کام کی باتیں کرنے لگی۔ اس نے مجھے بتایا کہ یہاں روزانہ پچاس ہزار جیکٹ اور پینٹ تیار کی جاتی ہیں جن کا حساب کتاب رکھنا اور انہیں باہر بھیجنا اب میری ذمہ داری ہے۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ قدم قدم پر میری مدد کرے گی۔ پھر اس نے اپنے ساتھ لائی ہوئی فائل کھول کر مجھے وہ آرڈر دکھائے جو ہماری فیکٹری کو باہر سے ملے تھے۔ زیادہ تر مال جرمنی بھیجا جا رہا تھا دوسرے نمبر پر امریکہ اور تیسرے نمبر پر انگلستان تھا۔ عذرا ہی سے مجھے معلوم ہوا کہ فیکٹری میں تین ہزار ورکرز کام کرتے ہیں جبکہ باہر ممالک میں بھی ہمارے نمائندے موجود ہیں جو آرڈر لینے اور یہاں سے بھیجا ہوا مال ریسیو کر کے پارٹیز کو دینے کا کام کرتے ہیں۔

عذرا تقریباً دو گھنٹے وہاں بیٹھی مجھے ایک ایک بات بتاتی رہی جسے میں غور سے سنتا اور ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کی یادداشت پر مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ وہ

کسی کمپیوٹر کی طرح بول رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے فیکٹری سے متعلق ہر بات اس کمپیوٹر میں فیڈ کر دی گئی ہو۔

مجھے یہ سب سن کر حیرت کے ساتھ ساتھ خوشی بھی ہوئی کہ یہ لوگ اس قدر امیر و کبیر ہوتے ہوئے بھی کس قدر سادہ اور شفیق تھے۔ عذرا نے بھی فاربیہ کی بے حد تعریف کی۔ اس نے بتایا کہ فاربیہ، عذرا کو سگی چھوٹی بہنوں کی طرح چاہتی ہے اور اس کا خیال رکھتی ہے۔ میں جو بیگ صاحب اور فاربیہ سے پہلے ہی بہت متاثر تھا یہاں آکر مزید متاثر ہو گیا تھا۔

عذرا تقریباً دو گھنٹے بعد چلی گئی تھی۔ اس کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد انٹرکام بول اٹھا۔

”ہیلو!“

”اقبال کیا کھانے کا پروگرام نہیں ہے؟“ دوسری طرف فاربیہ تھی۔

”کیوں نہیں ویسے آپ کا کیا پروگرام ہے؟“

”چلے آؤ میں نے کھانے کا آرڈر دے دیا ہے۔“

”اوکے..... آئی ایم جسٹ کم انگ۔“

میں نے ریسپور کریڈل پر رکھ دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

میں فاربیہ کے کمرے میں پہنچا تو وہاں فاربیہ کے علاوہ عذرا بھی موجود تھی۔ کھانا آچکا تھا اور وہ لوگ میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔ کھانے کے دوران میں مکمل خاموشی رہی۔ میں جانتا تھا کہ فاربیہ خاموشی کے ساتھ کھانے کی عادی ہے شاید عذرا بھی اس بات سے واقف تھی، اس نے بھی اس دوران میں کوئی بات نہیں کی۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو چائے آ گئی۔

”ویل مسٹر اقبال؟“ فاربیہ نے تولیے سے ہاتھ منہ پونچھتے ہوئے کہا۔ ”یہاں آکر

کیسا لگا؟“

”اچھا..... بہت اچھا“ میرا خیال ہے کہ کچھ روز کی محنت اور توجہ کے بعد

ایکسپرٹ ہو جاؤں گا۔“

”میں بھی یہی چاہتی ہوں۔ عذرا نے جو کچھ سمجھایا ہے اسے ذہن نشین کر لیا۔“

”؟“

”جی ہاں میرا خیال ہے کہ میں ذہن نشین کر چکا ہوں۔“

”ویری گڈ..... اقبال، عذرا میری بہت اچھی ساتھی ہے گو اس ساتھ کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا میرے خیال میں جس روز تم سے ملاقات ہوئی شاید اسی روز عذرا سے بھی ملاقات ہوئی ہے۔ عذرا بھی تم جیسی ذہین اور مخلص ہے اور میں ذہین اور مخلص لوگوں کی قدر کرتی ہوں۔ یہ ایسے لوگ نہیں ہوتے جنہیں ضائع کر دیا جائے۔ تم چاہو تو گھر جاسکتے ہو۔ میری گاڑی لے جاؤ۔ میں دیر سے آؤں گی۔“

”تھینک یو میڈم۔ آپ کو پرالیم تو نہیں ہو گی؟“

”نہیں میں آفس کی گاڑی میں آجاؤں گی۔“ یہ کہہ کر اس نے دراز میں سے گاڑی

کی چابی نکال کر میری جانب بڑھادی۔

”اوکے..... خدا حافظ میڈم۔“

”خدا حافظ۔“ اس نے جواب دیا اور میں باہر آ گیا۔ ابھی ساڑھے تین بجے تھے۔

میں سڑک پر پہنچا تو سابق رات اٹھ بجے آتیں اس لئے میرے پاس بہت وقت تھا۔ میں فیکٹری کے باہر آیا تو موسم بے حد دلکش ہو رہا تھا۔ آسمان پر گہرے بادل تھے، ہوا میں عجیب سی فرحت انگیزی تھی جس نے مجھے فریش کر دیا۔ میں یونہی بے مقصد ایک سڑک پر مڑ گیا۔ کچھ دیر بعد ہی بوندیں پڑنے لگیں۔ گویا موسم اور خوبصورت ہو گیا۔ میں بے خیالی میں کرشن نگر پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر میں نے جیسیں ٹولیں۔ سلطان کا دیا ہوا ایڈریس میرے پرس کی چھوٹی جیب میں موجود تھا۔ میں نے پاس سے گزرنے والے ایک لڑکے کو روک کر ایڈریس کی پرچی اس کی طرف بڑھادی۔

”جی یہ سامنے والی گلی ہے نا اس میں چلے جائیں آگے جا کر گلی دائیں طرف مڑ جاتی

ہے بس اسی موڑ پر ایک لال بلڈنگ ہے۔ وہاں سے آپ کو ان کے گھر کا پتا چل جائے گا۔

وہ اسی بلڈنگ کے ایک حصے میں رہتے ہیں۔“

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور سامنے والی پتلی سے گلی میں مڑ گیا۔ گلی بہت پتلی

تھی۔ گاڑی لے جانا بہت دشوار لگ رہا تھا مگر موڑ پر سے گلی چوڑی ہو گئی تھی۔ میں نے

گاڑی ایک طرف پارک کر دی اور پیدل اس بلڈنگ کی طرف بڑھ گیا۔ بلڈنگ بہت خستہ

نکل گیا۔

سلطان سے مل کر مجھے اپنا ماضی یاد آ جاتا تھا۔ راجہ وغیرہ کو گئے اتنے دن ہو چکے تھے مگر انہوں نے پلٹ کر میری خبر بھی نہ لی تھی۔ اب تو میں ان لوگوں کا انتظار کر کر کے تھک چکا تھا بلکہ اب تو مجھے یوں لگتا تھا جیسے مجھے کسی کا بھی انتظار نہیں کرنا چاہئے۔ میں کسی کھونٹے کی طرح فاریہ اور بیگ صاحب کے آنگن میں گڑ گڑ رہ گیا ہوں۔

میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ سلطان چائے کے برتن لئے اندر داخل ہوا، ساتھ ہی پلیٹ میں گرم گرم سمو سے بھی تھے۔

”یار بارش میں گرم گرم سمو سے بہت مزے کے لگتے ہیں۔“ اس نے تخت پر بڑے کہتے ہوئے کہا۔

”سلطان تم یہاں کیا کرتے ہو؟“

”میں..... میں مستقل تو کچھ نہیں کرتا۔ آج کل چوڑیوں کے کارخانے میں کام کر رہا ہوں۔ تم بتاؤ، تم آج کل بڑے بابو بن گئے ہو کیسے اور کیوں؟“

”میں بیگ صاحب کی فیکٹری میں ملازمت کر رہا ہوں۔ وہ لوگ بہت اچھے ہیں سلطان، انہوں نے مجھے پڑھایا لکھایا ہے، گاڑی چلانا سکھایا ہے اور آج فیکٹری میں میرا پہلا دن تھا۔ میرا خیال ہے کہ میں یہ کام بھی جلد سمجھ لوں گا۔“

”کیا کام؟“ اس نے سوال کیا۔ اس کی آنکھوں میں شبہ تھا۔
میں نے اسے فیکٹری کے کام کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتا رہا۔

”یہ لوگ تیرے ساتھ یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہیں..... یہاں ہزاروں ایسے لوگ ہیں جو پڑھے لکھے ہیں، ڈگریاں ہیں ان کے پاس، نوکریاں ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ ان لوگوں کو یہ لوگ واپس کر دیتے ہیں پھر..... تجھ پر اتنی محنت کیوں کر رہے ہیں۔ آخر کیوں..... یہ بات میرے حلق سے نہیں اترتی بالے کہ وہ سب کچھ تیری ہمدردی میں کر رہے ہیں۔ یہاں کی کچی بستیاں نہیں دیکھیں تو نے، وہاں گرمی سے جھلتے ہوئے، بھوکے پیاسے بچے نہیں دیکھے، بارش اور آندھی سے ٹوٹی ہوئی چشتیں نہیں دیکھیں۔ ان لوگوں سے ہمدردی کیوں نہیں ہے ان لوگوں کو.....؟“ اس کا لہجہ بہت زہریلا تھا۔

حالت میں تھی مگر تھی بہت بڑی۔ اس کے بڑے سے دروازے پر ایک عورت مل گئی جو غالباً اپنے بچے کو آوازیں دے رہی تھی۔ میں نے اس سے سلطان کے بارے میں پوچھا۔
”وہ اپنے کمرے میں ہے! ادھر سے اوپر جاؤ۔ تیسرا کمرہ اس کا ہے۔“ اس نے سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ میں اس طرف بڑھ گیا۔ اوپر پہنچ کر میں نے سلطان کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

”اؤ کون اے؟“ اندر سے سلطان کی بھرائی ہوئی آواز آئی، میں نے جواب دیا۔
کچھ دیر بعد دروازہ کھلا تو سامنے سلطان کھڑا آنکھیں مل رہا تھا۔ غالباً وہ سو کر اٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی مجھ سے پلٹ گیا۔ اسے شاید توقع نہیں تھی کہ میں اس سے ملنے آؤں گا۔

”آؤ بادشاہو.....“ وہ خوش ہو کر بولا۔

میں اندر داخل ہوا۔ چھوٹا سا کمرہ تھا، صاف ستھرا سا۔ ایک طرف ایک تخت پڑا تھا جس پر صاف ستھری چادر بچھی تھی۔ تخت کے پاس ہی کرسی رکھی تھی۔ سلطان نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو میں کرسی پر بیٹھ گیا۔
”مجھے یقین نہیں تھا کہ تم آؤ گے۔“

”میں نے تم سے وعدہ کیا تھا پھر کیوں نہ آتا۔“
بالے تو بہت بدل گیا ہے بالکل نہیں لگتا کہ تو وہی بالا ہے جو ہمارے ساتھ یہاں تک آیا تھا۔“ اس نے سر سے پاؤں تک مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

”وقت سب کچھ بدل دیتا ہے سلطان..... میں نے شر آنے اور یہاں محنت کرنے کے خواب دیکھے تھے مگر جس طرح یہ سب کچھ میرے سامنے آیا ہے وہ ناقابل یقین اور غیر متوقع ہے۔ سلطان..... یوں لگتا ہے جیسے میں کسی آبشار میں گر گیا ہوں جس کا تیز بہاؤ مجھے تنکے کی طرح پہاڑوں، صحراؤں اور کھیتوں سے بہاتا ہوا انجانی سمت لے جا رہا ہے۔ اتنے سے دنوں میں مجھ پر صدیوں کی تھکن طاری ہو گئی ہے مگر..... میں یوں بنے جانے پر مجبور ہوں، کچھ بھی نہیں کر سکتا نہ معلوم میری قسمت مجھے کہاں لے جا رہی ہے۔“

”تو بیٹھ میں ابھی آتا ہوں۔“ اچانک وہ اٹھ کھڑا ہوا اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے باہر

جھلتا ہوا..... آگ اگتا ہوا۔

میں خاموشی سے سنتا رہا۔ نہ معلوم کیوں وہ بیگ صاحب اور فاریہ سے اتنا متفرق تھا۔ اسے میری کسی بھی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ وہ ہر مرتبہ صرف یہی ایک بات کہتا تھا کہ بالے کچھ گڑبڑ ہے..... دال میں کچھ کالا ہے۔ تجھے محتاط رہنا چاہئے۔

جہاں تک محتاط رہنے والی بات تھی وہاں تک تو وہ ٹھیک تھا۔ میں خود بھی محتاط رہنا چاہتا تھا مگر گڑبڑ والی بات میرے حلق سے نہیں اترتی تھی۔ بیگ صاحب اور خصوصاً فاریہ کو مشکوک سمجھنا میرے بس سے باہر تھا۔ حالانکہ کچھ باتیں ایسی ہو چکی تھیں جن سے مجھے بھی شک ہوا تھا مثلاً وہی انگریز والی بات، جو بعد میں قتل کر دیا گیا مگر میں فاریہ سے جس قدر قریب ہو رہا تھا اتنا ہی اس کی ذات میں میرا اعتماد بڑھتا جا رہا تھا اور جب سے اس نے سیماں اور بہادر والا قصہ سنایا تھا اور ان کے خلاف مجھ سے تعاون کا وعدہ لیا تھا اس وقت سے تو میں اس کی انسان دوستی سے اتنا متاثر ہوا تھا کہ بیان مشکل ہے۔

سلطان کو جواب دینا بھی میرے بس میں نہیں تھا۔ وہ بھی ٹھیک کہتا تھا مگر ایک بات میں جانتا تھا کہ انسان پہلے اس کے لئے کچھ کرتا ہے جسے وہ جاننے لگے، پھرے ساتھ بھی یہی ہوا تھا، بیگ صاحب اور فاریہ مجھے جان گئے تھے۔ میری داستان سن چکے تھے شاید اسی لئے.....

”تمہارے پاس جواب نہیں ہے نا ان باتوں کا..... میں جانتا تھا۔ کسی کے پاس بھی ان باتوں کا جواب نہیں ہو گا۔“ اس نے نفرت سے جواب دیا۔

”مگر سلطان.....“

”جھوٹا بالے..... کوئی اور بات کر..... بس میں صرف ایک بات کہوں گا کہ اپنا خیال رکھنا، تیری ماں تیرا بڑی شدت سے انتظار کر رہی ہے اور سوہنی..... جو کسی کی بھی نہیں صرف تیری ہے، وہ ابھی جوان ہے بالے، اسے تیرا انتظار ہے، اتنی دیر نہ کر دینا کہ وہ راکھ ہو جائے۔“

سلطان کے ان دو جملوں نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ ایک دم میں گھبرا کر اٹھا۔ یوں لگا جیسے اس کو ٹھڑی میں ذرا دیر اور رہا تو مر جاؤں گا۔ میں کھڑا ہو گیا۔

”کہاں جا رہا ہے، ابھی تو آیا ہے۔“

”نہیں دوست..... میں پھر آؤں گا۔“

سلطان مجھے غور سے دیکھتا رہا۔ رک جانے کے لئے زیادہ اصرار نہ کیا۔ میں اس سے اجازت لے کر باہر نکل آیا۔ تیزی سے سیڑھیاں عبور کیں اور گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ بوندیں اب بھی پڑ رہی تھیں مگر موڈ تباہ ہو چکا تھا۔ گھبراہٹ اب بھی طاری تھی۔ میں تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتے ہوئے کوٹھی پہنچ گیا۔ گاڑی پورچ میں روک کر میں نے چوکیدار کو چابیاں دے دیں اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

سلطان کی باتوں نے مجھے ڈیپریس کر دیا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں سب کچھ چھوڑ کر ماں کے پاس پہنچ جاؤں۔ سوہنی کے پاس جو میرا انتظار کر رہی ہو گی۔ جس کی ویران آنکھیں خالی دروازے کو تک رہی ہوں گی۔ میں کپڑے بدل کر برآمدے میں آکر کھڑا ہو گیا۔ یقیناً نے چائے کے لئے پوچھا مگر میں نے منع کر دیا۔

وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا اور میں خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ آج فاریہ سے اس موضوع پر کھل کر بات کروں گا۔ اسے صاف کہہ دوں گا کہ ماں کے بنا میرا دل نہیں لگتا۔ اگر وہ چاہتی ہے کہ میری تمام تر توجہ کام کی طرف ہو تو اسے ماں کو یہاں لانا پڑے گا۔ یہ فیصلہ کر کے میں مطمئن ہو گیا۔

آسمان پر اب بھی بادل تھے۔ کسی کسی وقت بوندیں پڑتیں اور پھر معدم ہو جاتیں، اب اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ مسز مائیکل ایسے موسم میں بھی ٹھیک وقت پر پہنچ گئیں۔

”اے بوائے تم ٹھیک ہو نا؟“

مجھے ان کی قیافہ شناسی پر حیرت ہوئی۔ حالانکہ میں ان سے مسکرا کر ملا تھا پھر بھی انہوں نے نے بھانپ لیا تھا کہ میں اداس ہوں، ڈیپریس ہوں۔ میرا جی چاہا کہ میں مسز مائیکل کو سب کچھ بتا دوں مگر جانے کیا سوچ کر میں خاموش ہو گیا۔ مسز مائیکل اپنا سبق لے کر بیٹھ گئیں۔ ہم حسب معمول دو گھنٹے تک بیٹھے پڑھتے رہے پھر مسز مائیکل اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میں نے انہیں ڈراپ کرنے کی آفر کی جسے انہوں نے بڑی محبت سے قبول کر لیا۔ میں کپڑے بدلے بغیر انہیں چھوڑنے چلا گیا۔

مسز مائیکل کو ڈراپ کر کے واپس آیا تو چوکیدار نے مجھے فاریہ کا پیغام دیا۔ وہ ڈرائنگ روم میں میری منتظر تھی۔ میں سیدھا ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔

”اقبال‘ آج تمہیں سیماء کے پاس جانا تھا۔“

”اوہ میں تو بالکل بھول گیا تھا۔“

”کوئی بات نہیں، مگر کوشش کرنا کہ یادداشت کمزور نہ ہو۔ بیٹھو ہمیں بہت سی باتیں طے کرنا ہیں۔“ میں اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔

”اقبال‘ اگر تم کل سیماء کے پاس جاتے ہو اور وہ تمہیں روکنے کی کوشش کرے تو.....“

”اس معاملے میں ہر فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”ٹھیک ہے ایسا کرتے ہیں کہ تم کل وہاں جاؤ۔ پھر جو کچھ بھی وہ کہے اس کے مطابق فیصلہ کریں گے کہ کیا کرنا چاہئے۔ ظاہر ہے کل تم وہاں نہیں روکے۔ اصولاً تمہیں واپس آکر اپنا سامان وغیرہ لینا ہو گا۔ وہ کبھی نہیں چاہے گی کہ ہمیں اس بات کا پتا چلے کہ تم یہاں سے اس کے پاس چلے گئے ہو۔ اس لئے وہ کوئی ایسی ترکیب کرے گی جس سے وہ محفوظ رہ سکے۔“

”میڈم‘ میں نہیں جانتا کہ کل کیا ہو گا اس لئے اس بارے میں پہلے سے کچھ طے کرنا یا فیصلہ کرنا غیر مناسب ہے۔ بس ایک بات طے ہے کہ میں وہی کروں گا جو آپ چاہیں گی۔“

”ٹھیک کہتے ہو تم‘ پہلے سے کچھ بھی طے نہیں کیا جا سکتا۔ اوکے کل پھر تم صبح فیکٹری جانے کی بجائے سیدھے وہاں جاؤ۔ ایک بات کا خیال رکھنا کہ اپنے پرانے کپڑے پن کر جانا۔ اسے شبہ نہ ہو کہ تم پہلے والے اقبال نہیں ہو چیل بھی غالباً تمہارے پاس ہیں وہی پرانے.....“

”جی ہاں۔ سب کچھ ہے وہ پرانی چیزیں میرے لئے بہت قیمتی ہیں میڈم‘ وہ کپڑے میری ماں نے سی کر دیئے تھے اس کی خوشبو آتی ہے ان سے۔“

”اوہ..... اقبال میں اس ہفتے بہت مصروف ہوں ورنہ تمہاری ماں کو.....“

”کوئی بات نہیں میڈم..... پھر سہی..... مگر میرا دل نہیں لگتا اس کے بغیر۔“

تمہاری ماں کی اتنی ہی فکر ہے جتنی کہ تمہیں ہے۔“

”ٹھیک یو میڈم۔“

”اچھا اور کچھ؟“

”جی ہاں۔ ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ سیماء سے ملنے کے بعد میں فیکٹری کیسے جا پاؤں گا۔ کیا معلوم وہ مجھ سے کیا چاہے۔ ممکن ہے وہ مجھے اپنے پاس رکنے کو کہے، اپنے ساتھ کام کرنے کی آفر کرے۔ ایسی صورت میں آپ کے دیئے ہوئے فلیٹ میں شفٹ ہونا یا فیکٹری آنا ممکن ہو سکے گا؟“

”یہ کوئی بات ہی نہیں ہے اقبال‘ اگر وہ تمہیں اپنے ساتھ کام کرنے کی آفر کرے تو فوراً قبول کر لینا۔ یوں سمجھو کہ وہ کام فیکٹری کے کام سے زیادہ منافع بخش ہے۔ اسی طرح ہم جان سکیں گے کہ ان کا طریقہ کار کیا ہے۔ جو کچھ معاوضہ سیماء دے گی اس کا ذیل میں تمہیں دوں گی۔ ہمارا پسلا مقصد اس زہر کی پسلائی کو روکنا ہے۔ فیکٹری کا کام تو یوں بھی چل رہا تھا۔“

”مجھے معاوضے کی فکر نہیں ہے میڈم۔ آپ نے جو کچھ میرے لئے کیا ہے وہ میری توقع اور کام سے کہیں بڑھ کر ہے۔“

”باقی باتیں اس سے ملنے کے بعد طے کر لی جائیں گی۔ وہ فلیٹ تمہارا ہے تم چاہے ابھی جاؤ یا سال بھر بعد۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”ٹھیک ہے میڈم غالباً ہماری ملاقات کل شام ہی کو ہو گی؟“

”نہیں..... تم جیسے ہی وہاں سے واپس آؤ گے مجھے فون کر لینا۔ میں پہنچ جاؤں گی۔“

”اوکے.....“ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

”اور تمہاری پڑھائی کیسی جارہی ہے؟“

”بالکل ٹھیک۔ اب میں انگریزی پڑھنے کے علاوہ لکھ بھی سکتا ہوں۔“

”ویری گڈ۔ اچھا ٹھیک، پھر کل ملاقات ہو گی۔“ وہ بھی کھڑی ہو گئی۔ میں وہاں سے بیدھا اپنے کمرے میں چلا آیا۔ شام والی کیفیت قدرے بہتر ہو گئی تھی۔ رات کا کھانا میں نے کمرے ہی میں کھایا اور لیٹ گیا۔ اب پھر بھیانک سوچوں کے سوا میرے پاس کچھ بھی

نہیں تھا۔ وہ سوچیں جو مجھے لمحہ لمحہ تنہائی کا شدت سے احساس دلاتی تھیں۔ میں کل کے بارے میں خاصا پریشان تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ آنے والی کل مجھے کہاں کہاں لے جائے گی۔ مجھے اپنے غیر محفوظ ہونے کا بھی شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ جانے کل کیا ہونے والا تھا؟

میں سوچوں کے بھنور میں بہتا ہوا جانے کب نیند کی وادی میں پہنچ گیا۔ صبح سویرے ہی آنکھ کھل گئی۔ میں دروازہ کھول کر باہر آیا۔ آسمان پر اب بھی گہرے بادل تھے بارش شاید رات بھر ہوئی تھی، میرے سامنے زمین گیلی تھی اور سوندھی سوندھی خوشبوئیں پھیلی ہوئی تھیں۔ میں پلٹ کر کمرے میں واپس آ گیا۔ مجھے سیمائ کے پاس جانا تھا۔ اس لئے میں نے الماری کھول کر پرانے کپڑے نکال لئے۔ جنہیں دھلوا کر میں نے بڑے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ پوتھین بیگ میں لپٹے ہوئے چپل بھی تھے جن کے تلووں پر میرے گاؤں کی مٹی کے ذرے چپکے ہوئے تھے جن سے مجھے میرے اپنوں کی خوشبو آتی محسوس ہوئی۔

میں نہادھو کر تیار ہو گیا۔ اب میں پھر سے وہی پرانا بالا بن گیا تھا۔ میں نے آئینے میں خود کو دیکھا۔ نئے ہوئے بالوں کو ہاتھوں سے بکھیر دیا اور یعقوب کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد یعقوب میرا ناشتا لے آیا۔ میں نے ناشتا کیا اور سیمائ کے گھر کا ایڈریس لے کر باہر آ گیا۔ فاریہ نے مجھے بتا دیا تھا کہ مجھے وہاں کس طرح پہنچنا ہے۔ میں نے مین روڈ سے گلی برگ جانے والی بس پکڑ لی اور سیدھا گلی برگ پہنچ گیا۔ بہادر صاحب کا گھر ڈھونڈنا بہت مشکل نہ لگا کیوں کہ میں نے جس پہلے شخص کو ایڈریس والا پرچہ تھمایا اسی نے مجھے کوٹھی کے دروازے تک پہنچا دیا۔ بہادر صاحب غالباً اس علاقے کے مشہور شخص تھے۔ ان کی کوٹھی بے حد خوبصورت اور بیگ صاحب کی کوٹھی سے کہیں زیادہ بڑی تھی۔ گیٹ پر ایک چھوٹا سا کمرہ بنا ہوا تھا جس کا دروازہ اندرونی جانب تھا مگر ایک چھوٹی سے کھڑکی باہر کی جانب کھلی ہوئی تھی۔ اندر تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے قریب جاتے ہی ایک شخص کھڑکی کے قریب آ گیا۔ اس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور بولا۔ ”کیا بات ہے؟“

”جی وہ..... بہادر صاحب سے ملنا ہے۔“ میں نے گھگھکیانے کے سے انداز میں جواب دیا۔

”ہو..... کیا نام ہے؟“

”بالا۔“

”بالا..... یہ کیا نام ہوا؟“ وہ زیر لب بڑبڑایا۔ پھر اس نے سامنے رکھے فون پر اندر کسی کو میری آمد کی اطلاع دی۔ چند منٹ بعد ہی اس نے گیٹ کھولنے کا اشارہ کیا اور میں اندر چلا گیا۔ ایک شخص میری رہنمائی کرتا ہوا اندر کوٹھی میں لے گیا۔ کوٹھی اندر سے بلاشبہ خوبصورت تھی۔ ہم ایک ایسے کمرے میں پہنچ گئے جو غالباً ملاقاتیوں کے لئے مخصوص تھا۔ یہ ایک ہال نما کمرہ تھا جس میں تین صوفہ سیٹ اور چھ کرسیاں بڑی ہوئی تھیں۔ درمیان میں سینٹرل ٹیبل رکھی تھیں اور اس پر مختلف رسالے اور اخبارات رکھے تھے۔

وہ شخص مجھے وہاں بٹھا کر اندر چلا گیا۔ پندرہ منٹ تک کمرے میں کوئی نہ آیا۔ میں بہت سویرے آ گیا تھا۔ ممکن ہے سیمائ ابھی سو کر نہ اٹھی ہو یا بہادر صاحب موجود نہ ہوں۔ بہر حال پندرہ منٹ کے انتظار کے بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور سفید کپڑوں میں ملبوس سیمائ میرے سامنے آ گئی۔ وہ اس وقت اتنی معصوم اور اتنی پیاری لگ رہی تھی جیسے آسمان سے اتری ہوئی کوئی حور ہو۔ مجھے فاریہ کی بتائی ہوئی کہانی جھوٹی لگنے لگی۔ ایسی معصوم اور کم سن لڑکی لوگوں میں زندگی تو بانٹ سکتی ہے، ان کے اندر زندہ رہنے کی خواہش کو شدید کر سکتی ہے مگر زہر باٹھنا یا موت کے پروانے تقسیم کرنا..... مجھے ناممکن لگا۔

”اوہ..... اوہ تم آ گئے..... مجھے یقین تھا تم آؤ گے۔ میں تمہیں دوبارہ نہیں کھو سکتی۔ یقین کرو جب میں تم سے ملی تھی آج تک چین نصیب نہیں ہوا۔ ہریل دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں تم پھر مجھ سے دور نہ ہو جاؤ۔“ اس نے میرے سامنے بیٹھتے ہوئے بے تکلف انداز میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لئے بے پناہ پیار تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا اور حالات کچھ اور ہوتے تو شاید میں اپنے آپ کو دنیا کا خوش نصیب ترین آدمی سمجھتا کہ اتنی حسین لڑکی کی آنکھوں میں کسی کے لئے پیار ہونا بہت بڑی بات ہے مگر میں ایسی پوزیشن میں نہ تھا۔

میں اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے خود پر خوف اور گھبراہٹ سی طاری کر لی۔ ”بی بی میں بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچتا ہوں۔ آپ نے تو شام کو بلایا تھا مگر مجھے آج

وہ پہلے تو سنجیدگی سے میری باتیں سنتی رہی پھر زور سے ہنس پڑی۔
”بہت معصوم ہو تم..... تم سمجھتے ہو کہ اس طرح تم کافی کمالو گے! پگلے گیراج پر
بھی تم صرف اتنا ہی کماؤ گے کہ بس اپنا پیٹ بھریو۔ یہاں تو پڑھے لکھے لوگ اتنا ہی کما
پاتے ہیں اور تم تو جاہل ہو۔“

”پھر.....؟“ میں ہونقوں کی طرح اس کی صورت دیکھنے لگا۔
”ایک بات ہو سکتی ہے اگر تم میرے پاس آ جاؤ تو میں تمہیں ایسی نوکری دوں گی کہ
تم لکھ پتی بن جاؤ گے بولو..... میرے ساتھ کام کرو گے؟“
”جی..... لکھ پتی..... کیا..... کیا کام؟“ میں نے تھوک نلگتے ہوئے کہا۔
”کام بعد میں سمجھا دوں گی پہلے بتاؤ، بیگ اور فاریہ کو چھوڑ کر میرے پاس آ سکتے
ہو؟“

”ہاں جی..... وہ کون سے میرے سگے ہیں جی..... مجھے تو پیسا کمانا ہے جی،
کیں نہیں آؤں گا۔“

”شاباش - اب تم فوراً اپنا سامان لے کر یہاں آ جاؤ۔ بلکہ سامان بھی چھوڑو، یہاں
میں تمہیں اتنا کچھ دے دوں گی کہ تمہارے تصور میں بھی نہ ہو گا۔“
”وہ تو ٹھیک ہے جی پر وہ میرا بہت ضروری سامان ہے۔ میری ماں کی نشانیاں ہیں۔
میری بہن کی نشانیاں ہیں۔ انہیں میں کہیں نہیں چھوڑ سکتا میں کل آپ کے پاس آ جاؤں
گا۔“

”لیکن میں نہیں چاہتی کہ فاریہ کو اس بات کا علم ہو کہ تم وہاں سے میرے پاس
آ رہے ہو۔“

”نہیں معلوم ہو گا جی..... میں کہہ دوں گا کہ اپنے گیراج والے دوست کے پاس
بارہا ہوں۔“

”ہاں..... یہ ٹھیک رہے گا۔ میں کل تمہارا انتظار کروں گی۔“ اس نے کھڑے
ہوتے ہوئے کہا۔

میں بھی کھڑا ہو گیا۔ وہ گیٹ تک مجھے چھوڑنے آئی۔ اس نے مجھے گاڑی میں
اڑا پ کرنے کی آفر بھی کی تھی مگر خود ہی یہ آفر واپس لے لی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ

دن بھر کی چھٹی ملی تھی اس لئے سویرے آ گیا۔
”اچھا کیا اقبال..... بہت اچھا کیا تم نے ورنہ صبح سے شام کرنا میرے لئے بہت
دشوار ہو جاتا۔ یہ دو دن بھی بہت مشکل سے گزرے ہیں۔“
میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے آج مجھے جمال نہیں کہا تھا۔
”ناشتا کیا ہے تم نے؟“ اس نے بڑی اپنائیت سے پوچھا۔
”ہاں جی..... شکریہ۔“

”میرے ساتھ چائے پیو گئے نا؟“
”جی..... جیسی آپ کی مرضی۔“ میں نے سر جھکا کر جواب دیا۔
اس نے صوفے کے نیچے لگا بیٹن پاؤں سے دبایا کچھ دیر بعد ایک ملازم سفید وردی
میں اندر آ گیا۔ سیمائے اے ناشتا لانے کو کہا اور اس کے جانے کے بعد مجھ سے مخاطب
ہوئی۔ ”ان لوگوں نے تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں دی نا؟“
”نہیں جی..... تکلیف تو نہیں دی پر..... میں نے جان بوجھ کر بات
ادھوری چھوڑ دی۔“

”پر کیا؟“
”وہ جی..... میں تو شہر اس آس پر آیا تھا کہ کوئی ایسا کام کروں گا جس سے بہت
سایہ کما سکوں اور پھر گاؤں جا کر اپنی ماں کو شہر لے آؤں مگر وہاں تو مجھے اوپر کے کام پر
رکھا گیا ہے..... اب آپ ہی سوچئے اوپر کے کام سے بھلا کیا کماؤں گا۔“
”ان لوگوں سے اس سے زیادہ کی توقع بھی بیکار ہے، کنجوس لوگ ہیں اور ان کے
پاس ہے ہی کیا جو تمہیں دیں گے۔“ اس نے نفرت سے منہ سیکڑتے ہوئے جواب دیا۔
میں خاموش رہا۔ وہ کچھ دیر سوچتی رہی اور گہری نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ پھر
بولی۔ ”اب تم کیا کرو گے، تمہارا کیا ارادہ ہے؟“

”میں سوچتا ہوں یہاں گیراج پر کام کر لوں۔ میرا ایک جاننے والا ہے یہاں اس کا
گیراج ہے۔ گاڑیوں کی مرمت ہوتی ہے وہاں، یہاں سے سیدھا اس کے پاس جاؤں گا۔
اس سے بات کروں گا کہ روزانہ دو تین گھنٹے وہ مجھے کام سکھا دے اس طرح میں کسی قابل
ہو جاؤں گا۔ ہنر آ جائے گا میرے ہاتھ میں۔“

تمہیں کچھ ہی عرصے تک کرنا پڑے گا۔ ان کا اعتماد حاصل ہوتے ہی تم آزاد ہو جاؤ گے۔ شروع میں احتیاط کی ضرورت ہے۔ خود کو ذہن مگر معصوم ظاہر کرنا اور کسی بھی خطرے کو محسوس کرتے ہی وہاں سے نکل کر میرے پاس آجانا۔ ویسے میرا ایک آدمی ہر لمحہ تمہارے تعاقب میں رہے گا محض تمہاری حفاظت کے خیال سے، اس سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے اس کا نام طاہر ہے۔ میں آج ہی اسے تم سے ملا دوں گی تاکہ تم اسے پہچان سکو۔“

مجھے اس ساری گفتگو کے دوران میں یوں لگ رہا تھا جیسے میں کسی محاذ پر بھیجا جا رہا ہوں۔ ایک نامعلوم سا خوف مجھے اندر سے دبوچے ہوئے تھا۔ میں خاموش بیٹھا تھا۔ فاریہ اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ وہ مجھے انتظار کرنے کو کہہ گئی تھی۔ بیک صاحب ادھر ادھر کی گفتگو کرتے رہے مگر میرا ذہن کہیں اور تھا۔ کچھ دیر بعد فاریہ واپس آئی تو ایک لفافہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ پھر میرے بالکل سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے لفافہ میرے سامنے رکھ دیا۔

”اسے رکھو، اس کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔“ اس نے لفافہ سرکاتے ہوئے کہا۔
”یہ کیا ہے؟“

میرے سوال کا اس نے جواب نہیں دیا بلکہ ہاتھ بڑھا کر لفافہ اٹھایا اور دوسرے ہی لمحے ہاتھ نکالا تو اس میں ایک چھوٹا سا ریوا لور تھا۔ میرے بدن پر چیونٹیاں سی ریگ گئیں۔ مجھے یوں لگا جیسے میں بالکل پہلے کی طرح سپاہی غلام رسول کا ریوا لور لیے غیر ہموار پہاڑیوں پر ننگے پاؤں چڑھ رہا ہوں۔ میری سانس پھولی ہوئی اور میرے پاؤں زخمی ہیں۔
”یہ بتیس بور کا ریوا لور ہے۔ اس کا استعمال تمہیں آتا ہو گا“ نہیں آتا تو میں ابھی سکھائے دیتی ہوں مگر یہ تمہارے لیے بہت ضروری ہے، اسے صرف اپنی جان بچانے کے لیے استعمال کرنا۔“ اس نے شاید میری آنکھوں میں الجھن پڑھ لی تھی۔

وہ مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اقبال اپنی جان بچانا ہر شخص کا حق ہے۔ میں تمہیں کسی تکلیف اور پریشانی میں نہیں دیکھنا چاہتی۔ یہ انتہائی ضرورت کے وقت استعمال کرنا ورنہ نہیں۔“

جن حالات کی خوفناکی کی وجہ سے میں نے راجہ وغیرہ کا ساتھ چھوڑا تھا وہی حالات

فاریہ کو پتا چلے کہ میں یہاں آیا تھا۔ اس آفر پر میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ یہاں سے بس سیدھی جاتی ہے اور میں راستہ جان گیا ہوں اس لیے مجھے کوئی دشواری نہیں ہو گی۔

میں حسب سابق مطلوبہ بس میں بیٹھ کر اپنی منزل پر اتر گیا۔ ابھی دن کے صرف گیارہ بجے تھے۔ میں نے گھر پہنچتے ہی فاریہ کو فون کر دیا۔ پھر میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر لیٹا حالات پر غور کرتا رہا میں منٹ بعد ہی یعقوب نے بتایا کہ فاریہ میرا انتظار کر رہی ہے۔ میں ڈرائنگ روم میں آیا تو وہ بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھی۔
”کیا ہوا اقبال؟“ اس نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔

میں نے اپنی اور سیمیاں کی ملاقات کی تمام تفصیل اسے بتائی۔ وہ میری اداکاری پر بہت خوش ہوئی اور اس نے مجھے فوراً اجازت دے دی کہ میں جب چاہوں سیمیاں کے پاس چلا جاؤں۔ اس نے مجھے بے حد محتاط رہنے کی تلقین کی اور ہدایت کی کہ میں موقع ملتے ہی فون کر لیا کروں۔ فاریہ سے وہاں جانے کی اجازت مل جانے کے بعد میں نہ معلوم کیوں ادا اس ہو گیا۔ یہ تیسرا مقام تھا جہاں سے میرا دانہ پانی اٹھا تھا۔ جدائیاں میری قسمت میں کتنی تیزی سے آرہی تھیں کہ کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔
میں بوجھل قدموں سے اپنے کمرے میں چلا آیا اور برآمدے میں کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔ آسمان پر تیرتے بادلوں کو دیکھتے دیکھتے ہی وقت گزر گیا۔ فاریہ نے کھانے کے کمرے میں بلایا تو وہاں بیک صاحب بھی موجود تھے۔

”کیسے ہو بیٹا؟“ انھوں نے شفقت سے پوچھا۔

”ٹھیک ہوں بیک صاحب۔۔۔“ میں نے مختصر جواب دیا پھر فاریہ انھیں میرے بارے میں بتانے لگی۔ کھانے کے دوران میں بھی فاریہ مجھے اونچ نیچ سمجھاتی رہی۔ اس نے مجھے ہدایت کی کہ میں وہاں رہ کر ہر آنے جانے والے پر نگاہ رکھوں اور حتی الامکان اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کروں بلکہ ہو سکے تو ان کے درمیان ہونے والی گفتگو بھی سن رہوں۔ اس کے علاوہ بھی اس نے مجھے بہت سی باتوں کی ہدایت کی اور پانچ ہزار روپے کا خلیفہ رقم مجھے ایک لفافے میں لپیٹ کر دی اور بولی۔ ”یہ رقم چھپا کر رکھنا۔ وہ لوگ تمہارے سامان کی تلاشی لیں گے اور ہر لمحہ تم پر نگاہ رکھیں گے، ہر وقت محتاط رہنا۔“

مجھے یہاں بھی پیش آرہے تھے۔ میں عجیب شش و پنج میں تھا۔

”اگر تم میرا ساتھ نہیں دینا چاہتے تو چھوڑو، ان مجرموں کے لیے میں اکیلی ہی کافی ہوں۔ تم سے ذرا مجھے سہولت ہو جاتی، میرا کام آسان ہو جاتا مگر.....“ اس نے سپاٹ لمبے میں جواب دیا۔ وہ شاید میرے چہرے سے ایک بات پڑھنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں میڈم.....“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”حالات کی تبدیلی انسان کے جذبات اور احساسات میں کچھ کھلبلی تو بچا ہی دیتی ہے، اور نیچرل ہے مجھے یہاں ایسے حالات کی توقع نہیں تھی اور اب سے پہلے آپ نے بھی کبھی اس جانب اشارہ نہیں کیا تھا ورنہ شاید ان سب باتوں کے لیے پہلے سے تیار ہوتا۔“

میں نے سمجھانے کے سے انداز میں جواب دیا۔

وہ دھیرے سے مسکرائی۔ ”تمہارے اندر ایک اور صلاحیت ہے اقبال جس کا انکشاف ابھی ابھی مجھ پر ہوا ہے کہ تم بات کو جس طرح محسوس کرتے ہو اسے اسی طرح بیان کرنے کا ملکہ بھی رکھتے ہو۔ ایسا بہت کم لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ اپنے احساسات کو الفاظ نہیں دے پاتے جبکہ تم ایسا کر سکتے ہو اور دوسرے کو بہت جلد قائل کر لینے کی صلاحیت بھی رکھتے ہو۔ تم نے بالکل ٹھیک کہا، میری کم علمی تھی کہ میں ایسا نہیں محسوس کر پائی۔“

تھینک یو میڈم، آپ ہدایات جاری رکھیں، میں متوجہ ہوں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ میں نے خود کو بہت جلد سنبھال لیا تھا۔ گویا خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ صرف ایک خدا کی ذات تھی جس سے میں پُر امید تھا اور بس۔

ہم تقریباً دو ڈھائی گھنٹے وہاں بیٹھے اس موضوع پر باتیں کرتے رہے، فاریہ مجھے باریکیاں سمجھاتی رہی اور میں اس کی ایک ایک بات ذہن نشین کرتا رہا۔

”پھر تم کب جا رہے ہو؟“

”کل صبح۔“

”ٹھیک ہے، وش یو گڈ لک۔ ایک بار پھر کہوں گی کہ خطرہ محسوس کرتے ہی واپس آ جانا۔ دوسری صورت میں خود کو محاذ پر محسوس کرنا تمہیں اپنے ملک و قوم کو ان زہریلے لوگوں سے بچانا ہے۔ ان معصوم بچوں کو زندگی دینا ہے جو دھیرے دھیرے موت کے منہ

میں جا رہے ہیں۔“

”آپ فکر نہ کریں۔ ایسا کرتے ہوئے میں اپنی جان کی پرواہ بھی نہیں کروں گا۔“

”نہیں اقبال..... تمہاری جان بھی تو قیمتی ہے، تمہارے پاس امانت ہے خدا کی اسے خواہ مخواہ ضائع نہ کرنا پلیز.....!“

”اوکے میڈم، میں کوشش کروں۔“

”اوکے اقبال، میں اور انکل تمہارے لیے دعاگو ہیں۔“ اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ لمحہ بھر کو اس کے چہرے پر اداسی پھیل گئی تھی۔

”بیگ صاحب راجہ آئے تو اسے مجھ سے کیا ہوا وعدہ ضرور یاد دلایئے گا۔ اسے کہئے نا کہ اسے میرا انتقام لینا ہے۔ اگر میں نہ رہوں تو بھی۔“

”کیسی باتیں کرتے ہو بیٹا..... خدا تمہاری حفاظت کرے گا، ایسی مایوس کن باتیں نہ کرو، میرا جی گھبرانے لگتا ہے۔“

”بس آپ اسے میرا پیغام دے دیجئے گا۔“

”ٹھیک ہے میں ایسا ہی کروں گا۔ تم فکر نہ کرو۔“

”پھر خدا حافظ۔“

”ابھی تو تم سے رات کو ملاقات ہو گی اقبال۔“

”نہیں میڈم، میں کھانا باہر کھانا چاہتا ہوں۔ کچھ عرصہ باہر کی آزاد فضاؤں میں گھومنا چاہتا ہوں۔ رات میں دیر سے آؤں گا اور صبح سویرے ہی سیمیاں کے گھر چلا جاؤں گا، اگر آپ اجازت دیں تو.....؟“

”کیوں نہیں، جیسا تمہارا جی چاہے کرو۔“ فاریہ نے مسکرا کر جواب دیا۔

”تھینک یو میڈم اور خدا حافظ۔“ اتنا کہہ کر میں وہاں سے چلا آیا۔ میں نے گاڑی نکالی اور چوکیدار کو مسز مائیکل کے لیے پیغام لکھ کر دے دیا کہ آج بھی اور شاید آئندہ بھی میں ان سے نہیں مل سکوں گا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا تھا اور لکھ دیا تھا کہ وہ میرے بارے میں مس فاریہ سے تفصیل معلوم کر سکتی ہیں۔ اصل وجہ میں نے اس لیے نہیں لکھی کہ نہ معلوم فاریہ انھیں کیا بتانا چاہے۔

میں کہا اور کرسی پر ڈھے گیا۔

”پھر..... یہ سب.....؟“

”یہ سب تو گاؤں لے جائے گا۔“

”کیا مطلب؟“

”ہاں سلطان، تجھے میرا یہ کام کرنا ہوگا۔ یہاں صرف ایک ٹوٹی تو ہے میرا دوست جو میرے سب دکھ درد بانٹتا ہے، میرا گاؤں اور میری ماں کو بچاتا ہے۔“

”مگر..... میں.....“

”پلیز سلطان! میں نے بڑے مان سے یہ فیصلہ کیا تھا اور اسی فیصلے کی بنا پر یہ سب کچھ خریدا تھا کہ تو.....؟“

”مگر یار بات کیا ہے..... یہ خیال اچانک کیسے آگیا..... اور پھر اتنا پیسا؟“ وہ اب حیران تھا۔

اب میں نے اس سے کچھ چھپانا بیکار ہی سمجھا۔ پھر کوئی تو ایسا ہوتا جسے میرے بارے میں حقیقت معلوم ہوتی، کیا پتا فاریہ وغیرہ کسی کو میرے بارے میں حقیقت سے آگاہ کریں بھی یا نہیں؟

سلطان ہی ایسا آدمی تھا جو راجہ کو میرے بارے میں بتا سکتا تھا۔ میری کسی بھی معاملے میں مدد کر سکتا تھا۔ یہی سوچ کر میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ وہ حیران اور خاموش بیٹھا میری داستان سنتا رہا۔ کبھی اس کے چہرے پر دکھ پھیل جاتا اور کبھی وہ حیرت سے آنکھیں پٹپٹانے لگتا۔

میں نے بات ختم کی تو وہ خلاؤں میں گھورنے لگا۔ میں نے سرکری کی پشت سے ٹکا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس وقت میں خود کو بہت ہلکا محسوس کر رہا تھا۔

”بالے..... کچھ ہونے والا ہے بالے..... میں کہتا تھا نا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ اس وقت تو

نے میری بات نہیں سنی۔“

”مگر تو تو فاریہ کو گڑبڑ کہتا تھا۔ گڑبڑ وہاں نہیں ہے سیمال اور بہادر گڑبڑ ہیں۔“ میں نے جھلا کر جواب دیا۔

”مگر یہ گڑبڑ بھی تو فاریہ سے شروع ہوئی نا! وہ نہ ہوتی تو.....؟“

یہ پیغام دے کہ میں وہاں سے چلا آیا۔ اس روز میں شاید لاہور کی ایک ایک گلی اور ایک ایک سڑک سے گزرا، عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ میرے اندر کوئی تھا جو بار بار مجھے یہ احساس دلا رہا تھا کہ یہ رات میری آزادی کی آخری رات ہے۔ آج جیسا ہلکا پھلکا میں پھر کبھی نہ رہ سکوں گا۔ میں بلا مقصد سڑکوں پر گھومتا رہا، پھر اچانک ایک خیال بڑی سرعت سے میرے ذہن میں کوندا میں ماں، ماسی میراں اور سوہنی کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا۔ جو کچھ میں ان حالات میں کر سکتا تھا وہ سب کچھ کرنا چاہتا تھا۔ یہ خیال آتے ہی دوسری تمام باتیں میرے ذہن سے نکل گئیں۔ میں انارکلی بازار کے بالکل قریب تھا۔ میں نے وہیں گاڑی پارک کی اور بازار میں سچی دکانوں کی طرف بڑھ گیا۔

پھر تو لگتا تھا جیسے میں ہوش کھو بیٹھا ہوں۔ میری جیب میں فاریہ کی دی ہوئی خلیہ رقم موجود تھی۔ میں نے ماں، ماسی میراں اور سوہنی کے لیے بہت سی چیزیں خریدیں۔ بار بندے، کپڑا، چوڑیاں، پازیبیں، گھر کی ضرورت کی مختلف چیزیں جوتے، چپل اور جانے کیا کیا کچھ۔ یہ سب خریدنے کے بعد میں سیدھا سلطان کے گھر پہنچ گیا۔ اس کے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ میں سیڑھیاں عبور کر کے، لدا پھندا اس کے دروازے پر پہنچ گیا۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ سلطان مجھے اس طرح دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”یہ..... یہ سب کیا ہے بالے؟“ اس نے پیکٹ میرے ہاتھوں سے لیتے ہوئے کہا ورنہ شاید وہ سب میرے ہاتھوں سے گر جاتے۔

”سامان ہے، ماں کے لیے، سوہنی اور ماسی میراں کے لیے!“ میں نے پیکٹ تخت پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔

”کیا تو گاؤں جا رہا ہے؟“ اس نے خوش ہو کر پوچھا۔

”نہیں..... سلطان میری قسمت میں شاید گاؤں جانا نہیں لکھا۔“ میں نے نڈھال لہجے

”اچھا اب چھوڑ تو بتا گاؤں جائے گا نا؟“

”بالے میرے گاؤں جانے سے تیری ماں کے دل پر لگا زخم تو نہیں بھرے گا نا.....
تو خود کیوں نہیں جاتا بالے، چھوڑ دے یہ سب، وہ دکھ اچھا ہے بالے جس پر تلی
دینے والے پاس ہوں۔ اکیلے آدمی کو تپ چڑھ جائے تو وہ خود کو موت کے منہ میں محسوس
کرتا ہے، چلا جا بالے..... چلا جا.....“

”سلطان..... میں وہاں بھی اکیلا ہوں، ظلم کے خلاف آواز اٹھانے والا وہاں بھی کوئی
نہیں ہے میرے دوست اور میرا وجود ان تینوں کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے، انہیں اگر غلج
نصیب ہے تو صرف اس لیے کہ چوہدری اور راجو کے خیال میں میں مرچکا ہوں۔ تو کیا
سمجھتا ہے میرا دل نہیں چاہتا کہ میں اپنے اندھے آنگن میں دیا روشن کروں، اپنی ماں نے
دل پر لگے زخموں پر مرہم رکھوں..... نہیں دوست..... تیری سوچ غلط ہے، میں وہاں جانا
چاہتا ہوں، ماں کے پاس، سوہنی کے پاس مگر تجھے معلوم نہیں سلطان، وہاں جلا دیتے ہیں،
میری کمر پر پڑے نشان ان کی سفاکی کا ثبوت ہیں اور یہ..... یہ دیکھ میری پنڈلی..... میں
نے اپنی پنڈلی کا وہ زخم سلطان کے سامنے کر دیا جو تھانیدار کے بوٹوں کا مرہون منت تھا
اور خراب ہو کر اپنا نشان چھوڑ گیا تھا۔

کمرے میں گہرا سناٹا چھا گیا۔ شاید سلطان میں بولنے کی سکت نہیں رہی تھی۔
”تو گاؤں چلا جا سلطان، یہ پیسے رکھ۔“ میں نے جیب سے لفافہ نکال کر ایک ہزار
روپے اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ ”ان پیسوں میں سے جو بیچ جائیں وہ ماں کو دے دینا۔
اس سے کہنا کہ..... کہ تیرا بیٹا شہر میں بہت بڑا افسر لگ گیا ہے اور یہ بھی کہنا کہ.....
کہ میں اسے جلد بلا لوں گا۔“

”اگر یہ سب کہہ دیا تو چوہدری اور راجو.....؟“

”نہیں نہیں..... ابے کچھ نہ کہنا.....“ میں نے ایک دم اس کی بات کاٹ دی۔
”میں تو بھول ہی گیا تھا کہ میری موت کی خبر ہی تو ان کی آزادی کا پروانہ ہے۔“

وہ خاموش ہو گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھ کر پیسے لے لیے۔ ”میں یہ پیسے ماں کو دے
دوں گا بالے۔“ اس نے تھکے تھکے انداز میں جواب دیا۔

”اوہ شکریہ سلطان..... شکریہ، میں تیرا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔“

”مگر بالے..... تو ان لوگوں کے چکر میں مت پڑ۔“

”پھر ملوں گا سلطان، اب اجازت دے، باقی باتیں پھر ہوں گی!“ میں نے سلطان کی
بات کا جواب دیے بغیر کہا اور فوراً ہی وہاں سے نکل آیا۔

میں جانتا تھا کہ اگر میں کچھ دیر اور رکا تو سلطان مجھے اکسانے کی کوشش کرے گا۔
میں فاریہ اور بیگ صاحب کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ وہاں سے نکلا تو دس بجے
تھے۔ بھوک بالکل نہیں لگ رہی تھی۔ میں ایک ہوٹل میں جا بیٹھا اور چائے کا آرڈر دے
کر پھر حالات پر غور کرنے لگا۔

میں تقریباً ایک گھنٹہ بلا مقصد ہوٹل میں بیٹھا، وہاں آنے جانے والوں کو دیکھتا رہا۔
بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو بل کاؤنٹر پر دے کر باہر چلا آیا۔ گھر پہنچا تو فاریہ منتظر تھی۔ وہ وہیں
برآمدے کے آگے ٹھل رہی تھی۔

”اقبال..... تم پریشان تو نہیں ہونا؟“

”نہیں میڈم، پریشانی کی کوئی بات نہیں۔“ میں نے زبردستی مسکراتے ہوئے جواب
دیا۔

”آؤ میں تمہیں کسی سے ملوانا چاہتی ہوں۔“ وہ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے
بولی۔ مجھے حیرت ہوئی۔ رات کے گیارہ بجے..... ایسا کون تھا جسے ملوانا ضروری تھا؟ میں
نے دل میں سوچا مگر پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ میرا خیال تھا کہ
آنے والا ڈرائنگ روم میں ہو گا مگر جب فاریہ نے ڈرائنگ روم کا دروازہ عبور کیا تو مجھے
مزید حیرت ہوئی۔ اب ہم کوٹھی کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ڈرائنگ روم
کا دروازہ عبور کرنے کے بعد ہم ایک ہال نما کمرے میں پہنچ گئے۔ اس ہال نما کمرے کے
دائیں اور بائیں دو دو دروازے تھے جو اس وقت بند تھے۔ میں کوٹھی کے اندرونی حصے
میں پہلی بار آیا تھا ورنہ اس سے پہلے یا تو ڈرائنگ روم میں آیا تھا یا ڈرائنگ روم جو
ڈرائنگ سے متصل تھا۔

اب حیرت کے ساتھ ساتھ میرے بدن میں سنسنی بھی دوڑ رہی تھی۔ فاریہ کا چہرہ
سٹا تھا جیسے میرے ساتھ چلنے والی کوئی جیتی جاگتی ہستی نہ ہو بلکہ پتھر کا کوئی بت ہو۔ جس
کے چہرے پر یا آنکھوں میں کوئی تاثر نہ تھا۔ اچانک فاریہ ایک دروازے پر ٹھہر گئی۔ اس

نے دروازے پر ہولے سے دستک دی میں دم سادھے اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ چند لمحوں بعد کسی نے دروازہ کھول دیا۔ اندر بہت ہلکی روشنی تھی۔ فاریہ نے مجھے آنے کا اشارہ کیا اور آگے بڑھ گئی۔

میں نے دروازہ کھولنے والے کی طرف دیکھا۔ یہ چالیس پینتالیس برس کی بوڑھی عورت تھی جس کے چہرے پر عسرت اور مفلسی کی جھریاں پڑی محسوس ہوتی تھیں جو فاریہ کو دیکھ کر مودب ہو گئی تھی۔

”کیا حالت ہے؟“ فاریہ نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

”جی ابھی ابھی سوئی ہے۔ دوا دی ہے میں نے، ورنہ تو تڑپتی رہتی۔“ اس کی آواز میں بے پناہ دکھ تھا۔ ”بی بی مجھ سے اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی آپ یہاں کسی اور کو رکھ لیں۔“ اس نے ایک دم فاریہ کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔

”اب کچھ ہی دن کی بات ہے، حمیدہ بی بی.....“ فاریہ نے جواب دیا، اس کی آواز بھرائی ہوئی محسوس ہوئی۔

میں حیرت سے گنگ کھڑا تھا۔ کمرابے حد تاریک سا لگ رہا تھا۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر گرے رنگ کے پردے پڑے تھے۔ کمرے میں روشنی بھی کم تھی بلکہ کمرے کا ایک حصہ تو بالکل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ جس دروازے سے ہم اندر داخل ہوئے تھے اس کی پیشانی پر لگا بلبل کمرے کو پوری طرح روشن کرنے میں ناکام رہا تھا۔

”کیا سو گئی ہے، تم نے اطمینان کر لیا ہے؟“ فاریہ نے کمرے کے تاریک گوشے کی طرف دیکھتے ہوئے اس عورت سے پوچھا۔

”جی بی بی.....“ اس نے مختصر جواب دیا۔ اس دوران میں میں آنکھیں پھاڑے اس تاریک حصے کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں کسی بیڈ کا ہیولا اب کچھ واضح ہو گیا تھا۔ بیڈ پر غالباً کوئی لیٹا تھا۔ غالباً نہیں بلکہ یقیناً کیوں کہ فاریہ اور اس بوڑھی عورت کے درمیان شاید اسی ہستی کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔

”ٹھیک ہے تم جاؤ!“ نادیدہ نے اس عورت سے کہا۔

وہ عورت دوپٹے کے پلو سے آنکھیں خشک کرتی ہوئی وہاں سے باہر نکل گئی۔ میں

ہوتی بنایہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ نادیدہ دھیمے قدموں سے اس تاریک حصے کی طرف بڑھی پھر شاید اس نے بیڈ کے قریب رکھی ٹیبل پر رکھے لیمپ کو روشن کر دیا۔ وہ حصہ روشن ہوتے ہی میں چونک اٹھا۔ بیڈ پر ایک لڑکی لیٹی تھی۔ اس کی عمر بے مشکل بیس بائیس برس ہوگی۔ وہ فاریہ سے بہت مشابہ تھی مگر بہت کمزور مدقوق! وہ شاید بیمار تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے تھے۔ شاید وہ کبھی خوب صورت بھی رہی ہوگی مگر اس وقت تو اس کے چہرے پر موت کا بھیانک سایہ تھا جس نے اسے بد صورت بنا دیا تھا۔

”اقبال یہ زاریہ ہے..... میری چھوٹی بہن.....“ فاریہ کی آواز کسی گہرے کنویں سے آنی محسوس ہوئی۔

میں اس کے قریب آگیا۔ فاریہ نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے دیوار سے لگی کرسی کو بیڈ کے قریب کر لیا اور بیٹھ گیا۔

”یہ بہت صحت مند تھی۔ بہت خوب صورت..... بی اے پارٹ ون کی تیاری کر رہی تھی۔ زندگی سے بھرپور زاریہ کے قہقہوں نے اس پوری کوٹھی میں زندگی پھیلا دی تھی۔ اس کی معصوم شرارتوں میں زندہ رہنے اور زندہ رکھنے کی امنگ تھی۔ میں تو اسے دیکھ کر ہی جیتی تھی اقبال، مئی پاپا کے بعد میرے لیے دنیا میں صرف یہی ایک ہستی تھی جو مجھے زندہ رہنے پر مجبور کیے ہوئے تھی یا انکل، جنھوں نے میرے اندر حوصلہ پیدا کیا۔ پاپا کا کاروبار سنبھالا اور مجھے زمانے کی اونچ نیچ سکھائی۔ زاریہ نے اسی زمانے میں میٹرک کا امتحان دیا تھا۔ اس کی کچھ کلاس فیلوز اسلام آباد میں بی ہو گئیں۔ کچھ وہاں کلج میں ایڈمیشن لے کر ہوشل میں رہنے لگیں، زاریہ نے بھی اسلام آباد جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ مجھ میں اس کی کسی خواہش کو رد کرنے کی ہمت نہیں تھی، کاش اس وقت میں نے اس کی خواہش کو ماننے سے انکار کر دیا ہوتا۔“ وہ لمحہ بھر کو رکی۔ کمرے میں گہرا سناٹا چھا گیا۔ میں بھی سانس روکے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ فاریہ چند لمحے بیڈ پر بے خبر سوئی ہوئی زاریہ کو دیکھتی رہی پھر اس کی بھرائی ہوئی آواز سارے کمرے میں گونجنے لگی۔

”میں نے زاریہ کی خواہش پر اسے اسلام آباد بھیج دیا۔ وہیں ہاسٹل میں اس کے رہنے کا انتظام بھی کر دیا۔ زاریہ ہر ماہ چھٹیوں میں یہاں آتی تو اس ویران کوٹھی میں

ہیروئن کی عادی ہے۔

یہ سن کر میں سائلے میں رہ گئی۔ اس کی پرنسپل سے بات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ زاریہ بہت عرصے سے ہیروئن پی رہی تھی۔ پرنسپل کے علم میں بات آئی تو انہوں نے نہ صرف اسے سمجھایا بلکہ ہمیں بتانے کی دھمکی بھی دی مگر زاریہ نے ان سے معافی مانگی اور وعدہ کیا کہ وہ آئندہ نہیں پئے گی مگر وہ ہمیں کچھ نہ بتائیں۔ پرنسپل نے اس کے وعدے پر اعتبار کر لیا مگر زاریہ اس زہر سے نجات حاصل نہ کر سکی۔ اس نے چھپ کر ہیروئن پینا شروع کر دی اور وہ جھوٹ بھی بولنے لگی۔ جب بھی پرنسپل اسے بلاتی اور پوچھتی تو وہ قسمیں کھاتی اور بتاتی کہ اب وہ ہیروئن نہیں پیتی۔ یہ سلسلہ بہت عرصے تک چلتا رہا۔ اس کی گرتی ہوئی صحت اور اس میں پیدا ہونے والی تبدیلی سے سبھی پریشان تھے مگر یہ پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ اب بھی ہیروئن پیتی ہے یا نہیں۔ پھر ایک دوبار ایسا ہوا کہ وہ گھر آنے کے لئے وہاں سے روانہ ہوئی مگر یہاں نہیں پہنچی، پرنسپل نے گھرفون کر کے پوچھا تو معلوم ہوا کہ زاریہ یہاں نہیں آئی۔ یہاں نہ پہنچنے کی اطلاع انہیں انکل نے دی تھی مگر یہ بات انہوں نے مجھے نہیں بتائی۔ ان کا خیال تھا کہ میں پریشان ہو جاؤں گی۔ پھر ایک روز اس کے کمرے سے چیخوں کی آواز سن کر داروڑن نے پرنسپل کو اطلاع کی۔ پرنسپل نے آکر دیکھا تو وہ بری طرح تڑپ رہی تھی۔ اس کا جسم اکڑا ہوا تھا۔ آنکھیں ابل کر باہر آگئی تھیں اور وہ بے حال تھی۔ ان لوگوں کو دیکھتے ہی اس نے ہاتھ جوڑ دیئے اور پرنسپل وغیرہ سے گڑگڑا کر ہیروئن مانگنے لگی۔ وہ کہتی تھی میں مر جاؤں گی مجھے ایک کش دے دو۔ اس کی حالت بہت بگڑی تو پرنسپل اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ اسے یہاں لے آئیں۔ میں اس کا علاج کر رہی ہوں اقبال مگر..... یہ لمحہ لمحہ موت سے قریب تر ہوتی جا رہی ہے۔ جانے کب یہ مجھ سے ہٹھک جائے گی..... اور یہ احساس کہ کوئی کسی بھی لمحہ ہمیشہ کے لئے ہٹھکے والا ہے کتنا خوفناک ہوتا ہے اس کا شاید تمہیں احساس نہ ہو اس لئے کہ تمہاری بہن جب تم سے جدا ہو رہی تھی تو تمہیں گمان بھی نہ تھا۔ تم نے تو اسے سونے کے لئے کہا تھا، آرام کرنے کے لئے..... اگر تمہیں اس وقت معلوم ہو جاتا کہ وہ تم سے ہٹھکنے والی ہے تو..... تو تم کیا کرتے اقبال.....؟ اسے موت کے بھیانک پنچے سے کیسے آزاد کراتے..... کہاں چھپاتے اسے.....؟ بولو..... بولو..... اقبال

اچانک زندگی دوڑ جاتی۔ خوب شرارتیں کرتی۔ انکل کے ساتھ جاکر شاپنگ کے پروگرام بناتی، یوں سمجھو کہ سب کچھ تلیپ کر دیتی تھی، ساری ترتیب بگاڑ دیتی یوں لگتا جیسے زاریہ نہ آئی ہو کئی خاندان آگئے ہوں۔ گھر کا ہر شخص، تمام نوکر سب مصروف ہوتے، بھگدڑ مچی ہوتی تھی، مگر یہ بے ترتیبی اچھی لگتی تھی۔ زندگی محسوس ہوتی تھی۔ پھر..... اچانک یہ ہنگامے کم ہو گئے۔ زاریہ ہر ماہ کی بجائے ہر دو تین ماہ میں آنے لگی اور آتی بھی تو اسے جانے کی جلدی ہوتی۔ جتنا عرصہ رہتی عجیب سی رہتی، اکیلی اکیلی، ہمارے قریب بھی زیادہ نہ رہتی، یا تو اپنے کمرے میں گھسی رہتی یا اکیلی ادھر ادھر پھرتی رہتی اس کے قہقروں میں جو ایک چھنک تھی، زندگی سے پیار کا احساس تھا وہ بھی کم ہو گیا بلکہ کبھی کبھی تو یوں ہوتا کہ وہ قہقہہ لگائے بغیر ہی چلی جاتی۔ خاموشی سے..... چپ چپ، یہ تبدیلی رفتہ رفتہ آئی تھی اس لئے شروع میں تو ہمیں محسوس نہ ہوا مگر جب اس خاموشی اور تنہائی پسندی کے ساتھ ساتھ اس کی صحت بھی گرنے لگی تو مجھے تشویش ہوئی۔ میں نے بہت چاہا کہ اسے ڈاکٹر کو دکھا دوں مگر وہ تیار نہ ہوئی۔ کہتی تھی میں ٹھیک ہوں بچا!

میرا کاروبار اس قدر پھیل گیا تھا کہ میں بے پناہ مصروف ہو گئی۔ ادھر انکل نے آہستہ آہستہ کاروبار میں دلچسپی کم کر دی اور سارا بوجھ مجھ پر پڑ گیا۔ زاریہ آتی بھی تو میری اور اس کی ملاقات کم ہوتی۔ میں دن بھر فیکٹری میں رہتی اور وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں۔ رات کو کبھی ملاقات بھی ہوتی تو صرف کھانے کی ٹیبل پر، میں اس کی صحت کو دیکھ کر فکر مند ہو جاتی اسے علاج کے لئے کہتی اور وہ ٹال جاتی، پھر یوں ہونے لگا کہ زاریہ نے یہاں آنا کم کر دیا۔ ہماری فون پر بات ہوتی۔ میں اسے آنے کے لئے کہتی تو وہ پڑھائی اور امتحان کی تیاری کا بہانہ بنا کر ٹال جاتی۔

اسی طرح تقریباً ڈیڑھ برس گزر گیا۔ یہ پچھلے ماہ کی بات ہے۔ میں فیکٹری میں تھی کہ اچانک انکل کا فون آیا۔ انہوں نے مجھے فوراً گھر پہنچنے کو کہا۔ ان کے لہجے میں تشویش تھی۔ انہوں نے فون پر کچھ بتانے سے انکار کر دیا۔ میں سیدھی گھر پہنچی تو معلوم ہوا کہ زاریہ آئی ہوئی ہے۔ بلکہ لائی گئی ہے۔ اس کی حالت بہت خراب ہے۔ انکل نے ڈاکٹر کو بلا لیا تھا۔ زاریہ کے ساتھ اس کے کالج کی پرنسپل بھی تھیں۔ میں زاریہ کی حالت دیکھ کر پاگل ہو گئی۔ وہ بری طرح تڑپ رہی تھی۔ تب ڈاکٹر نے یہ بھیانک انکشاف کیا کہ زاریہ

دنیت سے جانتی ہے۔ ہمیں نہ صرف اس کی کاشت کو تباہ کرنا ہو گا بلکہ منشیات کی تیاری کو اور اس زہر کی اسمگلنگ کو بھی روکنا ہو گا۔ ہمیں پاکستان کی پیشانی پر لگے اس بدنامداغ کو مٹانا ہو گا اقبال، اپنے لئے تو ہر شخص جیتا ہے مگر دوسروں کے لئے زندہ رہنا بڑے ظرف کا کام ہے۔۔۔۔۔۔ بہادر کو مار دینا کافی نہیں ہے، بہادر مر گیا تو اس گروہ کا کوئی اور ضمیر فروش بہادر بن جائے گا اور ان کا مذموم کاروبار اسی طرح روز افزوں ترقی کرتا رہے گا۔ پوری دنیا اس زہر سے پریشان ہے، لوگ چیخ رہے ہیں، مگر یہ ایسے طاقت ور لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جن کی طاقت کے آگے بڑے بڑے سورا تھرا اٹھتے ہیں مگر ہم خدا کی ذات پر مکمل ایمان رکھتے ہیں، ہم جانتے ہیں کہ خدا ظلم کے خلاف جہاد کرنے والوں کا ساتھ دیتا ہے، مجھے یقین ہے اقبال کہ خدا میرا بھی ساتھ دے گا۔ خدا نے کائنات بنائی ہے کہ یہاں زندگی پھلے پھولے مگر لوگ اسے موت کی وادی میں تبدیل کر رہے ہیں۔ ہم ان لوگوں کے خلاف جہاد کریں گے اقبال۔۔۔۔۔۔ اگر تم۔۔۔۔۔۔ میرا ساتھ دینا چاہو تو میری ہدایت پر عمل کرو ورنہ مجھے یہ حق نہیں کہ تمہیں تمہاری مرضی کے بغیر استعمال کروں۔“

”میں سمجھتا ہوں میڈم۔۔۔۔۔۔ اب سے پہلے میرے دل میں انجانا سا خوف تھا۔۔۔۔۔۔ مگر اب۔۔۔۔۔۔ اب میں خوفزدہ نہیں ہوں، میں آپ کے ساتھ ہوں میڈم۔۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔۔ زاریہ کو بھی مرنے نہیں دوں گا۔ میں اس کے اور موت کے درمیان آہنی دیوار بن جاؤں گا میڈم۔۔۔۔۔۔ اپنی جان بھی قربان کر دوں گا۔“

”نہیں اقبال، تم جیسے مضبوط لوگ اگر یوں ضائع ہو جائیں گے تو ان لوگوں کے خلاف کون لڑے گا۔ ہمیں بہت سوچ سمجھ کر پلاننگ کر کے ان لوگوں کو چوہوں کی طرح بٹانسا ہو گا۔ ہم انہیں بلوں سے نکلنے پر مجبور کر دیں گے۔ انہیں آپس میں لڑا دیں گے، ان کی طاقت کو توڑ دیں گے اقبال، یوں ایک دم ان کے سامنے جانا بہتر نہ ہو گا۔ تمہیں وہ اگر زیادہ ہے جس سے ہماری ملاقات اس ریسٹوران میں ہوئی تھی اور جو کچھ روز بعد مارا گیا تھا؟“

اس کے سوال نے مجھے چونکا دیا۔ ”جی میڈم۔۔۔۔۔۔ اور سچی بات یہ ہے کہ اس واقعے نے میرے دل میں بھی کئی شک و شبہات پیدا کر دیئے تھے۔“

”میں جانتی ہوں۔۔۔۔۔۔ مجھے اندازہ تھا اقبال مگر میں اس وقت تمہیں یہ سب

میں زاریہ کو کہاں چھپاؤں۔۔۔۔۔۔ موت جو دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھ رہی ہے اسے کیسے روکوں۔۔۔۔۔۔ کیا میں مگر کبھی اسے بچا سکتی ہوں۔۔۔۔۔۔؟ نہیں۔۔۔۔۔۔ دنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں بچا سکتی۔۔۔۔۔۔

مگر میں اور تم ان بہت سی معصوم بچیوں کو بچا سکتے ہیں اقبال، جو ابھی زندہ ہیں، جو ابھی اس مملکت زہر سے واقف نہیں ہیں مگر ایک نہ ایک دن بہادر اور سیمیا جیسے ضمیر فروش انہیں بھی یہ زہر پینے پر مجبور کر دیں گے، وہ بچے میرے بھی ہو سکتے ہیں اقبال اور تمہارے بھی۔۔۔۔۔۔ کیا ہماری قوم کے ہر بچے کی قسمت میں اسی طرح ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنا لکھا ہے۔۔۔۔۔۔؟ ہاں اقبال اگر کسی نے اس زہر کے خوفناک آتش فشاں کو نہ بجھایا تو ایسا ہی ہو گا۔۔۔۔۔۔ ایسا ہی ہو گا اقبال۔۔۔۔۔۔ ایسا ہی ہو گا۔۔۔۔۔۔“ وہ اچانک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میں سر سے پاؤں تک کانپ اٹھا۔ لرزنے لگا۔ مجھے زاریہ کے معصوم چہرے پر موت رقص کرتی محسوس ہوئی اور یوں لگا جیسے فاریہ کی صورت میں زندگی اس کے سرہانے بیٹھی بین کر رہی ہو۔

”ایسا۔۔۔۔۔۔ ایسا نہیں ہو گا میڈم۔۔۔۔۔۔“ میں نے گمبھیر لہجے میں جواب دیا۔

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

”ہاں میڈم، ایسا نہیں ہو گا۔ میں ان ضمیر فروشوں کو موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔ زندہ نہیں چھوڑوں گا انہیں۔“ میں نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے جواب دیا۔

”نہیں اقبال۔۔۔۔۔۔ یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ یہ کام تو میں بھی کر سکتی تھی، سیمیا کو اور بہادر کو جان سے مروا دینا کچھ مشکل نہیں ہے مگر ان کی موت سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ یہ کام صرف سیمیا اور بہادر کو ختم کر دینے سے ختم نہیں ہو جائے گا۔ یہ پورا گینگ ہے جو ملک کے چپے چپے پر چھپایا ہوا ہے۔ بہت منظم گروہ ہے جو نہ صرف ان پودوں کی کاشت کرتا ہے جس سے نشہ آور چیزیں بنتی ہیں بلکہ ان نشہ آور چیزوں کی تیاری بھی کرتا ہے اور انہیں ملک میں اور غیر ممالک میں اسمگل کر کے خود لاکھوں ڈالر کما رہا ہے اور دنیا بھر میں موت بانٹ رہا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے پاکستان کا نام بدنام ہو رہا ہے۔ ساری دنیا پاکستان کے ہر فرد کو محض منشیات کے اسمگلر کی

بتانے یا اس چکر میں الجھانے کو تیار نہ تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ میں صرف یہ چاہتی تھی کہ تم فیکٹری کا کام سمجھ کر میرا یہ بوجھ ہلکا کر دو مگر سیمیاں سے تمہاری ملاقات اور اس کی تم میں دلچسپی نے مجھے اس انداز میں سوچنے پر مجبور کر دیا۔ پھر میں نے تم میں کچھ حیرت انگیز صلاحیتیں دیکھیں جس نے تمہیں بے حد مضبوط بنا کر پیش کیا اور میں تمہیں اپنے ساتھ ملانے کے بارے میں سوچنے لگی۔" وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوئی۔ اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھے جگ میں سے پانی گلاس میں انڈیلا اور ایک ہی گھونٹ میں گلاس خالی کر دیا پھر بولی۔

"وہ انگریز..... میری فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ بے حد ذہین اور پھرتیلا تھا، اسے میں نے اپنے ساتھ اس مشن میں شامل کر لیا مگر..... مگر اس نے مجھے ڈبل کر اس کرنے کی کوشش کی تھی اقبال، وہ لالچ میں آ گیا تھا، ان لوگوں کے ساتھ مل گیا تھا اور اس نے میرا ایک پلان تباہ کر دیا تھا میں اسے معاف کرنے کو تیار نہ تھی، میں کسی بھی ایسے آدمی کو معاف کرنے کو تیار نہیں ہوں جو اس زہر کے خلاف کام کرنے کی بجائے اس کے فروغ کی کوشش کرے۔ میں نے..... میں نے اسے مراد دیا۔ ایسے وفادار لوگ ہیں میرے پاس جو میرے ایک ایک اشارے پر کسی کی بھی جان لے سکتے ہیں یا اپنی جان دے سکتے ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ وہ ذہن استعمال کرنے کے قابل نہیں، ذہانت نہیں ہے ان کے پاس، وہ صرف اور صرف لڑنا جانتے ہیں مگر تم....."

"میں ہر طرح آپ کے ساتھ ہوں میڈم..... میں نے خیالات کی حد تک جو بددیانتی کی اس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔"

"مجھے پر تم پر فخر ہے اقبال..... ربیلی اقبال، میں نے ایسا آدمی اب سے پنل نہیں دیکھا، میں تمہیں کسی بھی حال میں کھونا نہیں چاہتی۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔

مجھے فاریہ کی خوشی نے بڑی طمانیت بخشی۔

"آں..... ہوں....."

اس آواز سے ہم اچھل پڑے۔ زاریہ شاید اٹھ گئی تھی۔ نادیہ اس پر جھک گئی۔

"زاری..... میری جان..... کیا حال ہے، کیسی ہو تم زاری.....؟"

"بب..... بجو..... بجا میرا حلق خشک ہو رہا ہے، پانی....."

اس پر بے حد نقاہت طاری تھی۔ وہ لمحہ بھر کو آنکھیں کھولتی اور بند کر لیتی۔ فاریہ

نے فوراً گلاس میں پانی انڈیل کر اس کے منہ سے لگا دیا، دوسرے ہاتھ سے وہ اسے سہارا دے کر اوپر اٹھائے ہوئے تھی۔ مجھے اس کی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے نظر آ رہے تھے۔

پانی پی کر وہ نڈھال ہو کر بستر پر گر گئی۔ میں اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ فاریہ آہستہ آہستہ اس کا سر دبانی لگی۔ وہ دھیمے لہجے میں اس سے باتیں کر رہی تھی اسے لے کر لمبی ڈرائیو پر جانے کے پروگرام بنا رہی تھی۔ اسے سمندر پر لے جانے کی باتیں کر رہی تھی۔ اسے بتا رہی تھی کہ پورے چاند کی راتوں میں سمندر جب سرکش ہوتا ہے تو انسان میں کیسی فرحت انگیزی پیدا کر دیتا ہے، ہلچل سی مچا دیتا ہے، وہ اس سے کہہ رہی تھی کہ اسے جلد ٹھیک ہو جانا چاہئے اس لئے کہ چاند کی راتیں شروع ہو گئیں ہیں اور پورے چاند کی رات میں صرف نو دن باقی ہیں۔ اس نے زاریہ کو یہ بھی بتایا کہ آج بارش ہوئی تھی، کل سے مسلسل ہو رہی ہے۔ پورا شہر نکھرا نکھرا لگ رہا ہے اور..... اور جانے کیا کیا..... وہ زندگی کی طرف بلانے والی تمام باتیں کر رہی تھی۔ اسے زندہ رہنے پر اکسارہی تھی مگر زاریہ..... اس کی پھیلی ہوئی خالی آنکھوں میں کچھ بھی نہ تھا۔ نہ زندگی سے پیار نہ جینے کی امنگ، نہ سمندر پر جانے کی خواہش نہ بارش میں بھگینے کی تمنا، کچھ بھی تو نہیں تھا اس کی آنکھوں میں..... اس کے چہرے پر، وہ ویران آنکھوں سے چھت کو تک رہی تھی۔ فاریہ کا منہ کھولنے والا انداز میرے دل پر برچھیاں چلا رہا تھا۔

"بجو..... پلیز..... دیکھو میرا بدن ٹوٹ رہا ہے..... میں..... میں..... میں..... میں..... صرف ایک مرتبہ..... پھر میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گی، میں زندگی کی طرف لوٹ آؤں گی بجو..... تم دیکھنا بس پانچ منٹ میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔" وہ سسک سسک کر کہہ رہی تھی۔ اس کے لہجے میں التجا کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"بیٹا..... میری جان..... تو زندہ رہے گی زاری..... تجھے زندہ رہنا ہو گا۔ میرا تو تیرے سوا کوئی بھی نہیں ہے زاری..... میں تجھے مرنے نہیں دوں گی بیٹا۔"

فاریہ بے ساختہ رو پڑی۔

میری آنکھوں کے کنارے بھگ گئے۔ میں نے ایسا رقت آمیز منظر اب سے پہلے

نہیں دیکھا تھا۔ یہ کیسا خوفناک احساس تھا کہ مرنے والے کو بھی معلوم ہو کہ وہ مر رہا ہے اور پاس بیٹھے لوگوں کو بھی کہ..... وہ مرجائے گا۔

”تو پھر..... مجھے دے دو بجو..... بس ایک کش..... صرف ایک کش بچو“ اگر تم مجھے زندہ دیکھنا چاہتی ہو تو..... اف..... میرا بدن..... میں مر رہی ہوں..... مجھے..... مجھے بچالو..... بچالو نا.....!“ اس نے تڑپ کر کہا۔

اس کا بدن اکر نے لگا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے عضلات کھینچ گئے ہوں۔ وہ ہاتھ پیروں کو بار بار اکڑا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر شدید درد کے آثار تھے رنگ سفید پڑ گیا تھا اور وہ سر کو تنکے پر بیٹھنے لگی تھی۔ میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ مجھ سے اس کی یہ حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔

”اقبال ڈاکٹر کو.....“ فاریہ نے چیخ کر مجھ سے کہا مگر میں اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی دروازے کی طرف لپک پڑا۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہ بوڑھی عورت سامنے ستون سے لگی رو رہی تھی۔ زاریہ کے چیخنے اور التجائیں کرنے کی آواز باہر تک آرہی تھی۔ میں نے اسے ڈاکٹر کو بلانے کو کہا۔ وہ بھاگتی ہوئی باہر کی طرف نکل گئی۔ میں بوکھلاہٹ میں کچھ دیر تو وہیں کھڑا رہا، اندر سے زاریہ کے چیخنے کی آوازیں اور فاریہ کے تسلی دینے کی آوازیں آرہی تھیں۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میرا وہاں کھڑا رہنا دو بھر ہو گیا۔ جی چاہتا تھا کہ بھاگ جاؤں۔ ان کرب ناک آوازوں سے کہیں دور..... مگر ایسا کرنا بھی میرے لئے ناممکن تھا۔

میں بے چینی سے برآمدے میں ٹہلنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد دور سے آتے ہوئے قدموں کی آواز نے مجھے اسی جانب متوجہ کر لیا۔ وہ بیگ صاحب تھے۔ ان کے چہرے ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ مجھے وہاں دیکھ کر وہ لمحہ بھر کو ٹھٹکے پھر تیزی سے زاریہ کے کرب میں داخل ہو گئے۔ میں بھی ان کے پیچھے اندر چلا گیا۔ وہ زاریہ کے بیڈ کی طرف لپکے۔ بری طرح تڑپ رہی تھی۔ فاریہ اسے سنبھالنے میں ناکام ہو گئی تھی۔

”بیٹا..... بیٹا..... زاریہ..... ہوش میں آؤ زاریہ..... ڈاکٹر آ رہا ہے“ کچھ برداشت کرو بیٹا۔“ بیگ صاحب نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی۔

”انکل..... انکل میں مر رہی ہوں انکل..... مجھے بچالیں..... ایک دفعہ

..... صرف ایک مرتبہ انکل..... میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔ میں بہت..... تکلیف میں ہوں انکل..... بجو..... مجھے دے دو..... دے دو بجو.....“ وہ پاگلوں کی طرح چیخ رہی تھی۔

فاریہ چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے قیامت آگئی ہو۔ فاریہ رو رہی تھی۔ بیگ صاحب رو رہے تھے، وہ بوڑھی عورت رو رہی تھی اور..... اور زاریہ یوں تڑپ رہی تھی جیسے کوئی دھیرے دھیرے اس کے بدن سے اس کی روح کھینچ رہا ہو۔

میری مٹھیاں بھینچ گئیں۔ کپٹیاں سلگنے لگیں، کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں۔ مجھ سے وہاں زیادہ دیر کھڑا نہ رہا گیا۔ میں خود پر قابو پانے کی کوشش میں ناکام ہو کر کمرے سے باہر چلا آیا۔ باہر فاریہ دیوار سے لگی آنسو بہا رہی تھی۔

”میڈم.....“

”اقبال..... وہ مرجائے گی اقبال..... میں اسے ہیروئن کیسے دے دوں..... اپنے ہاتھوں سے اسے زہر کیسے پلا دوں؟“

”صبر کیجئے میڈم..... گو صبر کرنا آسان نہیں ہے، میں جانتا ہوں صبر کرنا کیسا اذیت ناک فعل ہے خصوصاً ان حالات میں مگر..... ہم اور کر بھی کیا سکتے ہیں؟“

اس سے پہلے کہ فاریہ میری بات کا جواب دیتی تیز قدموں کی آہٹ نے ہمیں اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ وہ حمیدہ اور ڈاکٹر تھے۔ ڈاکٹر دوڑنے کے سے انداز میں چل رہا تھا۔ وہ ہمارے قریب رکے بغیر سیدھا کمرے میں چلا گیا۔ ہم دونوں بھی اس کے پیچھے اندر داخل ہو گئے۔

زاریہ اب بھی تڑپ رہی تھی۔ بیگ صاحب بے بسی سے اسے تڑپتا ہوا دیکھ رہے تھے۔

”ڈاکٹر..... کیا تم بھی اسے نہیں بچا سکتے؟“ انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ڈاکٹر نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنا بیگ کھول کر انجکشن بنانے لگا۔ ڈاکٹر کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا بس آنکھوں میں تشویش تھی۔ وہ انجکشن تیار کر کے آگے بڑھا۔ زاریہ کو قابو کرنا بہت مشکل ہو رہا تھا فاریہ نے اور بیگ صاحب نے اسے

سنبھلاتا تب جا کر ڈاکٹر انجکشن لگانے میں کامیاب ہوا۔ زاریہ کے چہرے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ منہ کھلا ہوا تھا اور وہ لمبی لمبی سانس لے رہی تھی۔

انجکشن لگانے کے بعد ڈاکٹر نے بیگ صاحب کو باہر آنے کا اشارہ کیا اور اپنا بریف کیس اٹھا کر باہر نکل گیا۔ زاریہ نڈھال سی بیڈ پر پڑی تھی۔ فاریہ اس کے سرہانے بیٹھ کر اس کی پیشانی سے پسینا صاف کرنے لگی۔ میں اس کرسی پر بیٹھ گیا جو زاریہ کے بیڈ کے قریب رکھی تھی۔ میری نگاہیں زاریہ کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں جو اب بے مدد ہو گئی تھی۔ اس کی حالت معمول پر آ رہی تھی۔ چہرے پر درد کی شدت کم ہو گئی تھی۔ پھر شاید آہستہ آہستہ وہ نیند یا غشی کی حالت میں چلی گئی جس کمرے میں شدت کا شور تھا وہاں اب گہرا سناٹا طاری تھا۔

کچھ دیر میں اور فاریہ وہاں خاموش بیٹھے اسے دیکھتے رہے پھر فاریہ دھیرے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں بھی آہستہ قدموں سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ہم باہر آئے تو وہاں ڈاکٹر صاحب اور بیگ صاحب کھڑے تھے۔ ”ڈاکٹر..... اس کا کیا ہو گا؟“

ڈاکٹر نے خاموش نگاہوں سے اسے دیکھا اور سر جھکا لیا۔ ”مس فاریہ، ہم جو کچھ اس کے لئے کر سکتے ہیں وہ کر رہے ہیں۔ آپ..... صرف دعا کریں۔“

فاریہ کا چہرہ لمحہ بھر کو سفید پڑ گیا مگر اس نے فوراً ہی خود پر قابو پا لیا۔ ”آؤ اقبال۔“ اس نے مجھ سے کہا اور ڈرائنگ روم کی طرف چل پڑی۔ آگے بڑھنے سے پہلے اس نے حمیدہ بی بی کو زاریہ کا خیال رکھنے کو کہہ دیا تھا اور وہ سر جھکا کر بلو سے آنکھیں پونچھتی ہوئی کمرے میں چلی گئی تھی۔

ہم دونوں ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے۔ فاریہ خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں بھی ایک طرف بیٹھ کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھی۔ اس کے چہرے سے دکھ کا تاثر معدوم ہو چکا تھا۔ مجھے اس کی جرأت پر حیرت ہوئی۔ میرا دل اب بھی زور زور سے دھڑک رہا تھا اور مجھے یقین تھا کہ پچھلے واقعات کا عکس اب بھی میرے چہرے پر عیاں ہو گا۔

”اقبال..... تم..... کل نہ جاؤ۔ میں خود کو اس وقت بہت کمزور محسوس کر رہی ہوں۔ تم کل اسے فون کر کے کہہ دو کہ تم..... کچھ روز میں اس تک پہنچ جاؤ۔“

گئے۔“ صحیح فیصلہ کیا ہے آپ نے میڈم..... میں بھی خود کو ابھی اس قابل نہیں پا رہا ہوں کہ وہاں جاؤں۔ میرا خیال ہے کہ میں بہادر اور سیمال کو دیکھ کر خود کو قابو نہ رکھ سکوں گا۔ یہ دکھ کچھ کم ہو جائے تو.....“

”ہوں..... تم ٹھیک کہتے ہو۔ اقبال..... میں نے خود کو بے حد مضبوط بنایا ہوا ہے مگر کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے میری حیثیت ریت کی کسی بھر بھری دیوار سی ہو جو لمحہ بھر میں ڈھیر بن جائے گی یا کسی اٹھنے والے طوفان کا ایک ریلہ ہی مجھے بڑھ کر فنا کر دے گا۔ میں..... میں بہر حال ایک عورت ہوں۔ تنہا اور کمزور..... کاش میں مرد ہوتی تو..... تو اس وقت ساری دنیا کو آگ لگا دیتی۔ مجھ سے زاریہ کا دکھ اور اس کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔“

”میڈم مجھے تو آپ کی جرأت اور ہمت دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ میں اس سلسلے میں آپ سے بے حد مرعوب ہوں۔ آپ یہ سب محسوس کرنے کے باوجود بہت مضبوط ہیں۔ آپ خود کو تنہا سمجھیں میڈم..... میں آپ کے ساتھ ہوں۔ میری تمام طاقت آپ ہیں اور آپ کی ساری طاقت میں ہوں۔ مجھے آپ کسی بھی معاملے میں کمزور نہیں پائیں گی۔“

”تھینک یو اقبال..... تھینک یو۔ مجھے تم سے بہت بڑا سہارا ہے۔ اب..... تم چاہو تو جا سکتے ہو، تھک گئے ہو گئے۔“

”جی میڈم، میرا خیال ہے کہ آپ بھی آرام کریں۔ آپ صبح سے مضروف تھیں۔ اب تو بہت رات ہو چکی ہے۔“ میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ فاریہ بھی شاید اپنے کمرے میں جانے کو کھڑی ہو گئی۔ میں اسے شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ کپڑے بدلے اور بستر پر ڈھے گیا۔ آج کا دن میرے ذہن پر کچھ اچھا اثر نہ ڈال سکا تھا۔ میں خود کو بے حد تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ آج مجھے جو جذباتی جھٹکے لگے تھے اس نے میرے اعصاب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

آج سے پہلے فاریہ اور بیگ صاحب کے بارے میں جو کچھ بھی میرے ذہن میں تھا وہ سب کا سب الٹ پلٹ ہو گیا تھا۔ اس بے ترتیبی نے ہی مجھے کافی تھکا دیا تھا پھر سلطان

ہوئی تاریکی اور میرے بدن میں پھیلی ہوئی مایوسی ختم ہو گئی ہو۔ میں کمرے میں لوٹ آیا۔ میں نے نہا کر کپڑے بدلے اور کوٹھی کے سامنے والے حصے میں چلا آیا۔ میرا خیال تھا کہ گھر کے سب افراد ابھی سو رہے ہوں گے مگر لان میں فاریہ کو گم صم بیٹھے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ وہ کرسی کی پشت سے سر نکائے خلا میں گھور رہی تھی۔ اس نے کپڑے بھی نہیں بدلے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ سرے سے بستر پر لیٹی ہی نہیں۔

میں دبے قدموں اس کی جانب بڑھا۔ وہ مجھ سے بے خبر ویسے ہی بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ مجھے اس کی حالت پر بہت افسوس ہوا مگر یہ ہونا ہی چاہئے تھا۔ میرا تو زاریہ سے کوئی خونی رشتہ بھی نہ تھا مگر میں ساری رات جاگتا رہا پھر وہ تو زاریہ کی سگی بہن تھی۔ اس کی زندگی کا تو لمحہ لمحہ اس کی رفاقت میں گزرا تھا، بھلا وہ کیسے سو پاتی؟ میں نے کھنکار کر اسے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ وہ اچھل پڑی۔

”سوری میڈم۔“ میں جھج سا ہو گیا۔

”اوہ تم..... آؤ بیٹھو۔“ وہ سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

میں اس کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔

”تم بھی نہیں سو پائے؟“

”جی میڈم، بس نیند نہیں آئی۔“

”نیند نے شاید اس کوٹھی میں قدم رکھنا ہی چھوڑ دیا ہے اقبال..... مجھے یاد نہیں کہ زاریہ کے یہاں آنے کے بعد میں کب سوئی تھی۔“

”نچل سی بات ہے میڈم..... مگر..... آپ کو سنبھلنا ہو گا۔“

”ہاں مجھے احساس ہے کہ اس طرح میں مزید کمزور ہو جاؤں گی۔ مجھے سنبھلنا چاہئے۔“ وہ خاموش ہو کر نچلے ہونٹ کو دانتوں سے کاٹنے لگی۔

”آپ نے چائے پی؟“

”ہوں..... نہیں..... منگواؤ۔“

میں اٹھ کر یعقوب کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ یعقوب دو سرے کاموں کے علاوہ باورچی کا کام بھی کرتا تھا۔ اس کا دروازہ بند تھا۔ شاید وہ سو رہا تھا میں نے آگے بڑھ کر اس کے دروازے پر دستک دینا چاہی اسی لمحے اندر سے ابھرتی سرگوشی سنائی دی۔ میں

کی باتیں اور پھر زاریہ کا وجود..... یہ تمام ہی ایسی باتیں تھیں جنہوں نے میرے اعصاب جھنجھنا کر رکھ دیئے تھے۔ حالات جو اب تک نظر آئے تھے وہ یکسر تبدیل ہو چکے تھے۔ میرا ذہن خالی تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ذہن میں صرف آندھی سی چل رہی ہو بے پناہ شور سا تھا مگر کوئی خیال، کوئی بات واضح نہ تھی۔ میں اس وقت کچھ سوچنے کے قابل بھی نہیں تھا مگر نیند بھی نہیں آرہی تھی۔ میں خاموشی سے لیٹا رہا۔ وقت کب اور کیسے گزر گیا بالکل احساس نہ ہوا۔ حیرت مجھے اس وقت ہوئی جب گھڑی نے جب چھ گھنٹے بجائے۔

صبح ہو گئی۔ وقت کسی تیز لہری طرح بہہ گیا۔ میں اٹھ بیٹھا۔ میری عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ مجھے کتنے روز کے بعد نماز کا خیال آیا۔ میں نے وضو کیا اور خدا کے آگے سجدہ ریز ہو گیا۔ نماز پڑھ کر میں نے خدا سے دعا مانگی۔ دعا کی کہ وہ مجھے میرے مشن میں کامیاب کرے، مجھ میں حوصلہ اور جرأت پیدا کر دے کہ میں ان خبیث اور ضمیر فروشوں کو نیست و نابود کر سکوں۔ میں نے اس سے گڑگڑا کر زاریہ کی زندگی کی دعائیں بھی مانگیں، میں بہت دیر تک سجدے میں گرا روتا رہا۔ میں نے ماں، ماسی میراں اور سو بہنی کی خیریت کی بھی دعا مانگی تھی، پھر میں نے جاء نماز تہہ کر کے الماری کے اوپر رکھ دی اور خود دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ باہر آسمان پر ملگجاسا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ آسمان کا مشرقی کنارہ اجلا ہو گیا تھا مگر باقی آسمان پر تاریکی کی چادر سی پڑی تھی۔ میں بہت دیر کھڑا اس اجالے کو دیکھتا رہا جو دھیرے دھیرے چھاتا جا رہا تھا۔ آسمان پر چمکنے والے ستارے دھیمے دھیمے اپنی روشنی سے محروم ہوتے جا رہے تھے۔

”اقبال۔ خدا بڑا کریم ہے، اسی طرح اندھیرے میں اجالا پھیلاتا اور اجالے کو اندھیروں میں تبدیل کر دیتا ہے، قدرت رکھنے والی یہ عظیم ہستی ظلم اور ظالم کے خلاف بھی اسی طرح عمل کرتی ہے۔ وہ ایک نہ ایک روز ظلم کو ختم کر دیتی ہے، ظالم کو فنا کر دیتی ہے۔ اس عظیم ہستی سے مدد مانگے گا تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ تیری مدد نہ کرے۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ تو اجالے کی طرح دنیا میں پھیلتا چلا جائے اور ظلم کے جاہ و جلال کو فنا کر دے۔“ میرے اندر سے سرگوشی ابھری۔ پھر جانے کیا ہوا کہ پھیلنے ہوئے اجالے کے ساتھ ساتھ میری کیفیت بھی بدلتی چلی گئی۔ میں نے خود کو زیادہ مضبوط اور بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ مجھے لگا جسے دھیرے دھیرے پھیلنے والا یہ اجالا مجھ میں اتر گیا ہو۔ میرے دل و دماغ پر چھائی

ٹھنک کر رک گیا۔ میں نے اپنا کان دروازے سے لگا دیا۔

”یہ اسے دے دینا..... یہ بہت ضروری ہے ہے یعقوب..... کسی بھی طرح.....“ عجیب سی آواز تھی۔ اندازہ نہ ہوا کہ بولنے والی عورت ہے یا مرد۔ میرے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ میں نے مزید کچھ سننے کی کوشش کی۔ اندر سے یعقوب کی آواز آئی تھی مگر جملہ سمجھ میں نہ آیا۔ پھر کوئی آہٹ ہوئی جیسے کوئی دروازے کی طرف آ رہا ہو۔ میں لپک کر دیوار کے پیچھے ہو گیا۔

”کل مجھ سے فون پر بات کرنا۔“ آواز کسی عورت کی تھی۔

”ٹھیک ہے مگر..... تم اس طرف سے نہ جاؤ۔ اس طرف خطرہ ہے۔ پچھلے دروازے سے نکل جانا۔“ یعقوب کی آواز میں اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اس کے لیے میں گھبراہٹ تھی۔

میں نے آہستہ سے سر آگے بڑھا کر جھانکنے کی کوشش کی مگر فوراً ہی پیچھے ہو گیا۔ میں اس وقت کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ میں وہیں دبا کھڑا رہا غالباً وہ عورت چلی گئی۔ یعقوب نے اندر جا کر دروازہ بند کر لیا۔ اسے شاید توقع نہیں ہو گی کہ ہم اس وقت جاگ رہے ہوں گے۔ اس کے کمرے میں جاتے ہی میں کوٹھی کے بیرونی گیٹ کی طرف لپکا۔ لان میں بیٹھی فاریہ مجھے حیرت سے باہر کی جانب جاتے دیکھ رہی تھی مگر میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں اسے ساری پتویشن سے آگاہ کرتا۔ میں کسی بھی طرح کوٹھی کے پچھلے حصے کی طرف جانا چاہتا تھا کہ اس عورت کی صورت دیکھ سکوں۔ میں تیز قدموں سے گیٹ کی طرف جا رہا تھا چوکیدار نے شاید مجھے اس جانب آتے دیکھ لیا تھا۔ میں نے اسے دور ہی سے گیٹ کھولنے کا اشارہ کیا۔ گیٹ پر تالا پڑا تھا چوکیدار نے پھرتی سے تالا کھول دیا۔

فاریہ مجھے باہر جاتا دیکھ کر کھڑی ہو گئی مگر میں نہیں رکا۔ گیٹ سے باہر نکلتے ہی میں نے بھاگنا شروع کر دیا۔ میں برابر کی پتلی گلی سے ہوتا ہوا کوٹھی کی پچھلی جانب پہنچ گیا مگر پچھلی سڑک سنسان تھی۔ دور دور تک کوئی نہ تھا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ اتنی جلد کوئی وہاں سے غائب ہو سکتا ہے۔ کوٹھی سے نکلنے والے کو مین روڈ تک پہنچنے میں کم از کم تین چار منٹ تو لگتے ہی جبکہ میں اس سے بھی کم وقت میں وہاں پہنچ گیا تھا۔

ممکن ہے وہ ابھی کوٹھی ہی میں ہو۔ یہ خیال آتے ہی میں گلی میں کوٹھی کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ میں وہیں اس کا انتظار کرنا چاہتا تھا۔ میرا مقصد صرف اس عورت کی صورت دیکھنا تھا۔ کوٹھی سے چند قدم آگے ایک کار کھڑی تھی مگر اس کی حالت ایسی تھی جیسے کئی برسوں سے وہیں کھڑی ہو۔ دھول میں اٹی ہوئی۔ میں نے سوچا کہ میں اس کار کی پہنچ کر اس کی آڑ لے لوں تاکہ دروازے سے نکلنے والے کو صاف طور پر دیکھ سکوں مگر جانے کیوں میں نے ایسا نہ کیا اور وہیں دم سادھے کھڑا رہا۔

مجھے وہاں کھڑے چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ اچانک گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ میں چونک کر آگے بڑھا۔ مجھ سے چوک ہو گئی تھی۔ وہی مردہ گاڑی تیز رفتاری سے آگے کی جانب بڑھ رہی تھی۔ اسے کوئی عورت ڈرائیو کر رہی تھی۔ میں نے جلا کر گھونسا دیوار پر مارا اور دور جاتی گاڑی کو دیکھنے لگا۔

مجھے تو گمان بھی نہ تھا کہ آنے والی اس قدر چالاک ہو گی جو ایسی گاڑی میں آئے گی بے دیکھ کر کسی کو احساس بھی نہ ہو گا کہ یہ گاڑی چل بھی سکتی ہے۔ اسے دیکھ کر تو میں یہ سمجھا تھا کہ وہ کسی کی ناکارہ کار ہے جو جائے ٹک سے یہاں کھڑی ہے۔

میں نہیں جانتا تھا کہ وہ عورت کون تھی اور یعقوب سے اس کا کیا تعلق تھا مگر اس واقعے سے ایک بات واضح ہو گئی تھی کہ یہاں کوٹھی کے اندر بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو عمارت کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔ مجھے اس عورت کا جملہ یاد تھا۔ اس نے یعقوب کو کوئی چیز دی تھی جو یعقوب کو کسی تک پہنچانا تھی۔ وہ کیا چیز تھی..... وہ عورت کون تھی۔ وہ چیز کس کے لئے تھی؟ یہ وہ سوالات تھے جو کسی تیز رفتار چلتی کی طرح میرے ذہن میں گھوم رہے تھے۔

میں جھکے جھکے قدموں سے واپس لوٹ آیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے یعقوب پر کمری نگاہ رکھنا ہے۔ میں گیٹ کے پاس پہنچا تو فاریہ کو حیران وہاں کھڑے پایا۔

”اقبال..... کیا ہوا؟ کہاں گئے تھے؟“ اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

”آئیے میڈم..... بیٹھ کر بات کریں گے۔“ میں نے لان کی طرف اشارہ کیا۔ وہ ابھی ابھی سی لان کی طرف چل دی۔

ہم وہاں بیٹھ گئے۔ میں سوچنے لگا کہ فاریہ کو یہ سب بتانا چاہئے یا نہیں، وہ اس وقت

ویسے ہی بہت پریشان تھی۔ یہ واقعہ اس کی پریشانی میں اضافہ کر دیتا۔ میرے لئے یہ بھی پریشانی کی بات تھی کہ اگر یہ سب اسے نہ بتاؤں تو اپنے یوں باہر جانے کی کیا وجہ بتاؤں۔
”اقبال..... تم بولتے کیوں نہیں..... تم تو چائے کے لئے گئے تھے نا پھر..... اس طرح بھاگ کر باہر جانا..... کیا بات ہے، بتاتے کیوں نہیں؟“

”میڈم سوری..... میری ایک بے وقوفی کی وجہ سے آپ کو پریشانی ہوئی۔ بات تو کچھ خاص نہ تھی۔ میں جب یعقوب کے کمرے کی طرف گیا تو جانے کیوں مجھے ایسا لگا جیسے کوئی کہیں کودا ہو۔ یہ خیال آتے ہی میں نے اس دیوار کی طرف دیکھا جو پچھلی گلی اور کوٹھی کے درمیان تھی۔ نہ معلوم کیوں میں..... باہر چلا گیا۔ بس ایسا لگا تھا جیسے کوئی اسی دیوار سے پچھلی جانب کودا ہو مگر گلی میں کچھ بھی نہ تھا۔ سنسان تھی پوری گلی۔ شاید میرا وہم تھا۔ ان حالات نے شاید مجھے بہت کنفیوز کر دیا ہے۔ آئی ایم ریلی سوری میڈم۔“

”وہ بے یقینی سے مجھے دیکھ رہی تھی شاید میرے لہجے کے کھوکھلے پن نے اسے مشکوک کر دیا تھا۔“

”اقبال..... کیا تم سچ بول رہے ہو؟“
”جی میڈم..... میں..... سچ بول رہا ہوں۔ آپ سے جھوٹ بولنے کا جواز بھی نہیں۔“ میں نے لہجے کو مضبوط بناتے ہوئے جواب دیا، ایسا کرنے کے لئے مجھے خاصی محنت کرنا پڑی۔

وہ کچھ دیر مجھے خالی خالی نگاہوں سے دیکھتی رہی پھر لمبی سانس لے کر اس نے سرلو پھر کرسی کی پشت سے نکا دیا۔

”زندگی، کائنات اور اس میں ہونے والی ہر حرکت کتنی بے یقینی ہوتی ہے۔“ وہ زیر لب ہنسنے لگی۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔

”تم نے چائے کے لئے نہیں کہا؟“

”اوہ سوری..... اس چکر میں بھول ہی گیا۔ میں کہتا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں یعقوب کے کمرے کی طرف چل پڑا۔

میں نے یعقوب کا دروازہ کھٹکھٹایا جو فوراً ہی کھل گیا۔ یعقوب اتنی سویرے مجھے دیکھ

کر حیران ہو گیا۔ وہ تو سوا آٹھ بجے مجھے خود آکر اٹھایا کرتا تھا۔
”سر آپ؟“ وہ گھبرایا ہوا سا لگا۔

”یعقوب مس فاریہ لان میں ہیں۔ میری اور ان کی چائے وہیں لے آؤ۔“ میں نے بارل انداز میں کہا۔

”بی بی اٹھ گئیں؟“ اس نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔
”ہاں ابھی ابھی اٹھی ہیں۔ میں انہیں لان میں جاتے دیکھ کر اس طرف آ گیا۔“

”جی..... جی بہتر..... آپ چلیں میں ابھی لایا۔“ اس نے بوکھلائے انداز میں جواب دیا اور پلٹ گیا۔ اس کے پلٹتے ہی میری نگاہ اس کے پلنگ پر پڑی جو سامنے ہی بچھا ہوا تھا۔ اس کے تنکے کے قریب ایک چھوٹا سا لفافہ رکھا تھا۔ لفافہ کچھ ابھرا ہوا تھا۔ میرا دل دھڑک اٹھا۔ شاید یہی لفافہ اسے دیا گیا ہو۔ یہ خیال آتے ہی میرے جڑے بھیج گئے۔
اسی وقت یعقوب پلٹ پڑا۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی میں بول اٹھا۔ ”جلدی کرو.....“

”بی بی بہت تھکی ہوئی ہیں۔“
”جی سر بس ایک منٹ لایا۔“

میں اس کا جواب سن کر وہاں سے چل پڑا۔ میرے ذہن میں آندھنی سی چل رہی تھی۔ وہ کیا چیز ہے..... وہ کیا چیز ہے اور کسے دینا ہے؟ بس یہ ایک جملہ میرے ذہن میں ہتھوڑے کی طرح برس رہا تھا ”اقبال.....“ فاریہ کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔
”جی میڈم..... میں نے چائے کے لئے کہہ دیا ہے۔“ میں نے فوراً خود کو نمٹال لیا۔

وہ خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی۔ میں سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور ٹیبل پر رکھا اخبار اٹھا کر پڑھنے لگا حالانکہ میں ایک سطر بھی نہیں پڑھ پایا مگر نگاہیں اخبار کے صفحے پر گاڑے بیٹھا رہا۔ میں فاریہ سے جھوٹ بول کر خود کو بہت گھٹیا محسوس کر رہا تھا مگر اس کے سوا بارہ بھی کوئی نہیں تھا۔

ہمارے درمیان خاموشی طاری رہی۔ کچھ دیر بعد ہی یعقوب چائے کی ٹرے لئے چلا آیا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ چور نگاہوں سے فاریہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے وجود نے ایک اضطراب سا محسوس ہوا مجھے۔ فاریہ اس سے لا تعلق بیٹھی درخت پر چچھاتی

چڑیوں کو دیکھ رہی تھی۔

یعقوب نے پیالیوں میں چائے بنائی اور ہمارے سامنے رکھ دی۔ میں چائے کی چسکیاں لینے لگا۔ میری نگاہیں اب بھی یعقوب کا تعاقب کر رہی تھیں جو اب چائے کے برتن لئے کوٹھی کے اندرونی حصے کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے جلدی سے چائے ختم کی اور فاریہ سے اجازت مانگی۔

”کہاں جا رہے ہو؟“ اس نے کھوئے ہوئے انداز میں پوچھا۔

”میں..... زاریہ کو دیکھنا چاہتا ہوں میڈم..... نہ معلوم وہ کیسی ہو گی؟“

”وہ سو رہی ہو گی اقبال..... اسے مارفا کا انجکشن لگایا تھا ڈاکٹر نے..... یہی بے ہوشی اس کی زندگی کی ضمانت بن گئی ہے۔“

”میں جانتا ہوں میڈم مگر ایک نظر دیکھ لوں گا تو.....“

”ٹھیک ہے جاؤ۔“ اس نے گہرا سانس لے کر مجھے اجازت دے دی۔

میں تیز قدموں سے کوٹھی کے اس حصے کی طرف چل پڑا جس طرف زاریہ کا کمرہ تھا۔ ابھی میں چند قدم پیچھے تھا کہ دروازہ کھلا اور وہ بوڑھی عورت باہر آ گئی۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ میں نے بے چینی سے پوچھا۔

”جی کلی کر لوں.....“

”یعقوب کہاں ہے؟“

”وہ اندر چائے لے کر گیا ہے۔“

میں تیزی سے آگے بڑھا اور میں نے اچانک دروازہ کھول دیا۔

وہ بیڈ پر جھکا زاریہ کو اٹھنے میں مدد دے رہا تھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ زاریہ کے سر ہانے تکیہ اونچا کر اسے بٹھایا اور چائے کپ میں انڈیلنے لگا۔ میں تیزی سے آگے بڑھا اور کرسی گھسیٹ کر بیڈ کے قریب بیٹھ گیا۔ میں بڑی گہری نگاہوں سے یعقوب کا جائزہ لے رہا تھا۔ زاریہ نڈھال سی آنکھیں بند کئے لیٹی تھی۔

اسی اثناء میں وہ بوڑھی عورت بھی آ گئی جو زاریہ کی خدمت پر معمور تھی۔ یعقوب گھبرایا ہوا سا تھا یا مجھے گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔ اس نے اس بوڑھی عورت کو بھی چائے دی۔

”حمیدہ بی بی..... دوا دی ہے آپ نے؟“ میں نے پوچھا

”صاحب جی رات کی خوراک تو دے دی تھی۔ اب ناشتا کر لیں گی تو دوں گی۔“

”کہاں ہے دوا؟“

”دراز میں!“ اس نے بیڈ کی دراز کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے دراز کھولی۔ اس میں کچھ دواؤں کی شیشیاں رکھی تھیں۔ زیادہ تر ٹیبلٹ تھیں ان دواؤں میں کوئی لفافہ نہیں تھا۔ ویسا ہی لفافہ جیسا میں نے یعقوب کے پلنگ پر رکھا دیکھا تھا اور جس پر مجھے شبہ تھا کہ یہ لفافہ اسی عورت نے دیا ہے۔ میں ہر چیز کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ یعقوب خواہ مخواہ کھڑا ہوا ہے۔ میں نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ وہ میری ہی طرف متوجہ تھا۔

”کیا بات ہے؟ تم اب کیوں کھڑے ہو؟“

”جج..... جی کچھ نہیں..... میں..... جا رہا ہوں۔“

”بی بی کے لیے ناشتہ لاؤ۔ میں اپنے سامنے انھیں ناشتا کراؤں گا۔“

وہ تیزی سے رُے لیے ہوئے باہر چلا گیا۔ مجھے نہ معلوم کیوں گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ ایک عجیب سا احساس تھا جو مجھے اندر سے دبوچے ہوئے تھا۔ کچھ ہو رہا ہے یا کچھ ہونے والا ہے اس احساس نے مجھے گھبراہٹ میں مبتلا کیا ہوا تھا۔ یعقوب کے جانے کے بعد میں زاریہ کی طرف متوجہ ہوا جو مجھے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی حالت ابھی تک سنبھلی نہیں تھی۔ چہرے سے نقاہت کا احساس ہو رہا تھا۔ آنکھیں ویران ویران سی لگ رہی تھیں۔

”زاریہ بی بی، تمہارا کوئی بھائی نہیں تھا نا..... مجھے اپنا بھائی سمجھو۔ میری بھی ایک چھوٹی بہن تھی، بالکل تمہاری طرح مگر..... میں..... میں اسے کھو چکا ہوں لیکن یہ میرا خود سے وعدہ ہے کہ میں تمہیں نہیں کھوؤں گا۔ تمہیں بچالوں گا۔“

”آپ کا نام..... نام کیا ہے؟“

”اقبال، تم مجھے بھیا کہہ سکتی ہو۔“

”شکریہ بھیا..... مگر مجھے اب زندگی کی خواہش نہیں ہے۔ آپ بتائیے میری یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے..... میری وجہ سے سب پریشان ہیں۔ میں خود بھی اپنے آپ سے تنگ

اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا مگر خاموش رہی۔
”تم..... تم اب نشہ نہیں کرو گی۔“

”کہاں سے کروں گی نشہ.....؟“ اس نے دکھ سے کہا۔ اس کے لہجے میں حسرت تھی۔

”میں نہیں جانتا۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم..... تمہیں اگر کوئی کئے بھی تو..... دے بھی تو نہیں کرو گی۔ مجھ سے وعدہ کرو زاریہ، تمہیں..... تمہیں بچو کی قسم زاریہ۔ کیا تم انہیں ایک چھوٹی سے خوشی نہیں دے سکتیں؟ تم جانتی ہو کہ وہ کتنی پریشان ہیں۔ وہ عورت ہو کر مردوں کی سی برداشت کا مظاہر کرتی ہیں۔ وہ لمحہ لمحہ تمہارے بارے میں سوچ کر پریشان رہتی ہیں۔ کیا تم..... ان کی خاطر اتنا بھی نہیں کر سکتیں۔ اس بچو کی خاطر جو تمہیں ماں سے زیادہ پیار دیتی ہے۔ باپ سے زیادہ شفیق ہے۔“
”بس کریں..... بس کریں پلینز..... پلینز.....“ وہ ایک دم چیخ پڑی۔

”چھوڑ دو اقبال۔“ اچانک زاریہ کی آواز آئی۔ میں نے اور زاریہ نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ بند دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ ہم باتوں میں اتنے مگن تھے کہ ہمیں اس کی آمد کا احساس بھی نہ ہوا۔

”جو کچھ میری قسمت میں ہے اقبال اسے نہ تم بدل سکتے ہو اور..... نہ زاریہ۔ میں اسی پر شاکر ہوں اور شاکر رہوں گی۔ زندگی کی خوب صورتی کے بارے میں زاریہ فوج جانتی ہے، سمجھ دار ہے، پڑھی لکھی ہے پھر بھی اس نے خود کو اس لعنت میں مبتلا کر لیا۔ کیا یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ ایسا کر کے موت کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھ رہی ہے۔ وہ تو یہ بھی جانتی ہے کہ اس راستے پر زیادہ سیڑھیاں نہیں ہیں مگر..... مگر پھر بھی.....“

”بجو..... بجو پلینز..... مجھے معاف کر دو۔ مجھے مر جانے دو بجو تاکہ تم اس اذیت سے نجات پا لو اور میں بھی.....“ زاریہ نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

ماحول ایک دم بہت بو جھل ہو گیا تھا۔ زاریہ بیڈ پر آ بیٹھی۔ وہ زاریہ کو اپنی بانہوں میں بھر کر اسے پیار کرنے لگی۔ ”میں تجھے کیسے مرنے دوں پگی؟“ اسی وقت یعقوب ناشتا

آچکی ہوں۔ میں زندگی کے اس موڑ پر ہوں جہاں سے واپسی ممکن نہیں۔ یہ سچ ہے کہ میں مرجانا چاہتی ہوں۔ بھیا، میں زندہ رہنا چاہتی تھی میں نے بھی عام لڑکیوں کی طرح حسین خواب دیکھے تھے، میں بھی ان خوابوں کی تعبیر پانے کے لیے سرگرداں تھی مگر..... میرے خوابوں کی تعبیر کتنی بھیا تک نکلی کہ..... کہ ہم سب تباہ ہو گئے۔ میں جانتی ہوں کہ میری موت بچو کے لیے بڑی تباہی بن جائے گی۔ بچو جس نے اب تک نہ کسی سے پیار پایا ہے اور نہ کسی سے سکھ۔ وہ..... وہ تو جیتے جی مرجائیں گی۔“

میں حیرت سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ خاموش ہوئی تو میں نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا اٹھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ رنجیدہ ہو۔

”تمہارا وہم ہے زاریہ کہ تم مرجاؤ گی۔ تم زندہ رہو گی، بلکہ بھرپور زندگی گزارو گی۔ تمہاری بچو تمہیں خوش و خرم دیکھ کر خود بھی خوش رہیں گی۔ زاریہ، تم بھی حسین خواب دیکھ سکتی ہو، ان حسین خوابوں کی تعبیر کی تلاش میں کروں گا بیٹا، میں اور تمہاری بچو تمہیں بھرپور زندگی کی طرف لے جائیں گے۔ تم ایسی باتیں سوچنا چھوڑ دو اور میری بات غور سے سنو۔ انسان اپنی عادات بدلنے پر قادر ہے۔ وہ چاہے تو کسی بھی وقت کوئی بھی عادت اپنا سکتا ہے اور کسی بھی لمحے اس سے چھٹکارا پا سکتا ہے۔ ذرا سی ول پاور کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسانی جسم کسی بھی چیز کا اس قدر عادی ہو سکتا ہے کہ اس کے نہ ملنے سے تکلیف محسوس کرے مگر انسانی جسم طالع ہے ذہن کے۔ اگر تم اپنے ذہن کو قابو میں رکھو تو جسم تمہیں دو چار دن تکلیف تو دے گا مگر بہت جلد وہ تمہاری مرضی کے مطابق کام کرنے لگے گا۔ میری اس تقریر کا مقصد صرف یہ ہے کہ ذرا سا خود کو سنبھال کر تم زندگی کو جیت سکتی ہو۔ یہ سوچ لو کہ زندگی خوب صورت ہے، یہ صرف ایک بار ملتی ہے، اور تمہیں زندہ رہنے کا پورا پورا حق ہے، تم یقین کرو تم جیت جاؤ گی۔“ میں دھیمے لہجے میں اسے سمجھا رہا تھا اور وہ بے یقینی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

”چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے بی بی!“ حمیدہ بی بی کی آواز نے ہم دونوں کو چونکا دیا۔

اس نے لمبا سانس لے کر چائے کی پیالی اٹھالی۔ اس کے ہاتھوں میں ہلکی سے لرزش تھی۔

”زاریہ..... مجھ سے ایک وعدہ کرو۔“

لے آیا۔ فاریہ نے اپنا اور میرا ناشتا بھی وہیں منگوا لیا تھا ہم سب نے وہیں ناشتا کیا۔ ماحول گھٹا گھٹا سا تھا۔ میں مسلسل اس لفافے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ وہ کس کے لئے ہے۔ میری عقل میں جو بات آئی تھی وہ یہی تھی کہ وہ لفافہ شاید زاریہ کے لئے تھا مگر اسے ثابت کرنا میرے لئے انتہائی مشکل تھا۔ میں فاریہ کو اس بات سے آگاہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ناشتا کر کے ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ فاریہ کو فیکٹری جانا تھا۔ بیگ صاحب کو کل رات سے بلڈ پریشر کی شکایت تھی۔ زاریہ خطرے میں تھی۔ یعقوب جو یہاں کے لوگوں کے نزدیک ان کا اپنا آدمی تھا اور جس پر سب ہی پوری طرح اعتماد کرتے تھے وہ میری نگاہوں میں مشکوک ہو چکا تھا۔ مجھے ان حالات میں یوں لگ رہا تھا جیسے میں کسی گھنے جنگل میں تنہا ہوں اور میرے چاروں طرف دشمن گھات لگائے بیٹھا ہو۔

”اقبال تم میرے ساتھ فیکٹری چلو۔ آج سامان کی شپنگ کرانا ہے۔ میں خود میں اتنی ہمت نہیں پاتی کہ تنہا یہ سب کروں۔“ فاریہ نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میں یہاں سے ایک پل کے لئے بھی نہیں جانا چاہتا تھا۔ میں اتنے نازک حالات میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔

”میڈم..... بیگ صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ادھر زاریہ اکیلی ہے۔ ہم دونوں کا چلا جانا مناسب نہیں۔ آپ یہاں زاریہ کے پاس رہیں تو میں چلا جاتا ہوں۔“

”زاریہ اکیلی تو نہیں اقبال، حمیدہ اور یعقوب اس کا خیال رکھنے کے لئے موجود ہیں۔ تم تنہا یہ سب نہیں کر سکو گے۔ کون سے سامان کی شپنگ کرانا ہے یہ تو میں خود کر پاؤں گی۔ مجھے ریکارڈ دیکھنا ہو گا۔ کتنا مال کس ملک میں اور کس کمپنی کو بھیجنا ہے یہ علم یا تو مسٹر علوی کو ہے یا مجھے۔ مسٹر علوی اپنی بیوی کے علاج کے لئے لندن گئے ہیں ہوئے ہیں۔ ان کی غیر موجودگی سے مجھ پر بڑا بوجھ آ چڑا ہے ورنہ میں کسی حد تک اس مصیبت سے آزاد تھی۔“

”میڈم اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں یہاں رک جاتا ہوں، آپ وہاں اپنی مدد کے لئے کسی اور کو کہہ دیجئے گا۔“ میرے لہجے کی بے پناہ بے چینی شاید فاریہ نے محسوس کر لی تھی۔ اس نے گہری نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

”اقبال..... کوئی خاص بات ہے؟“

”جج..... جی نہیں میڈم..... کوئی خاص بات نہیں ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔“

”مگر اقبال تم.....“ وہ اپنا جملہ مکمل نہیں کر پائی تھی کہ اچانک کال بیل کی مدھم آواز سنائی دی۔ میں اور فاریہ فوراً برآمدے کی طرف بڑھ گئے ہم نے دیکھا کہ چوکیدار گیٹ کھول رہا ہے۔ گیٹ کھولتے ہی ڈاکٹر طارق کی گاڑی اندر آ گئی۔ میں اور فاریہ پورچ کی طرف بڑھ گئے۔

”زاریہ کی طبیعت اب کیسی ہے؟“ ڈاکٹر طارق نے گاڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ بہتر ہے ڈاکٹر مگر یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا؟“ فاریہ نے پوچھا اور ہم لان کی طرف بڑھ گئے جہاں سایہ دار درخت کے نیچے کرسیاں بڑی ہوئی تھیں۔

”مس فاریہ، یہ انتہائی نازک معاملہ ہوتا ہے۔ اس میں علاج کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی خیال رکھا جاتا ہے کہ مریض دوبارہ نشے کی طرف رجوع نہ کرے۔ اسے جو بے اندازہ تکلیف ہوتی ہے وہ دواؤں سے نہیں بلکہ نشے سے فوراً ختم ہو جاتی ہے۔ مریض یہ بات جانتا ہے اگر اس میں قوت برداشت کی کمی ہو تو وہ فوراً نشے کی طرف رجوع کرتا ہے مگر یہاں میرے خیال میں زاریہ کو ایسا کوئی خطرہ نہیں کہ وہ دوبارہ نشہ کرنے کی کوشش کرے۔ میرا خیال ہے کہ یہ تکلیف اب کچھ ہی روز کی ہے پھر انشاء اللہ وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔ ڈونٹ وری مس فاریہ، میں زاریہ کی طرف سے پُر امید ہوں۔ میں رات کو کی گئی بات پر شرمندہ تھا اسی لیے آج صبح یہاں پہنچ گیا۔ دراصل میں بھی تو انسان ہوں اس کی بے تحاشہ تکلیف اور اس کی حالت نے مجھے مایوس کر دیا تھا میں معذرت چاہتا ہوں۔“

”کوئی بات نہیں ڈاکٹر، بس آپ زاریہ کا علاج جاری رکھیں۔ اس کی حالت اب بھی کچھ بہتر نہیں ہے۔“ فاریہ نے جواب دیا۔

”میرا علاج جاری رہے گا مس فاریہ۔ میں زاریہ سے ملنا چاہتا ہوں۔“

ڈاکٹر کی بات سن کر میں کھڑا ہو گیا۔ ”آئیے میں آپ کو لے چلتا ہوں۔ مس فاریہ

بہت تھکی ہوئی ہیں۔“ پھر میں فاریہ سے مخاطب ہوا۔ ”میڈم میرا خیال ہے کہ اب آپ کچھ دیر آرام کر لیں، آرام آپ کے لیے بے حد ضروری ہے۔ آپ کو فیکٹری بھی جانا ہے۔“

”ہاں اقبال..... تم ساتھ چلو گے۔“ اس کا انداز تحکمانہ تھا۔ میں سر جھکائے کھڑا رہا۔

”چلئے مسٹر اقبال۔“

میں ڈاکٹر کو لیے زاریہ کے کمرے میں آگیا۔ زاریہ نے ہمیں دیکھ کر منہ بنایا اور کروٹ لے لی۔

”بی بی کیسی ہیں آپ؟“

”ٹھیک ہوں۔ میں دوائیں کھانے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ آپ مجھے انجکشن لگا دیں۔“ زاریہ نے ہماری جانب دیکھے بنا جواب دیا۔

ڈاکٹر انجکشن تیار کرنے لگا۔ میں نے حمیدہ بی بی کو باہر آنے کا اشارہ کیا اور خود دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ حمیدہ کے باہر آنے سے پہلے ہی میں نے چاروں طرف گھوم کر یہ اطمینان کر لیا تھا کہ اس پاس کوئی موجود نہیں ہے جو ہماری گفتگو سن سکے۔ حمیدہ چند لمحوں بعد باہر آئی تو اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

”حمیدہ، تمہاری کوئی بیٹی ہے؟“

”جی؟.....“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”میری بات کا جواب دو۔“

”جی صاحب ایک بیٹی ہے۔ ماشاء اللہ دو بچے ہیں اس کے کراچی میں رہتی ہے۔“

”ہوں..... حمیدہ تم زاریہ کی زندگی چاہتی ہو یا موت؟“

”جی!.....“ وہ اچھل پڑی۔ اس کی آنکھوں میں خوف سمٹ آیا۔ ”کک..... کیا بات ہے صاحب؟ آپ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں۔ میں بھی بچوں والی ہوں۔ خدا نہ کرے

زاریہ بی بی کو کچھ ہو۔“

”ہوں..... تو پھر میری باتیں غور سے سنو۔ زاریہ کو پھر وہی زہر دینے کی کوشش کی جائے گی، اس لیے تم ایک لمحے کے لیے بھی اس کو تنہا چھوڑنا۔ سب پر گہری نگاہ رکھنا۔“

سب پر..... خواہ وہ گھر ہی کا کوئی آدمی کیوں نہ ہو۔ تم سمجھ رہی ہونا؟“

”جج..... جی صاحب..... آپ کا مطلب یہی ہے ناکہ بی بی کو کوئی ہیروئن دے گا۔ مگر کون صاب..... یہاں تو باہر کا کوئی بھی آدمی نہیں آسکتا۔“

”میں نے ابھی کہا ہے ناکہ..... وہ گھر کا آدمی بھی ہو سکتا ہے۔ کوئی بھی..... کوئی ملازم یا کوئی مہمان..... کوئی بھی۔ تم ایک لمحے کے لیے زاریہ کو تنہا نہیں چھوڑو گی۔ ہاتھ روم وہی استعمال کرو گی جو زاریہ کے کمرے میں ہے۔ ہاتھ روم جانے سے پہلے باہر کا دروازہ لاک کرو گی۔ ہاتھ روم کے دروازے کو لاک کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سمجھ رہی ہو؟“

”جی صاب..... ایسا ہی ہو گا۔“

”اگر ایسا نہیں ہوا..... تو پھر اچھا نہیں ہو گا۔ میں اور مس فاریہ فیکٹری جائیں گے، جب تک واپس نہ آجائیں تم ایک پل کے لیے یہاں سے نہیں ہلو گی۔“

”جی صاب۔“ اس نے سعادت مندی سے سر ہلایا۔

اسے یہ ہدایت دیتے ہی میں کمرے میں چلا آیا۔ ڈاکٹر انجکشن دے چکا تھا اور اپنا بکس بند کر رہا تھا۔ وہ زاریہ سے باتیں بھی کر رہا تھا مگر زاریہ پر غشی طاری ہوتی جا رہی تھی۔ چند لمحوں میں وہ بے خبر ہو گئی۔

”مسٹر اقبال اب یہ چار گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آئیں گی۔ شام کو انھیں ٹیبلٹس دے دیجئے گا۔ ان کی غذا کا خاص خیال رکھیں۔ انھیں کمزوری بہت ہے۔ میں رات کو چکر لگا لوں گا، ویسے اگر کوئی خاص بات ہو تو آپ میرے کلینک فون کر سکتے ہیں۔ میں کلینک سے رات دس بجے اٹھتا ہوں۔“

”آپ کا فون نمبر؟“

”مس فاریہ کے پاس ہے میرا نمبر۔“

آپ مجھے بھی اپنا کارڈ دے دیں۔“

”ہاں ضرور۔“ ڈاکٹر نے اپنا وزیٹنگ کارڈ میری طرف بڑھا دیا جسے میں نے فوراً اپنی جیب میں رکھ لیا۔ وہاں سے باہر آتے ہوئے بھی میں نے ایک مرتبہ پھر حمیدہ کو زاریہ کا خیال رکھنے کی ہدایت کی اور ڈاکٹر کو لے کر لان میں چلا آیا۔ فاریہ اپنے کمرے میں جا چکی

تھی۔

”ٹھیک ہے حمیدہ.... کھانا لگاؤ۔ ہم سب ساتھ ہی کھانا کھائیں گے۔ انکل کہاں

ہیں؟“

”وہ بھی یہیں تھے بھو... ابھی ابھی گئے ہیں۔ وہ آپ کے لیے پریشان تھے۔“
 فاریہ نے میری طرف دیکھا۔ میں اس کا مطلب سمجھ کر بیگ صاحب کے کمرے کی
 طرف چلا گیا۔ وہ اپنے کمرے میں تھے۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے فاریہ کی خیریت معلوم کی
 پھر میرے ساتھ ڈرائنگ روم میں آگئے۔

حمیدہ اور یعقوب نے کھانا لگا دیا۔ کھانے کے دوران زاریہ مسلسل بولے جا رہی
 تھی۔ وہ اس وقت بہت ایکٹیو لگ رہی تھی مجھے اس کے اس قدر بہتر ہونے پر حیرت ہو
 رہی تھی۔ فاریہ اسے یوں چمکتے دیکھ کر خوش تھی۔ بیگ صاحب، حمیدہ اور خود زاریہ
 بھی خوش تھے مگر میں یعقوب کو غور سے دیکھ رہا تھا جو کھانے کی ڈشیں سب کو پیش کر رہا
 تھا۔ اس کے چہرے پر بلا کا اطمینان تھا۔ وہ خوف جیسے میں صبح اس کے چہرے پر دیکھ چکا
 تھا۔ اس کا کہیں نام تک نہ تھا۔ نہ معلوم کیوں مجھے وحشت سی ہونے لگی۔ زاریہ اور
 فاریہ دونوں کی باتیں مجھے بری لگنے لگیں۔ میرا جی چاہا کہ سب خاموش ہو جائیں۔ ہر
 طرف سناٹا چھا جائے یعقوب کسی کام سے کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔

میں کچھ سوچنا چاہتا تھا مگر میرے چاروں طرف بے پناہ شور تھا۔ کوئی بات تھی جو
 مجھے مسلسل چبھ رہی تھی۔ میرے ذہن میں کچھ کے لگ رہے تھے۔

”یعقوب..... یعقوب.....“ اچانک زاریہ یعقوب کو آوازیں دینے لگی۔

”کیا بات ہے اقبال.....! تم کھانا نہیں کھا رہے!“ فاریہ نے اچانک مجھے مخاطب

کیا۔

”نہیں میڈم..... میں کھا رہا ہوں۔“ میں نے چونک کر جواب دیا اور پلیٹ کی

طرف متوجہ ہو گیا۔

اسی وقت یعقوب اندر داخل ہوا۔ ”جی بی بی..... حکم کیجئے۔“ اس نے سر جھکا

کر زاریہ سے کہا۔

”اوہ یعقوب..... تم نے کھانا بہت اچھا بنایا ہے۔“ زاریہ نے والمانہ انداز میں

کہا۔

ڈاکٹر کے رخصت ہوتے ہی میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ تھکن سے جسم کا جوڑ جوڑ
 ڈھک رہا تھا۔ میں نے شاور لیا اور کپڑے بدل کر بستر پر لیٹ گیا۔ میں جانتا تھا کہ فاریہ کسی
 بھی لمحے مجھے بلوا سکتی ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے اس پر حیرت ہوتی تھی کہ وہ عورت ہونے
 کے باوجود چوبیس گھنٹے بغیر آرام کیے کام کیسے کرتی ہے۔ اس سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ آرام
 کرنے کی بجائے فیکٹری جانے کے لیے تیار ہو رہی ہو۔ اور ہوا بھی وہی۔ آدھے گھنٹے بعد
 ہی میرا بلاوا آگیا۔ میں تیار تو تھا ہی۔ اس کے بلانے پر فوراً ہی باہر آگیا۔

وہ بالکل فریش اور تیار کھڑی تھی۔ گاڑی کا دروازہ کھولا اور اس کے بیٹھ جانے کے
 بعد خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

تمام راتے خاموشی طاری رہی۔ میرا ذہن موجودہ حالات کی سنگینی کے بارے میں
 سوچ رہا تھا اور فاریہ جانے کن خیالوں میں گم تھی۔ اس خاموشی میں تمام راستہ کٹ گیا۔
 فیکٹری پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ یہاں فاریہ کی موجودگی کتنی ضروری تھی۔ کئی آرڈرز تھے
 جن کی شپنگ ضروری تھی ورنہ لاکھوں کا نقصان ہو جاتا۔ میں اور فاریہ وہاں اس قدر
 مصروف رہے کہ وقت کا بالکل احساس نہ ہوا۔ ہمیں ہمارے کام سے فراغت تقریباً رات
 ساڑھے نو بجے ملی۔ فاریہ کا تھکن سے برا حال تھا۔ وہ تمام رات اور تمام دن بستر پر لیٹی
 بھی نہ تھی۔ ہم نے دوپہر کا کھانا بھی ٹھیک طرح نہیں کھایا تھا۔ ساڑھے نو بجے فارغ
 ہوتے ہی میں اسے لے کر کوٹھی پہنچ گیا۔

ہم گاڑی سے اتر کر ڈرائنگ روم میں پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ زاریہ وہاں
 موجود تھی۔ وہ حمیدہ کے ساتھ بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ کھڑی ہو
 گئی۔ ”اوہ بھو.....“ وہ فاریہ سے پوچھ گئی۔

”کیسی ہو تم زاری؟“

”اوہ بالکل ٹھیک ہوں بھو..... آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہی تھیں۔ دیکھئے، میں بالکل

ٹھیک ہوں۔“ زاریہ واقعی اس وقت بہت بہتر لگ رہی تھی۔

”تم نے کھانا کھایا؟“ فاریہ نے زاریہ سے پوچھا۔

”نہیں میں آپ کا انتظار کر رہی تھی۔“

”ٹھیک یو میڈم۔“

”اب اچھی سی چائے پلانا۔“ اس بار زاریہ کی زبان لڑکھڑائی تھی۔ یوں لگا جیسے اس کی زبان الفاظ کو ٹھیک طرح ادا کرنے میں ناکام ہو رہی ہے۔
میں نے چونک کر فاریہ کو دیکھا پھر بیگ صاحب کو مگر وہ دونوں کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ شاید ان میں سے کسی نے بھی یہ بات محسوس نہیں کی تھی۔
میں اچانک کھڑا ہو گیا۔

”کیا ہوا؟“ فاریہ نے سر اٹھا کر پوچھا۔

”کچھ نہیں میڈم میں کھانا کھا چکا ہوں۔“

”چائے نہیں پیو گے؟“

”ضرور پیوں گا میڈم، میں بس ابھی آیا۔“ میں نے پکین سے منہ پونچھتے ہوئے کہا اور تیزی سے کمرے سے باہر آ گیا۔

میں فوری طور پر ڈاکٹر کو بلانا چاہتا تھا۔ میں نے اپنی جیب سے اس کا وزیٹنگ کارڈ نکالا اور ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ ڈاکٹر کے کلینک فون کیا تو وہاں کسی نے ریسیور نہ اٹھایا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کلینک سے نکل چکا ہے۔ کارڈ پر اس کے گھر کا نمبر بھی درج تھا۔ میں نے گھر کا نمبر ڈائل کیا۔

”ہیلو“ دوسری جانب سے نسوانی آواز سنائی دی۔

”ہیلو، دیکھئے مجھے ڈاکٹر طارق سے بات کرنا ہے۔“

”پلیز ہولڈ کیجئے۔“ دوسری جانب سے جواب ملا۔

چند لمحوں بعد ڈاکٹر لائن پر آ گیا۔ ”ہیلو کون؟“

”ڈاکٹر صاحب میں اقبال بول رہا ہوں۔ بیگ صاحب کے گھر سے۔ آپ سے معلوم کرنا تھا کہ جو دوائیں آپ دے کر گئے تھے کیا وہ اتنی افیکٹیو تھیں کہ زاریہ ہنسنے، بولنے اور کھینے لگتی۔ وہ حیرت انگیز طور پر نارمل ہے۔“

”وہ دوائیں مسکن ہیں اقبال صاحب۔ اس کے اعصاب کو پرسکون کر دیتی ہیں۔ اس کو اس تکلیف سے نجات دلا دیتی ہیں جو وہ نشہ نہ ملنے پر محسوس کرتی مگر اس قدر ایکٹیو نہیں کرتیں کہ وہ بالکل نارمل ہو جائے۔ اگر ایسا ہوتا تو لوگوں کو ہیروئن سے جان

چھڑانا بہت آسان ہو جاتا اقبال صاحب۔“

”پھر وہ حیرت انگیز طور پر ٹھیک کیسے ہو گئی؟“

”ٹھہرے۔ اقبال صاحب میں میں آتا ہوں۔“ وہ پرسوج انداز میں

بولے۔

”ڈاکٹر کیا آپ بھی وہیں سوچ رہے ہیں جو میرے ذہن میں ہے؟“

”میں آتا ہوں مسٹر اقبال۔“ دوسری طرف سے اتنا کہہ کر ریسیور رکھ دیا گیا۔

میں نے جیب سے رومال نکال کر پیدنا پونچھا اور دروازے کی طرف پلٹا تو فاریہ کو وہاں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کا رنگ سفید ہو رہا تھا اور وہ آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھ رہی تھی۔ مجھے لگا جیسے وہ گر جائے گی۔ میں نے بھاگ کر اسے پکڑ لیا۔ وہ کسی روباٹ کی طرح بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے صوفے پر بٹھا دیا۔

”میڈم پلیز خود کو سنبھال لیئے۔“

”تم تم سمجھتے ہو کہ اس نے نشہ کیا ہے؟“

میں نے سر جھکا دیا۔

”مگر ایسا نہیں ہو سکتا۔ اسے کون دے گا نشہ؟ میں نے پوچھا تھا۔

صبح سے اب تک کوئی آیا بھی نہیں۔ میں نے تو زاریہ کی سیہیلوں کو فون تک کرنے سے منع کر دیا تھا۔ پھر یہاں“ وہ عجیب سی ہو رہی تھی، یوں جیسے خواب میں بول رہی ہو۔ اس کی اپنی حالت بھی خراب تھی۔ جس پریشانی سے بچانے کے لئے میں نے اس سے جھوٹ بولا تھا۔ صبح والا واقعہ اس سے چھپایا تھا۔ اب وہ اسی پریشانی میں مبتلا تھی۔ کاش میں صبح ہی اس کو بتا دیتا تو کم از کم زاریہ تک وہ زہر تو نہ پہنچ پاتا۔

”میڈم خاموش ہو جائیے۔ یہاں ہمیں ایسی کوئی بات نہیں کرنی ہے جس سے دشمن ہوشیار ہو جائے۔ آپ ڈاکٹر کا انتظار کیجئے میں ابھی آتا ہوں۔ میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا مگر اس وقت آپ کسی پر کچھ ظاہر نہ ہونے دیں۔ پلیز میڈم ورنہ ہم کسی ناقابل تلافی نقصان سے دو چار ہو سکتے ہیں۔ آپ آپ سمجھ رہی ہیں نا؟“

وہ کمال کی عورت تھی۔ اس نے فوراً ہی خود پر قابو پالیا۔ ”تم کہاں جا رہے ہو؟“

”کہیں نہیں میرا خیال ہے ڈرائنگ روم چائے پیتے ہیں۔“

”نہیں..... چائے پیس منگوا لو۔“

میں تیزی سے باہر آگیا۔ یعقوب ڈرائنگ روم میں تھا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ زاریہ بیگ صاحب سے باتیں کر رہی تھی، حمیدہ اور یعقوب وہیں کھڑے اس کی باتوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

میں نے دو کپ چائے بنائی اور دونوں کپ لے کر باہر جانے لگا۔
”اقبال تم کہاں جا رہے ہو، اور فاریہ کہاں ہے۔“

”ہم ڈرائنگ روم میں ہیں سر۔ آج جو سامان باہر بھیجا ہے اس سے متعلق کچھ فائلیں دیکھنا ہیں۔ بس تھوڑی سے دیر لگے گی، پھر ہم سب بیٹھ کر باتیں کریں گے۔“
”لایئے سر“ چائے میں لے جاؤں۔“ یعقوب بڑی مستعدی سے آگے بڑھا۔
”نہیں یعقوب تم زاریہ بی بی سے باتیں کرو۔ چائے میں لے جاؤں گا۔“ میں نے مسکرا کر اس سے کہا اور چائے کے کپ لئے ڈرائنگ روم میں آگیا۔ فاریہ، بت بنی بیٹی تھی۔ میری آہٹ پر چونک اٹھی۔

”میڈم آپ یہاں بیٹھیں۔ میں گیٹ پر جا رہا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب آنے والے ہوں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ ہارن بجائیں یا گاڑی اندر لے کر آئیں اور کسی کو ان کی آمد کا پتا چلے۔“

”مگر کیوں..... کس کو..... تمہیں کس سے ڈر ہے۔ تم ڈاکٹر کی آمد کو کس سے چھپانا چاہتے ہو! تم مجھے اصل بات کیوں نہیں بتا رہے ہو اقبال۔ وہ کون ہے..... کیا تم اسے جانتے ہو؟“

”جی میڈم..... اور اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ وہ پہلے سے ہوشیار نہ ہو جائے۔ میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا میڈم، ابھی وقت نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب آتے ہی ہوں گے۔“ اتنا کہہ کر میں لپک کر باہر آگیا۔ میرے پاس وقت نہیں تھا کہ میں اسے منانے کی کوشش کرتا اور یہ میں نے اچھا ہی کیا۔ میں گیٹ کھول کر باہر آگیا اسی وقت ڈاکٹر کی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ میں نے آگے بڑھ کر انہیں کوٹھی سے چند قدم دور ہی رک لیا۔ میں ڈاکٹر کو ساری پچویشن سمجھانا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر نے مجھے دیکھ کر گاڑی روک لی۔

”کیا بات ہے مسٹر اقبال۔ آپ نے یہاں گاڑی کیوں روک لی؟“ ان کے لہجے میں تنویش تھی۔

”ڈاکٹر میں آپ سے بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔“
”یہاں..... سڑک پر.....؟“

”جی ہاں..... میں نہیں چاہتا کہ وہ شخص جس نے زاریہ تک ہیروئن پہنچائی ہے وہ آپ کو دیکھ کر چوکنہ ہو جائے اور..... اور فرار ہو جائے۔“
”کیا وہ شخص کوٹھی میں موجود ہے؟“

”جی ہاں۔“ پھر میں نے صبح سویرے والا تمام واقعہ سنا دیا۔ میں نے اپنا شبہ بھی ظاہر کر دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ فاریہ اس واقعہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتی ہے مگر اب اسے سب کچھ بتا دینا ناگزیر ہو گیا ہے۔
”یہ تو بہت خطرناک بات ہے مسٹر اقبال۔ زاریہ کا اب تک کا علاج بیکار ہو گیا۔ آپ کو صبح ہی کوئی قدم اٹھانا چاہئے تھا۔“

”بس ڈاکٹر..... غلطی ہو گئی۔ اب اسے سنبھالنا بھی میرا ہی ذمہ ہے۔“
پھر ہم دونوں کوٹھی میں داخل ہو گئے۔ میرے کہنے پر ڈاکٹر نے اپنی گاڑی باہر ہی کھڑی کر دی تھی۔ ڈرائنگ روم میں فاریہ ہمارا شدت سے انتظار کر رہی تھی۔ میں نے اندر داخل ہو کر دروازہ اندر سے لاک کر لیا۔
”فاریہ بی بی..... اقبال مجھے سب کچھ بتا چکا ہے۔ ہمیں بڑی احتیاط سے قدم اٹھانا ہو گا۔“

”مگر اقبال نے مجھے ابھی تک کچھ نہیں بتایا۔“ اس نے ناراض ہو کر جواب دیا۔
تب میں نے ہلکے لہجے میں اسے ساری بات بتا دی۔ یعقوب کا نام سن کر وہ اچھل پڑی تھی۔ ”یہ..... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“
”یہاں سب کچھ ہو سکتا ہے مس فاریہ، آپ صرف یہ سوچیں کہ کیا کرنا ہے!“
ڈاکٹر نے کہا۔

”اقبال تم..... تم یعقوب کو اپنے کمرے میں لے جاؤ کسی بھی بہانے سے۔ میں ڈاکٹر کو زاریہ سے ملوا کر اور تمہارے شے کی تصدیق کروا کر وہیں آتی ہوں۔“ فاریہ کا لہجہ

لگ گیا۔

”مم..... میڈم..... یہ..... یہ.....“

”حرامزادے..... کتے..... غدار..... کینے..... تجھے اسی دن کے لئے

رکھا تھا ہم نے۔ احسان فراموش..... بھول گیا وہ دن جب تیرے پاس سر چھپانے کو

لٹکانہ بھی نہ تھا۔“ فاریہ آگ اگل رہی تھی۔

وہ بری طرح کھکھیانے لگا تھا۔ فاریہ کو دیکھ کر ہی میں سمجھ گیا تھا کہ میرا شبہ،

حقیقت تھا۔ میں نے لپک کر یعقوب کا گریبان پکڑ لیا۔ ”بول..... کون تھی وہ عورت

..... بول کس کے لئے کام کر رہا ہے..... بول وہ زہر کی پڑیا کس نے دی تھی

تجھے۔ بول ورنہ دانت توڑ دوں گا۔“ میں نے اتنی طاقت سے اس کا گریبان پکڑا تھا کہ اس

کی گردن کی تمام نیس پھول کر کپا ہو گئیں۔ اس کا سانس گھٹنے لگا وہ خود کو چھڑانے کی

کوشش کرنے لگا۔

”اسے باندھ دو اقبال“ میں جانتی ہوں کہ یہ کس کا آدمی ہے۔ کس کے لئے کام کر

رہا ہے اور یہ بھی جانتی ہوں کہ صبح یہاں آنے والی عورت کون تھی، مجھے تو اس سے کچھ

دوسری ضروری باتیں معلوم کرنا ہیں۔“

میں نے رسی کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔

”یہ کھڑکی کھولو۔ اس کی گرل پر رسی بندھی ہے۔ وہ کھول لو۔“

میں نے کھڑکی کا پٹ کھولا تو وہاں رسی کا گچھا لٹکا ہوا تھا۔ میں نے تیزی سے رسی نکالی

اور یعقوب کے ہاتھ پشت پر لے جا کر اسے اچھی طرح مضبوطی سے باندھ دیا۔ فاریہ کے

ریو اور کارخ اب بھی یعقوب کی طرف تھا۔ اس کا رنگ سفید ہو رہا تھا۔ آنکھیں خوف

سے ابلی پڑ رہی تھیں۔

”میڈم کیا میرا شبہ درست تھا؟“

”ہاں“ زاریہ کو اس نے دوپہر میں کسی وقت ایک چھوٹا سا لفافہ دیا تھا جس میں تین

چار روز کی خوراک موجود تھی۔ اس خوراک کے ساتھ ہی پنی، ماچس کی ڈبیا اور کانڈ کی

بنی ہوئی نلکی بھی تھی۔“

”مگر یہ سب اس نے دیا کیسے“ میں نے حمیدہ بی بی کو تاکید کی تھی کہ وہ لمحہ بھر کے

اچانک بدل گیا۔ اس کے جڑے بچھ گئے۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکلتے محسوس ہوئے اور مجھے وہ فاریہ یاد آ گئی جو ریستوران میں اس انگریز آدمی پر برس رہی تھی۔ اس وقت اس کے چہرے پر وہی سفاکی تھی جو میں نے انگریز کے قتل کی خبر سننے کے بعد اس کے چہرے پر دیکھی تھی۔

میں تیزی سے باہر آ گیا۔ وہ سب اس وقت بھی ڈاننگ روم میں تھے۔ مجھے دیکھتے

ہی بیگ صاحب بول پڑے۔ ”بھئی تم لوگوں کے انتظار میں کب تک بیٹھیں گے ہم؟“

”سوری سر، میڈم تو بہت مصروف ہیں۔ میں بہت تھک گیا ہوں اس لئے اپنے

کمرے میں جا رہا ہوں۔ میڈم نے پیغام بھیجا ہے کہ وہ یہاں نہیں آ سکیں گی۔ کام ختم

کرتے ہی اپنے بیڈ روم میں چلی جائیں گی۔“

”چلو بھئی زاریہ..... یہ لڑکی تو پاگل ہو گئی ہے۔ کام کام اور کام..... بس،

کچھ اور تو آتا ہی نہیں اسے۔“ بیگ صاحب بڑبڑاتے ہوئے اٹھ گئے۔

”اوکے انکل“ میں بھی اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔ ذرا ٹی وی دیکھوں گی۔“

زاریہ اتنا کہہ کر اٹھ گئی۔ حمیدہ اسے لے کر ڈاننگ روم سے باہر چلی گئی۔

یعقوب چائے کے برتن سمیٹنے لگا۔ میں وہیں برآمدے میں کھڑا ہو گیا۔ یعقوب برتن

لے کر بچن کی طرف چلا تو میں بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ بچن میرے کمرے کے راستے

ہی میں تھا اس لئے اس نے میرے اپنے پیچھے آنے کو زیادہ اہمیت نہ دی مگر جب میں بچن

کے دروازے پر رک گیا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اس کے چہرے پر ایک

رنگ سا آ کر گزر گیا۔

”یعقوب..... میں بہت تھک گیا ہوں۔ پلیز اگر تم مائنڈ نہ کروں تو کچھ میرا بدن

دبا دو۔“

میری بات سن کر اس نے گہرا سانس لیا اور فوراً تیار ہو گیا۔ میں اس سے باتیں

کرتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا اور کپڑے تبدیل کئے بغیر ہی بستر پر الٹا لیٹ گیا۔ یعقوب نے

میرا بدن دہانا شروع کر دیا۔ میں اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔

تقریباً بیس منٹ بعد اچانک میرے کمرے کا دروازہ ایک زور دار آواز سے کھلا اور

فاریہ ریو اور لئے اند آ گئی۔ ریو اور کارخ یعقوب کی طرف تھا۔ وہ اچھل کر دیوار سے

لئے بھی زاریہ کو تنہا نہ چھوڑے پھر.....“

”وہ رات بھر کی جاگی ہوئی تھی اقبال، بوڑھی عورت ہے تھکن نے اسے بے حال کر دیا اور وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گئی۔ یعقوب نے صبح چائے دیتے ہوئے ہی زاریہ کو اشارہ دیا تھا کہ وہ اس کی تکلیف کا مداوا کر سکتا ہے۔ زاریہ کو اس کا انتظار تھا۔ ڈاکٹر انجکشن دے کر گیا تو وہ ایسی بن گئی جیسے اس پر غشی طاری ہو گئی ہو مگر دراصل وہ ہوش میں تھی۔ حمیدہ کو اس کی طرف سے اطمینان ہوا تو وہ سو گئی اور اسی دوران میں یعقوب زاریہ کو وہ لفافہ دے گیا۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی اقبال..... اس نے نہ صرف یہ کہ میرے بے پناہ اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے بلکہ یہ میری بہن کو موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا تھا۔ آج مجھے معلوم ہوا کہ بند کمرے میں کی گئی باتیں باہر کیسے چلی جاتی تھیں؟ میری فیکٹری کے راز کیسے افشا ہو جاتے تھے۔ میرے آرڈرز کیسے کینسل ہو جاتے تھے۔ میرے حریفوں کو کیسے پتا چل جاتا تھا کہ مجھے کس کمپنی نے کتنے مال کا آرڈر دیا ہے۔ اس نے عمارت میں گھس کر نقب لگائی ہے اقبال اور میں اسے وہ سزا دوں گی کہ یہ موت مانگے گا موت نہ آئے گی۔“ فاریہ آگ اگل رہی تھی اس کے پورے وجود سے شعلے اٹھتے محسوس ہو رہے تھے۔

”سرمیں..... میں بے قصور ہوں۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو وہ لوگ میری جان لے لیتے۔“

”اور تم نے اپنی جان بچانے کے لئے زاریہ کو قریان کرنے کا فیصلہ کر لیا یہی نا؟ بے غیرت ہو تم ایک معصوم بچی کو خود پر قریان کرتے شرم نہیں آئی تمہیں، اگر جان کا خطرہ تھا تو تم ہم سے مدد مانگ سکتے تھے۔“

”مجھے معاف کر دیں سر..... میں..... میں آپ کو منہ مانگی قیمت دے سکتا ہوں اپنی جان کی..... وہ لوگ آپ کو مالا مال کر دیں گے سر، وہ بہت بڑی پارٹی ہے ارب پتی۔ بلکہ کھرب پتی..... وہ آپ کو اتنا دے دیں گے کہ آپ کو زندگی بھر کچھ کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ آپ اپنے دشمنوں سے بدلہ بھی لے سکیں گے اور اپنی ماں، سوہنی اور ماسی میراں کو بھی ان درندوں کے ہاتھوں سے بچا کر لے آئیں گے۔ سر..... فاریہ کے پاس کچھ نہیں ہے سریہ لوگ ذیوالیہ ہو چکے ہیں۔ میں آپ کو لکھ پتی بنا دوں گا سر..... مجھے کھول دیں۔ مجھے جانے دیں سر.....“

وہ مجھے بھڑکا رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ میرے بارے میں کافی کچھ جانتا تھا۔ وہ میرے جذبات کو ابھار رہا تھا۔ میری دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی تھی اس نے۔ ”کون لوگ ہیں وہ؟“

”میں آپ کو ان سے ملا دوں گا سر، بس آپ مجھے جانے دیں۔ میں سچ کہتا ہوں سر کہ وہ آپ کو مالا مال کر دیں گے۔ طاقت ور اور ذہین لوگوں کو وہ آسمان پر اٹھا لیتے ہیں۔ وہ قدر کرتے ہیں ایسے لوگوں کی۔ انہیں آپ جیسے لوگوں کی ضرورت ہے سر..... آپ جیسے ذہین اور طاقت ور لوگوں کی۔“

وہ خوشامدی انداز میں مجھ سے اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ فاریہ آگئی تو وہ یہاں سے زندگی بھر نہیں نکل پائے گا۔

”جلدی کیجئے سر وہ آجائے گی۔ وہ عورت نہیں جنگلی بلی ہے، وہ..... وہ آپ کو بھی تباہ کر دے گی سر، آپ سے پہلے اور بہت سے لوگ اس کے ہاتھوں موت کا ذائقہ چکھ چکے ہیں۔ آپ بھی میرے ساتھ نکل چلئے۔ زندگی بھر عیش کریں گے۔“

میری قوت برداشت جواب دے گئی تھی۔ خون میری کپٹیوں پر ٹھو کریں مار رہا

اسی وقت وال کلاک نے بارہ گھنٹے بجائے اور فاریہ چونک اٹھی۔ ”اقبال یہ ریوالور پکڑو۔ اس کی طرف سے چونکا رہنا، یہ بہت چالاک ہے، اگر یہ فرار ہو گیا تو..... تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی سمجھو۔ میں ابھی آتی ہوں۔“ وہ ریوالور مجھے تھما کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

یعقوب پر سکتہ طاری تھا۔ اسے شاید بازی پلٹ جانے کی توقع نہیں تھی۔ فاریہ کے جاتے ہی وہ کسمایا۔ پانیا..... پانی.....“

”سوری یعقوب..... میڈم کی اجازت کے بغیر میں تمہیں کچھ بھی نہیں دے سکتا۔ پانی تو زندگی کی علامت ہے..... موت بھی نہیں..... تم اسی قابل ہو کہ تمہیں سسکا سسکا کر مارا جائے۔ تمہیں بھی معلوم ہونا چاہئے کہ موت کیسی ہوتی ہے۔ اگر میڈم نے نہ روکا ہوتا تو میں تمہیں لاتیں مار مار کر جان سے مار دیتا یعقوب، تمہارے بدن سے ایک ایک بوٹی نوچ لیتا۔“

تھا۔ میرے بدن میں آگ بھڑک اٹھی میں تڑپ اٹھا اور یعقوب کے منہ پر ایک زوردار لات ماری۔ وہ ڈکرا کر اوندھے منہ گر گیا۔

”گڈ..... دیری گڈ اقبال.....“ اچانک فاریہ کی آواز آئی۔ وہ دروازے میں کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ”میں اس کی باتیں سن چکی ہوں۔“ وہ پھر یعقوب سے مخاطب ہوئی جس کا نیچلا ہونٹ پھٹ چکا تھا اور اس میں سے خون بہہ رہا تھا۔ ”تو اسے خریدنے کی کوشش کر رہا تھا..... کتے ٹو بھول گیا کہ ہر شخص تیری طرح بے کردار نہیں ہوتا۔“

”مم..... مجھے معاف کر دیں میڈم.....“

”اندر آؤ۔“ فاریہ نے اس کی بات کا جواب دیئے بغیر پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اسی وقت چار آدمی جو پولیشیا رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور ان کے ہاتھوں میں پستول تھے اندر آ گئے۔ ان کے چروں پر گھنی داڑھی موٹھیں تھیں وہ چہرے ہی سے خطرناک لگ رہے تھے۔

لے جاؤ اسے..... اور سنو..... اسے اتنا مارو کہ اس کا بدن پھوڑا بن جائے مگر اسے زندہ رہنا چاہئے۔ میں کل کسی وقت آؤں گی۔ لے جاؤ۔“ فاریہ نے حکم دیا۔ وہ لوگ یعقوب کی طرف جھپٹے اور اسے اٹھا کر کمرے سے نکل باہر گئے۔ میں اور فاریہ بھی ان کے پیچھے باہر آ گئے۔ باہر کالے رنگ کی بڑی سی گاڑی کھڑی تھی جس کے شیشے بھی سیاہ رنگ کے تھے۔ ان چاروں نے اسے گاڑی میں ڈالا۔ یعقوب نے چیخنے کی کوشش کی جس پر ایک شخص نے پستول کا دستہ اس کی کینٹی پر دے مارا اور وہ اس کے بازوؤں میں جھول گیا۔ چند ہی لمحوں بعد گاڑی بے آواز چلتی ہوئی گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ میں نے گہرا سانس لیا اور فاریہ کے پیچھے چلتا ہوا اس برآمدے تک آ گیا جہاں سے بیرونی گیٹ نظر آ رہا تھا۔ گاڑی کے باہر جاتے ہی چوکیدار نے گیٹ بند کر دیا۔ ”میڈم..... یہ چوکیدار قابلِ اعتماد ہے؟“

اس نے خالی خالی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ ”پتا نہیں اقبال..... میں نے ہمیشہ بھروسے اور اعتماد میں دھوکا کھایا ہے۔ میں ان لوگوں کے لئے اتنا کچھ کرتی ہوں پھر بھی یہ لوگ میرے دشمنوں سے مل جاتے ہیں۔ کیوں اقبال؟“

”آپ دل برداشتہ نہ ہوں میڈم‘ سب ایسے نہیں ہوتے۔ چوکیدار کے بارے میں آپ نے نہیں بتایا کہ یہ کون ہے؟“

”میرا خیال ہے کہ قابلِ اعتماد ہے۔ یہ میرے ابو کے خاص ملازم کا بیٹا ہے۔ ابو اس کے باپ کو گھر بنا کر دے چکے ہیں۔ اس کی دو بہنوں کی شادی بھی انہوں نے کروائی تھی۔ باپ اب بہت بوڑھا ہے کام کرنے کے قابل نہیں ہے۔ میں نے اس کی دیکھ بھال کے لئے ایک لڑکا رکھا ہوا ہے اس کے پاس۔ اس کے بوڑھے ماں باپ تو ہمیں دعائیں دیتے ہیں۔ انہوں نے ہی اسے یہاں رکھا ہے۔ سکندر خان نام ہے اس کا‘ اب تک تو میرے اعتماد پر پورا اترتا ہے آگے خدا جانے کیا ہو گا۔“

”ٹھیک ہے میڈم اب ایک سوال کا جواب اور دے دیں کہ یعقوب کو لے جانے والے کون ہیں اور کہاں لے گئے ہیں؟“

”وہ میرے وہی جان نثار ہیں جن کے بارے میں میں تمہیں پہلے بتا چکی ہوں اور یہاں لے گئے ہیں وہاں میں تمہیں کل لے کر چلوں گی خود دیکھ لینا۔“

”اوکے میڈم..... اب آپ آرام کریں۔ میں زاریہ کو دیکھ کر اپنے کمرے میں ہاؤں گا۔“

”نہیں اقبال اسے اس وقت تنہا چھوڑ دو۔ میں نے..... میں نے اسے مارا ہے۔“

”جی!“ میں حیرت زدہ رہ گیا۔

”ہاں اقبال ورنہ وہ بتانے پر تیار نہ تھی کہ اسے نشہ کس نے لا کر دیا تھا۔ میں نے اس کے پاس سے وہ لفافہ برآمد کر لیا تب اسے بتانا پڑا۔ ڈاکٹر نے اسے انجکشن لگا دیا ہے۔ وہ سو رہی ہو گی۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دو بس۔“

میں سر جھکائے اس کی باتیں سنتا رہا پھر شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں ٹھکن سے چور تھا۔ ذہنی تھکاوٹ نے مجھے زیادہ نڈھال کر دیا تھا۔ میں بستر پر گرتے ہی سو گیا۔ دن چڑھے تک سوتا رہا۔ روزانہ تو یعقوب مجھے اٹھا دیا کرتا تھا مگر آج تو وہ بھی نہیں تھا۔ گیارہ بجے خود ہی میری آنکھ کھل گئی۔ میں خود کو بہتر محسوس کر رہا تھا۔ میں کافی دیر تک نہاتا رہا پھر تیار ہو کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔

حسب توقع فاریہ وہاں موجود تھی۔ حمیدہ بی بی چائے پیالیوں میں انڈیل رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر فاریہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

”آؤ اقبال، کیسے ہو؟“

”تھکن اتر گئی ہے میڈم، بہت بہتر ہوں۔ آپ کیسی ہیں؟“

”ٹھیک ہوں اقبال، آج انکل کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، انہیں رات والے معاملے پر بے پناہ دکھ ہے۔ وہ یعقوب پر اندھا اعتماد کرتے تھے۔“

”ڈاکٹر کو بلا لیا تھا؟“

”ہاں ڈاکٹر ابھی چیک کر کے گیا ہے۔ زاریہ کی حالت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ اس کا نشہ ٹوٹ چکا ہے، وہ کل اور پرسوں سے زیادہ تکلیف محسوس کر رہی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔ جی چاہتا کہ اسے واقعی زہر دے کر تمام تکلیفوں سے نجات دلا دوں۔“

”میڈم، آپ مایوس نہ ہوں، مایوسی کفر ہے، خدا کرے گا سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

حمیدہ نے مجھے چائے کا کپ دیا۔ میں چائے پینے لگا اس وقت بیگ صاحب بھی آ گئے۔ وہ بے حد تھکے ہوئے لگ رہے تھے۔

”کیسی طبیعت ہے آپ کی۔“ میں نے ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔

”اچھا ہوں بیٹا..... میرے خیال میں تمہارے سلسلے میں، میں دھوکا نہیں کھاؤں گا ورنہ یعقوب نے تو مجھے توڑ کر رکھ دیا ہے۔“

”ہر شخص یعقوب نہیں ہوتا سر، میں گاؤں کا سیدھا سادا آدمی ہوں، جس کا نمک کھاتا ہوں اس سے زندگی بھر وفا نبھاتا ہوں۔ آپ کو میری ذات سے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔“

”یہ تمہارا احسان ہو گا بیٹا، اگر تم نہ ہوتے تو فاریہ کتنی اکیلی ہو جاتی۔ زاریہ ہی کا دکھ مجھے مارے دیتا ہے پھر فاریہ پر بے پناہ بوجھ اور پے در پے صدمے مجھے اور پریشان کر رہے ہیں۔“

”میرے لئے پریشان نہ رہا کریں انکل، میں بہت بے جس ہوں، مجھے کچھ نہیں ہو گا۔“ فاریہ نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔

بیگ صاحب نے لمبی سانس لے کر سر کو صوفے کی پشت سے ٹکا دیا۔

”تم نے ناشتہ کر لیا؟“ فاریہ نے پوچھا۔

”نہیں مگر میں ناشتہ نہیں کروں گا۔ میڈم کیا ہمیں کہیں جانا ہے؟“

”ہاں..... کچھ دیر کے لئے فیکٹری جانا ہے پھر..... یعقوب کو دیکھنا ہے۔ تم تیار ہو؟“

”جی میڈم.....“

فاریہ یہ سنتے ہی اٹھ گئی۔ ہم سیدھے فیکٹری پہنچے۔ تقریباً ڈھائی گھنٹے بعد وہاں سے فارغ ہو گئے۔ فاریہ نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا تو وہاں عذرا موجود تھی۔ ہمارے درمیان رسمی بات چیت ہوئی پھر ہم دونوں خاموش ہو کر فاریہ کو دیکھنے لگے۔

”اقبال، میں نے عذرا کو اپنے گھر کا پراہلم بتایا ہے یہ میرے ساتھ گھر چلنے کو تیار ہے۔“

”مگر یہ کیا کریں گی میڈم؟“

”زاریہ کی دیکھ بھال، حمیدہ کو میں بچن میں لگا دوں گی۔ سارا مسئلہ زاریہ کی دیکھ بھال کا ہے جس کے لئے کسی ذہن اور نڈر لڑکی کی ضرورت ہے۔ حمیدہ بوڑھی عورت ہے وہ اسے سنبھالنے میں ناکام ہے دوسری اہم بات یہ ہے کہ عذرا زاریہ کی ہم عمر ہے، اس سے باتیں کر کے زاریہ کا دل بھی بہلا رہے گا اور شاید عذرا اس کو زندگی کی طرف بلا لے۔“

”رائٹ میڈم۔ آپ جو فیصلہ کریں گی بہتر ہو گا۔“

”اس وقت تو ہمیں دوسرے اہم کام سے جانا ہے۔ میں نے عذرا کو ایڈریس سمجھا ہے۔ یہ خود ہی کوٹھی پہنچ جائے گی۔ میں نے انکل کو فون کر دیا ہے۔ وہ اسے ریسو کر لے گا۔“

”اوکے میڈم! میں گھر جاؤں گی تاکہ اپنا ضروری سامان لے کر آپ کی کوٹھی پہنچ لوں۔“ عذرا نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

فاریہ کو دیکھ کر میں بھی کھڑا ہو گیا۔ ہم تینوں ساتھ ہی آفس سے نکلے۔ لفٹ میں فاریہ عذرا کو ہدایت دیتی رہی۔ نیچے پہنچ کر ہم عذرا سے جدا ہو گئے۔

میں نے پارکنگ لاث سے گاڑی نکالی اور مین گیٹ پر فاریہ کے سامنے روک دی۔
فاریہ گاڑی کا اگلا دروازہ کھول کر میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

”کہاں چلنا ہے میڈم؟“

”سیدھا چلتے رہو، میں بتا دوں گی۔“

ہم تقریباً ایک گھنٹے تک چلتے رہے۔ فاریہ مجھے ہدایات دیتی رہی اور میں اس کی ہدایات پر عمل کرتا ہوا شہر سے باہر آ گیا۔ سڑک دور تک چلی گئی تھی۔ آج سے پہلے میں اس طرف نہیں آیا تھا۔ سڑک کے دونوں جانب گھاس، خود رو جھاڑیاں اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں شروع ہو چکی تھیں۔ فاریہ خاموش سامنے دیکھ رہی تھی۔

”میڈم ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”میں نے کہا تھا کہ میں بتا دوں گی۔“

اس کے لہجے میں عجیب سی بات تھی۔ بیگانگی، لائق اور سفاکی۔ میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس کے لہجے سے میں سمجھ چکا تھا کہ وہ بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہے۔ وہ بالکل پہلے والی فاریہ بن چکی تھی جس میں ہلاکی، رعوت اور سفاکی تھی۔ میں خاموش رہا اور تیز رفتاری سے گاڑی ڈرائیو کرتا رہا۔ ہم شہر سے تقریباً سو کلومیٹر دور آ چکے تھے اور کوئی ذیلی سڑک یا آبادی نظر نہیں آ رہی تھی۔ مجھے فاریہ کی ذہنی حالت پر شبہ ہونے لگا۔ میں نے کن آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ کسی بت کی طرح بیٹھی تھی۔

”آہستہ کرو۔“ اچانک وہ بول اٹھی اور میرا پاؤں بریک دباتا چلا گیا۔ گاڑی کے چنچ اٹھے۔ فاریہ کو جھٹکا لگا مگر اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔ گاڑی آہستہ ہو چکی تھی۔

”دائیں طرف ایک کچا رستہ آئے گا وہاں سے اندر کی طرف موڑ لینا۔“ اس نے

سپاٹ لہجے میں کہا۔

”یس میڈم!“ میں نے مستعدی سے جواب دیا۔ میری نگاہیں اپنی دائیں جانب وہ کچا رستہ تلاش کر رہی تھیں۔ جلد ہی جھاڑیوں کے درمیان وہ کچا رستہ نظر آ گیا۔ میں نے ہدایت کے مطابق گاڑی اس طرف موڑ لی۔ تقریباً گیارہ بارہ کلومیٹر چلنے کے بعد مجھے سڑک اینٹوں کی وہ پکی حویلی نظر آئی جو انتہائی خستہ حالت میں تھی۔ اس حویلی کے چاروں طرف

چھوٹے چھوٹے مکانات بنے ہوئے تھے۔ قریب پہنچنے پر معلوم ہوا کہ وہ تو باقاعدہ ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ جہاں عورتیں، مرد اور بچے سبھی تھے۔ ہماری گاڑی جوں ہی بستی میں داخل ہوئی۔ مرد بچے اور عورتیں بھاگ بھاگ کر گاڑی کے قریب آ گئے۔ سب فاریہ سے ہنس کر مل رہے تھے اور فاریہ فرداً فرداً سب کی خیریت معلوم کر رہی تھی۔

انہی لوگوں میں، میں نے ایک شخص کو دیکھا جو مجمع کو چیرتا ہوا ہمارے قریب آ گیا تھا۔ ”آئیے میڈم۔“ اس نے لوگوں کے درمیان راستہ بناتے ہوئے فاریہ سے کہا۔ اور تبھی میں اسے پہچان گیا۔ وہ ان چاروں میں سے ایک تھا جو کل کو بستی سے یعقوب کو لینے آئے تھے۔ فاریہ بستی والوں سے اجازت لے کر اس کے پیچھے چل دی۔ میں فاریہ اور اس آدمی کو فالو کر رہا تھا۔ ہم جلد ہی اس حویلی میں داخل ہو گئے جو مجھے دور سے نظر آئی تھی۔ اس کا گیٹ اس وقت کھلا ہوا تھا جو ہمارے داخل ہوتے ہی بند کر دیا گیا۔

”اقبال یہ بستی دیکھی تم نے؟ یہ سب میرے ملازمین اور ان کی فیملیز ہیں۔ یہ سب چمڑا دھونے اور رنگنے کا کام کرتے ہیں۔ یہاں خالص لیدر کے جوتے اور پرس بھی بنائے جاتے ہیں جو ہم باہر بیچ دیتے ہیں۔“ فاریہ نے چلتے ہوئے بتایا۔

”یہ سب دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی ہے میڈم۔“ اب ہم حویلی کے اندرونی حصے میں داخل ہو رہے تھے۔ دروازے سے اندر جاتے ہی یوں لگا جیسے ہم ایئر کنڈیشنڈ روم میں آ گئے ہوں۔ حالانکہ یہاں ایئر کنڈیشن نہیں تھا بلکہ حویلی کی چھتیں بہت اونچی اور قدیم ہونے کی بنا پر شاید ٹھنڈک تھی۔

”آپ یہاں ٹھہریے میڈم، میں اندر کا کمرہ کھلواتا ہوں۔“ وہ شخص دائیں جانب بنے چھوٹے سے دروازے سے اندر چلا گیا۔ چند لمحوں بعد ہمارے سامنے کی طرف کا دروازہ کھل گیا۔ ہم اندر داخل ہو گئے۔ اندر جا کر مجھے حیرت کا ایک اور شدید جھٹکا لگا باہر سے انتہائی خستہ نظر آنے والی حویلی اندر سے بے حد خوبصورت تھی اور سجاوٹ میں مغربی انداز نمایاں تھا۔ کمرے میں قیمتی فرنیچر تھا اور کونے میں رکھے لمپوں کی روشنی ماحول کو خواب ناک بنا رہی تھی۔ فاریہ نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے مجھے بھی بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ ہم دونوں ابھی بیٹھے ہی تھے کہ اندر سے وہی آدمی ٹھنڈے مشروبات لے آیا۔

جسے دیکھ کر مجھے پیاس کی شدت کا احساس ہوا۔ میں نے گلاس لیا اور غور سے اس شخص کو دیکھنے لگا جو فاریہ سے سرگوشی میں باتیں کر رہا تھا۔

”ٹھیک ہے ابھی معلوم ہو جائے گا۔“ فاریہ نے اس سے کہا اور میری طرف متوجہ ہو گئی۔ میں بظاہر تو کمرے کی سجاوٹ دیکھ رہا تھا مگر میری توجہ اسی جانب تھی۔

”اقبال یہ قادر داد ہے۔ میرا خاص آدمی، یہاں موجود تمام آدمیوں کا انچارج اسی کو سمجھ سکتے ہو۔ یہ چمڑے کی فٹنگ کروا کر فیکٹری بھی بھیجتا ہے اور میرے خفیہ معاملات بھی یہی دیکھتا ہے جیسے یہ یعقوب والا معاملہ ہے۔ تم مشروب پی لو پھر ہم یعقوب سے بھی مل لیتے ہیں۔“

”جی میڈم.....!“ میں نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا اور کھڑا ہو گیا۔ ہم دونوں اس شخص کے پیچھے چل پڑے۔ اس کمرے سے نکل کر ہم ایک ایسے کوریڈور میں آ گئے جس کے دونوں جانب ستون لگے تھے یعنی دونوں جانب دیواریں نہ تھیں بلکہ صرف چھت تھی جو اونچے اونچے ستونوں کے سہارے کھڑی تھی۔ ان ستونوں کے درمیان سیڑھیاں تھیں جو نیچے کی جانب جارہی تھیں۔ یہ کوریڈور زمین سے تقریباً چار فٹ اونچا تھا۔ دونوں جانب خود رو جھاڑیاں تھیں یا بہت پرانے برگد کے درخت تھے اور زمین پر جگہ جگہ سوکھے پتے بکھرے ہوئے تھے۔ اس حصے میں آ کر یوں لگتا تھا جیسے ہم کوئی قدیم تاریخی قلعہ دیکھ رہے ہوں جو انتظامیہ کی بے پرواہی کی نذر ہو گیا ہو۔ یہ احساس بالکل نہ ہوتا تھا کہ یہاں ایک حصہ ایسا بھی ہے جسے دیکھ کر آنکھیں پھٹ جائیں۔

کوریڈور دور تک چلا گیا تھا۔ ہم سیدھے چلتے ہوئے اس جگہ پہنچ گئے جہاں کوریڈور ختم ہو گیا تھا اور پھر ہم ایسے حصے میں کھڑے تھے جو صاف ستھرا تھا جگہ جگہ گگلے رکھے تھے جن میں خوب صورت پھول اور پودے لگے تھے۔ کوریڈور جس برآمدے میں آ کر ختم ہوا تھا اس کے سامنے کی جانب لائن سے دروازے تھے۔ قادر داد بائیں جانب مڑ گیا پھر اس نے دس قدم چلنے کے بعد ایک لوہے کے دروازے پر لگا بڑا سا کنڈا ہلایا۔ چند لمحوں بعد ہی دروازہ کھل گیا۔ ہم تینوں اندر داخل ہو گئے۔ اندر تیز روشنی تھی جو چھت میں لٹکے بلب سے پھوٹ رہی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس کمرے میں جسے ہال کہنا زیادہ مناسب ہو گا کوئی کھڑکی یا روشن دان نہیں تھا۔ کمرے چاروں طرف سے بند ہونے کی وجہ

سے بلب کی روشنی کا مہون منت تھا۔ کمرے میں ایک صوفہ سیٹ اور چار پلنگ پڑے تھے جن پر صاف ستھری چادریں بچھی ہوئی تھیں ایک طرف فریج رکھا تھا اور اسی کمرے کے ایک حصے کو کچن بنایا گیا تھا۔ یہاں وہ تینوں بھی موجود تھے جو قادر داد کے ساتھ کوٹھی آئے تھے۔

فاریہ نے ان تینوں سے میرا تعارف کرایا۔ ان میں نبی بخش اور گل جان بٹھان تھے اور قادر داد اور جمالی سندھی۔ چاروں فاریہ کی بہت عزت کرتے تھے اور اسے دیکھ کر متوجہ ہو گئے تھے۔ قادر داد ہمیں لے کر آگے بڑھا۔ سامنے ایک چھوٹا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ یہ دروازہ زمین سے صرف تین فٹ اونچا تھا۔ قادر داد نے جھک کر اس میں پڑا تالا کھولا اور جھکے جھکے اس میں داخل ہو گیا۔ فاریہ بھی اس کے پیچھے اندر داخل ہو گئی۔ میں نے اندر قدم رکھا تو معلوم ہوا کہ وہاں سیڑھیاں تھیں جو نیچے کی جانب جارہی تھیں اور آگے بہت اندھیرا تھا۔ قادر داد نے چند سیڑھیاں اتر کر شاید کوئی سوچ دیا تھا اچانک ایک مدقوق سا بلب روشن ہو گیا جس کی روشنی میں سیڑھیاں صاف نظر آنے لگیں۔ ہم سنبھل سنبھل کر سیڑھیاں اتر گئے۔ یہاں بھی گہرا اندھیرا تھا بلکہ سیڑھیوں پر روشن بلب کی ہلکی روشنی نے اس اندھیرے کو اور زیادہ خوفناک بنا دیا تھا۔ قادر داد نے پھر کوئی سوچ دبا کر اس تہہ خانے میں روشنی کر دی۔

کمرہ روشن ہوتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ چھت سے لٹکے ایک کنڈے میں رسی ڈال کر یعقوب کے دونوں ہاتھ اس رسی سے باندھ دیئے تھے۔ اس کے بدن پر صرف شلوار تھی اور باقی ننگے بدن پر سرخ اور نیلے ابھرے ہوئے لمبے لمبے نشان پڑے تھے لگتا تھا جیسے اس کے بدن پر کوڑے برسائے گئے ہیں۔ اس کا چہرہ بھی سوجا ہوا تھا۔ جس جگہ وہ لٹکا ہوا تھا اس کے چاروں طرف دائرے میں دہکتے ہوئے کوئلے رکھے گئے تھے جن کی آہنی سے یعقوب کا بدن کانپ رہا تھا اور پسینا پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ نہ معلوم کیوں مجھے وہ دن یاد آ گیا جب تھانے میں مجھے اسی طرح باندھ کر مارا گیا تھا۔

”میڈم..... یہ..... یہ ظلم ہے۔“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ فاریہ جھٹکے سے میری جانب مڑی۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اس کا چہرہ واقعی کسی جنگلی بلی کا سا لگ رہا تھا۔ جس کے منہ کو خون لگ گیا ہوں۔

”یہ ظلم ہے؟ ظلم ہے یہ.....؟ اور وہ جو میری..... کوٹھی کے ایک تاریک کمرے میں پڑا سسک رہا ہے، جسے زندہ اور بے گناہ ہوتے ہوئے بھی قید رکھا جاتا ہے۔ جو سانس لینے کے باوجود مردوں میں شمار ہوتا ہے۔ وہ ظلم نہیں.....؟ وہ ظلم نہیں جسے زندہ درگور کر دیا گیا۔ ایک معصوم سی جوان لڑکی جس نے ابھی شعور کی منزل پر پہلا قدم رکھا تھا کہ اس سے جینے کا حق چھین لیا گیا..... اس کی آنکھوں سے وہ سنے نکال کر پھینک دیئے گئے جو ابھی اس نے پورے بھی نہ دیکھے تھے۔ اس کی معصوم اور خواب دیکھتی آنکھوں میں موت کی جلتی سلاخیں گھبیڑ دی گئیں۔ وہ جو اپنے گرد محبت کرنے والے ہوتے ہوئے بھی لوگوں کی نفرت کا شکار ہو گئی۔ وہ ظلم نہیں.....؟ معصومیت ہے ان لوگوں کی..... نیکی ہے ان درندوں کی.....؟ انہیں حق تھا اسے زندہ درگور کرنے کا اور میں..... میں اس حرامزدے سے یہ بھی نہیں پوچھ سکتی کہ میرے گھر کو آگ لگانے والا کون ہے.....؟ میری معصوم بہن پر موت بھیجنے والا کون ہے؟ کون ہے وہ جو اس کی زندگی، اس کے خوابوں اور اس کے مستقبل کا خریدار بن گیا ہے۔ کون ہے وہ جو اس کی ایک ایک سانس کو کشید کر رہا ہے؟ کون ہے وہ جس نے میرے اور میرے گھر کے لوگوں کے گرد موت کے جال پھیلا دیئے ہیں۔ کون ہے جس نے میرے گھر کی فضاؤں میں زہر گھول دیا..... اگر میں ان سوالوں کے جوابوں کی طالب ہوں تو میں ظالم ہوں.....؟ ظلم کرتی ہوں ان کتوں پر جو میرے ملک، میرے شہر کے معصوم بچوں سے جینے کا حق چھین رہے ہیں۔ ان کی ماؤں کی گودیں اجاڑ رہے ہیں جو برسوں گود بھر جانے کی آرزوئیں کرتی ہیں، منتیں مانتی ہیں، نو ماہ اپنے پیٹ میں رکھ کر حسین خواب دیکھتی ہیں..... میں ظالم ہوں.....! یہ ظلم ہے تو کان کھول کر سن لو تم سب کہ میں ظالم ہوں، یہ ظلم میں زندگی بھر کرتی رہوں گی۔ میں ان کی کھال اتار کر ان کے جسموں کو انگاروں کی بھٹی میں لٹکا دوں گی۔ جیسا یہ لوگ کرتے ہیں یہ تو انسانوں کی روح کو بھٹی میں ڈال دیتے ہیں اقبال صاحب، میں تو عورت ہوں، مجھ میں تو ظلم کرنے کا بھی اتنا حوصلہ نہیں، میں ان سے کمزور ہوں اس لئے صرف ان کے جسموں کو تکلیف دے سکتی ہوں، اگر میں طاقتور ہوتی تو ان کے سامنے ان کی اولاد کو ہیروئن پلائی نہیں کھلاتی..... ایک خوراک نہیں..... ایک کش نہیں، ایک ایک کلو ہیروئن ان کی رگوں میں اتار دیتی مگر میرا ضمیر مجھے

کمزور کر دیتا ہے۔ میں بے بس ہو جاتی ہوں اپنے ضمیر کے آگے۔“ وہ بری طرح چیخ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو اور شعلے ایک ساتھ بہتے محسوس ہو رہے تھے۔ لگتا تھا وہ پاگل ہو گئی ہے۔ میں سہا کھڑا تھا۔ وہ چاروں بھی خوفزدہ، سر جھکائے کھڑے تھے اور یعقوب کی آنکھوں میں تو جیسے موت بھر گئی تھی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ آج کا دن اس کی زندگی کا آخری دن ہے۔ یہ یقین تو اب مجھے بھی ہو گیا تھا۔ فاریہ کی باتوں نے مجھ میں لاوا بھر دیا تھا۔ وہ سچ بول رہی تھی۔ اس کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک حرف کھرا اور سچا تھا۔ مجھ سے فاریہ کی یہ حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ مجھے خود پر غصہ آ رہا تھا کہ میں نے حقیقت جانتے ہوئے بھی ایسی بات کہہ دی جو مجھے نہیں کہنا چاہیے تھی۔

فاریہ دیوار سے لگی ہانپ رہی تھی۔ وہ بے قراری سے اپنے گلے پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ شاید اس کا حلق خشک ہو گیا تھا۔ یہ محسوس کرتے ہی میں لپکا اور قادر داد سے پانی لانے کو کہا۔ قادر داد بھاگتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ میں فاریہ کے قریب جا کھڑا ہوا۔

”میڈم..... آئی ایم سوری..... ریلی آئی ایم سوری۔ میں نے نہ معلوم کیوں..... ایک غلط بات کہہ دی۔ مجھے معاف کر دیں میڈم، دراصل اسے اس حالت میں دیکھ کر مجھے اپنا وہ دن یاد آ گیا تھا جب بالکل اسی طرح تھانے میں مجھے باندھ کر مارا گیا تھا۔ چوہدری کے آدمیوں نے.....“

”تم بے گناہ تھے اقبال مگر یہ.....“ اس نے میری بات کاٹ دی۔

”آئی ایم سوری میڈم!“

”آل رائٹ..... فور گیٹ اٹ.....“ اس نے ماتھے سے پسینا پونچھتے ہوئے کہا۔ اس نے بہت جلد خود پر قابو پا لیا تھا۔ اسی وقت قادر داد پانی لے آیا فاریہ پانی پی کر کچھ بہتر ہو گئی تھی۔

”اقبال..... تم..... باہر چلے جاؤ۔“

”کیوں میڈم؟“ میں بے چین ہو گیا۔

”کیوں کہ تم برداشت نہیں کر پاؤ گے۔“

ایسا کہہ کر اس نے میری مردانگی کو چیلنج کر دیا تھا۔ وہ مجھے کمزور سمجھ رہی تھی۔

بھی جانتا ہے کہ وہ بہت مال دار پارٹی ہے۔ یہ بھی جانتا ہے کہ وہ مجھے مالا مال کر دیں گے۔ کتے تو تو یہ بھی جانتا ہے کہ میری ماں، سوہنی اور ماسی میراں میرے دشمنوں کے قبضے میں ہیں۔ اور..... اور یہ بھی کہ وہ تیری جان کی منہ مانگی قیمت ادا کریں گے..... حرامزادے تو ان کے لیے اتنا اہم ہے کہ وہ تیرے لیے مجھے لکھ پتی بنا دیں گے۔ تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تو انھیں جانتا نہ ہو..... بول..... بول وہ کون ہیں..... کون ہیں وہ.....؟“ میں غصے سے پاگل ہو گیا اور میں نے اس پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔ میں اندھا ہو گیا تھا۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا بس اس کے چیخنے کی آوازیں تھیں جو پھرے ہوئے سمندر کے شور کی طرح چاروں طرف پھیل رہی تھیں۔ اچانک مجھے جکڑ لیا گیا۔ بے بس ہو گیا میں۔ چند لمحوں بعد مجھے ہوش آیا تو نبی بخش، جمالی اور گل جان مجھے جکڑے کھڑے تھے۔

”یوں نہیں اقبال..... یہ بے ہوش ہو گیا۔ اس طرح ہم اس سے کیسے معلوم کر سکیں گے۔ کچھ وقت دیا کرو تاکہ مار کھانے والا سنبھل سکے، تم شاید نئے ہو اس لیے بے قابو ہو جاتے ہو۔ تشدد کرنا ایک فن ہے اقبال، اور وہ تمہیں نہیں آتا۔“ فاریہ نے نرم لہجے میں کہا۔

میں واقعی بے قابو ہو گیا تھا۔ پسینا میری پنڈلیوں پر ریگ رہا تھا۔ میں بے دم ہو کر زمین پر بیٹھ گیا۔ میں نے دیوار سے پشت نکادی اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ ”اسے ہوش میں لاؤ۔“ فاریہ نے قادر داد سے کہا۔

قادر داد نے کونے میں رکھا پانی کا جگ اٹھایا اور یعقوب کے چہرے پر انڈیل دیا۔ پانی کے چند قطرے اس کے کھلے ہوئے منہ میں بھی چلے گئے تھے جس سے وہ جلدی ہوش میں آگیا۔ چند لمحے وہ خالی خالی نگاہوں سے چھت کو تکتا رہا مگر جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ وہ موت کے جال میں ہے۔ وہ خوفزدہ ہو کر اٹھ بیٹھا اور سرکتا ہوا فاریہ سے دور ہو گیا۔ اس کی نگاہیں فاریہ پر جمی ہوئی تھیں اور ان نگاہوں میں التجا تھی۔

”میڈم..... مم..... میں سچ کہتا ہوں۔ انھوں نے مجھے جان سے مار دینے کی دھمکی دی تھی اور کہا تھا کہ کل جب ان کا آدمی مجھ تک وہ لفافہ پہنچانے آئے گا تو مجھے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ مجھے جان سے مار دینا ان کے لیے کتنا آسان ہے اور..... اور

میرے وجود میں آگ بھر گئی۔ ”میڈم..... آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ اس کتے سے ان لوگوں کا نام اور پتا میں پوچھ لوں گا میڈم۔ اس لیے کہ آپ عورت ہیں..... کمزور ہیں مگر میں مرد ہوں، طاقتور ہوں، میں اس کی روح تک کو ادھیڑ کر رکھ دوں گا۔ میں اس کی کھال اتار کر اس پر جلتی ہوئی راکھ ملوں گا میڈم..... اپنے ان ہاتھوں سے، اسے جہنم رسید کر دوں گا۔ جان سے مار دوں گا میڈم.....“ میں چیخ پڑا تھا۔ میں نے دانت پیس کر اور چبا چبا کر جملے ادا کیے تو فاریہ نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

”نہیں اقبال..... اسے جان سے نہیں مارنا..... مر گیا تو اذیت سے نجات پالے گا اور میں..... میں اسے اذیت دینا چاہتی ہوں، ویسی ہی اذیت جو زاریہ کو موت اور زندگی کے بیچ معلق رکھتی ہے اسے زندگی اور موت کے بیچ میں کھڑا کر دو..... اقبال..... مارنا نہیں..... زندہ رکھنا۔“

اور میں مضبوط قدموں سے آگے بڑھا۔ یعقوب گھگھکیا نہ لگا۔ ”ٹھہرو اقبال، اسے نیچے تو اتارنے دو..... میں نہیں چاہتی کہ اس جیسے کتے کے سامنے کھڑے ہو کر تم اپنے آپ کو تباہ قد محسوس کرو۔“ یہ کہہ کر فاریہ نے ان چاروں کو اشارہ کیا۔ ان میں سے ایک نے جیب سے پستول نکالی اور یعقوب کا نشانہ باندھنے لگا۔ میں حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ میں ابھی بات کو سمجھ بھی نہ پایا تھا کہ اچانک ایک دھماکہ ہوا، گولی چلنے کا دھماکہ اور ساتھ ہی دوسرے دھماکے سے یعقوب ان جلتے انگاروں پر آ پڑا۔ اس نے تڑپ کر کروٹ لی اور لڑھکتا ہوا انگاروں سے دور ہو گیا۔ مگر فاریہ کے قدموں میں آگرا اور فاریہ تو سلگتی بھٹی بنی ہوئی تھی۔

”مم..... مجھے معاف کر دیں میڈم..... معاف کر دیں۔“ ”وہ کون ہے؟“ فاریہ نے سفاکی سے اس کے بال پکڑ کر چہرہ خود سے قریب کر لیا۔ ”مم..... میں اسے نہیں جانتا میڈم..... مجھے تو فون پر کہا گیا تھا کہ..... مجھے جو کچھ بھیجا جائے اسے زاریہ تک پہنچا دوں۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ بھیجنے والا کون ہے اور..... اور وہ لانے والی کون تھی۔ خدا کی قسم میڈم مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ زاریہ کو جو چیز جو لفافہ بھیجا گیا ہے اس میں ہیروئن ہے۔“ ”جھوٹ بولتا ہے تو؟“ میں نے اس کے پیٹ میں لات ماری اور چیخ کر کہا۔ ”تو تو یہ

”مگر تمہاری جان تو بہت قیمتی ہے یعقوب..... کسی بھی شخص کو لکھ پتی بنا سکتی ہے اور وہ ساری زندگی عیش کر سکتا ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر طنزیہ لہجے میں کہا۔

”وہ جھوٹ تھا اقبال صاحب‘ میں اپنی جان بچانے کے لیے جھوٹ بول رہا تھا آپ سے ورنہ..... میرا کون ہے جو میری جان کی اتنی قیمت دے گا؟“

”چلو اقبال.....“ فاریہ نے میزبھیوں کی طرف بڑھتے ہوئے کہا اور میں کھڑا ہو گیا۔

”مجھے لے چلیں میڈم..... میں ہاتھ جوڑتا ہوں..... اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں میڈم..... میں نہیں جانتا تھا کہ اس لفافے میں زاریہ بی بی کے لیے کیا ہے!“

”ابھی نہیں یعقوب..... اگر تمہاری بات سچ ہوئی تو میں کفارہ ادا کرنے کا موقع ضرور دوں گی۔“

فاریہ نے تیز لہجے میں کہا اور سیڑھی پر قدم رکھ دیا۔

یعقوب چپخراہ گیا اور ہم اس خوفناک تہہ خانے سے نکل کر کھلی فضا میں آگئے۔

”اسے ٹارچر نہیں کرنا۔ جب تک میں نہ آؤں اسے کچھ نہ کہنا۔ اس کے لیے قید تہائی ہی کافی ہے۔ جب آدمی بالکل تنہا ہو اور اسے موت کا خوف گھیرے ہوئے ہو تو وہ بڑی اذیت میں ہوتا ہے۔ فی الحال اس کے لیے یہی کافی اذیت کافی ہے۔“ فاریہ نے قادر داد سے کہا۔

”اوکے میڈم!“ اس نے فوراً جواب دیا۔

ہم وہاں رکے بغیر اس حویلی سے باہر آگئے۔ میں نے بڑھ کر دروازہ کھولا اور فاریہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ چند لمحوں بعد ہم پھر شہر کی طرف جا رہے تھے۔

”اقبال..... تمہارے خیال میں یعقوب سچ بول رہا ہے یا جھوٹ؟“

”میڈم..... میرا خیال ہے کہ ہمیں اس پر یقین کر لینا چاہیے۔ ممکن ہے یہی سچ ہو!“

”ہوں..... میں بھی یہی سوچ رہی ہوں مگر یاد رکھو کہ جب تک وہ عورت ہمیں

یہ سچ ہی نکلا میڈم جب اس رات..... بلکہ آدھی رات کے بعد اچانک مجھے کسی نے بلایا تو میں اس عورت کو سرہانے دیکھ کر حیران اور خوفزدہ ہو گیا تھا۔ میں دروازہ لاک کر کے سویا تھا مگر وہ عورت اس وقت میرے سرہانے کھڑی تھی۔ اس نے ایک لفافہ مجھے دے کر کہا تھا کہ اسے زاریہ تک پہنچا دوں ورنہ دوسرے روز میرے کمرے میں میری لاش ملے گی۔ میں..... ڈر گیا تھا میڈم میں ڈر گیا تھا..... میں سچ کہتا ہوں..... خدا کی قسم میں سچ کہتا ہوں۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ کمرے میں اس کے رونے کی آواز کے سوا کوئی آواز نہ تھی۔ فاریہ اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں گہری سوچ تھی۔ نہ معلوم کیوں مجھے لگا جیسے یعقوب سچ بول رہا ہو۔ عین اسی لمحے میں نے فاریہ کی آنکھوں میں بھی یقین کی کیفیت دیکھی۔ مگر لمحہ بھر کو..... دوسرے ہی لمحے وہ ٹھہرے ہوئے سفاک لہجے میں بول اٹھی۔ ”فون کرنے والا کون تھا؟“

”مم..... میں نہیں جانتا..... میں نے ایسی آواز اس سے پہلے نہیں سنی تھی۔ وہ آواز میرے لیے اجنبی تھی۔“

”اور وہ عورت.....؟ اس کا حلیہ کیا تھا؟“

”وہ تیس بتیس برس کی لگتی تھی۔ گول چہرہ تھا اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں اس کے پوٹے کچھ ابھرے ابھرے سے تھے اور رنگت سنہری تھی۔ بال بالکل سیاہ اور بہت لمبے تھے جو چوٹی میں گندھے ہوئے تھے۔“

یعقوب نے ہانپتے ہوئے اس عورت کا حلیہ بتایا۔ پھر وہ قادر داد سے مخاطب ہوا۔ ”پپ..... پانی.....“

قادر داد نے فاریہ کی طرف دیکھا۔ فاریہ نے سر ہلایا تو اس نے گلاس بھر کر اس کی طرف بڑھا دیا جسے یعقوب نے ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔

”ٹھیک ہے یعقوب..... میں اس حلے کی عورت کو تلاش کروں گی اور جب تک وہ مجھے مل نہیں جاتی تم یہیں قید رہو گے۔“ فاریہ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”مم..... مجھے بھی ساتھ لے چلیں میڈم..... میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب..... اب آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ میں اپنی جان بھی دے دوں گا مگر.....“

نشے کی لت میں مبتلا کیا ہو گا۔ انہی کے کسی آدمی نے ہاں وہ وہ
لوگ دشمن ہیں ہمارے اودہ اقبال یو آر ویری انٹیلی جنٹ۔“
”تھینک یو میڈم یہ میرا خیال ہے، اس پر پوری طرح یقین ابھی نہ کریں۔
میڈم، میرا جلد از جلد وہاں چلے جانا آپ کو بہت خطروں سے بچا سکتا ہے۔ اگر آپ اجازت
دیں تو میں کل“

”نہیں“ وہ ایک دم بول اٹھی مگر خود ہی پریشان ہو گئی۔ ”اقبال پتا نہیں
کیوں یہ خیال آتے ہی مجھے ڈر سا لگنے لگتا ہے۔ جیسے تمہیں بھیج کر میں میں بہت
کمزور ہو جاؤں گی یا تمہیں خدا نخواستہ کچھ ہو جائے گا۔ میں ڈر جاتی ہوں اقبال،
تمہاری ماں اور اور تمہاری محبت تمہارا انتظار کر رہی ہے مجھے کوئی حق نہیں کہ
میں تمہیں ان لوگوں سے جدا کروں۔ میرا کیا ہے اقبال میں تو پہلے بھی اکیلی تھی
..... کل پھر اکیلی ہو جاؤں گی مگر آج آج تمہارے قرب سے مجھے جو
..... اودہ کچھ تمہیں اقبال“

اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔ اس کی حالت عجیب سی ہو گئی تھی۔
اس کے لہجے میں حسرت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

”میڈم آپ اکیلی نہیں ہوں گی میں وہاں رہ کر بھی تو آپ کی
حفاظت کروں گا۔ آپ کے گھر پر پھیلے ہوئے موت کے جال کو سمیٹ کر انہی لوگوں پر
پھینک دوں گا جو آپ کو پریشان کر رہے ہیں۔ آپ مجھے ہمیشہ اپنے ساتھ ہی محسوس کریں
گی میڈم۔“

”ہاں مگر اقبال میں ان لوگوں کے پھیلائے ہوئے جال سے
نہیں ڈرتی میں موت سے نہیں ڈرتی مگر اکیلا پن اودہ
..... چھوڑو ان باتوں کو کوئی اور بات کرو پلینز یہ فیصلہ بعد میں کریں
گے کہ تم تمہیں کب جانا ہے۔ میں ہی غلط ہوں شاید میں نے تم پر اتنا
بھروسہ کیوں کر لیا۔ تمہارے آنے کے بعد میں میں کمزور ہو گئی ہوں ورنہ لوگ
میرے ماتھے پر شکن دیکھ کر دہل جاتے تھے اور اب تو شاید میرے ماتھے
پر شکن ہی نہیں آتی“ وہ بالکل ایسے ہی بول رہی تھی جیسے خواب میں بول رہی

نہیں مل جاتی ہم یعقوب کو چھوڑنے کا رسک نہیں لے سکتے۔ وہاں یعقوب محفوظ ہے
ورنہ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ لوگ اسے جان سے مار دیں کیوں کہ وہ کم از کم اس عورت کو
شناخت کر سکتا ہے جو اس کے کمرے میں آئی تھی۔“
”لیس میڈم، ایسا ہو سکتا ہے۔“

”اقبال اس کا مطلب ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی محفوظ نہیں ہے۔ وہ عورت
تمہارے یا میرے کمرے میں بھی آسکتی تھی اور زاریہ کے“ اچانک وہ خاموش ہو
کر کچھ سوچنے لگی۔ ”اقبال وہ زاریہ کے کمرے میں خود بھی تو جاسکتی
تھی پھر وہ یعقوب کے پاس ہی کیوں آئی!“

”ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے میڈم، یعقوب کے کمرے تک پہنچنا نسبتاً آسان ہے مگر
آپ کے یا زاریہ کے کمرے تک پہنچنے کے اسے کئی تالوں کی چابیاں بنوانا پڑتیں اور پھر
بھی یہ رسک موجود رہتا کہ ممکن ہے آپ بیگ صاحب یا حمیدہ کوئی اسے دیکھ لیتا، مگر
یعقوب کو جان سے مار دینے کی دھمکی دے کر اس سے یہ کام آسانی سے کروایا جاسکتا تھا۔
یعقوب کا کمرہ باہر کی جانب ہے، چوکیدار کا کمرہ اس کے کمرے سے بہت دور ہے اور آپ
سب اندر ہوتے ہیں۔ اپنے بارے میں کہہ نہیں سکتا کہ انھوں نے کیا سوچ کر مجھے چھیڑا
نہیں کیا۔ ممکن ہے اس لیے کہ میں آپ لوگوں کے لیے نیا ہوں اور شاید وہ سوچ رہے
ہوں کہ میری رسائی زاریہ تک نہیں ہے۔ اس کے علاوہ تو کوئی بات سمجھ میں نہیں
آتی۔“

”تم بہت ذہین ہو اقبال تم نے بہت اچھا تجزیہ کیا ہے۔ میں میں
سمجھتی ہوں کہ ایسا ہی ہوا ہو گا لیکن اس سے ایک بات تو بالکل واضح ہو گئی ہے کہ دشمن
بہت ذہین ہے اور حویلی کے اندر کی بہت سی باتیں جانتا ہے۔“

”جی میڈم میرا ذہن تو سیمیں اور بہادر کی طرف جا رہا ہے۔ وہ آپ کے
دشمن ہیں ممکن ہے یہ سارا کھیل انہی لوگوں کا ہو۔ وہ جان گئے ہوں کہ آپ ان کے
بارے میں خطرناک ارادے رکھتی ہیں۔“

”اودہ اودہ اقبال یہ یہ خیال مجھے کیوں نہ
آیا ہاں ہاں وہی ہو سکتے ہیں انھوں نے ہی زاریہ کو اس

ہو۔ کبھی کبھی اس کا لہجہ اتنا دھیمّا ہو جاتا تھا کہ میں بڑی کوشش کے بعد سن پاتا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ مجھے اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہونے لگا بلکہ جب یہ سب کہنے کے بعد اس نے سر کو سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا اور کتنی ہی دیر تک بے سندھ پڑی رہی تو میں گھبرا گیا۔ میں سمجھا کہ وہ بے ہوش ہو چکی ہے۔

”میڈم..... میڈم.....“ میں نے گھبرا کر اس کا شانہ پکڑ کر ہلایا۔

”ہوں.....“ اس نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں اور پھر موند لیں تب مجھے اطمینان ہوا۔ اس کی یہ حالت ٹھیک ہی تو تھی۔ مسلسل تین روز سے اس پر قیامت ٹوٹ رہی تھی۔ وہ بھی آخر کب تک برداشت کرتی میں ہٹا کٹا ہونے کے باوجود پے درپے صدموں اور حیرت انگیز واقعات سے ٹوٹ گیا تھا، وہ تو بے چاری ایک عورت تھی۔

وہ یونہی بے سندھ آنکھیں موندے پڑی رہی۔ میں نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ میں دعا مانگ رہا تھا کہ کوٹھی میں سب خیریت ہو تاکہ فاریہ کچھ دیر آرام کر سکے۔ سوا گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد ہم کوٹھی پہنچ گئے۔ شام کے ساڑھے تین بجے تھے۔ یہ وقت بیگ صاحب کے سونے کا تھا۔ میں نے گیٹ پر گاڑی روک کر ہارن دیا تو فاریہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ چوکیدار نے گیٹ کھولا۔ میں نے گاڑی بڑھا دی۔

”ٹھہرو۔“ فاریہ نے گاڑی وہیں رکوائی اور چوکیدار کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔

”سلام بی بی!“

”وعلیکم سلام، کیسے ہو سکندر خان؟“

”آپ کی مہربانی ہے بی بی۔“ اس نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

”کوئی تکلیف تو نہیں تمہیں؟“

”نہیں بی بی۔“

”آغا کیسے ہیں؟“

”اب تو بہتر ہیں۔ آپ کو دعائیں دیتے ہیں۔“

”دیکھو سکندر میں بہت مصروف رہتی ہوں۔ تم سے خیریت پوچھنے کا بھی وقت نہیں ملتا۔ تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو خود ہی کہہ دینا۔“

”مہربانی بی بی..... بس آپ کی دعا چاہیے۔“

”اور ہاں سنو..... عذرا نام کی کوئی لڑکی آئی تھی؟“

”ہاں بی بی..... ایک بی بی آیا تھا۔ ہم نے نام پوچھ کر پہلے بڑے صاحب کو بتایا پھر اندر چھوڑا تھا اسے۔“

”ہاں..... وہ یہاں رہنے کے لیے آئی ہے۔“

”رہنے کے لیے؟“

”ہاں چلو اقبال.....“ اور میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے میں نے فاریہ کو آرام کرنے کا مشورہ دیا اور خود بھی اپنے کمرے میں چل پڑا۔ مجھے بھوک بالکل نہیں تھی حالانکہ میں نے صبح ناشتا بھی نہیں کیا تھا بس نیند اور تھکن تھی۔ میں اپنے کمرے میں گیا۔ نمایا اور بستر پر گر کر سو گیا۔

شام کو میری آنکھ کھلی۔ میں کمرے سے باہر آیا اور سیدھا کچن میں چلا گیا۔ میں نے سوچا کہ چائے خود ہی بناؤں گا مگر کچن میں حمیدہ کو دیکھ کر میں اسے چائے کے لیے کہہ کر لان میں چلا آیا۔

چند لمحوں بعد فاریہ اور بیگ صاحب بھی وہیں آگئے۔ فاریہ غالباً سو کر اٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں بوجھل تھیں مگر وہ خود بالکل تروتازہ لگ رہی تھی۔ میں نے بیگ صاحب سے ان کی خیریت پوچھی۔ اس دوران فاریہ اخبار پڑھتی رہی۔ حمیدہ چائے لے کر آئی تو فاریہ نے اس سے زاریہ کی خیریت پوچھی۔

”وہ ٹھیک ہیں۔ عذرا بی بی آگئی تھیں انھوں نے مجھے بھیج دیا تھا اور وہ خود زاریہ کے پاس رک گئی تھیں۔“

”ارے ہاں..... میں تو بتانا ہی بھول گیا تھا۔ تمہارے فون کرنے کے کچھ دیر بعد ہی عذرا آگئی تھی۔ بہت مہذب بچی ہے۔“

”ہاں انکل، اس وقت میری نگاہ اس پر پڑی تھی۔ وہ حالات کی ستانی ہوئی لڑکی ہے، دکھ درد کے معنی جانتی ہے اسی لیے میں نے اس پر بھروسہ کر لیا ہے باقی ہماری قسمت۔“

”اور ہاں یعقوب کا کیا بنا؟“ بیگ صاحب نے پوچھا۔

فاریہ انھیں تفصیل سے بتانے لگی۔ میں اخبار لے کر بیٹھ گیا۔

”تمہارا کیا خیال ہے کیا وہ سچ بول رہا ہے۔“ بیگ صاحب نے فاریہ سے پوچھا۔

”آپ بتائیے انکل، آپ تو شاید اسے مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔“

”یہ سچ بھی ہو سکتا ہے مینا اور جھوٹ بھی۔ اب تو اپنی زبان سے نکلی ہوئی بات کا بھی اعتبار چلا گیا ہے۔“ انھوں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”ہوں، انکل اسی لیے میں نے اسے وہیں رکھا ہے۔ میں اس عورت کو تلاش کر لوں گی تبھی اس کی بات پر یقین کروں گی۔“

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ میں دیکھنے کے لیے اٹھنے لگا کہ اسی وقت حمیدہ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔ میں پھر بیٹھ گیا۔

”فاریہ بی بی آپ کا فون ہے۔“ اس نے برآمدے ہی سے آواز دی۔

فاریہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔ چند لمحوں بعد ہی اندر سے فاریہ کے چیخنے کی آواز آئی۔ وہ کسی سے زور زور سے بات کر رہی تھی۔ نہ معلوم کیوں میں بے چین ہو کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔

”تم کہاں سے بول رہی ہو؟“ فاریہ فون پر پوچھ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ریسیور کانپ رہا تھا اور اس کی حالت خراب تھی۔

دوسرے لمحوں ہی اس نے فون کو کریڈل پر بٹھا اور دروازے کی طرف بھاگتے ہوئے کہا۔ ”اقبال جلدی آؤ..... زاریہ خطرے میں ہے۔“

میں اندھا دھند اندر کی طرف بھاگا۔ فاریہ کے چیخنے کی آواز شاید بیگ صاحب اور ڈاکٹر طارق نے بھی سن لی تھی۔ وہ لوگ بھی بھاگتے ہوئے اندر آگئے۔

”کیا ہوا؟“ بیگ صاحب چیخے۔

”وہ..... عذرا نہیں ہے انکل، کوئی اور ہے.....“ فاریہ نے میرے پیچھے بھاگتے ہوئے جواب دیا۔ ہم سب زاریہ کے کمرے کے دروازے تک بھاگتے ہوئے پہنچے اور پھر میں نے دروازے پر زور دار لات ماری دروازہ لاک نہیں تھا۔

کمرے میں گہرا اندھیرا تھا۔ فاریہ نے غالباً سوچ ڈھونڈ کر آن کیا تھا مگر روشنی نہ ہوئی۔

”اقبال..... شاید بلب.....“ وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر اندھیرے ہی میں گرتی پڑتی زاریہ کے بیڈ کی طرف دوڑی مگر شاید کسی چیز سے ٹکرا کر گری۔

”ماچس..... ماچس لاؤ۔“ بیگ صاحب کی آواز سے مجھے ہوش آیا۔

میں اٹنے قدموں باہر کی طرف بھاگا میں ابھی آدھے رستے ہی پر تھا کہ حمیدہ ماچس ہاتھ میں لیے دوڑتی ہوئی میرے برابر سے گزری۔

”لاؤ..... مجھے دو!“ میں تیزی سے کمرے میں داخل ہوا۔ ماچس کی تیلی جلائی تو زاریہ کا بیڈ خالی تھا۔

فاریہ ایک دم چیخ اٹھی۔ ”زاریہ کہاں گئی۔ زاریہ نہیں ہے انکل..... زاریہ!“ وہ پاگلوں کی طرح ہاتھ روم کی طرف بھاگی۔

”حمیدہ بی بی.....“ چونکدار سے کو کوئی بلب لائے۔“ میں نے پلٹ کر کہا۔ اسی وقت میرے منہ سے سسکاری نکل گئی۔ تیلی پوری جل چکی تھی۔ میری انگلیاں جلیں تو میں نے گھبرا کر تیلی بچھا دی۔

اندھیرے کمرے میں فاریہ اور بیگ صاحب کی آوازیں سمندر کے کسی شور کی طرح محسوس ہو رہی تھیں۔ میں اندھیرے میں بے بس کھڑا تھا۔ ماچس میں انگلی داخل کی تو اس میں صرف ایک آخری تیلی باقی تھی جسے میں نے ابھی جلاتا مناسب نہ سمجھا۔ حمیدہ کا ہیولا اندر داخل ہوتا نظر آیا کچھ ہماری نگاہیں بھی اندھیرے کی عادی ہو گئی تھیں۔ میں نے ماچس کی تیلی اور خالی ماچس فاریہ کو تھما دی۔ ”میڈم احتیاط سے جلائیے گا، یہ آخری تیلی ہے۔ میں بلب لگاتا ہوں۔“

”ٹھہرو اقبال یہ.....“ یہ لولیمپ۔“ فاریہ نے اندھیرے میں لیپ اٹھا کر میرے قریب کر دیا اور خود تیلی جلا دی۔ میں نے لیپ میں بلب لگایا لیپ سے منسلک سوچ آن تھا، بلب لگتے ہی کمراروسن ہو گیا۔ روشنی پھیلتے ہی ہمیں زاریہ نظر آگئی جو بیڈ کے انتہائی کونے میں آڑھی پڑی تھی۔

”زاریہ.....“ فاریہ اور بیگ صاحب اس کی طرف جھپٹے۔ میں نے وہاں رک کر وقت ضائع نہیں کیا اور بھاگتا ہوا ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا جہاں ٹیلی فون رکھا تھا۔ میں نے ڈاکٹر کو فون کیا اور اسے پوری صورت حال کے بارے میں بتایا۔ ڈاکٹر کو فوری پہنچنے کا کہہ کر میں دوبارہ زاریہ کے کمرے میں پہنچا۔

حمیدہ اور فاریہ اس کے تریچھے پڑے بدن کو سیدھا کر کے لٹا چکی تھیں۔ زاریہ بے

ہوش تھی۔ اس کا رنگ سفید اور اس کے چہرے پر بلا کی کمزوری اور نقاہت تھی۔ فاربیہ نے اس پر پانی کے چھینٹے بھی مارے مگر اس کی ساکت پلکوں پر ان ٹھنڈی بوندوں کا اثر نہ ہوا۔ بیگ صاحب پریشان حال کھڑے اسے تک رہے تھے۔ فاربیہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور حمیدہ بھی رو رہی تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر زاریہ کے کمزور رخساروں پر ہلکے طمانچے لگائے مگر لگتا تھا جیسے اس نے آنکھیں نہ کھولنے کی قسم کھائی ہوئی ہو۔ اس کا تنفس بہت مدہم تھا۔ مجھے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ کمرے میں موت کا سا سکوت چھایا ہوا تھا۔

”اقبال، ڈاکٹر.....!“

”جی وہ آتے ہی ہوں گے۔“

عین اسی وقت سنائے میں گاڑی کے رکنے کی آواز آئی اور میں لپک کر باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد ہی میں ڈاکٹر کو لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ ڈاکٹر نے زاریہ کے پوٹے اٹھا کر دیکھا۔ اس کی پتلیاں چڑھی ہوئی تھیں۔ بیگ صاحب اور فاربیہ بیڈ پر جھکے ڈاکٹر کے سپاٹ چہرے کو اور کبھی زاریہ کے بے جان چہرے کو دیکھ رہے تھے۔ ڈاکٹر بہت دیر تک زاریہ کا معائنہ کرتا رہا پھر اچانک اس نے سر اٹھا کر بیگ صاحب کو اور فاربیہ کو دیکھا۔

”اسے ہاسپٹل لے جانا پڑے گا۔ ابھی..... فوراً.....“ اس کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔ فاربیہ اور بیگ صاحب کا رنگ سفید پڑ گیا۔

میں رکے بغیر بھاگتا ہوا پورچ کی طرف بڑھ گیا۔ بیگ صاحب کی بڑی گاڑی کی چابیاں چوکیدار سے لیں اور اسے بیک کر کے اس حصے کی طرف لے آیا جہاں سے زاریہ کا کمرہ قریب تھا۔ گاڑی کا پچھلا حصہ کھول کر میں زاریہ کے کمرے کی طرف بڑھا۔ فاربیہ اور بیگ صاحب زاریہ کو اٹھائے اسی جانب آ رہے تھے۔ میں نے اسے سہارا دیا اور گاڑی کی سیٹ پر لٹا دیا۔ فزیز اور بیگ صاحب اس کے پاس بیٹھ گئے۔ میں نے فوراً ہی گاڑی اشارت کی اور تیز رفتاری سے اسے ریورس میں ڈال کر گیٹ تک لے آیا۔ ڈاکٹر بھی اپنی گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ ہم دونوں تیز رفتاری سے آگے پیچھے سفر کرتے ہوئے ہاسپٹل پہنچ گئے۔ ڈاکٹر نے فوراً ہی اسٹریچر کا انتظام کر دیا اور زاریہ کو اسی وقت آئی۔ سی۔ یو میں لے گئے۔

میں، فاربیہ اور بیگ صاحب یوں تنہا کھڑے رہ گئے جیسے زاریہ ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئی ہو۔ فاربیہ کی بہت بری حالت تھی مگر اس نے اپنی قوت ارادی سے خود کو سنبھالا ہوا تھا مگر بیگ صاحب تو پہلے ہی دل کے مریض تھے۔ مجھے ان کی طرف سے فکر تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے وہ کانپ رہے ہوں۔ میری نگاہیں ان پر گری ہوئی تھیں۔ اچانک یوں لگا جیسے وہ گرنے والے ہوں۔ میں ان کی طرف لپکا اور میں نے انہیں تھام لیا ورنہ واقعی وہ گر گئے ہوتے۔ فاربیہ بھی چیخ کر ان کی طرف لپکی۔

”انکل..... انکل آپ..... ٹھیک تو ہیں نا؟“

”ہیں..... ہاں..... ہاں..... ٹھیک ہوں۔ اقبال..... ڈاکٹر کو.....“

انہوں نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ ان کی سانس اکھڑ رہی تھی اور وہ ایک ہاتھ سے اپنے سینے کو دبا رہے تھے۔

ہم کیوں کہ اس وقت اسپتال ہی میں کھڑے تھے اس لیے انہیں فوری طور پر طبی امداد مل گئی ورنہ خدا نخواستہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ یہ ان پر دوسرا اٹیک تھا۔ فاربیہ تو بالکل ہی زروس ہو گئی تھی اور زروس ہونے کی بات بھی تھی۔ ایک طرف اس کی بہن آئی۔ سی۔ یو میں پڑی زندگی اور موت کی کشمکش سے نبرد آزما تھی تو دوسری طرف بیگ صاحب کارڈیو میں پہنچ چکے تھے۔ خود میری حالت بھی کچھ بہتر نہ تھی مگر فاربیہ کی حالت دیکھ کر میں خود کو مضبوط بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد ہمیں ڈاکٹر صاحب آتے نظر آئے۔

”ڈاکٹر طارق.....“ فاربیہ تیزی سے آگے بڑھی۔

”اب وہ خطرے سے باہر ہے۔“

”تھینکس گاڈ!“ فاربیہ نے آسمان پر نگاہ کی۔ اس کے چہرے کی سفیدی میں کمی آئی۔

”بیگ صاحب چلے گئے؟“ ڈاکٹر طارق نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

تب میں نے انہیں ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ پریشان ہو گئے۔ انہوں نے فاربیہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا جیسے وہ اسے تسلی دے رہے ہوں۔ پھر مجھے اشارہ کرتے ہوئے اس طرف بڑھ گئے۔ جہاں بیگ صاحب کو رکھا گیا تھا۔

”میڈم..... سب کچھ ٹھیک ہے اب آپ گھر جا کر آرام کریں۔“ میں نے اس سے نگاہیں چراتے ہوئے کہا۔ میں اپنے کھوکھلے لہجے پر خود ہی شرمندہ تھا۔

”سب ٹھیک ہے؟“ اس نے جلتی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ ”میں اکیلی رہ گئی۔ ان دونوں نے مجھے تنہا چھوڑ دیا، دونوں مجھ سے غافل ہو گئے اور تم کہتے ہو سب ٹھیک ہے۔“ اس کا سلگتا ہوا لہجہ تیز تھا ادھر ادھر کے لوگوں نے چونک کر ہماری طرف دیکھا۔

”میڈم..... آئیے گاڑی میں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ یہاں..... بہت لوگ ہیں۔“ میں نے کہا۔

اس نے بھی شاید ان حیران نگاہوں کو دیکھ لیا تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی اور ہم باہر کھڑی گاڑی میں آ بیٹھے۔ کچھ دیر تک ہمارے درمیان گہری خاموشی حائل رہی۔ شاید ہم دونوں ہی خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”سوری اقبال.....“ اس نے سر کو سیٹ کی پشت سے ٹکاتے ہوئے کہا۔ وہ کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح لگ رہی تھی۔ ”میں نے زاریہ اور انکل کو ہمیشہ خود سے قریب تر محسوس کیا ہے شاید اسی لیے..... میں ذرا جذباتی ہو گئی تھی۔ میں..... میں ان دونوں میں سے کسی کی بھی جدائی برداشت نہیں کر سکتی۔ میرا ان دونوں کے سوا کوئی بھی تو نہیں ہے اقبال۔“

”میں جو ہوں میڈم!“

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ اس کی بجھتی ہوئی آنکھوں میں لمحہ بھر کو ایک کرن ہے، چمکی پھر معدوم ہو گئی۔

”تم؟“

”جی میڈم۔ آپ تنہا نہیں ہیں اور پھر زاریہ اور بیگ صاحب ٹھیک ہو جائیں گے۔ میڈم میں نے تو آپ کو اتنا مایوس کبھی نہیں دیکھا، آپ تو مضبوط قوت ارادی کی مالک ہیں۔ دوسروں کو سہارا دینے والی ہیں پھر خود کو سنبھال کیوں نہیں لیتیں!“

”مضبوط قوت ارادی کی فاریہ کے ساتھ ایک نازک اندام عورت بھی تو ہے۔ وہ عورت جو مسلسل بھرے ہوئے طوفانوں کا مقابلہ کر رہی ہے اقبال، آخر کب تک؟ باہر سے مضبوط اور اندر سے لرزتی ہوئی اس عورت کے درمیان اصل فاریہ تو کب کی پکل

چکی ہے۔ میں..... میں کیا کروں اقبال..... میں کیا کروں؟“ وہ بے اختیار رو پڑی۔ مجھ سے فاریہ کے آنسو برداشت نہیں ہوتے تھے۔ شاید اس لیے کہ میں نے اسے کبھی بہت مضبوط اور کبھی بہت سفاک بھی دیکھا تھا۔ ایسی پتھریلی شخصیت تو اسی وقت رو سکتی ہے جب اندر سے اور باہر سے بری طرح تباہ ہو چکی ہو۔ شاید فاریہ کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔

”میڈم..... پلیز کچھ بھی ہو آپ کو ہمت کرنا پڑے گی۔ اگر ایسا نہیں کریں گی تو سوچئے زاریہ کو سنبھالنے والا کون ہو گا۔ بیگ صاحب کو سہارا دینے والا کون ہو گا۔“

”مس فاریہ!“ اچانک ڈاکٹر طارق کی آواز آئی، وہ فاریہ کی کھڑکی کے قریب کھڑے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی ہم دونوں فوراً گاڑی سے اتر آئے۔

”ڈاکٹر!“

”ڈونٹ وری مس فاریہ۔ بیگ صاحب بالکل ٹھیک ہیں۔ زاریہ بھی خطرے سے باہر ہے، اب آپ بے فکری سے گھر جا سکتی ہیں۔“ انہوں نے ہونٹوں پر زبردستی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ مگر میں ان کی آنکھوں کے کناروں پر پریشانی کی وہ چمکیلی لکیر دیکھ رہا تھا جو کافی واضح تھی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ فاریہ کو تسلی دینے کے لیے جھوٹ بول رہے ہیں۔

”کتنی عجیب بات ہے۔“ میں نے دکھ سے سوچا۔ ”ہم سب ایک دوسرے سے مخلص ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے جھوٹ بولنے پر مجبور ہیں۔ نہ زاریہ خطرے سے باہر ہے اور نہ بیگ صاحب ٹھیک ہیں۔“

”میں..... میں دونوں سے ملے بغیر گھر کیسے جا سکتی ہوں ڈاکٹر، ان دونوں کو ایسی حالت میں چھوڑ کر کہیں جانے کا تصور ہی میرے لیے خوفناک ہے۔“

”یہ میں نے کب کہا کہ آپ ملے بغیر ہی چلی جائیں۔“ اس نے لہجے کو شوخ بناتے ہوئے کہا۔ ”چلے بیگ صاحب آپ کو یاد کر رہے ہیں مگر مس فاریہ، پلیز اپنی آنکھوں کو پونچھ لیں، یہ آنسو بیگ صاحب کو خوشی نہیں دیں گے۔ انہیں زاریہ کے بارے میں خوش خبری سنائیے گا پلیز.....“

اور فاریہ نے اپنی آنکھیں رومال سے رگڑ کر صاف کر لیں۔ ”چلے!“

”عذرا کا!“

”جی!“ میں اچھل پڑا۔

”مگر اسے تو کوٹھی پہنچنا تھا پھر وہ کیوں نہیں پہنچی اور وہ کون تھی جو اس کی جگہ وہاں آئی؟“

”عذرا نے کہا تھا کہ اسے کوٹھی پہنچنے سے روکا گیا تھا۔ اس نے تو مجھ سے معذرت کرنے کے لیے فون کیا تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ چوکیدار کی اطلاع کے مطابق تو تم یہاں آئی ہو تب اس نے انکار کیا اور پھر مجھے اتنا ہوش ہی نہ رہا کہ میں اس سے تفصیل پوچھتی۔ اب ہم اسی لیے وہاں جا رہے ہیں کہ حقیقت معلوم کی جاسکے۔“

”اوہ..... اس کا مطلب ہے کہ یہ بات ہم تینوں کے سوا کوئی اور بھی جانتا ہے کہ آج عذرا کو زاریہ کی خدمت کے لیے بلایا گیا ہے۔“

”ہاں..... حالانکہ جب یہ پروگرام بنا تھا تو کمرے میں سوائے میرے تمہارے اور عذرا کے کوئی چوتھا فرد نہیں تھا۔ میں بھی حیران ہوں کہ یہ بات ہمارے دشمنوں تک کیسے پہنچ گئی۔“

”میڈم‘ آپ اس واقعے کی اطلاع پولیس کو دے دیں۔ وہ خود ہی.....“

”بے وقوف ہو تم‘ یہ معاملات ایسے نہیں کہ انہیں طشت ازہام کیا جائے۔ جانتے ہو یہ بات میرے لیے اور انکل کے لیے کتنی بدنامی کی ہو گی کہ زاریہ ہیروئن پتی ہے۔ ویسے بھی یہ ایسی بات نہیں کہ پولیس اس کا تدارک کر سکے۔ میں اس معاملے کو اپنے طور پر نمٹانا چاہتی ہوں۔ یوں بھی پولیس پر اعتماد کرنا سب سے بڑی بے وقوفی ہے۔ یہ اتنے بڑے بڑے کاروبار پولیس کی سربراہی کے بغیر تو نہیں ہو رہے نا۔ پولیس بہت سے معاملوں سے واقف ہے مگر کچھ بھی نہیں کرتی۔ اس لیے کہ ان کی اپنی عیاشیوں کا دار و مدار بھی تو ایسے ہی لوگوں پر ہے جو ناجائز کاروبار کرتے ہیں‘ کالا دھن کھاتے ہیں اور پولیس والوں کی ضرورتوں کا خیال رکھتے ہیں۔“

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ مجھے اس کی باتوں پر قائل ہونا پڑا۔ ”لیکن میڈم‘ آپ تنہا اس سلسلے میں کیا کر سکیں گی۔“

”میں سب سے پہلے یہ معلوم کرنے کی کوشش کروں گی کہ یہ پروگرام لیک آؤٹ

کیسے ہوا۔ دیکھو اقبال مجھے غلط نہ سمجھنا‘ میں ایسا سوچنے میں حق بجانب ہوں کہ اس پروگرام کی اطلاع دشمن کو پہنچانے والے یا تو تم ہو یا عذرا اور تم دونوں ہی وہ افراد ہو جن پر مجھے بھرپور اعتماد ہے۔ پھر بھی اس سلسلے میں چھان بین کرنا میرا فرض ہے۔“

”آپ ٹھیک کہتی ہیں میڈم۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ آپ جس طرح چاہیں اس معاملے کی چھان بین کریں اور مجرم کو قرار واقعی سزا دیں۔ اگر مجرم میں ہوں تو مجھے بھی اور اگر عذرا ہے تو اسے بھی۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

”دائیں طرف موڑ لو۔“ فاریہ نے ایک ذیلی سڑک کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے گاڑی کو اسی جانب موڑ دیا۔ کچھ دور چلنے کے بعد فاریہ کی ہدایت کے مطابق پھر ایک گلی میں داخل ہو گیا۔ یہ علاقہ بہت صاف ستھرا تھا۔ ہم ایک گرے کمر کے مکان کے آگے رک گئے۔ فاریہ نے اتر کر کال بیل پر ہاتھ رکھ دیا۔ تقریباً تین چار منٹ تک مسلسل بیل بجانے کے بعد دروازہ کھلا۔ وہی عورت جسے میں نے پہلی بار بس میں دیکھا تھا، دروازے پر کھڑی آنکھیں پٹپٹا رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے وہ سو رہی تھی۔

”مس عذرا ہیں؟“

”وہ تو آپ ہی کے گھر کی طرف گئی ہے۔“

”کس وقت؟“ فاریہ نے پوچھا۔

”ایک ڈیڑھ گھنٹا ہو گیا ہے۔“

فاریہ فوراً ہی پلٹ آئی۔ ”جلدی چلو اقبال وہ کوٹھی گئی ہے۔“ فاریہ نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا اور میں نے اس کے دروازہ بند کرتے ہی گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ اس نے اٹھتے ہوئے لمبے میں کہا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی کنپٹیاں دبائے ہوئے بیٹھی تھی۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔ ہم بیس منٹ بعد ہی کوٹھی کے گیٹ میں داخل ہو رہے تھے۔ فاریہ نے گیٹ کے پاس گاڑی رکوا کر چوکیدار سے عذرا کے متعلق پوچھا۔

”جی‘ بیگم صاحب..... ایک لڑکی آیا تھا مگر ہم نے اندر نہیں آنے دیا۔ وہ بولا ہم

آدھا گھنٹا میں واپس آئے گا۔“

”افوہ..... کیا مصیب ہے۔“ فاریہ نے جھنجھلا کر کہا۔ میں نے اس کے اشارے پر گاڑی آگے بڑھا دی۔ پورچ میں گاڑی روک کر میں اور فاریہ دونوں اتر آئے۔
”میرے لیے کوئی حکم میڈم!“
”ہاں میرے ساتھ چائے پیو، مجھے کچھ باتیں کرنا ہیں۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔“

میں کوئی جواب دیے بغیر اس کے پیچھے چلنے لگا۔ فاریہ مجھ سے دو قدم آگے تھی۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی وہ ٹھٹک گئی۔ ”تم.....!“
میں تیزی سے آگے بڑھا اور سامنے عذرا کو بیٹھ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ بڑے اطمینان سے صوفے پر بیٹھی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی کھڑی ہو گئی۔
”سوری میڈم، چوکیدار نے مجھے اندر آنے سے روک دیا تھا جبکہ میرا آپ سے ملنا بے حد ضروری تھا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ آپ کس وقت آئیں گی اور کہیں اور جانا میرے لیے ممکن نہ تھا اس لیے میں کوٹھی کی چھپی جانب سے دیوار کوڈ کر اندر داخل ہوئی اور یہاں آپ کا انتظار کرنے لگی۔“

”دیٹ سو آل..... معاملہ کیا تھا؟“ اس نے سپاٹ لمچے میں پوچھا۔
”میں آپ کی ہدایت کے مطابق آفس سے سیدھی گھر گئی تھی۔ وہاں سے میں نے اپنی ضرورت کی چیزیں لیں اور گھر سے باہر آئی تو سڑک کے دوسری جانب ایک درخت کے نیچے خالی ٹیکسی کھڑی تھی۔ میں نے اس سے چلنے کو کہا تو وہ تیار ہو گیا۔ میں نے اسے ایڈریس بتایا اور اطمینان سے بیٹھ گئی۔ کچھ دور چلنے کے بعد ٹیکسی والے نے کہا کہ راستے میں اس کا گھر آتا ہے اگر میں اجازت دوں تو وہ گھر میں کچھ پیسے دے دے تاکہ بیوی کچھ پکا کر بچوں کو کھلا سکے۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ بہت غریب ہے اور ٹیکسی کا مالک بہت ظالم شخص ہے۔ پچھلے دنوں اس کی ٹیکسی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ مالک نے اس کی تنخواہ کاٹ لی اور دو روز سے اس کے گھر فاقہ ہے۔ بات ایسی تھی اور ایسے انداز میں کی گئی تھی کہ میں نے اسے اجازت دے دی۔ وہ خوش ہو گیا اور اس نے کہا کہ وہ صرف دو منٹ رکے گا۔ مجھے ایسی کوئی جلدی نہیں تھی، اس لیے میں نے زیادہ خیال نہ کیا۔ راستے میں بچی ٹھہری پر اس نے ٹیکسی ایک پتلی سی گلی میں موڑ لی پھر ایک چھوٹے سے مکان کے

دروازے پر رک گیا۔ مجھ سے ایک منٹ کا کہہ کر وہ اندر چلا گیا۔ دو تین منٹ کے بعد وہ باہر نکلا تو ایک عورت اس کے ساتھ تھی جو غالباً اس کی بیوی تھی۔ میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس اس عورت کے ہاتھ میں ایک گلاس تھا۔ وہ میری کھڑکی کے قریب آئی اور اس نے بڑی لجاجت سے وہ گلاس میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے انکار کیا تو اس نے کہا۔ ”مہم غریب کوئی اور خدمت تو نہیں کر سکتے بی بی ہمارے گھر کا پانی تو پی لو۔ نیبو کا پانی ہے، ٹھنڈک پڑ جائے گی۔“

اس نے یہ جملہ کچھ اس طرح کہا تھا کہ میں انکار نہ کر سکی اور وہ گلاس اس کے ہاتھ سے لے کر ایک ہی گھونٹ میں پی گئی۔ ٹیکسی والے نے ٹیکسی اسٹارٹ کرتے ہوئے میرا شکریہ ادا کیا اور گاڑی چلا دی۔ پھر..... پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ آنکھ کھلی تو میں اپنے گھر میں تھی۔ اماں نے بتایا کہ ٹیکسی والا مجھے وہاں چھوڑ گیا تھا۔ اس نے اماں سے کہا تھا کہ شاید گزری سے بے ہوش ہو گئی ہوں۔ ٹیکسی والے نے اماں کی مدد سے مجھے گھر میں لا کر لٹایا اور خود واپس چلا گیا۔ اس نے کرایہ بھی نہیں لیا۔ میری آنکھ جیسے ہی کھلی اور معاملہ میری سمجھ میں آیا تو میں نے آپ کو فون کر دیا۔ میڈم یہ سب کچھ اس انداز میں ہوا تھا کہ میں کچھ کر ہی نہیں سکتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ مجھے جان بوجھ کر کوٹھی پہنچنے سے روکا گیا تھا۔“ وہ دم لینے کو رکی اور سائڈ ٹیبل پر پڑا گلاس اٹھالیا جس میں پانی تھا۔
”ہاں..... اور روکنے والے جو کچھ چاہتے تھے وہ انہوں نے کر لیا۔“

”جی! کیا..... کیا مطلب؟“

پھر فاریہ نے اسے تمام قصہ سنا دیا۔ یہ سن کر کہ زاریہ اور انکل دونوں اسپتال میں ہیں اس کا رنگ سفید ہو گیا۔ اس کا ہاتھ کانپنے لگا اور اس نے گلاس ٹیبل پر رکھ دیا۔

”سوری۔ سوری میڈم، یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا ہے۔“

”نہیں عذرا..... تم کیا کر سکتی تھیں۔ وہ لوگ بہت چالاک ہیں۔ ویسے ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ پروگرام لیک آؤٹ کیسے ہو گیا؟“ فاریہ نے چہیتے ہوئے لمبے میں کہا۔ اس کی تیز نگاہیں عذرا کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ لگتا تھا جیسے اسے عذرا کی کہانی پر یقین نہ آیا ہو۔

”آں.....؟“ عذرا چونک پڑی اور پھر شاید وہ فاریہ کا مطلب سمجھ گئی۔ اس کی

رکنا نہیں چاہیے۔“ عذرا نے پُرسوج انداز میں کہا۔
وہ ٹھیک کہتی تھی۔ یہی خیال مجھے بھی آیا تھا مگر میں فاریہ کی تسلی کرانا چاہتا تھا۔
دوسری طرف فون کی بیل بجنے لگی۔ کچھ دیر بعد کسی نے ریسور اٹھالیا۔
”ہیلو..... کون؟“

”وصی!“ دوسری جانب سے آواز آئی۔

میں نے فاریہ کا حکم ان تک پہنچا دیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ اسے لے کر پہنچ رہے ہیں۔ میں نے ریسور کریڈل پر رکھ دیا اور فاریہ کو بتایا کہ وصی صاحب لفٹ مین کو لے کر آرہے ہیں۔

فاریہ نے حمیدہ بی بی سے چائے کے لیے کہا اور ہم وہیں بیٹھ کر وصی صاحب کا انتظار کرنے لگے۔ دس منٹ بعد ہی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے بڑھ کر ریسور اٹھالیا۔ دوسری جانب توقع کے مطابق وصی صاحب بول رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ لفٹ خالی ہے اور لفٹ مین کا کمرہ بھی خالی ہے۔

”ہوں؟“ فاریہ نے استفسار کیا نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا اور وصی صاحب سے کہا۔ ”آپ ذرا معلوم کرائیں کہ وہ کہاں ہے اور ہاں اس کا نام کیا تھا؟“

”ادریس“..... دوسری طرف سے وصی صاحب نے جواب دیا۔ ”اس کا نام ادریس محمد تھا۔ وہ کرشن نگر کا رہنے والا تھا۔ میں ایڈریس ڈھونڈتا ہوں پھر آپ کو بتاؤں گا ویسے مائنڈ نہ کریں تو مجھے بتائیں گے کہ معاملہ کیا ہے؟“

”آپ میڈم سے بات کر لیں۔“ یہ کہہ کر میں نے ہاتھ پیس پر ہاتھ رکھا اور فاریہ کو بتایا کہ وصی صاحب کیا پوچھ رہے ہیں۔

”ہاں مسٹر وصی! جی..... آپ کیسے ہیں؟“

پھر کچھ دیر وہ کچھ سنتی رہی۔

”جی وصی صاحب معاملہ ذرا سنگین نوعیت کا ہے ورنہ وہ اس وقت غائب نہ ہوتا۔ بہر حال..... جی..... ٹھیک ہے آپ تلاش کر کے بتائیں۔“ پھر اس نے خدا حافظ کہہ کر ریسور رکھ دیا۔ اسی وقت حمیدہ بی بی چائے لے آئی۔ اس کے چائے بنانے کے دوران

آنکھوں میں لمحہ بھر کو دکھ بھر گیا۔ اسے فاریہ کے اس انداز سے دکھ پہنچا تھا۔ بالکل ویسے ہی جیسے کچھ دیر پہلے مجھے پہنچا تھا۔ مگر فاریہ بھی تو مجبور تھی۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہو رہا تھا وہ اگر میرے ساتھ بھی ہوتا تو شاید میں بھی یہی کچھ سوچتا۔
”ہاں عذرا!..... یہ بات تمہیں مجھے اور اقبال ہی کو معلوم تھی.....“

پھر.....

”سوری میڈم! ایک چوتھا شخص بھی اس پروگرام سے واقف ہو گیا تھا۔ ہم تینوں کی موجودگی ہی میں۔“

”کیا مطلب؟ میرے خیال میں یہ گفتگو میرے کمرے میں ہوئی تھی اور اس وقت وہاں کوئی بھی چوتھا شخص موجود نہیں تھا۔“

”یقیناً..... آپ کے کمرے میں کوئی چوتھا شخص موجود نہیں تھا میڈم مگر وہ لفٹ مین موجود تھا۔ جب آپ مجھے ایڈریس بتا کر کچھ ہدایات بھی دے رہی تھیں۔ اگر آپ کو اقبال پر بھروسہ ہے تو مجھے یقین ہے کہ یہ اطلاع دشمنوں کو دینے والا وہی لفٹ مین ہو گا۔“

اس کی بات سن کر میں اور فاریہ دونوں ہی اچھل پڑے۔ ہم دونوں میں سے کسی کا دھیان اس طرف نہیں گیا تھا۔

”اوہ..... عذرا!..... تم واقعی ذہین ہو۔“ فاریہ نے پُرجوش لہجے میں کہا اور میری طرف اس انداز میں دیکھا جیسے وہ اپنے اس انتخاب پر مجھ سے داد لینا چاہتی ہو۔

”اور آپ کے ساتھ پُر خلوص بھی میڈم۔ آپ کبھی میری وفاداری پر شبہ نہ کیجئے گا۔ مجھے..... مجھے دکھ ہو گا۔“

”سوری عذرا لیکن سوچو اگر میری جگہ تم ہوتیں تو.....“ فاریہ نے اچانک جملہ ادھورا چھوڑ دیا پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ”اقبال وصی صاحب کو فون کرو۔ ان سے کہو کہ وہ لفٹ مین کو پکڑ کر فوراً یہاں لے آئیں۔ انہیں اور کچھ نہ بتانا لیکن یہ ہدایت کر دینا کہ وہ فرار نہ ہونے پائے۔“

”اوکے میڈم۔“ میں نے مستعدی سے جواب دیا اور فون کی طرف بڑھ گیا۔

”میرا خیال ہے میڈم کہ اب وہ نہیں ہو گا۔ ایسی حرکت کرنے کے بعد اسے وہاں

فاریہ نے لپک کر مجھ سے ریسور چھین لیا۔ پھر شاید فاریہ نے بھی وہ خوشخبری سن لی۔ اس کی ویران آنکھوں میں ایک دم زندگی بھر گئی۔ ”کیا میں اس سے مل سکتی ہوں ڈاکٹر..... ہاں ابھی.....“

دوسری طرف سے شاید ڈاکٹر نے اسے اس وقت نکلنے سے باز رکھا تھا۔ وہ مایوس سی ہو گئی۔ ”اوکے ڈاکٹر، لیکن میں سویرے ہی پہنچ جاؤں گی۔“ پھر کچھ دیر تک وہ ریسور کلاں سے لگائے رہی۔

میں عذرا کے قریب جا بیٹھا۔ جو اب خالی پیالی میں اس طرح گھور رہی تھی جیسے وہ اس میں کچھ تلاش کر رہی ہو۔ کچھ دیر بعد فاریہ بھی ریسور کریڈل پر رکھ کر ہمارے قریب آ بیٹھی۔

”میڈم، میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے؟“ عذرا نے گہیرے لہجے میں کہا۔ ہم دونوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کے لہجے میں ٹھہراؤ اور عزم تھا۔

”کیا مطلب؟“ فاریہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

”میں..... میں جاؤں گی بہادر کے پاس۔“

”دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا..... تمہیں شاید اندازہ نہیں کہ وہ لوگ کس قدر چالاک اور سفاک ہیں۔“

”مجھے یقین ہے میڈم کہ وہ لوگ چالاک اور سفاک ہوں گے مگر میں پھر بھی وہاں جانے کا فیصلہ کر چکی ہوں۔“ اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

فاریہ کچھ دیر تک اسے غور سے دیکھتی رہی پھر اس نے لمحہ بھر کو میری طرف دیکھا۔

”آپ وہاں کیوں جانا چاہتی ہیں؟“ میں نے ایک دم اس سے سوال کیا۔

”میرا خیال ہے کہ میں وہاں رہ کر میڈم کی اور زاریہ کی حفاظت کر سکتی ہوں۔“

”مگر میڈم اور زاریہ کے لیے آپ خود کو خطرے میں کیوں ڈال رہی ہیں؟“

میرے اس سوال سے عذرا کے چہرے پر ناگواری چھا گئی۔ اس کے جڑے بھنچ گئے اور آنکھوں میں سرد مہری تیر گئی۔

”مسٹر اقبال کیا آپ مجھ پر کسی قسم کا شک کر رہے ہیں؟“

”سویری مس عذرا، یہ شک نہیں، ایسے حالات میں اس طرح کا سوال کرنا ضروری

گہری خاموشی چھا رہی۔ گہرے میں صرف برتنوں کے ٹکرانے کی آواز تھی یا گھڑی کی ٹک ٹک کی آواز کمرے میں زندگی پھیلا رہی تھی۔ حمیدہ چائے بنا کر چلی گئی۔ فاریہ خلا میں کچھ تلاش کر رہی تھی۔ عذرا خاموشی سے چائے کی پیالی میں سے اٹھتی ہوئی بھاپ کو تک رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ زاریہ زندہ ہے یا مر چکی۔

ڈاکٹر طارق نے اس کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی اور اس کی یہی خاموشی مجھے پریشان کیے ہوئے تھی۔ ہمیں تو ابھی تک یہی معلوم نہیں ہوا تھا کہ زاریہ کو ایسی کیا چیز دی گئی تھی جس سے وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس کا ہوش میں آنا بہت ضروری تھا اس لیے اس کی زندگی سب کے لیے ضروری تھی مجھے اندازہ تھا کہ ایک اس کے نہ رہنے سے اس پورے گھر کو تباہی کھا جائے گی۔ اکل زندہ نہ رہیں گے اور فاریہ وہ تو انسان سے کسی طوفان میں تبدیل ہو جائے گی۔ میں نے دل ہی دل میں اس کی زندگی کی دعا مانگی۔

”میڈم۔ آپ پولیس کو اطلاع.....“

”نہیں.....“ فاریہ نے عذرا کی بات کاٹ دی۔ ”میں ان درندوں سے خود ہی نمٹنے کی صلاحیت رکھتی ہوں عذرا، میں اتنی آسانی سے تباہ نہیں ہو جاؤں گی۔ وہ مجھے ترنوالہ سمجھ رہے ہیں، بہت جلد انہیں معلوم ہو جائے گا کہ میں کیا ہوں۔ مجھے اپنی زندگی کی کوئی پرواہ نہیں اور جسے اپنی زندگی کی پرواہ نہیں رہتی عذرا بیگم! وہ نہ موت سے ڈرتا ہے اور نہ ان ہتھکنڈوں سے، اگر زاریہ کو کچھ ہو گیا تو میں بہادر کا جینا دو بھر کر دوں گی، وہ مجھ سے موت کی بھیک مانگے گا عذرا مگر میں..... میں اسے موت بھی نہیں دوں گی۔ تم دیکھ لینا..... دیکھ لینا تم کہ.....“

فون کی گھنٹی کی آواز میں اس کی آواز دب گئی۔ میں نے لپک کر ریسور اٹھالیا۔ میرا خیال تھا کہ دوسری طرف وصی صاحب ہوں گے مگر ڈاکٹر طارق کی آواز سن کر میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

”لیس.....!“ میں نے سسے ہوئے لہجے میں کہا۔

”خوشخبری ہے اقبال۔ زاریہ کو ہوش آ گیا ہے۔ جس وقت تم لوگ گئے ہو مجھے ایک فیصد بھی امکان نہیں تھا۔“

”اوہ تھینکس گاڈ.....“ میرے منہ سے اطمینان بھری سانس نکل گئی۔

سمجھا جاتا ہے۔“

وہ کچھ دیر اپنے کو نارمل کرنے کی کوشش کرتی رہی پھر اس نے ایک لمبا سانس لیا اور بولی۔ ”مس فاریہ میری محسن ہیں مسٹر اقبال، جو خلوص اور محبت مجھے ان سے ملی ہے میں زندگی بھر اس سے محروم رہی ہوں۔ آپ شاید نہیں جانتے کہ مس فاریہ نہ ہوتیں تو میں اس وقت کن عذابوں میں گھری ہوتی، دوسری بات یہ کہ میں دنیا میں بالکل تنہا ہوں۔ میری زندگی تو ویسے ہی رائیگاں ہے اگر ایسی ناکارہ زندگی کو میں نے کسی کی خاطر گزار دیا اور کچھ نیکی کر لی تو سمجھوں گی کہ میرے کائنات میں اتارے جانے کا بھی کوئی مقصد تھا۔ دنیا کا جو رنگ میں نے اب تک دیکھا ہے وہاں میں نہیں سمجھتی کہ مجھے پیار، سکھ یا وہ زندگی میسر ہو سکتی ہے جو ہمارے یہاں لاکھوں عورتوں کو میسر ہے۔ میں اپنی اس بے نشان زندگی کو کوئی نام دینا چاہتی ہوں مسٹر اقبال، آپ اگر میری کسی قسم کی آزمائش کرنا چاہیں تو میں حاضر ہوں۔“ آخری جملے میں بھرپور طنز تھا۔

میں اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوا تھا اور خاموشی سے اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا کہ وہ اچانک بول اٹھی۔ ”آپ بھی تو میڈم کے لیے خود کو خطرے میں ڈالے ہوئے ہیں مسٹر اقبال..... کیا میں اس کی وجہ پوچھ سکتی ہوں۔ آپ کا بھی تو ان لوگوں سے کوئی رشتہ نہیں.....“

اس کے سوال نے مجھے اس کے جذبوں کی سچائی سے روشناس کرا دیا۔ وہ ٹھیک ہی تو کہتی تھی۔ جب میں فاریہ اور اس کے مختصر سے گھرانے کے لیے خود کو وقف کر رہا تھا تو کیا اس کے جذبے جھوٹے ہو سکتے ہیں؟

”او کے عذرا، مگر یہ بتاؤ کہ تم وہاں جا کر کروگی کیا اور وہاں تم کیسے جاؤ گی؟“ فاریہ نے پوچھا۔

”کیسے جاؤں گی؟ یہ تو آپ بتائیں گی اور کیاں کروں گی؟ یہ فیصلہ میں وہاں جا کر اور حالات دیکھ کر ہی بتا سکتی ہوں۔ اپنے وہاں جانے کا مقصد میں نے بتا دیا ہے، اب آپ ہی میرے متعلق فیصلہ کریں گی۔“

”مگر میں وہاں تمہیں بھیج کر تم سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتی۔ اقبال کی بات دوسری ہے۔ وہ مرد ہے، باہمت ہے اور حالات سے نمٹنا جانتا ہے، میں اتنی خود غرض نہیں ہوں

عذرا، کہ اپنی خاطر تمہیں کسی خطرے میں دھکیل دوں۔“

”میڈم، اس خطرے میں کودنے کا فیصلہ میرا ہے، آپ کا نہیں۔ آپ صرف مجھے طریقہ بتائیے کہ میں کس طرح ان لوگوں میں شریک ہو سکتی ہوں، اور دوسری بات یہ کہ میں اقبال کو وہاں بھیجنے کا مشورہ نہیں دوں گی۔ اقبال کے چلے جانے سے آپ، زاریہ اور بیگ صاحب بالکل تنہا رہ جائیں گے۔ جو کچھ آپ اقبال کو وہاں بھیج کر حاصل کرنا چاہتی ہیں، وہ میں بھی کر سکتی ہوں۔“

عذرا بڑی سلجھی ہوئی باتیں کر رہی تھی۔ فاریہ کے بعد میں نے یہ دوسری لڑکی دیکھی تھی جو ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ نڈر بھی تھی۔

فاریہ نے مجھے گہری نگاہوں سے دیکھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بھی عذرا کی باتوں کی قائل ہو گئی ہو۔ ”اقبال تم بتاؤ..... تمہارا کیا مشورہ ہے؟“ فاریہ نے تھکے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”میرا خیال ہے کہ جب یہ خود ہی وہاں جانے کو تیار ہیں تو ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ البتہ یہ بات بھی یہ ذہن نشین کر لیں کہ ہمارے لیے ان کی جان بہت زیادہ قیمتی ہے، اگر ایسا کوئی خطرہ محسوس کریں تو وہاں سے نکلنے یا ہمیں اطلاع دینے کی کوشش ضرور کریں۔“

”ٹھیک ہے عذرا!“ کچھ دیر خاموش رہ کر فاریہ نے کہا۔ ”تم میری فیکٹری میں کام کرتی رہی ہو۔ اکاؤنٹ سیکشن میں بھی تم نے کام کیا ہے، ایک یہی صورت ہے کہ تم جا کر سیماں سے ملو اور اسے یہ بتاؤ کہ تم ملازمت چاہتی ہو۔ یہ یاد رکھو کہ ان کی دواؤں کی فیکٹری ہے، جہاں مختلف قسم کی دوائیں بنتی ہیں اور ملک میں اور ملک سے باہر سپلائی کی جاتی ہیں۔ میں کل تمہیں ایسے پمفلٹ فراہم کر دوں گی جس سے تم دواؤں کی فیکٹری کے متعلق کافی معلومات حاصل کر لو گی۔“

”ایک منٹ میڈم!“ عذرا نے ٹوکا۔ ”یہ دواؤں کی فیکٹری کہاں ہے؟“

”لاہور سے کچھ دور، میرا خیال ہے کہ تقریباً بیس بائیس کلومیٹر پر ایک بہت بڑی فیکٹری ہے۔ بہادر صاحب اس کے ڈائریکٹر ہیں، یوں تو سیماں بھی ڈائریکٹر ہیں شامل ہے مگر وہی تمام کام کی دیکھ بھال بھی کرتی ہے۔ مسٹر موہن چند جو ہندو ہیں وہ بھی اس فیکٹری

عرصہ پہلے دواؤں کی فیکٹری میں کام کیا ہے۔ لاہور میں نہیں کراچی میں۔ کراچی کی ایک کمپنی کے ڈائریکٹر سے میری اچھی دوستی ہے اس کمپنی کا نام اے کے کمپنی ہے، اس کمپنی کا حوالہ دینا اور بتانا کہ صفدر صاحب نے تمہیں اپائنٹ کیا تھا۔ میں انہیں فون کر دوں گی۔ ٹھیک.....؟“

”تھینک یو میڈم، آپ نے میرا کام بہت آسان کر دیا ہے۔ اب مجھے زیادہ دشواری نہیں ہوگی، لیکن کیا وہ نہیں سوچے گی کہ میں آپ کی فیکٹری سے نکل کر سیدھی اس کے پاس کیوں پہنچ گئی۔“

”لیکن تم ایسا تو نہیں کرو گی۔“ فاریہ مسکرائی۔

”کیا مطلب؟“ عذرا نے حیران ہو کر پوچھا۔

”یعنی تم سیدھی اس کی فیکٹری نہیں جاؤ گی۔ کچھ دن تم دوسرے دفاتروں، فیکٹریوں اور ملز کے چکر کاٹو گی۔ ہر جگہ درخواست دو گی، پھر وہاں پہنچو گی۔“

”اوہ۔ گڈ، یہ تو خیال ہی نہیں آیا مجھے۔“ عذرا خوش ہو گئی۔ مجھے بھی فاریہ کی ذہانت پر رشک آ رہا تھا۔

”اوکے میڈم، مجھے اجازت دیں۔“ عذرا اٹھتے ہوئے بولی۔

اسی وقت حمیدہ ٹرائی لیے اندر داخل ہوئی۔

”ارے ایسے کیسے؟ چائے آگئی ہے پی کر جاؤ۔“

عذرا بیٹھ گئی۔ سینڈوچ اتنے خوب صورت بنائے تھے کہ دیکھتے ہی مجھے بھی بھوک لگنے لگی۔ ہم خاموشی سے سینڈوچ کھاتے اور چائے پیتے رہے۔ چائے پی کر عذرا اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تم کیسے جاؤ گی؟“ فاریہ نے پوچھا۔

اس نے گھڑی دیکھی۔ ”میرا خیال ہے رکشا ٹیکسی مل جائے گی!“

”پھر بھی دیر بہت ہو چکی ہے۔ ممکن ہے نہ ملے۔ اقبال تمہیں چھوڑ آئے گا۔“

عذرا نے انکار نہ کیا۔ میں کھڑا ہو گیا۔ گاڑی کی چابی میرے پاس تھی۔ ”میڈم آپ حمیدہ کو اپنے کمرے میں بٹھائیں۔ میں چوکیدار کو چوکنا رہنے کے لیے کہہ دوں گا۔ میرے آنے تک آپ کمرے سے باہر نہ آئیں تو مناسب ہو گا۔“ میں نے سنجیدگی سے فاریہ کو

کے ڈائریکٹرز میں شامل ہیں۔ باقی لوگوں کے بارے میں، میں نہیں جانتی۔ موہن چند کے بارے میں اتنا بتا دوں کہ ان کا تعلق بنیا ذات سے ہے، یہ تقسیم ہند سے پہلے بھی میرپور خاص سندھ میں رہتے تھے۔ اور آج بھی ان کی فیملی وہاں مقیم ہے۔ میرپور خاص کے نواح میں ان کے باغات ہیں، ان کے دو بیٹے امریکہ میں ہیں جو وہاں پر اس فیکٹری کے کام نمٹاتے ہیں، اور ان کمپنیز سے رابطہ رکھتے ہیں جو سیموں کی فیکٹری کو وہ پاؤڈرز اور وہ کیمیکل فراہم کرتی ہیں جو دواؤں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ موہن چند خود بھی اکثر وہاں جاتے رہتے ہیں۔ موہن چند کی ایک بیٹی ہے جس کی شادی ایک پارسی ڈاکٹر سے ہوئی ہے اور وہ کراچی میں کلفٹن کے علاقے میں رہتی ہے۔ بہادر صاحب کی ساری فیملی یہیں ہے، اور سیموں اکیلی ہے۔ اس کی ماں کے مرنے کے بعد تمام کاروبار بہادر صاحب نے ہی سنبھالا تھا۔ ایک بات یاد رکھنا عذرا، کہ صورت سے بے حد بھولی بھالی اور سیدھی سادی سیموں قیامت کی چالاک اور شاطر ہے۔ اس کی معصومیت سے کبھی دھوکا نہ کھانا اور کبھی اس کو بے خبر نہ سمجھنا۔“ فاریہ دم لینے کو رکی۔ اس نے دیوار پر لگے ایک ٹن کو دبایا۔

کچھ دیر بعد حمیدہ بی بی اندر آگئی۔ ”جی!“

”حمیدہ مجھے پانی پلاؤ اور چائے کے ساتھ کچھ کھانے کو لے آؤ۔ ہو سکے تو سینڈوچ بنا دو۔“

حمیدہ سر ہلا کر واپس چلی گئی۔ کمرے میں ایک بار پھر گرا سناٹا چھا گیا۔ میں اور عذرا ہمہ تن گوش تھے۔ مجھے حیرت تھی کہ فاریہ کی معلومات سیموں اور بہادر کے سلسلے میں بھی کافی تھیں۔

”اور عذرا، وہاں جا کر کچھ عرصے کے لیے ہمیں بھول جانا اس لیے کہ سیموں جب تک کسی سے پوری طرح مطمئن نہ ہو جائے اس پر اعتماد نہیں کرتی، اور ایسا ہونا ہی چاہیے اس کی جگہ اگر میں بھی ہوتی تو یہی کرتی۔ میں کوشش کروں گی کہ خود ہی تم سے کسی طرح رابطہ قائم کروں۔ یہاں سے جانے کے بعد تم قطعی طور پر ہمیں بھول جاؤ گی۔ گھر میں بھی یہی پوز کرنا کہ جیسے اب تمہاری مجھ سے لڑائی ہو گئی ہے۔ میں نے تمہیں فیکٹری میں سب کے سامنے ذلیل کیا ہے اس لیے تم اب میرا نام بھی سننا پسند نہیں کرتیں۔ یہ بہت ضروری ہے۔ اس کے بعد تم وہاں اپلائی کرنا۔ کہہ دینا کہ تم نے کچھ

ہدایت دی۔

وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ ”تم تو ایسے کہہ رہے ہوں جیسے میں بچی ہوں۔ میں بڑے بڑے حالات سے نمٹی ہوں مسٹر اقبال۔ ایک مرتبہ میں نے خود کو اغوا کرنے والے تین غنڈوں کو مار مار کر بھگا دیا تھا۔ تم میری فکر نہ کرو۔ میں اگر اتنی آسان ہوتی تو وہ لوگ زاریہ کو پریشان کرنے کی بجائے مجھ سے ٹکرانے کی کوشش کرتے۔ ویسے یہ ناکام کوشش کر چکے ہیں۔ تم جاؤ جلدی آجانا۔“

میں فوراً ہی کمرے سے باہر آگیا۔ میں نے پہلے چوکیدار کو بلا کر اسے بتایا کہ میڈم ایکی ہیں اس لیے وہ چوکس رہے پھر میں نے گاڑی اشارت کی اور مین دروازے کے سامنے لے آیا جہاں فاریہ اور عذرا کھڑی تھیں۔ فاریہ عذرا کو کچھ سمجھا رہی تھی۔ چند منٹ کے انتظار کے بعد عذرا گاڑی میں آ بیٹھی اور میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ سڑک سنسان تھی۔ میں تیز رفتاری سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ ہم دونوں ہی خاموش تھے۔ کچھ ہی دیر بعد ہم عذرا کے گھر پہنچ گئے۔

”میڈم کا خیال رکھو گا۔“ عذرا نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔

”جی!“ میں نے مختصر جواب دیا۔

وہ خدا حافظ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ میں نے گاڑی آگے بڑھا دی مگر کچھ دور ایک لکڑی کے کھوکے کے پیچھے روک لی۔ میں شیشے میں سے عذرا کے گھر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دروازہ ابھی تک نہیں کھلا تھا اور عذرا غالباً بار بار کال بیل کا بٹن دبا رہی تھی۔ مجھے بے چینی شروع ہو گئی۔ میں گاڑی اشارت کر کے اس کے گھر کی طرف موڑنے ہی والا تھا کہ دروازہ کھل گیا۔ اندر سے آتی ہوئی روشنی سڑک پر پھیل گئی۔ میں نے عذرا کو اندر داخل ہوتے دیکھا اور اطمینان بھرا سانس لے کر گاڑی آگے بڑھا دی۔

جس تیز رفتاری سے میں یہاں آیا تھا اسی تیز رفتاری سے میں واپس پہنچ گیا۔ چوکیدار نے مجھے دیکھ کر گیٹ کھول دیا۔ میں نے گاڑی پورچ میں پارک کر دی اور اتر کر ڈرائنگ روم میں آگیا۔ فاریہ ابھی تک وہاں بیٹھی تھی۔ حمیدہ بی بی بھی وہیں قالین پر بیٹھی اس سے باتیں کر رہی تھی۔ مجھ دیکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ٹھیک ہے حمیدہ تم جا کر سو جاؤ۔“ فاریہ نے کہا۔

حمیدہ سر ہلاتی ہوئی ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔

”مسٹرو صی نے دوبارہ فون نہیں کیا اقبال!“

”جی میں معلوم کرتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا اور ریسور اٹھا کر مسٹرو صی کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ مسٹرو صی کیوں کہ تنہا تھے اسی لیے وہ فیکٹری کے احاطے میں بنے اس کالج نما گھر میں رہتے تھے جو عام طور پر ریگسٹ ہاؤس کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ وہاں فون بھی تھا اور ان کے وہاں رہنے سے بے حد سہولت تھی۔ ایک تو یہ کہ وہ رات کی شفٹ کو بھی دیکھ لیتے تھے دوسرے اس قسم کا کوئی کام پڑ جانے پر بھی کام آتے تھے۔

میں نمبر ڈائل کرنے کے بعد دوسری طرف سے ریسور اٹھائے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ چند منٹ بعد ہی ریسور اٹھا لیا گیا۔ دوسری طرف مسٹرو صی تھے۔

”جی مسٹرو صی آپ نے جواب نہیں دیا۔ میڈم انتظار کر رہی ہیں۔“

”جی سوری“ دراصل وہ رجسٹر نہیں مل رہا تھا جس میں ادریس محمد کا ایڈریس اور اس کے دوسرے کوائف درج تھے۔“

”اب مل گیا؟“ میں نے ان کی بات کاٹ کر پوچھا۔

”جی سر مل گیا“ آپ نوٹ کریں۔“

میں نے فاریہ کو قریب رکھی ٹیبل پر پین اور کانڈ کی طرف اشارہ کیا۔ فاریہ نے فوراً ہی پین اور کانڈ میری طرف بڑھا دیا۔ پھر صی صاحب نے مجھے ادریس کا ایڈریس لکھوایا۔ یہ ایڈریس کرشن نگر کا تھا۔ میں نے ایڈریس لکھنے کے بعد مسٹرو صی سے اجازت لی اور ان کا شکریہ ادا کر کے ریسور رکھ دیا۔

فاریہ نے میرے ہاتھ سے کانڈ لے لیا۔

”ہوں۔ کرشن نگر اتنا بڑا نہیں کہ اسے تلاش کرنا مشکل ہو۔ تم نے کرشن نگر دیکھا ہے؟“

”جی میڈم سلطان وہیں رہتا ہے۔ میں دوبار اس کے پاس جا چکا ہوں۔“

”سلطان؟“ اس نے استفہامیہ انداز میں مجھے دیکھا۔

”جی وہ راجہ کا ساتھی جسے راجہ نے میرے گاؤں ماں اور سوہنی وغیرہ کی خیریت معلوم کرنے بھیجا تھا۔ وہ یہاں آیا تھا۔ آپ نے شاید دیکھا ہو؟“

”اچھا ہاں..... وہ..... اودہ اقبال میں بہت شرمندہ ہوں کہ تم سے وعدہ کرنے کے باوجود تمہارے گاؤں نہ جاسکی۔“

”نہیں میڈم شرمندہ ہونے کی بات نہیں۔ میں حالات دیکھ رہا ہوں۔“

”اقبال میں نے تم سے وعدہ کیا تھا۔ میں وہ وعدہ ضرور پورا کروں گی۔ فلیٹ تو لے لیا ہے میں نے وہ بند ہے اقبال وہ انشاء اللہ اسی وقت کھلے گا جب تمہاری ماں آئیں گی۔“

”آپ فکر نہ کریں میڈم..... میں انشاء اللہ خود جا کر ماں کو لاؤں گا۔ اب میں اقبال ہوں میڈم، بلا نہیں جو سیدھا سادا اور غلام ذہنیت کا مالک تھا۔ ظلم سننے کی عادت پڑ گئی تھی جسے۔“

”حالات معمول پر آتے ہی ہم دونوں چلیں گے اقبال، ویسے یہ حقیقت ہے کہ تم اب بلا نہیں رہے۔ اقبال! میں یعقوب کے سلسلے میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ تمہیں نیند تو نہیں آرہی؟“

”نہیں میڈم، ایسے حالات میں نیند کہاں آتی ہے۔ آپ بات کیجئے۔ اس سلسلے میں کچھ باتیں میرے ذہن میں بھی ہیں۔“

”میں تم سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ یعقوب جو کچھ کہہ رہا ہے وہ سچ ہے یا نہیں؟“

”میرے خیال میں وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ سچ ہے میڈم، میں اپنے بارے میں کوئی دعویٰ تو نہیں کرتا پھر بھی مجھے کچھ اندازہ ہو جاتا ہے کہ بولنے والا سچ بول رہا ہے یا جھوٹ۔ بقول آپ کے یعقوب کافی عرصے سے آپ کے پاس ہے۔ اس حرکت سے پہلے اس نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی جس سے اس کی شخصیت مشکوک ہوئی ہو۔ اگر اس پر اعتبار کر کے دیکھ لیا جائے تو کچھ فرق نہیں پڑے گا بلکہ بات کھل جانے کے بعد وہ زیادہ محتاط رہے گا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ہمارے کام آئے۔“

”گڈ..... یہی بات میرے ذہن میں بھی تھی۔ دوسری بات یہ کہ عذرا پر تم کس حد تک اعتماد کر سکتے ہو؟“

”کہہ نہیں سکتا میڈم، جب تک ادریس ہمیں نہ مل جائے اور اصل بات سامنے نہ آجائے اس سلسلے میں کچھ بھی کہنا قبل از وقت ہو گا۔“

”ٹھیک..... بہر حال اسے بھی دیکھ لیں گے۔ وہ اگر ہمارے کام نہ آسکی تو ہمیں

نقصان بھی نہیں پہنچا پائے گی۔ سوائے اس کے کہ یہ بتا دے کہ ہم ان لوگوں کے بارے میں کافی کچھ جانتے ہیں۔“

”تم ایک کام کرو، یہ سلطان کیسا آدمی ہے؟“

”نڈر اور بے لوث ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”اگر کسی طرح یہ تیار ہو جائے تو ہم اسے عذرا کے پیچھے لگا کر خاصی معلومات حاصل کر سکیں گے اور اس کی حفاظت کا مسئلہ بھی حل ہو جائے۔ تمہیں سیمال جانتی ہے۔ میرے باقی آدمی اس قابل نہیں کہ ذہانت سے اس کو قابو کر سکیں پھر صورت سے سب ہی بد معاش لگتے ہیں، اس کے لیے کوئی ایسا آدمی چاہیے ہے جو واقعی نڈر اور بے لوث ہو۔ ذہن ہو اور چہرے مرے سے شریف آدمی لگتا ہو۔ اگر سلطان میں یہ خوبیاں ہیں تو اسے تیار کرنے کی کوشش کرو۔“

”اسے تیار کرنے کے لیے اسے بہت کچھ بتانا پڑے گا میڈم، اگر آپ اجازت دیں تو میں اس سے بات کروں۔ وہ بنیادی طور پر شریف آدمی ہے ظالم کا بہت بڑا دشمن ہے، اسے اگر اصل بات معلوم ہو گئی تو وہ فوراً تیار ہو جائے گا۔“

”راز کو راز رکھ سکے گا؟“ فاریہ نے پوچھا۔

”یقیناً۔“

”تو پھر ٹھیک ہے۔ تم بات کرو۔“

”میں کل ادریس کو تلاش کرنے جاؤں گا تو اس سے مل لوں گا۔ پچھلی بار میں نے اسے گاؤں بھیجا تھا ہفتہ بھر سے زیادہ ہو چکا ہے وہ آگیا ہو گا۔“

”ٹھیک..... تم چاہو تو کچھ دیر آرام کرو۔ ہمیں صبح سویرے اسپتال جانا ہے۔“

”آپ بھی کچھ دیر سولیں۔“

”نیند تو شاید نہ آئے مگر آرام کروں گی۔“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ میں اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنے کمرے میں چلی گئی تو میں بھی اپنے کمرے میں آگیا۔ میں نے کپڑے بدلے اور بستر پر لیٹ گیا۔

آنکھیں موندتے ہی سوہنی کا مسکراتا چہرہ نگاہوں میں گھوم گیا مگر فوراً ہی ماں کی وحشت بھری نگاہوں نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا وہ جانے کس حال میں ہو گی۔ اسے آج

”میں تو ٹھیک ہو چکا ہوں بیٹا۔ میں خود بھی گھر جانا چاہتا ہوں۔ یہ اسپتال کا ماحول تو اچھے بھلے آدمی کو بیمار کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ ابھی صبح صبح برابر والے کمرے میں مقیم صاحب انتقال کر گئے۔ خدا کی پناہ ایسا شور اٹھا اس کمرے سے کہ میں دہل گیا۔ موت کس قدر ظالم چیز ہوتی ہے۔ نہ رشتے دیکھتی ہے نہ محبتیں، سارا گھر تڑپ رہا تھا اور مرنے والے کے چہرے پر دنیا جہاں کا سکون چھایا ہوا تھا۔“

”اوہ انکل پلینز۔ آپ وہاں کیوں گئے تھے؟“ فاریہ نے ناراض ہو کر پوچھا۔

”ہنگامے کی وجہ معلوم کرنے گیا تھا۔“

”نہیں انکل..... آپ کو وہاں نہیں جانا چاہیئے تھا۔ ٹھیک ہے میں ڈاکٹر طارق سے بات کرتی ہوں آپ کو واقعی یہاں نہیں رہنا چاہیئے۔“

”گڈ یہ بات کی باتم نے..... اور سنو، زاریہ کیسی ہے؟“

”وہ۔ ٹھیک ہے۔ بالکل ٹھیک ہے وہ.....“ فاریہ اس اچانک سوال سے بوکھلا

اٹھی۔

”یہیں اسپتال میں ہے!“

جی انکل۔ ابھی تو یہیں ہے، اس کے بارے میں ڈاکٹر طارق سے بات کروں گی۔ دراصل ان سے ابھی میری ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ ایمر جنسی وارڈ میں تھے۔“

”ہاں بیٹا، ہم دونوں گھر پر ہی رہیں گے۔ ایک نرس رکھ لیں گے مگر یہاں.....“

یہاں تو اس کے لیے زیادہ خطرہ ہے، طرح طرح کے لوگ آتے ہیں، کسی کے چہرے پر تو تو نہیں لکھا ہوتا نا کہ یہ کون ہے..... کیا ہے اور کیسا ہے، کہاں سے آیا ہے اور کیا کرنے آیا ہے۔“

”ٹھیک کہتے ہیں آپ۔“ فاریہ نے دھیرے سے کہا۔ اس کے چہرے پر پریشانی پھیلی ہوئی تھی۔

بیگ صاحب نے ٹھیک ہی تو کہا تھا۔ وہ لوگ جب بند کوٹھی تک پہنچ سکتے ہیں تو یہاں بھلا انہیں کون روکے گا۔

”آپ نے ناشتا کیا؟“ فاریہ نے بیگ صاحب سے پوچھا۔

”نہیں..... منگوایا ہے۔“

بھی میرا انتظار ہو گا اور میں انجانے چکروں میں بھنس کر رہ گیا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ سلطان سے خیریت ملے ہی میں جلد از جلد گاؤں جانے کی کوشش کروں گا۔ انہیں ایک مرتبہ یہاں لے آؤں تو سکون ہو جائے گا۔ یہ فیصلہ کر کے میں نے کروٹ لی اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔ دروازے پر ہونے والی دستک سے آنکھ کھلی، میں گڑبڑ کر بستر سے اتر پڑا۔ دروازہ کھولا تو حیدہ چائے لیے کھڑی تھی۔

”میڈم تیار ہیں اور آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔“ حیدہ نے چائے کا کپ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”بس میں ابھی آتا ہوں۔“

حیدہ چلی گئی تو میں نے جلدی جلدی چائے پی اور نہانے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد جب میں تیار ہو کر ڈرائنگ روم میں پہنچا تو فاریہ ناشتا کر رہی تھی۔

”صبح بخیر میڈم!“

”صبح بخیر، آؤ ناشتا کر لو۔“ اس نے مکھن سلائس پر لگا کر پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ہم نے ناشتہ کیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ صبح کے سوا سات بجے تھے۔ میں نے گاڑی نکالی اور ہم بیس منٹ بعد ہی اسپتال پہنچ گئے۔ استقبالیہ سے ہم نے بیگ صاحب کا روم نمبر معلوم کیا۔ ڈاکٹر طارق کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ ایمر جنسی وارڈ میں ہیں اور اس وقت بڑی ہیں۔ ہم استقبالیہ کاؤنٹر پر ان کے لیے پیغام چھوڑ کر بیگ صاحب کے کمرے میں پہنچ گئے۔

بیگ صاحب جاگ چکے تھے۔ نرس انہیں دوائیں دے رہی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی ان کے چہرے پر خوشی پھیل گئی۔

”اوہ۔ آؤ۔ بیٹا، میں تم لوگوں کی طرف سے بہت فکر مند تھا۔“

”ہماری فکر نہ کریں انکل..... بس آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔ آپ نہیں تھے تو گھر بہت خالی لگ رہا تھا۔“

فاریہ نے ان کی پیشانی پر پیار کرتے ہوئے جواب دیا اور ان کا ہاتھ تھام کر قریب کی کرسی پر بیٹھ گئی۔

ڈاکٹر یہ کہہ کر استقبالیہ کی طرف بڑھ گیا جہاں کاؤنٹر کے کونے پر فون رکھا تھا۔ میری نگاہیں اس ڈاکٹر کا تعاقب کر رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ فون سے فارغ ہو گیا تو مسکراتا ہوا میری طرف بڑھا۔

”جی اب فرمائیے، کیا نام ہے آپ کا؟“

”اقبال“ آپ بس میرا نام بتادیں وہ خود ہی آجائیں گے۔“

”اوکے“ آپ انتظار کریں۔“ وہ یہ کہہ کر اندر چلا گیا۔

میں وہیں کھڑا انتظار کرتا رہا۔ میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اچانک کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں اچھل پڑا۔

”اوہ ڈاکٹر طارق.....“ انہیں دیکھتے ہی میں بول اٹھا۔

”کیا ڈر گئے تھے آپ؟“ وہ مسکرائے۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا جیسے وہ خواہ مخواہ مسکرانے کی کوشش کر رہے ہوں۔

”نہیں ڈاکٹر، ایسے حالات کا اتنا عادی ہو چکا ہوں کہ اب تو ڈر بھی نہیں لگتا۔ ڈاکٹر..... میں سچ سننا چاہتا ہوں۔ حقیقت.....“ میں نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ میری بات کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ اس نے نگاہیں جھکا لیں۔ چند لمبے وہ کچھ سوچتا رہا۔ میں نے اسے تو کتنا مناسب نہ سمجھ۔ بس اس کے سامنے خاموش کھڑا رہا، اور میری یہی خاموشی اس کے جھوٹ کا پھندا بنی رہی۔

”وہ..... وہ اب تک بے ہوش ہے اقبال۔“ اسے سچ بولنا ہی پڑا۔ ”ہم اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بہت طویل بے ہوشی خطرناک ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے وہ..... طویل عرصے کے لیے کوما میں چلی جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ..... وہ ہوش میں آئے بغیر ہی.....“ وہ جملہ پورا کیے بغیر خاموش ہو گیا۔

”نہیں ڈاکٹر..... نہیں..... اسے ہوش میں آنا چاہیے۔ اگر وہ ہوش میں نہ آئی تو ہم کبھی بھی نہ جان سکیں گے کہ وہ..... وہ کون تھی جس نے اسے اس حال کو پہنچا دیا، اور پھر..... اسے کچھ ہو گیا ڈاکٹر تو..... نہ فاریہ بچے گی نہ بیگ صاحب.....“

پھر کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ ہم سب اپنی اپنی جگہ سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد ایک لڑکا ناشتالے آیا۔ ناشتے میں ایک ابلّا ہوا انڈا، ایک گلاس اورنج جوس اور ایک سلاکس تھا۔

”بھلا بتاؤ۔ اتنے لمبے چوڑے آدمی کو یہ ناشتا دیتے ہیں یہاں۔ کمزوری نہ بڑھے تو کیا ہو؟“ بیگ صاحب نے شوخ انداز میں کہا۔

میں اور فاریہ ہنس پڑے۔ بیگ صاحب اچھا خاصا ہیوی ناشتا کرنے والے آدمی تھے۔

”اچھا ہے اور بیمار پڑیں۔“ فاریہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”ذرا ذرا سی بات کو دل پر لے لیتے ہیں۔“

”توبہ ہے بھئی، ہمارے دادا کی بھی توبہ، کچھ بھی ہو، آدمی اپنے گھر میں ہنستا بولتا، کھانا پیتا مرے۔ بڑی تقویت ہوتی ہوگی مرنے کے بعد مگر یہاں اسپتال میں تو مرنے والا بے چارہ مرنے کے بعد بھی لاغر ہی رہتا ہو گا۔“

بیگ صاحب اس وقت بڑے ہشاش بشاش لگ رہے تھے، یہ دیکھ کر مجھے ان کی طرف سے تو اطمینان ہو گیا تھا مگر زاریہ کے بارے میں پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ فاریہ کی آنکھوں میں بھی کبھی کبھی فکر تیرتی مگر بیگ صاحب کی وجہ سے وہ جلد ہی خود کو سنبھال لیتی تھی۔ ہمیں آئے ہوئے دس منٹ گزر گئے تھے مگر ڈاکٹر طارق کا کہیں پتا نہ تھا۔ میں کافی دیر بیٹھا پہلو بدلتا رہا پھر مجھ سے برداشت نہ ہوا تو میں ان دونوں سے اجازت لے کر کمرے سے باہر آ گیا۔

میں لفٹ کے ذریعے نیچے پہنچا اور ایمرجنسی وارڈ کے دروازے کے قریب کھڑا ہو گیا۔ وہاں سے نکلنے والے ایک ڈاکٹر سے میں نے ڈاکٹر طارق کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے بتایا وہ اندر ہیں۔

”پلیز میرا ان سے ملنا بہت ضروری ہے۔ ان تک اگر میرا میسج پہنچ جائے تو.....“

”ایک منٹ۔ میں ابھی آتا ہوں۔ ایک اہم فون کرنا ہے پھر میں ڈاکٹر طارق تک آپ کا میسج پہنچا دوں گا۔“

”میں جانتا ہوں مسٹر اقبال، ہم پوری کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے کراچی سے ڈاکٹر تجل کو بھی بلوایا ہے۔ وہ آج شام کی فلائٹ سے یہاں پہنچ رہے ہیں۔ پریشانی صرف یہ ہے کہ فاریہ کو اس صورت حال سے زیادہ عرصے تک بے خبر نہیں رکھا جاسکتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کس طرح بتاؤں کہ وہ خود کو سنبھالے رہے اور ہمارے ساتھ پوری طرح تعاون کرے تاکہ ہم اس مشکل صورت حال سے نکل سکیں۔“

”اس کی فکر نہ کریں، اسے تو یہ سب کچھ بتانا اب ناگزیر ہو گیا ہے، مگر ڈاکٹر زاریہ کے ساتھ کیا ہوا ہے جس کی وجہ سے اس کی یہ حالت ہوئی ہے۔“

”اس کے سر میں شدید چوٹ لگی ہے۔ اسی چوٹ کی وجہ سے وہ بے ہوش ہوئی اور اب تک ہوش میں نہیں آئی ہے۔ ڈاکٹر تجل دماغ کے ماہر ہیں۔ ہم نے انہیں اسی لیے بلوایا ہے تاکہ وہ اس کا معائنہ کر کے کوئی فیصلہ کریں۔“

”آپ کا کیا اندازہ ہے ڈاکٹر، کیا ڈاکٹر تجل اسے ٹھیک کر سکیں گے؟“

”ابھی کچھ کہا نہیں جاسکتا مسٹر اقبال، ان کا جواب اثبات میں بھی ہو سکتا ہے اور انکار میں بھی۔“

میں نے ڈاکٹر طارق کو غور سے دیکھا۔ ان کا چہرہ سپاٹ تھا۔ عجیب سی بے حسی چھائی ہوئی تھی۔ مجھے اندازہ نہ ہو سکا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں کس حد تک صحیح ہے۔

”آپ مس فاریہ کو اصل بات بتا کر مجھے اس پریشانی سے نجات دلا سکتے ہیں مسٹر اقبال۔“

”جی ڈاکٹر..... مگر یہاں نہیں، یہ سب کچھ میں گھر جا کر بتاؤں گا۔ بیگ صاحب کے سلسلے میں آپ کا کیا مشورہ ہے!“

”وہ اب ٹھیک ہیں قدرے بہتر، بس دواؤں کا استعمال پابندی سے ہونا چاہیے۔“

”وہ گھر جانا چاہتے ہیں!“

”لے جائیے بس محتاط رہیے گا۔ کوئی صدمہ یا حادثہ انہیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔ میری مانیں تو انہیں کہیں بھیج دیجئے، کسی پرفضا مقام پر، یہاں کا ماحول اور زاریہ سے متعلق کوئی بھی اطلاع ان کے لیے نقصان دہ ہو سکتی ہے۔“

”ڈاکٹر فی الحال کسی ایسی نرس کا انتظام ہو سکتا ہے جو آپ کے نزدیک بااعتماد ہو؟“

”ہوں..... میں دیکھتا ہوں مسٹر اقبال۔ اوکے مجھے اجازت دیں۔ میں رات کو گھر سے ہوتا ہوا آپ کے پاس آؤں گا۔ میرے پہنچنے سے پہلے ہی آپ مس فاریہ کو بتا دیجئے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ کچھ اہم باتوں پر ان سے ڈسکس کروں۔ نرس کا انتظام ہو گیا تو میں لیتا آؤں گا۔ آپ بیگ صاحب کے سلسلے میں متعلقہ شعبے کے ڈاکٹر سے ہدایات لے لیجئے گا۔ ایک بار پھر کہوں گا کہ دوائیں انہیں پابندی سے ملنا چاہیں۔“

”فکر نہ کریں، میں خود اس بات کا خیال رکھوں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

ڈاکٹر طارق مجھ سے ہاتھ ملا کر واپس ایمرجنسی وارڈ میں چلے گئے۔ میں کچھ دیر وہیں گم صم کھڑا رہا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اوپر کیسے جاؤں۔ میں جانتا تھا کہ فاریہ بے حد ذہین ہے۔ وہ میرے چہرے سے حالات بھانپ لے گی۔ مجھے اداکاری نہیں آتی تھی ورنہ میں اپنے چہرے کے تاثرات بدل لیتا۔ میں یہی سوچتا ہوا اسپتال سے باہر آ گیا۔ اسپتال کے گیٹ کے سامنے ہی پان والے کی دکان تھی۔ نہ معلوم کیا سوچ کر میں نے اس سے سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس خریدی اور ٹمٹلتا ہوا واپس اسپتال میں آ گیا۔ سیڑھیوں پر پہنچ کر میں ایک بار پھر رک گیا۔ میں نے سگریٹ کے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکالا اور اسے سلگا کر لمبا کش لیا۔ میں زندگی میں پہلی بار سگریٹ پی رہا تھا، شاید اسی لیے سگریٹ کے پہلے ہی کش نے مجھ پر اثر کیا۔ ایک ہلکا سا چکر آیا اور پھر کچھ سرور محسوس ہونے لگا۔ پھریوں لگا جیسے میں کچھ سنبھلنے لگا ہوں۔ میں لمبے لمبے کش لے رہا تھا کہ اچانک مجھے کسی نے پکارا۔ آواز بہت دھیمی تھی۔

میں پلٹا اور اپنے سامنے فاریہ کو دیکھ کر گڑبڑا گیا۔ وہ مجھے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ میرے ہاتھ میں سگریٹ تھا اور منہ سے دھواں نکل رہا تھا۔

”سوری میڈم۔“ میں نے گھبرا کر سگریٹ پھینک دی۔

”اقبال۔ تم..... تم سگریٹ پیتے ہو؟“

”جی۔ نہیں۔ جی ہاں۔ بس کبھی کبھی۔ یونہی.....“

”کیا بات ہے اقبال۔ تم بہت پریشان لگ رہے ہو۔“

”نہیں میڈم، ایسی تو کوئی بات نہیں، چلے گھر چلیں۔“

”گھر.....؟ مگر ابھی تک مجھے زاریہ کی خیریت معلوم نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر طارق سے

ہو۔ میرا سامان تیار ہے۔ تم ڈاکٹر سے بات کر لو..... اور ہاں زاریہ کو بھی لے چل رہے ہو نا؟

”نہیں انکل، وہ کچھ روز یہاں رہے گی۔ البتہ آپ ضرور ہمارے ساتھ چلیں۔“
 زاریہ نے نارمل لہجے میں کہا۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ”اقبال تم ڈاکٹر سے مل لو۔
 دوائیں وغیرہ لکھوا لینا۔“
 ”جی بہتر!“ میں کمرے سے باہر آ گیا۔

☆=====☆=====☆

کچھ دیر بعد میں، بیگ صاحب اور فاریہ کو ٹھکی کی طرف جا رہے تھے۔ سڑکوں پر
 ٹریفک بہت زیادہ تھا۔ لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ دفاتروں اور اسکولوں کو
 جانے والے بس اسٹاپوں پر کھڑے بسوں کا انتظار کر رہے تھے۔ دکانیں ایک ایک کر کے
 کھلتی جا رہی تھیں۔ طلوع ہوتے سورج کے ساتھ ساتھ زندگی انگڑائیاں لیتی بیدار ہو رہی
 تھی مگر ہم تینوں خاموش تھے۔ یوں جیسے بیدار ہوتی اس زندگی سے ہمارا کوئی رشتہ ہی نہ
 ہو میرا ذہن مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ آنکھوں میں زاریہ کی معصوم صورت تیر رہی تھی،
 اچانک مجھے اس بھگتی، دوڑتی، ہنستی مسکراتی زندگی سے نفرت محسوس ہوئی۔

کاش میں زندہ نہ رہا ہوتا۔ کاش میں چوہدری کی حویلی میں آگ لگا کر خود بھی اس
 آگ میں جل مرتا تو یہ سارے عذاب بھلا کیوں اٹھانا پڑتے، میرا اپنا ہی دکھ کیا کم تھا جو یہ
 اجنبی دکھ بھی میرے اپنے ہو گئے تھے۔ میں چاہتے ہوئے بھی خود کو ان دکھوں سے بیگانہ
 نہیں کر پاتا تھا۔ ماں، سوہنی اور ماسی میراں کی جدائی نے مجھے کیا کیا دکھ نہ دیئے تھے، صغرا
 کی موت نے کیا میرا کلیجہ نہیں پھاڑ دیا تھا کہ اب زاریہ زندگی اور موت کے درمیان
 معلق تھی۔ لگتا تھا جیسے محبتیں مجھے کبھی راس نہ آئیں گی، جو لوگ مجھ سے پیار کرتے تھے
 وہ عذابوں میں گھر جاتے تھے۔ خدا جانے مجھ پر کیسی گردش آئی تھی اور جانے یہ کب ختم
 ہونے والی تھی۔

میں انہی سوچوں میں گم چلا جا رہا تھا کہ اچانک فاریہ نے مجھے ٹوکا۔ ”اقبال۔ رکو۔
 کہاں جا رہے ہوں؟“
 میں نے ایک دم پاؤں بریک پر رکھ دیا۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔ وہ تو کرم

ملنے آئی ہوں میں۔ تم نے معلوم کیا کہ زاریہ کہاں ہے؟ میں اسے دیکھے بغیر نہیں جاؤں
 گی انکل بھی گھر جانے کے لیے بھند ہیں۔“

”ڈاکٹر طارق مجھے ملے تھے۔ انہوں نے کہا ہے کہ بیگ صاحب گھر جانا چاہتے ہیں تو
 چلے جائیں اور زاریہ کے بارے میں وہ گھر آ کر آپ سے باتیں کریں گے، ویسے وہ بالکل
 ٹھیک ہے۔“

”وہ بالکل ٹھیک ہے تو ہمیں اس سے مل کر جانا چاہیے۔ کس وارڈ میں ہے؟“
 ”وہ آئی۔ سی۔ یو میں ہے میڈم، اسے ابھی تک ہوش نہیں آیا۔ میں نے کہا تھا
 ملنے کے لیے مگر ڈاکٹر طارق نے منع کر دیا ہے، انہوں نے کہا کہ وہ رات کو گھر آئیں
 گے۔“

”وہ آئی۔ سی۔ یو میں ہے، بے ہوش..... تو پھر ٹھیک کیسے ہوئی؟ کیا اول فول
 بول رہے ہو تم..... کہاں ہیں ڈاکٹر طارق۔“ یہ کہتی ہوئی فاریہ استقبالیہ کاؤنٹر پر پہنچ
 گئی۔ وہ تیز لہجے میں وہاں موجود نرس سے کچھ کہہ رہی تھی۔

”میڈم..... میڈم.....“ میں نے اس کے بالکل قریب جا کر سرگوشی کی۔
 ”یہاں کچھ نہ کہیں، زاریہ کے متعلق کوئی بات نہ کریں۔“
 فاریہ نے چونک کر مجھے دیکھا۔

میں دو چار قدم پیچھے ہو گیا۔ فاریہ فوراً میرے پیچھے آئی۔
 ”کیا بات ہے؟ کیا کہہ رہے ہو تم؟“

”میڈم، وہ لوگ چلاک ہیں۔ ڈاکٹر طارق نے اس کے وارڈ کے بارے میں مجھے
 بھی کچھ نہیں بتایا تو بھلا وہ استقبالیہ پر کیوں بتائیں گے۔ آپ مطمئن رہیں۔ ڈاکٹر طارق
 کل رات سے اب تک گھر نہیں گئے۔ وہ مستقل زاریہ کے پاس ہیں۔ آپ..... آپ
 گھر چلیں میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔ یہاں کوئی بات کرنا مناسب نہیں۔“

وہ کچھ دیر خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی، پھر شاید بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ
 لفٹ کی طرف بڑھ گئی میں اس کے پیچھے تھا۔ ہم بیگ صاحب کے کمرے میں پہنچے۔ وہ بیڈ
 پر لیٹے اخبار پڑھ رہے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی اٹھ بیٹھے۔

”بھئی تم لوگ کہاں چلے گئے تھے۔ میں ڈر گیا تھا کہ شاید تم لوگ گھر واپس چلے گئے

اندازہ نہیں کہ اس وقت تمہاری موجودگی میرے لیے کتنی بڑی ڈھارس ہے۔“
میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

”سنو‘ زاریہ کے بارے میں مجھے تفصیل سے بتاؤ۔ ڈاکٹر طارق سے تمہاری کیا بات ہوئی تھی؟“

میں کچھ دیر تک سوچتا رہا کہ بات کہاں سے شروع کروں۔ میں جانتا تھا کہ یہ بات فارسیہ کو بہت دکھی کر دے گی مگر بتائے بنا چارہ بھی نہ تھا۔ پھر میں نے ہمت کر کے دھیرے دھیرے اسے سب کچھ بتا دیا۔ وہ پتھر کا بت بنی سنتی رہی۔

”میڈم‘ آپ معاملے کی نزاکت کو سمجھ رہی ہیں نا؟“

”ہوں!“ وہ چونک پڑی۔ ”ہاں..... اقبال میں سمجھ رہی ہوں۔ زاریہ موت سے مزید قریب ہو گئی ہے۔ یہی کہنا چاہتے ہو نا تم؟“

”نہیں میڈم..... ایسا نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ وہ ٹھیک ہو جائے۔“

”اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ٹھیک نہ ہو۔“ اس نے میری بات کاٹ دی۔ ”مگر اقبال..... یہ بات ہم کیسے جانیں گے کہ اسے اس حال تک پہنچانے والی کون تھی؟“

”سب سے اہم بات یہی ہے میڈم‘ اور یہ بات ہمیں زاریہ کے سوا کوئی نہیں بتا سکتا۔“

”نہیں۔ ٹھہرو..... حمیدہ..... ہاں حمیدہ ہمیں اس لڑکی کا حلیہ تو بتا سکتی ہے نا اور چوکیدار بھی۔“

میں اچھل پڑا۔ حیرت انگیز بات تھی کہ اتنی ذرا سی بات کا ہمیں پہلے خیال کیوں نہ آیا۔ ہم حمیدہ اور چوکیدار سے الگ الگ اس لڑکی کا حلیہ پوچھ کر کسی حد تک اندازہ لگا سکتے تھے کہ وہ کون ہوگی۔

”جی میڈم‘ آپ حمیدہ کو بلائیں۔“ فارسیہ نے دیوار پر لگا ہٹن دبایا۔ چند منٹ بعد ہی حمیدہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

”جی بی بی!“

”حمیدہ یہاں آؤ بیٹھو۔ دیکھو وہ جو لڑکی زاریہ کے پاس آئی تھی‘ وہ تمہیں یاد ہے؟“

”جی..... ہاں جی‘ کچھ کچھ یاد تو ہے۔“ اس نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

ہوا کہ میری گاڑی کے پیچھے کوئی گاڑی نہیں تھی ورنہ ایکسیڈنٹ ہو جاتا۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“ فارسیہ نے حیرت سے مجھے دیکھا۔
”نک..... کچھ نہیں میڈم۔“

”پھر کہاں جا رہے ہو‘ وہ سڑک تو پیچھے رہ گئی جہاں سے ہمیں مڑنا تھا۔“

”اوہ سوری.....“ میں نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا اور گاڑی سٹارٹ کر لی۔ میں گاڑی کو موڑ کر اس جگہ لے آیا جہاں ہمیں مڑنا تھا۔ میں واقعی اپنی سوچوں میں اس قدر گم تھا کہ راستہ ہی بھول گیا تھا اگر فارسیہ احساس نہ دلاتی تو میں جانے کہاں پہنچ جاتا۔

ہم چند منٹ بعد کوٹھی کے گیٹ پر پہنچ گئے۔ چوکیدار نے آگے بڑھ کر گیٹ کھول دیا۔ میں نے گاڑی برآمدے کے پاس روک دی تاکہ بیگ صاحب کو زیادہ نہ چلنا پڑے۔ گاڑی روکتے ہی میں اتر آیا۔ بیگ صاحب کو سہارا دینے کے لیے میں نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

”ارے بیٹا‘ ابھی اتنا بوڑھا تھوڑا ہی ہوا ہوں کہ اپنے پیروں پر کھڑا بھی نہ ہو سکوں۔“ انہوں نے ہنستے ہوئے کہا اور خود ہی اتر آئے۔

”اقبال تم گاڑی پارک کر دو میں انکل کو پہنچا دوں گی۔“ فارسیہ نے مجھ سے کہا۔
میں نے سر ہلایا اور ان کے اترنے کے بعد میں گاڑی کو پارکنگ میں لے آیا۔ گاڑی کی چابی میں نے چوکیدار کو دے دی اور اسے تاکید کی کہ وہ گاڑی کو اچھی طرح صاف کر دے۔

میں اپنے کمرے میں جانے سے پہلے ڈرائنگ روم میں چلا آیا۔ میں جانتا تھا کہ فارسیہ‘ زاریہ کے سلسلے میں بے حد پریشان ہوگی۔ میری توقع کے عین مطابق فارسیہ وہاں موجود تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔

”اقبال تم بہت تھک گئے ہوں گے مگر میری بے چینی بڑھتی جا رہی ہے‘ مجھے بات بتاؤ پھر تم جا کر آرام کرو۔ مجھے احساس ہے کہ تم ہماری وجہ سے بہت پریشان ہو گئے ہو۔“

”ایسا نہ سوچا کریں میڈم‘ مجھے اجنبیت محسوس ہوتی ہے۔“

”یہ تمہارا احسان ہے اقبال جسے میں کبھی فراموش نہیں کروں گی۔ شاید تمہیں

”مجھے حلیہ بتاؤ اس کا۔ وہ کیسی تھی؟ اس کا رنگ، نقشہ، قد، بال، کپڑے..... جو کچھ بھی یاد ہو۔“

”وہ جی پیٹس تیس برس کے درمیان لگتی تھی۔ گورا رنگ تھا اس کا، بات کرتے ہوئے بار بار آنکھیں جھپکتی تھی، اس نے تیز پہلی فیض اور تیز گلابی شلوار اور اسی رنگ کا دوپٹا پہنا ہوا تھا۔ ناک نقشہ اچھا تھا۔ اس کی ناک میں سفید رنگ کی بڑی سی لوگ تھی، بڑا لشکارا مار رہی تھی، اور قد..... قد تقریباً زاریہ بی بی جتنا تھا۔ آپ سے کچھ کم مگر اس نے ہیل پہنی ہوئی تھی جی، پتا نہیں کتنا قد ہو گا۔“

”اچھا..... اور کچھ..... کوئی خاص بات..... یاد کرو۔“

اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ ”بس جی۔ اور تو کوئی بات.....“ اچانک وہ چونک کر خاموش ہو گئی۔ جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو۔

”ہاں ہاں..... بتاؤ..... کیا بات ہے؟“

”وہ جی اس کے سیدھے ہاتھ کی پہلی انگلی کا ناخن نہیں تھا۔ میری نگاہ اس وقت پڑی جب اس نے مجھ سے پانی مانگا تھا۔ میں نے گلاس اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے گلاس سیدھے ہاتھ میں تھاما تھا تبھی میری نگاہ اس کی انگلی پر پڑی تھی۔ بہت خوب صورت ہاتھ تھے پر اس انگلی نے عیب دار بنا دیا تھا۔“

”کانی ہے میڈم۔“ میں نے فاریہ سے کہا۔

”ٹھیک ہے حمیدہ تم جاؤ۔ ایک بات کا خیال رکھنا کہ ہماری غیر موجودگی میں کوئی بھی کوٹھی میں داخل نہ ہو۔ یہ ہدایت میں چوکیدار کو بھی کر چکی ہوں۔ دوسری بات یہ کہ تم انکل کا خیال رکھنا۔ انہیں وقت پر دوا دینا اور ان کے کھانے پینے کا خیال رکھنا کسی کو بھی ان کے کمرے میں جانے نہیں دینا، سوائے ڈاکٹر طارق کے۔ سمجھ گئیں؟“

”جی بی بی، سمجھ گئی۔ وہ..... زاریہ بی بی کیسی ہیں؟“

”وہ ٹھیک ہے حمیدہ، دعا کرو بالکل اچھی ہو جائے۔“ فاریہ نے گہرا سانس لے کر کہا۔ ”جاؤ تم کھانے کا انتظام کرو۔“

وہ اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے چوکیدار کو بلایا۔ اس نے بھی جو تھوڑی بہت باتیں بتائیں وہ وہی تھیں جو حمیدہ بتا چکی تھی۔ چوکیدار کو اس

کے کپڑوں کا رنگ اور اونچی ہیل کا جوتا ہی یاد تھا یا یہ کہ وہ گوری چٹی اور خوب صورت لڑکی تھی۔

چوکیدار کے جانے کے بعد میں اور فاریہ بہت دیر تک یہی باتیں کرتے رہے کہ ایسے حلے کی لڑکی ہمیں یاد نہیں تھی، نہ میری نگاہ سے گزری تھی اور نہ ہی فاریہ کے کہنے کے مطابق وہ اس سے واقف تھی۔

”ٹھیک ہے اقبال، اس معاملے کو بھی دیکھیں گے تم فی الحال آرام کرو، دوپہر کے کھانے پر ملاقات ہوگی۔“ فاریہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”جی میڈم، آپ بیگ صاحب کی دوا کا ٹائم حمیدہ کو سمجھا دیجئے گا۔“

وہ مسکرائی۔ ”ٹھیک یو اقبال، میں نے سمجھا دیا ہے بلکہ میں خود انہیں دوا دوں گی۔“

میں ڈرائنگ روم سے نکل کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ تھکن بدن کے جوڑوں میں بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے شاور لیا، ہلکے پھلکے کپڑے پہنے اور بستر پر لیٹ گیا۔ جلد ہی مجھے نیند آ گئی۔ سونے سے قبل میں نے کمرے کا دروازہ لاک کر دیا تھا۔ میں اتنا بے خبر سویا کہ آنکھ کھلی تو یہ دیکھ کر میں اچھل پڑا کہ شام کا ملگجا اندھیرا پھیل چکا تھا۔

میں نے جلدی سے منہ پر جھپکے مارے اور تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ کوٹھی پر گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میرا دل دھڑک اٹھا۔ مجھے بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ کسی نے مجھے اب تک اٹھایا کیوں نہیں.....؟ میں تیز قدموں سے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھا۔ راستے میں حمیدہ بی بی مل گئی۔

”مس فاریہ کہاں ہیں؟“

”جی وہ سو رہی ہیں!“

”اوہ۔ دوپہر انہوں نے کھانا نہیں کھایا؟“

”جی نہیں..... میں نے انہیں بھی اٹھانے کی کوشش کی تھی اور آپ کو بھی۔ مگر

آپ دونوں ہی گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے۔“

میں مسکرایا۔ یہ اچھا ہی ہوا تھا کہ وہ گہری نیند سو گئی تھی۔ جانے کب سے اس کی نیند پوری نہیں ہوئی تھی اور نہ معلوم حالات کیا رخ اختیار کر لیتے، میں حمیدہ سے چائے کا

کہہ کر لان میں چلا آیا۔ میں نے اسے چائے کے ساتھ کچھ کھانے کی چیزوں کو بھی کہا تھا۔ کھانے کا وقت تو گزر چکا تھا۔ حمیدہ سر ہلا کر بچن کی طرف بڑھ گئی۔ میں لان میں آ بیٹھا۔ نیبل پر اخبار پڑا تھا۔ میں اخبار پڑھنے لگا۔

کچھ دیر بعد حمیدہ چائے کی ٹرائی لیے وہیں آ گئی۔ ”بی بی کو اٹھا دوں؟“

”آں..... ہاں۔ انہیں اٹھا دو۔ بیگ صاحب کیسے ہیں؟“

”ٹھیک ہیں جی..... میں نے دوا دے دی تھی۔ وہ باہر آنا چاہتے تھے مگر میں نے منع کر دیا ہے۔ ہوا ٹھیک نہیں ہے جی۔“ اس نے دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

”اچھا کیا حمیدہ بی بی، ان کا خیال رکھنا اب تمہارا کام ہے۔ بی بی تو بہت مصروف رہتی ہیں، مجھے بھی وقت نہیں ملتا۔ گھر میں اب تم ہی رہ گئی ہو۔“

”آپ فکر نہ کریں جی، مجھ پر بی بی اور بیگ صاحب کے بڑے احسان ہیں، اپنی جان بھی دے دوں گی تو احسان کا بدلہ نہیں اتار سکتی۔“

”اچھا تم بی بی کو اٹھا دو۔“ میں نے چائے کپ میں نکالتے ہوئے کہا۔

”صاحب جی، ایک بات پوچھوں؟“

”ہوں۔ پوچھو!“

”صاحب جی یعقوب کہاں گیا؟“

”آں۔ وہ کہیں گیا ہے۔ شاید اپنی بیٹی کے گھر۔“

”اس کے تو کوئی بیٹی نہیں۔“

”اچھا۔ تو پھر شاید بیٹے کے پاس گیا ہو۔“

”مگر اس نے تو کہا تھا کہ اس کے کوئی اولاد ہی نہیں ہے۔“ وہ مسلسل بحث کر رہی تھی۔

میں جھنجھلا گیا۔ ”مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں گیا ہے۔ بس اپنے رشتے داروں میں ہی گیا ہے۔“ میرے لہجے کو اس نے محسوس کر لیا تھا وہ جلدی سے پلٹ کر برآمدے کی طرف چلی گئی۔

کچھ دیر بعد فاریہ آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ شاید ابھی ابھی نما کر نکلی تھی۔ اس کے

لبے لبے سیاہ بال اس کی کمر پر لہرا رہے تھے۔ اس کا وجود نکھرا نکھرا سا لگ رہا تھا۔ ”ہیلو اقبال۔“ اس نے قریب آ کر کہا اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ ”آج ٹوٹ کر نیند آئی ہے!“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کے ہونٹوں پر دھیمی مسکراہٹ تھی۔

”آپ کے لیے بہت بہتر ہوا۔ فریش ہو گئی ہیں۔“

”انکل بھی آرہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں تم مجھے قید کرنا چاہتی ہو۔“

میں مسکرایا۔ ”اچھا ہے کچھ دیر فریش ہوا میں بیٹھیں تو خود کو بہتر محسوس کریں گے۔“

”مگر مجھے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔“

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”جی فرمائیے۔“

”اقبال تم وہ جگہ تو جان گئے ہونا جہاں یعقوب کو رکھا گیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم وہاں جا کر اسے لے آؤ۔“

”میڈم۔ اگر آپ ساتھ ہوں گی تو.....“

”اچھا..... تم..... خیر چھوڑو ہم رات اس سلسلے میں بات کریں گے۔“ اس نے برآمدے کی سیڑھیوں کو عبور کرتے ہوئے بیگ صاحب کی طرف دیکھ کر کہا۔

میں بھی سنبھل کر بیٹھ گیا۔ بیگ صاحب چھڑی تھامے دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے ہوئے چلے آرہے تھے۔

”ہاں بھی بچو، اکیلے اکیلے چائے پی جا رہی ہے؟“ انہوں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”نہیں انکل آپ کا انتظار کر رہے تھے۔“ فاریہ نے جواب دیا۔

”اچھا اقبال..... بیٹا تم ایک کام تو کرو۔ یہ..... یہ دوا ختم ہو گئی ہے، یہ

گولیاں ہیں، زبان کے نیچے رکھنے سے بڑا سکون ملتا ہے، درد کم ہو جاتا ہے۔“ انہوں نے جیب سے پرچہ نکال کر میری طرف بڑھایا۔

میں نے چائے کا آخری گھونٹ لیا اور کھڑا ہو گیا۔

”کیا ابھی جا رہے ہو؟“ بیگ صاحب نے پوچھا۔

”جی..... قریبی میڈیکل اسٹور سے لے آتا ہوں، بھول گیا تو پھر مشکل ہو جائے گی۔“ میں نے جواب دیا اور فاریہ سے اجازت لے کر گاڑی کی طرف چل پڑا۔ چوکیدار نے گاڑی صاف کر دی تھی۔ چابیاں سلف میں لٹکی ہوئی تھیں۔ میں نے گاڑی اشارت کی اور گیٹ سے نکالتا ہوا مین روڈ پر آ گیا۔ میڈیکل اسٹور زیادہ دور نہیں تھا۔ یہ میڈیکل اسٹور شاپنگ بلازہ کے کارنر پر تھا۔ شام کا وقت تھا اس لیے کافی رش تھا۔ میں گاڑی سے اتر کر میڈیکل اسٹور کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے گولیاں خریدیں۔ چیونگم کا پیکٹ خریدا، پیکٹ میں سے ایک چیونگم کھول کر منہ میں ڈال لی اور پیکٹ جیب میں رکھ لیا۔ میں نے دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی اشارت کر کے میں نے آگے بڑھا دی۔ اچانک مجھے لگا جیسے کوئی چیز میرے پاؤں سے ٹکرائی ہو۔ میں نے ایک دم گاڑی سائڈ پر کر کے روک دی۔ اندر کی لائٹ جلائی تو وہ لفافہ سامنے ہی نظر آ گیا جو میری سیٹ کے نیچے پیروں کے پاس پڑا تھا۔ میں نے جھک کر لفافہ اٹھالیا۔ لفافہ بالکل سادہ تھا اور بند تھا۔ میں نے لفافہ یو نی جیب میں رکھ لیا اور گاڑی اشارت کر کے واپس کو بھی چلا آیا۔

میں نے دوا بیگ صاحب کو دی اور فاریہ سے دو منٹ کی اجازت لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ میں نے جلدی سے لفافہ کھولا۔ اندر خط موجود تھا۔ میں نے خط کھولا اور تحریر کے نیچے نگاہ ڈالی جہاں بھیجنے والے کا نام لکھا تھا۔

نام دیکھ کر میرا دل دھڑک اٹھا۔ وہ عذرا کا خط تھا۔ مجھے حیرت اس بات پر ہوئی کہ یہ خط کب اور کیسے میری گاڑی میں پہنچ گیا۔ میں بہ مشکل چند منٹ میڈیکل اسٹور پر رکا ہوں گا۔

خط بہت جلدی میں لکھا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ رائٹنگ بہت خراب تھی اور صرف ایک جملہ لکھا تھا کہ۔ ”ڈاکٹر زیدی ان کا آدمی ہے، زاریہ کا خیال رکھو۔“

تحریر پڑھتے ہی میں تیزی سے باہر نکلا اور تقریباً بھاگتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔ ڈرائنگ روم خالی تھا۔ فاریہ غالباً اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔ میں نے سائیڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی ڈائری کھولی اور اسپتال کا نمبر تلاش کرنے لگا۔ جلد ہی مجھے اسپتال کا نمبر مل گیا۔ میں نے نمبر ڈائل کیا، دوسری طرف سے فوراً ہی ریسپور اٹھالیا گیا۔

آپریشن کی آواز سنتے ہی میں بول اٹھا۔ ”پلیز ڈاکٹر طارق سے ملائیے۔“
”پلیز ڈاکٹر طارق کا پورا نام بتائیے، یہاں اس نام کے تین ڈاکٹر ہیں۔“
”ڈاکٹر طارق رضوی۔“ میں نے فوراً ہی جواب دیا۔ ”وہ آئی سی یو میں ہوں گے۔ مجھے فوراً بات کرنا ہے، ایمر جنسی پلیز۔“

”اوکے ہولڈ آن پلیز۔“ آپریشن نے جواب دیا اور دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔ یہ خاموشی میرے اضطراب کو بڑھا رہی تھی۔ نہ معلوم کیوں میرے اندر خوف پھیلتا جا رہا تھا۔ میں بے حد نروس تھا۔ اس کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب میری کپنیوں سے پسینا ہمہ کر رخساروں پر آ گیا۔ میں نے ایک ہاتھ جیب میں ڈال کر رومال نکالا اور پسینہ پونچھنے لگا۔ عین اسی وقت فاریہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ ریسپور میرے ہاتھ میں لرز اٹھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے سوالات کرے گی، پوچھے گی کہ میں کسے فون کر رہا تھا، اور اگر نہ بھی پوچھا تو ڈاکٹر طارق کے لائن پر آتے ہیں میری گفتگو سن لے گی اور تب..... جانے کیا ہو گا؟ یہ سب کچھ میں نے لحوں میں سوچ لیا۔

نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا اس کی آنکھوں میں استفہام تھا۔ میں نے لرزتے ہوئے ہاتھ سے عذرا کا خط اس کی جانب بڑھا دیا۔ میں نہیں جانتا کہ اسے پڑھ کر اس کی کیا حالت ہوئی۔ اس لیے کہ میں نے نگاہیں جھکا لیں تھیں اور اسی وقت ڈاکٹر طارق کی آواز آئی۔
”ہیلو ڈاکٹر طارق اسپیکنگ!“

”ڈاکٹر..... ڈاکٹر زیدی سے ہوشیار رہیے۔ وہ زاریہ کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔ کوئی سوال نہ کیجئے گا، میں وہیں آ کر بتاؤں گا۔“ اتنا کہتے ہی میں نے ریسپور کریڈل پر رکھ دیا اور خود کھڑا ہو گیا۔

”جلدی۔ ہری اپ.....“ فاریہ نے کسی کمانڈر کی طرح مجھے حکم دیا اور تیزی سے ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر کمال ضبط کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس کی آواز میں مضبوطی تھی اور قدم بھی نہیں لڑکھڑائے تھے۔

ہم تقریباً بھاگتے ہوئے گاڑی تک پہنچے۔ میں نے فوراً ہی گاڑی اشارت کر دی۔
”ایک منٹ گیٹ پر روکنا۔“ اس نے کہا۔

میں نے گاڑی گیٹ پر روکی۔ فاریہ نے چوکیدار کو بلایا اسے گیٹ کو تالا ڈال کر بیگ

صاحب کے کمرے میں چلے جانے کو کہا اور مجھے چلنے کا اشارہ کیا۔

میں نے سڑک پر آتے ہی ایکسی لیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔ میں صرف بارہ منٹ میں اسپتال پہنچ گیا جبکہ گھر سے اسپتال عام طور پر بیس پچیس منٹ میں پہنچا کرتا تھا۔ راستے میں خاموشی رہی۔ میرا سارا دھیان ڈرائیونگ کی طرف تھا اور فاریہ کا غالباً زاریہ کی طرف۔ اسپتال میں داخل ہوتے ہی میں نے گاڑی پارک کی۔ میرے اترنے سے پہلے ہی فاریہ اتر کر اسپتال کے اندرونی حصے کی طرف دوڑتی چلی گئی تھی۔

گاڑی لاک کر کے میں بھی اس کے پیچھے لپکا۔ کوریڈور ہی میں ہمیں ڈاکٹر طارق مل گئے۔ فاریہ نے انہیں عذرا کا خط دکھایا اور انہیں بتایا کہ زاریہ شدید خطرے میں ہے۔ اس دوران ہم رکے نہیں تھے۔ بلکہ تیز قدموں سے آئی سی یو کی طرف بڑھتے رہے تھے۔ شاید ڈاکٹر طارق اس بارے میں کافی کچھ جانتے تھے۔ انہوں نے اس معاملے کو اتنی ہی سنجیدگی سے لیا تھا جتنا کہ فاریہ اور میں نے۔

”مس فاریہ آپ فکر نہ کریں۔ اقبال صاحب کے فون کے بعد میں نے اسٹاف کو خصوصی طور پر ہدایت کر دی تھی کہ میرے آنے تک کسی بھی حال میں کوئی بھی اندر داخل نہ ہونے پائے۔“

”ڈاکٹر۔ یہی وجہ تھی کہ میں اس کے پاس رہنا چاہتی تھی مگر آپ.....“

”آئی ایم سوری مس فاریہ وہاں کوئی بھی نہیں رک سکتا۔“

”میں باہر بیٹھی رہتی، شیشے کے اس پار سے اسے دیکھتی رہتی مگر.....“

فاریہ کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں زاریہ کو رکھا گیا تھا میں اور فاریہ باہر ہی رہ گئے۔ ڈاکٹر طارق نے ہمیں اندر آنے سے روک دیا۔ وہ خود اندر چلے گئے۔ چند منٹ بعد ہم سے چند قدم آگے ایک شیشے کے اندر کی جانب پڑا ہوا پردہ سرک گیا۔ دوسری جانب ڈاکٹر طارق تھے۔ میں اور فاریہ لپک کر اس شیشے کے پاس پہنچ گئے۔ ڈاکٹر طارق نے ”سب ٹھیک ہے“ کا اشارہ کیا اور خود ان مشینوں سے الجھ گئے جو زاریہ کے سرہانے اور دائیں جانب رکھی تھیں۔

زاریہ کا چہرہ بالکل سامنے تھا۔ وہ کسی لاش کی مانند بے حس و حرکت پڑی تھی۔ میں نے اپنی نگاہیں اس پر پڑی سفید چادر پر گاڑ دیں۔ میں اس کے تنفس کو محسوس کرنا چاہتا

تھا مگر اتنی دور سے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ مردہ ہو چکی ہو۔ میں نے کن آنکھوں سے فاریہ کی طرف دیکھا، اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا، آنکھوں میں کرب پھیلا ہوا تھا مگر پھر بھی اس کے چہرے سے سختی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کے جڑے بھینچے ہوئے تھے۔

میں نے پھر شیشے کے پار دیکھا جہاں ڈاکٹر طارق ایک کمپیوٹر جیسی کسی مشین سے الجھے ہوئے تھے پھر انہوں نے پلٹ کر ہماری طرف دیکھا۔ مسکرانے کی ناکام کوشش کی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔ میں اور فاریہ دم سادھے خاموش کھڑے تھے۔ چند لمحوں بعد اندرونی دروازہ پھر کھلا۔ اس بار ڈاکٹر طارق کے ساتھ ایک نرس بھی تھی۔ ڈاکٹر طارق نرس کو کچھ سمجھاتے رہے، وہ سر ہلاتی رہی پھر زاریہ کے بیڈ کے دائیں جانب رکھی کرسی پر بیٹھ گئی اور ڈاکٹر طارق باہر چلے گئے۔

میں یہ غور اس نرس کو دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا جیسے میں اس نرس کو پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہوں۔ میں نے ذہن پر بہت زور ڈالا مگر کچھ یاد نہ آیا۔

”اقبال..... میرا دل گھبرا رہا ہے۔“ اچانک فاریہ کی آواز نے مجھے خیالوں کی دنیا سے چونکا دیا۔

”میڈم۔ سب کچھ ٹھیک ہے، شکر کیجئے کہ ہم بروقت پہنچ گئے ورنہ.....“

”پتا نہیں اقبال..... مجھے نہیں لگتا کہ سب کچھ ٹھیک ہو گا۔ میری چھٹی حس کسی بہت بڑے خطرے کا احساس دلا رہی ہے۔“

”ممکن ہے کہ یہ آپ کا وہم ہو میڈم۔“

”یہ نرس کون ہے؟“

”میں نہیں جانتا، لیکن وہ یقیناً ڈاکٹر طارق کی جاننے والی ہو گی ورنہ وہ اس پر اتنا اعتماد کرتے کہ ایسے خطرے کے وقت اسے زاریہ کے کمرے میں تنہا چھوڑ دیں۔“

”یہاں کون اعتماد کے قابل ہے اقبال.....“ ”یہاں تو خود اپنے سائے سے بھی ڈر لگتا ہے۔“ فاریہ نے ٹوٹے لہجے میں جواب دیا۔

میں اسے تسلی دینے کے لیے الفاظ ہی تلاش کر رہا تھا کہ ڈاکٹر طارق آگئے۔

”مس فاریہ، زاریہ بالکل ٹھیک ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب آپ کو گھر واپس چلے جانا چاہیئے تاکہ میں اپنے فرائض کسی ٹینشن کے بغیر ادا کر سکوں۔“

”مگر ڈاکٹر..... میں زاریہ کے پاس رکنا چاہتی ہوں۔ میں ایسے حالات میں اسے تنہا نہیں چھوڑنا چاہتی۔“

”وہ تنہا نہیں ہے مس فاریہ، میں اور تبسم اس کے پاس ہیں۔ آپ اس سلسلے میں بے فکر رہیں۔ اس کی جان کی حفاظت کرنا ہم دونوں کا فرض ہے۔ آپ نے اچھا کیا کہ مجھے اس خطرے سے آگاہ کر دیا ورنہ ممکن ہے مجھ سے چوک ہو جاتی، اب آپ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں ایک لمحے کے لیے بھی اسے تنہا نہیں چھوڑوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔“ ڈاکٹر طارق نے فاریہ کو سمجھانے کے سے انداز میں کہا۔

”تبسم کون ہے؟“ فاریہ نے پوچھا۔

”وہ نرس!“ ڈاکٹر طارق نے شیشے میں اس نرس کی طرف اشارہ کیا۔

”ڈاکٹر طارق کیا وہ.....“

”جی مس فاریہ!“ ڈاکٹر طارق نے فاریہ کی بات کاٹ دی۔ ”وہ قابل اعتماد لڑکی ہے، میں اسے سات سال سے جانتا ہوں۔ اس اسپتال کے بعد وہ میرے کلینک میں میری مدد کرتی ہے۔ آپ مطمئن رہیں۔ یہ میری ذمہ داری ہے۔ میں حالات کی نزاکت سے بھی واقف ہوں اور آپ لوگوں کی پریشانی سے بھی، آپ کو مجھ پر اعتماد کرنا چاہیے مس فاریہ، دوسری بات یہ کہ ڈاکٹر قمل یہاں پہنچ گئے ہیں۔ وہ کل صبح زاریہ کا آپریشن کریں گے۔ مجھے نوے فیصد امید ہے کہ زاریہ ٹھیک ہو جائے گی۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو ڈاکٹر..... ورنہ.....“ فاریہ نے نڈھال لہجے میں کہا۔

”ڈونٹ وری مس فاریہ، آئی ایم شور کہ ایسا ہی ہو گا۔“

فاریہ نے لمحہ بھر کو مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ بھی نہ تھا، یوں جیسے وہ خلاؤں میں تنہا رہی ہو۔

”مسٹر اقبال، آپ مس فاریہ کو لے جائیں۔ میں فون پر آپ سے رابطہ رکھوں گا لیکن پلینز آپ فون نہ کیجئے گا کیوں کہ ممکن ہے اس وقت میں مصروف ہوں۔ میں خود ہی آپ کو فون کر کے اس کی خیریت بتاتا رہوں گا۔“

ٹھیک ہے ڈاکٹر مگر آپ نے ڈاکٹر زیدی کے لیے کیا کیا؟“

”میرے اور تبسم کے سوا اسپتال کا ایم ایس بھی اس کمرے میں داخل نہیں ہو

سکتا۔ میں نے ایسا انتظام کر دیا ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔

”ٹھیک یو ڈاکٹر..... ٹھیک یو۔“

”ویل کم..... اوکے، سی یو۔“

”اوکے۔“ میں نے جواباً کہا اور بیرونی گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ فاریہ بھی میرے ساتھ قدم سے قدم ملائے چل رہی تھی۔ ہم پارکنگ لاٹ میں آئے۔ میں نے گاڑی کا دروازہ کھول کر فاریہ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا، وہ گم سم سی ڈرائیونگ سیٹ کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں نے دروازہ بند کیا اور گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آ گیا۔

ہم خاموشی سے آگے بڑھتے رہے۔ شام گہری ہو گئی تھی۔

”اقبال، کسی پی سی او سے گھر فون کر کے انکل کی خیریت معلوم کرو۔“ اچانک فاریہ نے کہا۔

میں نے سر ہلایا اور دونوں جانب پی سی او کی تلاش میں نظریں گھماتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ اچانک ہی میری نگاہ ایک پوسٹ آفس پر پڑی۔ میں نے وہاں سائیڈ پر گاڑی روک دی۔ فاریہ گاڑی ہی میں بیٹھی رہی۔ میں اتر کر پوسٹ آفس میں چلا گیا۔ وہاں میں نے گھر فون کیا۔ فون حمیدہ نے اٹھایا اور میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ بیگ صاحب سو رہے ہیں، چوکیدار انہی کے کمرے میں ہے اور سب خیریت ہے۔ میں نے اسے زاریہ کی خیریت بتائی اور اسے بیگ صاحب کا خیال رکھنے کی ہدایت کرنے کے بعد فون رکھ دیا۔

حمیدہ نے مجھ سے پوچھا تھا کہ ہم کب تک واپس آئیں گے مگر اس بارے میں میں خود بھی نہیں جانتا تھا کہ فاریہ کا کیا پروگرام ہے۔ فون کرنے کا مطلب تو یہی تھا کہ ہم سیدھے گھر نہیں جائیں گے ورنہ وہ بیگ صاحب کی خیریت فون پر معلوم نہ کرواتی۔ میں نے حمیدہ سے کہہ دیا کہ ہم کچھ ضروری کام نمٹا کر ہی گھر آئیں گے، ممکن ہے ہمیں دیر ہو جائے اور ممکن ہے کہ ہم جلدی گھر پہنچ جائیں۔

میں واپس آیا تو فاریہ سیٹ کی پشت سے سر نکالے اداس بیٹھی تھی۔ میری آہٹ پر اس نے چہرہ گھما کر میری طرف دیکھا۔

”سب ٹھیک ہے، بیگ صاحب سو رہے ہیں۔“ میں نے جواب دیا اور دروازہ کھول

کر اندر بیٹھ گیا۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور فاریہ کی طرف استہنامیہ نگاہوں سے

دیکھا۔

”کیس چائے پیئیں گے، کچھ باتیں کریں گے، کسی اچھے سے ریستوران میں چلو جہاں سکون ہو۔“ فاریہ نے سر کو پھر سیٹ کی پشت سے ٹیکتے ہوئے کہا۔

”یس میڈم۔“ میں نے مستعدی سے جواب دیا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

تقریباً پندرہ بیس منٹ کی رنگ کے بعد میں نے گاڑی جی ٹی روڈ پر ڈال دی۔ اس روڈ پر ایک ریستوران تھا جہاں میں ایک بار پہلے بھی گیا تھا۔ میں نے اس ریستوران کے سامنے گاڑی روک دی۔ ریستوران کے احاطے کے اندر لان تھا، جہاں کرسیاں ٹیبل پر ہی ہوئی تھیں۔ ہر ٹیبل کے درمیان کافی فاصلہ تھا اور ہر ٹیبل پر ایک خوبصورت لیپ روشن تھا۔ یہاں کا ماحول بے حد پرسکون اور خوبصورت تھا۔ فاریہ نے اندر داخل ہو کر چاروں طرف دیکھا اور مجھے دیکھ کر مسکرائی۔

”کافی باڈوق ہوا!“

”تھینک یو میڈم، مجھے اونچی دیواروں کے درمیان بیٹھنے سے کھلی فضا میں بیٹھنا پسند ہے۔ میں ایک ایک بار پہلے بھی آچکا ہوں۔“

”تم نے یہ جگہ ڈھونڈی کیسے تھی۔ میں یہاں کی رہنے والی ہوں مگر اس جگہ سے ناواقف تھی۔“

”اتفاقاً لپچ کیا تھا۔“ میں نے مختصر جواب دیا اور ایک گھنے درخت کے نیچے رکھی ٹیبل کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے کرسی کھینچ کر فاریہ کو بٹھایا اور دوسری کرسی کھینچ کر خود بھی بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں سفید براق وردی میں ملبوس ویٹر ہمارے قریب آگیا۔ جس نے سر پر ہرے رنگ کی گپڑی باندھی ہوئی تھی اور کمر پر ہرے رنگ کی بیلٹ کسی ہوئی تھی جس کے کنارے سنہری تھے۔

”یس سر!“

”چائے..... اور سینڈویچز“ فاریہ نے آرڈر دیا۔

وہ سر ہلا کر واپس چلا گیا۔

فاریہ کچھ دیر تک چاروں طرف دیکھتی رہی۔ ہمارے قریب کوئی نہ تھا۔ ایک دو ٹیبلز پر جو ہم سے کافی فاصلے پر تھیں، کچھ لوگ بیٹھے تھے۔

”اقبال“ میں نے یعقوب کے سلسلے میں تم سے پہلے بھی بات کی تھی۔ میں اس پر اعتماد کر کے دیکھنا چاہتی ہوں۔“

”جی میڈم اور میں نے آپ کے اس فیصلے کی تائید کی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ ٹھیک کتا ہے کہ وہ ان لوگوں کے مقاصد سے ناواقف تھا۔ اسے نادانستگی میں استعمال کیا گیا ہے۔ ورنہ میں نے اسے آپ کے لیے اور گھر کے دوسرے افراد کے لیے پریشان ہوتے بھی دیکھا ہے میڈم۔“

اس نے پُر سوچ انداز میں سر ہلایا۔ ”میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہمارے لیے یہ مشکل ہو گا کہ ہم کسی نئے آدمی پر اعتماد کریں ہاں البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ میں گل جان کو کونھی میں لے آؤں، وہ بے تحاشا طاقت ور اور بے حد وفادار ہے۔ میں اسے ہزار ہا موقعوں پر آزما چکی ہوں۔ وہ واقعی ان لوگوں میں سے ہے جو آنکھ بند کر کے مالک کے لیے جان دے دیتے ہیں اور لے بھی لیتے ہیں۔ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ جس کی وہ جان لے رہے ہیں وہ ان کا اپنا خون ہے۔ گل جان انکل بیگ کی وفاداری میں اپنے چچا کا خون کر چکا ہے۔ اس کے اسی وحشی پن کی وجہ سے میں نے اسے شر سے باہر اس قلعے میں رکھا ہوا ہے۔“

”اگر وہ ایسا ہے میڈم تو اس سے بہتر کوئی بھی شخص نہ ہو گا جسے گھر پر چھوڑ کر ہم مطمئن ہو سکیں۔ ہمیں آج ہی اسے اور یعقوب کو گھر لے آنا چاہیے۔“ میں نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

”آج تو نہیں، البتہ ہم کل صبح ہی اسے لے آئیں گے۔ آج تم ایک کام کرو، ادریس کو تلاش کرو اور وصی صاحب سے معلوم کرو کہ آفس کا ریکارڈ تو محفوظ ہے نا، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ادریس سے کوئی اور کام بھی لیا ہو۔“

”جی میڈم۔ میں ادریس کے متعلق آج ہی معلوم کر لوں گا۔ مجھے سلطان کی طرف جانا بھی ہے۔ میں نے کچھ سامان گاؤں بھیجا تھا۔ شاید سلطان آگیا ہو۔ ماں، ماسی میراں اور سوہنی کی خیریت بھی معلوم کرنا ہے۔“

”میں بہت شرمندہ ہوں اقبال.....“

”نہیں میڈم پلیز.....“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

وہ شرمندہ نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہ گئی۔

میں نے چائے ختم کر کے چاروں طرف دیکھا پھر قاریہ سے مخاطب ہوا۔ ”چلیں میڈم!“

”ہاں..... چلتے ہیں.....“ اس نے مجھے مجھے انداز میں جواب دیا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ یہاں مزید بیٹھنا چاہتی ہو۔

”اگر آپ بیٹھنا چاہتی ہیں تو.....“

”نہیں..... ایسی بات نہیں، بس میری طبیعت کچھ عجیب سی ہو رہی ہے، میرا دل کسی بھی جگہ، کسی بھی کام میں نہیں لگ رہا۔ گھر جانے کو بھی دل نہیں چاہ رہا۔“

”پھر آپ ایسا کریں کہ میرے ساتھ چلیں، کام بھی ہو جائے گا اور ممکن ہے کہ آپ کا دل بھی بہل جائے۔“

”مگر کہاں؟“

”ہم یہاں سے سیدھے سلطان کے گھر چلیں گے، اسی سے اداریس کا ایڈریس بھی معلوم ہو جائے گا۔“

”ہاں چلو.....“ وہ فوراً ہی کھڑی ہو گئی۔ ہم کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئے جو گیٹ کے قریب ایک گھنے درخت کے نیچے بنایا گیا تھا اور جہاں ایک خوب صورت نوجوان بیٹھا تھا جو ہمیں دیکھ کر مسکرایا اور بل ہماری طرف بڑھا دیا۔

میں نے بل ادا کیا اور ہم دونوں گیٹ سے نکل کر گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ چند ہی لمحوں بعد ہم کرشن نگر کی طرف جا رہے تھے۔ شام ڈھل چکی تھی اور بازار میں اچھا خاصا رش تھا۔ ہم کرشن نگر کی جس سڑک پر جا رہے تھے وہاں دکانیں ہی دکانیں تھیں۔ ان کے علاوہ ٹھیلے، تانگے، سائیکلیں اور پیدل چلنے والوں کا بے انتہا رش طبیعت کو خواہ خواہ الجھا رہا تھا۔ مجھے گاڑی کی رفتار ہلکی کرنا پڑی۔ ہم اس رش سے گزرتے ہوئے اس گلی کے موڑ پر پہنچ گئے جو سلطان کے گھر کی طرف جاتی تھی۔

”توبہ ہے..... میرا دل گھبرا گیا اس جگہ سے، لوگ یہاں کیسے رہتے ہوں گے اقبال؟“

”یہ لوگ آپ کے علاقوں میں جا کر اسی طرح گھبرا جاتے ہیں میڈم کہ ہم کہاں آ

گئے، جہاں بندہ نہ بندے کی ذات، صرف اونچی اونچی دیواریں ہیں جو پورے پورے خاندانوں کو یوں ہڑپ کیے بیٹھی ہیں جیسے وہاں زندہ لوگ رہتے ہی نہ ہوں۔ زندگی کا یہ ڈھنگ زندگی کو بھرپور بناتا ہے میڈم، یہاں سب ایک دوسرے کے دکھ سکھ سے واقف ہوتے ہیں، مگر وہ علاقے..... معاف کیجئے گا جہاں آپ لوگ رہتے ہیں، کسی قبرستان کی طرح محسوس ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے سے اتنی بیگانگی ہوتی ہے کہ دیوار کے اُس طرف اگر کوئی ذبح بھی کر دیا جائے تو دیوار کے اِس طرف رہنے والوں کو پتا بھی نہیں چلتا۔“

”سچ کہتے ہو اقبال، ہم لوگوں نے منفرد ہونے کے لیے اپنے گرد کیسے اُن دیکھے دائرے کھینچ لیے ہیں کہ ہم اپنے بنائے ہوئے دائروں میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہم نے خود ہی زندگی کی رفتار کو کسی قدر ست اور بے جان سا بنا دیا ہے کہ ارتقاء کی منزلیں بہت دور محسوس ہوتی ہیں۔“ اس نے لمبا سانس لے کر جواب دیا۔

اس کی بات ختم ہوتے ہی سلطان کا گھر آگیا۔ میں نے گاڑی روکی۔ ”آئیے میڈم!“

”یہاں؟“

”جی!“

”سلطان اتنے بڑے مکان میں رہتا ہے؟“

”جی نہیں میڈم، اس مکان کا صحن اور سیڑھیاں اگرچہ ایک ہی ہیں مگر یہاں چار پانچ خاندان آباد ہیں، ذات، رنگ اور نسل میں ایک دوسرے سے بہت مختلف مگر لگتا ہے جیسے سب ایک ہی خاندان، ذات اور رنگ کے ہوں۔“ میں نے دروازہ کھولتے ہوئے جواب دیا۔ ”سلطان اسی مکان کے اوپر بنے ہوئے ایک کمرے میں رہتا ہے۔“

قاریہ دوسری جانب کا دروازہ کھول کر باہر آگئی۔ میں نے گاڑی کے دروازے لاک کیے اور قاریہ کی رہنمائی کرتا ہوا ان تاریک سیڑھیوں تک آگیا جو اوپر جا رہی تھیں۔

ہم آگے پیچھے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر پہنچ گئے۔ سلطان کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھٹکھٹایا مگر اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد دروازے کو پھر بجایا۔ میرا خیال تھا کہ اگر سلطان اندر موجود ہے تو یقیناً سو رہا ہو گا ورنہ پہلی دستک پر ہی دروازہ کھول دیتا۔ اس بار میں نے دروازے کو زور سے بجایا تھا جس کی آواز سے ساتھ والا دروازہ کھل گیا اور ایک لڑکی کا چہرہ نظر آیا۔

”کیا بات ہے جی؟“ اس نے اکھڑ لہجے میں پوچھا۔

”وہ جی سلطان سے ملے آئے تھے ہم۔“ میں نے جواب دیا۔

”وہ تو ہفتے بھر سے نہیں آئے۔“

”ہفتے بھر سے نہیں آئے؟“

”جی..... آتے تو ہمیں معلوم ہو جاتا۔“ اس نے میرے برابر کھڑی فاریہ کو سر

سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے مجھے جواب دیا۔ ”یہ تمہاری زنانی ہے؟“ اس کے آخری جملے نے مجھے بوکھلا دیا۔ فاریہ بھی جھل سی ہو گئی۔

”اچھا..... ابھی سگائی نہیں ہوئی شاید۔“ اس نے ایسے انداز میں کہا جیسے اچانک

کوئی بڑا فلسفہ اس کی سمجھ میں آگیا ہو۔ اس کے ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ تھی۔

”نہیں۔ تم غلط سمجھ رہی ہو۔“ میں نے جلدی سے جواب دیا اور سیڑھیوں کی

طرف بڑھ گیا۔ فاریہ میرے پیچھے تھی۔ ہم سیڑھیاں اتر کر باہر آئے۔ میں نے آگے بڑھ

کر گاڑی کا دروازہ کھولا اور اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بوکھلاہٹ میں، میں فاریہ کی سیٹ کا

دروازہ کھولنا بھی بھول گیا بلکہ خود فاریہ کی موجودگی ہی کو فراموش کر بیٹھا۔ میں نے چابی

سیلف میں ڈال کر گھمائی اسی وقت شیشے پر ہونے والی ٹک ٹک نے مجھے اپنی جانب متوجہ

کر لیا۔ میں نے نگاہ اٹھائی۔ فاریہ مجھے دروازے کا لاک کھولنے کو کہہ رہی تھی۔ میں نے

گھبرا کر لاک کھولا اور دروازے کو دھکادے کر کھول دیا۔

”سوری میڈم.....“

”سو آل رائٹ!“ اس نے سیٹ پر بیٹھتے ہوئے دھیرے سے کہا۔ اس کے ہونٹوں پر

دبی دبی مسکراہٹ تھی۔ شاید اس نے میری بوکھلاہٹ کو محسوس کر لیا تھا۔

میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

”کہاں جانا ہے میڈم؟“

”گھر..... ہمیں اسپتال سے نکلے بہت دیر ہو گئی ہے، معلوم نہیں زاریہ کیسی

ہے؟ اقبال، میں اس مسلسل ٹینشن سے اکتا گئی ہوں۔ تھک گئی ہوں بری طرح۔ اگر

زاریہ ٹھیک ہوتی تو میں کم از کم اپنے مشن میں مصروف رہتی۔“

”مشن؟“ میں نے استفہامیہ انداز میں پوچھا۔

”ہاں..... ہیروئن کے ان سمگلروں کو نیست و نابود کر دینے کا مشن، میں نے عہد

کیا تھا کہ میں تمام زندگی چین سے نہ بیٹھوں گی۔ اگر انہیں ختم نہ کیا تو.....“

”میڈم آپ اس سلسلے میں حکومت سے مدد کیوں نہیں لیتیں؟“

”حکومت؟ اونہ، حکومت کے سرکردہ افراد ہی تو ان سمگلروں کی پشت پناہی کرتے

ہیں، وہ بھلا میرا ساتھ کیوں دیں گے۔“

”نہیں میڈم، ایسا نہیں ہے، سب لوگ کرپٹ نہیں، یہاں ایسے لوگ بھی ہیں جو

مخلص ہیں، دیانت دار ہیں اور اس لعنت کو ختم کرنے میں آپ کا پورا پورا ساتھ دیں

گے۔“

وہ چونک اٹھی۔ اس نے مجھے گہری نگاہوں سے دیکھا۔ میں نے لمحہ بھر اس کی طرف

دیکھا اور پھر نگاہیں سڑک پر جمادیں۔

”کون ہیں وہ؟ کیا تم انہیں جانتے ہو؟“

”نہیں میڈم میں تو یہاں سوائے آپ لوگوں کے کسی کو بھی نہیں جانتا..... میرا

مطلب یہ تھا کہ پوری کائنات کے تمام لوگ یا کسی ملک کے تمام باشندے خراب نہیں

ہوتے، خرابیوں میں کہیں کہیں اچھائیاں بھی چھپی ہوتی ہیں۔ آپ اگر چاہیں تو ایسے

مخلص لوگوں تک پہنچ سکتی ہیں۔“

”ہوں۔“ اس نے گہرا سانس لیا۔ ”ہاں یہ ممکن ہے مگر مخلص کے چہرے پر تو نہیں

لکھا ہوتا کہ وہ واقعی مخلص ہے۔“

”میڈم ایک بات میرے ذہن میں چبھ رہی ہے۔ اگر اجازت دیں تو میں پوچھ

لوں.....!“

وہ مسکرائی۔ ”پوچھو، ذہن میں کسی چیز کو چھوڑا نہیں کرو اقبال، کانٹا اگر چھہارہ

جائے تو زخم کو بڑھا دیتا ہے۔“

”تھینک یو میڈم، بات یہ ہے کہ آپ کے گھر میں ایک عورت داخل ہوئی، جو

سراسر غیر قانونی طریقہ تھا۔ دوسرا یہ کہ یعقوب نے زاریہ کی زندگی لینے کی کوشش کی،

نس میں وہ عورت بھی ملوث تھی۔ یہ دونوں کام ایسے تھے کہ آپ فوراً پولیس کو مطلع کر

کتی تھیں۔ وہ یعقوب کو پکڑ لیتے اور اس سے اگلا لیتے کہ وہ عورت کون تھی۔ عورت

کی تلاش پولیس کا درو سر تھا نہ کہ آپ کا، اس طریقے پر عمل کرنے سے نہ صرف یہ کہ ہم بہت سی پریشانیوں سے بچ جاتے بلکہ وہ پوری چین کی چین گرفتار ہو سکتی تھی۔ پھر آپ کا موجودہ طریقہ کار میرے لیے سوالیہ نشان بن کر رہ گیا ہے۔“

”پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے پولیس پر اعتماد نہیں، وہ ہزار دو ہزار یا زیادہ سے زیادہ پانچ سات ہزار روپے لے کر یعقوب کو چھوڑ دیتے۔ دوسری بات یہ کہ وہ زاریہ کے لیے کچھ بھی نہ کر پاتے، تیسری بات یہ کہ میں اپنے دشمنوں سے خود ہی غمنا چاہتی ہوں..... اور کوئی بات؟“ اس کے سپاٹ لہجے اور آخری جملے نے میری ہمت پست کر دی اور میں نفی میں سر ہلا کر رہ گیا۔

ہم گھر کے قریب پہنچ چکے تھے۔ گیٹ تک کا راستہ خاموشی سے گزرا۔ گیٹ بند تھا۔ چوکیدار گیٹ پر نہیں تھا۔ میں نے کئی بار ہارن دیا۔ سکندر خان فاریہ کی ہدایت کے مطابق بیگ صاحب کے کمرے میں تھا۔ ہارن کی آواز سن کر آیا اور جیب سے چابیاں نکال کر گیٹ کھول دیا۔ میں گاڑی کو پورچ میں لیتا چلا گیا۔

گاڑی پارک کر کے میں اور فاریہ دونوں ہی کوٹھی کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئے۔ ہم پہلے بیگ صاحب کے کمرے میں گئے۔ میں نے اور فاریہ نے ان کی خیریت دریافت کی پھر ہم دونوں ڈرائنگ روم میں چلے آئے۔ فاریہ نے فوراً اسپتال کا نمبر ڈائل کیا، چند لمحوں بعد ہی نمبر مل گیا۔ فاریہ نے ڈاکٹر طارق کو بلانے کی بجائے وہاں کے کاؤنٹر کا نمبر لیا اور وہاں سے روم نمبر ۲۱ کے مریض کی خیریت دریافت کر لی۔ ڈاکٹر طارق کہہ چکے تھے کہ انہیں ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ شاید اس لیے فاریہ نے انہیں نہیں بلوایا تھا۔

ہم کچھ دیر وہاں بیٹھے باتیں کرتے رہے پھر اچانک فاریہ نے کہا۔ ”اقبال“ وصی صاحب کو فون کر کے آفس کی صورت حال معلوم کر لینا۔ کل میں ضرور آفس جاؤں گی۔“

”اوکے میڈم ایز یو لائیک!“

”کھانا کھائیں؟“ فاریہ نے مجھ سے پوچھا۔

”ضرور..... مجھے تو بھوک محسوس ہو رہی ہے۔“

ہم دونوں ڈرائنگ روم سے باہر آ گئے۔ حمیدہ ہمیں برآمدے ہی میں مل گئی۔ وہ ہمیں یہی اطلاع دینے آ رہی تھی کہ کھانا لگ گیا ہے۔ میں اور فاریہ ڈرائنگ روم میں

داخل ہوئے۔ بیگ صاحب وہاں موجود تھے۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ ہم قریب پہنچے تو انہیں ہماری آمد کا علم ہوا۔

”آؤ بچو..... مجھے بھوک تو نہیں ہے مگر تم لوگوں کے ساتھ کچھ دیر بیٹھنے کے لیے یہاں آ گیا۔“

میں نے محسوس کیا کہ بیگ صاحب بہت پریشان اور بے چین ہیں۔ ان کے لہجے میں لرزش تھی اور چہرے کا رنگ پیلا ہو رہا تھا۔

”بیگ صاحب! آپ..... ٹھیک تو ہیں نا؟“ میں نے انہیں گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میرے پوچھنے پر فاریہ نے بھی چونک کر بیگ صاحب کو دیکھا۔ ”انکل..... آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”ہاں بیٹا..... میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے مگر میں..... میں کچھ بہت ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں تم لوگوں سے۔“

”یہاں بیٹھے بیٹھے تو آپ تھک جائیں گے۔ اگر ایسی بات تھی تو ہمیں اپنے کمرے میں بلوایا ہوتا۔ چلے آپ کے کمرے میں چلتے ہیں، وہیں باتیں بھی ہو جائیں گی۔“ میں نے اٹھ کر ان کے ہاتھ تھامے اور انہیں سارا دے کر باہر لے آیا۔

”مگر تم لوگ کھانا تو کھا لو۔“

”کھالیں گے کھانا..... آپ فکر نہ کریں۔“ فاریہ نے جواب دیا۔

”نہیں۔ پہلے تم لوگ کھانا کھاؤ گے پھر میں باتیں کروں گا۔“ انہوں نے ضدی انداز میں کہا۔

”ٹھیک ہے کھانا وہیں منگوا لیتے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

ہم بیگ صاحب کے کمرے میں آ گئے۔ سکندر خان گیٹ کے قریب بنی کوٹھی میں

جا چکا تھا۔ حمیدہ غالباً کچن میں تھی۔ فاریہ نے بیل بجا کر اسے وہیں بلوایا اور ہدایت کی کہ

کھانا ٹرائی میں رکھ کر بیگ صاحب کے کمرے میں لے آئے۔ میں نے بیگ صاحب کو بستر

پر لٹا دیا۔ ان کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ میں نے بیڈ کو سرہانے سے اونچا کر دیا تاکہ وہ

آرام سے لیٹ سکیں۔

”آپ نے دوالی تھی؟“

”ہاں لی تو تھی مگر تم یہ چھوٹی گولی دے دو، میں زبان کے نیچے رکھ لوں گا، درد میں کچھ کمی ہو جائے گی۔“ انہوں نے گہری سانسوں کے درمیان کہا۔

میں نے جلدی سے ایک شیشی کھول کر گولی نکالی اور ان کے ہاتھ پر رکھ دی جسے انہوں نے فوراً ہی زبان کے نیچے رکھ لیا۔

”انکل ڈاکٹر کو بلواؤں؟“

”نہیں بیٹا، ایسی کوئی تکلیف نہیں ہے، دوالی ہے نا میں نے، ٹھیک ہو جائے گا۔ ویسے بھی ڈاکٹر طارق کو ڈسٹرب کرنا بہتر نہیں ہے۔ وہ بے چارے وقت بے وقت تو آ جاتے ہیں، انہیں اپنا کاروبار بھی چلانا دو۔“

فاربی خاموش ہو گئی۔ حمیدہ کھانے کی ٹرائی وہیں لے آئی۔ میں اور فاربی کھانا کھانے لگے۔ بیگ صاحب ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ جبکہ میں اور فاربی منتظر تھے کہ وہ کوئی خاص بات کریں گے مگر انہوں نے ایسی کوئی بات نہ کی جو کسی بھی اعتبار سے اہم ہو۔ ہم کھانا کھاتے رہے کھانا ختم کیا تو حمیدہ چائے لے آئی۔ وہ بیگ صاحب کے لیے دودھ میں کمپلن بھی ملا لائی تھی۔ چائے پینے کے دوران ہی فاربی نے بیگ صاحب سے کہا۔

”انکل آپ کچھ اہم باتیں کرنے والے تھے۔“

”ہاں بیٹا۔۔۔۔۔۔ میں بہت دنوں سے بتانا چاہ رہا تھا مگر ہمت نہیں پڑتی تھی لیکن فاربی، پہلے تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم مجھے معاف کر دو گی۔“

”کیسی باتیں کر رہے ہیں انکل۔۔۔۔۔۔ آپ نے کبھی ایسا کچھ نہیں کیا جس کے لیے آپ کو معافی مانگنے کی ضرورت پڑے۔“

”ایسا نہ کو بیٹا، تمہارے اس اعتماد ہی نے تو مجھے موت کے کنارے پہنچا دیا ہے۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں انکل؟“

”ٹھیک کہہ رہا ہوں بیٹا۔۔۔۔۔۔ اگر تم مجھ پر اتنا اعتماد نہ کرتیں تو۔۔۔۔۔۔ تو شاید میں اس دلدل میں کبھی نہ دھنستا۔“ بیگ صاحب کے چہرے پر شدید تکلیف کے آثار تھے۔

میں اور فاربی ان کی باتوں پر بہت حیران تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ان کا ذہنی توازن بگڑ

گیا ہو۔

”بیٹا۔ جو کچھ بہادر کرتا ہے۔۔۔۔۔۔ وہی۔۔۔۔۔۔ میں بھی کرتا رہا ہوں۔“ انہوں نے اٹکتے ہوئے کہا۔ ان کی نگاہیں فاربی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور آنکھوں میں شدید خوف تھا۔

میں اور فاربی ان کے اس جملے پر اچھل پڑے۔

”انکل۔۔۔۔۔۔ آپ۔۔۔۔۔۔ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں، کیا آپ جانتے ہیں۔۔۔۔۔۔ کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ وہ چیخ اٹھی۔

”ہاں۔۔۔۔۔۔ میں جانتا ہوں۔ مجھے تکلیف ضرور ہے فاربی مگر میں بقید ہوش و حواس تمہیں یہ سب کچھ بتا رہا ہوں۔ میں بھی وہی کچھ کر رہا تھا جو بہادر کرتا ہے۔ تمہاری فیکٹری میں چڑے کی جیکٹس کی خفیہ جیبوں میں ہیروئن بھر کر جرمنی جاتی رہی ہے۔ میں اس گناہ کا ذمے دار ہوں فاربی، مگر جب سے زاریہ کی حالت دیکھی ہے میں نے توبہ کر لی ہے۔ پھر بھی۔۔۔۔۔۔ جو آرڈرز پہلے سے آچکے تھے ان پر ابھی تک کام ہو رہا ہے۔ میں اس کام کو رکوانا چاہتا ہوں فاربی لیکن میرے اس گناہ میں جو دوسرے لوگ ملوث ہیں ان کا مفاد بھی ان آرڈرز سے وابستہ ہے۔ وہ اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہتے ہیں جبکہ میں ایسا نہیں چاہتا۔۔۔۔۔۔ اب وہ لوگ الٹا مجھے بلیک میل کر رہے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ میں نے ان پر زیادہ دباؤ ڈالا تو۔۔۔۔۔۔ تو نہ صرف یہ کہ فیکٹری بند ہو جائے گی بلکہ براہ راست تم پر حرف آئے گا۔ مجھے معاف کر دو فاربی اور میری مدد کرو۔ پلیز۔۔۔۔۔۔ فاربی۔۔۔۔۔۔“

وہ بولے جا رہے تھے اور میں اور فاربی دونوں پتھر کے بتوں کی طرح ساکت و جلد بیٹھے انہیں دیکھ رہے تھے۔ مجھے تو ان کی باتوں پر بالکل یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ نہ معلوم فاربی کی کیا حالت تھی؟ چہرے سے تو کچھ بھی پتا نہیں چلتا تھا۔ اس کی نگاہیں گویا منجمد ہو چکی تھیں۔ وہ سیدھی، بالکل پتھر کی مورتی کی طرح بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ بے جان تھا۔ میں نے خود پر جلد ہی قابو پالیا اور میں فاربی کی طرف متوجہ ہوا۔ بیگ صاحب بھی خوفزدہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”میڈم۔۔۔۔۔۔!“

”ہوں!“ وہ ایک دم چونک اٹھی۔ ”کیا..... کیا ہے؟“
”میڈم..... آپ ٹھیک ہیں نا؟“

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ بلکہ وہ بیگ صاحب سے مخاطب ہوئی۔ ”وہ کون لوگ ہیں؟“ اس کا انداز ٹھہرا ہوا مگر زہریلا تھا۔

”وہ..... وصی صاحب ہیں۔ باقی جو لوگ ان کے انڈر میں کام کرتے ہیں ان میں کون اس معاملے میں ملوث ہے۔ اس کے بارے میں وہی زیادہ جانتے ہیں۔ میں نے اس ڈیٹ میں صرف وصی کو شامل کیا تھا۔“ بیگ صاحب نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

وہ بیگ صاحب کے منہ سے وصی صاحب کا نام سنتے ہی کھڑی ہو گئی۔ ”اقبال“ گاڑی نکالو۔“

”فاریہ..... ایسے نہیں بیٹے..... ٹھنڈے دماغ سے سوچ لو پھر کوئی پلاننگ کرو ورنہ.....“

”ورنہ کیا ہو گا انکل..... میں تباہ ہو جاؤں گی؟ سو وہ تو ہو ہی رہی ہوں۔ فیکٹری بند ہو جائے گی تو اس کی مجھے پرواہ نہیں ہے۔ آپ نے..... آپ نے مجھے تو ڈر کر رکھ دیا انکل..... تباہ کر دیا مجھے۔“ وہ اچانک بری طرح رونے لگی۔

مجھ پر اور بیگ صاحب پر تو سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ کمرے میں صرف فاریہ کے رونے کی آواز گونج رہی تھی۔ وہ بے طرح رو رہی تھی۔ نہ ہی بیگ صاحب کی ہمت ہوئی کہ اسے دلاسا دے پاتے اور نہ ہی میری۔ ویسے بھی اس کے لیے جی بھر کر رونا بہتر ہی تھا۔ اس کے اندر جو طوفان اتنے دنوں سے ٹھائیں مار رہا تھا اس کا نکل جانا ہی اس کے لیے بہتر تھا ورنہ مجھے تو ڈر تھا کہ پے درپے ہونے والے صدمات اسے پاگل نہ کر دیں۔ میں نے یہی سوچ کر اسے رونے دیا اور خود اٹھ کر دبے پاؤں باہر آ گیا۔

آسمان پر گہری سیاہی چھائی ہوئی تھی۔ فضاؤں پر سناٹا طاری تھا یوں لگتا تھا جیسے پوری کائنات ساکت ہو گئی ہو۔ میں بے دم سا ہو کر باہر لگے ستون سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور سوچنے لگا کہ سلطان نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ۔ ”بالے یہاں کچھ ہو رہا ہے“ کچھ گڑبڑ ہے۔“

مگر اس وقت مجھے گمان بھی نہ تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ شروع شروع میں تو میں

خود بھی یہاں کے ماحول سے گھبرا گیا تھا بلکہ خوف زدہ ہو گیا تھا مگر پھر رفتہ رفتہ فاریہ اور بیگ صاحب پر میرا اعتماد بحال ہو گیا تھا اور اب تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ فیکٹری میں یہ ڈراما بھی کھیلا جا رہا ہو گا۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ بیگ صاحب بہت کم فیکٹری جاتے تھے بلکہ جب سے میں آیا تھا وہ زیادہ تر گھر پر ہی رہے تھے۔ ممکن ہے وصی صاحب سے ان کا رابطہ فون پر قائم رہا ہو۔ بہر حال جو کچھ بھی تھا یہ بہت خطرناک بات تھی۔ اتنی خطرناک کہ فاریہ گرفتار بھی ہو سکتی تھی۔

میں کانپ کر رہ گیا۔ نہ معلوم اس گھر پر اور گھر والوں پر کون سا عذاب نازل ہوا تھا جو ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ ایک پریشانی ختم ہوئی نہیں تھی کہ دوسری پریشانی منہ پھاڑے کھڑی ہوئی تھی۔

”اقبال!“ اچانک فاریہ کی آواز سن کر میں چونک اٹھا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ فاریہ بیگ صاحب کے کمرے کی کھڑکی کھولے کھڑے تھی۔ میں جلدی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اندر کا بو جھل پن کچھ کم محسوس ہو رہا تھا۔ بیگ صاحب خاموش لیٹے چھت کو تنک رہے تھے مگر ان کے چہرے کی پیلاہٹ کچھ کم ہو چکی تھی۔ فاریہ نارمل تھی بلکہ رونے کے بعد نکھری نکھری سی لگ رہی تھی گو اس کے چہرے پر پھیلی اداسی اور دکھ کا سایہ اب بھی گہرا تھا۔

”اقبال بیٹھو۔“ اس نے سامنے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

”میں انسپکٹر قدیر کو جانتی ہوں۔ وہ بچھلے تئیں برس سے پولیس کی سروس میں ہے اور میں اسے تقریباً بارہ پندرہ برس سے جانتی ہوں۔ وہ لوگ ہمارے محلے میں رہتے تھے۔ قدیر کے والد اور میرے والد گہرے دوست تھے۔ گویا ہم بچپن ہی سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ اس جان پہچان کے باوجود میں نے اسے اپنے مشن کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ یہ میرا اندازہ ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ میری سرگرمیوں کے بارے میں جانتا ہے۔ اس نے دبے لفظوں میں میری مدد کرنے کی پیشکش بھی کی تھی جسے میں نے شکریہ کہہ کر ٹھکرا دیا تھا۔ وجہ وہی تھی کہ میں اپنے دشمنوں سے خود ہی نمٹنا چاہتی تھی۔ بہر حال تمہیں یہ سب کچھ بتانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اب اس کی مدد ناگزیر ہو گئی ہے۔ آج نہیں تو کل یہ بات کھل جائے گی اور جو کچھ کل ہو گا وہی آج بھی ہو گا۔ عرصے کو طویل کرنے سے

معاملے کی سنگینی پر کچھ اثر نہ پڑے گا بلکہ ہو سکتا ہے کہ معاملات اور زیادہ الجھ جائیں۔ میں چاہتی ہوں کہ اسے تمام صورت حال بتا کر اس سے قانونی مدد حاصل کی جائے، تم صرف اتنا کرو کہ صبح سویرے ہی آفس جا کر تمام شپنگ رکوا دو، تمام آرڈر کینسل کر دو اور سامان کو اسی جگہ سیل کر دو۔ وجہ صرف یہی بتانا کہ زاریہ کی حالت خراب ہونے کے بعد بیگ صاحب پر بھی دل کا دورہ پڑا ہے اور ان کی حالت خراب ہو گئی ہے۔ میں بہت زیادہ مصروفیت کی وجہ سے فیکٹری کو بند کر رہی ہوں۔“

”ایک منٹ میڈم! اس طرح قانونی پیچیدگیاں پیدا نہیں ہو جائیں گی؟“

”نہیں تم کل ہی ملازمین کو دو دو ماہ کی ایڈوانس تنخواہ دے دو اور انہیں کہہ دو کہ دو ماہ بعد انہیں بائی پوسٹ فیکٹری میں آنے یا نہ آنے کی اطلاع کر دی جائے گی یا اخبار میں اشتہار دے دیا جائے گا۔ تم کہہ سکتے ہو کہ حالات خراب ہونے کی وجہ سے فیکٹری کو بند کرنا ناگزیر ہو گیا ہے۔ فی الحال اتنا ہی کرو بعد میں سوچیں گے کہ کیا کیا جائے؟“

”جی میڈم ہر کام آپ کی ہدایت کے مطابق ہو جائے گا۔“

”اوکے“ ڈرائنگ روم میں سائیڈ کارنر پر ایک گرین کلر کی ڈائری رکھی ہے اس میں انسپکٹر قدیر کا فون نمبر ہے۔ اسے فون کر کے پیغام دو کہ وہ پہلی فرصت میں مجھ سے میری کوٹھی پر ملاقات کرے۔“

”جی بہتر میڈم!“ میں یہ کہہ کر بیگ صاحب کے کمرے سے نکل آیا۔ سیدھا ڈرائنگ روم میں پہنچا۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد ہی مجھے انسپکٹر قدیر کا نمبر بھی مل گیا۔ میں نے نمبر ڈائل کیا۔ چند لمحوں کے بعد ہی دوسری جانب سے ایک بھاری سی آواز سنائی دی۔

”میں انسپکٹر قدیر سے بات کر سکتا ہوں؟“

”وہ اس وقت ڈیوٹی پر نہیں ہیں۔ آپ کون صاحب؟“

”جی مجھے اقبال کہتے ہیں، میں مس فاریہ کی کوٹھی سے بات کر رہا ہوں۔ آپ بتا سکیں گے کہ وہ اس وقت کہاں ہوں گے؟“

جی نہیں اقبال صاحب، یہ بتانا تو بہت مشکل ہے، مس فاریہ کیسی ہیں، میں قدیر کا بھائی نذیر بات کر رہا ہوں۔ آپ پیغام دے دیں۔ وہ جیسے ہی آئیں گے میں پیغام انہیں

دے دوں گا۔ دوسری طرف بات کرنے والے کا انداز نہایت شستہ تھا۔

”بس آپ ان سے.....“

”ایک منٹ وہ آگئے!“ دوسری جانب سے کہا گیا۔ پھر چند لمحے بعد ہی ایک دوسری

آواز آئی۔ ”ہیلو انسپکٹر قدیر۔“

”قدیر صاحب میں اقبال بول رہا ہوں مس فاریہ کا ملازم ہوں۔ انہوں نے آپ کے

لیے پیغام دیا ہے۔ اگر ہو سکے تو آپ ان سے کوٹھی پر مل لیں۔“

”خیریت؟“ اس نے تشویش ناک لہجے میں پوچھا۔

”آپ آجائیں تو آپ کو پوری صورت حال کا پتا چل جائے گا۔“ میں نے جواب

دیا۔

”فاریہ اور زاریہ دونوں ٹھیک ہیں نا؟“ اس نے میرے جواب کو نظر انداز کر کے

دوبارہ پوچھا۔

”جی ہاں! دونوں خیریت سے ہیں۔“

”ٹھیک ہے مسٹر اقبال میں پندرہ منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔“

”اوکے!“ میں نے ریسور رکھ دیا۔

پھر میں سیدھا بیگ صاحب کے کمرے میں چلا آیا۔ میں نے انسپکٹر قدیر سے ہونے

والی گفتگو فاریہ کو بتائی۔ بیگ صاحب اب بھی بالکل خاموش تھے۔

”انکل..... یہ سب کچھ میں آپ کے حق میں کر رہی ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوا

تو..... تو آپ خود بھی گرفتار ہو جائیں گے۔“ فاریہ نے گہیر لہجے میں کہا اور اٹھ کر

کھڑی ہو گئی۔

”میں باہر جا رہی ہوں، قدیر پہنچنے میں دیر نہیں لگائے گا۔ آپ اچھی طرح اونچ نیچ

سوچ لیجئے۔ آپ کو ہر بات بتانا ہوگی۔ ان تمام لوگوں کے نام بھی جو اس معاملے میں ملوث

ہیں۔“

”کیا تم بہادر والا معاملہ بھی اس سے ڈسکس کروں گی؟“ بیگ صاحب نے پوچھا۔

”نہیں“ وہ معاملہ اگر میں نے قدیر سے ڈسکس کیا تو وہ کبھی بھی مجھے اجازت نہیں

دے گا اور ممکن ہے کہ میرے کاموں میں مداخلت کرے، حالانکہ میرا اندازہ ہے کہ وہ

کافی کچھ جانتا ہے۔“ اتنا کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ چلتے چلتے اس نے مجھے اشارہ کیا۔ میں بھی اس کے پیچھے ہی باہر آ گیا۔ ہم بیگ صاحب کے کمرے سے نکل کر کوٹھی کے سامنے والے برآمدے میں آ گئے جہاں کرسیاں پڑی تھیں اور بلب روشن تھا۔ ”میڈم میں چوکیدار کو بتا دوں کہ قدیر صاحب آنے والے ہیں۔“

”ہاں ویسے وہ قدیر کو پہچانتا ہے۔“

”یعنی اسے بتانا ضروری نہیں؟“

”ہاں بتا دو وہ ہماری اجازت کے بغیر گیٹ نہیں کھولے گا۔“ فاریہ نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

میں سر ہلا کر گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ سکندر خان الرٹ تھا۔ مجھے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ میں نے اسے انسپکٹر قدیر کی آمد کے بارے میں بتایا اور پلٹ کر برآمدے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ عین اسی وقت گیٹ کے باہر گاڑی رکنے کی آواز سے رک گیا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ انسپکٹر قدیر ہی تھا۔ میں نے سکندر کو چھوٹی سی کھڑکی سے اس سے بات کرتے دیکھا پھر سکندر جیب سے چابی نکالتا ہوا گیٹ کی طرف آیا۔

”صاحب انسپکٹر قدیر آ گئے ہیں!“ اس نے مجھے اطلاع دی۔

”ہاں میں جانتا ہوں۔“

سکندر گیٹ کی طرف بڑھا اور اس نے گیٹ کھول دیا۔ انسپکٹر قدیر گاڑی اندر لے آیا۔ میں اس کی گاڑی کے پیچھے چلتا ہوا برآمدے میں آ گیا۔ اس نے شاید فاریہ کو وہاں بیٹھے دیکھ لیا تھا۔ برآمدے کی سیڑھیوں سے بہت قریب اس نے گاڑی روکی اور فوراً ہی اتر کر فاریہ کی طرف بڑھا جو اسے دیکھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

”فاریہ سب ٹھیک ہے نا؟“ اس نے پوچھا۔

میں آ گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ لمحہ بھر کو چونکا پھر استغما میہ انداز میں فاریہ کو دیکھا۔

فاریہ نے مختصر الفاظ میں میرا تعارف کرایا۔

اس دوران میں میں اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ چھ فٹ کا لمبا چوڑا اور خوب صورت جوان تھا۔ اس کے شانے چوڑے اور جسم کسرتی تھا۔ وہ اب بھی پولیس کی وردی میں تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ لمحہ بھر کو بھی گھر پر نہیں رکا اور فون سنتے ہی سیدھا

چلا آیا ہے۔

”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا فاریہ، کیا تم ٹھیک ہو؟“

”ہاں قدیر..... اگر ٹھیک ہونا محض زندہ رہنے کو کہتے ہیں تو میں ٹھیک ہوں۔“

”اور زاریہ، انکل.....؟“

”میں سب کچھ بتا دوں گی تم بیٹھو تو۔“

اس نے غور سے فاریہ کو اور پھر مجھے دیکھا۔ ”سم تھنگ رونگ!“ وہ زیر لب بڑبڑایا اور ایک کرسی کھینچ کر فاریہ کے قریب بیٹھ گیا۔

”فاریہ تم بہت ٹھنڈے دماغ کی عورت ہو۔ مگر میرے ساتھ معاملہ کچھ مختلف ہے۔ مجھے جلدی جلدی سب کچھ بتا دو تاکہ میری پریشانی کم ہو سکے۔ تمہیں شاید اندازہ نہ ہو کہ گھر سے یہاں تک کا سفر میں نے محض سات منٹ میں طے کیا ہے۔ جبکہ یہ سفر بیس یا پچیس منٹ پر محیط ہے۔“

”میں جانتی ہوں!“ فاریہ دھیرے سے مسکرائی۔ پھر اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”بیٹھو اقبال!“

میں بھی بیٹھ گیا۔ قدیر بہت بے چین طبیعت کا مالک تھا۔ اتنی سی دیر میں اس نے کئی بار پہلو بدلا۔ پھر جیب سے گولڈ لیف کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ سلگایا اور لمبا کش لے کر فاریہ کو دیکھنے لگا۔

فاریہ جو اس کی بے چینی کو محسوس کر رہی تھی دھیرے دھیرے بولنے لگی اور پھر اس نے زاریہ کے زخمی ہونے سے لے کر انکل کے اس نئے انکشاف تک کی ساری کہانی اسے سنا دی۔ اس نے زاریہ کے بارے میں بتا دیا کہ وہ ہیروئن کی عادی ہو گئی تھی مگر یہ بات گول کر گئی کہ یعقوب نے اسے ہیروئن دی تھی یا یہ کہ وہ بہادر اور سیمائ کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ اس نے یعقوب، بہادر اور سیمائ کا نام سرے سے گول کر دیا۔

”زاریہ کو کس نے زخمی کیا؟“ انسپکٹر قدیر نے پوچھا۔

”معلوم نہیں، اس روز ہم گھر پر نہیں تھے، واپس آئے تو وہ بے ہوش تھی

اور..... آج تک ہوش میں نہیں آئی۔“

”تمہیں کس پر شک ہے؟“

”کسی پر نہیں، ہو سکتا ہے یہ ان لوگوں کی انکل کو دھمکی ہو جو انکل کو بلیک میل کر رہے ہیں۔“

”ہوں۔ اس کا آپریشن کب ہے؟“

”کل صبح کراچی کے ایک برین اسپیشلسٹ ڈاکٹر تجل اس کا آپریشن کریں گے۔“

”تم نے اس واقعہ کی رپورٹ کی تھی؟“

”نہیں.....“

”ایک تو تم پولیس کو جانے کیا سمجھتی ہو۔ یہ واقعہ ایسا تھا کہ خاموشی سے برداشت کر لیا جاتا؟ کم از کم مجھے ہی اطلاع کر دی ہوتی۔ اب اگر یہ بات پولیس کے علم میں آئی تو معاملے کی نوعیت ہی بدل جائے گی، وہ پہلا سوال یہی کرے گی کہ آپ نے اس واقعے کی فوری رپورٹ کیوں نہیں کی؟“

”اوہ قدیر! میں نے تمہیں انکل والے معاملے کو سلجھانے کے لیے بلایا ہے۔“ وہ زنج ہو کر بولی۔

”کہاں ہیں انکل؟“

”اپنے کمرے میں، چلو وہیں چلتے ہیں۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تم نے انکل سے بات کی تھی؟“

”ہاں میں بتا چکی ہوں کہ تمہیں بلانے کا مشورہ بھی انہوں نے ہی دیا تھا۔“

اتنا کہہ کر فاریہ ڈرائنگ روم سے باہر آگئی۔ میں اور قدیر اس کے پیچھے تھے۔ ہم بیگ صاحب کے کمرے کے دروازے پر پہنچے۔ فاریہ نے بڑھ کر ہلکی سی دستک دی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔

قدیر کو دیکھتے ہی بیگ صاحب کا چہرہ سفید ہو گیا۔ آنکھوں میں شرمندگی کے ساتھ ساتھ کرب پھیل رہا تھا۔ وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگے۔

”نہیں انکل آپ لیٹے رہئے۔“ قدیر نے جلدی سے آگے بڑھ کر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر وہ فاریہ کی جانب مڑا۔ ”فاریہ پلیز آپ لوگ باہر چلے جائیں، میں انکل سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

یہ بات سنتے ہی میں کمرے سے باہر آگیا چند منٹ بعد ہی فاریہ بھی باہر آگئی۔ ہم

دونوں وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔

”میڈم..... اس طرح تو پولیس بیگ صاحب کو بھی گرفتار کر لے گی!“

”نہیں، اگر انکل پاکستان نارکوٹکس بورڈ کے ریجنل ڈائریکٹر کو اسٹینٹ دے دیں تو نہ صرف یہ کہ وہ انکل کو تحفظ فراہم کرے گی بلکہ اس کیس میں ملوث افراد کو بھنک بھی نہ پڑنے دے گی کہ یہ اطلاع انکل نے دی ہے۔ انکل کی حیثیت ایک طرح سے سلطانی گواہ کی سی ہو جائے گی۔ ممکن ہے کہ انہیں اپنے کیے کی سزا بھگتنا پڑے مگر وہ بہر حال اتنی سخت نہیں ہو گی۔“

”مجھے حیرت ہے!“ میں بڑبڑایا۔

”تمہیں صرف حیرت ہے مگر مجھے تو دکھ نے نڈھال کر دیا ہے۔ میں نے کبھی انکل کو کسی چیز کی کمی نہ ہونے دی۔ میرے باپ کا جتنا کاروبار تھا انہی کی سرپرستی میں چلتا رہا۔ میں نے کبھی ان کے اخراجات پر اعتراض نہ کیا حالانکہ بعض مرتبہ بڑی بڑی رقمیں بنک سے نکالی گئیں مگر نہ وہ فیکٹری کے کسی کام پر خرچ ہوئیں نہ گھر کے، پھر بھی میں نے کبھی نہیں پوچھا کہ انہوں نے یہ رقم کیوں اور کس لیے نکالی۔ انکل کا ہمارے سوا دنیا میں کوئی بھی تو نہیں کہ وہ پیسہ جمع کرتے وہ بھی مجھ سے چھپا کر۔ ہم نے انہیں ہمیشہ باپ کا درجہ دیا تھا۔ اقبال، تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ اس انکشاف نے مجھے ذہنی طور پر کتنا بڑا نقصان پہنچایا ہے۔“

”مجھے اندازہ ہے میڈم، آپ کی تو بات ہی اور ہے خود مجھے ہی اتنا صدمہ پہنچا ہے۔“

”ہمارے سارے کام دھرے رہ گئے۔ ویسے اب ادریس کی تلاش بیکار ہے، ہمیں بھی اپنے مشن کو کچھ روز کے لیے دہانا پڑے گا۔ قدیر کو بھنک بھی مل گئی تو وہ پیچھے لگ جائے گا۔“

”میڈم آپ قدیر صاحب کو بتا کیوں نہیں دیتیں، اس طرح ہمیں بہت آسانیاں ہو جائیں گی۔“

”نہیں اقبال، ابھی ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ بہادر اور سیمیاں کے خلاف ثبوت حاصل کرنے کے بعد میں خود ہی اس معاملے کو قانون کے حوالے کر دوں گی مگر فی

الحال یہ ممکن نہیں، عذرا کے وہاں جانے سے ممکن ہے ثبوت بھی مل جائیں اور ہم آگے بھی بڑھ سکیں۔“ فاریہ نے جواب دیا۔

میں خاموش ہو گیا۔ یہ بات میرے حلق سے نہیں اتر رہی تھی کہ فاریہ یہ جنگ تنہا لڑنے پر کیوں بضد ہے جبکہ تقدیر نہ صرف اسے تحفظ فراہم کر سکتا ہے بلکہ قانونی مدد بھی کر سکتا ہے۔ کچھ بھی ہو فاریہ کو یہ بات اعلیٰ حکام کے علم میں لانا چاہیے تھی جس سے وہ گریز کر رہی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ بہادر اور سیمائے نے ذاتی طور پر اسے نقصان پہنچایا تھا مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ وہ سارے معاملے کو ذاتی طور پر ہی حل کرنا شروع کر دے۔ اس طرح وہ خود بھی غیر قانونی حرکات کی مرتکب ہو رہی تھی مثلاً یعقوب کو قید کرنا اور زدو کوب کرنا، اس انگریز کا قتل اور جانے ایسی کتنی ہی باتیں ہوئی ہوں گی یہ سراسر غیر قانونی ہوں گی۔

میرے دل و دماغ میں کانٹا سا چھ رہا تھا۔ البتہ بیگ صاحب کے سلسلے میں مجھے کچھ اطمینان محسوس ہو رہا تھا کہ انہوں نے اس معاملے سے نمٹنے کے لیے قانونی طریقہ اختیار کر لیا تھا۔ معلوم نہیں کہ اس معاملے کو قانونی طور سے حل کرنے پر فاریہ کیسے تیار ہو گئی ورنہ اس سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ اس معاملے کو بھی خود ہی حل کرنے کی کوشش کرتی۔ بیگ صاحب کے اس انکشاف کے بعد سے میرا دل بھی گھبرانے لگا تھا۔ یہاں وہ سب کچھ ہو رہا تھا جس کی امید نہیں ہوتی تھی۔ فاریہ پر البتہ میرا اعتماد اب بھی بحال تھا۔

میں جانے کب تک انہی خوف ناک سوچوں میں گم رہا۔ اچانک دروازہ کھلنے اور تقدیر کے بھاری بوٹوں کی دھمک کی آواز نے مجھے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ میں اور فاریہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

”فاریہ، معاملات بہت گہرے ہیں۔ میں کل صبح انکل کو لینے آؤں گا۔ دیکھیں گے کہ کیا کیا جا سکتا ہے اور تم کن چکروں میں ہو؟“ اس نے آخری جملہ بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

”مجھے تو زاریہ اور پھر فیکٹری سے نجات نہیں ملتی۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔ اس کے لہجے میں بیزاراں تھی۔

”چائے نہیں پلو آؤ گی؟“

”ہاں کیوں نہیں؟“ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھی۔

”آپ ٹھہریں میڈم، میں حمیدہ سے کہہ دیتا ہوں۔“ میں جلدی سے آگے بڑھا۔

”نہیں، تم تقدیر صاحب کو لے کر ڈرائنگ روم میں جاؤ، میں خود ہی کہہ دوں گی۔“

اس نے جواب دیا اور آگے بڑھتی چلی گئی۔

میں نے محسوس کیا کہ فاریہ انپیکٹر تقدیر سے کترا رہی ہے۔ وہ اس کے قریب زیادہ دیر نہیں رکنا چاہتی تھی۔ میں نے اس کے حکم کی تعمیل میں انپیکٹر تقدیر کو ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا۔

”تشریف رکھیے؟“ میں نے ایک صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

”آپ بھی بیٹھیں، مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔“

میرا دل دھڑک اٹھا کہ اسے مجھ سے کیا باتیں کرنا ہیں اور میں نہیں جانتا تھا کہ مجھے اس کی باتوں کا جواب کس انداز میں دینا ہو گا۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی بیٹھ گیا۔

”آپ یہاں کتنے عرصے سے ہیں؟“ اس کا انداز خالص پولیس والوں جیسا تھا۔

میں نے ابھی جواب دینے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ فاریہ اندر داخل ہوئی، میں نے شکر ادا کیا۔

”اقبال تم آرام کرلو، بہت تھک گئے ہو گے۔“ فاریہ نے مجھے کہا۔

”سوری انپیکٹر صاحب، آپ میرے بارے میں مس فاریہ سے تفصیل سے پوچھ

سکتے ہیں۔ اگر مجھے اجازت دیں تو کچھ دیر آرام کر لوں۔“

”ضرور ضرور۔“ اس نے سر ہلایا اور میں کمرے سے باہر نکل گیا۔

میں سیدھا اپنے کمرے میں آیا۔ میں واقعی بہت تھک گیا تھا۔ بستر پر لیٹتے ہی نیند آ

گئی۔

علی الصبح میری آنکھ دروازے پر ہونے والی دستک سے کھلی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ

میں اتنا بے خبر سو گیا تھا کہ پوری رات گزر گئی اور پتا بھی نہ چلا۔ جانے تقدیر صاحب کب

گئے۔ دوبارہ ہونے والی دستک نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے بڑھ کر دروازہ کھولا، سامنے

سکندر خان کھڑا تھا۔

”بیگم صاحب بلاتا ہے آپ کو؟“

”ٹھیک ہے تم چلو“ میں آتا ہوں۔“

اس کے جاتے ہی میں ہاتھ روم گھس گیا۔ پندرہ منٹ بعد نہادھو کر تیار ہو گیا تھا۔ میں پہلے ڈرائنگ روم میں پہنچا، وہ خالی تھا۔ میں نے بیگ صاحب کے کمرے کی طرف رخ کیا ہی تھا کہ پیچھے سے حمیدہ کی آواز آئی۔ ”صاحب وہ لوگ ڈرائنگ روم میں ہیں۔“

”اوہ“ ٹھیک یو۔“ میں پلٹ کر ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔

”آؤ اقبال!“ فاریہ نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

”سوری میڈم رات میں بستر پر لیٹتے ہی غافل ہو گیا تھا۔“

”کوئی بات نہیں، تم تھک بھی تو بہت گئے تھے نا؟“

”بس احساس ہی نہیں ہوا کہ کب نیند آگئی۔“ قدیر صاحب کب گئے؟“

”چائے پیتے ہی چلے گئے تھے اب آنے والے ہوں گے۔“ اس نے چائے کے کپ

میں چائے انڈلیتے ہوئے جواب دیا۔

”میڈم آج آفس جانا ہے۔“ میں نے کپ میں چچہ ہلاتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں چلے جاؤ مگر..... بلکہ میں بھی چلتی ہوں۔“ دراصل انسپکٹر قدیر نے مجھے منع

کر دیا ہے کہ ابھی میں کوئی ایسا قدم نہ اٹھاؤں جس سے مشروعی اور ان کے گھر کے

ہوشیار ہو جائیں۔ ہم آفس جائیں گے اور معمول کے مطابق کام کریں گے۔ ان لوگوں پر

بالکل ظاہر نہیں ہونے دیں گے کہ ہم کچھ جانتے ہیں۔“

”اس طرح تو ممکن ہے کہ وہ نئی کھیپ بھیج دیں۔“ میں نے کہا۔

”ہاں ہو سکتا ہے۔ اگر شپنگ کرائی گئی تو بھی ہم کچھ نہیں کریں گے۔“ انسپکٹر قدیر

اس سلسلے میں فوری انتظامات کر لیں گے بلکہ انہوں نے نارکوٹکس کنٹرول بورڈ کے

سرکردہ افراد کو اطلاع بھی دے دی ہوگی۔ آج وہ انکل کو کنٹرول بورڈ کے ریجنل ڈائریکٹر

کے پاس لے جا رہے ہیں۔ اب یہ تمام معاملہ وہ لوگ دیکھیں گے، ہماری ذمہ داری ختم

ہو گئی ہے۔“

میں سر ہلا کر ناشتے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ بیگ صاحب بہت خاموش اور اداس

تھے۔ وہ نگاہیں جھکا کے چائے پی رہے تھے۔ مجھے ان کی صورت دیکھ کر ترس آ رہا تھا مگر یہ

معاملہ ایسا تھا کہ میں اس سلسلے میں ان کی کوئی مدد بھی نہیں کر سکتا تھا۔ خود فاریہ کے

چہرے پر گہری اداسی چھائی ہوئی تھی۔

ڈائینگ روم میں خاموشی طاری تھی کبھی کبھی چائے کے برتنوں کی آواز گونج اٹھی

تھی یا دیوار پر لگی گھڑی کی ٹیک ٹیک کمرے میں زندگی کا احساس پھیلا رہی تھی۔

ہم ابھی ناشتے سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ گیٹ پر ہارن کی آواز سے چونک

اٹھے۔

”شاید انسپکٹر قدیر آگئے۔“ فاریہ نے مجھے ہوئے لمبے میں کہا۔

بیگ صاحب کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے دم بھر کو ان

کا سانس رکا ہو۔ میں پیالی ہاتھ سے رکھ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

”انہیں یہیں لے آؤ۔“ فاریہ کی آواز آئی اور میں ”اچھا“ کتا ہوا باہر نکل گیا۔

چوکیدار نے گیٹ کھول دیا تھا۔ انسپکٹر قدیر نے گاڑی برآمدے کے سامنے ہی روک

دی۔ وہ اس وقت بھی وردی میں تھے اور خاصے اسمارٹ لگ رہے تھے۔ میں نے سلام کیا

اور انہیں لیے ہوئے ڈائینگ روم میں آگیا۔

انسپکٹر قدیر نے بڑے پرجوش انداز میں سلام کیا اور کپ اتار کر ایک طرف رکھی

پھر دونوں ہاتھ ملتے ہوئے بولے۔ ”بڑے اچھے موقع پر آیا ہوں۔“

مجھے لگا جیسے وہ فضا کے بوجھل پن کو ختم کرنے کے لیے اس انداز سے بات کر رہے

ہیں ورنہ ان کی آنکھوں میں بھرپور سنجیدگی صاف نظر آرہی تھی۔

”ناشتا کریں گے؟“ فاریہ نے دھیمے لمبے میں سوال کیا۔

”نیکی اور پوچھ پوچھ..... جناب میں رات سے بھوکا ہوں، رات گھر میں داخل

ہوتے ہی رکے بغیر یہاں چلا آیا تھا، یہاں سے بھی آپ نے بھوکا بھیج دیا۔ رات زیادہ ہو

گئی تھی، سب سو چکے تھے، کسی کو اٹھانا بہتر نہ سمجھ کر چپ چاپ دبے قدموں اپنے کمرے

میں جا کر سو گیا اور دس منٹ پہلے آنکھ کھلی، سیدھا یہاں چلا آیا۔“

”اقبال، تم حمیدہ سے کوناشتا اور لے آئے۔“ فاریہ نے اس کے شوخ انداز کو

نظر انداز کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

میں کمرے سے باہر آگیا۔ حمیدہ غالباً چوکیدار کو ناشتا دے کر واپس آرہی تھی۔ میں

نے اسے ناشتے کے لیے کہا اور خود وہیں برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔

میری ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ میں اتنے بوجھل اور تکلیف دہ ماحول میں دوبارہ جا کر روح میں اتر جانے والی خاموشی اور اداسی کا مقابلہ کروں۔ پندرہ بیس منٹ بعد حمیدہ ناشتے کی ٹرے لیے آگئی۔ میں نے ٹرے اس سے لے لی اور خود ناشتے لے کر کمرے میں داخل ہو گیا۔

کمرے میں اب بھی خاموشی طاری تھی۔ میں وہاں ناشتا رکھ کر خود باہر چلا آیا۔ صبح کے تقریباً ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ میں نے حمیدہ سے ایک کپ چائے منگوائی اور لان میں پڑی کرسیوں پر آ بیٹھا۔ نہ معلوم کیوں اچانک ہی مجھے ماں یاد آگئی۔ کاش وہ میرے قریب ہوتی تو میں کچھ دیر سراس کی گود میں رکھ کر سو جاتا، وہ لمحہ بھر کی نیند کتنی پرسکون ہوتی! یہ خیال آتے ہی مجھے سلطان کا خیال بھی آگیا۔ سلطان کو گاؤں گئے اتنے روز ہو گئے تھے مگر وہ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ خدا خیر کرے سب خیریت ہو، میرے دل سے دعا نکلی۔ کاش میں خود ہی گاؤں چلا گیا ہوتا۔ میں یہ سب کچھ چھوڑ کیوں نہیں دیتا۔ یہ شہر جس میں قدم قدم پر بد اعتمادیاں پھیلی ہوئی تھیں، جہاں سب کچھ آدمی کی توقع کے خلاف ہوتا تھا۔ جہاں جسمانی تکلیف نہ تھی مگر روح پر پڑنے والے پے درپے گھاؤ اس بری طرح زخمی کر دیتے تھے کہ آدمی ٹوٹ کر رہ جاتا تھا۔

میں بکھر رہا تھا۔ ایک جنگ تھی جو میرے اندر لڑی جا رہی تھی۔ دل کہتا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنے گاؤں میں جاؤں اور دماغ ایک آہنی دیوار کی طرح سامنے کھڑا تھا۔ ”وہاں بھی غلامی کے سوا کیا رکھا ہے؟“ دماغ کے اس سوال نے مجھے شکستہ کر دیا تھا۔ اگر ماں کا وجود نہ ہوتا تو شاید میں کسی بہت ہی بڑی طاقت سے ٹکرا کر خود کو پاش پاش کر لیتا مگر اب مجھے ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا پڑتا تھا۔ محض اس لیے کہ میری ماں عذابوں میں قید، ماسی میراں اور سوہنی میرا انتظار کر رہی تھیں۔

میں خود کو کسی ایسے اندھے کنوئیں میں گرتا ہوا محسوس کر رہا تھا جس کی انتہا نہ تھی، زندگی کی امنگ اور روشنی کی کرن دور ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ راجہ کا کچھ پتا نہ تھا۔ میرا مقصد حیات یعنی چوہدری سے انتقام کا جذبہ حالات کی تہہ در تہہ گرد کے نیچے کہیں پڑا سسک سسک کر دم توڑ رہا تھا۔ میں خود کو مٹی کا ایک تودہ محسوس کر رہا تھا جو اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ سرک سکتا ہو۔ یہ حالات مجھے کہاں لے جائیں گے کچھ پتا نہ چلتا تھا۔

اچانک سوچتے سوچتے میرا جی الجھ گیا، دم گھٹنے لگا۔ میں گھبرا کر گیٹ کی طرف بڑھ گیا جہاں سکندر خان کرسی ڈالے بیٹھا تھا۔ میں اس کے قریب جا کر خواہ مخواہ اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ ان باتوں کا مقصد خود کو ان خوف ناک سوچوں سے آزاد کرانا تھا۔

ابھی مجھے وہاں کھڑے دو تین منٹ ہی ہوئے تھے کہ فاریہ کی آواز آئی۔ فاریہ، انسپکٹر قدیر اور بیگ صاحب برآمدے میں کھڑے تھے۔ میں تیزی سے پورج کی طرف بڑھ گیا۔ اتنی دیر میں بیگ صاحب، انسپکٹر قدیر کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ میں گاڑی برآمدے کے قریب لے آیا اور انسپکٹر قدیر کی گاڑی کے پیچھے کھڑی کر دی۔

فاریہ غالباً بیگ صاحب کو تسلی دے رہی تھی۔ چند لمحوں بعد انسپکٹر قدیر نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ وہ گاڑی کو گیٹ کی طرف لے گیا۔ سکندر خان گیٹ کھول چکا تھا۔ میں نے گاڑی فاریہ کے قریب روکی۔ وہ فوراً ہی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ میں نے بھی انسپکٹر قدیر کے پیچھے ہی گاڑی گیٹ سے باہر نکال لی۔

”جی میڈم..... کہاں چلوں؟“

”آفس.....“ اس نے مختصر جواب دیا اور شیشے سے باہر کہیں دور دیکھنے لگی۔ میں نے مزید کوئی سوال کیے بغیر گاڑی کی اسپید بڑھا دی۔ ہم خاموشی سے سفر کرتے ہوئے آفس پہنچ گئے۔ میں نے گاڑی پارکنگ لائٹ پر کھڑی کی اور فاریہ اتر کر لفٹ کی طرف بڑھ گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے تھا، ہم سیدھے فتنہ فلور پر پہنچے جہاں فاریہ کا آفس تھا۔ کوریڈور میں ہی ہماری ملاقات مسٹروسی سے ہو گئی جو ہاتھوں میں فائل اٹھائے، ناک پر چشمہ جمائے اپنے کچھ حواریوں کے ساتھ ساتھ بڑی تیزی میں ایک طرف جا رہے تھے۔ فاریہ کو دیکھتے ہی وہ گھبرا کر رک گئے۔

”اسلام علیکم میڈم!“

”وعلیکم السلام مسٹروسی، بڑی جلدی میں ہیں، خیریت؟“

”جی میڈم..... آج جرمنی کی شپنگ ہے۔ ابھی تک پیکنگ مکمل نہیں ہوئی۔“

”تو کینسل کر دیجئے پھر کرا لیجئے گا۔“

”بہت نقصان ہو جائے گا میڈم۔“

”کوئی بات نہیں نفع نقصان تو ہوتا ہی رہتا ہے۔“ فاریہ نے مسکرا کر جواب دیا۔

”اچھا.....!“ انہوں نے ذرا حیرت سے کہا۔

شپنگ کینسل کرانے میں کافی نقصان ہوتا تھا اور ایک لمبا پروپیٹر طے کرنا پڑتا تھا شاید اسی لیے انہیں حیرت ہوئی تھی۔ ان کے چہرے پر الجھن کے آثار تھے مگر پھر بھی وہ خود کو نارمل کرنے کی کوشش کر رہے۔ فاریہ نے ان پر دھیان نہ دیا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

میں بھی اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہو گیا۔

فاریہ نے کرسی پر بیٹھتے ہی ٹیبل کے نیچے لگی بیل بجائی۔ چند لمحوں بعد ہی چپراسی اندر داخل ہوا۔

”مسٹر شاہد بیگ کو بلاؤ۔“ فاریہ نے چپراسی سے کہا اور مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

چپراسی دوبارہ باہر چلا گیا۔ میں خاموشی سے سامنے والی کرسی پر جا بیٹھا۔ فاریہ دراز سے مختلف فائلیں نکال کر ان کا بغور مطالعہ کرتی رہی جبکہ میں مختلف اندیشوں میں گھرا بے شمار باتیں سوچتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ فاریہ کے شپنگ سے منع کرنے نے انہیں شک میں مبتلا کر دیا ہے۔ ان کے چہرے کی الجھن اور آنکھوں کی حیرت بار بار میرے سامنے آ رہی تھی۔ میں یہ بات فاریہ کو بتانا چاہتا تھا مگر وہ اتنے انہماک سے فائلیں دیکھ رہی تھی کہ میں نے اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا۔ فاریہ نے فائلوں پر جھکا سر اس وقت اٹھایا جب دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

”کم ان!“ فاریہ نے زور سے کہا۔

اس کے ساتھ ہی دروازہ کھلا اور پینتیس چالیس برس کا بہت اسارٹ سا آدمی اندر داخل ہوا۔ اس میں ایک عجیب سا وقار تھا۔ خوب صورت چہرہ، روشن اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جن سے ذہانت چھلک رہی تھی اور کپٹیوں پر چپکنے والے سفید بالوں نے اسے بے پناہ پُرکشش بنا دیا تھا۔ اس کی شخصیت ایسی تھی کہ انسان اسے دیکھ کر چند لمحوں کے لیے ساکت ہو جائے، یہی میرے ساتھ بھی ہوا تھا۔

”بیٹھئے مسٹر شاہد۔“ فاریہ نے بڑے اخلاق مگر بے حد سنجیدگی سے کہا۔

وہ میرے برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ فاریہ چند لمحے خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ وہ بھی جھجکے بغیر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس کے بولنے کا منتظر رہا۔ اس دوران

میں، میں ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ نہ معلوم کیوں مجھے ان دونوں کی نگاہوں میں ایک دوسرے کے لیے عجیب سی بات محسوس ہوئی، کیا؟ اسے میں کوئی معنی نہ دے پایا مگر میرے ذہن میں ایک جھپٹ سی ہونے لگی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ شاہد بیگ کی فیکٹری میں کیا حیثیت ہے اور آج سے پہلے میں نے اسے یہاں دیکھا بھی نہیں تھا جبکہ فاریہ کے بلانے اور چپراسی کے سر ہلا کر چلے جانے اور پھر شاہد بیگ کی آمد نے کم از کم یہ بات ثابت کر دی تھی کہ وہ یہیں فیکٹری میں تھا اور یہاں کے لوگ اسے جانتے بھی ہیں۔

”ہوں.....“ اچانک فاریہ نے گہرا سانس لیا۔

میں چونک کر اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”تو گویا تمہارا خیال صحیح تھا۔“ اس نے اپنے چہرے کو دونوں ہتھیلیوں کے درمیان جماتے ہوئے کہا۔

”خیال نہیں میڈم، اندازہ۔“ اس نے اتنی ہی سنجیدگی سے جواب دیا۔

گو کہ اس نے فاریہ کو میڈم کہا تھا مگر اس کے لہجے میں وہ بات نہ تھی جو فیکٹری کے کسی دوسرے ملازم کے لہجے میں یا خود میرے لہجے میں ہوتی تھی۔

”ہوں، ایک ہی بات ہے۔“ فاریہ نے جواب دیا۔

”نہیں محترمہ، آپ مختلف باتوں کو گڈنڈ کر دیتی ہیں۔ بہر حال، تو میرا اندازہ صحیح تھا؟“

”ہاں شاہد صاحب، میں معذرت خواہ ہوں کہ میں نے آپ کی بات پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا بلکہ اس طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ بہر حال اب مجھے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔“

”موسٹ ویل کم میڈم۔“ وہ ذرا سا جھکا۔ ”فائلیں میرے پاس ہیں اور میں جانتا ہوں کہ کہاں کیا اور کب کتنا مال بھیجا گیا۔ آپ نے دھیان نہیں دیا تھا مگر میں اس طرف سے غافل نہیں رہا۔ میں کسی طرف سے بھی غافل نہیں رہا مس فاریہ۔“ آخری جملہ اس نے بڑے معنی خیز انداز میں کہا اور تب میں نے اس کی آنکھوں میں محبت کا دریا موجزن پایا۔ بے پناہ اپنائیت اور لگاؤ۔ تبھی میرے ذہن میں ہونے والی جھپٹ ختم ہو گئی، میں نے فاریہ کی طرف دیکھا، اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔

”ٹھیک ہے مسٹر شاہد میں آپ کی ممنون ہوں۔ میں چاہتی ہوں اس سلسلے میں آپ کبھی غافل نہ ہوں۔ میں نے کچھ اقدامات کیے ہیں۔ میں آپ کو بعد میں تفصیل بتاؤں گی۔ اس وقت مجھے کچھ ضروری کام ہیں۔ اوکے.....؟“

”اوکے۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیں۔“

”نو تھینک یو.....“ فاریہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں بھی کھڑا ہو گیا۔ مسٹر شاہد بیگ مجھ سے ہاتھ ملا کر چلے گئے۔ فاریہ نے دروازے نکالی ہوئی کچھ فائلیں اٹھائیں اور کمرے سے باہر آگئی۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ ہم بغیر کسی سے ملے لفٹ تک آ گئے۔ لفٹ میں کوئی نیا تھا۔ اس نے ہمیں دیکھتے ہی سرخم کیا اور اسٹول سے کھڑا ہو گیا۔ میں اور فاریہ لفٹ میں داخل ہو گئے۔ لفٹ میں نے ٹن دلیا اور ایک کونے میں منسوب کھڑا ہو گیا۔ وہ تقریباً پچاس برس کے لگ بھگ تھا۔

”تم نئے آئے ہو؟“ فاریہ نے پوچھا۔

MAJIK ABDUL RAOOF

”جی میڈم!“

میں اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اتنی عمر کا ہونے کے باوجود کافی مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اس کے دائیں کان کے نیچے ایک گہرے زخم کا نشان تھا جو غالباً صرف مجھے ہی نظر آ رہا تھا کیوں کہ میں اس کی دائیں جانب کھڑا تھا۔

”کس کے تھرو آئے ہو؟“

”جی وصی صاحب نے نوکری دلائی ہے۔ وہ میرے محلے کے قریب ہی رہتے ہیں۔“

”محلے کے قریب؟“

”جی میڈم“ نالے کے اس طرف کوٹھیاں ہیں اور دوسری طرف کچے پکے چھوٹے مکان، میں وہیں رہتا ہوں۔“

”اوہ..... آئی سی.....“ فاریہ نے سر ہلایا اور لفٹ کے دروازے کے اوپر دیکھا جہاں فرسٹ فلور کا نمبر روشن تھا۔

چند لمحوں میں لفٹ گراؤنڈ پر آگئی۔ میں اور فاریہ پارکنگ لاٹ پر چلے آئے۔

”تم نے غور کیا!“ فاریہ نے دروازہ کھولتے ہی مجھ سے پوچھا۔

”کیا میڈم؟“

”یہ کافی بڑھا لکھا لگتا ہے۔“ اس نے بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

میں بھی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

”کیسے؟“ میں نے گاڑی اشارت کرتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔

”میں نے انگلش لفظ استعمال کیا تھا ”تھرو“ وہ سمجھ گیا۔“

”اوہ..... ہاں بچ..... میں نے تو غور ہی نہیں کیا۔“

اب تمہیں ہر چھوٹی بڑی بات پر غور کرنا چاہیے

”ویسے وہ آدمی مجھے پسند نہیں آیا، کچھ عجیب سا احساس ہوا تھا اسے دیکھ کر۔“

”ہاں..... مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔

میں نے گاڑی ریورس کی اور گیٹ سے باہر نکال لی۔

”کہاں جائیں گی میڈم؟“

”اسپتال..... کیا تم بھول گئے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے میڈم؟ مجھے یاد ہے اور یہ بھی یاد ہے کہ آج گیارہ بجے زاریہ کا آپریشن ہے۔ ابھی گیارہ بجنے میں بہت وقت تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید آپ اس دوران میں کوئی اور کام نمٹانا چاہتی ہوں۔“

”نہیں فی الحال میں کام نہیں کرنا چاہتی۔ فیکٹری کے تمام معاملات انپیکٹر قدیر، انگل اور شاہد بیگ سنبھال لیں گے۔“

”میڈم یہ شاہد صاحب.....“

”ہاں اقبال، میں خود بھی تمہیں بتانا چاہتی تھی۔“ اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔

”شاہد بیگ اس پوری فیکٹری میں وہ واحد شخص ہے جو میرے لیے پُر خلوص ہو سکتا ہے۔

اسے میں نے میمنجر کی حیثیت سے جاب دی۔ وہ بہت شارپ ہے مگر وہ بنیادی طور پر نیک آدمی ہے۔ اس کے یہاں آنے کے بعد مسٹر وصی کو اپائنٹ کیا گیا تھا مگر مسٹر وصی دھیرے

دھیرے تمام شعبوں پر چھاتے چلے گئے۔ انہوں نے وہ کام بھی اپنے ذمے لے لیے جو شاہد بیگ کرتا تھا۔ مسٹر وصی بے حد چالاک آدمی ہیں۔ ان کا طریقہ کار اتنا غیر محسوس تھا کہ

مجھے احساس بھی نہ ہو سکا اور نہ ہی انہوں نے کسی کو شکایت کا موقع دیا۔ شاہد کو انہوں نے زیادہ تر ایسے کام دے دیے جو واقعی چمڑے اور اس کی تجارت کے متعلق تھے، جن

ممالک کو وہ ہیرودن بھیج رہے ہیں ان کا تمام کام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور جہاں خالص چمڑے کی اشیاء جاتی ہیں وہ کام اور آرڈر ز انہوں نے شاہد کے پاس چھوڑ دیے۔ شاہد نے دو ماہ پہلے میری توجہ اس جانب دلائی تھی۔ مجھے دبے لفظوں میں کہا تھا کہ یہاں کچھ گڑبڑ ہو رہی ہے مگر میں نے دھیان نہ دیا۔ آج اس کی بات سچ ہو گئی۔ اگر میں اس وقت اس کی بات کو سنجیدہ لیتی تو شاید سنہلنے کا موقع مل جاتا۔ بہر حال وہ نہ صرف مخلص ہے بلکہ ذہین اور حب الوطن بھی ہے۔ مجھے اس سے کافی مدد مل جائے گی۔“

فاربیہ کی یہ تمام باتیں سن کر میری سمجھ میں سب کچھ آ گیا۔ میرا ذاتی خیال تھا کہ وہ فاربیہ کو پسند کرتا ہے شاید اسی لیے اس سے بے حد پُر خلوص بھی ہے مگر فاربیہ نے اس جانب کوئی اشارہ نہیں کیا۔

چند لمحوں بعد ہم اسپتال پہنچ گئے۔ زاریہ ابھی تک بے ہوش تھی۔ ڈاکٹر طارق ہمیں اس کے وارڈ کے باہر ہی مل گئے۔ انہوں نے بتایا کہ آپریشن کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں اور ٹھیک گیارہ بجے اسے آپریشن تھیٹر میں لے جائیں گے۔

انہوں نے پہلے فاربیہ کو اور پھر مجھے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ ہم صرف چند لمحوں کے لیے اس کے پاس رہے۔ اسے بے عمدہ پڑا دیکھتے رہے۔ پھر فاربیہ آنکھوں میں امنڈ آنے والے آنسو رومال میں سموتی ہوئی باہر چلی گئی۔ میں نے پل بھر کو زاریہ کے چہرے کی طرف دیکھا جس پر بے حد سکون چھایا ہوا تھا۔ پھر خدا سے اس کی زندگی کی دعا کی اور کمرے سے باہر آ گیا۔

”مس فاربیہ آپ لوگ چاہیں تو جاسکتے ہیں اس لیے کہ تین گھنٹے خواہ مخواہ آپریشن تھیٹر کے باہر کھڑا رہنا بے حذر اذیت ناک ہوتا ہے۔ مجھے سو فیصد یقین ہے کہ وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ ڈاکٹر جمل اس کی طرف سے خاصے مطمئن ہیں۔“

”مگر ڈاکٹر اس کی طویل بے ہوشی.....“ فاربیہ نے بے چین ہو کر کہا۔

”اوہ مس فاربیہ سوری، میں آپ کو یہ بتانا بھول گیا کہ رات انہیں چند لمحوں کے لیے ہوش آ گیا تھا اور اسی وجہ سے ہم اتنے مطمئن ہیں۔“

”ڈاکٹر..... سچ..... مگر آپ نے بتایا کیوں نہیں.....“

”یہ واقعہ رات پونے تین بجے کا ہے مس فاربیہ، میں نے رات گئے بتانا مناسب نہ

سمجھا اور سچ پوچھیں تو زاریہ کے ہوش میں آ جانے کے بعد میں اتنا ریلیکس ہو گیا تھا کہ گھٹنا بھر تک بے خبر سوتا رہا۔ بہر حال اب تو پتا چل گیا.....!“

”ڈاکٹر..... وہ ٹھیک تھی.....؟ اس نے آپ کو پہچانا؟“

”کچھ کہا نہیں جاسکتا مس فاربیہ..... اس لیے کہ وہ ہوش میں آنے اور آنکھیں کھولنے کے باوجود گم ضم تھی۔ بہر حال ہمارے لیے یہی بہت تھا۔ ڈاکٹر جمل کو میں نے اسی وقت بلوا لیا تھا۔ انہوں نے خود ان کا تفصیلی چیک اپ کیا تھا اور ہمیں خوشخبری سنائی تھی۔“

”اوہ..... اوہ..... تھینکس گاڈ.....“ فاربیہ بے حد خوش تھی۔ میں بھی خود کو ایک دم ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک بڑا بوجھ تھا جو سر سے اتر گیا تھا۔

زاریہ جو موت سے چند لمبے کے فاصلے پر پڑی تھی، اب زندگی کی طرف لوٹ آئی تھی۔ ”ڈاکٹر ٹھیک کہتے ہیں مس فاربیہ، تین چار گھنٹے یہاں کھڑے رہنے سے کچھ نہ ہو گا۔ آپ نے جہاں اتنی بہت سی باتوں کو حقیقت پسندانہ انداز میں قبول کیا ہے وہاں اس معاملے پر بھی محض جذبات سے کام نہ لیں۔ آپ یہاں رہ کر کچھ بھی نہ کر سکیں گی۔“ میں نے بھی ڈاکٹر کی حمایت کی۔

”پھر.....؟“ اس نے استفسار یہ انداز سے مجھے دیکھا۔

”ہم کوئی اور کام کر لیتے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”مثلاً!“

”مثلاً یہ کہ..... یعقوب کو لے آتے ہیں..... یا..... سلطان کو دیکھ لیتے ہیں یا.....“

”ٹھیک ہے ہم سلطان کو دیکھ لیتے ہیں میں جانتی ہوں کہ تمہیں اس کا بہت شدت سے انتظار ہے“ وہ فوراً تیار ہو گئی۔ ہم نے ڈاکٹر طارق سے اجازت لی اور باہر آ گئے۔

فاربیہ اس وقت بہت خوش لگ رہی تھی پھر بھی کبھی کبھی اس کا چہرہ اداس ہو جاتا تھا۔ ہم گاڑی میں بیٹھے اور میں نے گاڑی اسپتال کے گیٹ سے باہر نکال لی۔ باہر آتے ہی فاربیہ بولنے لگی۔ وہ مسلسل زاریہ کی باتیں کر رہی تھی۔ اس کے ہوش میں آ جانے کی اسے بے پناہ خوشی تھی۔

”اقبال“ انکل سنیں گے تو کتنا خوش.....“ اچانک وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گئی۔ شاید اسے یاد آ گیا تھا کہ انکل گھر پر نہیں ہوں گے بلکہ وہ انسپکٹر قدیر کے ساتھ اپنے گناہوں کا اعتراف کرنے گئے ہوئے ہیں۔ ان گناہوں کے اعتراف کے بعد ان کے ساتھ کیا ہو گا اس کا کسی کو بھی اندازہ نہ تھا۔ ممکن ہے انسپکٹر کے کہنے کے مطابق بیگ صاحب کو واقعی چھوڑ دیا جاتا یا ممکن ہے کہ انہیں گرفتار کر لیا جائے۔

میں نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

”ایک خوشی ملتی ہے اقبال تو دوسرا غم منہ پھاڑے سامنے آ جاتا ہے“ یہ کیسی آنکھ پھولی ہے؟“

”صبر کریں میڈم..... مجھے دیکھیں، کوئی خوشی ملتی ہی نہیں پھر بھی حالات کا مقابلہ کرنے پر مجبور ہوں۔“

اس نے گردن موڑ کر مجھے غور سے دیکھا، شاید میرے بھرائے ہوئے لہجے نے اسے چونکا دیا تھا۔ اس نے آنکھیں صاف کر لیں مگر پھر کچھ نہ بولی۔

تمام راستہ خاموشی سے طے ہو گیا۔ ہم کرشن نگر میں داخل ہو گئے۔ میں نے سلطان کے مکان کے سامنے گاڑی روکی۔

”میڈم، آپ آئیں گی یا.....“

”تم دیکھ آؤ اگر سلطان ہے تو مجھے بلا لینا اور نہ ہو تو واپس آ جانا۔“

میں سر ہلا کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ اندھیری سیڑھیوں کو عبور کر کے میں سلطان کے دروازے پر پہنچ کر رک گیا۔ پہلے کی طرح اب بھی دروازے پر تالانہ تھا۔ میں نے ہلکے سے دروازے پر دستک دی۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ ابھی تک واپس نہیں آیا۔ اگر واپس آ گیا ہوتا تو میرے پاس ضرور آتا۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ دروازہ کھل گیا مگر سلطان سامنے نہ آیا اور نہ دروازہ پورا کھلا۔

”سلطان!“ میں نے آواز دی۔

”وہ باہر گئے ہیں.....“ اندر سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ آواز جانی پہچانی سی لگی، نہ معلوم کیوں میرا دل دھڑک اٹھا۔

بولنے والی خاموش ہو چکی تھی مگر اس کی آواز کی بازگشت اب بھی میرے پورے

وجود میں جھنجھار رہی تھی۔ میرا جی چاہا کہ وہ ایک بار پھر بولے تاکہ میں جان سکوں کہ وہ کون ہے..... مگر وہ پھر نہ بولی۔

”اے..... اے کئے گا کہ.....“ بالآ آیا تھا۔ ”میں نے جواب دیا۔

عین اسی لمحے دروازہ دھڑکی آواز سے پورا کھل گیا اور وہ سامنے آ گئی۔

سامنے ایک لڑکی کا ڈھانچہ کھڑا تھا۔ لاغر، کمزور اور لڑکھڑاتا ہوا۔ اسے دیکھ کر میں خود بھی لڑکھڑا گیا۔ ”سوہنی!“ بے اختیار میرے منہ سے نکلا اور میں بے دھڑک اندر داخل ہو گیا۔ ”یہ..... یہ تو ہے۔ مگر تو تو ایسی نہ تھی۔“

”ہاں بالے..... تو تو مجھے چھوڑ آیا تھا نا..... پھر..... پتا نہیں کیا ہوا؟ میں ایسی ہو گئی۔“ اس نے عجیب سے انداز میں مجھے جواب دیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی زبان سوچی ہوئی ہو یا اس کا ذہن سویا ہوا ہو۔

”سوہنی..... ماں کہاں ہے..... اور ماسی؟“ میں نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”وہ جہاں بھی ہیں اور جیسی بھی ہیں تجھے اس سے کیا؟“ دروازے کی طرف سے آواز آئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، سلطان ہاتھوں میں تھیلے لیے کھڑا تھا۔

”سلطان.....“ میں سے دیکھ کر لپکا۔

”تو تو بھول چکا ہے ناسب کو، بابو ہو گیا ہے تو، انگریزی بولتا ہے، گاڑی چلاتا ہے اونچے اونچے ہونٹوں میں بیٹھتا ہے، بہت بڑی کوٹھی میں رہتا ہے، یہ جو ڈھانچہ کھڑا ہے تیرے سامنے، اسے پہچانتا ہے؟ یہ سوہنی ہے، وہی سوہنی جس کے وجود میں پھول کھلتے دیکھے تھے تو نے..... جس کی آنکھوں میں پہلا سپنا تو نے سجایا تھا۔ وہ سوہنی جسے تو پیار کرتا تھا۔ جس کی وجہ سے تو پریشان تھا بالے، سچ بتا بالے، کیا یہ وہی سوہنی ہے..... کیا تو نے اسی ڈھانچے سے پیار کیا تھا کیا اسی کے وجود میں پھول کھلتے تھے..... کیا انہی وحشت زدہ آنکھوں میں خواب اگائے تھے تو نے.....؟ نہیں بالے نہیں، یہ وہ سوہنی نہیں ہے، یہ تو وہ سوہنی ہے جس کے جسم اور دل کو کھنڈر بنا دیا گیا، تجھ سے پیار کرنے کی پاداش میں جسے تباہ کر دیا گیا، اور تو..... تو یہاں عیش کرتا رہا۔ اپنوں کو جہنم کی بھٹی میں چھوڑ کر دوسروں کے لیے جنت تلاش کرتا رہا۔“

کبھی واپس نہیں آئے گا مگر وہ جھلی کچھ بھی نہ مانتی تھی۔ ہمیں تیرے بارے میں کچھ پتا نہ تھا مگر جانے کیوں مجھے ایک عجیب سا اطمینان تھا یوں جیسے تو قریب ہی کہیں موجود ہے۔ پھر ایک روز راجو آیا اس نے ہمیں بتایا کہ تجھے ڈاکوؤں نے مار دیا ہے، انہوں نے صفرا کی لاش بھی وہاں سے نکلا لی بالے، اور پورے گاؤں کو جمع کر کے لاش دکھائی، وہ لاش کیا تھی بالے، بچے ہوئے گوشت اور بدبوؤں سے بھری ہوئی ایک گھڑی تھی بالے..... صفرا کی لاش کی اس بے حرمتی پر پورا گاؤں رویا تھا بالے..... پورا گاؤں، مگر صرف ایک تیری ماں تھی جو ہنس رہی تھی۔ کہتی تھی۔ ”دیکھو لوگو..... کیا میری صفرا ایسی تھی..... کیا کوئی پھول سی بچی ایسی ہو سکتی ہے.....“

تب راجو نے کہا تھا۔ ”بڑھیا، یہ تیری بیٹی صفرا ہے، اسے خدا نے ایسا کر دیا اور کسی کھائی میں تیرے بیٹے کی لاش بھی پڑی ہو گی۔“

اور تب بالے..... بالے ماسی بہت ہنسی تھی۔ بولی۔ ”دیکھو یہ کتا، خدا پر الزام رکھتا ہے..... خدا ایسا ظالم کب ہے کہ پھول جیسی صفرا کو ایسا کر دے۔“

”بس کر سوہنی۔ بس کر۔“ میں تڑپ کر کھڑا ہو گیا۔ ”اب راجو کے حساب میں میرا ایک گناہ اور بڑھ گیا سوہنی، اب میں بھی اس کی سزى ہوئی لاش کو نکال کر سارے گاؤں میں پھراؤں گا۔ میں اس کے خاندان کے ایک ایک بچے کی لاش گرا دوں گا سوہنی، اس کے باپ دادا کی لاشیں نکال لوں گا۔“ میں پاگلوں کی طرح چیخ رہا تھا۔ مجھے کچھ ہوش نہ تھا۔

”اقبال، ہوش میں آؤ.....“ یہ فارسیہ کی آواز تھی۔ یہ آواز مجھے ہوش میں لے آئی۔ میں تو اسے نیچے گاڑی میں بٹھا کر بھول گیا تھا۔ وہ جانے کب اوپر چلی آئی۔

”میں ہوش میں آ گیا ہوں مس فارسیہ..... سنا آپ نے..... انہوں نے کیا کیا، میرے پیچھے میری ماں پر کیا عذاب آئے، مگر آپ کو کیا..... آپ کو تو صرف اپنی فکر تھی، زاریہ کی فکر تھی، بیگ صاحب کی فکر تھی۔ آپ کو بھلا میری ماں کی فکر کیوں ہوتی، آپ کے تو اپنے بڑے مشن تھے، آپ میرے مشن پر تنجیدگی سے کیوں سوچتیں؟“

”آئی ایم سوری اقبال..... یہ سچ ہے کہ میں..... میں سیلفش ہو گئی تھی، مجھے معاف کر دو!“

”بس..... بس کر سلطان۔ تو جانتا ہے..... سب جانتا ہے تو۔“ میں چیخ اٹھا۔ ”نہیں بالے..... میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ تو اگر چاہتا تو ان سب کو عذابوں سے نکال سکتا تھا۔ تجھے پتا ہے سوہنی کو کیا ہوا ہے؟ یہ..... یہ نشہ کرتی ہے، راجو نے اسے نشے کی عادت ڈال دی تاکہ یہ ساری زندگی بھیک مانگتی رہے، اپنی موت کی بھیک۔“

”نہیں..... نہیں سلطان..... بکتا ہے تو۔ جھوٹ بولتا ہے.....“ میں نے لپک کر اس کے شانے پکڑ لیے، پھر میں پلٹ کر سوہنی کے قریب آ گیا، جو دیوار سے ٹیک لگائے نڈھال سی کھری تھی۔ ”سوہنی..... یہ جھوٹ ہے نا؟“

”نہیں بالے، یہ جھوٹ نہیں ہے، تو بیٹھ جا، میں تجھے سب کچھ بتاتی ہوں۔“ سوہنی نے پلنگ کی چادر ٹھیک کرتے ہوئے کہا اور خود سامنے چبھی دری پر بیٹھ گئی۔

میں کسی روبرو کی طرح اس کے سامنے پلنگ پر بیٹھ گیا۔

”بالے، تو تو چلا آیا پر تیرے ہاتھ نہ آنے پر راجو اور تھانیدار دونوں ہی پاگل ہو رہے تھے پھر تیری گولی سے زخمی ہونے والے دو سپاہی اور راجو کا ایک جگری دوست مر گیا۔ تیرے خلاف قتل کا مقدمہ بھی بن گیا، تیرے چلے جانے کے تیسرے دن تیری ماں گلی میں تجھے اور صفرا کو پکارتی ہوئی مل گئی۔ وہ پاگل ہو چکی تھی۔ جانے ان تین دنوں میں اس پر کیا گزری تھی کہ وہ سب کچھ بھول گئی۔ بس اسے یہ یاد رہ گیا کہ تو صفرا کو لینے گیا ہے، ماں کو اس حال میں دیکھ کر میں اور اماں برداشت نہ کر پائے اور اسے اپنے ساتھ لے آئے محلے کے سارے لوگ اسے دیکھ کر پریشان تھے۔ چوہدری اور راجو اب بھی ہمارے اور تیری ماں کے ہمدرد بنے ہوئے تھے..... وہ دونوں دن کی روشنی میں آتے، سارے گاؤں والوں کو اکٹھا کرتے، تیرے تھانے سے فرار ہونے اور قتل کر کے بھاگنے کی کہانی سناتے صفرا کے لیے بھی انہوں نے، سارے گاؤں والوں کو یہی بتایا تھا کہ وہ اپنے آشنا کے ساتھ بھاگ گئی ہے اور اسی صدمے سے صفرا کی ماں پاگل ہو گئی ہے۔ گاؤں کے لوگ سب کچھ جانتے ہوئے بھی خاموش تھے، تیرے سوا کون تھا جو چوہدری اور راجو کے سامنے زبان کھول سکتا۔

”بالے، میں اور اماں، ماسی کو اپنے گھر لے آئے۔ وہ سارا سارا دن ہر آتے جاتے سے تیرے لیے پوچھتی تھی، راجو جب بھی آتا اسے یہ بتانے کی کوشش کرتا تھا کہ تو اب

”اوہ..... کتنا آسان ہے محافی مانگ لینا۔ آئی ایم سوری..... اور بس۔“
 ”اقبال پلیز، میں بہت شرمندہ ہوں، مجھے احساس ہے کہ تم نے میرا بے پناہ خیال رکھا مگر میں..... میں کم ظرف تھی کہ.....“
 ”بالے..... تو اس سے کیوں جھگڑا کر رہا ہے۔ جو کچھ ہم نے بھگتا ہے وہ تو ہماری قسمت تھی بالے۔“

”ماں کہاں ہے سوہنی؟“

”ہم نے بہت کوشش کی بالے کہ وہ ہمارے ساتھ شہر آجائے، میں نے اسے بتایا تھا کہ بالا شہر میں ہے مگر..... وہ کہتی ہے کہ میں کہیں چلی گئی تو بالا مجھے ڈھونڈے گا اور نہ پا کر پھر کہیں چلا جائے گا۔“ سلطان نے جواب دیا۔
 ”اور ماسی میراں؟“

”وہ ہمارے ساتھ آئی ہے بالے، بہت بیمار ہے وہ، میں نے سرکاری اسپتال میں داخل کرا دیا ہے اور آج سوہنی کو بھی ہسپتال میں داخل کرا دوں گا۔“
 ”سوہنی..... تو یہ زہر کیوں اور کیسے پینے لگی..... میرے گاؤں میں یہ زہر نہیں تھا۔“

”ہاں بالے، مگر اب یہ زہر گاؤں بھر میں پھیل رہا ہے۔ ایک روز راجو کا ایک دوست شہر سے گاؤں گیا تھا، تمام رات ایک سفید کار راجو کی حویلی کے آگے کھڑی رہی، راجو اپنے اس دوست کو لیے گاؤں بھر میں گھومتا پھرا پھر اگلے روز میں نے گاؤں کے گھنے درختوں کے نیچے لوگوں کو سر جھکائے نشہ کرتے دیکھا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ بالے کہ وہ کیا چیز پی رہے ہیں۔ ایک روز میں بیمار ہو گئی۔ تپ چڑھ گیا تھا مجھے۔ راجو کا وہ دوست اس روز بھی گاؤں آیا تھا۔ راجو اسے لیے میرے گھر آیا۔ تیرے جانے کے بعد وہ اکثر گھر میں آ جاتا تھا۔ اماں اس سے بہت خوف زدہ تھی مگر اسے گھر آنے سے روکنا اس کے بس میں نہ تھا۔ مجھے بیمار دیکھ کر راجو کے دوست نے ایک انجکشن لگا دیا کہ ابھی ٹھیک ہو جائے گی، اور وہ انجکشن نشہ کا تھا بالے..... وہ ہر دوسرے روز مجھے یہ انجکشن لگا دیتا تھا پھر یوں ہونے لگا کہ میں خود راجو کے گھر پہنچ جاتی تھی۔ اس سے منتیں کرتی کہ مجھے انجکشن لگا دے، راجو کا دوست واپس شہر چلا آیا تھا۔ راجو نے کہا کہ اسے انجکشن لگانا

نہیں آتا پھر اس نے مجھے سفید رنگ کا پوڈر دیا اور اسے پینے کا طریقہ بتایا، بالے وہ پی کر میری بے چینی دور ہو جاتی تھی اور اس طرح میں اس زہر کی عادی ہو گئی.....۔“ مگر اب میں نے سلطان بھائی سے وعدہ کیا ہے کہ چاہے میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے میں اس نشہ کو ہاتھ نہ لگاؤں گی اور دیکھ لو بالے میرے بدن کا جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے مگر میں نے تین روز سے نشہ نہیں کیا۔“

”سوہنی، اماں کہاں ہے؟“

”اسے غلام رسول سپاہی کی بیوی لے گئی تھی۔ غلام رسول سپاہی اور اس کی بیوی آتے رہتے تھے بالے! جب انہیں معلوم ہوا کہ ہم شہر آ رہے ہیں تو انہوں نے بھی بہت کوشش کی تھی کہ ماسی ہمارے ساتھ چلے مگر..... جب وہ نہ مانی تو اسے اپنے ساتھ لے گئے۔“

”راجو نے تم لوگوں کو شہر کیسے آنے دیا؟“ فاریہ نے سوال کیا۔

”وہ نہیں جانتا۔ ہم سب سے چھپ کر آئے ہیں۔ ہمارے لیے لاری کا بندوبست غلام رسول سپاہی نے کیا تھا۔“ اس نے ڈوبتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ اس کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بڑھ کر رخساروں کی ہڈیوں تک آ گئے تھے۔ دھیرے دھیرے اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور اس نے دیوار سے سر ٹیک دیا۔
 ”لیٹ جاؤ سوہنی..... اب تم کسی بات کی فکر نہ کرو، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں اور اقبال جلد ہی گاؤں جا کر ماں کو بھی لے آئیں گے، تمہارا علاج میں کراؤں گی۔“

فاریہ نے اسے شانوں سے پکڑ کر اٹھایا۔ میں پلنگ پر سے اٹھ گیا۔ اس نے سوہنی کو وہاں لٹا دیا۔

”ہاں سوہنی۔ فاریہ ٹھیک کہتی ہیں۔ اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“ میں نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ پر تھپکی دی۔

اس لمحے سوہنی نے آنکھیں کھولیں، اس کی آنکھوں میں دکھوں کے گہرے سائے تھے اور کوئی ایسی بات تھی جس نے مجھے تڑپا کر رکھ دیا تھا۔ ”تم..... سو جاؤ سوہنی میں شام کو ڈاکٹر کو لے کر آؤں گا۔“ میں نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔

کو باہر چلنے کا اشارہ کیا۔

اس دوران میں سوہنی یونہی منہ پھیرے لیٹی رہی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ جاگ رہی تھی مگر نہ تو وہ اس معاملے میں کچھ بولی اور نہ ہی اس نے گردن موڑ کر ہمیں دیکھا۔

☆=====☆=====☆

”تو جا رہا ہے بالے؟“ اس نے حسرت ناک انداز میں کہا۔

”آں..... ہاں۔“ میں نے فاریہ کو دیکھ کر جواب دیا۔ ”میں جلد واپس آؤں گا سوہنی، مجھے کچھ کام ہے، وہ کام کر کے فوراً واپس آ جاؤں گا۔“ میں نے فوراً ہی کہا۔

اس نے تھکے تھکے انداز میں مجھے دیکھا اور کروٹ لے کر لیٹ گئی۔ میرا دل تو نہیں چاہ رہا تھا کہ اسے یوں بے آسرا چھوڑ کر چلا جاؤں مگر میں جانتا تھا کہ زاریہ کا آپریشن ہو رہا ہے۔ بیگ صاحب نار کوئٹس کے ڈائریکٹر کے پاس گئے ہوئے ہیں، نہ معلوم ان دونوں کا کیا ہوا ہو گا۔ پتا نہیں بیگ صاحب واپس آئے ہوں گے یا نہیں، نہ جانے زاریہ کا آپریشن کامیاب ہوا ہو گا یا نہیں..... میں جانتا تھا کہ فاریہ بہت اکیلی ہے اور یہاں سوہنی بھی اکیلی تھی۔ اگر سوہنی کے پاس سلطان نہ ہوتا تو میں کبھی اسے چھوڑ کر نہ جاتا یا فاریہ کے پاس کوئی بھی ہوتا تو بھی میں سوہنی کو چھوڑ کر نہ جاتا۔ میری حالت عجیب سی ہو گئی تھی۔ میری قوت فیصلہ بھی جواب دیتی جا رہی تھی۔ جی چاہ رہا تھا کہ فاریہ سے کہہ دوں کہ وہ چلی جائے اور کبھی دل کتا تھا کہ اسے اس مقام پر تنہا چھوڑنا انسانیت نہیں۔

”سلطان صاحب، ہم جلدی ہی واپس آئیں گے، آپ سوہنی کا ہر طرح خیال رکھئے گا۔ یہ ہماری امانت ہے آپ کے پاس پلیز، اور یہ.....“ اتنا کہہ کر فاریہ نے پرس کھول کر نوٹوں کی گڈی نکال لی۔ ”یہ رکھ لیجئے۔ ضرورت پڑ سکتی ہے۔“

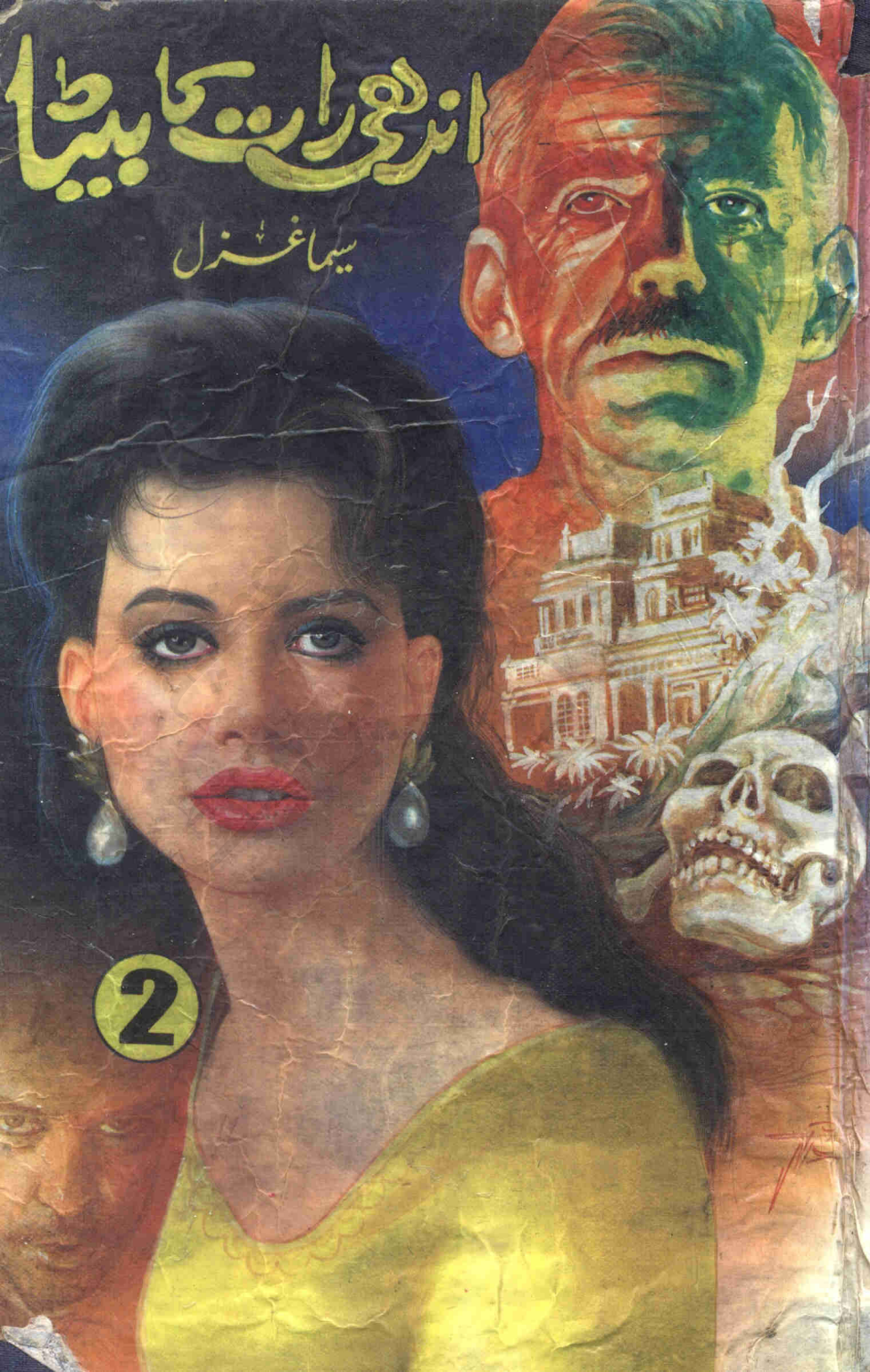
”شکریہ فاریہ صاحبہ، پیسے میرے پاس ہیں، اتنے تو نہیں جتنے آپ کے پاس ہیں مگر ہماری ضرورتوں کے لیے کافی ہیں۔“ سلطان نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔

”نہیں سلطان..... ایسا نہ بولو۔ یہ میرے ہیں، سمجھو کہ میرے ہیں۔“ میں پچویشن سے گھبرا گیا۔

”تیرے پیسے بھی نہیں چاہئیں مجھے، سوہنی کو اور ماسی میراں کو میں لایا ہوں۔ یہ میرے گھر پر ہیں، جب تو انہیں اپنے ساتھ لے جائے گا تو یہ امیری دکھانا اپنی۔“ اس نے غصے میں جواب دیا۔ ”میری غریبی کا مذاق اڑاتا ہے!“

فاریہ نے گھبرا کر پیسے واپس پرس میں رکھ لیے۔ ”نہیں سلطان..... تم غلط سمجھ رہے ہو۔ میں تو.....“ وہ بوکھلا گئی تھی۔

”نھیک ہے سلطان..... میں بعد میں آؤں گا۔“ میں نے جلدی سے کہا اور فاریہ



اندر عمارت کا بیڑا

سیما غنزل

2

پاکستان کی سب سے بڑی شہر

باراقل _____ ۱۹۹۹ء
مطبع _____ یو این ڈی پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ _____ ہاشمی کمپوزنگ سنٹر، لاہور
قیمت _____ ۱۵ روپے

فاربیہ جلدی سے بیڑھیاں اتر گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے ہی باہر چلا آیا۔ میں بے حد کنفیوز تھا۔ میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ میں نے خاموشی سے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گیا۔ فاربیہ بھی بیٹھ گئی میں نے گاڑی اشارت کی اور گاڑی کارخ اسپتال کی جانب موڑ لیا۔ آدھے سے زیادہ راستہ خاموشی میں کٹ گیا۔ شاید فاربیہ بھی محسوس کر رہی تھی کہ سب کچھ غلط ہو گیا ہے مگر اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا اس کا بھی اسے احساس تھا ورنہ وہ ایسی تو نہ تھی کہ ایسے موقع پر خود غرضی دکھاتی۔ میں عجیب سی حالت میں تھا بولنا چاہتا تھا مگر حلق خشک ہو رہا تھا۔

”اقبال..... تم..... تمہیں نہیں آنا چاہیے تھا۔“ کچھ دیر بعد فاربیہ نے کہا۔ اس کا لہجہ بھیگا ہوا سا محسوس ہوا۔

میں کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔ ”نہیں میڈم ایسی کوئی بات نہیں۔“
”یا پھر تم اسے اپنے ساتھ لے آتے۔ کوئی بہت بڑی ہے اقبال اور وہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ تم ماسی میراں اور سوہنی دونوں کو وہیں لے آؤ۔“

”جی میڈم مگر اس وقت سلطان نہیں مانتا۔ وہ جس اپنائیت سے مجھ سے ناراض ہوتا ہے یا میرے رشتے داروں کا خیال رکھتا ہے، اس سے کچھ کہنا مجھے مشکل لگتا ہے۔ میں پھر کسی وقت آکر اسے منالوں گا، مگر میڈم اب میں زیادہ برداشت نہیں کر سکتا مجھے گاؤں جانا ہو گا میڈم، جلد..... بہت جلد، میں راجو اور اس کے خاندان کو بالکل اسی طرح تباہ کر دوں گا جس طرح اس نے میرا خاندان تباہ کیا ہے۔“

”اقبال، سچ کہتی ہوں، میں اس وقت خود کو تمہاری مجرم محسوس کر رہی ہوں، اگر میں نے پہلے ہی تمہیں جانے دیا ہوتا یا میں چلی گئی ہوتی تو شاید سوہنی اس حال کو نہ

اسٹاکسٹ

علی ہیکٹال

نسبت روڈ، چوک میوہ اسپتال
لاہور فون ۲۲۳۸۵۳

ISBN 969-8429-51-4

”میڈم ہماری قسمت خراب ہے، ہم جتنا خود کو دکھوں کی دلدل سے نکلنے کو ہاتھ پاؤں مارتے ہیں اتنا ہی اس دلدل میں دھنتے چلے جاتے ہیں۔ اس میں آپ کا قصور نہیں ہے۔“

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ سر جھکائے اپنے ہاتھوں کے ناخن کریدتی رہی۔ گاڑی میں ایک گہرا سناٹا چھا گیا، ہم میں اور اسپتال میں فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے ذہن سے تمام سوچوں کو جھٹکنے کی کوشش کی۔ میں نے گاڑی اسپتال کے گیٹ سے اندر لے جا کر سیڑھیوں کے پاس روکی۔ فاریہ دروازہ کھول کر اتر گئی اور میں گاڑی کو آگے بڑھالے گیا۔ میں نے ایک درخت کے نیچے گاڑی پارک کی اور اسے لاک کر کے خود بھی وہیں پہنچ گیا جہاں فاریہ کھڑی میرے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ ہم دونوں سیڑھیاں عبور کر کے اس منزل پر پہنچ گئے جہاں آپریشن تھیٹر تھے اور جہاں ایک آپریشن تھیٹر میں زاریہ کا آپریشن ہو رہا تھا۔

آپریشن تھیٹر کے دروازے کے اوپر سرخ بلب جل رہا تھا اس کا مطلب تھا کہ آپریشن ابھی تک ختم نہیں ہوا۔ نہ معلوم کیوں میرا دل بیٹھنے لگا۔ میں ایک کھلی کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور کھڑکی سے نظر آنے والے بکراں آسمان کو تنکے لگا۔ فاریہ وہاں پڑی ایک کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔ ہم سے کچھ فاصلے پر مزید کچھ لوگ کھڑے تھے، ان کی نگاہیں بھی ایک آپریشن تھیٹر کے دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔

اچانک اس آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا جہاں زاریہ کو لے جایا گیا تھا۔ ڈاکٹر طارق کا چہرہ نظر آتے ہی میں اور فاریہ ایک ساتھ اس کی طرف بڑھے۔ ڈاکٹر طارق کے ہاتھ میں ایک پرچہ تھا جسے اس نے میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اقبال صاحب، یہ دوا انجکشن اور خون کی بوتل فوراً لے آئیں، خون آپ کو اسپتال کے بلڈ بنک سے مل جائے گا اور انجکشن شاید اسپتال کے باہر سڑک کے دوسری جانب ٹامیڈیکل سٹور پر مل جائیں۔“

میں پرچہ لے کر تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ فاریہ شاید اس سے زاریہ کے متعلق پوچھنے لگی تھی۔ میں نے ڈاکٹر طارق کا جواب سننے کی کوشش نہیں کی، کیوں کہ میں جانتا تھا کہ لمحہ بھر کی دیر کسی بھی مصیبت کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔ میں سیدھا بلڈ

بنک گیا، وہاں سے میں نے پرچے پر لکھے ہوئے گروپ کا خون لیا اور اس میڈیکل اسٹور کی طرف بڑھ گیا جہاں سے وہ انجکشن مل سکتے تھے۔ میں نے کیسٹ کی طرف پرچہ بڑھا دیا اور جیب سے پیسے نکالنے لگا۔

”یہ ٹیبلٹس ہوں گی آپ کے پاس۔“

اچانک ایک مترنم آواز نے مجھے نگاہ اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ میں نے کن آنکھوں سے بولنے والی کی طرف دیکھا۔ وہ بلاشبہ حسین ترین لڑکی تھی اور ایک نسخہ تھامے کیسٹ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر میری نگاہ اس کے خوب صورت ہاتھوں پر ٹھہر گئی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے میں پھنسا کر اس شوکیس پر ٹکایا ہوا تھا جہاں کیسٹ نے میرے مطلوبہ انجکشن رکھے تھے، بس لمحہ بھر کو میری نگاہ اس کے خوب صورت ہاتھوں پر پڑی، گوری اور مخروطی انگلیوں میں خوب صورت انگوٹھیاں اور بڑھے ہوئے ناخنوں پر سرخ رنگ کی نیل پالش اسے مزید خوب صورت بنا رہی تھی۔

”یہ انجکشن جناب“ کیسٹ کی آواز سے میں چونک اٹھا اور میں نے دونوں انجکشن اٹھا لیے۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ جیسے میرے ذہن میں کہیں کاٹنا سا چھ گیا ہے۔ اس لڑکی کی شخصیت میں اچانک ہی کچھ عجیب سی بات محسوس ہوئی تھی۔ جسے میں کوئی نام نہیں دے پا رہا تھا۔ اسی الجھن میں، میں نے پیسے ادا کیے اور انجکشن لیے تیزی سے اسپتال کی طرف بڑھ گیا۔ اسپتال کی طرف جاتے ہوئے بھی کوئی مجھے اندر سے دبوچ رہا تھا اور مجھے پلٹ جانے پر مجبور کر رہا تھا مگر یہ وقت ایسا نہ تھا کہ میں اسے یہاں اپنی الجھی ہوئی سوچوں کو سلجھانے میں ضائع کرتا۔ ڈاکٹر طارق نے مجھے جلد آنے کو کہا تھا۔ یہ انجکشن زاریہ کے لیے زندگی جتنا اہم بھی ہو سکتا تھا۔ میں ان تمام کیفیتوں کے باوجود رکا نہیں۔

سیڑھیوں کو پھلانگتا ہوا میں آپریشن تھیٹر کے دروازے پر پہنچ گیا جہاں فاریہ بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی میری سمت لپکی۔ ”اوہ اقبال، اتنی دیر لگا دی۔ ڈاکٹر طارق دو مرتبہ پوچھ چکے ہیں۔“

ابھی اس نے جملہ مکمل کیا تھا کہ آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر طارق باہر آ

گئے، میں تیزی سے آگے بڑھا اور میں نے ایک تھیلا ان کے حوالے کر دیا جس میں خون اور انجشن موجود تھے۔ ڈاکٹر طارق کوئی بات کیے بغیر اندر کی طرف پلٹ گئے۔ ان کے چہرے پر شدید گھبراہٹ تھی جس نے مجھے مایوس کر دیا۔ ”یا اللہ خیر کرنا!“ میرے دل سے بے اختیار دعا نکلی۔ فاریہ بھی شاید محسوس کر چکی تھی کہ ڈاکٹر طارق حد سے زیادہ گھبرائے ہوئے تھے۔ وہ بھی سخت بے چین ہو گئی اور اس نے کوریڈور میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ میں پھر کھڑکی میں اکھڑا ہوا اور اپنے ذہن کو ادھر ادھر لگانے لگا تاکہ پریشانی سے بچ سکوں، میں جانتا تھا کہ میری پریشانی فاریہ کے حوصلے پست کرے گی۔ میں خواہ مخواہ دور جاتی سڑک سے گزرنے والی گاڑیوں کو گننے لگا، اچانک میرے ذہن میں وہی حسین لڑکی آکھڑی ہوئی، جس سے میں کچھ دیر پہلے میڈیکل اسٹور پر ملا تھا اور جسے دیکھنے کے بعد نہ معلوم کیوں میرے ذہن میں کانٹے سے اُگ آئے تھے۔ اس کا خیال آتے ہی میرے وجود میں وہی عجیب سی بے چینی پھیل گئی۔ میں نے آج سے پہلے کبھی اس لڑکی کو نہیں دیکھا تھا مگر پھر بھی کوئی ایسی بات تھی جو مجھے بار بار یہ احساس دلا رہی تھی کہ میں اسے جانتا ہوں۔ میرا ذہن الجھتا جا رہا تھا۔ اس کی مترنم آواز مسلسل میری سماعت میں بھنور سے ڈال رہی تھی۔ اس کا سراپا میری نگاہوں میں گھوم رہا تھا اور میرے اندر کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ اچانک اس کے خوب صورت ہاتھوں کی مخروطی انگلیاں میرے ذہن میں چپک سی گئیں۔ ناخنوں پر لگی نیل پالش بار بار میرے دماغ میں ہتھوڑے سے برسا رہی تھی۔

”کیا مصیبت ہے۔“ میں زیر لب بڑبڑایا۔ میں نے اس کے خیال کو جھٹکنا چاہا اور تبھی اچانک میرے بے پناہ شور کرتے وجود میں گہری خاموشی چھا گئی۔ گہری اور پراسرار خاموشی، اور پھر میں اچھل پڑا۔ اس کے ہاتھوں کی خوب صورت انگلیوں میں ایک انگلی کا ناخن نہیں تھا۔ اس نے اس پر بھی نیل پالش لگا کر چھپانے کی کوشش کی تھی اور یہی شاید وہ چیز تھی جس نے میرے وجود میں کانٹے سے چبھائے تھے۔

میں تیزی سے سیڑھیوں کی طرف لپکا۔

”اقبال۔“ مجھے سیڑھیاں اترتے دیکھ کر فاریہ چیخی۔ شاید اس نے بھی میری وحشت کو محسوس کر لیا تھا۔

”میں آ رہا ہوں میڈم.....“ میں نے نیچے اترتے ہوئے جواب دیا مگر ٹھہرا

نہیں۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ وہی لڑکی تھی جس کے بارے میں حمیدہ نے ہمیں بتایا تھا اور جو عذرا بن کر حویلی میں داخل ہوئی اور زاریہ کو زندگی سے دور کر کے غائب ہو گئی تھی۔ مجھے امید تھی کہ وہ مجھے نیچے مل جائے گی مگر پھر بھی میں تیز رفتاری سے اسی میڈیکل اسٹور کی طرف بڑھ گیا۔

حسب توقع وہ وہاں نہیں تھی۔

”سنئے..... وہ جو لڑکی ابھی کچھ دیر پہلے.....“ اور پھر میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ میڈیکل اسٹور والا مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس سے کچھ پوچھنا بیکار ہی تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ وہ اپنے اسٹور پر آنے والے ہر شخص کو جانتا ہو۔ میں کچھ دیر حیران سا کھڑا چاروں طرف دیکھتا رہا۔ پھر کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح اسپتال کی طرف چل پڑا۔ میں اس وقت اپنے آپ کو بری طرح کوس رہا تھا کہ مجھے یہ بات اس وقت یاد کیوں نہ آئی جب میں نے اس کے ہاتھوں کو دیکھا تھا۔ یہ احساس تو مجھے اسی وقت ہو گیا تھا کہ کچھ ہے، کیا ہے اس کا احساس بہت بعد میں ہوا۔ اتنی دیر میں تو وہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہو گی۔

میں تھکا تھکا اوپر پہنچا تو فاریہ کو وہاں نہ پا کر حیران رہ گیا۔ سامنے بیچ پر ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس سے فاریہ کے متعلق پوچھا۔

”جی وہ اس طرف گئی ہیں۔“ اس نے دائیں جانب اشارہ کیا۔ جس جانب اس شخص نے اشارہ کیا تھا وہاں ایک لائن میں کمرے بنے ہوئے تھے جہاں مریض کو آپریشن کے بعد چند روز تک رکھا جاتا تھا۔ میں نے پلٹ کر اس آپریشن تھیمڑکی طرف دیکھا جہاں زاریہ کو لے جایا گیا تھا۔ وہاں دروازے پر لگا بلب بجھ چکا تھا۔ یہ دیکھتے ہی میں ان کمروں کی طرف بڑھ گیا۔ بلب بجھ جانے کا مطلب تھا کہ زاریہ کا آپریشن ہو چکا ہے۔ میں ہر کمرے میں جھانکتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔ وہاں ایک کمرے کے اندر سے مجھے ڈاکٹر طارق کی آواز آئی۔

میں نے ہلکے سے دروازے پر دستک دی۔

”کم ان!“ ڈاکٹر طارق نے دستک کا جواب دیا۔

میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ فاریہ، زاریہ پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کی

آنکھوں میں آنسو تھے مگر چہرے پر خوشی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے اس لمحے خود کو ہلا محسوس کیا۔ ڈاکٹر طارق نے مجھے مسکرا کر دیکھا۔ ”مبارک ہو مسٹر اقبال، زاریہ اب بالکل ٹھیک ہے، چھ سات گھنٹے میں انہیں ہوش آجائے گا۔“

”چھ سات گھنٹے..... یہ بہت طویل عرصہ نہیں ڈاکٹر؟“

”بہت طویل ہے، مگر اقبال صاحب، مسئلہ دماغ کا ہے، ابھی کچھ ہی دیر پہلے میں نے انجکشن دیا ہے تاکہ وہ مکمل طور پر آرام کر سکیں ورنہ یہ ممکن تھا کہ وہ آدھے گھنٹے میں ہوش میں آجائیں۔ ایسا ان کی صحت کے لیے ضروری تھا، بلکہ میں تو آپ لوگوں سے یہ بھی درخواست کروں گا کہ ہوش میں آنے کے بعد بھی آپ لوگ ان سے کم ہی بات کیجئے گا۔ میرا خیال ہے کہ انہیں مکمل صحت یاب ہوتے ہوئے مہینہ تو لگ ہی جائے گا۔“

”اوکے طارق..... ناوشی از دیری ویل۔“ ڈاکٹر نے جو زاریہ کا معائنہ کر رہے تھے سر اٹھا کر کہا۔

”تھینک یو سر..... آئیے آپ کو چھوڑ آؤں۔“

”کہاں..... میں ذرا ایم ایس سے مل کر جاؤں گا۔“ انہوں نے اپنا اسٹیتھو سکوپ اور ایک چھوٹا بکس اٹھاتے ہوئے کہا۔ وہ بکس بریف کیس سے کچھ بڑا تھا مگر یہ اس بکس سے بالکل مختلف تھا جو عام طور پر ڈاکٹرز کے پاس ہوتے ہیں۔

میں ان دونوں کو باتیں کرتے دیکھ کر خود زاریہ کے قریب چلا گیا۔ زاریہ دنیا و مافیہا سے بے خبر، بالکل بے حس و حرکت لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا رنگ بالکل سفید ہو رہا تھا۔ میں چند لمحے خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ اس دوران میں ڈاکٹر تجل اجازت لے کر اور فاریہ کو تسلی دے کر چلے گئے۔ پھر ڈاکٹر طارق بھی یہ کہہ کر چلے گئے کہ وہ ایک گھنٹے کے بعد آئیں گے۔ ظاہر ہے وہ بہت تھک چکے تھے۔ فاریہ نے انہیں کہا وہ چاہیں تو آرام کر سکتے ہیں اور یہ کہ فاریہ اور میں زاریہ کے پاس ہیں۔ ڈاکٹر کے جاتے ہی فاریہ میرے قریب آگئی۔ ”اقبال تم کہاں گئے تھے؟“ اس کے لہجے میں کھوج تھا۔

تب میں نے اسے ساری بات بتا دی۔ یہ سن کر کہ میں اسے کھوپکا ہوں وہ بہت نڈھال ہو گئی۔ ”اوہ..... ہر بار شکست ہر لمحہ ہار..... یہ آخر کب تک ہو گا اقبال.....؟“

”آپ مایوس نہ ہوں میڈم۔ خدا ہماری مدد کر رہا ہے اور وہ ہمیں ایک نہ ایک روز ضرور کامیاب کرے گا۔ ہم انسانیت کے لیے کر رہے ہیں جو کچھ کر رہے ہیں۔ وہ یقیناً ہمارا ساتھ دے گا۔“

”خدا کرے اقبال.....“ اس نے اپنے ہاتھوں کو اپنی گود میں رکھ لیا اور سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ اس کے انداز میں بے حد تھکاوٹ اور مایوسی تھی۔ پھر اس نے کچھ دیر بعد سر اٹھایا تو خود پر کافی قابو پا چکی تھی۔ ”اقبال تم گھر فون کر کے انکل کے بارے میں معلوم کرو کہ وہ آئے یا نہیں، اگر وہ گھر پر نہ ملیں تو.....“ یہ کہہ اس نے پرس میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹی سی ڈائری نکالی اور اس میں سے ایک کانڈ پر فون نمبر لکھ کر میری جانب بڑھا دیا۔ ”وہ گھر پر نہ ہوں تو اس نمبر پر انسپکٹر قدیر کو فون کرنا۔ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ کیا ہوا؟“

میں نے کانڈ لے لیا اور اس سے اجازت لے کر نیچے میڈیکل اسٹور پر چلا آیا۔ میڈیکل اسٹور والے نے مجھے پھر اپنے قریب دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا۔ ”جی فرمائیے؟“

”میں فون کروں گا۔“

”جی ضرور!“ یہ کہہ کر اس نے فون قریب کر دیا۔

میں نے پہلے کوٹھی کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے ریسیور اٹھانے والے خود بیگ صاحب تھے۔

”بیگ صاحب۔ سب ٹھیک ہے نا؟“

”ہاں..... بیٹا، زاریہ کیسی ہے؟“

”جی انکل اس کا آج آپریشن تھا۔“

”آپریشن۔ مگر تم لوگوں نے.....“

”آپریشن کامیاب ہو گیا ہے انکل، باقی تفصیل ہم وہیں آکر بتائیں گے۔ بس آپ خوش ہو جائیے وہ ٹھیک ہو گئی ہے۔“ میں نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔

”اوہ اقبال..... خیر ٹھیک ہے، تم لوگ کب آؤ گے؟“

”ابھی تو ہم زاریہ کے پاس ہیں۔ ڈاکٹر طارق آرام کرنے گئے ہیں، وہ صبح سے آپریشن میں بڑی تھے۔ ان کے آنے کے بعد ہی ہم آسکیں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔ اب

انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”خدا تمہاری زبان مبارک کرے بیٹا۔ میں زاریہ کو دیکھنا چاہتا ہوں۔“ انہوں نے لمبی انداز میں کہا۔

”میں کوشش کرتا ہوں کہ آپ کو آکر لے آؤں۔ فاریہ کو بتا دوں کہ آپ پہنچ گئے ہیں!“

”ہاں اور اس سے کہو کہ میں آنا چاہتا ہوں۔“

”جی بستر۔ میں کچھ دیر میں یا تو فون کروں گا یا پھر آ جاؤں گا۔“ پھر میں نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ میں نے جیب سے نوٹ نکال کر میڈیکل اسٹور والے اس لڑکے کی طرف بڑھا دیا۔ جو شاید حساب کتاب کر رہا تھا۔ پھر میں پلٹ کر اسپتال آ گیا۔ فاریہ بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھی۔

”کیا ہوا؟“ اس نے میرے داخل ہوتے ہی پوچھا۔

میں نے اسے بتایا کہ بیگ صاحب گھر آ گئے ہیں تو وہ خوش ہو گئی۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ وہ زاریہ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ فاریہ نے مجھے جانے کی اجازت دے دی۔ میں اس سے رخصت ہو کر نیچے آ گیا۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور کوٹھی کی سمت چل پڑا۔

کچھ ہی دیر بعد میں بیگ صاحب کو لیے دوبارہ اسپتال آ رہا تھا۔ راستے میں مجھے بیگ صاحب نے بتایا کہ نارکوٹکس کے ریجنل ڈائریکٹر نے انہیں تعاون کا یقین دلایا ہے اور وعدہ کیا ہے کہ ان کی گواہی کو راز رکھا جائے گا اور انہیں سلطانی گواہ بنالیا جائے گا انہوں نے اپنے آدمی وحسی صاحب کے پیچھے لگا دیے ہیں اور کہا ہے کہ ان کی کوئی شہنگ نہ روکی جائے۔ وہ اس معاملے کو اپنے طور پر ڈیل کریں گے۔

ان کی زبانی یہ سب سن کر مجھے قدرے اطمینان ہو گیا۔ یہ حقیقت تھی کہ زاریہ کے آپریشن اور ریجنل ڈائریکٹر سے بیگ صاحب کی ملاقات نے ہم پر منڈلانے والے خطرات کو کم کر دیا تھا مگر سوہنی کی حالت کو دیکھ کر میں خود کو وہیں کھڑا محسوس کر رہا تھا جہاں اب سے کچھ دن پہلے تھا۔ میرے لیے پریشانی کم ہونے کے بجائے بڑھ گئی تھیں۔ خصوصاً ماں کا گاؤں میں رک جانا، میرے لیے بڑی پریشانی کا باعث تھا۔

”بس بیٹا کہاں جا رہے ہو؟“ اچانک بیگ صاحب کی آواز نے مجھے سوچوں کے

بھنور سے نکال لیا۔

میں نے بریک دیا اور ورنہ میں اسپتال کے گیٹ سے آگے نکل جاتا۔ گاڑی میں نے اندر موڑ لی اور مناسب جگہ پارک کر کے ہم دونوں اسپتال کی عمارت کی طرف بڑھ گئے۔ میں نے لفٹ سے جانا مناسب سمجھا کیوں کہ بیگ صاحب خود بھی بیمار تھے، ان کے لیے دو منزل تک سیڑھیاں چڑھنا غیر مناسب تھا۔

چند منٹ بعد ہی ہم اس کمرے میں تھے جہاں زاریہ کو رکھا گیا تھا۔ فاریہ ہمیں دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔ بیگ صاحب لپک کر زاریہ کے سرہانے پہنچ گئے۔ ”اس کی یہ حالت ہو گئی اور تم لوگوں نے مجھ سے چھپائے رکھا۔“ انہوں نے فاریہ سے شکایت کی۔

”انکل آپ بھی تو ٹھیک نہیں تھے، پھر آپ کو بتا کر کیا کرتے، اب دیکھئے نا یہ بالکل ٹھیک ہے، آپریشن کامیاب ہو گیا ہے۔“

”تو پھر یہ..... یہ بے حس و حرکت کیوں ہے، آنکھیں کیوں نہیں کھولتی..... بات کیوں نہیں کرتی؟“ وہ گھبرائے ہوئے تھے۔

”انکل..... یہ بے ہوش ہے، اسے ڈاکٹر نے خود بے ہوشی کا انجکشن لگایا ہے تاکہ مکمل طور پر آرام کرے۔ ابھی ہوش میں آئی تو تکلیف محسوس کرے گی۔“ فاریہ نے انہیں سمجھایا۔

”تم..... تم سچ کہہ رہی ہو نا؟“

”جی بیگ صاحب یہ سچ کہہ رہی ہیں۔“ دروازے سے ڈاکٹر طارق کی آواز آئی۔

”اوہ ڈاکٹر..... تم بھی ان لوگوں کی طرح اصل بات مجھ سے چھپاتے ہو۔“

”جی میں مجرم ہوں آپ کا مگر اس وقت خود آپ کی حالت ایسی نہیں تھی مگر اب میں قسم کھانے کو تیار ہوں کہ مس زاریہ بالکل فرسٹ کلاس ہیں۔ آپ بالکل فکر نہ کریں، بس انہیں آرام کی ضرورت ہے، ہوش میں آ جانے کے بعد بھی میں آپ لوگوں سے یہ امید کروں گا کہ آپ لوگ اسے زیادہ سے زیادہ آرام پہنچانے کے لیے تنہا چھوڑ دیں گے۔“ ڈاکٹر طارق نے کہا۔

”ڈاکٹر آپ تو آرام کرنے گئے تھے۔“ فاریہ نے پوچھا۔

”بس مس فاریہ ہمارا آرام اتنا ہی ہوتا ہے۔ ویسے میں نے ڈاکٹر منیر کو بلوایا ہے،

ڈاکٹر منیر میرے کلینک میں کام کرتے ہیں اور میرے بہنوئی بھی ہیں۔ آج وہ رات بھر زاریہ کے پاس رہیں گے اور میں آج رات گھر پر آرام کروں گا۔
”ڈاکٹر.....!“ فاریہ نے وحشت زدہ ہو کر کہا۔

”نہیں مس فاریہ، آپ فکر نہ کریں۔ میں ڈاکٹر منیر پر اتنا ہی اعتماد کرتا ہوں جتنا خود پر، اور میں انہیں تمام معاملہ بھی سمجھا چکا ہوں۔ دراصل اس تمام معاملے کو پوری احتیاط سے ہینڈل کرنا اور دوسرے مسائل سے بھی نمٹنا تمام میرے بس سے باہر تھا۔ میں ذہنی طور پر خود کو بہت تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ اسی لیے میں نے ڈاکٹر منیر کو اپنے اعتماد میں لیا اور اب میں اس معاملے کو باآسانی منبھال سکتا ہوں۔ جب تک مس زاریہ مکمل طور پر صحت مند نہیں ہو جاتیں میری ذمہ داری ختم نہیں ہوگی۔“

”تھینک یو ڈاکٹر، آپ نے میرا جتنا ساتھ دیا ہے میں اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔“ فاریہ نے احسان مندانہ انداز میں جواب دیا۔

ڈاکٹر طارق وہیں بیٹھ گئے اور بیگ صاحب سے باتیں کرنے لگے۔ فاریہ بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ بیگ صاحب سے ان کے معاملے پر گفتگو کے لیے پریشان ہے مگر ڈاکٹر طارق کی موجودگی میں یہ ممکن نہ تھا۔

زاریہ کی بے ہوشی کو تقریباً تین گھنٹے گزر چکے تھے گویا آپریشن ہوئے تین گھنٹے ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر اسے مسلسل گلوکوز اور خون دے رہے تھے۔ وہ اب تک اسی طرح پڑی تھی، بے حس و حرکت، اس میں گو زندگی کے آثار بالکل نہ تھے مگر وہ مشینیں جن سے نکلنے والے مختلف تار زاریہ کے بدن کے مختلف حصوں میں لگے ہوئے تھے وہ اسے زندہ ثابت کر رہی تھیں۔ اس کے دل کی دھڑکن بہت مدہم تھی مگر چل رہی تھی۔

میں بہ ظاہر زاریہ کو دیکھ رہا تھا مگر میرا ذہن کہیں اور تھا۔ پلنگ پر کروٹ لیے منہ پھیرے سوہنی اب بھی میری نگاہوں کے سامنے تھی۔ اب مجھے اس کا چہرہ، اس کی آنکھیں، اس کا لہجہ اور اس کا پورا کا پورا سراپا یاد آ رہا تھا۔ یہ کسی حال میں بھی وہ سوہنی نہیں تھی جسے پہلی نگاہ میں دیکھ کر ہی میں دل ہار بیٹھا تھا۔ صغرا کے ساتھ پانی بھرتی ہوئی سوہنی، میرے پیالہ بنے ہاتھوں میں پانی ڈالتی ہوئی سوہنی اس سوہنی سے بہت مختلف اور خوب صورت تھی۔ مجھے سوہنی کی وہ ہنسی یاد آ گئی جب میں ہاتھوں کا پیالہ بنائے پانی پی رہا

تھا اور نگاہیں اوپر اٹھائے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا تو وہ ایک دم حیران سی ہو کر بولی تھی۔ ”ہائے تو اتنا پیاسا تھا؟“ اور جب صغرا نے میرا کندھا ہلا کر کہا۔ ”بھاء جی بس کر، اتنا پانی پئے گا تو مر جائے گا۔“ تب سوہنی کی چھلکتی ہوئی ہنسی سن کر میں جھینپ گیا تھا۔ اس کا چھینچھناتا ہوا لہجہ میرے پورے وجود میں پائل سی چھنکا گیا تھا۔

مگر اب۔ اس کا لہجہ، اس کا انداز۔ کتنا فرق تھا اس میں اور آج کی سوہنی میں۔ پہلے اس کے لہجے میں چھنکار تھی مگر اب وہ بولی تھی تو یوں لگا تھا جیسے میں بگولوں کی وحشت ناک آوازوں میں چکراتا ہوا اوپر ہی اوپر اٹھتا چلا جا رہا ہوں، اور جیسے ہی یہ آواز معدوم ہو گی میں دھڑام سے زمین پر آگروں گا اور جب اس نے کہا تھا۔ ”اس سے کیوں جھگڑا کرتا ہے ہائے، ہم نے جو بھگتا ہماری قسمت میں لکھا تھا“ تو اس کی آواز گہرے کنویں سے آتی محسوس ہوئی تھی، وہ خود بھی تو ایک اندھے کنویں میں تبدیل ہو گئی تھی۔ ایک اندھے اور تاریک کنویں میں جس میں سوائے گاڑھے دھوئیں کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ یہ ساری سوچیں اتنی وحشت ناک تھیں کہ میرے روٹنے کھڑے ہو گئے۔ میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔
”اقبال.....“ فاریہ نے حیرت زدہ لہجے میں مجھے پکارا۔ میں نے خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

وہ میرے قریب چلی آئی۔ ”اقبال، کیا بات ہے..... تم ٹھیک تو ہونا؟“
”جج..... جی میڈم..... میں..... ٹھیک ہوں۔“ میں نے جواب دیا اور خود پینٹ کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کھڑکی میں آکھڑا ہوا۔ ہوا میں خنکی تھی، یہ خنکی میرے چہرے سے نکرائی تو جیسے مجھے ہوش آگیا۔ میں نے چند منٹ لمبے لمبے سانس لئے اور تازہ ہوا کو اپنے اندر اتارنے لگا۔ میرے اس عمل نے فوراً ہی مجھ میں توانائی بھر دی۔
”اقبال، میں جانتی ہوں تم بہت پریشان ہو، تمہاری جگہ اگر میں ہوتی تو شاید تم سے زیادہ پریشان ہو چکی ہوتی، تم میں صبر و تحمل کمال کا ہے اقبال۔ جاؤ سوہنی کے پاس جاؤ، وہ تمہارے اس طرح چلے آنے سے ناراض ہوگی اور جسے آدمی پیار کرتا ہو اسے ناراض نہیں کرنا چاہیے۔“ فاریہ نے میرے قریب آ کر سرگوشی میں کہا۔

”نن..... نہیں میڈم۔ میں اس لیے تو پریشان نہیں ہوں۔“ میں نے جھوٹ بولا مگر وہ جن نگاہوں سے مجھ دیکھ رہی تھی اس نے مجھے نگاہ جھکانے پر مجبور کر دیا۔

”جاؤ، اقبال۔ دیکھو نا اب مجھے ہر طرح سے اطمینان ہے۔ انکل واپس آ گئے ہیں۔ دسی صاحب والا معاملہ تدیر دیکھ رہا ہے۔ زاریہ کا آپریشن کامیاب ہو گیا۔ ڈاکٹر طارق میرا اور زاریہ کا بلکہ انکل کا بھی کتنا خیال کر رہے ہیں۔ اب مجھے ایسی کوئی پریشانی نہیں کہ تم محض میری وجہ سے اس کا خیال نہ کرو۔ وہ جب تک یہاں ہے، تمہاری ذمہ داری ہے۔ سلطان کتنا ہی ہمدرد کیوں نہ ہو، سوہنی کا تو کچھ نہیں لگتا نا پھر اسے وہاں اس کے پاس چھوڑنا مناسب نہیں ہے۔ تم ماسی میراں اور سوہنی کو یہاں لے آؤ۔ میں سوہنی کا علاج ڈاکٹر طارق سے کرواؤں گی اور ماسی میراں کا بھی۔ ہم اسے سرکاری اسپتال کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتے۔ جاؤ اقبال پلیر ورنہ میں بھی اس کی طرف سے پریشان رہوں گی۔ تم انہیں لے کر گھر چلے جانا۔ میں اور انکل ڈاکٹر طارق کے ساتھ گھر چلے جائیں گے۔ ڈاکٹر طارق کہہ چکے ہیں کہ یہاں صرف ڈاکٹر منیر رہیں گے۔ تم جا کر حمیدہ سے کہنا کہ وہ کھانے میں بہت اچھی چیزیں بنائے۔ سوہنی میری مہمان ہے اقبال، جتنا تم نے میرا خیال رکھا ہے میں اتنا ہی سوہنی کا خیال رکھوں گی۔“

فاریہ دھیرے دھیرے بولے جا رہی تھی اور میں نکٹلی باندھے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ کتنی پُر خلوص، کتنی شفیق لگ رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے مجھ پر شدید گرمی اور جس کے بعد اچانک ٹھنڈی پھوار سی پڑنے لگی ہو۔ میں کھڑا ہو گیا۔ میری آنکھوں میں گویا آنسو کا قطرہ سا انک گیا تھا۔ میں بے ساختہ ہنس دیا۔

”تھینک یو میڈم، تھینک یو، آپ بہت شفیق ہیں۔“

جواباً وہ مسکرائی اور اس نے میرے کندھے پر اپنا نرم و نازک سا ہاتھ رکھ دیا۔

”جاؤ۔“

میں دروازے کی طرف بڑھا۔ پھر اچانک مجھے ڈاکٹر طارق اور بیگ صاحب کا خیال آ گیا۔ میں واپس آیا اور ان دونوں کے قریب پہنچ گیا۔ ”اوکے ڈاکٹر، اوکے بیگ صاحب۔“ میں نے ان کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے رخصت چاہی۔

”کہاں جا رہے ہو؟“ بیگ صاحب نے حیران ہو کر پوچھا۔

”انکل، اقبال کو ذرا کام ہے۔“ مجھ سے پہلے فاریہ بول اٹھی۔

بیگ صاحب نے سر ہلایا مگر ان کی آنکھوں میں الجھن تھی۔ میں ان دونوں سے

مصافحہ کر کے کمرے سے باہر آ گیا۔ کمرے سے باہر آتے ہی گویا میرے پر لگ گئے۔ میں دو سیڑھیاں ایک ساتھ پھاندتا ہوا نیچے پہنچا اور گاڑی میں بیٹھتے ہی میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ اسپتال سے باہر آ کر گاڑی کی اسپنڈ بڑھا دی تھی۔ میں جلد از جلد سوہنی تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ سورج کی تپش ختم ہو چکی تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک بڑھ گیا تھا مگر میں انتہائی مہارت سے گاڑی تیز رفتاری سے چلاتا ہوا کرشن نگر پہنچ گیا۔ سلطان کے گھر کی سیڑھیاں بھی چند ہی چھلانگوں میں عبور کر گیا۔

دروازے پر تالا نہیں تھا۔ میں نے دستک دی۔ چند ہی منٹ بعد دروازہ کھل گیا۔ سامنے سلطان کھڑا تھا۔ ”کیوں..... تو کیوں واپس آ گیا؟ تجھے تو بڑے کام تھے، اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ اپنوں کا دکھ ہی سن لیتا پھر کیسے وقت مل گیا تجھے؟“ اس کے لہجے میں اتنا زہر تھا کہ مجھے اپنا آپ کتنا محسوس ہوا۔

”مجھے اندر نہیں آنے دے گا کیا؟“ میں نے تھوک نلگتے ہوئے کہا۔

”کیوں نہیں..... مجھے بھلا کیا حق ہے کہ میں تجھے اندر آنے یا باہر جانے سے روک سکوں۔ یہ حق تو شاید تو نے کسی کو بھی نہیں دیا۔“ اس نے اسی زہریلے انداز میں جواب دیا اور پلٹ کر اندر کی طرف بڑھ گیا۔

میں اس کے پیچھے ہی اندر داخل ہو گیا۔ سوہنی فرش پر پچھی دری پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر بھی اس نے جنبش نہ کی بلکہ اسی طرح بیٹھی ساٹ نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ یوں جیسے میرا اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ میرا جی چاہا کہ میں آگے بڑھ کر اسے جھنجھوڑ دوں۔ اس سے پوچھوں کہ اس کی آنکھوں کی وہ بے چینی کہاں گئی جو میں نے آخری بار اس کی آنکھوں میں کوندتی دیکھی تھی۔ اس کی وہ مسکراہٹ کہاں کھو گئی۔ جو میرے ذہن میں آج بھی چاندنی بن کر پھیلی ہوئی ہے۔ میں نے چاہا کہ اسے بتا دوں کہ میں تو آج تک اسی کی یادوں کے سارے جیتا رہا ہوں پھر اس پر ایسی گہری چپ کیوں طاری ہے، میں اسے سب کچھ بتانا چاہتا تھا مگر میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ میرا حلق خشک ہو گیا تھا۔ الفاظ دھواں بن کر نگاہوں کے سامنے مگر ہونٹوں سے بہت دور اڑ رہے تھے۔ میں کسی روبروٹ کی طرح اس کے سامنے جا بیٹھا۔ وہ اب بھی مجھے ہی تک رہی تھی مگر اس کی نگاہوں میں کچھ بھی نہ تھا، کوئی جذبہ، کوئی احساس یا کوئی تاثر نہ تھا۔ نہ

معلوم کیوں مجھے لگا جیسے میرے سامنے کسی نے سفید بے داغ چادر سی تان دی ہو۔ میں گھبرا سا گیا۔ میں زیادہ دیر اس کے قریب نہ بیٹھ سکا۔ ایک دم ہی کھڑا ہو گیا۔ سلطان کمرے کے ایک کونے میں بیٹھا چولے پر چائے کی کیتلی رکھ رہا تھا۔

”سلطان، ماسی میراں کہاں ہے؟“ میں نے ڈوبتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

سلطان نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور جواب دیے بغیر چائے کے گکے اپنے سامنے رکھنے لگا۔ کمرے میں سوائے برتنوں کے کھنکنے کی آواز کے دوسری آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اتنے گہرے سکوت نے مجھے بے چین کر دیا تھا کہ مجھے اپنی پشت پر پائل کی چھنکار سنائی دی۔ پائل کی وہی چھنکار جو میرے اور سوہنی کے درمیان پہلی کڑی تھی۔ میں بے ساختہ پلٹ گیا۔ تب میری نگاہ سوہنی پر پڑی جو اپنی سمٹی ہوئی ٹانگوں کو پھیلا چکی تھی، اس نے شاید پہلو بھی بدلا تھا کہ اس کی شلوار کا پانچہ کچھ اوپر سرک گیا تھا اور اس کے خوب صورت پیروں میں پڑی پائل میری نگاہوں میں انگارے سے بھر رہی تھی۔ یہ وہی پائل تھی جو میں نے اپنے پیار کی پہلی نشانی کے طور پر اسے دی تھی۔ ہم دونوں کے درمیان کی پہلی کڑی آج بھی میرا پیار بنی اس کے پیروں سے لپٹی ہوئی تھی۔

پائل کی اس چھنکار نے میرے اندر طوفان سے اٹھا دیے تھے میرے اوپر چڑھا، اقبال کا خول پل بھر میں اتر گیا، وہ کھنچاؤ، وہ وضع داری دھواں بن کر اڑ گئی اور میں لپک کر اس کے قریب جا بیٹھا۔

”سوہنی..... تو مجھے دیکھتی کیوں نہیں، مجھ سے بات کیوں نہیں کرتی سوہنی! دیکھ تو میں وہی بالا ہوں، تیرا اپنا، یاد ہے میں نے تیری آنکھوں میں ایک سپنا سجایا تھا۔ کہاں ہے وہ سپنا..... کہاں ہے وہ پیار جو میں نے تجھے سونپا تھا سوہنی، میں تو آج تک اس پیار کے سارے جی رہا تھا، مجھے پیار چاہیے سوہنی مجھے اپنا وہی پیار چاہیے۔“ میں بے ساختہ بولتا ہی چلا گیا، مجھے لگا جیسے میرے اندر کے دریاؤں کا بند ٹوٹ گیا ہو۔

”تیرا پیار تو کچا پختار تھا بالے..... لمحوں کے پیروں تلے دب کر چلا گیا۔ وہ سپنا جو تو نے مجھ میں بسایا تھا، مجھ سے چھین لیا گیا بالے، میرے وجود میں تیرے پیار کی راکھ تو شاید مل جائے مگر وہ پیار..... تو لیرا لوٹ کر لے گیا..... مجھ میں اب کچھ بھی نہیں بالے۔ کچھ بھی نہیں۔“ وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھی، یوں جیسے میری موت کا پروانہ پڑھ کر

سنارہی ہو۔

میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ”تو..... تو کیا کہہ رہی ہے سوہنی؟ وہ..... وہ کون تھا جو میرا سپنا بھی لوٹ کر لے گیا..... اور..... تو نے میرے پیار کی حفاظت بھی نہ کی!“ میں نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

”بالے.....“ اس نے گہرا سانس لے کر سر دیوار سے ٹیک دیا۔ ”اگر کوئی تجھے جکڑ کر اٹھا لے جائے..... اور لوٹ لے تو کیا..... کیا تو ان امانتوں کو بچا سکتا ہے جو کسی نے تجھے دی ہوں؟“

”سوہنی..... چپ کر جا..... چپ کر جا سوہنی۔“ میں تڑپ کر کھڑا ہو گیا اور خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور میں دیوار میں کے برسانے لگا۔ میں دونوں مٹھیوں کو پوری طاقت سے دیوار پر مار رہا تھا اور وہ یونہی بے حس و حرکت بیٹھی ساٹ نگاہوں سے مجھے تنک رہی تھی۔

اگر سلطان نے مجھے پیچھے سے آکر جکڑ نہ لیا ہوتا تو میں شاید اپنے دونوں ہاتھ زخمی کر چکا ہوتا۔ سلطان نے مجھے کھینچ کر پلنگ پر دھکیل دیا۔ میں بستر پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ سلطان دھیرے دھیرے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا مگر اس نے مجھے خاموش کرانے کی کوشش نہیں کی۔

”تو بری طرح لٹ چکا ہے بالے، رولے..... جی بھر کر رولے، پھر تو خالی ہو جائے گا میری طرح..... پھر تجھے کبھی رونا نہیں آئے گا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔“ اس نے آنسوؤں اور دکھوں سے بو جھل لہجے میں کہا۔

اور میں روتا رہا..... روتا رہا، جانے کب تک روتا رہا۔ سلطان نے ٹھیک کہا تھا۔ بہت دیر رونے کے بعد میری آنکھیں خشک ہو گئیں، میرے اندر چکراتے سارے طوفان خاموش ہو گئے۔ میں نے خود کو اندر سے بالکل ساٹ محسوس کیا، میرے اندر سے دکھ، درد یا غم کا ہر احساس ختم ہو گیا اور عجیب سی بے حس اور سفاکی پھیل گئی۔ تب مجھے پتہ چلا کہ سوہنی اتنی ساکت اور ساٹ کیسے ہو گئی، اس کے اندر کے سارے احساسات ختم کیسے ہو گئے۔

مجھ پر گہرا سکوت طاری ہو گیا تو میں اٹھ بیٹھا۔ اب میرے اندر اور باہر ہر طرف

گہری خاموشی تھی۔ سلطان اور سوہنی بھی دونوں ہی خاموش تھے۔ چند لمحوں بعد سلطان اٹھا اور پانی کا بھرا ہوا گلاس لا کر میری طرف بڑھا دیا۔ اس لمحے اچانک مجھے سخت پیاس محسوس ہوئی۔ میرا جی چاہا کہ میں دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا لوں اور سوہنی میرے ہاتھوں میں پانی ڈال دے کہ میری پیاس بجھ جائے۔ میں نے گلاس ہاتھ میں تھامتے ہوئے سوہنی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں لمحہ بھر کو وہی جذبہ ابھرا اور معدوم ہو گیا۔ شاید وہ سین اسے بھی یاد آ گیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے نگاہیں جھکا لیں۔

میں ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر گیا، مگر پیاس اب بھی نہ بجھی۔ میں نے اٹھ کر دوبارہ پانی نہ لیا۔ میں جانتا تھا کہ اب یہ پیاس شاید کبھی نہ بجھے گی۔ سلطان چائے کے گم لیے ہمارے قریب آ گیا۔ اس نے سوہنی کے سامنے درمی پر ہی تینوں گم رکھ دیے۔

”بالے، ہمیں آجا، تو اوپر بیٹھتا ہے تو ہمیں اپنے چھوٹے ہونے کا احساس ہونے لگتا ہے۔“ سلطان نے دھیرے سے کہا اور میں جلدی سے نیچے درمی پر آ بیٹھا۔ ہم تینوں نے خاموشی سے چائے پی۔ میں نے محسوس کیا کہ سوہنی کی حالت کچھ خراب ہوتی جا رہی ہے۔ وہ بار بار پسو بدلتی اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے دونوں کندھے پکڑ کر دبائے لگتی پھر اچانک اس کے ہونٹوں سے ایک کراہ نکلتی اور وہ دونوں ٹانگیں سکڑ کر گھٹنوں کو اپنی ٹھوڑی تک لے آتی اور کبھی دونوں ٹانگیں پھیلا کر پیروں کے نیچے دبائے لگتی۔

”سوہنی۔ کیا..... کیا ہو رہا ہے؟“

”نشہ نہ کرنے سے یہی حالت ہو جاتی ہے اس کی۔ کل میں نے مجبوراً اسے مارفیکا انجکشن لگایا تھا۔ آج رات کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جاؤں گا۔“ سلطان نے کہا تو مجھے زاریہ کی کیفیت یاد آ گئی۔

”نہیں سلطان..... میری بات غور سے سن۔“ یہ کہہ کر میں نے فاریہ کی ساری کہانی اسے سنا دی اور پھر زاریہ کی حالت کے بارے میں بھی اسے سب کچھ بتا دیا۔ میں نے سلطان سے درخواست کی کہ اگر وہ بھی سوہنی اور ماسی میراں کے ساتھ ہی وہاں چلے تو فاریہ کو بڑی ڈھارس ہو جائے گی۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ فاریہ اس سے مدد حاصل کرنے کو پہلے ہی کہہ چکی ہے۔

”مجھے فاریہ نے یہی کہہ کر بھیجا ہے کہ میں سوہنی اور ماسی میراں کو لے کر کوٹھی پہنچ جاؤں..... تو بھی ہمارے ساتھ چل سلطان، میرا دل بھی بڑھ جائے گا اور پھر جب تو وہاں ہو گا تو میں گاؤں جا کر ماں کو بھی لے آؤں گا سلطان۔“ میں نے اس سے التجائی۔

”مگر بالے.....“

”کچھ نہیں سلطان.....“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”کیا تو نہیں چاہتا کہ ان زہریلے بچے والوں کو پھانسی تک پہنچایا جائے، کیا سوہنی کو دیکھنے کے بعد بھی تجھے ان سے نفرت محسوس نہیں ہوئی؟“

”یہ بات نہیں ہے بالے..... اگر راجو مجھے مل گیا ہوتا، یا اگر مجھے ان دونوں کو ساتھ لے کر نہ نکلتا ہوتا تو میں راجو اور اس کے خاندان کو بھون کر رکھ دیتا مگر ان دونوں کو وہاں سے نکالنے کے لیے ضروری تھا کہ میں چوروں کی طرح واپس آ جاؤں ورنہ.....“ اس نے دانت پیستے ہوئے جواب دیا۔

”تو پھر میرا ساتھ دے سلطان، سوہنی اور زاریہ دونوں ہی ان زہریلے سوداگروں کا شکار ہوئی ہیں۔ فاریہ تنہا ہے سلطان اور بیگ صاحب کے بارے میں، میں تجھے بتا چکا ہوں۔ سلطانی گواہ بننے کے بعد بھی انہیں کچھ نہ کچھ سزا تو بھگتنا ہوگی نا..... ایسے میں وہ دونوں لڑکیاں کیا کریں گی، کہاں جائیں گی۔ فاریہ کتنی ہی مضبوط سہی ہے تو ایک عورت ہی نا!“

میری باتیں سن کر سلطان خاموش ہو گیا۔ شاید وہ قائل ہو گیا تھا۔ جو رہی سہی الجھن تھی اسے سوہنی کے اس جملے نے ختم کر دیا کہ بالا ٹھیک کتا ہے سلطان، ہم ساتھ ہوں گے تو ایک دوسرے کا سہارا بنیں گے۔

سلطان میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔ اس نے بتایا کہ ماسی میراں سرکاری ہسپتال میں ہے۔ مغرب کا وقت گزر چکا تھا۔ کافی دیر ہو گئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ فاریہ اور بیگ صاحب گھر پہنچ گئے ہوں گے اور میرے بارے میں پریشان ہو رہے ہوں گے۔ میں نے فوراً ہی ان سے سامان اٹھانے کو کہا۔ سوہنی کا سامان تو بندھا رکھا تھا۔ سلطان نے ضروری چیزیں ایک سوٹ کیس میں رکھ لیں۔ مجھے اس کے ساتھ چلنے سے بڑی ڈھارس ہوئی تھی۔ ہم وہاں سے نکل کر سیدھے سرکاری ہسپتال گئے۔ ماسی میراں مجھے دیکھ کر مجھ سے

سے پہلے ایک ہال نما کمراتھا جسے میٹنگ روم کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ ماسی میراں مجھے دیکھتے ہی اٹھ بیٹھی۔

”بالے کیسا ہے ٹو..... تجھے دیکھنے کو تو آنکھیں ترس گئیں۔ سلطان کے آنے سے پہلے تو ہم یہی سمجھتے تھے کہ رب نہ کرے تو اس دنیا میں نہیں رہا۔ راجو وغیرہ نے سارے گاؤں میں یہی اڑایا ہوا ہے کہ تو پولیس مقابلے میں مارا گیا۔ جانے کیسے ان لوگوں نے صفرا کی قبر دیکھ لی تھی۔ پر بالے..... وہ کیسے مری تھی؟ کیا ہوا تھا تم لوگوں کے ساتھ؟ ہمیں تو پتا ہی نہ چل سکا۔ تیری ماں تو دیوانی ہو گئی، کبھی کچھ کہتی تھی اور کبھی کچھ۔“

تب میں نے ماسی میراں کو تھانے سے فرار سے لے کر یہاں تک پہنچنے تک کی ساری داستان سنا دی۔ وہ دل تھامے ساری داستان سنتی رہی اور روتی رہی۔ سوہنی بھی ٹھوڑی کو گھنٹوں پر ٹکائے، آنکھیں پھاڑے تمام کہانی سن رہی تھی۔ میری کہانی ختم ہوئی تو کمرے میں سوہنی اور ماسی میراں کی سسکیوں کے سوا کوئی آواز نہ تھی۔ سلطان، بیگ صاحب سے باتیں کر رہا تھا۔ ان دونوں کی آوازیں دھیمی دھیمی تھیں مگر اس کمرے تک پہنچ رہی تھیں۔ حمیدہ چائے لے آئی۔ ہم لوگ خاموشی سے چائے پیتے رہے۔ چائے پینے کے بعد فاربیہ نے سوہنی اور ماسی میراں کو آرام کرنے کو کہا اور مجھے اشارہ کرتی ہوئی باہر آ گئی۔

ہم کمرے سے باہر آئے تو فاربیہ نے سرگوشی کی۔ ”اقبال، سلطان سے تمہاری بات ہوئی؟“

”جی میڈم، وہ اب یہیں رہے گا۔ میں اسے تمام بات بتا چکا ہوں۔“

”تمہیں اس پر اعتماد ہے؟“

”جی میڈم، اگر اعتماد نہ ہوتا تو میں اسے گاؤں نہ بھیجتا، اور نہ سوہنی کو تنہا اس کے پاس چھوڑ کر آپ کے ساتھ آتا۔“

”اوہ تھینکس گاؤ۔“ فاربیہ نے اطمینان بھرا سانس لے کر کہا۔

”میڈم سلطان کے لیے بھی کمرہ صاف کرا دیں۔“

”ہاں میں حمیدہ سے کہتی ہوں۔ تمہارے کمرے کے بالکل سامنے والا کمرہ اس کے

لپٹ کر بری طرح روئی۔ بڑی مشکل سے میں نے اور سوہنی نے اسے سنبھالا۔ ہم نے ڈاکٹروں سے یہ کہہ کر اجازت لے لی کہ ہم ماسی کو بڑے ڈاکٹروں کے پاس لے جائیں گے اور پرائیویٹ علاج کرائیں گے۔

انہوں نے کچھ منہ تو بنایا مگر اسے چھٹی دے دی۔ میں اسپتال پہنچ کر ہی کوٹھی فون کرنا چاہتا تھا مگر فون بزی جا رہا تھا پھر میں ان تینوں کو لے کر کوٹھی کی طرف چل پڑا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم کوٹھی پہنچ گئے۔ میرا اندازہ صحیح تھا۔ فاربیہ اور بیگ صاحب وہاں پہنچ چکے تھے اور میری طرف سے سخت پریشان تھے۔

فاربیہ سوہنی اور ماسی میراں کو میرے ساتھ دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ اس نے فوراً ہی حمیدہ کو بلا کر میرے کمرے کے برابر والا کمرہ صاف کرنے کو کہا اور سوہنی وغیرہ کو لے کر اندر چلی گئی۔ جانے سے پہلے اس نے دونوں کا تعارف بیگ صاحب سے بھی کروایا۔ بیگ صاحب یہ سن کر بہت خوش ہوئے کہ سوہنی وغیرہ شہر آ گئے۔

”اقبال، تمہاری والدہ نہیں آئیں؟“ ان کے اندر جانے کے بعد بیگ صاحب نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے انہیں بتایا کہ وہ کیوں نہیں آئیں اور یہ بھی کہ اب میرا وہاں جانا اور ان کو یہاں لے کر آنا ناگزیر ہو گیا ہے۔

”ہاں اقبال، اب تمہیں چلے جانا چاہیے۔ اب وہ وہاں بالکل تنہا رہ گئی ہوں گی؟“

”جی بیگ صاحب، اللہ ان کی حفاظت کرنے والا ہے ویسے وہاں ابھی کچھ ہمدرد باقی ہیں۔ پورا گاؤں ہی چوہدری اور اس کے بیٹے سے متنفر ہے۔ مگر سب ہی کو اپنی جان پیاری ہے، کوئی بھی ان کے خوف سے کچھ نہیں کہتا۔“

”ٹھیک ہے اقبال، میری طرف سے تو تمہیں اجازت ہے، تم نے بیٹوں سے بڑھ کر میرا ساتھ دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میرا کوئی بیٹا ہوتا تو وہ بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ جاؤ خدا تمہیں اپنی امان میں رکھے گا اور سونو غیریت نہ برتنا، جتنے پیسوں کی بھی ضرورت ہو فاربیہ سے لے لینا بیٹا۔“

”شکریہ بیگ صاحب۔“ میں نے احسان مندی سے کہا اور ان سے اجازت لے کر اُس حصے میں چلا آیا جہاں فاربیہ وغیرہ بیٹھے تھے۔ یہ ڈرائنگ روم سے آگے اور بیڈ رومز

لیے صاف کروا دیتی ہوں۔“

پھر اس کمرے میں آگئے جہاں بیگ صاحب اور سلطان بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئے اور پھر باتیں کرنے لگے۔ میں نے فاریہ سے زاریہ کے متعلق پوچھا۔ فاریہ نے بتایا کہ اسے شام ساڑھے سات بجے کے قریب ہوش آگیا تھا۔ وہ بولی تو نہیں مگر اس کی آنکھوں میں بہت سے سوالات تھے۔ وہ مجھے اور انکل کو اپنے قریب دیکھ کر خوش ہوئی تھی اور اس نے بات کرنے کی کوشش بھی کی تھی مگر شاید اس سے بولا نہ گیا۔ ڈاکٹر طارق بھی موجود تھے اور ڈاکٹر منیر بھی آگئے تھے۔ ڈاکٹرز نے اس کا مکمل معائنہ کیا اسے دوائیں دیں اور اسے مسکن انجکشن لگا دیا۔ جس سے وہ پھر بے خبر سو گئی۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اس کے لیے مکمل آرام بے حد ضروری ہے ورنہ اس کی یادداشت متاثر ہوگی۔

فاریہ بے حد خوش تھی۔ اس کے بکھرے ہوئے معاملات تقریباً سمٹ گئے تھے۔ بہادر اور سیمیاں کو وہ بھول چکی تھی۔ ابھی اس کی ساری توجہ زاریہ کی طرف تھی۔ آج وہ فیکٹری بھی نہیں گئی تھی۔ میں اور فاریہ کل صبح جا کر یعقوب کو لے آنے کا پروگرام بناتے رہے پھر حمیدہ نے کھانا کھانے کے لیے بلایا۔ سوہنی اور ماسی میراں نے سب کے ساتھ کھانا قبول نہ کیا۔ میں جانتا تھا کہ ڈاننگ ٹیبل پر بیٹھ کر کھانا ان کے بس کی بات بھی نہ تھی۔ فاریہ نے ان دونوں کا کھانا ان کے کمرے ہی میں لگوا دیا۔ میں نے بھی جانے کتنے عرصے بعد سوہنی اور ماسی میراں کے ساتھ کھانا کھایا۔ کچھ دیر بعد فاریہ بھی اپنی پلیٹ اٹھائے ہمارے ساتھ آ بیٹھی۔

مجھے وہ کھانا یاد آ رہا تھا جو مجھے گاؤں کے تھانے میں ماسی میراں اور سوہنی نے پہنچایا تھا۔ وہ گاؤں میں میری آخری کھانا تھا، جو میں نے کھایا، اور اب اتنے برس بعد میں سوہنی اور ماسی میراں کے پاس بیٹھا تھا۔ کاش اماں بھی ہمارے ساتھ ہوتی تو میں کتنا مطمئن ہوتا۔ کھانے کے بعد ہی فاریہ نے حمیدہ کو بھیج کر برابر والی کوٹھی میں رہنے والی لیڈی ڈاکٹر کو بلوایا جو فاریہ کی دوست بھی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر نے ماسی میراں کو اچھی طرح چیک کیا اور دوائیں لکھ کر دے دیں۔ فاریہ نے ڈاکٹر کو سوہنی کے بارے میں بھی بتا دیا کہ اسے نشے کی عادت ہو گئی ہے۔ آج تو اسی کی دوا لینا تھی کل ڈاکٹر طارق اسپتال سے فارغ ہوتے تو

انہیں بلا کر سوہنی کا باقاعدہ علاج کرانا تھا مگر آج تو ڈاکٹر طارق گھر جا چکے تھے۔ اس نے دونوں کے لیے دوائیں لکھ دیں۔ فاریہ نے نسخہ میرے ہاتھ میں تمہا دیا۔ ”اقبال یہ دوائیں لے آؤ اور سنو، انکل سے بھی پوچھ لینا شاید انہیں بھی کچھ چاہیے ہو۔“

”جی ہمت!“ میں نے دواؤں کا پرچہ لے لیا۔

”یہ رکھ لو۔“ فاریہ نے ایک ہزار کانٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”پیسے ہیں میڈم۔“

”پھر بھی ضرورت تو پڑ سکتی ہے نا اور جو تمہارے پاس ہیں وہ تم اپنی ضرورت کے لیے رکھو۔“

”ایک ہی بات ہے میڈم۔“ میں نے انکار کرنا چاہا مگر فاریہ پیسے میری مٹھی میں دبا کر آگے بڑھ گئی۔

میں ڈرانگ روم میں آیا۔ بیگ صاحب کو بھی دوا چاہیے تھی انہوں نے بھی مجھے پرچہ دے دیا۔ میں نے سلطان کو بتا دیا تھا کہ میرے کمرے کے سامنے والا کمرہ اس کا ہے اور صاف بھی کر دیا گیا ہے۔

”میں سب کچھ بتا چکا ہوں بیٹا اسے، تم فکر نہ کرو، اب تم اکیلے ہی میرے بیٹے نہیں ہو سلطان میرا دوسرا بیٹا ہے۔“ بیگ صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں نے سلطان کی طرف دیکھا۔ وہ بیگ صاحب کے رویے پر بے انتہا خوش نظر آ رہا تھا۔

”میں ابھی آتا ہوں۔“ میں نے سلطان سے کہا۔

”میں بھی چلتا ہوں!“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”نہیں سلطان یہ بات اب سے طے ہے کہ اگر میں کوٹھی سے باہر ہوں گا تو تم کوٹھی کے اندر یعنی ان لوگوں کے ساتھ ہی رہو گے۔“ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے بٹھاتے ہوئے کہا۔

”اقبال ٹھیک کہتا ہے سلطان، عذاب ہمارے ارد گرد ہی ریگتے رہتے ہیں۔ جیسے ہی موقع مل جائے ہم میں کسی کو بھی ڈس لیتے ہیں۔“ بیگ صاحب نے تھکے تھکے انداز میں

میں ان دونوں سے اجازت لے کر باہر نکل آیا۔ میڈیکل اسٹور یہاں سے کافی فاصلے پر تھا۔ میں نے چوکیدار سے گاڑی کی چابیاں لیں اور گاڑی اسٹارٹ کر کے گیٹ تک لے آیا۔ چوکیدار گیٹ کھول چکا تھا میں گاڑی کو گیٹ سے باہر لیتا چلا گیا۔

رات کے تقریباً گیارہ بج چکے تھے۔ گھروں میں تو روشنی تھی، لوگ جاگ رہے تھے مگر سڑک بے حد سنسان تھی۔ یہ وہ علاقہ تھا جہاں زندگی بڑے بڑے اور اونچے جنگلوں کے پیچھے قید رہتی تھی۔ غریبوں کی بستیاں تو تھیں نہیں جہاں لوگ گھروں کے آگے بیٹھ کر زندگی کے غم بھولنے کے لیے اونچے قہقہے لگاتے ہیں۔ میں جلدی میں نہ تھا، پھر بہت عرصے بعد کچھ ذہنی سکون میسر آیا تھا اس لئے خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں گاڑی کو آہستہ رفتار سے چلاتا، سیٹی بجاتا چلا جا رہا تھا۔

اور پھر اچانک ہی میری سیٹی خود بہ خود بند ہو گئی۔ میری نگاہیں سڑک پر پڑی ایک گٹھڑی پر جم گئیں اور میں نے قریب پہنچ کر گاڑی روک دی۔ وہ کوئی عورت تھی۔ سفید ساری میں ملبوس وہ جو بھی تھی سڑک پر بکھری پڑی تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں آہستہ رفتار سے گاڑی چلا رہا تھا ورنہ شاید وہ گاڑی کے نیچے آ کر کچل جاتی۔ میں نے قریب پہنچ کر اس کا ہاتھ پکڑا۔ میں نبض سے اس کی زندگی کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ عین اسی لمحے کسی نے میری دائیں کینٹی پر کوئی بھاری چیز دے ماری۔ میری آنکھوں میں ستارے ناچے اور گرا اندھیرا چھا گیا۔

معلوم نہیں کتنی دیر بعد مجھے ہوش آیا۔ ہوش آتے ہی تو کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا، صرف یہ احساس ہوا کہ میں لیٹا ہوا ہوں پھر اچانک ہی یہ احساس بھی ہو گیا کہ میں کسی کار، ٹرک یا ٹرین میں ہوں کیوں کہ میں مسلسل ہل رہا تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے جس چیز پر میں لیٹا ہوا تھا وہ ہل رہی تھی۔ میری آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ ہاتھ پشت پر لے جا کر باندھ دیے گئے تھے اور میری ٹانگیں بھی آزاد نہیں تھیں۔ میں نے ہلنے جلنے کی کوشش کی مگر مجھے اس بری طرح جکڑا گیا تھا کہ میں پوری قوت لگانے کے باوجود ایک انچ بھی نہ سرک سکا تھا۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی یا تو میں ٹرک ٹائپ کی کسی گاڑی میں تھا کہ جہاں میرے سوا کوئی دوسرا نہ تھا، ممکن ہے کہ

وہ لوگ اگلے حصے میں ہوں۔ یا پھر وہ جو بھی تھے انہوں نے آواز نہ نکالنے کی قسم کھائی ہوئی تھی۔

”سنو..... کوئی ہے!“ میں نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد دھیمے سے پوچھا۔

”سب ہیں..... تم خاموش رہو۔“ کسی نے غرا کر جواب دیا۔

”مجھے پیاس لگی ہے۔“ میں نے لہجہ اونچا کیے بغیر کہا۔

”ہم تمہیں ایسی ہی جگہ لے جا رہے ہیں جہاں تمہیں کوئی پانی ڈالنے والا بھی نہ ہو۔“ اسی شخص کی آواز آئی۔ لہجہ بے پناہ سفاک تھا۔ میں نے لہجہ اور آواز پہچاننے کی

کوشش کی مگر یوں لگتا تھا جیسے وہ شخص میرے لیے قطعی اجنبی ہو۔

”تو پھر یہاں پر گولی مار دو۔“ میں نے کہا۔

”اگر تم دوبارہ بولے تو میں تمہارے مشورے پر عمل کروں گا۔“ اسی سفاک لہجے

میں جواب ملا۔

میں سمجھ چکا تھا کہ وہ شخص سچ بول رہا ہے۔ میں خاموش ہو گیا۔ اس گفتگو سے یہ

اندازہ تو ہو گیا تھا کہ میں کار کی پچھلی سیٹ پر پڑا ہوں۔ میں نے اپنے کان باہر کی آوازوں

پر لگا دیے، میں جاننا چاہتا تھا کہ ہم جس راستے پر سفر کر رہے ہیں، وہ سنسان ہے یا بارونق،

بارونق ہونے کی مجھے امید تو نہ تھی کیوں کہ اغوا کر کے لے جانے والے کبھی بارونق

سڑکوں سے نہیں گزرتے مگر پھر بھی اس وقت صرف سماعت ہی کام آ سکتی تھی اور میں

اس سے کام لینا چاہتا تھا۔ اندازہ لگانا چاہتا تھا۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ انہوں نے

میرے منہ میں کپڑا کیوں نہیں ٹھونسا، حالانکہ اگر میں اغوا کرنے والوں کی جگہ ہوتا تو اس

کا خیال رکھتا۔ کیوں کہ میں چاہتا تو شور مچا کر ان لوگوں کے لیے مشکل پیدا کر سکتا تھا۔

مگر بہت جلد مجھے احساس ہو گیا کہ انہوں نے ایسا کر کے کوئی غلطی نہیں کی ہے۔

میرے کانوں میں صرف اور صرف گاڑی کے انجن کی آواز ہی گونجتی رہی تھی کوئی ایسی

آواز نہ آئی جس سے مجھے یہ اندازہ ہوتا کہ میرا رابطہ باہر کی دنیا سے قائم ہے۔ نہ کسی

گاڑی کے ہارن کی آواز، اور نہ کسی گاڑی کے قریب سے گزرنے کا شور۔

”سنو۔“ میں نے دوبارہ بولنے کی کوشش کی۔

”بند کرو اس کا منہ!“ اسی شخص کی غراہٹ نے مجھے سہا دیا۔

میں اس وقت بالکل بے بس تھا اور جو شخص مجھے مارنے کی دھمکی دے چکا تھا اور غالباً گاڑی چلا رہا تھا اس کے لہجے نے مجھے یقین دلادیا تھا کہ میری کوئی بھی حرکت (اگر میں کر سکتا تو) مجھے بہت مہنگی پڑے گی۔ میں نے خود کو ریلیکس کیا اور بدن ڈھیلا چھوڑ دیا، تاکہ میری توانائی ضائع نہ ہو۔ میرے لیے ان حالات میں یہی بہتر تھا۔

”مارنگ!“ جو بابا کہا گیا۔ ”اسے یہاں لٹا دو۔“ لہجہ بہت دھیما اور ٹھہرا ٹھہرا سا تھا۔
اس کے اس حکم کے ساتھ ہی مجھے نرم گدے پر ڈال دیا گیا۔
”سیٹھ، ہمارا حساب کر دو۔ ہمیں بہت دور جانا ہے اور رات سے پہلے اپنے اڈے پر
پہنچنا ہے۔“ وہی آواز سنائی دی جو میں پہلے بھی سن چکا تھا۔
”کیا تم ایک کپ چائے بھی پینا پسند نہیں کرو گے؟“ اسی ٹھنڈے اور میٹھے لہجے میں
پوچھا گیا۔

”راستے میں پی لیں گے صاب..... پر یہاں دیر تک نہیں رک سکتے۔ اصول نہیں ہے ہمارا۔“

”ٹھیک ہے بلگو.....“ پھر غالباً اشاروں میں کچھ کہا گیا۔ مجھے بریف کیس کھلنے کی آواز آئی جسے میں پہچانتا تھا۔ چند لمحوں میں صرف آہٹیں محسوس ہوتی رہیں۔

”گن لو!“ ٹھنڈے لمحوں والے نے کہا۔

”بدمعاش کا سب سے پہلا اصول دیانت ہوتا ہے صاب، ہم سے جو کچھ منگوا یا، ہم نے دیانت داری سے لا دیا اب جو کچھ تم دو گے اس میں بھی دیانت داری ہی بر تو گے۔“

”ہا ہا.....“ وہ ہنسا۔ ”دلچسپ بھی ہو؟“

”اجازت ہے؟“ اکھر شخص نے اس کی ہنسی اور تعریف سے متاثر ہوئے بغیر بو چھلا۔

”اوکے، ایز یو لائیک، ویسے میری خواہش تھی کہ ہم دوستوں کی طرح بیٹھ کر ایک کپ چائے پیتے۔“

”ہم دوست ہوتے تو ضرور چائے پیتے صاب۔“ پہلے والے شخص نے جواب دیا۔
”مجھے کھرے اور صاف گو لوگ پسند ہیں۔ تم نے مجھے متاثر کیا ہے۔ ہم دوست
کس طرح بن سکتے ہیں؟“

”آپ سیٹھ لوگ ہو، ہم اپنی حیثیت کے لوگوں سے دوستی کرتے ہیں۔“ پہلے والے نے مختصر جواب دیا اور غالباً وہ رکا نہیں۔ چند لمحوں بعد ہی دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور پھر بند ہونے کی آواز کے ساتھ ہی، کسی نے گہرا سانس لیا۔

”جگو اسے مہمان خانے میں پہنچا دو۔“ اسی نرم گو آدمی کی آواز آئی۔ ”مگر

ٹھہرو..... یہ کیڑا نکالو۔“

بس، بہت دور جانا ہے اپن کو۔“ گاڑی چلانے والے کی آواز میں اب بھی سفاکی تھی۔
 ”اسے لے کر اندر چلو، دو منٹ میں تمہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ پہلی بار
 نسوانی آواز سنائی دی۔ غالباً یہ وہی عورت تھی جس کی مدد کرنے کے چکر میں پھنس کر میں
 یہاں پہنچ گیا تھا۔

”میم صاحب! اپن کے سودے میں لاش اٹھانے کا کوئی ذکر نہیں تھا۔“ اس نے اکھڑے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

”تھیں بحث کرنے کی بہت عادت ہے؟“ اس عورت نے کہا۔ اس کے انداز میں ناراضگی تھی۔

”اپن اتنا ہی کام کرتا ہے جتنا بولا جائے۔ اس پہلوان کو بولو کندھے پر اٹھا کر لے جائے اس کو۔“ اس نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ چند لمحوں بعد ہی کسی نے میرے دائیں جانب والا دروازہ کھولا اور مجھے بڑی بے دردی سے باہر کی طرف کھینچ لیا۔ میرے دونوں پیر آپس میں بندھے ہوئے تھے اس لیے میں زمین پر پاؤں نہ ٹکا سکا۔ مجھے کھینچنے والے نے مجھے کندھوں پر ڈال لیا اور ایک طرف کو بڑھ گیا۔

”چلو اندر تم بھی۔“ اسی عورت کی آواز مجھے اپنی پشت کی جانب سے آئی تھی۔ پھر قدموں کی آواز آئی اور ہم سب چلتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ کچھ ہی دور چلنے کے بعد ایک دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز سے میں سمجھ گیا کہ اب ہم کسی عمارت کے اندر داخل ہو گئے ہیں۔ گھڑی کی ٹیک ٹیک کی آواز خاصی اونچی تھی، جو آہستہ ہوتے ہوتے معدوم ہو گئی۔ قدموں کی آواز بھی اب نہیں آرہی تھی جس کا مطلب تھا کہ ان سب کے پیروں کے نیچے دبیز قالین ہے۔ یہ سفر بھی خاصا طویل تھا جس شخص نے مجھے کندھے پر اٹھایا ہوا تھا اس کی سانس بری طرح پھولی ہوئی تھی اور اس کی چال بھی بگڑ چکی تھی۔ گویا وہ مجھے اٹھائے اٹھائے تھک چکا تھا۔

چند منٹ تک مسلسل چلنے کے بعد ہی مجھے اٹھا کر چلنے والا رک گیا۔
 ”گڈ مارنگ سر!“ اسی عورت نے کہا۔

اور میں چونک اٹھا۔ مارنگ۔ گویا صبح ہو چکی تھی۔

مجھے پھر کندھے پر اٹھا لیا گیا۔ کچھ دیر تک یہ سفر جاری رہا۔ شاید چھ سات منٹ تک۔ پھر مجھے گاڑی میں ڈال دیا گیا۔ گاڑی اشارت ہوئی اور ہم پھر کسی نامعلوم سمت روانہ ہو گئے۔ اس بار ہماری منزل زیادہ دور نہیں تھی۔ شاید دس منٹ بعد ہی گاڑی رک گئی۔ گاڑی رکتے ہی دو تین آدمیوں کے قدموں کی آواز قریب آتی محسوس ہوئی۔ دروازہ کھلا۔ کسی نے میرے پیر کھولے۔ میرے دونوں پیروں میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ مجھے آگے کی طرف گھسیٹا گیا اور میرے پاؤں زمین سے ٹکرائے۔ میری سسکاری نکل گئی۔ میرے دونوں پیر ٹپٹپٹ تھے۔

”کھڑے ہو جاؤ۔“ یہ اسی شخص کی آواز تھی جسے مجھے لانے والے نے جگو کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

”نہیں ہو سکتا..... میرے پاؤں ٹپٹپٹ ہیں۔“ میں نے بیچارگی سے کہا۔ مگر اس نے میری بات پر دھیان نہ دیا اور مجھے کھینچ کر کھڑا کر دیا۔ میں لڑکھڑایا مگر مجھے دو آدمیوں نے دونوں طرف سے تھام لیا۔ اسی وقت میری کمر سے کوئی نوکیلی چیز ٹکرائی۔

”سنو مسٹر، میرے ہاتھ میں پستول ہے۔ اور اس میں گولیاں بھی ہیں۔ بالکل خاموشی سے اسی طرف چلتے رہو۔ جہاں لے جایا جا رہا ہے۔“

”میرے خیال میں میں نے اب تک کوئی مزاحمت نہیں کی۔“ میں نے روکے انداز میں کہا۔

”اس وقت تمہارے پیر بھی بندھے ہوئے تھے مسٹر۔“ اس نے غرا کر جواب دیا۔ میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ ہم چند منٹ چلتے کے بعد رکے۔ کوئی دروازہ کھولا گیا۔ پھر کسی نے مجھے بتایا کہ آگے سیڑھیاں ہیں۔ میں نے سنبھال کر پاؤں آگے بڑھایا ورنہ شاید میں خود پر قابو نہ رکھ پاتا۔ یہ سیڑھیاں کافی تھیں اور نیچے کی طرف جا رہی تھیں، جوں جوں ہم نیچے اتر رہے تھے جس بڑھتا جا رہا تھا اور ایک عجیب سی بو کا احساس بڑھ رہا تھا۔ میں کچھ اندازہ نہ لگا پایا۔

سیڑھیاں ختم ہوتے ہی مجھے دونوں جانب سے پکڑنے والے آدمیوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ ”اس کی پٹی کھول دو۔“ جگو کی آواز آئی۔

اور پھر کسی نے میرے حلق میں ٹھسا ہوا کپڑا نکال دیا۔ میری جان میں جان آئی مگر حلق بری طرح سوکھ رہا تھا۔ زبان پر جیسے کانٹے سے اُگ آئے تھے۔

”پپ..... پانی.....“ بہ مشکل میرے منہ سے نکلا۔

”پانی پلاؤ اسے۔“

پھر پانی کا گلاس کسی نے میرے ہونٹوں سے لگایا تو میں ایک ہی گھونٹ میں گلاس خالی کر گیا۔ ”اور.....“ اور دو۔“ حلق تر ہوتے ہی مجھ میں توانائی بھر گئی۔

چند لمحوں بعد گلاس پھر میرے ہونٹوں سے لگا دیا گیا۔ میں نے یہ بھی ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔

”چچ..... چچ..... بہت ظالم تھا وہ شخص..... اتنے طویل سفر میں پانی بھی نہیں پلایا!“ نرم گو شخص نے کہا۔

”پلیز..... میرے ہاتھ کھول دیں۔ بہت تکلیف ہے۔“ میں نے ہمت کر کے کہا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ میری خواہش پوری کرے گا۔

”تم تو ہٹے کٹے مرد ہو۔ پھر تکلیف کیسی.....؟ کافی مضبوط ہے جسم تمہارا۔“

”میں..... میں آپ کو نہیں جانتا..... میرا خیال ہے کہ یہ لوگ کسی غلط فہمی کی بناء پر مجھے اٹھا لائے ہیں۔“

”نہیں مسٹر اقبال۔ انہیں کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔ وہ صحیح آدمی کو لائے ہیں۔“ اس کے منہ سے اپنا نام سن کر میں حیران رہ گیا۔

”آپ شاید حیران ہو گئے۔ ہونا بھی چاہیے۔ یہ حیرانگی ہی کی بات ہے کہ آپ ہمیں نہیں جانتے مگر ہم آپ کو جانتے ہیں۔ کیوں ہے نا؟“

”میں۔ شاید آپ کو دیکھوں تو پہچان لوں۔“

”نہیں مسٹر اقبال آپ کی یہ خواہش فی الحال پوری نہیں ہو سکتی۔ مجھے کچھ ضروری کام نمٹانے ہیں۔ رات کو آپ سے ملاقات ہو گی۔“

پھر کچھ دیر خاموشی رہی۔

”انہیں لے جاؤ“ چند لمحوں بعد اس نے کہا۔ ”اور دیکھو ان کے ہاتھ پاؤں کھول دینا اور کھانا بھی کھلا دینا۔“

دوسرے ہی لمحے میری آنکھوں سے پٹی کھول دی گئی۔ میں نے جونہی آنکھیں کھولیں، گھبرا کر دوبارہ بند کر لیں۔ میری آنکھ میں جلن سی ہونے لگی تھی۔ چند لمحوں بعد میں نے پھر آنکھیں کھول دیں۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ بہت ہلکی روشنی اوپر کے روشن دان سے اندر آرہی تھی۔ جس میں تین آدمیوں کے ہیولے میرے سامنے تھے مگر کسی کی بھی شکل نظر نہیں آرہی تھی۔ ایک شخص ان میں کافی موٹا تھا جو میرے دائیں جانب کھڑا تھا اور اسی کے ہاتھ میں پستول تھا۔

”اے تم اس کا کھانا لے آؤ۔“ موٹے آدمی نے کہا تو میں سمجھ گیا کہ وہی جگو ہے۔ دوسرا آدمی تیزی سے باہر کی طرف چلا گیا۔ وہ دونوں یونہی میرے سامنے کھڑے رہے۔ دونوں خاموش تھے۔ میں بار بار پلکیں جھپکا رہا تھا میری آنکھوں میں اب بھی جلن ہو رہی تھی اور اب تو پانی بھی بننے لگا تھا۔ میرے ہاتھ ابھی تک بندھے ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد پہلا شخص ایک ٹرے ہاتھ میں اٹھائے اندر آ گیا۔ ٹرے اس نے میرے سامنے رکھ دی پھر میری پشت پر جا کر ہاتھ کھولے۔ میری کلائی پر مریچیں سی لگ رہی تھیں۔ شاید رستی کی وجہ سے کلائی پھیل گئی تھی۔ میں کچھ دیر اپنی دونوں کلائیوں کو مسلتا رہا۔

”چلو.....“ جگو نے ان دونوں سے کہا اور وہ تینوں اس دروازے کی طرف بڑھ گئے جہاں سے اوپر جانے والی سیڑھیاں شروع ہوتی تھیں۔ میں انہیں جاتا دیکھتا رہا۔ انہوں نے جاتے ہوئے دروازے کو باہر سے تالا ڈال دیا تھا۔

ان تینوں کے باہر جاتے ہی چھت پر لٹکا ہوا بلب روشن ہو گیا۔ شاید لائٹ کا بٹن سیڑھیوں پر ہی کہیں تھا جسے انہوں نے جاتے ہوئے آن کر دیا تھا۔ بلب شاید ساٹھ واٹ کا تھا۔ کیوں کہ روشنی بہت کم تھی۔ میں بھوک سے بے حال تھا روشنی ہوتے ہی میں نے ٹرے اپنی جانب سرکائی ایک پلیٹ میں سبزی تھی اور دو چپائیاں تھیں۔ مجھ ایسے بٹے کئے شخص کے لیے یہ کھانا نہ ہونے کے برابر تھا مگر پھر بھی غنیمت تھا۔ میں نے پانچ منٹ میں سب ختم کر دیا۔ پانی گلاس بھی ٹرے میں ہی رکھا تھا میں نے پانی پیا اور ٹرے ایک جانب سرکا دی۔ اب میں حواسوں میں آچکا تھا۔ کھانا پیٹ میں پڑا تو احساس ہوا کہ بھوک پیاس اور شدید تھکن سے بہت کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی میں نے

کمرے پر طائرانہ نگاہ ڈالی۔ یہ کسی بہت ہی قدیم عمارت کا کمرہ لگتا تھا جس کی چھت بہت اونچی تھی اور چھت سیدھی اور سینٹ کی نہ تھی بلکہ ٹکنی تھی یعنی جس طرح ہٹ کی چھت ہوتی ہے، چھت لکڑیوں کی بلیوں پر رکھی ہوئی لگتی تھی اور چھت سے ایک بہت لمبا تار لٹکا ہوا تھا۔ اور تار میں یہ بلب روشن تھا۔ بجلی کے اس تار کو ہزاروں کھیاں چٹی ہوئی تھیں۔ کمرے کے حد ٹھنڈا تھا اور اس میں صرف ایک درزی پڑی تھی جس پر میں بیٹھا تھا۔ نہ کوئی فرنیچر تھا نہ ہی کوئی اور چیز، پورا کمرہ خالی تھا۔ دیواروں کا پلستر جگہ جگہ سے ادھڑا ہوا تھا چھت سے شاید گز بھر نیچے دو روشن دان تھے اور ان روشن دانوں پر لوہے کی جالی لگی ہوئی تھی۔ گویا یہاں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا سوائے اس دروازے کے جس سے ہم اندر داخل ہوئے تھے۔

مجھے حیرانگی اس بات کی تھی کہ یہ شخص کون ہے؟ اگر مجھے اغوا کرنے والا بہادر ہے تو وہ سامنے کیوں نہیں آیا؟ اس عورت کی آواز بھی یہاں سے بہت مختلف تھی اور پھر اس عورت نے اس شخص کو ”سر“ کہہ کر مخاطب کیا تھا جبکہ یہاں بہادر کو انکل کہا کرتی تھی۔ سوالات کا طوفان تھا جو میرے ذہن میں ٹھاٹھیں مار رہا تھا مگر میں نے سب کچھ ذہن سے جھٹک دیا اور درزی پر لیٹ گیا۔ میرے بدن میں بے انتہا درد تھا۔ رات بھر کار کی سیٹ پر سکڑے پڑے رہنے سے میرا اعصاب بے حد متاثر ہوئے تھے۔ میں سب کچھ بھول کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ نیند بہت دیر سے آئی مگر آ گئی۔

پھر میری آنکھ کسی کی ٹھوک سے کھلی تھی۔ میں اچھل کر اٹھ بیٹھا۔ کمرے میں پھر اندھیرا تھا۔ ہلکی روشنی میں مجھے تین سائے کھڑے نظر آئے جن میں ایک یقیناً عورت کا سایہ تھا۔

”اوہ۔ اس طرح نہیں جگو۔ آرام سے، ممانوں سے ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے تمہیں!“ وہی میٹھا لہجہ سنائی دیا۔

”مسٹر اقبال، کیسے ہیں آپ۔“ میرے خیال میں کافی فریش ہو گئے ہوں گے؟“

”جج..... جی کافی بہتر ہوں۔“ میں نے کھڑے ہوتے ہوئے جواب دیا۔

”مسٹر اقبال، بات مختصر کروں گا۔ مجھے آپ سے چند ضروری کام لینے ہیں، ایسے کام جنہیں آپ کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔ بہترین معاوضہ اور زندگی کی ضمانت بھی دوں گا۔ یہ

کام ایسا نہیں جو قانوناً یا اخلاقاً جرم ہو مگر شاید آپ اسے جرم سمجھیں، بہر حال اگر آپ میرے لیے دو کام کر دیں تو میں بڑا احسان مند ہوں گا۔“

”کام کی نوعیت جانے بغیر میں کچھ بھی کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں، اگر آپ کچھ تفصیل سے بتا دیں تو شاید فیصلہ کرنا آسان ہو جائے۔“ میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے پر اعتماد لہجے میں جواب دیا۔

”گڈ..... ویری گڈ..... اچھی بات ہے، ویسے مجھے امید ہے کہ آپ میری بات مان جائیں گے۔“ اگر آپ دوستانہ ماحول میں گفتگو کرنا پسند کریں تو میں آپ کے ساتھ بہتر سلوک کر سکتا ہوں۔“ اس نے دونوں ہاتھوں کو سینے پر باندھتے ہوئے کہا۔ وہ ناٹوں کو ذرا سا پھیلا کر بڑے پر اعتماد انداز میں کھڑا تھا۔

”معاف کیجئے گا، میرے چاہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا میں ہر حال میں دوستانہ ماحول میں گفتگو کرنا پسند کروں گا، ویسے بھی میں ایسی پوزیشن میں نہیں ہوں کہ غیر دوستانہ رویہ اختیار کر سکوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”ہوں..... یہ بھی ٹھیک ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ میں پہلے تو کچھ روز آپ کو اپنا مہمان بنانا چاہتا ہوں۔ پلیز اگر آپ قبول کر لیں تو میں اچھی طرح سے میزبان کر سکوں گا، پھر بعد میں..... یعنی کچھ پرائیملس ہیں ان کے حل ہو جانے کے بعد میں آپ کو کام کی نوعیت سے آگاہ کر سکوں گا۔“

”آپ جس میزبانی اور دوستانہ ماحول کی باتیں کر رہے ہیں وہ مجھے یہاں نظر تو نہیں آ رہا..... میں نہ آپ کا نام جانتا ہوں نہ آپ کو پہچانتا ہوں۔ یوں اندھیرے تہہ خانے میں پڑے رہ کر میں جس میزبانی کا مظاہرہ دیکھ رہا ہوں، وہ اپنی نوعیت کی منفرد میزبانی ہے۔“

”میں اسی لیے شرمندہ ہوں اور آپ سے درخواست کر رہا ہوں کہ اگر آپ دل سے میرا مہمان بننا قبول کریں تو میں بھی اس ذہنی اذیت سے آزاد ہو سکوں گا۔ پلیز.....“

”میں آپ کا مہمان ہی ہوں مسٹر.....“ میں نے جان بوجھ کر جملہ ادھر را چھوڑ دیا، میں اس کا نام جاننا چاہتا تھا۔

”زید..... مسٹر زید“ اس نے جواب دیا اور آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ مصافحہ کے لیے بڑھا دیا۔

اب مجھے اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہونے لگا تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس کا ہاتھ اس کی نرم روی کا غماز تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کسی انتہائی نرم و نازک سی لڑکی سے ہاتھ ملا رہا ہوں۔

”بیٹھیں..... تشریف رکھیں آپ!“ اس نے اس انداز میں ہاتھ سے اشارہ کیا جیسے وہ اپنے ڈرائنگ روم میں بچے کسی قیمتی صوفے کی طرف اشارہ کر رہا ہو۔

میں جھینپا جھینپا سا اس میلی اور مٹی میں آئی درری پر بیٹھ گیا۔ وہ پھر ہاتھ سینے پر باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کن لوگوں میں پھنس گیا ہوں۔ وہ عورت اور جگو خاموش، سر جھکائے کھڑے تھے۔

”جگو، مسٹر اقبال کو پوری تعظیم کے ساتھ ان کے بیڈ روم میں پہنچا دو۔ ان کا ہر طرح خیال رکھنا تمہاری ذمہ داری ہے۔“ یہ کہہ کر وہ میری جانب مڑا۔ ”اوکے مسٹر اقبال۔ میں ذرا ایک مینٹگ میں جا رہا ہوں۔ رات کا کھانا آپ ہی کے ساتھ کھاؤں گا۔ آپ اس دوران میں نہادھو کر آرام کر لیجئے گا۔“ اتنا کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ عورت اس کے پیچھے چلی گئی۔ جگو وہیں کھڑا رہا۔ میں اس شخص کو جاتے دیکھتا رہا۔ وہ ایک قد آور اور اسارٹ شخص تھا۔ اس کے جاتے ہی جگو آگے بڑھا۔ لمحہ بھر کو میرا دل دھڑک اٹھا۔

”آئیے سر!“ اس نے انتہائی ادب سے کہا۔ میں حیران ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگا مگر اس کمرے میں میرے سوا کوئی نہ تھا۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں تو سمجھا کہ اس شخص نے شاید میرے لیے کوڈ ورڈ میں کوئی سفاک حکم دیا ہو گا۔

”آئیے سر، آپ کو آپ کا کمرہ دکھا دوں۔“ اس نے پھر ادب سے کہا۔ میں بے یقینی کے عالم میں کھڑا ہو گیا۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ ہم سیڑھیوں سے ہوتے ہوئے اوپر پہنچ گئے۔ اوپر پہنچ کر میں سکتے میں رہ گیا۔ سیڑھیاں ختم ہوتے ہی اور دروازے سے باہر نکلتے ہی مجھے لگا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ وہ اتنی ہی خوابناک جگہ تھی۔ یہ ایک بہت ہی بڑا کمرہ تھا اور ایسا شاندار کمرہ تھا کہ مجھے یقین نہ آیا

کہ اسی کمرے کے ایک منقش دروازے کے اس طرف جو سیڑھیاں نیچے کی طرف جاتی ہیں ان کے اختتام پر وہی تہ خانہ ہے جسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے ہم دنیا کی قدیم عمارت کے کھنڈر میں ہیں۔

میں نے اتنا خوب صورت کمرہ شاید زندگی میں پہلی اور آخری بار دیکھا تھا۔ قیمتی اور نادر فرنیچر اور فرنیچر بھی ایسا کہ شاید کوئی تصور ہی نہ کر سکے۔ دائیں جانب کی دیوار کچھ اس طرح بنائی گئی تھی کہ لگتا تھا پہاڑی پہاڑی ہیں جن سے آبشار بہہ کر پورے زور سے نیچے پڑے پڑے پتھروں سے ٹکرا رہا تھا۔ میں نے قریب جا کر دیکھا وہ دیوار نہیں تھی وہاں واقعی آبشار گر رہا تھا۔ میں نے چہرے پر چھینٹے محسوس کیے اور تب ہی میں گھنٹوں تک اونچی اس دیوار سے ٹکرا گیا جو نصف دائرے کی شکلیں میں بنی ہوئی اس دیوار کے دوسرے کنارے پر خوب صورت سیزیز بنی ہوئی تھیں جو دور سے دیکھنے پر فریم کی ہوئی سیزیز لگتی تھیں مگر قریب جا کر معلوم ہوتا تھا کہ ان تصویروں کو اسی دیوار پر بنایا گیا ہے۔

کمرے کے پیچوں بچ سرخ رنگ کا گول قالین بچھا ہوا تھا۔ جس کے چاروں طرف گولائی میں ہی صوفہ اور سائیڈ ٹیبلز بنائی گئی تھیں۔ کمرے کے کونوں میں بڑے بڑے منقش گلدان رکھے تھے۔ خوب صورت پردے اور انتہائی نفیس اور قیمتی ڈیکوریشن ہیں تھے جو قدیم اور نادر معلوم ہوتے تھے۔

میں بالکل بھول چکا تھا کہ جگو میرے ساتھ ہے، وہ مجھے ہونقوں کی طرح منہ پھاڑے دیکھے گا تو کیا سوچے گا۔ میں واقعی بالکل گم صم ہو چکا تھا۔ مجھے یقین ہوتا جا رہا تھا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ خود کو خواب اور حقیقت کے درمیان معلق دیکھ کر میں نے اپنے بازو میں چٹکی کاٹی۔ سخت تکلیف نے مجھے احساس دلایا کہ میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں وہ حقیقت ہے۔ میں نے پلٹ کر جگو کی طرف دیکھا، جو کسی زر خرید غلام کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔ تیز روشنی میں مجھے وہ بوتل کا جن لگا، موٹا، بدبیت اور گنجا۔

مجھے اپنی جانب متوجہ پا کر اس نے ہاتھ سے بائیں طرف کے دروازے کی طرف اشارہ کیا اور کہا ”سر آپ کا کمرہ اس طرف ہے۔“ میں اس طرف بڑھ گیا۔

جگو نے لپک کر دروازہ کھولا، اب میں ایک اور حسین کمرے میں تھا جو بیڈ روم تھا۔ یہاں بھی ہر چیز قیمتی، خوب صورت اور نفیس تھی۔ میں نے حیران ہونے کی کوشش نہیں کی اور جگو سے مخاطب ہوا ”کیا یہی میرا کمرہ ہے؟“

”جی سر! یہ اس طرف ہاتھ روم ہے۔ آپ کے بیڈ کے سرہانے نیل کا بٹن لگا ہے، کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو آپ مجھے بلوا سکتے ہیں یہ انٹرکام ہے۔ سات نمبر میرے کمرے کا ایکشنشن ہے۔“ یہ کہہ کر وہ ایک دیوار کے قریب چلا گیا، جہاں آف وہاٹ اور سنہرے رنگ سے بنی ہوئی وارڈروبرب تھی۔ جگو نے اس کا سنہری ہینڈل پکڑ کر کھول دیا۔ اندر بڑی نفاست سے پنگر پر کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔

”یہ آپ کے کپڑے ہیں۔ آپ نما کر کپڑے بدل لیجئے گا۔“

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہاں قدم قدم پر اسراف تھا۔ جس نے میرے اعصاب کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ یہ کمرہ بھی بے حد بڑا تھا۔ اس کمرے کے بھی پیچوں بچ گول بیڈ تھا جو آف وہاٹ اور سنہرے رنگوں کا امتزاج تھا۔ پورے کمرے ۲ فرنیچر اسی طرح کا تھا جس میں ڈریسنگ ٹیبل، چار بے حد خوب صورت ڈیزائن کی کرسیاں، ایک ٹیبل اور ایک الماری شامل تھی۔ اسی رنگ کے پردے تھے۔ میں بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ مجھے خاموش دیکھ کر جگو اسی دروازے کی طرف بڑھ گیا جہاں سے ہم داخل ہوئے تھے۔ میرے کان دروازے پر لگے ہوئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ دروازہ باہر سے لاک کر دیا گیا ہو گا مگر میں نے ایسی کوئی آواز نہ سنی۔ میں چند لمحے اسی طرح کھڑا رہا۔ پھر میں نے دبے قدموں آگے بڑھ کر دروازے کے ہینڈل کو پکڑ کر اپنی جانب کھینچا۔ دروازہ کھلتا چلا گیا۔ اب مجھ میں حیران ہونے کا دم نہیں تھا اس لیے میں سپاٹ ذہن لیے دروازہ بند کر کے بیڈ تک آ گیا۔ بستر بے حد نرم تھا۔ میں بیٹھا تو اس میں دھنستا چلا گیا۔ کمرے میں بھیجی بھیجی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ بیڈ پر بہت سے کٹن پڑے تھے میں کٹن سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں بادلوں پر لیٹا ہوا ہوں۔ نرم، خنک اور خوشبوؤں سے معطر بادل۔

میں کافی دیر تک یوں ہی آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔ شاید آدھا گھنٹا اسی طرح گزر گیا۔ میرا ذہن اس نئی گتھی کو سلجھانے میں لگا ہوا تھا مگر گتھی کا سرا ہاتھ میں نہیں آ رہا تھا۔

ابھن بڑھتی جا رہی تھی۔ تب میں تھک گیا۔ میں نے سوچ لیا کہ خود کو ہلان کرنے سے بہتر ہے کہ حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا جائے۔ جو کچھ ہو گا سامنے آ ہی جائے گا۔ مجھے اپنے بارے میں کوئی خوف نہ تھا۔ پریشانی تھی تو صرف فاریہ اور سوہنی وغیرہ کی طرف سے کہ جانے وہ لوگ کس حال میں ہوں گے۔ میں نے صدقِ دل سے دعا مانگی کہ خدا کرے وہ خیریت سے ہوں۔ پھر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے ہاتھ روم کا دروازہ کھولا۔ ہاتھ روم بھی بے حد خوب صورت تھا۔ ضرورت کی ہر چیز اور دنیا کی ہر خوشبو وہاں موجود تھی۔ میں تقریباً گھنٹا بھر تک نہاتا رہا پھر وہاں ٹنگی ہوئی ہاتھ روم پین کر کمرے میں واپس آ گیا۔ الماری کھول کر میں نے ایک سوٹ اپنے لیے منتخب کیا اور اسے پین کر حیران ہو گیا لگتا تھا جیسے درزی کو میرا ناپ دے کر سلوایا گیا ہو۔ کپڑے بدل کر میں نے کلون لگایا جو خاصا مزنگا تھا۔ سائڈ ٹیبل پر سگریٹ کیس رکھا تھا اور اسی ٹیبل پر موسم بقی نما ایک سنہرا لائٹر بھی موجود تھا۔ میں نے ایک سگریٹ سلگایا اور کرسی پر بیٹھ کر لمبا کش لیا۔ مجھے چائے کی شدید طلب محسوس ہوئی تو میں نے انٹر کام اٹھا کر سات نمبر دیا۔ دوسری جانب سے فوراً ہی جگو کی آواز آئی۔ ”لیس سرا“

”جگو میں چائے پینا چاہتا ہوں۔“

”ابھی حاضر ہوا۔“ جواب کہا گیا اور رابطہ منقطع ہو گیا۔

چند لمحوں بعد ہی جگو چائے کی ٹرالی لے آیا جس میں چائے کے ساتھ لوازمات بھی تھے۔ مجھے ایک دم ہی بھوک کا احساس ہونے لگا۔ میں نے جو کھانا تہہ خانے میں کھایا تھا اسے کھانا تو نہیں کما جا سکتا تھا۔ جگو نے خود ہی چائے کا کپ بنایا اور میرے سامنے رکھ دیا۔

”ٹھیک ہے تم جاؤ۔“ میں نے چائے میں چچہ ہلاتے ہوئے جگو سے کہا۔

جگو ذرا سا جھکا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں ٹرے پر ٹوٹ پڑا۔ وہ جو کچھ بھی لایا تھا میں نے سب کھالیا، دو کپ چائے پی اور بے دم سائڈ پر پڑ گیا۔ پیٹ بھر جانے کے بعد مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی اور پھر نہ معلوم کب آنکھ لگ گئی۔

میری آنکھ انٹر کام کی بیل بجنے کی آواز پر کھلی۔ میں نے ہڑبڑا کر ریسپور اٹھایا۔

”لیس!“

”سر..... مسٹر زید آپ کو یاد کر رہے ہیں، اگر آپ تیار ہیں تو میں لینے آ جاؤں!“ جگو کی آواز سے میں پوری طرح جاگ گیا۔

”ہاں..... تم آ جاؤ۔“ میں نے جواب دیا اور ریسپور رکھ کر ڈرینگ ٹیبل کے سامنے پہنچ گیا۔ قد آدم آئینے میں خود کو دیکھا، کپڑوں کی کریز صبح کی۔ بالوں کو اچھی طرح جمایا اور آئینہ شیو چرے پر لگا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

چند لمحوں بعد دروازے پر ہلکی دستک سنائی دی۔ ”کم ان!“ میں نے اونچی آواز میں کہا۔ اس کے ساتھ ہی جگو اندر داخل ہوا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے آبشار والے کمرے سے گزر کر ایک لمبی کوریڈور میں آ گئے۔ کوریڈور میں دور تک قالین بچھا ہوا تھا۔ دیواروں پر خوب صورت تصاویر آویزاں تھیں۔ جگہ جگہ بڑے بڑے گلدان رکھے تھے۔ ٹیبل تھی جہاں ٹیلی فون رکھا تھا اور چھت پر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے فانوس لٹکے ہوئے تھے۔ اس کوریڈور میں دائیں بائیں کئی دروازے تھے جو بند تھے۔ جگو مجھ سے چند قدم آگے تھا۔ وہ ایک بڑے سے دروازے کے سامنے رک گیا۔ اس نے ہلکی سی دستک دی پھر دروازہ کھول کر ایک طرف ہو گیا، مجھے اس نے اندر جانے کا اشارہ کیا میں جھجکتا ہوا اندر داخل ہوا۔

وہ سامنے ہی کھڑا تھا۔ گرے کمر کے سوٹ پر میرون ٹائی اور جیب میں سے جھانکتا ہوا اسی رنگ کا رومال، اس پر بے حد خوب صورت لگ رہا تھا۔ وہ خود بھی بے حد خوب صورت تھا۔ اس کی عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان ہوگی۔ کنپٹی پر سفید بال اس کی خوب صورتی میں اضافہ کر رہے تھے۔ کھڑا ناک نقشہ، گورا رنگ اور گھنے گھونگریا لے بال۔ وہ مردانہ وجاہت کا حسین نمونہ تھا۔

مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر دلفریب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”آئیے مسٹر اقبال، آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟“

”جج..... جی نہیں۔“ میں خود کو مضبوط بنانے کی کوشش کرنے کے باوجود اس سے مرعوب ہو گیا اور میری زبان لڑکھڑا گئی۔

”آئندہ بھی نہیں ہوگی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میں جس کمرے میں تھا وہ ایک ہال نما کمرہ تھا اور یوں لگتا تھا جیسے یہ کوئی کانفرنس روم ہو۔ سائیڈ پر صوفے رکھے تھے مگر کمرے کے درمیان میں ایک بہت بڑی ٹیبل تھی جس کے چاروں طرف بہت سی کرسیاں رکھی تھیں۔ کمرہ انفاست سے سجایا گیا تھا۔ یہاں بھی نادر اشیاء کی بہتات تھی۔

میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ ”مسٹر اقبال“ آپ نے میری میزبانی قبول کرنے کا ثبوت دے دیا جس سے میں بے حد خوش ہوں۔“

”میں سمجھا نہیں!“

”یہ کہ آپ نے اپنے کمرے سے نکلنے یا فرار ہونے کی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ دروازے کھلے ہوئے تھے اور آپ اگر چاہتے تو جاسکتے تھے۔ میں نے سب سے کہہ دیا تھا کہ اگر آپ جانے کی کوشش کریں تو آپ کو نہ روکا جائے۔ مگر آپ نے ایسا نہیں کیا۔ یہی میری میزبانی قبول کرنے کا ثبوت تھا۔“ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

اس کی اس بات نے مجھے حیران کر دیا کہ میں مکمل طور پر آزاد تھا ورنہ میرا خیال تو یہ تھا کہ اندر نہ سہی مگر باہر ضرور پہرے بٹھائے گئے ہوں گے۔ بہر حال میں ان حالات میں اس کی بات پر اعتبار کرنے پر مجبور تھا کہ میں نے فرار ہو کر یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ میں آزاد ہوں یا نہیں۔ ویسے بھی ان حالات کے اسرار نے مجھے اتنا مجبور تو کر ہی دیا تھا کہ میں یہاں رک کر خود کو اغوا کر لینے کا مقصد جانے بغیر جا بھی نہیں سکتا تھا اور نہ ہی مجھے جانا چاہیے تھا۔

”مسٹر زید“ مجھے آپ کی میزبانی نے کافی متاثر کیا ہے۔ یہ میزبانی قبول نہ کرنا کفرانِ نعمت ہوتا۔“

”شکریہ مسٹر اقبال!“

”ویسے میں جلد از جلد یہ جاننا چاہوں گا کہ آپ مجھے کیسے جانتے ہیں اور مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“

”کیوں..... کیا آپ کو جانے کی جلدی ہے؟“

”ظاہر ہے..... میرے اس طرح آجانے سے گھر کے لوگ پریشان ہوں گے۔“

”تو آپ انہیں ٹیلی فون کر کے بتا دیجئے کہ آپ کو اچانک کراچی آنا پڑ گیا اور آپ

چند ہی روز میں واپس پہنچ جائیں گے۔“

”یہ..... یہ کراچی ہے؟“ میں اچھل پڑا۔

”جی مسٹر اقبال..... میں آپ کو اس طرح لائے جانے پر شرمندہ ہوں مگر یہ میری مجبوری تھی، پلیز آپ مائنڈ نہ کیجئے گا۔“

میں چند لمحے گنگ بیٹھا رہا۔ کراچی آنے کی میری بھی بہت خواہش تھی۔ میں نے کراچی کے بارے میں بہت کچھ گاؤں میں ہی سن لیا تھا اور کراچی کو کسی پرستان کی طرح اپنے خوابوں میں بھی دیکھا تھا مگر یوں اچانک اور بے خبری میں کراچی پہنچ جاؤں گا یہ گمان بھی نہ تھا مجھے۔

”مسٹر اقبال..... آپ نے مجھے معاف کر دیا ہے نا؟“

میں چونک اٹھا۔ جی..... جی ہاں۔ نہیں، ایسی کوئی بات نہیں مسٹر زید، جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی گیا ہے۔ اب ہمیں آئندہ کے بارے میں گفتگو کرنا چاہیے یہ سب کچھ میرا لیے بڑا حیران کن ہے اور میں حیرانگی کی اس کیفیت سے نکلنا چاہتا ہوں نکلنا چاہتا ہوں۔“

”ضرور مسٹر اقبال۔ وقت تو میرے پاس بھی بہت کم ہے، ویسے اب زاریہ کا کیا حال ہے؟“

زاریہ کے نام پر میں پھر اچھل پڑا مگر بہت جلد میں نے خود کو سنبھال لیا۔ ”وہ اب ٹھیک ہے..... آپریشن کامیاب ہو گیا ہے ورنہ مجھے تو اس کی موت کا یقین ہو گیا تھا۔“ میں نے قطعی نارمل لہجے میں بتایا۔ بالکل اس طرح جیسے میں کسی بہت ہی قریبی عزیز کو اس کے بارے میں بتا رہا ہوں۔

”ہاں“ مجھے جب علم ہوا کہ وہ کوما میں چلی گئی ہے تو میں خود بھی پریشان ہو گیا تھا۔ میرا مقصد قطعی اسے تکلیف پہنچانا نہیں تھا مگر.....“

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میرے دماغ میں اتھل پھٹل شروع ہو چکی تھی۔ اس کے اس جملے سے ظاہر ہوتا تھا کہ زاریہ محض انہی کی وجہ سے اس حال کو پہنچی ہے۔

اس سے پہلے کہ میں اس سے کوئی سوال کرتا دروازے پر ہونے والی ہلکی سی دستک نے مجھے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔

”ایس کم ان!“ مسٹر زید نے اونچی آواز میں کہا۔ دروازہ دھیرے سے کھلا اور ساتھ

ہی میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

یہ وہی لڑکی تھی جسے میں میڈیکل اسٹور پر دیکھ چکا تھا، جس کی شہادت کی انگلی کا ناخن نہیں تھا یا یوں کہہ لیجئے کہ عذرا کے بھیس میں فاریہ کی کوٹھی جانے اور زاریہ کو زخمی کرنے والی یہی تھی۔

”گڈ ایوننگ باس!“ وہ ذرا سا جھکی اور پھر مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی! ”گڈ ایوننگ مسٹر اقبال!“

”آؤ زینی..... میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔“ مسٹر زید نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میں اب تک سکتے کے عالم میں تھا۔ وہ لڑکی اس وقت فیروزی ساری میں ملبوس، فیروزے کا ہلکا سائٹ پینے، بالوں کا جوڑا بنائے کسی شہزادی سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی کمرہ بھینی بھینی خوشبو سے مہک اٹھا تھا۔ میرے اور مسٹر زید کے کپڑوں سے اٹھنے والی خوشبو پھینکی پڑ گئی تھی۔

وہ بڑے پُر وقار انداز میں چلتی ہوئی میرے قریب والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ قریب آنے پر وہ اور زیادہ پیاری لگی۔ اس لڑکی سے بہت مختلف جسے میں نے میڈیکل اسٹور پر دیکھا تھا۔ میرے ذہن میں کہیں دور یہ احساس موجود تھا کہ یہ وہی لڑکی ہے مگر پھر بھی وہ مجھے مختلف لگ رہی تھی، میں نے گھبرا کر اس پر سے نگاہیں ہٹالیں اور ذہن کو اس کے جادو سے آزاد کرنے کے لیے تمام خیالات کو جھٹک دیا۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ مسٹر زید نے دستک دینے والے کو اندر آ جانے کو کہا۔ آنے والا ایک باوردی ویٹر تھا جس نے ایک ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ ٹرے سے کافی کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ اس نے ہمارے سامنے کافی کے خوب صورت کپ رکھے اور منوذب ہو کر واپس چلا گیا۔

”ویل مسٹر اقبال..... ہم آپ کے بارے میں بہت زیادہ کچھ نہیں جانتے مگر جاننے کی خواہش رکھتے ہیں۔“ مسٹر زید نے کافی کا کپ اٹھا کر اس میں اٹھتی ہوئی بھاپ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ میرے بارے میں کیا جانتے ہیں، میرا مطلب ہے کتنا جانتے ہیں؟“

”صرف اتنا کہ آپ کی انٹری بہت ڈرامائی تھی، آپ ایک سیدھے سراوے اور دیہاتی آدمی تھے، پھر اچانک ہی آپ بے حد ذہین، چست و چالاک اور اسمارٹ نوجوان کی صورت میں سامنے آ گئے، بے حد ایکٹو اور ویری انٹیلی جنٹ۔ مگر یہ تبدیلی آپ میں اتنی جلد اور اچانک کیوں آئی اور کیسے آئی، یہ پتا نہیں چل سکا، اور یہ بھی نہیں معلوم کہ آپ کہاں سے آئے ہیں، یہی وہ باتیں ہیں جو ہم جانا چاہتے ہیں۔“

”یہ سب باتیں جانا آپ کے لیے غیر ضروری ہو گا بہتر تو یہی ہے کہ ہم بات کو ماضی سے شروع کرنے کی بجائے حال سے شروع کریں۔“

”لیس، اصولاً تو یہی ہونا چاہیے مگر یہ رسمی باتیں ہیں اور پہلی تفصیلی ملاقات میں بات اگر رسمی باتوں سے شروع ہوتی ہے تو آدمی میں جلد ہی ترتیب اور خود اعتمادی پیدا کر دیتی ہے۔ میں یہ سب محض اپنے اور آپ کے درمیان اپنائیت کی فضا پیدا کرنے کے لیے پوچھ رہا ہوں۔“

”پھر تو ایسے ہی سوال مجھے بھی کرنا پڑیں گے تب کیا آپ جواب دینا پسند کریں گے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

”یقیناً بلکہ میں آپ کو پہلے اپنے بارے میں ہی بتا دوں تاکہ آپ مطمئن ہو جائیں، ویسے آپ کی تعریف کروں گا کہ آپ کو اپنا دفاع کرنا آتا ہے۔“

”شکریہ مسٹر زید..... میرا اتنا استحصال کیا گیا ہے کہ میں لاشعوری اور غیر ارادی طور پر پہلے دفاع کرتا ہوں، امید ہے آپ مائنڈ نہیں کریں گے۔ ویسے بھی اصولاً دفاع مجھے کرنا ہے آپ کو نہیں۔ آپ کے ذہن میں میرے بارے میں یقیناً کوئی پلان ہے مگر میرا ذہن کسی کورے کاغذ کی طرح ہے، میں خوفزدہ بھی ہو سکتا ہوں اور متحس بھی جبکہ آپ کے ساتھ ایسا نہیں ہے آپ کے اعصاب پر کوئی بوجھ نہیں ہے اور میں..... میرے اعصاب پے درپے حالات کی وجہ سے شل ہو چکے ہیں۔“

”آئی ایم سوری مسٹر اقبال کہ آپ کو میری وجہ سے ذہنی اذیت اٹھانا پڑی، سب سے پہلے تو آپ لاہور فون کر کے خود کو ایک بڑی پریشانی سے بچالیں۔ خیریت معلوم بھی کر لیں اور اپنی خیریت سے بھی انہیں آگاہ کر دیں۔“ مسٹر زید نے کافی کا کپ خالی کر کے نیبل پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر واقعی تاسف تھا اور کوئی ایسی بات تھی

جو مجھے اطمینان دلا رہی تھی۔

”نہیں مسٹر زید، مجھے اپنی اس غیر حاضری کے لیے کوئی ایسا جواز بھی چاہیے جسے وہ لوگ بالخصوص فارسیہ قبول کر سکے۔ وہ بے انتہا ذہین ہے اور یہ بھی جانتی ہے کہ میں اس کی اجازت یا اس کے علم میں لائے بغیر ایسی کوئی حرکت نہیں کر سکتا۔“

”اوکے، ایز یو لائیک، اب آپ مجھ سے کوئی سوال کرنا چاہیں تو کریں، میں جواب دینے کے لیے تیار ہوں۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”ہاں میں یہ جانتا چاہوں گا کہ فارسیہ اور بیگ صاحب سے آپ کا کیا تعلق یا دشمنی ہے؟“

”میرا کوئی تعلق یا دشمنی نہ بیگ صاحب سے ہے اور نہ فارسیہ سے۔“ اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

”آں؟“ میں حیران ہو گیا۔ اس نے زاریہ پر یہ حملہ کرایا، وہ کوما میں چلی گئی گویا موت کے منہ میں چلی گئی تھی، مجھے اغوا کرایا اور کہہ رہا تھا کہ اس کی کوئی دشمنی زاریہ یا فارسیہ یا پھر بیگ صاحب سے نہیں۔ ”میں سمجھا نہیں۔“ میں نے ان دونوں کو باری باری دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”سیدھا سا جملہ تھا اور اس جملے کا ایک ہی مفہوم بھی تھا کہ میری کوئی دشمنی نہ بیگ صاحب سے ہے اور نہ فارسیہ سے بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ میں انہیں صرف اسی وقت سے جانتا ہوں جب سے میں آپ کو جانتا ہوں۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

”مسٹر زید! آپ شاید میرے سوالوں کا جواب دینا نہیں چاہتے!“ میں نے برا سامنے بنا کر کہا۔

”ارے مسٹر اقبال ایسی کوئی بات نہیں، ٹھہریے میں آپ کو شروع سے بتاتا ہوں۔ مسٹر اقبال، میں ایک متوسط گھرانے کا لڑکا تھا۔ یونیورسٹی میں میری ملاقات صبیحہ سے ہوئی تھی۔ وہ ایک مل اونر کی بیٹی تھی۔ اکلوتی بیٹی، حسین اور خوب صورت، وہ مجھے بہت اچھی لگی۔ میری تھوڑی سی کوشش مجھے اس کے قریب لے آئی۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ بھی مجھے پسند کرتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہماری قربت ایک سنجیدہ محبت میں تبدیل ہو گئی مجھے اپنے اور اس کے درمیان کا فرق معلوم تھا اسی لیے میں نے کبھی اس سے شادی کے

بارے میں نہ کہا حالانکہ میں اکثر خیالوں میں اسے حاصل کرنے کی ترکیبیں سوچا کرتا تھا۔ یہ بھی سچ ہے کہ مجھے اس کی دولت سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور یہ بات بھی میں جانتا تھا کہ شادی کی فرمائش میرے اور اس کے درمیان شکوک کے علاوہ فاصلوں کو بھی جنم دے سکتی ہے، ممکن ہے وہ یہ سمجھے کہ میں اس کی دولت کی وجہ سے اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں یا پھر ممکن ہے کہ اس کا مغرور باپ ہمارے درمیان فاصلے اگا دے۔ یہ دونوں خدشات مجھے شادی کی بات کرنے سے روکتے تھے مگر مجھے اس وقت حیرت ہوئی جب صبیحہ نے خود مجھ سے شادی کی بات کی اور اپنے باپ سے ملنے کا مشورہ دیا۔ تب میں نے اسے سمجھایا کہ اس کا باپ ہمارے درمیان دوری پیدا کر سکتا ہے۔ وہ یہ سب باتیں ماننے کو تیار نہ تھی اور ہر حال میں مجھ سے شادی کرنا چاہتی تھی چاہے اس کا باپ مانے یا نہ مانے۔ یہاں ایک اور بات بتا دوں کہ اس کا ایک سوتیلہ بھائی بھی تھا یعنی صبیحہ کے باپ کی پہلی بیوی کا بیٹا۔ وہ بیوی اس بیٹے کی پیدائش پر مر گئی تھی۔ اس کے سوتیلے بھائی کا نام حیدر علی تھا۔ حیدر علی تین برس کا تھا کہ اس کے باپ نے دوسری شادی کر لی اور اس کے یہاں صبیحہ نے جنم لیا۔ حیدر علی ماں کے مرنے کے بعد اپنی نانی کے پاس رہا تھا وہیں پلا بڑھا اور جوان ہوا اسے اپنے باپ کی محبت سے محرومی کا شدید احساس تھا۔ وہ کبھی کبھی باپ کے پاس رہنے آیا کرتا تھا اور صبیحہ سے باپ اور ماں کی محبت دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتا اور اس سے نفرت کرتا تھا۔

بہر حال میں بتا رہا تھا کہ صبیحہ نے مجھ سے ضد کرنا شروع کر دی کہ میں اس کے باپ سے ملوں۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ ماں کو راضی کر چکی ہے۔ اب تمام مسئلہ باپ کا ہے۔ باپ کو اس کی ماں نے میرے متعلق اور صبیحہ کی پسند کے متعلق بتا دیا تھا اور اس کا باپ مجھ سے ملنے کا خواہش مند تھا۔ میں خود میں اتنی ہمت نہیں پاتا تھا کہ اس سے ملوں مگر اس نے مجھے حوصلہ دیا اور میں نے اس کے باپ سے مل لیا۔ مجھے اس پر حیرت ہوئی کہ چند دن کی گہری خاموشی کے بعد اس کے باپ نے رضامندی کا اظہار کر دیا۔ وہ بے حد خوش تھی اور میری حالت بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھی۔

ہماری شادی دھوم دھام سے ہوئی۔ اس کے باپ نے مجھے اتنا کچھ دیا کہ میں تصور نہیں کر سکتا تھا۔ میرا ایک بھائی اور ایک بہن تھی۔ باپ کا انتقال ہو چکا تھا۔ ماں بیمار رہنے

میں اور صبیحہ، دونوں اتنے خوش تھے کہ ہمارے پاؤں زمین پر نہیں آتے تھے۔ ہم نے سیماء کی پیدائش پر جی کھول کے خوشیاں منائی تھیں۔ سیماء کے نانائے سیماء کے نام اپنی بہت سی جائداد کر دی تھی اس کی نانی نے بھی بہت کچھ دیا تھا۔ وہ خوش قسمت ترین بچی تھی جسے بے پناہ محبتیں ملیں۔ نانائانی اسے دیکھ کر جیتے تھے اور ہم دونوں میاں بیوی کی تو وہ آنکھ کا تارا تھی۔

وہ دو برس کی ہوئی تو اس کی نانی یعنی صبیحہ کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ ان کے مرنے کے بعد پتا چلا کہ وہ اپنی تمام دولت سیماء کے نام کر گئی ہیں۔ صبیحہ کے والد بوڑھے ہو چکے تھے۔ میں تنہا ان کی تمام جائیداد اور تمام کاروبار کو سنبھال نہیں سکتا تھا۔ یہ دیکھ کر انہوں نے اپنے بیٹے حیدر علی کو بھی اپنے پاس بلا لیا اور اپنے دو ٹیکسٹائل ملز اس کے حوالے کر دیے۔ حیدر علی بہادر ایک چالاک اور تیز آدمی تھا۔ اس نے بہت جلد اپنے حصے کا کاروبار سنبھال لیا بلکہ اس کاروبار میں خاطر خواہ اضافہ بھی کر دیا۔ صبیحہ کے والد اس کی ذہانت سے بہت خوش ہوئے اور اب وہ مطمئن ہو کر آرام کرنے لگے۔ ”وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوا اور اس نے سگریٹ کا لمبا کش لے کر پھر دھوئیں کے مرغولے بنائے۔

اسی وقت دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

”کم ان۔“ زینی نے بلند آواز میں کہا۔ اس کی آواز بے حد خوب صورت تھی۔

دروازہ کھلا اور ملازم کافی کی ٹرے لیے اندر داخل ہوا۔ اس کی کمرے میں موجودگی کے دوران میں گہری خاموشی طاری رہی چینی کے نازک برتنوں کی کھٹک گونجتی رہی۔ وہ ہم سب کو کافی کے کپ دے کر چلا گیا۔ تب زید میرے بالکل سامنے والی کرسی پر آ بیٹھا۔

”ہوں..... کیا کہہ رہا تھا میں؟“ اس نے زینی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”حیدر علی نے تمام کاروبار سنبھال لیا۔“ زینی نے جواب دیا۔

”ہاں..... صبیحہ کے والد کی عمر آرام کرنے کی تھی۔ یعنی اب دو بیٹے مل گئے

تھے۔ ایک میں اور دوسرا حیدر علی۔ میں بھی بڑے احسن طریقے سے اپنا کام سنبھالے ہوئے تھا۔ تین برس اور گزر گئے۔ سیماء پانچ سال کی ہو گئی۔ ہم بے حد خوش و خرم زندگی گزار رہے تھے کہ اچانک صبیحہ کے والد مضطرب رہنے لگے۔ ہم ان کے اضطراب کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھے مگر ایک بات میں نے نوٹ کی تھی کہ وہ کچھ روز کے لیے

کے بعد انتقال کر گئی۔ بھائی کو میں نے امریکہ بھیج دیا اور بہن کی شادی کر دی۔ ہماری شادی کے تیسرے برس صبیحہ نے ایک پیاری سی بچی کو جنم دیا جس کا نام ہم نے سیماء رکھا۔“

آخری جملہ سنتے ہی میں اچھل پڑا۔ ”جی؟ سیماء یعنی۔ یہ بہادر والی سیماء!“

اس کے ہونٹوں پر دکھ کی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”ہاں..... یہی سیماء، بہادر والی“

میری بیٹی ہے اور یہ بہادر ماموں ہے اس کا، صبیحہ کا سوتیلا بھائی، حیدر علی بہادر۔“

میری پیشانی پر پسینے کی بوندیں ابھر آئیں۔ اس کی تمام کہانی جسے میں اب تک لائق تعلق سے سن رہا تھا اب میرے لیے حیرت انگیز ہو گئی تھی میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ مجھے یاد آ گیا کہ مجھے بتایا گیا تھا کہ سیماء کا باپ اپنی بیوی اور بچی کو چھوڑ کر امریکہ بھاگ گیا تھا اور پھر پلٹ کر ان دونوں کی کوئی خبر نہ لی۔ مجھے وہ رات بھی یاد آ گئی جب سیماء، بیگ صاحب کے گھر میں تھی اور رات کو میری کھڑکی سے کود کر اندر آئی تھی اور عجیب ہلکی ہلکی باتیں کرنے لگی تھی اس نے مجھے جمال کہہ کر مخاطب کیا تھا اور مجھ پر اپنی ماں کے قتل کا الزام بھی لگایا تھا۔

”پھر..... پھر کیا ہوا مسٹر زید..... ٹھہریے۔ میں کافی اور پیوؤں گا۔“

زید نے سر کو ہلکی سی جنبش دی اور اس لڑکی کو اشارہ کیا جسے اس نے زینی کہہ کر تعارف کرایا تھا۔ زینی نے اٹھ کر انٹرکام پر کافی لانے کا آرڈر دیا۔ زید نے اٹھ کر کمرے میں نکلنا شروع کر دیا۔ پھر وہ اچانک رکا اس نے کوٹ کی جیب سے ایک قیمتی اور خوب صورت سگریٹ کیس نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے فوراً ہی سگریٹ لے لیا، مجھے شدت سے اس کی طلب کا احساس ہوا تھا۔ مسٹر زید نے بھی ایک سگریٹ نکالا اور ہونٹوں میں دبا کر دوسری جیب سے ایک چھوٹا سا مگر خوب صورت لائٹر نکال لیا۔ دوسرے لمے لائٹر سے شعلہ سا نکلا اور کمرے میں جلترنگ گونج اٹھا۔ جلترنگ کی آواز اس لائٹر سے آ رہی تھی اور اس آواز نے نہ معلوم کیوں میرے اعصاب کو پُر سکون کر دیا تھا۔ مسٹر زید نے پہلے میرا اور پھر اپنا سگریٹ سلگایا اور منہ سے دھوئیں کا ایک دائرہ سا بنا کر فضاؤں میں چھوڑ دیا۔ اس کی نگاہیں دھیرے دھیرے بڑھتے ہوئے اس دائرے پر جم کر رہ گئیں۔

”مسٹر اقبال..... سیماء ہم دونوں کے بے تحاشا پیار کی پہلی نشانی تھی جسے پاکر

امریکہ گئے تھے اور اپنے کچھ پرانے دوستوں سے مل کر آئے تھے آتے ہی انہوں نے دو ٹیکسائل ملز کا دورہ کیا جسے وہ حیدر علی کے سپرد کر چکے تھے۔ امریکہ سے آنے کے بعد ہی وہ بہت مضطرب رہنے لگے تھے پھر ایک روز انہوں نے مجھے بتایا کہ حیدر علی نے امپورٹ ایکسپورٹ کاروبار شروع کر دیا ہے وہ یہاں سے ایرانی قالین، پاکستان کی ثقافت کی کچھ اور چیزیں مثلاً ہاتھ سے بنائی ہوئی کپڑے کی گڑیاں، پیتل کے کام کے برتن اور لکڑی پر ہاتھ سے کھدے ہوئے نقش و نگار کی حامل چیزیں ایکسپورٹ کر رہا ہے اور ان کے بدلے میں وہ وہاں سے بھی کچھ چیزیں امپورٹ کرتا ہے۔

میں نے سب کچھ حیرت سے سنا کیوں کہ اب تک حیدر علی نے ہمیں ایسی کوئی بات نہیں بتائی تھی۔ صبیحہ کے والد حیدر علی کے اس کاروبار سے خوش نہیں تھے۔ انہوں نے دبے الفاظ میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ حیدر علی کو روک دیں اگر آپ نہیں چاہتے تو۔ مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ باوجود چاہنے کے اسے منع نہ کر سکے مگر ان کا اضطراب بڑھتا چلا گیا۔ شاید اسی اضطراب کی وجہ سے ان کے اعصاب جواب دے گئے اور ان پر فالج کا شدید دورہ پڑا۔ ان کی جان خطرے میں پڑ گئی۔ اسی حالت میں انہوں نے اپنے وکیل کو بلوا کر اپنی وصیت لکھوا دی اور وصیت کے تیسرے روز ہی وہ وفات پا گئے۔ ان کی موت کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنے بیٹے حیدر علی کو اپنی جائداد سے عاق کر دیا ہے اور اپنی تمام جائداد سیمال اور صبیحہ کے نام کر گئے ہیں۔

اب مجھے حیدر علی پر شک ہو گیا۔ سر کا اضطراب اور پھر ان کی وصیت نے اس کے کردار کو مشکوک بنا دیا تھا۔ ہم نے قانونی تقاضے پورے کرتے ہوئے حیدر علی سے تمام کاروبار لے لیا کیوں کہ یہ اس کے باپ کی ہدایت تھی۔ حیدر علی اس وقت تو خاموشی سے چلا گیا مگر وہ نچلا نہ بیٹھا اور میرے خلاف سازشوں کا جال سا بچھا گیا۔ اس نے کچھ زمینیں حیدر آباد کے نواح میں خرید لی تھیں اب انہی کی دیکھ بھال کرتا تھا اور اسی پر گزارہ بھی کرتا تھا۔

وہ جو بچپن ہی سے محرومی کا شکار رہا تھا اس نے ہماری جڑیں کاٹنا شروع کر دیں۔ میں نے ملز کے ساتھ ہی امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار بھی خود ہی سنبھالنے کا فیصلہ کر لیا تھا

اور یہی میری پہلی بھول تھی۔ مجھے اس سلسلے میں پوری سوچ بچار سے کام لینا چاہیے تھا مگر ایسا نہ کر سکا اور بہت جلد اس کے بوئے ہوئے گناہ میں ہاتھ کٹوا بیٹھا۔ معلوم اس وقت ہوا جب پانی سر سے اونچا ہو گیا اور مجھے اپنی گرفتاری کا خطرہ پیدا ہو گیا۔

”کس سلسلے میں؟“ میں نے اس کی بات کاٹی۔

”ایکسپورٹ امپورٹ کی آڑ میں وہ ہیروئن کا کاروبار کرتا تھا۔“ مسٹر زید نے ایک اور سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ”ادھ سوری۔“ وہ سگریٹ جیب سے نکالتے ہوئے بولا اور سگریٹ میری جانب بڑھا دی۔ میں نے انکار نہ کیا اور ایک سگریٹ نکال لی۔ لائٹر پھر جلا اور جلتنگ بج اٹھے۔

”مجھے ملک چھوڑ کر فرار ہونا پڑا۔“ اس نے دھوئیں کے مرغولے چھوڑتے ہوئے کہا۔ ”جاتے ہوئے سیمال کی ماں سے بھی نہ مل سکا اور یہ میری دوسری بڑی غلطی تھی۔ حیدر علی کو میری اس حرکت کی وجہ سے صبیحہ کو درغلانے کا موقع مل گیا۔ اس نے میری تصویریں ایک خوب صورت لڑکی کے ساتھ بنوائیں اور اسے پہنچا دیں۔ صبیحہ مجھ سے بے تحاشہ محبت کرتی تھی۔ وہ میرے بارے میں سن کر پاگل سی ہو گئی اور اتنی ہی شدت سے نفرت کرنے لگی جس شدت سے وہ محبت کرتی تھی۔ میں اپنے پیچھے زنجیروں کی جھنکار سنتا رہا اور بھاگتا رہا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ملک سے فرار ہوتے وقت مجھے پیسے کی ضرورت تھی اور وہ میں نے اسی کاروبار سے حاصل کیا تھا مگر میں نے اپنی بیوی یا بچی سے بے وفائی نہیں کی تھی۔“ مسٹر زید لمحہ بھر کو خاموش ہوئے۔ انہوں نے زینی کی طرف دیکھا اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ زینی ان کی مزاج شناس نکلی۔ اس نے اٹھ کر فریج کھولا اور ٹھنڈے پانی کی بوتلی نکال کر لے آئی۔ مسٹر زید نے مسکرا کر سر کی خفیف سی حرکت سے اس کا شکریہ ادا کیا اور ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔

”آپ مسٹر اقبال؟“ زینی نے مجھ سے پوچھا۔

”جی ضرور..... مسٹر زید کی داستان ایسی ہے کہ بار بار حلق خشک ہو جاتا ہے۔“ میں نے شوخ انداز میں جواب دیا اور ہاتھ بڑھا کر پانی کا گلاس اٹھا لیا جسے زینی دوبارہ بھر چکی تھی۔

مسٹر زید نے ایک بھونچکا کر مجھے گہری نظر سے دیکھا۔ ”آپ طنز تو نہیں کر رہے

مسٹر اقبال؟“ اس کا لہجہ دھیمّا تھا مگر میں نے اس کے لہجے میں آنچ محسوس کی۔
”سوری مسٹرزید..... میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا اگر آپ کو دکھ پہنچا ہے تو میرا
معذرت خواہ ہوں۔ جو کچھ میں نے کہا وہ قطعی طور پر سچائی پر مبنی تھا۔“

”شکریہ.....“ وہ پھر نارمل ہو گیا۔ ”تو مسٹر اقبال میں بھاگتا رہا، بھاگتا رہا اور جب
بہت سا وقت گزر گیا تو میں نے کچھ سکون محسوس کیا اور تبھی میں نے فون پر صبیحہ سے
رابطہ قائم کرنا چاہا مگر اس نے میری آواز سن کر فون بند کر دیا۔ اس نے مجھے صفائی کا موقع
بھی نہیں دیا اور یہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا کہ میں ان سب کے لیے مرچکا ہوں اور یہ کہ
دوبارہ رابطے کی کوشش نہ کروں۔ میں چیختا رہ گیا مگر بے سود، حیدر علی اپنے پلان میں
کامیاب ہو چکا تھا۔ وہ بسن اور بھانجی کا ہمدرد بن کر ان کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اس نے صبیحہ
کو میرے بارے میں ورغلا لیا اور اسے بتایا کہ یہ مذموم کاروبار میں ہی کر رہا تھا اور اس کے
باپ کو بھی متغیر کرنے والا بھی میں ہی ہوں۔ صبیحہ جو اکیلی ہو گئی تھی اسے بھائی کا سہارا بڑا
سہارا لگا اور وہ اس پر اعتماد کر بیٹھی۔ یہ سب باتیں مجھے جمال سے معلوم ہوئی تھیں۔“
جمال کے نام پر میں ایک بار پھر چونک اٹھا۔ ”جمال..... یہ کون تھا؟“

”میرا بھتیجا“ جسے میں نے مجبوراً صبیحہ کے پاس اپنے وکیل کی حیثیت سے بھیجا تھا
تاکہ وہ میری بیوی کو حقیقت بتا سکے اور ان لوگوں پر منڈلانے والے کسی بھی خطرے کے
امکان کو ختم کر سکے مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ حیدر علی اب سمجھ چکا تھا کہ میں
صبیحہ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش میں ہوں وہ جمال کی آمد کا مقصد بھی سمجھ چکا تھا۔ وہ
جانتا تھا کہ اگر صبیحہ کو حقیقت پتا چل گئی تو اس کی بنی بنائی ساکھ خراب ہو جائے گی۔ میں
نے جمال کے ہاتھ چمڑا ایسے دستاویزات بھیجے جو مجھے بے گناہ اور حیدر علی کو مجرم ثابت
کرنے کے لیے کافی تھے مگر یہاں جمال سے چوک ہو گئی۔ وہ پہلے بات چیت سے مسئلہ حل
کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ پہلے میری بیوی کے دل سے میری نفرت کم کرنے کی
ضرورت ہے تبھی وہ ان دستاویزات پر یقین کرتی۔ وہ متینا ایسا ہی کرتی مگر اس طرح
وقت کافی لگ گیا اور حیدر علی نے جو سو پر لٹک کر رہ گیا تھا، خود کو محفوظ کرنے کے لیے
اپنی سگی بسن کو قتل کرا دیا یعنی میری بیوی کو، اور الزام جمال کے اوپر رکھ دیا۔ سارے
شواہد جمال کے خلاف تھے۔ جمال کو وہاں سے بھاگنا پڑا اور اب وہ سیماں کا وارث بنا بیٹھا

ہے۔ سیماں کا نہیں بلکہ اس کی تمام جائیداد کا۔ اس نے دواؤں کی ایک فیکٹری کھولی ہے،
مسٹر اقبال اور مجھے یقین ہے کہ ہیروئن کا وہ مذموم کاروبار اسی فیکٹری کے تھرو کر رہا ہے۔
مگر کیسے اور اس کا طریقہ کار کیا ہے یہ میں اب تک معلوم نہیں کر سکا۔“ وہ خاموش ہو کر
مجھے دیکھنے لگا۔

”مسٹرزید یہ جمال صاحب کیا.....“

”ہاں..... وہ بالکل تم جیسا ہے۔“ مسٹرزید نے میری پوری بات سننے بغیر ہی
جواب دیا۔ مجھے اس کی ذہانت کی داد دینا پڑی۔ ”میں نے آپ کو یہاں اسی لیے بلوایا ہے
مسٹر اقبال کہ حیدر علی بہادر آپ میں اسی لیے دلچسپی لے رہا تھا وہ آپ کی ذہانت سے بھی
بہت متاثر ہے۔“

”مسٹرزید کیا مس سیماں جانتی ہیں کہ وہ کیا کاروبار کر رہا ہے، جیسے میں نے سنا ہے
کہ وہ خود بھی اس کاروبار میں شریک ہیں۔“

”غلط ہے یہ۔“ وہ یک بیک چیخ اٹھا مگر فوراً ہی اسے اپنے چیخنے کا احساس ہو گیا۔
”سوری مسٹر اقبال میں.....“

”کوئی بات نہیں مسٹرزید، میں آپ کی کیفیت کو سمجھ سکتا ہوں۔“ میں نے فوراً ہی
اس کی شرمندگی دور کر دی۔

”مسٹر اقبال یہ تو ممکن ہے کہ وہ نادانستگی میں ایسے جرائم میں ملوث ہو چکی ہو مگر
جان بوجھ کر وہ ایسا نہیں کر سکتی۔ وہ ابھی بہت چھوٹی ہے مسٹر اقبال، شی از اونی سیوشیتھ،
اتنی عمر میں اس کے اتنے بڑے کاروبار میں شرکت پر کوئی کیسے یقین کر سکتا ہے۔“

”ہوں..... آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“

”ہاں..... اب میں اس سوال کا جواب زیادہ آسانی سے دے سکتا ہوں۔ آپ کو
یہ تمام کہانی سنانے کا مقصد یہ تھا کہ آپ مجھ پر شک نہ کریں اور یہ جان جائیں کہ میں جو
کچھ بھی کرنا چاہتا ہوں۔ ایک باپ کی حیثیت سے کرنا چاہتا ہوں۔ مسٹر اقبال، آپ باپ
نہیں ہیں اس لیے میری کیفیت کو سمجھنے سے قاصر ہوں گے۔ مگر محبتوں کی کیفیت سے
ضرور واقف ہوں گے۔ میں نے صبیحہ کو کھویا اور تمام زندگی اس خلا کو پُر نہیں کر سکتا مگر

اب میں سیماس کو کھونا نہیں چاہتا۔ آپ اس سلسلے میں میری بھرپور مدد کر سکتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ حیدر علی نے سیماس سے آپ کے بارے میں کیا کہا ہو گا مگر میں یہ جانتا ہوں کہ وہ آپ کو استعمال کرنا چاہتا ہے۔“

تب میں نے اپنی اور سیماس کی اس ملاقات کے بارے میں اسے سب کچھ بتا دیا جب سیماس کھڑکی سے کود کر میرے کمرے میں آئی تھی اور اس نے مجھے میرے اصرار کے باوجود جمال کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ وہ اور زینی بڑے غور سے میری تمام باتیں سنتے رہے میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ میرا وہاں جانے کا پروگرام تھا مگر زاریہ کی حالت کی وجہ سے منسوخ کرنا پڑا۔

”گویا یہاں پھر ہم سے غلطی ہو گئی۔“ اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ اس کا لہجہ شکست خوردہ تھا۔

”مسٹر زید میں ابھی الجھن میں ہوں۔“

”کیوں؟“ وہ چونک اٹھا۔

”اس لیے کہ اس ساری داستان میں کہیں بھی بیگ صاحب یا فاریہ کا ذکر نہیں آیا پھر مس زینی کو وہاں بھیجنے اور زاریہ کو زخمی کرنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ بیگ صاحب کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟“

”ہاں..... آپ کی الجھن یقیناً صحیح ہے۔ میں بتاتا ہوں اصل میں بیگ صاحب اور حیدر علی بہت پرانے دوست تھے، کلاس فیلو بھی رہ چکے ہیں دونوں۔ اس معاملے میں ان دونوں کا ایک گہرا تعلق یہ ہے مسٹر اقبال کہ فاریہ کی یہ کوٹھی جس میں وہ لوگ اس وقت قیام پذیر ہیں، میرے سر کی بنوائی ہوئی ہے۔ انہی نے بہادر کے ہاتھ بیچا تھا اسے بلکہ اسے یہ کوٹھی خریدنے پر مجبور کیا تھا۔ یہ میں نہیں جانتا کہ کس طرح بیگ صاحب نے وہ کوٹھی خرید لی۔ میری معلومات کے مطابق اس مذموم کاروبار کے بہت سے ثبوت یہاں کسی خفیہ جگہ موجود ہیں۔ مرنے سے پہلے میرے سر مجھے اس بارے میں کچھ بتانا چاہتے تھے مگر فالج کے آخری حملے میں ان کی زبان بھی متاثر ہوئی اور دایاں ہاتھ بھی جس وقت انہوں نے مجھے کچھ بتانے کا فیصلہ کیا تھا اس وقت ان کی حالت بے حد خراب تھی پھر بھی انہوں نے مجھ سے اشاروں میں کاغذ اور قلم لانے کو کہا اور کرا خالی کروا دیا حتیٰ کہ

انہوں نے اپنی اکلوتی اور قیمتی بیٹی کی موجودگی کو بھی پسند نہ کیا تھا۔

میں نے کاغذ اور قلم انہیں دیا۔ انہوں نے اٹھے ہاتھ سے اس پر کچھ لکھنا چاہا مگر موت انہیں مہلت دینے کے لیے تیار نہ تھی۔ ان کے جسم کو جھٹکے لگ رہے تھے پھر بھی انہوں نے تین الفاظ ٹیڑھے میڑھے انداز میں لکھ ہی دیے وہ الفاظ تھے کوٹھی میں تیسرا کمر، تہ خانہ، کالا بکس۔

کوٹھی کے بارے میں میں نے پوچھا کہ ہماری کوٹھی؟ تب انہوں نے نفی میں سر ہلایا اور اسی وقت موت کے پنجے نے انہیں دبوچ لیا۔ وہ کاغذ آج تک اسی طرح میرے پاس موجود ہے۔ میں اسی وقت سے بیگ صاحب کی کوٹھی کے پیچھے پڑ گیا۔ میں نے کئی بار اس کوٹھی میں اپنے آدمی بھیجے مگر وہ کبھی کامیاب نہ ہو سکے۔ بہادر اور فاریہ کی خاصیت نے فاریہ کو الٹ کر دیا ہے اور وہ ایسی کسی بھی کارروائی کو بہادر سے منسوب کر دیتی ہے حالانکہ بہادر اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتا۔ میرے آدمی اس کوٹھی کے تمام کمرے چیک کر چکے ہیں۔ مگر زاریہ والا کمرہ ابھی تک چیک نہیں کیا گیا تھا۔ میں نے اپنے کچھ آدمی فاریہ کی فیکٹری میں بھی لگا دیے تھے جن میں سے ایک ادریس بھی تھا، لفٹ میں اور وہ ٹیکسی والا بھی میرا ہی آدمی تھا۔ جس نے عذرا کو نشہ آور مشروب پلا کر واپس گھر چھوڑ دیا تھا میں اس روز صرف اس کمرے میں تہ خانے کا راستہ تلاش کروانا چاہتا تھا۔ بکس نکالنا ابھی ضروری نہیں تھا کیوں کہ اس سے محفوظ جگہ کوئی دوسری نہیں ہو سکتی مگر زینی اس میں ناکام ہو گئی۔ وہ زاریہ کو بے ہوش سمجھ رہی تھی۔ اس نے تمام کمرے کو چیک کرنے کے بعد اس کے بیڈ کے نیچے جا کر چیک کرنا چاہا اسی وقت زاریہ اٹھ گئی اور اس سے پہلے کہ زاریہ جیتی زینی نے اس کے سر پر کوئی چیز دے ماری اور پھر وہ ناخوشگوار واقعہ ہو گیا جس کا مجھے اب تک دکھ ہے۔ ان لوگوں کو کسی بھی قسم کی تکلیف پہنچانا میرا مقصد نہیں تھا۔“

”یہ ایسی بات نہیں ہے مسٹر زید کہ آپ کو یہ طریقہ اختیار کرنا ضروری ہو۔ اس سلسلے میں اگر آپ فاریہ سے بات کرتے تو شاید آپ کا یہ مسئلہ بغیر کسی پریشانی کے حل ہو جاتا۔“

”یہ ممکن ہے بھی اور نہیں بھی، ویسے میں اس معاملے میں فاریہ کو ملوث کرنا بہتر

نہیں سمجھتا۔ بہادر پہلے ہی بیگ کا دشمن بنا ہوا ہے اور بیگ سے زیادہ اسے فاریہ سے خطرہ ہے کیوں کہ وہ اس کے لیے بہت نقصان دہ اور مشکل ثابت ہوئی ہے فاریہ نے اسے ناقابلِ بیان حد تک نقصان پہنچایا ہے۔ اس کی تفصیل میں آپ کو پھر کبھی بتاؤں گا، اس وقت مجھے بھوک محسوس ہو رہی ہے اور میرے خیال میں کافی وقت گزر چکا ہے یوں کہہ لیں کہ میں نے آپ کا کافی وقت ضائع کر دیا ہے مگر آپ کو اعتماد میں لینے کے لیے ضروری تھا کہ آپ کو حقیقت سے آگاہی ہو۔ اب میں آپ کی طرف سے کافی پُر امید ہوں مسٹر اقبال، اور میری خواہش ہے کہ آپ سیموں کو دوسرے طریقے سے پرکھیں، میں جانتا ہوں کہ بہادر نے اس کی پوزیشن کافی خراب کر دی ہے مگر وہ معصوم ہے مسٹر اقبال اور اسے صرف معصوم ثابت کرنے کے لیے آپ کو میرا ساتھ دینا ہو گا۔ اس کے بدلے آپ جو چاہیں گے وہ میں آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔ سیمیں میری اکلوتی بچی، میری محبت کی نشانی ہے، میرا اپنا خون ہے۔ اس کے سامنے میری تمام دولت اور دنیا کے تمام رشتے بچ ہیں۔“ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوا تو زینی اٹھ کھڑی ہوئی، اس نے انٹرکام پر کھانا لگانے کا حکم دیا۔

زید اس دوران میں پھر اٹھ کر ٹہلنے لگا تھا۔ اس کے چہرے پر گہری سوچ کے سائے لرزاں تھے، آنکھوں میں پھیلی محرومی کچھ اس شدت کی تھی کہ میں نے اسے اپنے اندر اور چاروں طرف بکھرتا محسوس کیا۔ قدرت مجھے انوکھے حالات میں ڈال رہی تھی ہر ہر مقام پر عجیب پراسراریت کا احساس ہوتا تھا۔ میں کہاں تھا اور کہاں پہنچ گیا تھا۔ اس بارے میں خود بھی حیرت زدہ تھا۔

کمرے میں چھائی ہوئی گہری خاموشی درد انگیز تھی۔ مسٹر زید کے ٹہلنے سے کوئی بھی آہٹ نہیں ہو رہی تھی کیوں کہ ان کے پیروں تلے دبیز قالین تھا۔

زینی خاموش نگاہوں سے کبھی مجھے اور کبھی زید کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا کردار اب بھی پراسراریت لیے ہوئے تھا میں نہیں جانتا تھا کہ اس کا زید سے کیا رشتہ ہے، نہ ہی اس بارے میں زید نے کچھ بتایا تھا۔ وقت بہت زیادہ گزر چکا تھا اور حالات بتا رہے تھے کہ داستان بہت زیادہ طویل ہے۔ میں بھی نہیں جانتا تھا کہ جمال اب کہاں ہے، زید کیا کرتا ہے۔ اس کے پاس اتنی بے تحاشہ دولت کہاں سے آئی ہے کہ وہ محل نما اس کو بھی میں

رہ رہا ہے، وہ اتنے بہت سے ملازموں کو کس طرح پال رہا ہے اور یہ کہ وہ مجھ سے اب کیا چاہتا ہے۔ ویسے یہ اندازہ تو مجھے ہو گیا تھا کہ وہ بھی میرے بہادر کے پاس چلے جانے کا خواہش مند ہے، اس طرح وہ سیموں کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ دوسری طرف وہ مجھ سے فاریہ کی کوٹھی میں موجود تہہ خانے کا پتا بھی معلوم کرنا چاہتا ہے۔ جس کے بارے میں میں اب تک نہیں جانتا تھا مگر ان تمام باتوں کے لیے وہ کون سا طریقہ اختیار کرے گا اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔

ہم سب اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے، اسی طرح تقریباً پندرہ منٹ گزر گئے۔ انٹرکام کی آواز پہلے ہم تینوں ہی چونک اٹھے۔ زینی نے انٹرکام اٹھایا اور کچھ سن کر رکھ دیا۔

”سٹرکھانا لگ گیا ہے۔“

”آئیے مسٹر اقبال۔“ زید نے مجھ سے کہا اور بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ میرے اور پھر زینی کے باہر آنے تک یونہی دروازہ کھولے کھڑا رہا۔ اس کے اخلاق نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ اس کے بارے میں میری پہلی رائے بہت غلط تھی۔ میں اسے پاگل یا نفسیاتی مریض سمجھا تھا مگر اب وہ مجھے بے حد سلیکھا ہوا اور کلچرڈ لگا تھا۔

ہم ایک دوسرے کے پیچھے چلتے ہوئے اس کمرے میں آ گئے جسے ڈائننگ روم کہا جاتا تھا۔ میں اب آپ کو اس کمرے کی تفصیل نہیں بتاؤں گا صرف اتنا کہ آج جو کچھ میں دیکھ رہا تھا وہ شاید زندگی بھر دوبارہ نہ دیکھ سکوں۔ فحاشی کی بہترین مثال تھا یہ محل اور یہاں کی معمولی سے معمولی چیز بھی اتنی قیمتی محسوس ہوتی تھی کہ بیان نہیں کر سکتا۔ ڈائننگ ٹیبل، برتن، پیچھے، گل دان دیواروں پر لگی پینٹنگز سبھی کچھ نوادرات میں شامل کی جاسکتی تھیں۔

ہم لوگ خاموشی سے کھانا کھاتے رہے کھانے کے بعد ہم نے گرم گرم چائے پی۔ چائے کے دوران میں زید کا موڈ بڑا خوشگوار تھا۔ وہ موضوع سے ہٹ کر اپنی سیاحت کے بارے میں بتاتا رہا۔ مختلف قوموں کے کلچر اور عادات پر تبصرہ کرتا رہا۔ اس نے بہت ہلکی پھلکی گفتگو کر کے ہمارے اعصابی تناؤ کو کم کر دیا تھا۔ یہ اس کی بہترین خوبی اور مہارت تھی۔ اس روز مجھے اندازہ ہوا کہ سونے سے پہلے انسان کس طرح خود کو ایک خوشگوار نیند کے لیے تیار کر سکتا ہے۔ ہم بہت دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اٹھ گئے۔ مسٹر زید نے

تھکن ظاہر کی اور مجھ سے اگلے روز ملنے کا وعدہ کیا۔ میں کھڑا ہو گیا مس زینی نے میرے کمرے تک میرا ساتھ دیا اور پھر شب خیر کہہ کر چلی گئیں۔

گوکہ مسٹر زید نے مجھے بڑا پرسکون کر دیا تھا مگر اس کی تمام داستان میرے ذہن میں گونج رہی تھی۔ میں نے سیلینگ سوٹ پہنا اور نرم و ملائم بستر پر لیٹ گیا۔ میں کیوں کہ دن میں کافی دیر سوچا تھا اس لیے نیند کا نہیں پتا نہیں تھا۔ اب میں نے مسٹر زید کی سلائی ہوئی داستان ذہن میں دہرانا شروع کر دی۔ میں اس داستان میں کہیں جھول تلاش کر رہا تھا جس سے میں داستان کی حقیقت یا جھوٹ ہونے کا اندازہ کر سکتا مگر بڑی باریک بینی کے باوجود مجھے کہیں جھول نظر نہ آیا اور تمام داستان حقیقت پر مبنی معلوم ہوئی۔ یہ داستان بھی پچھلے تمام حالات کی طرح پراسرار ضرور تھی اور ابھی تک بہت سی باتیں اور بہت سے سوال ایسے تھے جو جواب طلب تھے۔ مجھے یقین تھا کہ مسٹر زید سے دوسری تفصیلی ملاقات میں ان سوالوں کے جواب بھی مل جائیں گے۔

اب میں نے تمام باتوں کو ذہن سے جھٹک دیا اور فاریہ وغیرہ کے متعلق سوچنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ وہ لوگ میری وجہ سے بہت پریشان ہو چکے ہوں گے۔ مسٹر زید نے مجھے فون کرنے کی اجازت دے دی تھی مگر ابھی میں اس سلسلے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ مجھے مسٹر زید کی شخصیت کو ظاہر کرنا ہے یا نہیں۔

بہر حال مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ کچھ سوچنے کے بعد میں نے علی الصبح فون کرنے کا فیصلہ کر لیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ رات کے کسی پر مجھے نیند آگئی۔ بہت دیر سے سونے کی وجہ سے میں علی الصبح نہ اٹھ سکا۔ میری آنکھ کھلی تو پونے گیارہ بجے تھے۔ میں نے انٹرکام پر بجو کو چائے لانے کو کہا۔

کچھ دیر بعد بجو ناشتے کی ٹرے لیے آگیا۔

”مسٹر زید کہاں ہیں؟“ میں نے توس پر مکھن لگاتے ہوئے پوچھا۔

”وہ اسلام آباد جا چکے ہیں، رات کی فلائٹ سے واپس آ جائیں گے۔“ اس نے

مذہبانہ جواب دیا۔

”اور مس زینی.....؟“

”وہ یہیں ہیں اور آپ کے ناشتے سے فارغ ہونے کا انتظار کر رہی ہیں۔“

”اوہ..... ٹھیک ہے تم جاؤ۔ میں آدھے گھنٹے بعد ان سے ملاقات کروں گا۔“

”آپ تیار ہو جائیں تو مجھے بتا دیجئے گا، میں آپ کو لینے آ جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔ وہ ذرا سا جھکا پھر باہر چلا گیا اور میں ناشتے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

ٹھیک آدھے گھنٹے میں، میں تیار ہو چکا تھا۔ میں نے انٹرکام پر بجو کو بتایا۔ وہ چند لمحوں بعد مجھے لینے آگیا۔ ہم ایک دوسرے کے پیچھے چلتے ہوئے اسی کمرے میں آ گئے جہاں کل مسٹر زید اور مس زینی سے ملا تھا۔ مس زینی اس وقت ڈھیلی سی پینٹ اور ڈھیلی سی قمیض میں لبوس تھی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے۔ میک اپ سے پاک چہرے پر بے پناہ تازگی اور بلا کی معصومیت تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی۔ ”آئیے مسٹر اقبال۔“

”کیسی ہیں آپ؟“

”جسٹ فائن، آپ کیسے ہیں؟“

”بہترین، مس زینی آپ کے بارے میں تجسس ابھی تک برقرار ہے۔ ویسے آپ بتائیں گی کہ اُس روز آپ میڈیکل اسٹور پر کیا کر رہی تھیں؟“

”آپ نے مجھے پہچان لیا تھا کیا؟ آپ نے تو مجھے نہیں دیکھا تھا پھر آپ کیسے جان گئے کہ میں وہی ہوں جس نے مس زاریہ کو زخمی کیا ہے۔“

”آپ کی شہادت کی انگلی کی وجہ سے۔“

”اوہ..... یہ انگلی میرے لیے خطرناک بھی ہو سکتی ہے، اچھا ہوا آپ نے بتا دیا آئندہ میں اس بارے میں خیال رکھوں گی ویسے انگلی کے بارے میں کیسے پتا چلا تھا آپ کو؟“

”حمیدہ بی بی نے بتایا تھا۔ آپ نے غالباً اس سے پانی مانگا تھا۔ تبھی اس کی نگاہ آپ کی انگلی پر پڑی تھی اور جب ہم نے اس سے آپ کی کوئی نشانی اور حلیہ پوچھا تو اس نے بتایا کہ.....“

”خیر مسٹر اقبال، زاریہ کے سلسلے میں مسٹر زید تو معذرت کر رہی چکے ہیں، میں ذاتی طور پر بھی معذرت چاہتی ہوں۔ زاریہ جب تک اسپتال میں رہی میں اس کی خیریت معلوم کرنے جاتی رہی اور..... اسے بعض ممکنہ خطرات سے بھی بچایا ورنہ.....“

تمام نفاست ان کے ذوق کی آئینہ دار ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ان کی زندگی میں کسی چیز کی کمی نہیں مگر وہ اپنی بیوی اور بیٹی کو بہت مس کرتے ہیں۔ ان کی زندگی میں اگر کوئی دکھ ہے تو وہ بیوی کی جدائی کا اور بیٹی کی دوری کا۔ وہ ہر قیمت پر اپنی بیٹی کو حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے منہ مانگی قیمت دینے کو تیار ہیں۔ زینی جب تک وہاں بیٹھی رہی مسٹر زید کے کردار کے ہر پہلو پر باتیں کرتی رہی۔ اس نے ان کے ہر پہلو کی تعریف کی اور انہیں ایک عظیم شخصیت کے روپ میں پیش کیا۔

تین بجے کے قریب وہ کسی کام سے چلی گئی اور میں اٹھ کر اس کے ساتھ باہر آ گیا۔ یہ کوٹھی سے باہر کا حصہ تھا یہاں آکر میں حیرت زدہ رہ گیا کیونکہ باہر سے یہ کوٹھی کوئی قدیم عمارت لگتی تھی اور اس کوٹھی کی پیشانی پر سیمنٹ سے ابھرا ہوا انیس سو پینتیس لکھا ہوا تھا۔ میں جس جگہ کھڑا تھا وہاں سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر کوٹھی کا مین گیٹ تھا اور باہر سے گزرنے والی ٹریفک کا شور یہاں تک سنائی دے رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ کوٹھی شہر کی مصروف سڑک پر واقع تھی۔ گیٹ اور کوٹھی کے اس اندرونی دروازے کے درمیان سرخ رنگ کی بجری سے روش بنائی گئی تھی۔ روش کے دونوں اطراف میں خوب صورت پھول اور پودے لگے ہوئے تھے۔ دائیں جانب سرورٹ کوارٹر تھا اور بائیں جانب خوب صورت لان جس کے درمیان ایک پرانی طرز کا فوارہ بنا ہوا تھا۔ یہ فوارہ ایک حوض کے نیچوں بیچ تھا اور حوض شفاف پانی سے بھرا ہوا تھا۔ لان میں بھی خوب صورت پھول اور پودے لگے ہوئے تھے۔ میں ٹہکتا ہوا لان میں آ گیا، جہاں کونے میں ایک بڑی خوب صورت اور رنگ برنگی چھتری ایک لمبے بانس پر ٹکی ہوئی تھی۔ اس چھتری کے نیچے رنگین کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ان کرسیوں کے تین اطراف گلاب کے بڑے بڑے پھول مک رہے تھے۔ پھولوں کی خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔

میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ موسم بے حد خوب صورت تھا۔ دھوپ کی کرنیں ترچھی ہو چکی تھیں۔ میں یہاں بیٹھ کر گیٹ سے لے کر کوٹھی کے سامنے والے حصے تک دیکھ سکتا تھا۔ کوٹھی باہر سے کافی شکستہ لگ رہی تھی۔ باہر کی دیواروں کو نہ پلستر کرایا گیا تھا اور نہ ہی رنگ کیا گیا تھا۔ قدیم اور جدید کا یہ امتزاج عجیب پراسرار سا تھا۔ میں کچھ دیر آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا پھر میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی سوا پانچ بجے تھے۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

”ممکن خطرات.....؟“

”ڈاکٹر زیدی..... وہ اس کے لیے خطرناک تھا۔ ہمارے اسے ہدایت کی تھی کہ وہ کسی بھی طرح زاریہ کو ختم کر دے۔“

تب مجھے عذرا کا وہ خط یاد آ گیا جو اس نے جانے کے دوسرے روز ہی میری گاڑی میں اس وقت پہنچا دیا تھا جب میں بیگ صاحب کی دوا لینے میڈیکل اسٹور پر گیا تھا۔ اس میں اس نے زاریہ کو مسٹر زیدی سے بچانے کی ہدایت کی تھی۔

”شکریہ مس زینی.....“

”مجھے اس کی حفاظت کا حکم دیا گیا تھا مسٹر اقبال، ایسا کر کے میں نے اپنے جرم کا ازالہ کیا ہے، اس میں شکریہ کی بات نہیں۔“ یہ کہہ کر زینی نے چائے منگوائی اور ہم چائے پینے لگے۔

”مس زینی آپ کے بارے میں میرا ذہن الجھا ہوا ہے۔“

”سوری مسٹر اقبال، میں مسٹر زید کی اجازت کے بغیر کچھ بھی نہیں کہہ سکتی۔ ویسے آپ میرے لیے اپنے ذہن میں کوئی الجھن نہ رکھیں اور صرف اتنا سن لیں کہ میں مسٹر زید کا بہت احترام کرتی ہوں، اپنے کسی بھی بزرگ سے بڑھ کر، اس احترام میں محبت بھی شامل ہے، ویسی ہی محبت جیسی کوئی لڑکی اپنے باپ یا بڑے بھائی سے کر سکتی ہے۔ میری عزت کی زندگی انہی کی مرہون منت ہے۔ میں ان کی خاطر بڑے سے بڑے خطرے میں بھی کود سکتی ہوں۔“ ایسا کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھللاہٹ محسوس ہوئی اور میں سوچتا رہ گیا کہ اس کے ماں باپ یا بہن بھائی کہاں ہیں اور وہ کیوں مسٹر زید کی احسان مند ہے مگر وہ کسی بھی سوال کا جواب دینے سے معذرت کر چکی تھی۔ اس لیے اس سے کچھ پوچھنا بیکار تھا۔

اسی کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا کہ مسٹر زید ایک اہم میننگ میں اسلام آباد گئے ہیں اور رات واپس آ جائیں گے۔ میننگ کی اہمیت پر اس نے کوئی روشنی نہ ڈالی۔ ظاہر ہے کہ وہ یہ باتیں مجھ سے نہیں کرتی۔ میں نے بھی پوچھنا مناسب نہ سمجھا، ہم کچھ دیر وہاں بیٹھے باتیں کرتے رہے جو زیادہ تر کوٹھی کی نفاست اور خوب صورتی سے متعلق تھیں۔ زینی نے بتایا کہ مسٹر زید خوب صورت اور نادر چیزوں سے عشق کرتے ہیں۔ کوٹھی کی

یہ حیرت انگیز بات تھی کہ اس دوران میں مجھے کوئی ذی روح نظر نہ آیا تھا۔ گویا مسٹر زید نے سچ کہا تھا کہ اگر میں فرار ہونا چاہتا تو بغیر کسی مشکل کے فرار ہو سکتا تھا۔ یہاں دور دور تک کوئی نہ تھا جو میری راہ میں رکاوٹ بننا مگر حالات کو اس موڑ پر چھوڑ کر میرا فرار ہو جانا قطعی غیر مناسب تھا۔ البتہ میں فاریہ کو اپنی خیریت سے مطلع کرنا چاہتا تھا اور ان لوگوں کی خیریت معلوم کرنے کے لیے بے چین تھا۔ صبح تو میں فون نہیں کر سکا تھا مگر اب وقت ہو گیا تھا کہ مجھے فاریہ گھر پر مل سکتی تھی۔ یہ خیال آتے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اندر داخل ہوا اور ریڈور خالی تھا میں اندازے سے بڑھتا چلا گیا۔ نہ معلوم میں غلط جگہ آ گیا تھا مجھے اپنے کمرے کی پہچان نہیں تھی۔ میں نے جس کمرے کے دروازے کو دھکا دیا وہ لاک تھا۔ پھر میں نے اس کوریڈور کے تمام دروازوں کو کھولنا چاہا مگر سب کے سب لاک تھے اور سب ایک ہی جیسے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ نہ معلوم کیا بات تھی کہ مجھ پر خوف سا طاری ہو گیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے مجھے لوہے کے حصار میں قید کر دیا ہو۔ میں گھبرا کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ میرا خیال تھا یہ بھی لاک ہو گا مگر اس وقت مجھ میں اطمینان پھیل گیا جب وہ دروازہ کھلتا چلا گیا اور میں نے خود کو اسی لان کے سامنے کھڑا پایا جہاں میں کچھ دیر پہلے موجود تھا۔ میں نے کھلی فضا میں گہرے گہرے سانس لیے اور وہیں بیٹھ بیٹھ گیا۔ اب میں نے سوچا کہ جس کوریڈور میں چند لمحوں پہلے میں تھا وہ کوریڈور نہ تھا جس سے میں زینی کے ساتھ باہر آیا تھا کیونکہ اس کوریڈور میں کئی چیزیں ایسی تھیں جو کچھ اسی کوریڈور میں تھیں۔ مثلاً وہ کالا اور سنہری رنگ کا بڑا سا گلدان جس میں سرخ گلاب کے پھول لگے ہوئے تھے۔ وہ کارز ٹیبل جس پر میں نے فون رکھا دیکھا تھا۔ وہ خوب صورت تصویر جس میں ایک حسین عورت مسکرا رہی تھی کچھ بھی وہاں نہ تھا۔ میں عجیب محضے میں تھا کہ اچانک کوٹھی کا دروازہ کھلا اور جگو ٹرے میں چائے کے برتن لیے باہر آ گیا۔ ”سر میں آپ کی چائے یہیں لے آیا۔“

”اوہ جگو..... یہ کیا اسرار ہے؟ میں نے اپنے کمرے میں جانا چاہا تھا مگر.....“ اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھیں میں کھوج تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے کہ یہ سب مجھے نہیں کہنا چاہیے تھا۔

”مگر کیا ہوا؟“ اس نے کریدنے والی نگاہوں سے مجھ دیکھا۔ اس وقت اس کا لہجہ

بہت مختلف تھا۔

”مگر یہ کہ..... یہ دروازہ جو تم کھول کر آئے ہو..... یہ بند تھا۔ میں نے بہت کوشش کی دروازہ کھل جائے مگر نہیں کھلا، تھک ہار کر میں یہیں بیٹھ بیٹھ گیا۔“ میں نے بات بدل دی اور یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ میں پوری کوریڈور گھوم کر آیا ہوں۔

”آپ چائے یہیں پیئیں گے یا.....؟“ وہ منسوب ہو چکا تھا۔

میرے ذہن میں کہیں دور گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔ چھٹی جس کسی خطرے کی طرف اشارہ کر رہی تھی، وہ کیا خطرہ یا کیا بات تھی میں نہیں سمجھ سکا۔

”اندر کمرے میں، مجھے لاہور فون کرنا ہے۔“ میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”تشریف لائیے۔“ اس نے کہا اور اسی دروازے کی طرف پلٹ گیا۔ اس نے دروازے کا دایاں پٹ کھولا اور میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ میرا جانا پہچانا کوریڈور تھا۔ وہی کالا اور سنہری گلدان، وہی اس میں لگے ہوئے سرخ گلاب، مسکراتی ہوئی حسین عورت کی تصویر دیکھ کر تو مجھے یوں لگا تھا جیسے وہ میری حیرت اور بے وقوفی پر ہنس رہی ہو۔ چند قدم پلٹنے کے بعد وہ کارز ٹیبل بھی نظر آ گئی جس پر فون رکھا تھا۔ جگو آگے آگے تھا اور میں پیچھے پیچھے۔ اسی طرح چلتے ہوئے ہم دائیں جانب کے تیسرے دروازے پر رک گئے جو برے اندازے کے مطابق میرا کمرہ تھا۔

جگو کے ہاتھ میں چائے کی ٹرے تھی اس لیے میں نے بڑھ کر دروازہ کا ہینڈل گھمایا۔ دروازہ کھلتا چلا گیا۔ مجھے حیرت کے دورے پڑ رہے تھے مگر میں نے کمال مہارت سے دوکانر مل کیا ہوا تھا۔ جگو نے سائیڈ ٹیبل پر چائے کی ٹرے رکھ دی اور ہاتھ باندھ کر دب کھڑا ہو گیا۔

”ٹھیک ہے تم جاؤ۔“ میں نے اس سے نگاہیں چراتے ہوئے کہا۔ مبادا وہ میری نگاہوں میں بھری حیرت کو نہ دیکھ لے۔

وہ خفیف سا جھکا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ میں نے مزید حیرت زدہ ہونے کی بجائے یہ کافون نمبر ملایا مگر کوئی ٹیل نہ ہوئی میں نے پھر کوشش کی..... پھر کی مگر جانے کیا نہ تھی کہ نمبر ملانے کے بعد کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔

میں نے انٹرکام پر جگو کو بلوایا۔ چند منٹ بعد ہی وہ آگیا۔ میں نے اسے بتایا کہ فو غالباً خراب ہے۔ وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ اس نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھ سے ریسیور لے لیا اور مجھ سے نمبر پوچھ کر ڈائل کیا پھر ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ میں نے اشارے سے اسے جانے کو کہا اور خود فون کی طرف متوجہ کیا۔

دوسری جانب سے فون اٹھانے والا سلطان تھا جسے میں نے فوراً ہی پہچان گیا۔ ”سلطان میں بالا بول رہا ہوں۔“

”بالے..... تو..... تو کہاں چلا گیا بالے..... کہاں سے بول رہا ہے۔ ہم تجھے ڈھونڈ ڈھونڈ کر پاگل ہو گئے۔ مس فاریہ بہت پریشان ہیں بالے۔ سوہنی، بیگ صاحب، ماسی اور میں..... سب بہت پریشان ہیں، تو کہاں سے بول رہا ہے، تو کیوں؟ کیا تھا بالے، کہاں ہے تو.....؟“ وہ ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا۔

”سلطان میری بات تو سن یا تو ہی بولتا رہے گا۔“ میں نے کما گھر شاید دوسری طرف سے ریسیور فاریہ نے لے لیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے فاریہ کی آواز آئی۔

”اقبال.....؟“

”لیس میڈم.....“ میں فوراً مودوب ہو گیا۔

”تم کہاں چلے گئے اقبال.....؟“ وہ روہانسی ہو گئی۔

”میڈم سوری..... مجھے بغیر بتائے آنا پڑا.....“

”کہاں..... کہاں آنا پڑا؟“ اس نے فوراً ہی میری بات کاٹ دی۔

”میں کراچی سے بول رہا ہوں۔“

”کراچی سے..... مگر..... کیوں اقبال۔ سنو۔ کیا تمہارے قریب کوئی ہے۔“

”تم کسی کے دباؤ میں ہو؟“

”نہیں میڈم ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ میری پوری بات سنیں تو بتاؤں۔“

”ہاں بولو۔“

”میڈم آپ کو یاد ہے کہ سیماں نے مجھے جمال کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ پہلی مرتبہ جب

وہ آپ کے گھر آئی تھیں۔“

”ہاں..... آں یاد آیا..... تو پھر؟“

”میں اسی جمال کے پیچھے یہاں تک پہنچ گیا ہوں۔ سیماں اس وقت کراچی میں اسی جمال کے ساتھ ہے اور میں ان دونوں کے پیچھے۔ بہر حال آپ کو فون کرنے کا مقصد صرف اپنی خیریت بتانا اور آپ لوگوں کی خیریت معلوم کرنا تھا۔ تفصیل میں آکر بتاؤں گا کافی الحال یہ بتائیے کہ سوہنی اور زاریہ کیسی ہیں؟“

”وہ اب بالکل ٹھیک ہیں اقبال، زاریہ تو بالکل ہی ٹھیک ہے، اب تو بات چیت کر لیتی ہے مگر سوہنی تمہارے جانے کے بعد سے بہت پریشان تھی۔ اس وقت تو میرے سامنے بیٹھی مسکرا رہی ہے، اقبال تم تو خوش قسمت ہو کہ تمہارے اتنے بہت سے چاہنے والے موجود ہیں۔ تم واپس کب آرہے ہو، اور تمہارے پاس پیسے ہیں؟“

”آپ فکر نہ کریں۔ مجھے کوئی پریشانی نہیں۔ میں بہت جلد واپس آؤں گا۔ اپنا اور سب کا خیال رکھئے گا میڈم۔“

”ہاں اور سنو، جلدی آنا، جب تک نہیں آؤ گے ہم پریشان رہیں گے۔“

”آپ پریشان نہ ہوں میڈم میں جلد واپس آؤں گا، اوکے سی یو.....“

”سی یو اقبال گڈ بائے۔“ یہ کہہ کر اس نے ٹیلی فون بند کر دیا۔ میں چند لمحے یونیورسٹی پر بیٹھا رہا۔ بیٹھا رہا گیا پھر میں نے ایک لمبی سانس لے کر ریسیور کریڈل پر رکھا ہی تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور مسٹر زید تالی بجاتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

”گڈ..... ویری گڈ، آپ بہت انٹیلی جنٹ ہیں مسٹر اقبال۔“

میں اسے یہاں دیکھ کر حیران ہو گیا میری اطلاع کے مطابق اسے رات کو واپس آنا تھا جبکہ اس وقت چھ بج کر پندرہ منٹ ہو رہے تھے۔ دوسری حیرت مجھے یہ تھی کہ اس نے ہماری بات چیت کیسے سنی۔ وہ ابھی میرے سامنے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ میں کھڑا ہو گیا۔

”بیٹھے بیٹھے.....“ اس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے دوبارہ بٹھا دیا۔

”یہ سن کر خوشی ہوئی کہ زاریہ اب بالکل ٹھیک ہے۔“

”شکریہ مسٹر زید، ویسے مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ اسلام آباد گئے ہیں اور رات کی

فلائٹ سے آئیں گے۔“

”آپ سے ٹھیک کہا گیا تھا البتہ میرا پروگرام تبدیل ہو گیا اور میں رات سے پہلے ہی آگیا۔ کیا آپ کو میرے جلد آ جانے پر کوئی اعتراض ہے؟“ اس نے بڑی رازداری سے پوچھا اور میں بے ساختہ ہنس پڑا، اس کا انداز کچھ اتنا ہی مضحکہ خیز تھا۔

”اوہ..... آپ ہنس بھی لیتے ہیں..... چلئے آپ بنے تو.....“ اس نے خوشگوار موز میں کہا پھر یک لخت سنجیدہ ہو گیا۔ ”آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟“

”نہیں مسٹر زید، میں نے اتنی انوکھی میزبانی نہیں اور نہیں دیکھی۔“
”شکریہ مسٹر اقبال، مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے ابھی تک دوپہر کا کھانا نہیں کھایا۔“

”اوہ سچ..... میں تو بھول ہی گیا تھا۔ ویسے بھوک بھی محسوس نہیں ہوئی۔“
”اچھا..... ورنہ میں تو ڈر گیا تھا کہ شاید آپ ناراض ہو گئے یا کچھ آپ کے ساتھ غلط ہو گیا۔“

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔“
”تو پھر چلیں؟“
”کہاں؟“

”کھانا کھانے، مجھے بھوک لگی ہے اور جب آپ ڈائننگ روم میں جائیں گے تو یقیناً آپ کو بھی بھوک محسوس ہونے لگے گی۔“

”ضرور!“ میں نے مسکرا کر جواب دیا اور کھڑا ہو گیا۔ ہم پھر اس کوریڈور سے ہوتے ہوئے ڈائننگ روم میں آ گئے۔ اس بار میں نے کوریڈور کے اس دروازے کو بہت غور سے دیکھا جو باہر کی طرف کھلتا تھا۔ کوریڈور کی ایک ایک چیز میں نے ذہن نشین کرنی تھی۔ ہم کچھ ہی دیر بعد ڈائننگ روم میں پہنچ گئے اور زید نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ وہاں پہنچ کر مجھے بھوک لگنے لگے گی۔ مختلف کھانوں سے اٹھتی ہوئی لذت انگیز خوشبو نے میری بھوک چکا دی اور میں زید کے بیٹھنے کے بعد ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

ہم کھانے کے دوران میں خاموش رہے مگر کھانا ختم ہوتے ہی زید نے کہا۔ ”ہاں تو مسٹر اقبال اب آپ اپنے بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گے؟“
”کیوں نہیں۔“ میں نے کہا پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد میں نے اپنی داستان

شروع کر دی۔ گاؤں سے شروع ہونے والے مظالم کی داستان سناتے سناتے میری آواز بھرا گئی۔ حلق نمکین ہو گیا مگر میں نے خود پر قابو پائے رکھا۔ وہ بڑی توجہ سے میری کہانی سن رہا تھا۔ راجہ کے ذکر پر وہ لمحہ بھر کو چونکا تھا یا شاید مجھے دھوکا ہوا تھا بہر حال اس دوران میں زید نے مجھے ٹوکا نہیں بلکہ گہری خاموشی اور دلچسپی کے ساتھ سب کچھ سنتا رہا۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد میری داستان یہاں آ کر ختم ہو گئی کہ ”راجہ نے میری ملاقات بیگ صاحب سے کروائی اور پھر اس کے بعد کی تمام باتیں آپ جانتے ہی ہوں گے۔“

”ہوں.....“ ویری سیڈ، دنیا میں کتنے ظالم لوگ ہیں مسٹر اقبال جو رشتوں کی نزاکت اور جدائی کے جان لیوا عذاب سے نادا قف ہیں۔ شاید اس لئے کہ ان سے کبھی ان کا کوئی عزیز نہیں بچھڑا۔ ان لوگوں سے تمام رشتے چھین لینا چاہئیں مسٹر اقبال! مثلاً چودھری سے راجو یا..... راجو سے اس کا بیٹا اور حیدر علی بہادر سے اس کا بیٹا یا پھر.....“ ایسا کہتے ہوئے وہ انتہائی سفاک ہو گیا اور شاید اسے خود ہی اپنے لہجے کی سفاکی کا احساس ہوا تھا اسی لیے وہ چپ ہو گیا۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر اپنے چہرے پر پھیرا اور انٹرکام پر جگو سے چائے کے لیے کہہ کر اپنی کرسی پر واپس آ گیا۔ اس نے حسبِ عادت سگریٹ کیس نکال کر ایک سگریٹ مجھے دے دیا اور دوسرا خود سلا کر دھوئیں کے مرغولے بنانے لگا۔

”مسٹر زید گو آپ کی میزبانی میرے لیے باعثِ فخر ہے مگر میرے لیے بھی کچھ کام ہیں۔ میں جلد از جلد یہاں سے جانا چاہتا ہوں اگر آپ اجازت دیں تو.....“

”کیوں نہیں مسٹر اقبال، بس میری ایک درخواست ہے کہ سیمائے بے قصور اور معصوم ہے اس کا خیال رکھئے گا اور دوسری درخواست یہ ہے کہ اگر آپ اس کو ٹھکی میں تہ خانہ تلاش کر کے مجھے اس کا نقشہ فراہم کر سکیں تو نوازش ہو گی، اس کے بدلے میں آپ جو چاہیں میں پیش کر سکتا ہوں۔“

”شکریہ مسٹر زید، اول تو مادی چیزیں میرے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتیں شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ہماری پرورش میں جذباتوں، رشتوں اور محبتوں کے سوا کسی چیز کو اہمیت نہیں دی جاتی دوسری بات یہ کہ اگر سیمائے بے قصور ہے تو اور نہیں ہے تو، ہم دونوں صورتوں میں اسے نقصان پہنچانا نہیں چاہتے، فاریہ کا مشن صرف اس مذموم کاروبار کا

خاتمہ ہے اور شاید یہی آپ بھی چاہتے ہیں۔“

”یقیناً مسٹر اقبال“ ویسے میں ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں، اگر کہیں آپ کو میری ضرورت ہو تو ضرور بتائیے گا۔ ویسے اس بکس میں آپ کی دلچسپی بیکار ہوگی کیونکہ اس بکس میں میرے اور جمال کے بے گناہ ہونے کے ثبوت ہیں جو یقیناً آپ کے کام کے نہیں ہوں گے۔ اگر اس میں بہادر کے اس زہریلے کاروبار سے متعلق کچھ ہوا تو میں خود ہی رضا کارانہ طور پر آپ کو پیش کر دوں گا۔“

”شکریہ“ آپ کسی خدشے کو ذہن میں جگہ نہ دیں، میں جو کام بھی کرتا ہوں پوری دیانت داری سے کرتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے“ آپ کو ایک اچھے دوست کی حیثیت سے میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ یہ میرا کارڈ ہے، اس میں فون نمبر لکھا ہوا ہے کوئی کام کی بات معلوم ہو تو آپ رات میں کسی بھی وقت مجھ سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں، جب بھی آپ جانا چاہیں میں انتظام کرادوں گا۔“

”میں کل ہی جانا چاہتا ہوں۔“

”اوکے“ کل آپ کو پہلی فلائٹ کی ٹکٹ مل جائے گی اور آپ کو جگوائیر پورٹ تک چھوڑ آئے گا۔ میں شاید صبح آپ سے نہ مل سکوں بلکہ ممکن ہے اس وقت کے بعد آپ سے میری ملاقات نہ ہو پائے۔ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے، ویش یو گڈ لک۔“ اس نے اپنا ملائم ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا، اس کی گرفت دوستانہ تھی اور اس میں گرم جوشی بھی تھی۔ میں اس سے رخصت ہو کر کمرے میں آگیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بھی میں نے کوریڈور کو گہری نظروں سے دیکھا تھا۔ کمرے میں آکر میں نے کپڑے بدلنے اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ گو یہ سونے کا وقت نہیں تھا مگر میرے ذہن میں جو کچھ تھا اس پر عمل کرنے کے لیے میں اس وقت جی بھر کر سولینا چاہتا تھا۔

بہت جلد میں گہری نیند میں ڈوب گیا۔ گہری نیند میں جانے سے شاید لمحہ بھر پہلے میں نے اپنے چاروں طرف ہلکی موسیقی کی آواز سنی جس نے مجھے جگانے کی بجائے نیند میں پھنسا دیا اور گہری نیند کے باوجود میرا ذہن محض غنودہ حالت میں تھا اور مجھے یوں لگ رہا تھا

جیسے بیکراں سمندر کی موجیں میرے بالکل قریب آتی جا رہی ہوں اور جیسے ہر قریب آنے والی موج میرے ذہن سے ٹکرا کر ایک عجیب سی سنسنی مجھ میں اتار رہی ہو۔ ان موجوں کے دوش پر ایک سرگوشی آتی محسوس ہوتی تھی اور پھر جیسے وہ سرگوشی قطرہ قطرہ کر کے میرے وجود میں اترتی جاتی تھی۔

یہ ایک عجیب سی کیفیت تھی، میرا تمام جسم بے حس و حرکت تھا مگر ذہن کو جیسے کوئی دھجے دھجے لہجے سے جگائے ہوئے تھا۔ نہ معلوم یہ کیفیت کتنی دیر تک رہی مگر پھر یہ کیفیت نہ رہی اور مجھے بالکل کچھ بھی ہوش نہ رہا۔ جب میری آنکھ کھلی تو رات کے سوا دس بج رہے تھے۔ کمرہ بھینی بھینی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ ذہن بالکل خالی تھا، کچھ ایسی کیفیت تھی جیسے میں نے دنیا میں پہلی بار آنکھ کھولی ہو۔ میں کچھ دیر یونہی لیٹا رہا پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

اسی وقت دروازے پر ہلکی دستک ہوئی اور میرے جواب دینے سے پہلے ہی کسی نے دروازہ کھول دیا اور داخل ہونے والی زینی تھی۔ اس کی سحرانگیز شخصیت نے مجھے لمحوں میں چاق و چوبند کر دیا۔

”کیسے ہیں مسٹر اقبال؟“ اس نے مترنم لہجے میں مسکرا کر پوچھا۔ اس کے جملے نے جیسے مجھے سب کچھ یاد دلایا ورنہ ابھی تک میرا ذہن کسی کالج کے خالی برتن کی طرح لگ رہا تھا۔

”جی ٹھیک ہوں۔“

”بے وقت سو گئے تھے، مجھے خیال ہوا کہ شاید آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”جی بس کچھ کسلندی سی تھی مگر اب میں بالکل ٹھیک ہوں، اگر کافی مل جائے تو مزید بہتر ہو جاؤں گا۔“

”ضرور لیکن ایک شرط ہے۔“

”کیا؟“

”آپ میرے ساتھ تاش کھیلیں گے۔“

”جی۔ تاش۔ مجھے تو تاش کھیلنا نہیں آتے، میں نے کبھی تاش نہیں کھیلے۔“

”کھیلیں گے تو آجائیں گے۔“ یہ کہہ کر اس نے میرے بیڈ کی دراز کھولی اور ایک

میں جواب دیا اور وہ کیسٹ لے لیا۔

پھر ہم رات گئے تک باہر لان میں ٹہلتے رہے۔ باتیں کرتے رہے، میں زینی کی ذاتی زندگی کے بارے میں جاننا چاہتا تھا مگر جانتا تھا کہ وہ میرے کسی سوال کا جواب نہیں دے گی۔

مسٹر زید سے میری ملاقات نہیں ہو سکی۔ رات تقریباً ساڑھے گیارہ بجے جگو نے میرا ٹکٹ لا کر دیا جو اگلے روز صبح ساڑھے دس بجے والی فلائٹ کا تھا۔ ٹکٹ کے ساتھ ہی ایک لفافہ تھا جس پر انگریزی میں ”صرف مسٹر اقبال کے لیے“ لکھا ہوا تھا اور نیچے مسٹر زید کا نام لکھا تھا۔ جگو کے سامنے میں نے وہ لفافہ کھولا کہ شاید یہ مناسب نہ ہو۔ اس کے جانے کے بعد میں نے لفافہ کھولا تو اس میں پانچ ہزار روپے تھے۔ اس زمانے میں پانچ ہزار کی رقم بہت بڑی رقم تھی۔ میں حیرت زدہ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مجھے مسٹر زید سے اس سلوک کی امید نہ تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ یہ رقم کیوں دے رہے ہیں مگر یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اگر چاہتے تو بغیر کسی معاوضے کے ان کا کام کر سکتا تھا دوسری یہ بات تھی کہ جس طرح انہوں نے مجھے اغوا کروایا تھا بالکل اسی طرح وہ مجھ پر دباؤ ڈال کر بھی اپنا کام نکلوا سکتے تھے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا اور آج میں نے پہلی بار ان کے بارے میں اچھی رائے قائم کی۔ یہ حقیقت تھی کہ اب تک انہوں نے خود کو ایک بہترین شخص ثابت کیا تھا سوائے اغوا کرانے والے واقعہ کے۔

جگو جانے سے پہلے کہہ گیا تھا کہ ہمیں ساڑھے آٹھ بجے تک ایئر پورٹ پہنچ جانا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ مجھے صبح ساڑھے سات بجے تک جگا دے گا۔ میں یونہی دونوں ہاتھ سر کے نیچے رک کر لیٹ گیا۔ میرا پروگرام سونے کا نہیں تھا۔ جاگنے کے پروگرام کی وجہ ہی سے میں دن میں سوچا تھا۔ مجھے گھر کے دوسرے افراد، خاص طور پر جگو کے سونے کا انتظار تھا۔ میں یونہی لیٹا آنے والے لمحات کے بارے میں سوچتا رہا۔ میں نے جو کچھ سوچا تھا وہ کافی خطرناک تھا، مسٹر زید، زینی اور جگو کی نگاہ میں میرا بنانا ایچ تباہ ہو سکتا تھا یا پھر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا۔ ایک تو یہ پراسراریت ختم ہو جاتی اور میرا ایچ بھی نہ بڑتا۔

بہر حال مجھے سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا تھا اور اسی لیے میں ایک بار پھر اپنے فیصلے کے

خوب صورت پیکٹ نکال لیا۔ میں کچھ الجھن محسوس کرنے لگا، سر بھاری بھاری سا لگاؤ، احتراماً کچھ نہ کہہ سکا۔ میں نے کبھی زندگی میں تاش کے پتوں کو ہاتھ میں نہیں لیا تھا۔ جبکہ وہ انتہائی مہارت سے تاش کے پتوں کو پھینٹ رہی تھی۔ پھینکنے کے بعد اس نے اسی پھرے سے تاش بانے اور مجھے تاش اٹھانے کا اشارہ کیا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر تاش اٹھائے پھر حیرت انگیز طور پر تاش کے پتوں کا پھول سا بنا کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی غیر مرئی طاقت مجھ سے ایسا کروا رہی ہو۔ میں نے زینی کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں میرے دماغ میں سرسراتی محسوس ہوئیں اور پھر میں نے خاموشی اور انتہائی مہارت کے ساتھ کھیلنا شروع کیا۔ شروع میں تو زینی بڑی تیز اور کھوجنے والی نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی یوں جیسے میری ایک ایک حرکت اور ایک ایک چال کو نوٹ کر رہی ہو۔ پھر وہ ایک دم بہت خوش ہو گئی اس نے ہاتھ سے پتے پھینک دیے۔ ”ونڈر فل مسٹر اقبال۔ اب سب ٹھیک ہو گیا۔“

میں نے حیرت سے اس کا جملہ ساگر معنی اور مفہوم سمجھنے سے قاصر رہا۔

”میں نے سنا ہے کہ آپ کل جا رہے ہیں۔“

”جی! غالباً کل صبح تک روانہ ہو جاؤں گا۔“

یہ سن کر اس نے اپنی گود میں رکھا وہ چھوٹا سا رنگین کانڈ میں لپٹا ہوا پیکٹ اٹھالیا۔

”یہ ایک چھوٹا سا تحفہ ہے میری جانب سے۔“

”تکلف کر رہی ہیں آپ۔“ میں شرمندہ ہو گیا کہ میں نے ابھی تک اس انداز سے

نہیں سوچا تھا۔

”نہیں تکلف نہیں، مجھے پرانے گیت پسند ہیں، یہ میرے منتخب گیتوں کا کیسٹ ہے،“

میں ذہین اور اچھے لوگوں کو یہ تحفہ ضرور دیتی ہوں۔ اسے آپ سونے سے پہلے سنیں گے تو خود کو ہر الجھن سے دور محسوس کریں گے۔ یہ نغمے انسان میں نئی روح پھونک دیتے ہیں اور اگلے روز وہ زندگی کو زیادہ خوب صورت اور حسین پاتا ہے۔ اسے سننے کا ضرور ورنہ مجھے دکھ ہو گا۔“

”ضرور مس زینی! آپ جس خلوص سے تحفہ دے رہی ہیں وہ میرے لیے بہت

بڑی بات ہے، میں اسے ضرور سنوں گا اور آپ کو یاد رکھوں گا۔“ میں نے پرتیقین لہجے

متعلق سوچ رہا تھا۔ وقت دبے پاؤں سما ہوا سا گزر رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے ہر کوئی پر ٹکا دیا اور گزرتے ہوئے قدموں کی چاپ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ گھر کی ہر چیز اونگھنے لگی۔ گہری خاموشی رات کے گہرے ہو جانے کا احساس دل رہی تھی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ گھڑی میں وقت دیکھا ایک بج کر بیس منٹ ہو چکے تھے۔ میں مزید انتظار کرنا چاہتا تھا جوں جوں وقت گزر رہا تھا میرے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ بے کلی بڑھ کر انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ میں نے اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا۔

نہ جانے کس طرح مزید ایک گھنٹہ گزر گیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں نے اپنی پوری ایک صدی یونہی ٹہلتے ہوئے گزار دی ہو۔ میری پنڈلیوں کے پٹھے اکڑ کر رہ گئے تھے۔ میں آرام کرسی پر بیٹھ گیا اور میں نے اپنی ہتھیلیوں سے پٹھوں کو رگڑنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد میرے اعصاب ڈھیلے ہو گئے۔ میں نے ہاتھ روم جا کر منہ ہاتھ دھویا۔ بالوں میں کنگھی کی۔ یہ سب میں خود کو چاق و چوبند رکھنے کے لیے کر رہا تھا اور کچھ وقت بھی گزارنا مقصود تھا۔ اب دو بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ میں نے جوتے اتار دیے اور سیڈینگ سوٹ کی قمیض اٹھا کر پاجامے کے لاسٹک میں اڑس لیے۔

میں نے پانچ منٹ اور انتظار کیا پھر آہستہ سے دروازے کا ہینڈل گھمایا اور دروازے کو آہستگی سے اپنی جانب کھینچا۔ دروازہ بغیر کسی آواز کے کھلتا چلا گیا۔ باہر حسب توقع خاموشی تھی۔ کوریڈور خالی تھا اور تمام فانوس بجھا دیے گئے تھے۔ صرف ایک بلب روشن تھا جس کی روشنی اسی پر لگے شیڈ کی وجہ سے پورے کوریڈور میں پھیلی ہوئی تھی۔ میں باہر آ گیا اور دروازے کو دوبارہ اسی آہستگی سے بند کر دیا۔ کوریڈور میں دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ ہونے کا سوال ہی نہ تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے کسی بھی خطرے یا کسی کے بھی دیکھ جانے کے خوف سے بچنے کے لیے چپل نکال کر پہن لیے اب اگر کوئی دیکھ بھی لیتا تو میں کہہ سکتا تھا کہ مجھے نیند نہیں آرہی اور میں کچھ دیر کھلی فضا میں رہنا چاہتا ہوں۔ ایسا کر لینے کے بعد میں کچھ ہلکا سا ہو گیا۔ اب میں بڑے آرام سے نارمل حالت میں چلتا ہوا بیرونی دروازے تک آ گیا۔ مجھے سارا غدشہ یہ تھا کہ بیرونی دروازہ لاک نہ ہو مگر دروازے کے قریب پہنچ کر مجھے معلوم ہو گیا کہ دروازہ لاک ہے اور اندر کی جانب سے کھولا جا سکتا ہے مجھے امید تو نہیں تھی کہ یہاں اس قسم کے لاک ہوں گے مگر یہ

حقیقت تھی اور اس وقت میرے سامنے بھی تھی۔

میں نے دروازہ کھولا وہ کھلتا چلا گیا۔ میں نے اس دروازے کا باہر والا ہینڈل پکڑ لیا اور باہر آ کر دیکھا وہ دایاں پٹ تھا اور بایاں پٹ یونہی بند تھا جبکہ میں نے اندر سے دروازہ کھولتے ہوئے اچھی طرح نوٹ کیا تھا کہ کوریڈور میں صرف ایک پٹ کا دروازہ تھا۔ میرے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ یہ بایاں پٹ والا دروازہ یقیناً اس گیرلی کا تھا جہاں کل میں نادانستگی میں چلا گیا تھا اور بالآخر تھک کر واپس آ گیا تھا اور پھر جب جگو مجھے لے کر اندر داخل ہوا تھا تو اس نے دروازے کا دایاں پٹ کھولا تھا۔ اب بات میری سمجھ میں آ چکی تھی۔ ظاہر ہے باہر سے دیکھنے والے کو کوٹھی میں داخل ہونے والا یہ دروازہ دو پٹ کا نظر آتا تھا اور وہ اندر داخل ہونے کے بعد سوچتا بھی نہ ہو گا کہ یہ کیا اسرار ہے۔ میں کچھ دیر یونہی باہر ٹہلتا رہا۔ کھلی فضا میں لمبی لمبی سانسیں لیتا رہا تاکہ اگر کوئی دیکھے تو شک نہ کرے۔ میں نے اسی طرح تقریباً آدھا گھنٹا گزار دیا۔ مگر یہاں بھی گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا اور دیرانی منہ پھاڑے کھڑی محسوس ہوتی تھی۔ کچھ دیر بعد مجھے اطمینان ہو گیا تو میں دھیرے سے مگر بالکل نارمل انداز میں آگے بڑھا اور میں نے بجائے دایاں پٹ کھولنے کے بایاں پٹ کھولا، بالکل اسی طرح کہ اگر مجھے چیک کیا جا رہا ہو تو میری یہ حرکت قطعی غیر ارادی محسوس ہو۔

یہ حیرت انگیز بات تھی کہ دروازہ لاک نہیں تھا۔ میں کل کی طرح بڑی آسانی سے اندر داخل ہو گیا۔ یہ وہی کوریڈور تھا جہاں کل میں بھٹک رہا تھا مگر اب میں چونکا تھا۔ میں نے ایک طائرانہ نگاہ ڈالی، دونوں جانب تین تین دروازے تھے مجھے یقین تھا کہ یہ سب دروازے کل ہی کی طرح لاک ہوں گے پھر بھی میں نے انہیں چیک کیا وہ لاک تھے۔ میں آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ کوریڈور کے اختتام پر دائیں جانب بہت سی گلی جیسی بنی ہوئی تھی۔ میں اس پتلی گلی میں داخل ہو گیا جو دس قدم آگے بڑھنے کے بعد بند ہو گئی اور سپاٹ دیوار نے میرا راستہ روک لیا۔ اس گلی میں اندھیرا تھا اس لیے میں نے جیب سے لائٹر نکال لیا۔ یہ وہی لائٹر تھا جو موم بتی کی طرح بنا ہوا تھا۔ یہ لائٹر میں نے قصداً جیب میں ڈالا ہوا تھا۔ میں جانتا تھا کہ مجھے کسی بھی وقت اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے لائٹر کی روشنی میں میں نے دیواروں کا جائزہ لیا اور کوئی ایسی جگہ تلاش کرنے لگا جسے دروازے یا

کھڑکی کے طور پر استعمال کیا جاسکے۔ مگر ایسی کوئی جگہ نہ تھی البتہ ایک سوچ بوجھ بنا ہوا تھا جس پر ہرے، سرخ اور کالے رنگ کے تین بٹن لگے ہوئے تھے..... ان بٹنوں کے نیچے یا اوپر کچھ بھی لکھا ہوا نہیں تھا اس لیے میں رسک لینا نہیں چاہتا تھا۔ دائیں جانب دیوار میں لوہے کا ایک ہینڈل سا بنا ہوا تھا۔ میں نے ہینڈل کو پکڑا اور لمحہ بھر کو گھبرا گیا کیوں کہ ہینڈل ہاتھ میں پکڑتے ہی مجھے یوں لگا جیسے پوری دیوار ہل گئی ہو۔ میں نے پاؤں سختی سے جما لیے اور پھر یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ دائیں جانب کی دیوار کسی دروازے ہی کی طرح کھلتی چلی گئی بعد میں معلوم ہوا کہ دیوار نظر آنے والا یہ حصہ دراصل لکڑی کا بنا ہوا دروازہ تھا جس کے کھلے حصے سے ہلکی روشنی دکھائی دے رہی تھی اور کچھ ایسی آواز آرہی تھی جیسے اندر کہیں ڈرل مشین چلائی جا رہی ہو۔

میں نے احتیاط سے اندر کی جانب جھانکا، اندر میرے لیے مزید شوشے کا سامان موجود تھا۔ یہ حصہ ایسا تھا کہ جیسے میں قدیم خلوں کے اندر کا حصہ دیکھ رہا ہوں۔ بالکل شاہ جہاں کے مقبرے کا درمیانی حصہ لگتا تھا جہاں بڑے بڑے درختوں کے نیچے سینٹ کی منڈیریں سی بنی ہوئی ہیں، زرد پتے بکھرے ہوئے تھے۔ سرخ چھوٹی بڑی اینٹوں سے روشیں بنی ہوئی تھیں اور ان روشوں کے دونوں اطراف کبھی ہری ہری گھاس اگا کرتی ہو گی۔ مگر اس وقت وہاں سوکھے ہوئے زرد پتوں اور مٹی کے سوا کچھ نہ تھا۔

دور بالکل گولائی میں غلام گردش کے آثار تھے جو اب کھنڈر میں تبدیل ہو چکے تھے البتہ اس غلام گردش سے ہٹ کر ایک پرانی سی عمارت تھی جسے اس کھنڈر کا حصہ تو نہیں کہا جاسکتا تھا مگر وہ بھی کافی پرانی لگ رہی تھی۔ دو منزلہ اس عمارت کی پہلی منزل کی کھڑکیوں سے جھانکتی روشنی اور کھڑکی کے شیشوں پر لرزتے، آتے جاتے سائے وہاں زندگی کے آثار کا ثبوت تھے۔

میں اپنی متجسس طبیعت پر قابو نہ پاسکا اور پھر یہاں سے واپس چلے جانا کچھ دانش مندی بھی نہ تھی۔ اس لیے میں نے پلٹ کر کوریڈور میں جھانکا۔ وہاں سے اطمینان ہو جانے کے بعد میں نے دیوار نما دروازہ کھول کر اندر کا اچھی طرح جائزہ لیا اور اللہ کا نام لے کر قدم اندر رکھ دیا۔ اپنے پیچھے دروازے کو اچھی طرح بند کر کے میں ایک قریبی درخت کی آڑ میں ہو گیا۔ اس درخت کا تنا بہت موٹا تھا۔ میں اس کے پیچھے بہ آسانی

چھپ گیا۔ کچھ دیر وہاں دبکے رہنے کے بعد میں نے دیوار کے سائے سائے میں قدم آگے بڑھائے۔ دیواروں کے سائے تلے گہرا اندھیرے تھا اور میرے دیکھ لیے جانے کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔ میں اس عمارت تک پہنچنا چاہتا تھا جہاں پہلی منزل روشن تھی اور ڈرل مشین چلائے جانے کی سی آواز بھی وہیں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

میں بغیر آہٹ پیدا کیے آگے بڑھتا رہا۔ تقریباً بارہ منٹ کے بعد میں عین اس عمارت کے نیچے پہنچ چکا تھا۔ عمارت کا نچلا حصہ گہرے اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا پھر بھی میں نے احتیاط کا دامن نہ چھوڑا اور کافی دیر وہیں دبکا رہا۔ دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی اور پسینے کی بوندیں پیشانی پر سرسرا رہی تھیں، کچھ دیر میں نے احتیاط سے بڑی آہستگی سے حرکت کی اور سرکتا ہوا نچلے حصے کی اس کھڑکی تک پہنچ گیا جو تاریک تھی مگر اوپر سے آنے والی روشنی واضح طور پر نظر آرہی تھی۔ میں نے کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے سے اندر جھانکا، اندر کچھ بھی نہ تھا سوائے اندھیرے اور ویرانی کے۔

میں کچھ دیر آہٹ لیتا رہا پھر میں نے کھڑکی کے پٹ پر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ مدھم سی چرچاہٹ گونجی اور میں دہل کر رہ گیا۔ کچھ دیر ساکت کھڑا رہا مگر چرچانے کی یہ آواز شاید میرے حساس کانوں تک ہی پہنچی تھی۔ میں نے اب دیر کرنا مناسب نہ سمجھا اور فوراً ہی کھلی ہوئی کھڑکی سے اندر کی طرف اتر گیا۔ ایسا کرتے ہوئے میں نے چپل اتار کر بغل میں دبا لیے تھے مبادا فرش کھڑکی سے نیچا ہو اور میرے کودنے کی آواز سے اندر موجود کوئی بھی شخص چونکا ہو جائے۔

میرے پیر ٹھنڈے فرش سے ٹکرائے اور پیروں تلے مٹی اور سوکھے پتوں کا احساس ہوا جس سے مجھے یہ اطمینان ہو گیا کہ جس حصے میں میں داخل ہوا ہوں وہ قطعی استعمال میں نہیں ورنہ اتنی مٹی اور کوڑا وہاں نہ ہوتا۔ تھوڑی ہی دیر میں میری آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو گئیں اور مجھے کمر خالی نظر آیا۔ سامنے کی طرف ایک کھڑکی اور دروازے کا ہیولا سا نظر آ رہا تھا جسے باہر سے آنے والی ہلکی سی روشنی نے واضح کیا ہوا تھا۔

میں دبے قدموں دروازے کی طرف بڑھا۔ یہ دیوار میں بنا ہوا دروازے کا خلا تھا اور دونوں طرف سینٹ کی چوکھٹ اس بات کی طرف اشارہ کر رہی تھی کہ یہاں دروازہ نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ میں چند لمحے دیوار کی آڑ میں چھپا رہا پھر میں نے سر نکال کر باہر

جھانکا سامنے اوپر جاتی ہوئی سیڑھیاں نظر آگئیں اور یہاں سے سیڑھیوں کے اوپر بنا ہوا دروازہ صاف نظر آ رہا تھا جہاں روشنی تھی۔ غالباً سیڑھیوں کے اوپر چالیس دولٹ کالبل لگا ہوا تھا کیونکہ روشنی بہت مدقوق اور بیمار سی تھی۔

میں سیڑھیوں تک جانا چاہتا تھا بلکہ اوپر کی عمارت میں کیا ہو رہا ہے، یہ دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے چاروں طرف ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور قدم اٹھایا ہی تھا کہ میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ میں فوراً دیوار کی آڑ میں ہو گیا اگر ایک لمحے یا ثانے کی بھی دیر ہو جاتی تو ٹارچ کی روشنی کے اس دائرے کی زد میں آگیا ہوتا جو انتہائی بائیں جانب سے اچانک نمودار ہوا تھا اور ریٹکتا ہوا ایک کونے سے دوسرے کونے تک چلا گیا تھا۔

میں نے سر کو دیوار سے نکالیا، پسینہ میری گدی سے بہہ کر کمر سے ہوتا ہوا ٹانگوں کی طرف جاتا محسوس ہو رہا تھا۔ خدا نے مجھے بال بال بچالیا تھا ورنہ جانے میرے ساتھ کیا ہوتا۔ ٹارچ کی اس روشنی کا مطلب یہ تھا کہ یہاں کوئی شخص موجود تھا جس کی ذمہ داری یہاں کا خیال رکھنا تھی۔ اب میں اس جگہ تھا جہاں سے واپسی بھی مجھے ناممکن لگ رہی تھی کیوں کہ اس عمارت سے نکل کر اس جگہ پہنچنے میں، جہاں سے میں اس حصے میں داخل ہوا تھا مجھے تقریباً بارہ منٹ لگے تھے اور اب تو باہر کسی کی موجودگی ثابت ہو چکی تھی، آتے ہوئے مجھے یہ احساس تھا کہ یہاں کوئی نہیں ہے مگر اب چوکیدار کی موجودگی کو جاننے ہوئے میری واپسی بہت دشوار تھی۔

میرا سینہ کسی ڈھول کی طرح بجتا محسوس ہو رہا تھا۔ بدن سے پسینا یوں ابل رہا تھا جیسے میں نما کر نکلا ہوں۔ بہت جواب دے رہی تھی خاص طور پر اس لیے کہ مجھے واپس اپنے کمرے میں پہنچنا تھا اگر مجھے صرف فرار ہونا ہوتا تو دوسری بات تھی میں گھنٹا دو گھنٹے ہر حال یا تین چار گھنٹے بھی انتظار کر سکتا تھا اور پھر موقع دیکھ کر فرار ہو سکتا تھا مگر مجھے سات بجے سے اپنے کمرے بلکہ اپنے بستر پر ہونا تھا کیوں کہ جگو نے کہا تھا کہ وہ ٹھیک سات بجے مجھے جگا دے گا۔ دوسری بات یہ تھی کہ میں مسٹر زید کے اعتماد کو نہیں نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ ابھی میں بہت سی باتوں سے ناواقف تھا اور واقفیت چاہتا تھا مزید یہ کہ مسٹر زید نے اب تک میرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی تھی اور اب میں کوئی ایسا موقع دینا بھی نہیں چاہتا تھا مجھے ہر حال میں فاریہ اور سوہنی تک پہنچنا تھا۔

میں یہ تمام باتیں سوچتا رہا اور وقت سینے پر رکھے ہوئے کسی بوجھ کی طرح دھیرے دھیرے سرکتا رہا۔ میری ٹانگیں تھک گئیں تو میں آہستہ سے وہیں فرش پر بیٹھ گیا۔ میری آنکھیں باہر اندھیرے میں گھور رہی تھیں اور کان کسی آہٹ پر لگے ہوئے تھے چند منٹ یونہی گزر گئے پھر اچانک وہی روشنی کا دائرہ اندھیرے میں گھومنے لگا۔ اس مرتبہ یوں لگا جیسے کوئی شخص ٹارچ ہاتھ میں لیے قریب آ رہا ہو۔ بہت جلد آنے والے کے قدموں کی آہٹ سنائی دینے لگی۔ میں سرکتا ہوا دیوار کی آڑ لیے اس کھڑکی تک آگیا جو عین میرے بالوں سے کچھ اوپر تھی۔ آنے والا کھڑکی کے قریب آچکا تھا۔ میں نے سانس روک لیا اور اسی لمحے قدموں کی چاپ بھی رک گئی۔ روشنی کا گول دائرہ ریٹکتا ہوا پہلے دروازے کے راستے سامنے والی دیوار پر پڑا پھر شاید دروازے اور کھڑکی کے درمیان کی دیوار اس روشنی کی راہ میں آگئی اور پھر وہ دائرہ کھڑکی کے راستے سرسرایا یعنی عین میرے سر کے اوپر سے ہوتا ہوا سامنے کی دیوار اور کونے میں چکرانے لگا۔

میں نے اس لمحے پسینے کو اپنی ریڑھ کی ہڈی سے بہتا محسوس کیا۔ میری کپنیاں گرم ہو گئیں۔ حلق خشک ہو گیا اور یوں لگا جیسے سانس گھٹنے لگا ہو۔ چند لمحے تھے جو قیامت بن کر گزرے، پھر جاتے ہوئے قدموں کی آواز نے میرے اوسان بحال کر دیے۔ میں نے لمبے سانس لیے اور سینے کو دونوں ہاتھوں سے دبایا۔ کیوں کہ سانس روکے رکھنے کی وجہ سے میرا سینہ دکھ گیا تھا۔

قدموں کی آواز معدوم ہو گئی تھی۔ میں یونہی دیوار سے چپکا بیٹھا رہا پھر شاید پانچ یا سات منٹ بعد میں نے بڑی آہستگی سے سرکنا شروع کر دیا۔ اب اس جگہ ٹھہرے رہنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا اس لیے میں واپس جانا چاہتا تھا۔ میں دروازے کی جانب جانے کی بجائے اس کھڑکی تک چلا آیا جہاں سے کود کر میں ویران کمرے میں داخل ہوا تھا۔

کچھ دیر آہٹ پر کان لگائے بیٹھا رہا مگر جھینگروں کے بولنے کی آواز کے سوا کوئی آواز نہ تھی اور پھر چند ہی لمحوں بعد میں کھڑکی کے اس طرف تھا۔ باہر کودنے کے بعد میں نے دیر نہ کی اور تھوڑا سا اٹھ کر رکوع کی حالت میں ہی بھاگتا ہوا اس دیوار کے سائے تک پہنچ گیا جہاں سے میں اس کھڑکی تک آیا تھا۔ کوریڈور میں کھلنے والا دیوار نما دروازہ اب کافی فاصلے پر تھا مگر اب میں مطمئن تھا کیونکہ یہ فاصلہ میں اسی طرح طے کرتا جس

طرح آتے ہوئے طے کیا تھا۔ یعنی دیوار کے اندھیرے سائے تلے ہی سرکتا ہوا وہاں تک پہنچ سکتا تھا۔

یہاں رک کر میں نے پھر چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ آہٹ سننے کی کوشش کی اور وہیں بیٹھ گیا۔ اب میں کھڑا ہونے کی بجائے بیٹھے بیٹھے ہی اس طرح سرکنے لگا۔ اس طرح سرکتے ہوئے بہت سا وقت گزر گیا۔ تھکن اور اعصابی تناؤ نے مجھے ہلکان کر دیا تھا مگر میں رکے بغیر بڑھتا چلا گیا۔ اب وہ موٹے تنے والا درخت قریب آچکا تھا جس کا مطلب تھا کہ اس درخت سے بس چند قدم پر وہ دروازہ ہے جہاں مجھے پہنچنا تھا۔ میں دھیرے دھیرے درخت کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اچانک میرا پاؤں کسی چیز پر پڑا میں پھسلا اور بڑی مشکل سے اپنی چیخ روکی۔ وہ گول سا لمبا ڈنڈا تھا۔ بالکل ویسا جیسا میں نے تھانیداروں کے ہاتھوں میں دیکھا تھا، شاید اس کے چکنے اور گول ہونے کی وجہ ہی سے میرا پاؤں سلب ہو گیا تھا۔ یہ بھی خدا کا شکر تھا کہ میں اس وقت کھڑا ہوا نہیں تھا ورنہ بری طرح گرتا اور میرے گرنے کی آواز سے چوکیدار ہوشیار ہو جاتا اور پھر جانے کیا ہوتا۔

میں نے وہ ڈنڈا اٹھالیا۔ شاید یہ غیبی مدد تھی کیونکہ جیسے ہی میں درخت کے تنے کی آڑ سے نکلا اور اس طرف بڑھا جہاں میرے اندازے کے مطابق وہ دروازہ تھا، کوئی اچانک میرے سامنے آگیا، یہ وہی چوکیدار تھا کیوں کہ سامنے آتے ہی اس نے ٹارچ والا ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ میں نے اسی ڈنڈے سے اس ہاتھ پر وار کیا اور پھر اپنی پوری طاقت سے ڈنڈا اس کے سر پر دے مارا۔ وہ چکرا کر گرا اور میں وہاں رک کر اسے دیکھنے کی بجائے ڈنڈا وہیں پھینک کر دیوار کی طرف لپکا۔ دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا اور کوریڈور کی ہلکی روشنی میں یہ روزن صاف نظر آرہی تھی، شاید چوکیدار بھی یہی روزن دیکھ کر یہاں ٹھہرا تھا۔ میں نے وقت ضائع نہ کیا اور تیزی سے آگے بڑھ کر وہ دیوار نما دروازہ کھولا، دوسرے ہی لمحے میں اندر تھا۔

میں اندر بھی ایک لمحے کو نہ ٹھہرا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ یہ میری مشکل کا آخری لمحہ تھا مگر میں نے کسی خطرے کی پرواہ نہ کی اور خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ باہر اب بھی سناٹا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس پراسرار کوریڈور کا دروازہ بند کر کے میں نے دایاں پٹ کھولا اور اندر داخل ہو

کوریڈور سنسان تھا۔ میں اطمینان سے چلتا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا مگر میں..... میرا پورا وجود پسینے میں شرابور تھا۔ خون کپٹیوں پر ٹھوکریں سی مار رہا تھا۔ دل کی دھڑکن شور کرتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے لاک کر دیا اور بے دم سا بستر پر لیٹ گیا۔ میں نے اندر آتے ہی گھڑی دیکھی، پونے پانچ بج رہے تھے۔ اتنا بہت سا وقت گزر جانے پر میں حیران ہوئے بغیر رہ سکا۔

بڑی دیر بعد میری حالت سنبھلی تو میں اٹھ کر ہاتھ روم چلا گیا۔ ہاتھ روم کا دروازہ کھولتے ہی سامنے کی دیوار میں قد آدم آئینہ لگا ہوا تھا، اس پر نگاہ پڑتے ہی میں چونک گیا۔ میرے سیلینگ سوٹ پر جاہ جادہ بے پڑ گئے تھے۔ میں نے فوراً ہی شرٹ اتاری جو پشت سے بری طرح خراب ہو چکی تھی۔ یہ کپڑے پہنے رہنا خطرناک ہو گیا تھا۔ میں نے سیلینگ سوٹ اتار کر شاور لیا اور تولیہ لیٹھے ہوئے باہر آگیا۔ کپڑوں کی الماری کھولی جہاں ایک اور سیلینگ سوٹ میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ میں نے وہ کپڑے پہنے اور میلے ہو جانے والے سیلینگ سوٹ کو پانی سے اچھی طرح دھو کر وہیں ہاتھ روم میں لٹکا دیا۔

شاور لینے کے بعد میں کافی حد تک خود کو بہتر محسوس کرنے لگا۔ اب میں نے گزرے لمحات پر نگاہ ڈالی تو اس انتھک محنت اور کوشش کو بیکار ہی پایا۔ میں نے اتنا بڑا رسک لیا تھا مگر میں اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ نہ مجھے یہ معلوم ہوا کہ اس عمارت میں کون تھا اور کیا ہو رہا تھا اور نہ ہی اس گیلری یا کوریڈور میں بنے ہوئے کمروں کا راز کھل سکا جو کل بھی لاک تھے اور آج بھی۔ یعنی اس ساری محنت اور مشقت کے بعد میں وہیں تھا جہاں کل تھا۔ اگر وہ چوکیدار نہ آگیا ہوتا تو میں یقیناً کچھ نہ کچھ معلوم کر لیتا۔

بہر حال اب رونا بیکار تھا۔ میں آرام سے بستر پر لیٹ گیا۔ یہی غنیمت تھا کہ میں پکڑا نہیں گیا اور نہ ہی چوکیدار میری صورت دیکھ سکا تھا بس ایک پریشانی ہو گئی تھی کہ جانے وہ چوکیدار زندہ رہا یا مر گیا۔ میں نے اپنی پوری قوت سے ڈنڈا اس کے سر پر مارا تھا۔ خدا کرے وہ بچ گیا ہو۔ میں نے کروٹ بدلتے ہوئے دعا مانگی اور آنکھیں موند کر کچھ دیر سونے کی کوشش کرے لگا۔ میں جانتا تھا کہ میری آنکھ نہ بھی کھلی تو جگو مجھے جگا دے گا۔ شاید بری طرح تھک جانے کی وجہ سے ہی مجھے بہت جلد نیند آگئی۔

مجھے کسی نے بھی نہ اٹھایا بلکہ میری آنکھ خود ہی کھل گئی اور آنکھ کھلتے ہی مجھے یوں لگا جیسے میں کافی دیر سویا ہوں اور بہت اچھی نیند سویا ہوں کسی قسم کی کوئی تھکن یا نیند پوری نہ ہونے کا کوئی احساس نہ تھا جس پر مجھے حیرت ہوئی کیونکہ میں رات والے واقعے سے بہت تھک چکا تھا اور صبح کے قریب سویا تھا۔ میں نے بستر سے اٹھ کر بھرپور انگڑائی لی اور سائیڈ ٹیبل پر رکھی گھڑی پر نگاہ ڈالی اور دم بخود رہ گیا۔ یہ گھڑی پونے بارہ بج رہی تھی۔ میں نے پلکیں جھپکائیں۔ دوبارہ گھڑی پر نگاہ ڈالی یہ حقیقت تھی کہ گھڑی پونے بارہ بج رہی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ جگو نے تو مجھے صبح سات بجے تک جگا دینا تھا مجھے ساڑھے آٹھ بجے تک ایئر پورٹ پہنچنا تھا مگر اب.....

میں نے فوراً انٹرکام اٹھا کر جگو کا نمبر دیا۔ دوسری طرف سے کسی نے نہ اٹھایا۔ میں پریشان ہو گیا میں نے کپڑے بدلنا بھی مناسب نہ سمجھا اور انہی کپڑوں پر سیلپنگ گاؤن پہن کر باہر آ گیا۔ میں ابھی چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ بیرونی دروازہ کھلا پہلے مسٹر زید اور ان کے پیچھے زینی اور جگو، تینوں اندر آ گئے۔ مسٹر زید کا چہرہ خشک ہو رہا تھا اور ان کے جڑے بچنے ہوئے تھے اور جگو بالکل کسی لاش ہی کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی مسٹر زید نے کمال مہارت سے خود کو نارمل بلکہ بے انتہا خوش اخلاق ظاہر کیا۔ ”ہیلو مسٹر اقبال..... آئی ایم سوری، دراصل میری غلطی کی وجہ سے آپ کی فلائٹ نکل گئی۔ میں بالکل بھول گیا تھا کہ آج آپ نے فلائی کرنا ہے۔“ اس نے آگے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

مگر مسٹر زید..... میں وہاں اطلاع کر چکا تھا کہ میں.....

”آئی نو مسٹر اقبال لیکن..... بس آپ مجھے معاف کر دیں، قطعی غیر دانشگی میں ایسا ہو گیا۔ آپ پھر فون کر دیں اور میں نے زینی سے کہہ دیا ہے کہ وہ کل صبح کی فلائٹ میں آپ کی سیٹ بک کرادے، پلیز.....“

اس نے کچھ ایسے انداز میں کہا کہ میں کچھ اور نہ کہہ سکا، ویسے بھی میں بھلا کیا کر سکتا تھا؟ نہ اپنی مرضی سے یہاں آیا تھا اور نہ ہی اپنی مرضی سے یہاں سے جانے کا اختیار رکھتا تھا۔ ویسے میں گھبراہٹ میں مبتلا ہو گیا تھا کیونکہ میں رات ایک شخص کو زخمی کر چکا تھا یا شاید موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔ ہر دو صورت میں ان لوگوں کو مجھ پر ہی شک ہو

سکتا تھا۔ اب مجھے خود پر بہت قابو رکھنا تھا اور اپنی کسی حرکت یا کسی بات سے یہ ظاہر نہیں ہونے دینا تھا کہ رات والے واقعے کا تعلق مجھ سے ہے۔

”ٹھیک ہے مسٹر زید، نو پر اہم..... آپ اجازت دیں تو میں نما کر کپڑے بدل لوں۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں..... غالباً آپ نے ناشتا بھی نہیں کیا ہے؟“ اس نے جگو کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں اب ناشتے کی ضرورت تو نہیں بس چائے پیوں گا۔“

”اوکے مسٹر اقبال، انشاء اللہ بہت جلد آپ سے ملاقات ہوگی، اس وقت مجھے ایک اہم کام نمٹانا ہے۔“ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا اور نہ معلوم کیوں میری نگاہ جگو کی طرف اٹھ گئی۔ شاید یہ میرے احساس کا دھوکا تھا کہ مجھے جگو کی نگاہوں میں التجا نظر آئی اس کا رنگ ایک بار پھر سفید ہو گیا اور وہ اپنے موٹے موٹے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ خوف زینی کی آنکھوں میں بھی تھا مگر اتنا واضح نہ تھا جتنا جگو کی آنکھوں میں تھا۔ مسٹر زید ابھی تک میری طرف متوجہ تھے۔ میں نے فوراً ہی نگاہیں جگو کے چہرے سے ہٹا کر مسٹر زید پر جمادیں۔ ”آپ اسلام آباد سے کب آئے مسٹر زید؟“

”نہیں..... میں یہیں تھا۔“

”اوہ..... سوری میں بھول گیا تھا۔“ میں گھبرا گیا۔ اب بہتر یہی تھا کہ میں ان لوگوں کے پاس سے ہٹ جاتا اور میں نے ایسا ہی کیا۔ مسٹر زید سے اجازت لے کر میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ وہاں آ کر سب سے پہلا کام تو میں نے یہ کیا کہ اس سیلپنگ سوٹ کو چیک کیا جسے میں رات کو دھو کر ہاتھ روم میں ٹانگ آیا تھا۔ اس پر مٹی کا کوئی دھبہ نہیں تھا، یہ دیکھ کر مجھے قدرے اطمینان ہوا۔ دوسرا کام میں نے جو کیا وہ یہ تھا کہ کپڑے بدلتے ہی وہ سیلپنگ سوٹ جسے میں پہن کر سویا تھا، بالکل اسی طرح تہہ کر کے الماری میں رکھ دیا جس طرح میں نے اسے الماری سے نکال کر پہنا تھا۔

میں آدھے، پون گھنٹے بعد تیار ہو گیا۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ اب تک کوئی میرے لئے چائے لے کر نہیں آیا تھا۔ میں نے انٹرکام پر جگو کے کمرے کا نمبر دیا۔ ”دوسری طرف سے فوراً ہی ریسیور اٹھایا گیا مگر جو آواز سنائی دی وہ جگو کی قطعی نہیں ہو

سکتی تھی اس لیے بولنے والی کوئی عورت تھی۔

”سوری میڈم“ میں نے شاید غلط نمبر ملا لیا۔

”آپ نے ٹھیک جگہ ملایا ہے مسٹر اقبال“ میں ابھی چائے لے کر حاضر ہوتی ہوں۔

اتنا کہہ کر بولنے والی نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں حیران سا بیٹھا رہ گیا۔ چند لمحوں بعد ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ ”کم ان“۔

میرے منہ سے یہ الفاظ نکلتے ہی جیسے طلسمی دروازہ کھل گیا۔ وہ اتنی حسین اور خوب

صورت تھی کہ میں پتھرا کر رہ گیا۔ اس نے سفید لباس پہنا ہوا تھا اور وہ لباس بھی اتنا

عجیب تھا کہ اب تک میں نے نہیں دیکھا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میرے سامنے آسمان

سے اترتی ہوئی کوئی حور کھڑی ہو۔ اس کے مرمرین جسم پر سفید ریشمی لباس تھا جس نے

اسے سر سے پیر تک ڈھانپا ہوا تھا کچھ عجیب و غریب سالباس تھا۔

”مسٹر اقبال مجھے آپ کی خدمت پر مامور کیا گیا ہے۔ آپ مجھے نور کہہ سکتے ہیں۔“

اس نے آگے بڑھ کر چائے کی ٹرے سنٹرل ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔ تجھے

اس کی آواز نے مجھے چونکا دیا اور میں طلسمی دنیا سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آ

گیا۔ ”تھینک یو مس نور..... جگو کہاں ہے؟“

”وہ غالباً جا چکا ہے۔“ اس نے دھیرے سے کہا اور نہ معلوم کیوں میری ریڑھ کی

ہڈی میں سرد لہری دوڑ گئی۔ ”آپ چائے پی کر فارغ ہو جائیں۔ مسٹر زید آپ کا انتظار کر

رہے ہیں۔“

اس نے اسی دھیمے لہجے میں کہا اور پلٹ کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ نہ معلوم

کیوں میں بے چین ہو گیا تھا۔ مجھے رہ رہ کر اس چوکیدار کا خیال بھی آ رہا تھا۔ میرا خیال

تھا بلکہ مجھے یقین تھا کہ اب تک اس کے زخمی ہونے کا راز کھل چکا ہو گا اور یہ بھی ممکن

تھا کہ وہ بے ہوش ہوا ہی نہ ہو اور کسی اجنبی کی اس عمارت میں موجودگی کی اطلاع اس

لحے مسٹر زید کو مل چکی ہو۔ بہر حال جو بھی معاملہ تھا ابھی تک سامنے نہیں آیا تھا مگر میرا

یوں روک لیا جانا مجھے اندیشوں میں مبتلا کر رہا تھا۔

میں نے جلدی جلدی کسی نہ کسی طرح چائے پی اور فوراً ہی تیار ہو گیا میری خواہش

تھی کہ جو کچھ بھی ہونا ہے یا ہو چکا ہے وہ جلد از جلد میرے سامنے آ جائے تاکہ اس جان

لیوا کیفیت سے میری جان چھوٹ جائے۔ تیار ہو کر میں نے جگو کے ایکشنشن پر نور کو اطلاع

دی۔ وہ وہی مجھے لینے کے لیے آگئی۔ یہ شاید اس کی شخصیت کا اثر تھا یا خدا جانے کیا بات

تھی کہ میں اسے دیکھتے ہی افسردہ ہو گیا۔ یہ احساس مجھے شدت کے ساتھ ہوا کہ وہ بہت

دکھی ہے یا اس کے ساتھ بدسلوکی ہو رہی ہے یا کچھ یوں جیسے وہ یہاں زبردستی لائی گئی

ہے۔ جو تاثر مجھے زہنی کے چہرے پر نظر آتا تھا وہ اس کے چہرے پر نہ تھا بلکہ اس کی

آنکھوں میں خالی پن تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی آنکھیں غلامی میں کچھ تلاش کر

رہی ہیں۔

میں اس کے پیچھے پیچھے کوریڈور کراس کر کے باہر کے حصے میں آ گیا اور یہاں آتے

ہی مجھے سانپ سو گھ گیا۔ بیچ لان میں ایک میت رکھی تھی۔ زہنی اور مسٹر زید کے علاوہ

یہاں بہت سے اجنبی چہرے بھی تھے جن پر تاسف پھیلا ہوا تھا۔ جگو بھی یہاں موجود تھا مگر

ایسی حالت میں کہ اس کے چہرے پر جگہ جگہ نیل پڑے تھے۔ ایک آنکھ سوج کر کپا ہو گئی

تھی۔ وہ اس وقت صرف پتلون میں تھا یعنی اس کا اوپری حصہ بے لباس تھا۔ اس کے

دونوں ہاتھ پشت پر نائیلون کی رسی سے بندھے ہوئے تھے۔

مسٹر زید کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ انہوں نے جلتی ہوئی آنکھوں سے

مجھے دیکھا۔ میں ان کی نگاہوں کی تاب نہ لا سکا اور میں نے ان کے چہرے سے نگاہیں ہٹا کر

لان میں رکھی اس میت پر گاڑ دیں۔ ”یہ..... یہ کون ہے..... کیا ہوا

اسے.....؟“

”یہ ادیس ہے مسٹر اقبال..... وہی لفٹ مین جو میں نے فیکٹری میں

بھجھا تھا اور جس نے عذرا کے پروگرام کی اطلاع دی تھی۔“ مسٹر زید نے سلگتے ہوئے لہجے

میں کہا۔ اس دوران ان کی نگاہیں میرے چہرے کا بغور جائزہ لے رہی تھیں۔

میرا دل دھڑک اٹھا تھا مگر میں نے خود پر بڑی مہارت سے قابو رکھا اور معصوم بنا

رہا۔ ”مگر اسے کیا ہوا؟“

”اسے قتل کر دیا ہے کسی نے۔ اس کے سر پر ڈنڈا مارا جس سے یہ زخمی ہو گیا“ سر

سے خون بہا اور یہ رات بھر بیہوش پڑا رہا اور پھر..... خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے

اس کی موت واقع ہو گئی۔“

میرا حلق خشک ہو گیا۔ گویا میں نے قتل کر دیا تھا۔ وہ میرے ہاتھوں زخمی ہوا اور پھر مر گیا۔ اس اطلاع نے مجھے شدید صدمے سے دوچار کیا تھا مگر یہاں میری افسردگی میری موت ثابت ہوتی اس لیے میں نے خود کو سنبھالے رکھا مجھے یقین نہیں تھا کہ میں اداکاری بھی کر سکوں گا مگر اس وقت مجھے حیرت ہوئی جب مسٹر زید نے مجھے بتایا کہ اس کی وجہ جو ہے، جگو کی بے پروائی کے سبب کوئی شخص کو بھی میں داخل ہوا اور اس حصے میں پہنچ گیا جہاں بہ قول مسٹر زید کے ان کی قیمتی اور اہم اشیاء، رقم اور دوسرے اہم دستاویزات رکھے تھے اور جہاں کی حفاظت کے لیے انہوں نے ادریس کی ڈیوٹی لگائی ہوئی تھی۔ مسٹر زید کی کہانی کے مطابق ادریس نے غالباً اس شخص کو دیکھ لیا تھا جو چوری کی نیت سے وہاں داخل ہوا تھا۔ ادریس نے اسے پکڑنے کی کوشش کی ہوگی جس پر آنے والے نے اسے زخمی کر دیا، زخم اس کے سر پر تھا اور اسی زخم نے اس کی جان لے لی تھی۔

میں آنکھیں پھاڑے مسٹر زید سے منہ کھولے ان کی کہانی سنتا رہا۔ وہ خاموش ہوئے تو میں نے پوچھا۔ ”مسٹر زید آپ کو یہ سب کیسے پتا چلا.....“ آپ نے جب اسے دیکھا تو کیا یہ زندہ تھا؟“

”نہیں مسٹر اقبال، اصل میں مجھے صبح سویرے ورزش کرنے کی عادت ہے، آج صبح بھی میں حسب عادت بلکی ٹی ورزش کرنے کے لیے باہر آیا تھا کہ گیٹ کھولتے ہی میں نے ادریس کو زخمی حالت میں باہر رکھے گملوں کے درمیان پڑے دیکھا تب میں نے اسے چیک کیا تو معلوم ہوا کہ وہ بہت دیر ہوئی اس دنیا سے جا چکا ہے۔“

”سر مجھے معاف کر دیں..... سر آئندہ ایسی کوتاہی نہیں ہوگی سر۔“ اس کی بات ختم ہوتے ہی جگو گڑ گڑایا۔

آئندہ..... نہیں جگو آئندہ تو میں خود بھی ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں دنیا کا ہر نقصان برداشت کر سکتا ہوں مگر اپنے وفادار ساتھیوں کا جانی نقصان برداشت کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔ میں تمہیں آئندہ ایسی کوتاہی کا موقع نہیں دوں گا۔“ مسٹر زید نے ٹھہرے ہوئے مگر سفاک لہجے میں جواب دیا۔

”اسے معاف کر دیں سر..... یہ خود بھی آپ کا وفادار ہے۔“ میری پشت کی جانب سے مس نور کی سرسراتی ہوئی سرگوشی سنائی دی۔

مسٹر زید نے چونک کر میری پشت پر کھڑی مس نور کو دیکھا۔ اس نے گھبرا کر نگاہیں جھکا لیں۔ ہم سب ہی مس نور اور مسٹر زید کو دیکھ رہے تھے۔

”ہوں.....“ یہ بھی سچ ہے کہ جگو نے اب تک مجھ سے بے وفائی نہیں کی ہے، اگر کل رات والا واقعہ اس کی لاعلمی میں ہوا ہے تو.....“

”سرا خدا کی قسم میں نہیں جانتا کہ وہ کون تھا اور کیسے اندر داخل ہوا تھا.....“ جگو جلدی سے بول پڑا، شاید مسٹر زید کا جواب سن کر اسے کچھ یقین ہو گیا تھا کہ اسے معاف کیا جاسکتا ہے۔

”خیر اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے فی الحال اس کی تدفین کا انتظام کرو۔“ مسٹر زید نے وہاں کھڑے لوگوں سے کہا اور پھر میری جانب گھوم گئے۔ ”ہاں تو مسٹر اقبال میں کیا کہہ رہا تھا؟“ اس نے بالکل اس طرح کہا جیسے ہم خوش گپیوں میں مصروف تھے اور وہ جیسے چائے کا گھونٹ لینے کے لیے رکا تھا۔

”ہم ادریس ہی کے متعلق بات کر رہے تھے۔ مسٹر زید.....“

”اوہ لیواٹ.....“ وہ اب نہیں رہا اس لیے اس موضوع کو ختم کر دیں۔“

اس نے منہ بنا کر جواب دیا۔ میں اس طرز عمل پر حیران تھا کہ ایک شخص ختم ہو گیا تھا اور وہ کتنے اطمینان سے باتیں کر رہا تھا۔ ادریس کی موت نے مجھے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ میری کیفیت بہت خراب تھی۔ یہ احساس مجھے کچھ کے لگا رہا تھا کہ میں نے ایک شخص کو قتل کر دیا ہے۔ میں اس وقت تنہائی کا طالب تھا مگر مسٹر زید میری جان چھوڑنے پر تیار نظر نہیں آتے تھے۔ دوسری طرف میں اس طرح روک لیے جانے پر بھی پریشان تھا۔ مجھے یہ اندازہ بھی نہیں ہو رہا تھا کہ مسٹر زید کو اس سلسلے میں مجھ پر شک ہوا یا نہیں اور اسی الجھن نے مجھے بے چین کیا ہوا تھا۔

”مسٹر زید، مس فاریہ اور بیگ صاحب میرے نہ پہنچنے پر پریشان ہو جائیں گے۔“

”میں جانتا ہوں، آپ فون کر دیں کہ آپ چند روز بعد آئیں گے۔“

”جی.....“ چند روز بعد.....؟“ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

”در اصل مجھے کچھ ضروری کام ہیں اور پھر اہم بات یہ ہے کہ آج رات میں آپ کو کسی سے ملوانا چاہتا ہوں، اور.....“ مسٹر اقبال آج مجھے ایک بہت ہولناک اطلاع ملی ہے

کیا۔

”لیس جیلو.....“ میں نے ریسپور اٹھا کر کہا۔

”مسٹرزید سے بات ہو سکتی ہے مسٹر.....؟“ دوسری جانب سے بڑے اکھڑے ہوئے انداز میں پوچھا گیا۔ وہ آواز، وہ لہجہ، میرے سر میں دھماکے سے ہونے لگے۔ میں بولنے والے کو جانتا تھا مگر یاد نہیں آ رہا تھا۔ یہ لہجہ میں نے بہت قریب سے سنا تھا، میں یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

”اے مسٹر..... کیا تم سو گئے یا مر گئے؟“

”جی..... ایک منٹ ہولڈ کیجئے، میں دیکھتا ہوں۔ آپ کا نام.....؟“

”نام صرف دوستوں اور دشمنوں کو بتاتا ہوں مسٹر، اجنبی لوگوں کو نہیں۔“

اور میرے دماغ میں روشنی کا جھماکا سا ہوا۔

وہ سونی صدر راجہ کی آواز تھی۔ میں اسے مخاطب کرنے ہی والا تھا کہ مسٹرزید نے آگے بڑھ کر ریسپور میرے ہاتھ سے لے لیا۔

”لیس.....“ انہوں نے اسی تھکے ہوئے انداز میں کہا اور پھر غالباً دوسری جانب موجود شخص کی آواز سنتے ہی ان کی آنکھوں میں روشنی ہی بھر گئی۔ ”کہاں ہو تم؟“ انہوں نے بے چینی سے پوچھا پھر کچھ دیر تک وہ دوسری جانب بولنے والے کا جواب سنتے رہے۔ اس دوران میں ان کے اضطراب میں اضافہ ہو رہا تھا البتہ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ اضطراب خوشی کا ہے یا کسی پریشانی کا سبب ہے۔

”ٹھیک ہے مگر دیکھو..... تم جتنا جلد ہو سکے مجھ سے ملاقات کرو۔ آغا سے الجھنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ معاملہ بڑھ بھی سکتا ہے۔“ اتنا کہہ کر وہ پھر کچھ دیر خاموشی سے سنتے رہے پھر بولے۔ ”اوکے..... سی یو..... اور ہاں تھینک یو.....“ نہیں نہیں اس سلسلے میں جو کچھ مجھ سے ہو سکا میں ضرور کروں گا، نہیں..... اب ضرورت نہیں، شاید میرا کام اب آسانی سے ہو جائے۔“ آخری جملہ کہتے ہوئے انہوں نے مجھے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔

میں جو نیلی فون پر بولنے والے کی آواز سن کر بے چین ہو گیا تھا جھجک کر دوسری

وہ یہ کہ بہادر اسی ہفتے میں سیمال کو برطانیہ بھیج رہا ہے۔ ویسے تو اس نے سیمال سے کہا ہے کہ وہ کچھ عرصہ گھوم پھر لے مگر مجھے یقین ہے کہ وہ بلا مقصد اسے نہیں بھیج سکتا۔ وہ ضرور اسے استعمال کرے گا۔“

”مسٹرزید آپ ایک کام کیوں نہیں کرتے، آپ اگر میری بجائے سیمال کو اغوا کروا لیتے اور اسے یہ تمام کہانی سناتے تو شاید آپ کی ساری پریشانیاں دور ہو جاتیں اور آپ کی بیٹی بھی آپ کو مل جاتی۔“

”یہ اتنا آسان نہیں ہے مسٹر اقبال..... میں یہ بات بہت پہلے سوچ چکا ہوں۔ بہادر نے جو زہر سیمال کے اندر بھرا ہے وہ اتنی آسانی سے ختم نہیں ہو گا۔ اپنی بے گناہی کے جو ثبوت میں حاصل کرنا چاہتا ہوں بس وہی سیمال کے دل سے میری نفرت کو نکال سکتے ہیں اور آپ اس سلسلے میں میری مدد کا وعدہ بھی کر چکے ہیں۔“

”میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی ہے کہ آپ ہر معاملے کو اس طرح گھما پھرا کر کیوں حل کرنا چاہتے ہیں۔ ثبوت حاصل کرنے کے لیے بھی آپ نے اتنا طویل چکر لگایا۔ حالانکہ مجھے یقین ہے کہ فاریہ اور بیگ صاحب خود ہی وہ بکس آپ کے حوالے کر سکتے ہیں۔ دوسری طرف سیمال.....“

”مسٹر اقبال.....“ اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے خاموش کرا دیا۔ ”میں اپنے ہر معاملے کو اپنے طور پر حل کرنے کا عادی ہوں۔ اگر کبھی مجھے آپ کے مشورے کی ضرورت پڑی تو میں ضرور مشورہ لوں گا۔“ اس نے روکھے انداز میں جواب دیا اور میں خاموش ہو گیا۔

اس دوران میں لان میں سے ادریس کی میت اٹھالی گئی تھی۔ مس زینی اس کی تدفین کے انتظامات کروا رہی تھیں۔ میں کھڑے کھڑے تھک گیا تھا۔ شاید مسٹرزید سمجھ گئے تھے اس لیے کہ وہ فوراً ہی اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

”آئیے مسٹر اقبال اندر بیٹھتے ہیں۔“

ہم دونوں ایک دوسرے کے پیچھے چلتے ہوئے ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے۔ مسٹرزید ایک صوفے میں دھنس گئے اور مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اسی لمحے فون کی گھنٹی بجی، نیلی فون میرے قریب ہی رکھا تھا جبکہ مسٹرزید یہاں سے کافی دور تھے انہوں نے تھکے ہوئے انداز میں فون کو دیکھا اور پھر مجھے ریسپور اٹھا لینے کا اشارہ

طرف دیکھنے لگا۔ میں مسٹر زید پر اپنی بے چینی کا اظہار کرنا نہیں چاہتا تھا۔
”اوکے..... میں منتظر ہوں۔“ انہوں نے ریسور کریڈل پر ڈال دیا اور گہری سانس لی یوں جیسے ان کا کوئی بہت بڑا کام ہو گیا ہو۔

میں نے کن آنکھوں سے وال کلاک کی طرف دیکھا جو اب سواتین بج رہا تھا۔ مجھے شدید بھوک کا احساس ہو رہا تھا۔ دوسری جانب مجھے فاریہ کی طرف سے بھی سخت پریشانی تھی۔ اس نے بڑی شدت سے میرا انتظار کیا ہو گا۔ اب وہ ناسامید ہو گئی ہوگی اور جانے کیا کیا سوچ رہی ہوگی اور سوہنی..... جانے کیسی ہوگی کس قدر خراب قسمت تھی اس کی کہ خوشی جب بھی بڑھ کر اس کی دہلیز کو چھوتی تھی وہ عذابوں میں گھر جاتی تھی۔ پہلی بار جب اس نے اپنی آنکھوں میں میرے پیار کا پنا سجایا تو قدرت نے مجھے اس سے چھین لیا، ہم جدائیوں کی فصلیں کاٹتے رہے اور اسے لوٹا جاتا رہا اور اب جب وہ مجھے دوبارہ نصیب ہوئی، اس کی بھی آنکھوں میں دیے سے ٹٹمائے تو ایک بار پھر میں اس سے چھین لیا گیا، جانے میں اس کی اور وہ میری قسمت میں تھی یا نہیں۔

”مسٹر اقبال! مجھے آپ کی پریشانی کا احساس ہے مگر یقین کیجئے میں بے حد مجبور ہوں۔“ مسٹر زید کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”اوہ نہیں مسٹر زید، آپ پریشان نہ ہوں۔ مجھے ان چھوٹی چھوٹی پریشانیوں کی عادت سی ہو گئی ہے۔“

”طنز کر رہے ہیں؟“

”نہیں نہیں بھلا میری ایسی مجال کہاں میں حقیقت بتا رہا ہوں۔“

اسی لمحے زینی کمرے میں داخل ہوئی۔ ”سر کھانا لگا دیا گیا ہے۔“

”آئیے مسٹر اقبال۔“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کے چہرے پر ایسی کوئی بات نہ تھی جس سے احساس ہوتا کہ وہ کچھ دیر پہلے کسی تدفین کا انتظام کر رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ صبح سے اب تک کھانے ہی کے انتظام میں مصروف تھی۔ اس کی مخمور نگاہوں میں وہی معصومیت تھی۔ ہونٹوں پر نرم سی گیلی گیلی مسکراہٹ جو آدمی کو خواہ مخواہ تروتازگی کا ایک فرحت انگیز سا احساس دلاتی ہے۔

مسٹر زید کے ساتھ ہی میں بھی کھڑا ہو گیا۔ ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے ڈائینگ روم

میں پہنچے جہاں نور نگاہیں جھکائے گہری خاموشی میں سٹی کھانا لگا رہی تھی ہمیں دیکھتے ہی وہ ذرا سا جھکی اور کرسی پیچھے کی طرف سرکا کر مسٹر زید کے بیٹھنے کا انتظار کرنے لگی۔ مسٹر زید کے بیٹھتے ہی میں اور مس زینی بھی اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ نور نے فوراً ہی کھانا سرو کرنا شروع کر دیا۔ مجھے اس کے وجود سے لپٹی افسردگی اور خاموشی کو دیکھ کر وحشت سی ہو رہی تھی۔ میرے ذہن سے مس زینی کی شخصیت کا فرحت انگیز احساس زائل ہو کر مس نور کے وجود کا وحشت ناک احساس رہینگئے لگا تھا۔

کچھ دیر کے بعد وہ خاموشی سے سر جھکائے کمرے سے باہر چل گئی۔ میری نگاہیں اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔ شاید اس بات کو مسٹر زید نے بھی محسوس کر لیا تھا۔

”مسٹر اقبال..... یہ بچی جب صرف دس برس کی تھی تبھی سے میرے پاس ہے۔ یہ پہلے ایسی نہیں تھی۔ بات بات پر ہنسنے اور خوش ہونے والی بچی تھی مگر جب محمد بخش اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا تو..... اس نے اس کی ساری خوشیاں چھین لیں۔ اسے بتا دیا کہ یہ اس کی بیٹی نہیں ہے بلکہ اسے اس کی بانجھ بیوی نے چرایا تھا۔ اسے بچے کی بڑی تمنا تھی اور یہ تمنا اتنی شدید ہو گئی تھی کہ وہ یہ جرم کر بیٹھی۔ محمد بخش اپنی مجبور بیوی کا جرم چھپائے چھپائے جانے کہاں کہاں پھرتا رہا اور پھر تقدیر انہیں یہاں تک لے آئی۔ محمد بخش میرے پاس ملازم ہو گیا۔ اس کی بیوی سارے گھر کی دیکھ بھال کرنے لگی اور میں..... میں نور میں سیماں کا عکس تلاش کرنے لگا مگر وہ جانے کیوں مجھ سے ڈرتی تھی اور کبھی میرے سامنے نہیں آتی تھی۔ نہ ہی مجھ سے بے تکلف ہوتی تھی۔ اسے شدت سے یہ احساس تھا کہ وہ اس کی ماں اور اس کا باپ میرے ملازم ہیں۔“ اتنا کہہ کر مسٹر زید لمحہ بھر کو ٹھہرے، انہوں نے نوالہ منہ میں رکھا۔ چند لمحے کچھ سوچتے رہے پھر بولے۔ ”پھر اس کی ماں..... نہیں بلکہ محمد بخش کی بیوی مر گئی اور دو برس بعد محمد بخش بھی شدید بیمار ہو کر بستر سے جاگا، تب ہی ایک روز اس نے مجھے بلوایا اور نور کو بھی اپنے پاس بٹھالیا۔“

”صاب جی، اس بچی کو آپ کے حوالے کر رہا ہوں..... اور اس کی ذات سے وابستہ وہ راز بھی آج افشا کر رہا ہوں جسے سنبھالے سنبھالے میرے سینہ دکھ گیا ہے۔ اب اور جیا نہیں جاتا صاب جی۔“ اس نے اکھڑی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا تو میں حیران ہو

گیا تھا مسٹر اقبال، کہ بھلا اس کی اپنی بچی کی ذات سے کون سا ایسا راز وابستہ ہے جسے وہ ان حالات میں، اپنے آخری وقت میں افشا کرنا چاہتا ہے۔ مگر جب اس نے بتایا کہ نور کو چھ یا سات برس کی عمر میں اس کی بیوی سیکھنے نے ایک گاؤں کے کھیت سے اغوا کیا تھا تو میں ہی نہیں خود نور بھی اچھل پڑی تھی۔ پھر محمد بخش نے بتایا کہ سیکھنے نے مرتے دم تک مجھے اس گاؤں کا نام نہیں بتایا کہ کہیں میں بچی کو واپس نہ کر آؤں۔ اب میں اس بچی کو آپ کے سہارے چھوڑے جا رہا ہوں، یہ اگر اپنے ذہن پر زور دے کر کچھ یاد کر سکے تو ٹھیک ہے ورنہ..... سیکھنے کے جرم کی معافی مانگنے کے سوا میرے بس میں کچھ بھی نہیں۔ پھر اس نے نور سے کہا تھا کہ بیٹا اگر میں جانتا کہ تو کس کی بچی ہے تو اپنی بیوی کی اور اپنی خوشیوں کا گلا گھونٹ کر تجھے تیرے اپنوں کو لوٹا دیتا۔ پھر مسٹر اقبال، وہ نور کو ایک اذیت ناک کیفیت میں مبتلا کر کے مر گیا۔ یہ اس نے بہت برا کیا، ایک جرم اس کی بیوی نے کیا تھا اور دوسرا جرم وہ خود کر کے مر گیا تھا۔ نور اپنوں کی موت پر رو کر چپ ہو جاتی مگر وہ تو اسے اپنوں کی جدائی کا ایسا دکھ دے گیا جسے رو کر بھول جانا اس کے بس میں ہی نہیں، بس اسی روز سے نور بالکل بدل گئی۔ میں نے بہت چاہا کہ وہ یہاں بیگانوں کی طرح نہ رہے مگر.....“

مسٹر زید خاموش ہوئے تو مجھے اپنے وجود میں بہتے درد کا احساس ہونے لگا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کائنات میں بھکری تمام اذیتیں میرے ہی گرد گھیرا ڈال کر ناچ رہی ہیں۔ میں گاؤں سے ملنے والے دکھوں کو جھولی میں بھر کر نکلا تو مجھے بالکل اندازہ نہ تھا کہ یہ دکھ بڑھ کر میرے ارد گرد حصار سا بنالیں گے۔ مجھے تو یہ گمان تھا کہ راجہ اور خان وغیرہ کے ملنے کے بعد، ان کی مدد سے میں اپنے دکھوں سے آزاد ہو جاؤں گا اور زندگی کو کچھ ایسے برتوں کا گہ خوشیاں میرے، ماں کے اور سوہنی کے دکھوں کے عکس کو دھندلا دیں گی مگر یہاں تو ہر شخص کے وجود سے افسردگی اور دکھوں کی ٹیمیں سی اٹھتی محسوس ہوتی تھیں یوں لگتا تھا جیسے میں زندگی کو نہیں بلکہ دکھوں کو پر کھنے اور برتنے کے لیے نکلا ہوں۔

دکھوں کا یہ گھنا جنگل کب ختم ہو گا، کب اذیتوں کی یہ طویل رات کٹے گی، کب میں اس اندھی رات کی خوفناک سرنگ سے باہر نکلوں گا، کچھ پتا ہی نہ چلتا تھا۔ دور دور تک ایسی کوئی کرن نہ تھی جسے اپنی منزل سمجھ کر میں اس سمت بڑھنے کی کوشش کرتا اور مجھے

یہ آس بندھتی کہ یہ طویل اور اندھی رات کہیں نہ کہیں ضرور ختم ہو جائے گی۔ اگر کوئی کرن نظر بھی آئی اور میں نے اسی سمت قدم بھی بڑھائے تو بہت جلد یہ احساس ہو گیا کہ وہ روشنی کی کرن نہ تھی بلکہ میرے احساس کا دھوکا تھا۔ یہ کرن خود میرے ہی ذہن نے تراشی تھی اس ذہن نے جو دن رات کرنوں کے خواب دیکھا کرتا تھا یہ تمام کرنیں میری اپنی تمنا کے سوا کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتی تھیں۔

”مسٹر اقبال کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔“ مس زینی کی مترنم آواز مجھے سوچوں کے گنبد اندھیرے سے باہر لے آئی۔

”سوری۔“ میں نے چونک کر جواب دیا اور کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مسٹر زید مجھے گہری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے ان کی نگاہوں کی تیزی اور گہرائی کو اپنے چہرے پر سرسرا تا محسوس کیا مگر میں نے سراٹھا کر نہ دیکھا۔

”آپ مس نور سے بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں۔“ مسٹر زید نے قورمہ اپنی پلیٹ میں نکالتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں مسٹر زید، یہاں آپ کا جملہ غلط ہے۔“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ اب میں خود کو بہت حد تک سنبھال چکا تھا۔ ”کتنا یوں چاہیے کہ میں یہاں آکر بہت متاثر ہوا ہوں۔“ میں نے لفظ یہاں پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی شخصیت، مس زینی کی شخصیت اور کردار، جگو کی وفا..... اور پھر بے وفائی، مس نور کا وجود اور اس کے گرد لپٹی ہوئی افسردہ سی خاموشی..... یہ سب تھیر خیز ہے۔ کم از کم میرے لیے یہ سب کچھ عجیب ہے۔“ میں نے بڑے مضبوط اور پُر اعتماد لہجے میں جواب دیا۔

”فاریہ، زاریہ، بیگ صاحب اور بہادر..... پھر سیمال..... ان سب کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے، آپ کی کہانی کے مطابق تو آپ کی زندگی سے ان سب کا بھی کوئی تعلق نہیں تھا اور جس چیز کا تعلق آدمی کی اپنی زندگی سے نہ ہو مگر پھر اچانک وہی چیز اس کی زندگی کا مرکز بن جائے، وہ بھی عجیب محسوس ہوتی ہے۔“ مسٹر زید نے دیکھے لہجے میں کہا۔

”یقیناً..... میرے لیے وہ سب بھی کم تھیر خیز نہ تھے..... مگر اب تک شاید میں ان کا عادی ہو چکا ہوں۔“

”ہم سب بھی آپ کے عادی ہو جائیں گے، مسٹر اقبال، زندگی تو آپ کو کسی نہ کسی طور گزارنا ہی ہے۔ گاؤں میں یہ محدود تھی اور رہ سکتی تھی مگر اب جبکہ آپ گاؤں چھوڑ آئے ہیں تو یہاں کے دکھ درد، تشیب و فراز سب جداگانہ انداز رکھتے ہیں اور آپ کو اب ان سب چیزوں کو انہی کے انداز میں پرکھنا ہو گا۔“

”جی مسٹر زید“ میں کوشش کر رہا ہوں مگر..... گاؤں میں دکھوں کا بھی اور خوشیوں کا بھی یہ معیار نہیں تھا۔ وہاں کے دکھ بھی اور خوشیاں بھی دونوں ہی معصوم اور سادہ ہوتی ہیں، وہاں ہمیں دکھ اور خوشیاں دھوکا نہیں دیتے مگر یہاں مجھے قدم قدم پر دکھ اور خوشیاں دھوکا دے جاتے ہیں۔ جسے میں دکھ سمجھتا ہوں وہ دکھ نہیں نکلتا اور جسے میں خوشی محسوس کرتا ہوں وہ خوشی نہیں ہوتی۔ اب آپ اپنی مثال ہی لے لیں۔ آپ نے مجھے اغوا کروایا، تمہ خاں میں قید رکھا، اور میں آپ کو اپنا کوئی بڑا دشمن سمجھ کر دکھ اٹھانے کو تیار ہو گیا پھر سب کچھ بدل گیا۔ آپ مہربان نکلے، آپ نے میری توقع سے بڑھ کر عنایات کیں۔ میں آپ کو فاریہ کا حریف اور ہیروئن کا اسمگلر سمجھا تھا مگر آپ..... محض ایک دکھی باپ کی حیثیت سے سامنے آئے۔ جس کی بیٹی کو نہ صرف اس سے چھین لیا گیا بلکہ اسے باپ سے متفرک کر دیا گیا۔ یہ دھوکا نہیں تو اور کیا ہے؟ اور وہ..... سوہنی، جسے اپنے سامنے پا کر میں نے سمجھا کہ مجھے دنیا کی سب سے بڑی خوشی مل گئی، میرا پیارا میری دسترس میں آ گیا۔ جدائی کا دکھ ختم ہو گیا..... وہ..... وہ لوٹی جا چکی ہے..... وہ جسے میں اپنی زندگی سمجھا تھا خود دھیرے دھیرے موت کی طرف بڑھ رہی ہے میں چاہوں بھی تو اس کے ساتھ زندگی گزارنے کا خواب پورا نہیں کر سکتا اس لیے کہ..... کہ وہ نشے کی عادی ہے، نشہ اس کی رگوں میں رچ بس گیا ہے۔ میں ایک نہ ایک روز اسے کھو دوں گا۔“

”اوہ مسٹر اقبال..... ڈونٹ وری..... زندگی ایسی ہی ہوتی ہے، یہاں آسمانوں کی بلندیوں کے ساتھ انتہائی پستیاں بھی ہیں اور بلندیوں اور پستیوں کو کائنات میں یکجا کر کے خدائی توپتا رہا ہے کہ زندگی یہ ہے اور جب زندگی یہ ہے مسٹر اقبال تو ہر زندہ شے کو ان دونوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ اس سے بچنے کا صرف اور صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ زندگی کو ختم کر لیا جائے مگر یہ بات نہ بھولیے کہ زندگی کو از خود ختم کرنے والا پھر

پستیوں کی طرف گامزن ہو جاتا ہے، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جبکہ زندہ رہ کر وہ ایسے کام کر سکتا ہے جو موت کے بعد اسے بلندیوں کی طرف لے جاتے ہوں۔“

”ٹھیک کہتے ہیں آپ.....“

”تو پھر آپ کھانا کھائیے، خود کو ان جھمیوں سے آزاد کر لیجئے اور ہر جذبے کو اس کی تمام تر سچائیوں کے ساتھ محسوس کرنے کی کوشش کیجئے، ہر جذبے کی ایک الگ لذت ہے مسٹر اقبال، خواہ ہمیں پسند ہو یا نہ ہو مگر ہونا یہی چاہیے کہ ہم اپنی ذات میں محسوس ہونے والے جذبے کو پوری شدت سے محسوس کریں، ایسا کرنا ہمارے علم اور تجربے میں اضافہ کرتا ہے۔ ہمارے اندر قوت پیدا کرتا ہے اور یہ قوت زندگی کو ہم پر آسان کر دیتی ہے۔“

”آپ کی باتیں سن کر ایسا ہی لگ رہا ہے مسٹر زید۔ زندگی شاید آپ پر آسان ہو چکی ہے۔“ میں نے مسٹر زید کے چمکتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر کہا۔ مجھے اس کی باتیں سن کر واقعی اس کی ذہانت، علم اور تجربے کا احساس ہو رہا تھا۔

وہ مسکرایا۔ میں کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ زینی کھانے سے فارغ ہو چکی تھی اور کسی گہری سوچ میں غرق تھی۔ مسٹر زید کو دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ وہ محض میرا ساتھ دے رہے ہیں ورنہ وہ بھی کھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔ کچھ دیر بعد نور چائے کی ٹرائی لیے پھر کمرے میں داخل ہوئی۔ ہم سب کو چائے دے کر وہ پھر اسی خاموشی سے باہر چلی گئی۔

”مسٹر زید..... میں فاریہ کو فون کروں گا۔ اس سے اپنے وہاں پہنچنے کے بارے میں کیا کہوں؟“

”مسٹر اقبال، اصولاً آپ کو روکنا تو نہیں چاہیے مگر میں نے شاید آپ کو پہلے بھی بتایا تھا کہ میں آپ کو کسی سے ملوانا چاہتا ہوں شاید آج ہی رات کو ملوا دوں، اگر آج ایسا نہ ہو سکا تو انشاء اللہ کل تک ضرور ہو جائے گا، پھر آپ جا سکیں گے۔ میرا خیال ہے کہ آپ فاریہ سے صرف دو روز کی مہلت اور مانگ لیں اس تاخیر کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔“

”وہ کون ہے مسٹر زید جس سے میری ملاقات ضروری ہے؟“

”اس سلسلے میں اگر آپ کچھ صبر کر لیں تو.....“ اس نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ پھر میں نے اصرار نہیں کیا۔ وہ جو بھی تھا اسے بہر حال میرے سامنے تو

آنا ہی تھا۔ میں نے سر ہلایا، رست وایچ پر نگاہ ڈالی چار بج کر پچیس منٹ ہوئے تھے میں مسٹر زید اور زینی سے اجازت لے کر اپنے کمرے میں آگیا۔ میں نے سگریٹ سلگائی اور لیٹ گیا۔ میں کوئی ایسا بہانہ سوچنے لگا جو فاریہ سے کر سکوں اور وہ میرے بہانے سے مطمئن بھی ہو سکے۔ پہلے تو میں نے کہہ دیا تھا کہ میں جمال کے پیچھے یہاں تک پہنچ گیا ہوں اور سیماس اس کے ساتھ ہے مگر اب میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر عذر لانے اس دوران میں فاریہ سے رابطہ قائم کیا تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ سیماس وہیں لاہور میں موجود ہے۔ خود فاریہ کے بارے میں تو میں جانتا تھا کہ ان حالات میں اسے اتنی فرصت نہ ہوگی کہ وہ خود سیماس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے جائے۔ اب مجھے کوئی ایسی بات کرنا تھی جو بنی رہتی اور فاریہ کو مجھ پر کسی قسم کا شک نہ ہوتا۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر بہت جلد میں نے بہانہ تراش لیا مگر اس وقت اسے فون کرنا بیکار تھا۔ میں اسے شام چھ بجے کے بعد ہی گھر پر فون کرنا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ میری طرف سے بہت پریشان ہوگی مگر پھر بھی ایسا ہو سکتا تھا کہ وہ فیکٹری گئی ہوئی ہو یا کہیں اور گئی ہو مگر چھ بجے کے بعد گھر پر ملنے کے سونی صد امکانات تھے۔

میں نے دو گھنٹے آرام کرنے کے بعد فاریہ کا فون نمبر ملایا۔ دوسری طرف کچھ دیر تک بیل بجتی رہی مگر کسی نے فون نہ اٹھایا تو میرا اضطراب بڑھنے لگا۔ ایسا ممکن نہ تھا کہ گھر میں کوئی نہ ہو۔ گھر کے لوگ نہیں ہوتے تو حمیدہ کو تو لازماً گھر میں ہونا چاہیے تھا اور ویسے بھی میرے نہ پہنچنے کی بناء پر فاریہ کو یہ امید ضرور ہوگی کہ میں اس سے کسی بھی حال میں فون پر رابطہ قائم کروں گا۔ اسے اگر کسی کام سے جانا بھی پڑ گیا تو وہ بیگ صاحب کو یا سلطان کو فون کے انتظار میں ضرور بٹھاتی۔ میں نے گھڑی دیکھی، مجھے ریسیور اٹھائے ہوئے تقریباً دو منٹ ہو چکے تھے۔ میں ریسیور رکھنے ہی والا تھا کہ اچانک دوسری طرف سے کسی نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ ”ہیلو.....“ یہ سلطان تھا۔

”ہیلو سلطان..... میں بالا ہوں۔“

”ہاں بالے..... تو کیوں نہیں آیا، ہم سب پریشان ہیں۔“

”سن سلطان..... میں شاید ابھی دو روز اور نہ آسکوں گا۔“

”کیوں..... کیا بات ہے..... کیا تو آنا نہیں چاہتا۔“

”بیکار باتیں نہ کر، یہاں میں جس معاملے میں الجھا ہوا ہوں، اس سے نکلنے میں مجھے کچھ وقت لگے گا۔“

”تو کہاں ہے..... اپنا فون نمبر کیوں نہیں دیتا..... نمبر دے، فاریہ بہت پریشان ہے، وہ رات بھر لان میں شعلتی رہی ہے اور آج بیمار ہو گئی ہے۔ اسے پتا چلا تو مزید پریشان ہو جائے گی۔ تو نمبر دیدے وہ اس وقت سو رہی ہے۔ تجھ سے بات کر کے مطمئن ہو جائے گی۔“

”میں کسی ایسی جگہ سے فون نہیں کر رہا کہ تجھے نمبر دوں۔ میں خود ہی رات کو یا کل صبح اس سے بات کر لوں گا، اور سن سوہنی کیسی ہے، ڈاکٹر کو دکھایا؟ اور ماسی؟“

”ماسی تو کچھ ٹھیک ہے بالے مگر سوہنی کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔ یہ تو اس کی قوت برداشت ہے ورنہ اس کی تڑپ دیکھ کر ہمارا جی چاہتا ہے کہ اسے زہر دے دیں۔“

”نہیں سلطان..... ایسا نہ کرنا..... وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ وہ میری امانت ہے سلطان اس کا خیال رکھنا اور ہاں..... عذر را کی کوئی اطلاع ہے؟“

”نہیں البتہ فاریہ یعقوب کو لے آئی ہے، وہ اس وقت بیگ صاحب کے پاس ہے، ان کے کمرے میں۔“

”یہ اچھا کیا اس نے، ٹھیک ہے پھر..... میں کسی وقت دوبارہ فون کر لوں گا، تو فاریہ کو بتا دینا کہ میں ٹھیک ہوں اور دو روز بعد شاید واپس آ جاؤں۔“

”شاید.....؟“

”ہاں یعنی ممکن ہے دو روز بعد یا ممکن ہے وقت کچھ اور بڑھ جائے مگر میں ٹھیک ہوں، وہ میرے لیٹ ہو جانے پر پریشان نہ ہو۔“

”بالے تو تو بے حس ہو گیا ہے، کسی کی تکلیف اور پریشانی کا تجھے کوئی بھی احساس نہیں، سوہنی کی خالی آنکھیں، ان میں تیرا بھیگا بھیگا انتظار مجھے تو بہت بے چین کر دیتا ہے بالے، وہ روز بروز کمزور ہوتی جا رہی ہے اسے دیکھ کر خوف سا آتا ہے لگتا ہے جیسے کسی بھی دم وہ ہم سے جدا ہو جائے گی مگر تو..... پتا نہیں تجھے کیا ہو گیا ہے؟“

”کچھ بھی نہیں ہوا ہے سلطان، بس دکھ چھپانے کا سلیقہ آ گیا ہے ورنہ انسان تو میں بھی ہوں اور سوہنی تو میرے لیے دنیا کی اہم ترین ہستی ہے مگر کیا کروں سلطان، میرے

گرد بُنا ہوا جال اس قدر مضبوط ہے کہ اسے توڑنا تھا میرے بس میں نہیں لگتا۔
بہر حال..... میں جلد آؤں گا، تو سب کو تسلی دے دینا، سوہنی کو بھی۔“

پھر اس سے پہلے کہ سلطان مزید کچھ کہتا میں نے ریسور رکھ دیا۔ میں اسے کیسے بتاتا
کہ یہ سب کچھ خود مجھے بھی پسند نہیں مگر یہاں آدمی اپنی پسند کی زندگی بھلا کب گزارتا
ہے۔ میں بہت دیر تک سوچوں میں الجھا رہا پھر انشکام کی آواز سے چونکا۔
”مسٹر اقبال..... سر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“ مس نور کی آواز سن کر میں

اٹھ بیٹھا۔

”مس نور وہ اس وقت کہاں ہیں؟“

”ڈرائنگ روم میں۔ ان کے مہمان آگئے ہیں۔ انہوں نے مجھے تاکید کی تھی کہ
میں آپ کو ضرور بتا دوں تاکہ آپ ذہنی طور پر تیار ہو جائیں۔“

”ذہنی طور پر تیار ہو جاؤں؟ میں سمجھا نہیں مس نور.....“

”آئی ایم سوری سر..... میں اس سلسلے میں کوئی وضاحت نہیں کر سکتی، سر کا حکم
تھا جو میں نے آپ کو پہنچا دیا۔“

”اوکے..... تھینک یو مس نور۔“ میں نے ریسور رکھ دیا اور ہاتھ روم کی
طرف چل پڑا۔

پندرہ منٹ بعد ہی میں ڈرائنگ روم کی طرف جا رہا تھا۔ میرا ذہن بہت الجھا ہوا
تھا۔ دل کسی نامعلوم خوف سے دھڑک رہا تھا، مس نور کی بات سننے کے بعد سے میں اب

تک یہی سوچتا رہا تھا کہ آنے والا آخر کون ہے کہ مسٹرزید نے مجھے ذہنی طور پر تیار رہنے
کو کہا ہے۔ کیا وہ کوئی ایسا آدمی ہے جسے میں جانتا ہوں اور یہ بات مسٹرزید کے علم میں بھی

ہے؟ ایسی ہی بات میرے ذہن میں شور مچاتی رہی اور میں ڈرائنگ روم کے دروازے
تک پہنچ گیا۔ دروازہ اندر سے بند تھا اور یہ بات تعجب خیز تھی۔ اب سے پہلے میں نے

کبھی اس دروازے کو بند نہیں پایا تھا۔ میں نے ہولے سے دستک دی۔ چند لمحوں بعد ہی
دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والے مسٹرزید تھے مگر انہوں نے دروازے کو پوری طرح

کھولے بغیر ہی مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا، میں آڑھا ہو کر اندر داخل ہو گیا۔ کمرے کی
تمام لائٹس بجھی ہوئی تھیں صرف کونے میں رکھا لیمپ روشن تھا جس پر گرے رنگ کے

شیڈ کی موجودگی کی وجہ سے روشنی بہت ہلکی تھی۔ میں نے وہاں صوفے پر ایک اور شخص
کو بیٹھے دیکھا، روشنی اس کے جسم کے نچلے حصے پر پڑ رہی تھی مگر چہرہ تقریباً اندھیرے میں
تھا اندھیرے میں بھی نہیں بلکہ چہرے پر پڑے والی روشنی اتنی کم تھی کہ میں اس شخص
کے نقوش نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اس دوران میں مسٹرزید نے ڈرائنگ روم کا دروازہ پھر لاک کر دیا تھا۔ وہ دروازہ
بند کرنے کے بعد میرے برابر میں آکھڑے ہوئے۔ ”مسٹر اقبال“ یہ ہیں وہ مہمان جن سے
آپ کو ملوانا چاہتا تھا۔“

”گڈ ایوننگ سر!“ میں اپنا دایاں ہاتھ بڑھا کر اس صوفے کی سمت بڑھا جہاں وہ
شخص بیٹھا ہوا تھا۔

”گڈ ایوننگ مسٹر اقبال۔“ اس نے جواب دیا اور ٹرمی سے میرا بڑھا ہوا ہاتھ تمام
لیا۔ اس کا انداز دوستانہ تھا۔

اس کی آواز سن کر مجھے یوں لگا تھا جیسے میری ہی آواز کی بازگشت در و دیوار سے
نکرا کر دوبارہ گونجی ہو۔

”بیٹھے مسٹر اقبال۔“ مسٹرزید نے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا اور میں
اس کے برابر بیٹھ گیا۔

”مسٹرزید..... آپ نے ابھی تک مجھے اپنے مہمان سے متعارف نہیں کروایا۔“
میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

”یہی میرے مہمان ہیں مسٹر اقبال۔“
”جی ہاں..... آپ کے مہمان کا ہیولا میرے سامنے ہے اور میں ان کی آواز بھی
سن چکا ہوں مگر.....“

”اوہ..... آئی سی۔“ یہ کہہ کر مسٹرزید اٹھے اور انہوں نے سوچ بورد کے پاس
جا کر ایک بٹن دبا دیا کمر ایک دم روشن سا ہو گیا اور میں سامنے بیٹھے شخص کو دیکھ کر کھڑا
ہو گیا۔

”میں جانتا تھا اسی لیے میں نے اتنا وقت لیا تھا۔ بہر حال یہ جمال ہے، میرا بھتیجا۔“
اور میں حیرت سے اس شخص کو دیکھ رہا تھا جو ہو ہو میرا اپنا عکس محسوس ہو رہا تھا۔

سوائے اس کے کہ اس کے بالوں اور مونچھوں کا رنگ بہت کالا نہیں بلکہ کچھ بھورا بھورا سا تھا۔ اس میں اور مجھ میں کوئی بھی فرق نہ تھا۔ وہ خود بھی مجھے دیکھ کر اتنا ہی حیرت زدہ تھا جتنا کہ میں۔

”یہ..... یہ.....؟“

”ہاں جمال، یہ مسٹر اقبال ہیں، میرے دوست جنہیں پہلی بار دیکھ کر میری اپنی بھی ایسی ہی کیفیت ہوئی تھی جیسی اس وقت تم لوگوں کی ہو رہی ہے مگر مجھ میں قوت برداشت تم لوگوں سے زیادہ ہے اس لیے مسٹر اقبال میری اس حیرت کو محسوس نہ کر سکے۔ اب تمہاری سمجھ میں میرا تمام پلان آگیا ہو گا۔“

آخری جملے پر جمال چونک کر مسٹر زید کو دیکھنے لگا۔ پھر اس کی آنکھوں میں ستائش بھر گئی۔ ”اوہ..... ونڈر فل..... ایکسی لینٹ“۔ وہ ران پر ہاتھ مار کر بولا۔

نہ معلوم کیوں میرا دل گھبرانے لگا۔ آنے والے خطرات کا مبہم سا احساس مجھے ہونے لگا تھا۔ مسٹر زید نے لفظ پلان کہا تھا اور اسی لفظ پر میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ جو کچھ میں سمجھ رہا تھا اگر وہی سب کچھ ہونے والا تھا تو یہ سب سے خطرناک بات تھی۔ میری پریشانی بڑھتی جا رہی تھی مگر میں خود کو کسی نہ کسی طور سنبھالے ہوئے تھا۔ وہ دونوں میری طرف متوجہ تھے۔ جمال مجھے بالکل اس انداز میں دیکھ رہا تھا جیسے میں نے بکرا خریدنے والوں کو بکرے کو دیکھتے محسوس کیا تھا۔

”انکل آپ کے پلان میں کامیابی اسی وقت ممکن ہے جب میں مسٹر اقبال سے پوری طرح واقف ہوں، ان کا انداز گفتگو، چال ڈھال ان کے حالات اور سب سے اہم ان کی اس گھر میں اہمیت سے واقفیت ہی معاملے کو آسان بنا سکتی ہے۔“

”ان تمام امور پر میں پہلے ہی سوچ چکا ہوں اور انہی معاملات کی نزاکت ہی کی بناء پر میں نے مسٹر اقبال سے کچھ روز اور ٹھہر جانے کی استدعا کی ہے، اب ان سے تمام کچھ سیکھنا تمہارا کام ہے۔ مجھے تو ایک اہم میننگ میں اسلام آباد جانا ہے جب میں واپس آؤں تو تمہیں مکمل ہونا چاہیے۔ میرا مطلب ہے کہ میں تمہیں مسٹر اقبال سمجھوں اور دھوکا کھا جاؤں، اتنا پرفیکٹ.....“

”آپ فکر نہ کریں انکل، دو دن میرے لیے بہت ہیں۔“ جمال نے مسرور لہجے میں

جواب دیا۔

میں جواب تک ہونقوں کی طرح ان دونوں کی گفتگو سن رہا تھا اب وہ پلان سمجھ چکا تھا۔ خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ان کے اس پلان کا مقصد تھا کہ یا تو دنیا سے ہی میرا پتا صاف ہو جانا یا پھر لمبی مدت کے لیے پھر اسی تہ خانے میں قید ہو جانا جہاں سے نکال کر مجھے اس عظیم الشان کوٹھی میں لایا گیا تھا۔

زید، جمال کو میری جگہ دے کر بیگ صاحب کی کوٹھی میں بحیثیت اقبال بھیجنا چاہتا تھا۔ وہ ایسا آسانی کے ساتھ کر سکتا تھا۔ کیونکہ جب جمال کو دیکھ کر میں خود دھوکا کھا گیا تھا تو بھلا فاریہ وغیرہ اسے کس طرح پہچان سکتے تھے، مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ اگر مجھے اغوا کروانے کا مقصد یہی تھا تو پھر یوں آزاد کیوں چھوڑا گیا؟ یہ تو اتفاق تھا کہ اس پراسرار گیلری میں جانے کا مجھے خیال آگیا اور بہ قول زید کے ادریس میرے ہاتھوں زخمی ہو جانے کے بعد مر گیا۔ ورنہ تو میرا ٹکٹ لیا جا چکا تھا، میں واپس لاہور جانے والا تھا۔ مجھے فاریہ کو فون کرنے کی آزادی دی گئی تھی پھر اچانک مسٹر زید کا پروگرام بدل گیا، کیوں؟ بس یہی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

”مسٹر اقبال..... اب آپ جمال سے باتیں کریں، مجھے تو جانا ہے، میں آج ہی رات کی فلائٹ سے جا رہا ہوں، انشاء اللہ بہت جلد آپ سے ملاقات ہو گی۔“

مگر مسٹر زید..... میں آپ لوگوں کی گفتگو سے الجھ گیا ہوں۔ آپ کے ذہن میں کیا ہے؟“

”یہ آپ کو جمال بتا دے گا۔ مسٹر اقبال، ویسے آپ کو یہاں میری غیر موجودگی میں کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔ آپ گھبرائیے نہیں.....“

”مسٹر زید..... آپ مسلسل مجھ پر جبر کر رہے ہیں اور ساتھ ہی یہ ہدایت بھی ہے کہ گھبراؤں نہیں۔ جو کچھ میں سمجھا ہوں وہ کسی بھی طور مناسب نہیں ہے مسٹر زید..... آپ فاریہ کے سلسلے میں شاید غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ وہ بے حد ذہین اور چالاک ہے۔ اسے دھوکا دینا آسان نہیں ہے۔ میں آپ سے وعدہ کر چکا ہوں کہ آپ کا کام کر دوں گا پھر یہ کھڑاگ پھیلانے کا فائدہ؟“

”مسٹر اقبال، میں پہلے بھی آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں معاملات کو اپنے طور پر حل

کرنے کا عادی ہوں، کسی کا مشورہ اسی وقت قبول کرتا ہوں جب اس کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ دوسری بات یہ سچ ہے ہمارے درمیان معاملہ طے پا چکا ہے مگر یہاں غلطی آپ ہی سے ہوئی ہے اس میں میرا کوئی قصور نہیں، گویا یہ کلباڑی اپنے پیروں پر خود آپ نے ہی ماری ہے۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ جناب کہ پہلی بار فاریہ کو فون پر آپ ہی نے جمال کی کہانی سنائی تھی۔ اس سے پہلے میرے ذہن میں کچھ بھی نہ تھا، جمال والی بات سن کر ہی میرا ذہن اس نہج پر کام کرنے لگا اور پھر میں نے پروگرام بدل دیا۔ میں اپنے کسی معاملے میں کسی بھی شخص پر اعتماد کرنے کا عادی نہیں رہا، اس لیے میں نے یہ حل تلاش کیا ہے، اس معاملے میں جمال خود بھی ملوث ہے اس لیے یہ تمام تر احتیاط کر سکے گا۔ جبکہ آپ نادانستگی میں کوئی غلطی بھی کر سکتے ہیں۔ بہر حال پروگرام بدل جانے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہم میں دوستانہ مراسم نہیں رہے یا خدا نخواستہ یہاں آپ کو کوئی اذیت دی جائے گی۔ ایسا صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب آپ تعاون کرنے سے انکار کریں۔ جمال محض دو تین روز کے لیے وہاں جائے گا، یہ جیسے ہی خیریت سے واپس آئے گا آپ کو روانہ کر دیا جائے گا۔ اس سارے پلان میں آپ کی پریشانی والی کوئی بات نہیں۔“

وہ اس اطمینان سے باتیں کر رہا تھا جیسے کوئی ٹی وی پروڈیوسر آرٹسٹ کو ڈرامے کی پھولیشن سے آگاہ کر رہا ہو اور اسے اس کا رول سمجھا رہا ہو، اسے قطعاً اس بات کا احساس نہیں تھا کہ ایئر کنڈیشنر چلنے کے باوجود میری کنپٹیوں سے پسینا بہہ کر رخساروں تک آگیا ہے۔ میں سمجھ چکا تھا کہ مسٹر زید کی بکس والی کہانی سراسر جھوٹ پر مبنی ہے اور یہ کوئی ایسا کام ہے جو کسی کی تباہی کا سبب بھی بن سکتا ہے کس کی تباہی کا؟ یہ مجھے اب بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا مگر بہر حال جمال کا میرے روپ میں وہاں جانا کسی خطرے کا پیش خیمہ تھا۔

”اوکے مسٹر اقبال..... اب میں چلتا ہوں اگر اب بھی آپ کے ذہن میں کوئی الجھن ہو تو جمال موجود ہے۔“ پھر وہ جمال سے مخاطب ہوا۔ ”جمال، میں بڑی تفصیل سے تمہیں ایک ایک بات بتا چکا ہوں، اقبال کی تمام کہانی ریکارڈ ہو چکی ہے۔ ٹیپ تمہیں زینی سے مل جائے گا۔ اسے سن لینا اور اچھی طرح ذہن نشین کر لینا، باقی جو کچھ پوچھنا ہو تو مسٹر

اقبال سے پوچھ سکتے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تمہارے ساتھ مکمل تعاون کریں گے۔ ان کا ہر طرح خیال رکھنا اب تمہارا کام ہے، یہ میرے معزز مہمان ہیں۔“

”آپ فکر نہ کریں انکل، ہم اچھے دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے تعاون کریں گے۔“ اس نے مسکرا کر کہا مگر اس کی مسکراہٹ میں خباثت بھری ہوئی تھی اور آنکھوں میں میرے لیے دھمکی تھی۔

اب میں سمجھ چکا تھا کہ میرا کچھ کہنا سننا بیکار ہے۔ وہ جو بھی فیصلہ کر چکے ہیں اس پر قائم رہیں گے اور ان کا فیصلہ بدلنا میرے بس میں نہیں اس لیے میں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ مسٹر زید نے کھانا ہمارے ساتھ ہی کھایا اور پھر ہم سے رخصت ہو کر چلے گئے۔ مجھے جمال کے قرب سے وحشت ہو رہی تھی۔ وہ مجھے بڑی گہری اور چھینے والی نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ میں مسٹر زید کے رخصت ہوتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

”ہوں..... خیریت.....؟“ جمال نے چونکتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں مسٹر جمال میں..... سر میں درد محسوس کر رہا ہوں۔ سونا چاہتا ہوں، اگر آپ اجازت دیں تو.....“

”اودہ شیور..... میں بھی آرام کروں گا، سفر کی تکان نے نڈھال سا کر دیا ہے اور ویسے بھی تھکا ہوا ذہن سوچنے سمجھنے اور خصوصاً سیکھنے کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے، ہمیں صبح فریش ہو کر ایک دوسرے سے ملنا چاہیے۔ اس دوران میں آپ بھی یقیناً خود کو تعاون پر آمادہ کریں گے، یہ سب اگر دوستانہ ماحول میں ہو تو آپ کے لیے بہتر رہے گا۔ ورنہ آپ کی اذیت مجھے اور انکل دونوں کو پریشان کر دے گی۔“ اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا اور پھر اپنا ہاتھ مصافحہ کے لیے میری جانب بڑھا کر بولا۔ ”اوکے سی یو۔“

میں نے خاموشی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کے شائستہ جملوں میں چھپی دھمکی کو میں جان چکا تھا۔ اس کی بات کا جواب دیے بغیر میں تیزی سے ڈرائنگ روم سے باہر آ گیا۔ میں سیدھا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ میں کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ میں کسی نہ کسی طریقے سے فاریہ کو اطلاع کرنا چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے مگر مجھے یقین نہیں تھا کہ میں اس سے رابطہ قائم کر سکوں گا میرا خیال تھا کہ اب فون میرے کمرے میں نہیں ہو گا۔ ایک ہی ذریعہ تھا میرے پاس جس سے کام لے کر میں فاریہ کو خبردار کر سکتا

تھا۔ میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سائیڈ ٹیبل پر نگاہ ڈالی۔ ٹیلی فون اب بھی موجود تھا۔ اسے وہاں دیکھ کر میری جان میں جان آگئی۔ آدھی پریشانی دور ہو گئی۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آدھی رات کو فاریہ کو فون کر کے تمام حالات سے آگاہ کر دوں گا۔ اس اطمینان کے بعد میں کپڑے بدل کر بستر میں لیٹ گیا۔ میں نے سگریٹ سلگا لیا۔ اب میں صرف یہ سوچنا چاہتا تھا کہ میں جمال کو کس طرح دھوکا دوں اسے مس گائیڈ کروں۔ مگر مجھ سے ایک فاش غلطی سرزد ہو چکی تھی۔ میں نے مسٹر زید کی کمانی پر یقین کرنے کے بعد اسے اپنی تمام رام کمانی بھی سنادی تھی جسے غالباً وہ ٹیپ کر چکا تھا۔ اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ مسٹر زید کی سنائی ہوئی داستان سراسر جھوٹ پر مبنی ہوگی اس کے حقیقت ہونے کا کوئی ثبوت نہ تھا، ہاں یہ سب کچھ اس وقت حقیقت ہوتا جب وہ واقعی اپنے کسے کے مطابق مجھے جانے دیتا اور یہ بھی سچ ہے کہ میں اس کا کام بھی بڑی دیانت داری سے کر دیتا مگر اب..... اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ کمانی مجھے محض اس لیے سنائی گئی تھی تاکہ میں اس سے متاثر ہو کر اپنی رام کمانی اسے سنادوں، وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہو چکا تھا۔ گویا اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اب تو صرف ایک ہی صورت رہ گئی تھی کہ میں کسی طور پر فاریہ کو اطلاع کر سکوں۔ جمال کو مس گائیڈ کروں یا یہاں سے فرار ہو کر لاہور پہنچ جاؤں۔ جمال کو مس گائیڈ کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ میں اپنی چال ڈھال بدل لوں۔ اپنی عادات کو تبدیل کر کے پیش کروں یا کسی ایسی عادت کو اپنالوں جو مجھ میں قطعاً نہیں تھی اور جس کی بناء پر فاریہ کو جمال پر شک ہو جائے۔

تمام رات میرا ذہن الجھا رہا۔ میں ایسی ہی باتیں سوچتا رہا اور جانے کب مجھے نیند آ گئی۔ اگلے روز صبح سویرے ہی میری آنکھ کھل گئی تھی مگر میں یونہی بستر پر پڑا رہا۔ تقریباً گیارہ بجے کے قریب کسی نے ہولے سے دروازے پر دستک دی۔ میں نے کمبل چھوڑ دیا۔ نہ معلوم رات کے کس پہر میں نے ہمدردی محسوس کر کے کمبل اوڑھ لیا تھا۔ شاید اسے سی کی ٹھنڈک برداشت نہیں ہوئی تھی۔ میں اٹھ کر دروازے کی طرف بدھا میرے سر میں شدید درد تھا اور مجھے حرارت محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ دروازے پر نور ہوگی، اور یہ ٹھیک بھی تھا۔ دروازہ کھولا تو سامنے ہی نور چائے کی ٹرالی لیے کھڑی تھی۔ ٹرالی پر ناشتے کی چیزوں کے علاوہ اخبار بھی رکھا تھا۔ یہ میرے لیے اچھے کی بات

تھی۔ آج سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ ناشتے کے ساتھ اخبار بھی لایا گیا ہو۔ اول تو اتنے دنوں میں میں نے اخبار پڑھنے کی خواہش کا اظہار ہی نہ کیا تھا اور دوسری بات یہ کہ اخبار کوریڈور میں رکھی اس ٹیبل پر ہوتا تھا جس پر ٹیلی فون رکھا تھا۔ میں نے مسٹر زید کو بھی اخبار وہیں سے اٹھا کر پڑھتے دیکھا تھا اور مس زینی کو بھی۔

”آئیے مس نور!“ اتنا کہہ کر میں نے یونہی مس نور کے چہرے پر نگاہ ڈالی، تو چونک اٹھا۔ اس کا رنگ سفید ہو رہا تھا۔ اس کا نچلا ہونٹ کانپ رہا تھا اور آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔

میں نے حیرت سے اسے دیکھا اور وجہ معلوم کرنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اس نے اشارے سے مجھے خاموش رہنے کو کہا اور ٹرالی پر سے اخبار اٹھا کر میری طرف بڑھا دیا۔ اس کے اشارے کرنے پر میں سمجھ گیا کہ یہاں ہونے والی گفتگو کہیں اور بھی سنی جا رہی ہے۔ بہر حال میں مس نور کے انداز پر خوش بھی ہو گیا کہ وہ میرے ساتھ ہے۔ میں نے اس کے ہاتھ سے اخبار لے کر اشارے سے پوچھا کہ اس میں کیا ہے۔ اس نے پہلا صفحہ پلٹ کر اندر دیکھنے کو کہا۔ جوں ہی میں نے وہ صفحہ پلٹا، خوف سے سن ہو گیا۔

اندرونی صفحے پر جگہ کی تصویر تھی اور نیچے لکھا تھا کہ ”نامعلوم لاش برآمد“ میں نے تیزی سے ساری خبر پڑھ ڈالی۔ لکھا تھا کہ سپر ہائی وے کے قریب جھاڑیوں سے ایک پینتالیس برس کے شخص کی لاش برآمد ہوئی ہے جسے انتہائی بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔ لاش ایک دھوبی نے دیکھی اور متعلقہ تھانے میں اطلاع کی۔ لاش پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال بھیج دی گئی ہے۔ لاشی کے ساتھ ایسی کوئی چیز یا کانڈ برآمد نہ ہو سکا جس سے مرنے والے کے بارے میں تفصیل معلوم ہو سکتی ہو۔

حالانکہ جگہ کی موت سے میرا کوئی واسطہ نہ تھا مگر پھر بھی میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ اس خبر سے کم از کم مجھے ان لوگوں کی سفاکی کا علم تو ہو ہی گیا تھا اور اس خیال نے بھی مجھے بوکھلا دیا تھا کہ زید اگر جگہ کی بے پروائی کی یہ کڑی سزا دے سکتا ہے تو اگر اسے یہ پتا چل گیا کہ ادراہیں میرے ہاتھوں مارا گیا ہے تو کیا ہو گا..... اب میرا یہاں سے جلد از جلد نکل جانا ہی میری زندگی کی ضمانت تھا۔

نور اب تک میرے سامنے کھڑی مجھے خوف زدہ نگاہوں سے تنک رہی تھی۔ اب

یہی میرا آخری سہارا تھا فاریہ کو فون کرنے کا پروگرام تو رات کی گہری نیند نے خراب کر دیا تھا۔ اب اسے فون کرنے کے لیے مجھے پھر ایک طویل دن گزرنے کا انتظار کرنا تھا یا پھر اگر نور میری مدد کرتی تو میں کچھ کر سکتا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے اُدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں۔ میں کمرے میں کانڈ اور پین ڈھونڈ رہا تھا۔ جو مجھے نہیں مل سکا۔ میں نے نور کو اشارے سے کہا کہ مجھے کانڈ اور پین چاہیے وہ سرہلا کر کمرے سے واپس چلی گئی۔ مجھے بھوک تو بالکل بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی مگر نے زبردستی ناشتا کر لیا تاکہ میری کسی حرکت سے جمال وغیرہ کو کسی قسم کا شک نہ ہو سکے۔ تقریباً بیس منٹ بعد نور جب ناشتے کے برتن واپس لینے آئی تو وہ کانڈ اور پین چھپا کر لے آئی۔ یہ چھوٹے کانڈوں کا ایک دستہ تھا جو میرے بہت کام آ سکتا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے دونوں چیزیں لیتے ہی اس پر لکھا کہ وہ میری مدد کرے ورنہ میرا انجام بھی جگو سے مختلف نہ ہو گا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں فرار ہونا چاہتا ہوں۔ آج ہی رات، اگر وہ میری مدد کر سکے تو اس کا یہ احسان میں زندگی بھر نہ بھولوں گا۔

یہ پڑھ کر نور نے نفی میں سر ہلایا اور کانڈ پر مجھے لکھ دیا کہ مسٹر زید نے جانے سے قبل میری سخت نگرانی کا حکم دیا ہے۔ عمارت کے باہر بھی اور اندر بھی مجھ پر گہری نگاہ رکھی جا رہی ہے بلکہ اسے تو یہ بھی شک ہے کہ اس کمرے میں کوئی ایسی چیز بھی چھپی ہوئی ہے جس سے یہاں ہونے والی ہر آواز سنی جاسکتی ہے، کیوں کہ اس نے ایک آدمی کو میرے برابر والے کمرے میں ہیڈ فون کانوں پر لگائے دیکھا ہے اور اس نے یہ بھی بتایا کہ یہاں کی ہر آواز ٹیپ کی جا رہی ہے۔

یہ اطلاعات میرا دم نکالنے کے لیے کافی تھیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں فاریہ کو فون بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا اور نور ناشتے کے برتنوں کو ایک دوسرے سے ٹکراتی رہی تاکہ سننے والا یہ سمجھے کہ وہ وہاں خواہ مخواہ نہیں ٹھہری ہوئی بلکہ برتن سمیٹ رہی ہے۔ تبھی مجھے ایک ترکیب سوچھی اور میں نے کانڈ پر اسے فاریہ کا فون نمبر لکھ کر دیا اور صرف ایک جملہ لکھا کہ وہ اس فون پر فاریہ کو یا کسی کو بھی سنا دے وہ جملہ یہ تھا۔ ”اقبال کسی کی قید میں ہے اور ایک دوسرا شخص اقبال کے روپ میں وہاں پہنچے گا“ محتاط رہا جائے اور اسے گھر میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔

اس نے چپ چاپ وہ کانڈ اپنے گریبان میں چھپا لیا اور برتن ٹرالی پر رکھ کر واپس چلی گئی۔ میں نے اس کے جاتے ہی وہ تمام کانڈ جن پر بات چیت کی تھی اٹھائے اور ہاتھ روم میں چلا آیا۔ آتے ہوئے میں لائٹس بھی اٹھا لیا۔ ان کانڈوں کو واش بیس میں رکھ کر میں نے لائٹس سے آگ دکھائی اور ان کے راکھ بن کر پانی میں بہہ جانے تک وہیں کھڑا رہا۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے کانڈ کا وہ دستہ اور پین کارپٹ کا کونا لٹ کر اس کے نیچے چھپا دیا اور سگریٹ سلگا کر آنے والے حالات سے نبٹنے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ ابھی میرے پاس بہر حال دو تین روز تھے۔ جمال کو میری عادات و سکنات سیکھنے کے لیے اتنے دن تو لگ ہی جاتے۔ میں بہت دیر تک سوچتا رہا پھر میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں جمال کو مس گائیڈ کروں گا تاکہ اگر میں یہاں سے نہ نکل سکوں یا نور فاریہ تک میرا پیغام نہ پہنچا سکے تب بھی میرا مقصد پورا ہو جائے۔..... اور فاریہ کو جمال پر شک ہو جائے۔ یہ سب میں اپنی تسلی کو کر رہا تھا ورنہ سچی بات تو یہ تھی کہ مجھے یقین نہیں کہ فاریہ اس معاملے کو ڈیل کر سکے گی اور جمال پر اسے کسی قسم کا شک ہو سکے گا۔ ہاں نور اگر فاریہ کو میرا پیغام دینے میں کامیاب ہو گئی تو اس بات کی امید سو فیصد تھی کہ فاریہ بھی سمجھ جائے کہ وہ میں نہیں بلکہ جمال ہے۔

مجھے یاد تھا کہ خود اس نے بھی ایک بار مجھے بتایا تھا کہ میں جمال سے بہت ملتا ہوں اور یہ بات اس نے بیگ صاحب سے بھی کہی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ میری جمال سے مشابہت ان کے کام آ سکتی ہے۔ ”خدا کرے فاریہ اس خوفناک کھیل کو سمجھ جائے۔“ میں نے دل سے دعا کی۔

اس وقت انٹرکام بول اٹھا میں نے رینور اٹھایا اور دوسری طرف جمال کی آواز سنتے ہی خود کو قطعی نارمل کر لیا۔ ”گڈ مارننگ مسٹر جمال، کیسے ہیں آپ؟“

”مارننگ نہیں مسٹر اقبال، آفٹرنون کہئے۔“

”سوری..... دراصل مجھے رات حرارت سی ہو گئی تھی اور نیند بھی بہت دیر سے آئی تھی اس لیے دیر سے آنکھ کھلی۔“

”کوئی بات نہیں..... آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“

”کچھ بہتر ہے مگر شاید بخار اب بھی ہے۔“ میں نے جواب دیا اور یہ بات صحیح بھی

تھی اور میں اپنی آنکھوں میں شدید جلن محسوس کر رہا تھا۔
”اوہ آپ فکر نہ کریں میں ابھی دوا لے کر حاضر ہوتا ہوں۔“ اتنا کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر لیا۔

وہ میرے پاس آنے والا تھا اور میں جانتا تھا کہ وہ یہاں کیوں آنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے بخار میں وہ مجھے بلواتا بھی تو یہ نامناسب بات ہوتی۔ میں نے شکر ادا کیا کہ مسٹر زید اور مسٹر جمال میں کم از کم شائستگی تو تھی ورنہ وہ ایسی پوزیشن میں تھے کہ مجھ سے جبراً اپنا مطلب نکلوا سکتے تھے۔ بہر حال میں اس موضوع پر رات میں اور صبح سے اب تک سوچتا رہا تھا اور میں نے طے کر لیا تھا کہ مجھے کیا کہنا اور کیا کرنا ہے۔

میری توقع کے مطابق جمال تقریباً پندرہ منٹ بعد ہی میرے کمرے میں چلا آیا۔ اس کا موڈ خوشگوار تھا یا شاید اس نے اپنا مطلب نکالنے کے لیے خود کو بے حد خوش، مطمئن اور خوشگوار موڈ میں ظاہر کیا تھا۔

”سوری مسٹر اقبال میں کچھ لیٹ ہو گیا۔ یہ ٹیلیفون ہیں انہیں کھالیں اور کمبل کو اچھی طرح لپیٹ کر بیٹھیں۔ کچھ ہی دیر میں ٹھیک ہو جائیں گے۔“ اس نے پیناڈول کی گولیاں دیتے ہوئے کہا۔ میں نے دونوں گولیاں پانی کے ساتھ نگل لیں۔ کمبل کو میرے گرد لپیٹنے میں اس نے میری مدد کی اور پھر سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔

”مسٹر اقبال، آئی ایم سوری کہ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے ورنہ میں آج آپ کو آرام کرنے دیتا۔ خیر آپ اسی طرح لیٹے رہیے اس طرح آپ کو آرام مل جائے گا اور آپ میرے کام بھی آتے رہیں گے۔“ اتنا کہہ کر وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوا اس نے مجھے گہری نگاہوں سے دیکھا جیسے میرے چہرے پر اپنی بات کا رد عمل دیکھنا چاہتا ہو۔ میں ساٹ چہرے سے اسے تنکنا رہا۔ ”میرا خیال ہے کہ آپ نے اب تک کافی سوچ لیا ہو گا۔ کسی نتیجے پر بھی پہنچ گئے ہوں گے، کچھ مجھے بتانا پسند کریں گے؟“

”مسٹر جمال..... میں نے کافی کچھ سوچا ہے۔ میں ایک ہی شرط پر آپ سے تعاون کرنے کو تیار ہوں کہ.....“ میں قصداً جھجک کر خاموش ہو گیا۔

”ہاں ہاں بولئے..... اگر آپ کی شرط قابل قبول ہوئی تو یقین کیجئے میں اس شرط کو پورا کروں گا۔“ اس نے جلدی سے جواب دیا اور میں یہی دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ اس

معاطلے میں کس حد تک ایکسائیٹڈ ہے۔

وہ یہ مسٹر جمال..... کہ میں نے بیگ صاحب کے گھر کا نمک کھایا ہے اور میں نمک کا حق ادا کرنا چاہتا ہوں۔ میری وجہ سے انہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچنا چاہیے اگر مجھے یہ پتا چلے کہ میری کسی حرکت سے انہیں کوئی تکلیف پہنچنے والی ہے تو..... تو میں مرجانے کو ترجیح دوں گا مگر.....“

”ارے نہیں مسٹر اقبال..... آپ یقین کیجئے کہ انہیں کسی بھی قسم کی کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔“

”اگر آپ فاریہ، زاریہ، بیگ صاحب اور سوہنی وغیرہ کو کوئی تکلیف نہ دینے کا وعدہ کریں تو میں آپ سے تعاون کرنے کو تیار ہوں۔“ میں نے ہارے ہوئے جواہری کی طرح کہا تاکہ وہ یہی سمجھے کہ میں نے حالات سے تنگ آ کر شکست تسلیم کر لی ہے اور میں واقعی اس سے تعاون کرنے پر آمادہ ہوں۔

”بس اتنی سی بات تھی۔ میں تو ڈر ہی گیا تھا۔“ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔
”مسٹر اقبال میں وعدہ کرتا ہوں کہ انہیں کوئی بھی تکلیف نہیں ہوگی بلکہ میں انہیں گمان بھی نہیں ہونے دوں گا کہ میں اقبال نہیں بشرط کہ آپ مجھے سب کچھ سچ بتا دیں۔ دیکھیں نا اگر فاریہ کو یہ شک ہو جائے کہ میں اقبال نہیں ہو تو وہ کتنی اذیت محسوس کرے گی اور پھر یہ شک ہو جانے کے بعد مجھے بھی اپنا رویہ بدلنا پڑے گا، شاید سختی کرنا پڑے اور ایسا نہ آپ چاہتے ہیں اور نہ میں۔“

”میں تو سوچ بھی نہیں سکتا مسٹر جمال۔ آپ اپنے وعدے پر قائم رہیے گا۔“
”آپ فکر نہ کریں بس میرے سوالوں کا جواب دیتے رہیں۔“

”میں آپ پر اعتبار کر رہا ہوں۔ پوچھئے کیا پوچھنا چاہتے ہیں..... مگر پلیز ایک زحمت دوں گا۔ میرا سگریٹ ختم ہو گیا ہے اگر وہ منگوا سکیں تو.....“

”اوہ کیوں نہیں..... کون سا برانڈ پیتے ہیں آپ؟“

”پیتا تو گولڈ لیف ہوں مگر اس وقت جو بھی مل جائے۔“ میں نے کمال خوب صورتی سے جھوٹ بولا۔ میں سرے سے سگریٹ پینے کا عادی ہی نہیں تھا۔ بس کبھی پی لیا کرتا تھا اور یہ بات فاریہ جانتی تھی۔

”میں ابھی منگواتا ہوں۔“ یہ کہہ کر جمال نے انٹرکام پر میرے برائڈ کا سگریٹ لانے کی ہدایت کی اور پھر میری جانب متوجہ ہو گیا ”سگریٹ آپ کب سے پیتے ہیں؟“

”شہر آکر ہی شروع کی تھی۔ تقریباً سات آٹھ مہینے ہو گئے ہیں۔“

”ہیشہ گولڈ لیف ہی پیتے ہیں؟“

”جی!“

”فارہ اور بیگ صاحب کے سامنے بھی پیتے ہیں؟“

”جی ہاں‘ شروع میں تو چھپ کر پیتا تھا مگر زاریہ کے اسپتال جانے کے بعد اور آپریشن کے روز میں نے تمام تکلف بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ اس روز کے بعد مجھے بیگ صاحب نے بھی سگریٹ پینے کی اجازت دے دی‘ وزنہ میں تو لحاظ کرتا تھا۔“

آپ فارہ کو کیا کہہ کر مخاطب کرتے ہیں اور بیگ کو.....؟“

”جمال صاحب‘ حالانکہ میں پہلے والا بالا نہیں رہا مگر مالک کو مالک ہی سمجھتا ہوں اسی لیے بیگ صاحب کو ”صاحب اور فارہ کو بی بی کہتا ہوں البتہ فیکٹری میں کبھی کبھی میڈم بھی کہتا تھا کیوں کہ وہاں سب انہیں میڈم کہتے ہیں۔“

اس کے علاوہ بھی جمال نے بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں معلوم کیں اور میں ہر بات میں جدت یا تبدیلی پیدا کرتا رہا۔ یہی ایک صورت تھی کہ فارہ بچے درپے انہونی باتیں ہو جانے پر اس کی جانب سے مشکوک ہو سکتی تھی۔

”یعقوب کون ہے جس کے بارے میں آپ کو اطلاع ملی تھی کہ وہ واپس آ گیا ہے اور فارہ اسے جا کر لے آئی ہے وہ کون ہے‘ کہاں گیا ہوا تھا اور اس کی حیثیت کیا ہے؟“

مجھے حیرت ہوئی کہ وہ یعقوب کے بارے میں کیسے جانتا ہے جب کہ میں نے زید کو سنائی جانے والی کہانی میں بھی ایسی باتیں گول کر دی تھیں جس سے فارہ کا کردار مشکوک ہوتا اور یعقوب کا ذکر تو سرے سے آیا ہی نہیں تھا۔ پھر اچانک مجھے یاد آیا کہ میرا ٹیلی فون بھی ٹیپ کیا جا رہا ہو گا۔ شاید اسی وجہ سے نور نے بات کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا اور اس کی یہ بات بھی سچی نکلی تھی کہ میرے کمرے کی ہر آواز اور میرا فون کہیں اور سنا جا رہا ہے۔

”وہ فارہ کا ملازم تھا اور کسی وجہ سے ناراض ہو کر اپنی بیٹی کے پاس چلا گیا تھا“ وہ

ہیں بائیس برس سے وہاں ملازم تھا بیگ صاحب کی کسی بات سے روٹھ کر چلا گیا تھا۔ وفادار نوکر تھا اس لیے فارہ اسے مناکرواپس لے آئی ہے۔“

”یہ سلطان کون ہے؟“

”یہ بھی فارہ کا ملازم ہے۔“ میں نے نڈھال لہجے میں جواب دیا۔ میرا ذہن اس صورت حال سے تھک چکا تھا اور میرا بخار بھی تیز ہوتا جا رہا تھا۔ ”مسٹر جمال میں بہت تھک گیا ہوں۔ کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔ دیکھئے میرا بخار کم ہونے کی بجائے بڑھ گیا ہے۔“ میں نے اپنی پیشانی اس کے قریب کرتے ہوئے کہا۔ اس نے ہاتھ سے میری پیشانی چھوئی۔

”اوہ..... سوری مسٹر اقبال‘ واقعی آپ کی حالت بہت خراب ہے۔ آپ آرام کریں میں ڈاکٹر کو بلواتا ہوں۔“ اتنا کہہ کر وہ تیزی سے کمرے سے باہر چلا گیا۔ میں نے آنکھیں موند لیں۔ بخار اتنا تیز ہو گیا تھا کہ میری آنکھوں سے گرم گرم پانی بننے لگا اور مجھ پر غشی سی طاری ہو گئی۔

مجھے ہوش آیا تو میرے بیڈ کے قریب پڑی کرسی پر نور بے خبر سو رہی تھی۔ اس نے دونوں ٹانگوں کو سیٹھ کر کرسی پر رکھ لیا تھا اور ایک چادر گھٹنوں پر ڈالی ہوئی تھی۔ میرا بخار کچھ کم ہو گیا تھا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا‘ کوئی اور موجود نہیں تھا۔ میرے سرہانے کچھ دواؤں کی شیشیاں رکھی تھیں اور چند گولیاں پڑی تھیں۔

”مس نور..... مس نور.....“ میں نے دھیرے سے اسے پکارا مگر وہ نہ اٹھی تو میں نے ہولے سے اس کا گھٹنا ہلایا۔

”کک..... کون.....؟“ وہ چونک کر جاگ اٹھی۔

”مس نور آپ جا کر آرام کریں۔“

”نہیں..... آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے جمال صاحب نے آپ کا خیال رکھنے کو کہا ہے اور ایک گھنٹے کے بعد آپ کو دوا بھی دینا ہے۔“

”کیا..... کیا ٹائم ہوا ہے مس نور؟“

”رات کے تین بجے ہیں مسٹر اقبال‘ آپ کی طبیعت بہت خراب تھی۔ ڈاکٹر نے آپ کا معائنہ کر کے یہ دوائیں تجویز کی تھیں۔ دوائیں وقت پر لینا بہت ضروری ہے ورنہ

طبیعت مزید بگڑ جائے گی۔

”رات کے تین..... یعنی تمام دن گزر گیا اور مجھے پتا بھی نہ چلا۔“ میں حیران ہو گیا۔

”آپ پر غشی طاری تھی مسٹر اقبال۔“

”آپ آرام کریں، دوا کے بارے میں مجھے بتادیں، میں لے لوں گا۔“

”سوری مسٹر اقبال، میں جمال صاحب کا حکم نہیں ٹال سکتی۔ آپ سو جائیں میں ایک گھنٹے بعد خود ہی دوا دے دوں گی۔“

”اچھا..... جیسی آپ کی مرضی۔“ میں نے ذرا زور سے کہا اور مس نور کو کارپٹ کے نیچے سے کانڈ اور پین نکال کر لانے کو کہا۔ اس نے پہلے دروازے کی طرف دیکھا پھر خود پر لیٹی ہوئی چادر کے اندر ہاتھ ڈال کر ہاتھ دوبارہ نکالا اور میری طرف بڑھا دیا، اس کی مٹھی میں ایک کانڈ کا پرزہ دبا ہوا تھا۔ میں نے کانڈ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور بہت آہستگی سے کھولا تاکہ کانڈ کی آواز پیدا نہ ہو سکے۔

وہ نور کی تحریر تھی لکھا تھا کہ وہ فاریہ کو فون نہیں کر سکی اور اسے امید نہیں کہ وہ میرا پیغام اسے پہنچا سکے گی۔ اس نے لکھا تھا کہ دن میں اس نے کوٹھی سے باہر جانے کی کوشش کی تھی مگر اسے گیٹ سے باہر نہ جانے دیا گیا بلکہ بتایا گیا کہ مسٹر زید کی سخت ہدایت ہے کہ کوئی شخص کوٹھی سے باہر نہ جائے خواہ وہ کوئی بھی ہو، صرف جمال صاحب ہی باہر جاسکتے تھے۔

میں نے کانڈ کا وہ پرزہ مٹھی میں دبایا۔ اس تحریر نے مجھ میں مایوسی بڑھا دی تھی۔ گویا نور بھی میرے کسی کام نہیں آ سکتی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر کے سر کو تکیے سے ٹکا دیا۔ عین اسی لمحے ایک خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں کوندا اور میں اچھل کر اٹھ بیٹھا۔ میرے اس انداز پر نور بھی حیران ہو گئی۔ میں نے اسے کانڈ اور پین لانے کا اشارہ کیا۔ وہ فوراً ہی اٹھ کر کانڈ اور پین اٹھا لائی میں نے جلدی جلدی اس پر لکھا کہ وہ کسی بھی طرح مجھے ہائٹروجن اور ایونیو لادے۔ یہ کام وہ آسانی کے ساتھ کر سکتی تھی کیوں کہ میری طبیعت خراب تھی اور ڈاکٹر مجھے ویسے بھی دیکھ کر گیا تھا اگر وہ چاہتی تو یہ دونوں چیزیں اس سے کسی طرح حاصل کر سکتی تھی۔

میری تحریر پڑھتے ہی نور کی آنکھوں میں بھی چمک سی لہرائی۔ شاید وہ جان گئی تھی کہ میرے ذہن میں کیا ہے۔ اس نے سر ہلا کر میری ہدایت پر عمل کرنے کا وعدہ کیا اور کانڈ پین لے کر لکھا کہ وہ بھی میرے ساتھ یہاں سے نکلتا چاہتی ہے۔ اس نے لکھا کہ محمد بخش کے مرنے کے بعد جب اس کا کوٹھی میں رہنے کا اتفاق ہوا تو اس نے یہاں عجیب عجیب باتیں ہوتی دیکھیں ورنہ اس سے پہلے وہ ان تمام باتوں سے ناواقف تھی اور ویسے بھی ان لوگوں سے اس کا کوئی ناتا نہیں اس لیے وہ یہاں نہیں رہنا چاہتی۔

میں نے اسے ساتھ لے جانے کا وعدہ کیا اور دونوں کانڈوں کو جلانے کو کہا۔ اس نے فوراً ہی الیش ٹرے میں کانڈ ڈال کر جلا دیے اور الیش ٹرے کو دھو کر لے آئی۔ پھر اس نے کانڈ اور پین اسی جگہ پر رکھ دیے جہاں سے اٹھا کر لائی تھی..... میں اب کافی مطمئن ہو گیا تھا۔ جو ترکیب میرے ذہن میں آئی تھی اس کے سوا یہاں سے نکلنے کا کوئی چارہ نہ تھا۔ شاید آپ بھی سمجھ گئے ہوں گے کہ میرے ذہن میں کیا تھا۔ میں اپنے بالوں اور مونچھوں کو بھورا کرنا چاہتا تھا۔ یہاں سے فرار ہونے کے لیے ضروری تھا کہ خود کو جمال کے روپ میں ڈھال لوں یعنی ان لوگوں کی چال کو انہی پر لوٹا دوں۔

ایسا میں اگلی رات کو ہی کر سکتا تھا اگر اس دوران میں نور ناٹروجن اور ایونیو لادیتی تو مجھے یقین تھا کہ وہ اس میں کامیاب ہو جائے گی۔ میں آنکھیں بند کر کے لیٹا رہا اور سوچتا رہا کہ اپنی ترکیب کامیاب ہو جانے پر یہاں سے کس طرح نکلوں گا۔

چار بجے نور نے مجھے پکارا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ ”سر آپ دوا لے لیں۔ وقت ہو گیا ہے۔“

پھر اس نے مجھے گولی اور سیرپ دیا۔ سر ہانے رکھے ہوئے تھرمس میں سے گرم گرم سوپ نکال کر دیا اور تبھی مجھے احساس ہوا کہ یہ میرے لیے بہت ضروری تھا۔ مجھے بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ دوا لینے اور سوپ پینے کے بعد میری حالت کچھ اور سنبھل گئی۔ تو میں نے نور کو چلے جانے پر مجبور کیا کہ وہ اپنے بستر پر جا کر سو جائے۔ اب میں خود کو پہلے سے بہتر محسوس کر رہا تھا اور اب دوا بھی صبح ہی لینا تھی۔

میرے اصرار پر وہ چلی گئی مگر گھڑی میں الارام لگا کر میرے سر ہانے رکھ گئی۔ الارم دن بجے کا لگایا تھا اور مجھے تاکید کر دی تھی کہ میں دوائیں لے لوں۔ اس کے جانے کے بعد

”میں نے ایسے آدمی دنیا میں کم ہی دیکھے ہیں، اس لیے ان پر اعتماد کرنے کو جی چاہتا ہے۔ وہ نرم دل اور ہمدرد آدمی ہیں۔ مجھے مسٹر زید اور مسٹر جمال دونوں نے متاثر کیا ہے۔“

”جی سر دونوں ہی بے حد اچھے انسان ہیں۔“

”ویسے نور تم اگر یاد کرنے کی کوشش کرو تو ہو سکتا ہے کہ کچھ یاد آ ہی جائے۔“
میں نے موضوع بدل دیا۔ میرا مقصد صرف ان باتوں سے یہ تھا کہ سننے والے یہ سمجھیں کہ ہمیں ان دونوں پر بے حد اعتماد ہے اور ہم ایسی کوئی حرکت نہیں کریں گے جو ان کی توقع کے خلاف ہو۔ دوسری طرف میں نور سے اس بارے میں کچھ معلومات بھی چاہتا تھا۔ ظاہر ہے میں نور کو ساتھ لے جانے کا وعدہ کر چکا تھا اور میرے پاس سوائے فاریہ کی کوٹھی کے دوسرا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ جہاں میں اسے لے جا کر رکھتا اور فاریہ کی کوٹھی میں پہلے ہی میں سوہنی، ماسی اور سلطان کو لے جا چکا تھا۔ وہ کوئی یتیم خانہ تو تھا نہیں کہ میں دنیا بھر کے لاوارث لوگوں کو لے جاتا رہوں۔ میں چاہتا تھا کہ اگر نور کو کچھ یاد آ جائے تو اسے اس کے اپنوں تک پہنچا دوں۔

”مجھے کچھ بھی یاد نہیں آتا سر، بس کبھی کبھی ایک خواب ساد بکھتی ہوں جیسے میں کسی گھنے درخت کی چھاؤں میں بنے ہوئے چبوترے پر بیٹھی ہوں اور میرے چاروں طرف بیرہوئیاں سی ریگ رہی ہیں پھر میری آنکھ کھل جاتی ہے یا میں چونک جاتی ہوں۔“

”خیر یہ تو کوئی نشانی نہ ہوئی تم کوشش کرو کہ کوئی چہرہ..... کوئی بات..... ایسی بات جس سے تمہارے ماضی کو تلاش کیا جاسکے، یا کوئی گھر، خاص قسم کا یا کوئی ایسی عمارت جس کی کوئی خاص بات تمہیں یاد ہو۔“

اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے دونوں کپٹیوں کو دبایا اور نفی میں سر ہلانے لگی۔ ”کچھ بھی یاد نہیں سر..... جب کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتی ہوں وہی گھنے درخت کے نیچے بنا چبوترہ اور بیرہوئیاں ذہن میں رہنے لگتی ہیں اور بس..... چہرے تو بس مجھے محمد بخش یا اس کی بیوی کے ہی یاد ہیں، یوں لگتا ہے جیسے آنکھ کھولتے ہی بس یہی چہرے دیکھے تھے میں نے۔“

میں پھر حالات کے الجھ جانے کے بارے میں سوچتا رہا۔ اب میں اپنی تمام تر صلاحیتیں یہاں سے فرار ہونے میں صرف کرنا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے کہ حالات کوئی خطرناک شکل اختیار کر لیں۔ مجھے یہاں سے نکل کر فاریہ وغیرہ تک پہنچنا تھا۔ نہ معلوم ان لوگوں کا مقصد کیا تھا، وہ کون سا بسکس تھا، کہاں تھا اور اس میں کیا تھا مجھے کچھ معلوم نہ تھا۔ میں کافی دیر تک جاگتا رہا مگر پھر مجھ پر نیند غالب آ گئی۔ دس بجے الارم کی آواز نے مجھے جگا دیا۔ میں نے ہمت کر کے بستر چھوڑ دیا، ہاتھ روم میں جا کر گرم پانی سے نہایا اور کپڑے بدل کر واپس کمرے میں چلا آیا۔ کمرے میں نور موجود تھی۔ وہ میرے لئے چائے بنا رہی تھی۔

”سر آپ نے دوا لے لی تھی؟“

نہیں اب لوں گا۔“ یہ کہہ کر میں بیڈ کے سرہانے تکیہ ٹکا کر بیٹھ گیا۔ نور نے مجھے چائے اور پانی بھی دیا تاکہ میں گولیاں کھا سکوں، میں نے دوا کھائی اور چائے پینے لگا۔ نور میرے لیے سلائس پر مکھن لگا رہی تھی۔ میں گہری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ نہ معلوم کیوں اسے دیکھ کر مجھے احساس ہو رہا تھا جیسے میں اسے پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہوں۔ یہ احساس مجھ سے پہلے بھی ہوا تھا مگر اس وقت میں اس بارے میں کچھ سوچنے کی پوزیشن میں نہیں تھا یا یوں کہہ لیجئے کہ یہ احساس اب سے پہلے اتنا شدید نہ تھا۔ اس نے شاید میری نگاہوں کے لمس محسوس کر لیا تھا۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

”نور تمہیں یاد نہیں کہ تم کس گاؤں کی ہو..... کون ہو، تمہارے ماں باپ کون تھے یا کیسے تھے؟“

میری بات سنتے ہی ایک دم اس پر لرزہ سا طاری ہو گیا۔ ہاتھ کانپ گیا اور آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔ ”یہ یاد ہوتا سر تو..... یہاں کیوں ہوتی، مگر آپ کو یہ سب کس نے بتایا؟“

”مجھے تمہارے بارے میں مسٹر زید سب کچھ بتا چکے ہیں۔ وہ بہت اچھے آدمی ہیں مس نور!“

آخری جملے پر اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ سمجھ گئی کہ میں کیا چاہتا ہوں۔

”جی سر..... آپ ٹھیک کہتے ہیں اگر یہ نہ ہوتے تو جانے میرا کیا حشر ہوتا؟“

”اچھا خیر تم پریشان نہ ہو..... چھوڑو یہ باتیں، تمہارے لیے یہی کیا کم ہے کہ تم یہاں محفوظ ہاتھوں میں ہو مسٹر زید تمہیں اپنی بیٹی کی طرح چاہتے ہیں۔ سوچو ان کی جگہ کوئی جابر شخص ہوتا تو وہ تمہارے ساتھ کیا کرتا؟ یہاں تمہیں کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں ہے کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ ایسی خراب دنیا میں یہ سب کچھ مل جانا، جنت مل جانے سے کم نہیں ہے نور، تم نے باہر کی دنیا نہیں دیکھی، مگر میں دیکھ چکا ہوں۔“

”جی سر، بابا بھی کہتا تھا اور اماں بھی۔“

”کون بابا..... کون اماں؟“

”وہی سر، جنہوں نے مجھے پالا تھا۔ محمد بخش اور اس کی بیوی۔ وہی تو میرے بابا اور اماں تھے۔“

”اوہ..... ہاں کیوں نہیں..... جنم دینے والے سے پالنے والے کا رشتہ زیادہ گہرا ہوتا ہے۔“

”آپ ناشتا کر لیجئے۔“ اس نے سلاکس کی پلیٹ میری طرف بڑھائی۔

”تم نہیں کرو گی؟“

”میں نے کر لیا ہے سر، صبح سویرے ہی کر لیا تھا۔“

”تم سوئی نہیں تھیں؟“

”سوئی تھی سر، مگر آٹھ بجے اٹھ گئی تھی کچن کا کام میں ہی سنبھالتی ہوں۔ سب کو ناشتا دینا ہوتا ہے۔“

اس کی بات ختم ہوتے ہی میں نے اس سے اشارے سے نائٹروجن اور ایمونیا کے بارے میں پوچھا۔ اس نے اشاروں ہی میں جواب دیا کہ ڈاکٹر ابھی تک نہیں آیا ہے اور یہ کہ میں مطمئن رہوں وہ یہ دونوں چیزیں ضرور حاصل کر لے گی خواہ کسی بھی طرح کرنا پڑے۔

پھر وہ مجھ سے مختلف باتیں پوچھتی رہی اور میں صرف اس لیے کہ سننے والے ہر بات سن رہے ہوں گے اس سے مسلسل جھوٹ بولتا رہا جس کی مجھے شرمندگی بھی تھی مگر یہ میری مجبوری تھی۔ وہ شاید یہ بات بھول گئی تھی اسی لیے اس نے بعض ایسے سوال بھی کیے جن کا صحیح جواب دینا میرے لئے نقصان دہ ثابت ہوتا۔ اس دوران میں، میں ناشتا بھی

کرتا رہا۔ ناشتا ختم کیا تو وہ چائے کے برتن اٹھا کر باہر چلی گئی۔ میں لیٹے لیٹے تھک چکا تھا مگر میں باہر نہیں جانا چاہتا تھا کیوں کہ میں جانتا تھا کہ مجھے فریش دیکھ کر جمال پھر میرے سر پر سوار ہو جائے گا۔ اس لیے میں کمرے میں ٹہلنے لگا اور خدا سے دعائیں مانگنے لگا کہ نور اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے۔

میرا ذہن بہت الجھا ہوا تھا طرح طرح کی سوچیں مجھے پریشان کر رہی تھیں۔ زینی مجھے اب تک نظر نہیں آئی تھی، شاید وہ بھی مسٹر زید کے ساتھ ہی چلی گئی تھی۔ بہر حال مجھے اس سے یا مسٹر زید سے کوئی سروکار نہیں تھا میں تو بس ہر حال میں یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ میں ٹہلنے ٹہکتے تھک کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ اسی لمحے میری نگاہ فون پر پڑی اور مجھے خیال آیا کہ میں فاریہ کو فون ہی کر دوں۔ اگر اسے کچھ بتا نہ سکا تو کم از کم اپنی خیریت تو بتا ہی دوں گا اور ان لوگوں کی خیریت بھی معلوم کر لوں گا بلکہ موقع ملا تو ایسا کوئی جملہ بھی کہہ دوں گا جس سے فاریہ کچھ سوچنے پر مجبور ہو جائے۔

اسی خیال کے تحت میں نے ریسپور اٹھایا۔ فون ٹھیک تھا۔ یہ دیکھ کر میری ہمت بڑھی اور میں سوچنے لگا کہ ممکن ہے جو کچھ میرے یا نور کے ذہن میں ہے وہ سب ہمارے اپنے ذہنوں کی اختراع ہی ہو۔ میں نے فاریہ کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف بیل بجنے لگی۔ میرا دل خوشی سے دھڑک اٹھا اور نہ سچی بات تو یہ تھی کہ مجھے امید ہی نہ تھی کہ میرا فون ٹھیک ہو گا بلکہ یہ یقین تھا کہ اب تک میرا فون کاٹ دیا گیا ہو گا۔ بیل اب بھی بج رہی تھی پھر اچانک کسی نے ریسپور اٹھایا ہی تھا کہ میرے کاندھے کے اوپر سے ایک ہاتھ فون کی طرف بڑھا اور دوسرے لمحے ہی لائن کٹ گئی۔ میں نے ہونٹوں کی طرح اپنی پشت پر دیکھا۔ وہ جمال تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مدہم سی مسکراہٹ مگر آنکھوں میں بے رحمی تھی۔

”سوری مسٹر اقبال..... میں اپنی اس حرکت پر شرمندہ ہوں مگر.....“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر میرے ہاتھ سے ریسپور لے لیا اور اسے واپس کریڈل پر رکھ کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ ”اصل میں انکل نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں آپ کو فی الحال فون نہ کرنے دوں بلکہ جب میں یہاں سے روانہ ہوں گا تب..... یعنی میرے روانہ ہونے سے چند گھنٹے قبل آپ فاریہ کو اپنے پہنچنے کی اطلاع دیں گے اور پھر جب تک میں اپنا کام کر کے واپس نہ آ جاؤں اس وقت تک آپ اس سے رابطہ قائم نہیں کر سکیں گے

بلکہ اگلی فلائٹ سے آپ وہاں پہنچ جائیں گے۔ اس طرح اسے یہ شک نہ ہو سکے گا کہ آپ آپ نہ تھے بلکہ کوئی اور..... یعنی میں تھا۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟“ میں خاموش بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔

”آئی ایم رینلی سوری مسٹر اقبال.....“ وہ شاید میری نگاہوں کی تاب نہ لا رہا تھا۔ اس نے جھجکتے ہوئے کہا تھا۔

”لیکن مسٹر جمال، وہ پریشان ہوگی..... میں صرف اسے یہی بتانا چاہتا تھا کہ میں دو تین روز میں آ جاؤں گا۔“

”یہ تو آپ سلطان کو بتا چکے ہیں مسٹر اقبال، وہ مطمئن ہوگی.....“

میں لا جواب سا ہو گیا۔ میں واقعی سلطان کو بتا چکا تھا کہ میں، دو تین روز بعد آؤں گا مگر اس وقت مجھے یقین تھا کہ میں واقعی چلا جاؤں گا۔ یہ بات تو مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھی کہ دو تین روز یہاں سے جانے والا میں نہ ہوں گا بلکہ جمال ہو گا۔

پھر جمال کچھ دیر تک خاموش رہا۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھا۔ اچانک اس نے سر اٹھایا، مجھے گہری نگاہوں سے دیکھا اور اپنے دونوں ہاتھ ایک دوسرے میں پھنسا کر بولا۔

”مسٹر اقبال کیا میں یہ سمجھوں کہ آپ کچھ اور سوچ رہے ہیں اور..... مجھ سے تعاون نہیں کرنا چاہتے؟“

”میں کچھ اور سوچنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں مسٹر جمال اور آپ سے تعاون کرنا بہر حال میری مجبوری ہے، صرف اس لیے کہ میں ان لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔“

”آپ غلط سوچ رہے ہیں مسٹر اقبال..... یہ آپ کی مجبوری نہیں ہے اس لیے کہ ہم بھی انہیں نقصان نہیں پہنچانا چاہتے۔ یہ آپ اپنے دل سے نکال دیجئے۔ ہم پر اعتبار کر کے دیکھئے، آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔“ اس نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ اس کے لب و لہجے میں واضح تبدیلی آئی تھی اور میرے حق میں اچھا ہی تھا کہ اس نے میری اس حرکت سے مجھ پر کسی قسم کا شک نہیں کیا تھا۔

”آپ پر اعتبار ہی تو کر رہا ہوں مسٹر جمال، بلکہ آپ پر بھی نہیں، مسٹر زید پر، انہیں میں کچھ کچھ جان گیا ہوں، آپ سے البتہ اتنی ملاقات نہیں۔“

”مجھے بھی ان سے الگ نہ سمجھئے..... چلے چھوڑیئے اس بات کو یہ بتائیے کہ آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟“

”کافی بہتر ہے، آپ نے مس نور کو خواہ مخواہ زحمت دی۔“

”زحمت کیسی..... آپ مہمان ہیں اور مہمان کا ہر طرح خیال رکھنا ہمارے فرائض میں شامل ہے۔ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں آپ کو؟“

”نہیں، شکریہ۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”اگر آپ بہتر ہیں تو میرے کچھ سوالوں کا جواب دے دیں۔“

”جی پوچھئے۔“

پھر اس نے پے درپے کئی سوال کیے جن میں کچھ سوال فارسیہ کی فیکٹری سے متعلق تھے اور کچھ بہادر اور سیمال سے، یہاں میرا ذہن پھر کھٹک گیا، اگر مسٹر زید کے مطابق سیمال ان کی بیٹی اور بہادر ان کے سالے تھے تو ظاہر ہے ان کا رشتہ جمال سے بھی اتنا ہی قریبی تھا خاص طور پر اس صورت میں کہ جمال زیادہ تر مسٹر زید ہی کے پاس رہا ہے۔ یہ بات بھی مجھے مسٹر زید نے ہی بتائی تھی۔ اگر ایسی بات تھی تو پھر جمال ان دونوں سے متعلق اس طرح کیوں سوال کر رہا تھا جیسے وہ ان دونوں کے بارے میں زیادہ نہ جانتا ہو۔

بہر حال میں نے اگلے سیدھے جواب دے کر اسے مطمئن کر دیا تھا۔ وہ تقریباً دو ڈھائی گھنٹے میرا سر کھاتا رہا پھر مجھے آرام کی تاکید کرتا ہوا چلا گیا۔ میں بستر پر لیٹ کر اس کو دیے گئے جوابوں کے بارے میں سوچنے لگا کہ کہیں مجھ سے کوئی غلطی تو نہیں ہو گئی۔

کچھ دیر بعد دروازے پر آہٹ محسوس ہوئی مگر کسی نے دستک نہ دی۔ میں دستک کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک دروازے کا ہینڈل آہستگی سے گھوما۔ میں حیرت سے گھومتے ہوئے ہینڈل کو دیکھ رہا تھا کہ دروازہ دھیرے دھیرے کھلا اور سامنے نور کھڑی نظر آئی۔ میں جھپٹ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے ادھ کھلے دروازے ہی سے ایک کاغذ کا تھیلہ اپنی چادر میں سے نکال کر میری جانب بڑھا دیا اور تیزی سے پلٹ کر میری نگاہوں سے اوچھل ہو گئی۔ میں نے اسے آہستگی سے دروازہ بند کر دیا۔

کاغذ کے تھیلے میں شیشیوں کی موجودگی کو میں نے محسوس کر لیا تھا۔ یہ یقیناً ہائڈروجن اور ایمونیا کی شیشیاں تھیں۔ میں نے دروازہ بند کرتے ہی وہ تھیلہ اپنے تکیے کے

ہو گا۔ اس نے مجھے ہدایت کی تھی کہ اس کے جاتے ہی میں اپنے بالوں اور مونچھوں کو رنگ لوں اور اس کے واپس آنے کے بعد یہاں سے نکلنے کے لیے تیار رہوں۔

یہ خبر میرے لیے بہت اہم تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ خدا ہماری مدد کر رہا ہے۔ میں نے اشارے سے اسے مطمئن رہنے کو کہا۔ وہ میرے کمرے میں زیادہ دیر نہ رکی۔ میں اس کے جانے کے بعد کھانے میں مصروف ہو گیا۔ سینڈوچ کھاتے ہی جیسے میری آنکھیں کھل گئی تھیں۔ چائے پی کر فارغ ہوا تو میں نے رقم کا وہ تھیلا اپنے نیکے کے غلاف میں رکھ لیا جو مجھے مسٹر زید نے دیا تھا۔ وہ شاید رقم دے کر بھول چکے تھے۔ بہر حال یہ رقم میرے لیے بے حد ضروری تھی۔ میں بستر پر لیٹ گیا اور آنے والے حالات کا احاطہ کرنے لگا۔

رات تقریباً نو بجے نور نے مجھے بتایا کہ مسٹر جمال تیار ہو کر جا چکے ہیں اس کا خیال تھا کہ وہ رات بارہ ایک بجے سے پہلے واپس نہ آسکیں گے۔ میں نے اور نور نے اس رات ساتھ ہی کھانا کھایا۔ نور کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ مین گیٹ پر تین آدمی موجود ہیں۔ ایک اندرونی حصے میں اور دو باہری حصے میں۔ یہ سن کر میں پریشان ہو گیا مگر نور مطمئن تھی۔ اس کے خیال میں سب کچھ ہماری مرضی کے مطابق ہو رہا تھا۔ اس تمام سیٹ اپ میں سب سے بہترین اور اہم بات یہ تھی کہ مسٹر زید اور زینی یہاں موجود نہیں تھے ورنہ ان کی موجودگی ہمارے پلان کی ناکامی ثابت ہوتی۔

کھانے کے فوراً بعد ہی میں نے ہائٹروجن اور ایمونیا سے اپنے بالوں کو رنگ لیا تھا اور اپنے کمرے میں بند ہو گیا تھا۔ نور نے کہا تھا کہ وہ مسٹر جمال کے گھر آنے کے بعد ہی مجھے اطلاع کر دے گی۔ اس نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں سلیپنگ سوٹ میں ہی رہوں البتہ احتیاطاً میں ایک جوڑا اپنے ساتھ رکھ لوں۔ نور نے خواب آور گولیوں کا بندوبست بھی کر لیا تھا جسے وہ جمال کو سلانے کے لیے استعمال کرنا چاہتی تھی۔

رات تقریباً ڈیڑھ بجے میں نے اپنے دروازے پر آہٹ محسوس کر کے دروازہ کھول دیا۔ نور دروازے پر موجود تھی اس کے ہاتھ میں کانڈ کا ایک تھیلا تھا۔ اس نے مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ میں رقم پہلے ہی اپنی جیب میں رکھ چکا تھا۔ فوراً ہی اس کے پیچھے باہر آ گیا۔ ہم دبے پاؤں چلتے ہوئے کوریڈور سے باہر آ گئے باہر آتے ہی نور نے مجھے سنبھال

نیچے چھپا دیا اور خود جلدی سے اسی نیکے پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ نور کے اس انداز نے خواہ مخواہ مجھے خوف زدہ کر دیا تھا۔ میں سمجھا تھا کہ شاید کوئی اسی طرف آنے والا ہے ورنہ وہ اس طرح نہ بھاگ جاتی مگر کافی دیر گزر جانے پر بھی کوئی نہ آیا تو میں مطمئن ہو گیا۔ میں نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ لاک کر دیا۔

پھر میں نے دونوں شیشیاں نکال کر چیک کیں اور انہیں بیڈ کے نیچے چھپا دیا۔ اب میں خود کو کافی چاق و چوبند محسوس کر رہا تھا۔ میں نے وقت پر دوا بھی لے لی اور الماری سے ایک گہرے نیلے رنگ کا سوٹ نکال کر دیکھا۔ اسی قسم کا ایک سوٹ میں کل جمال کو پہنے دیکھ چکا تھا۔ اب مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ الماری میں لٹکے ہوئے یہ کپڑے بالکل میرے ناپ کے کیسے بن گئے تھے۔ یہ یقیناً جمال ہی کے کپڑے تھے جو مجھے فٹ آنے تھے۔

وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ہی ساتھ میرے اعصاب کا تناؤ بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ رات کو حالات کیا رخ اختیار کریں گے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں اور نور پھنس جائیں اور پھر دنیا سے ہمارا نام و نشان تک مٹ جائے اور یہ بھی ممکن تھا کہ ہم اپنے پلان میں کامیاب ہو جائیں۔

نور سے اب تک ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ اب شام ہو چکی تھی۔ میں نے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا بلکہ تھرمس میں موجود سوپ پی لیا تھا۔ نور مجھے بتا چکی تھی کہ ڈاکٹر نے سخت پرہیز بتایا ہے اس لیے مجھے آج صرف سوپ پر ہی گزارا کرنا پڑے گا۔ میں نے پوچھے کی کوشش نہیں کی تھی کہ مجھے کیا ہو گیا ہے یا پرہیز کیوں ضروری ہے اصل میں میرا ذہن ایسے بکھیزوں میں الجھا ہوا تھا جو ہر حال میں میری صحت سے زیادہ ضروری تھا۔

میں اپنے کمرے میں تھا کہ انٹرکام پر نور کی آواز سن کر کچھ ڈھارس سی ہوئی۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میری طبیعت اب کیسی ہے اور میں چائے کے ساتھ کیا لیتا پسند کروں گا۔ میں نے چائے کے ساتھ سینڈوچ لانے کو کہا۔ تقریباً بیس منٹ کے بعد وہ میرے کمرے میں آئی اور آتے ہی ایک کانڈ میری طرف بڑھا دیا۔ جس میں میرے لیے خوش خبری تھی کہ جمال کو رات کسی ڈنر میں جانا ہے۔ وہ رات گئے واپس آئے گا اور چونکہ شراب کا عادی ہے اس لیے نور کو سو فی صد یقین ہے کہ وہ حسب سابق نشے میں ڈوبا ہوا

لیا۔ میں اس کی قربت میں بوکھلایا مگر اس کی سرگوشی نے مجھے فوراً ہی نارمل کر دیا۔ ”تمہیں نشے میں نظر آتا ہے۔“ میں نے فوراً ہی جھومنا شروع کر دیا اور اپنا بوجھ نور ڈال دیا۔ نور مجھے تھامے ہوئے گیٹ کی طرف آگئی اس دوران میں وہ مسلسل مجھے سرگوشی میں ہدایت دے رہی تھی۔ میں نور کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے گنگنائے لگا اور کبھی کبھی خاموش ہو کر لڑکھڑانے بھی لگتا تھا۔

ہم گیٹ پر پہنچ گئے۔ میں نے نور کی ہدایت کے مطابق چوکیدار کو گیٹ کھولنے کے لیے کہا۔ چوکیدار جو شاید نیند سے جاگا تھا بوکھلا کر گیٹ کی طرف بڑھا۔

”خان زادہ..... صاحب کافی نشے میں ہیں، میں کچھ دور تک ٹھلا کر واپس لے آؤں گی۔“ تم گیٹ بند نہ کرنا بلکہ یہیں کھڑے رہنا۔“ نور کی بات سن کر اس نے سر ہلایا۔ میری اور نور کی آواز سن کر باہر موجود دونوں افراد بھی قریب آگئے مگر مجھے اور نور کو دیکھتے ہی منسوب ہو گئے۔

نور نے انہیں میری ضد کے بارے میں بتایا انہوں نے سر ہلایا پھر ان میں سے ایک شخص جو کافی لمبا ترنگا تھا آگے بڑھا اور نور سے کہا کہ اگر وہ چاہے تو وہ ان کے ساتھ حفاظت کے خیال سے چلنے کو تیار ہے مگر نور نے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ میں زیادہ دور نہیں جاؤں گی بلکہ اس سڑک سے دوسری گلی میں جا کر دوسری جانب سے واپس آ جاؤں گی وہ پریشان نہ ہو۔

اس گفتگو کے دوران مسلسل میرا دل دھڑک رہا تھا مگر میں بڑبڑاتا رہا گنگناتا رہا اور ایسی اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتا رہا جنہوں نے چوکیدار سمیت ان دونوں کو منہ دبا کر مسکرائے پر مجبور کر دیا۔ ان تینوں کو جل دے کر ہم آگے بڑھ گئے۔ مجھے کافی دیر تک لڑکھڑا لڑکھڑا کر چلنا پڑا کیونکہ وہ تینوں بالکل پیچھے موجود تھے۔ جہاں تک یہ سڑک سیدھی تھی وہاں تک مجھے نشے بازی کی اداکاری کرنا تھی گلی کے اختتام پر ہم جیسے ہی دوسری سڑک پر مڑے، میں اور نور دونوں سیدھے ہو گئے اور ہماری رفتار اچانک تیز ہو گئی۔ ہم خیریت کے ساتھ اس پراسرار عمارت سے کافی دور نکل آئے تھے۔

نور نے کالے رنگ کی چوڑی سی چادر اوڑھی ہوئی تھی اور کانڈ کا وہ تھیلا بھی اس نے چادر میں چھپایا ہوا تھا جو اس کے پاس تھا اور جس میں اس نے میرا ایک جوڑا لے کر

رکھا لیا تھا۔ ظاہر ہے میں کراچی سے لاہور تک کا سفر سلیپنگ سوٹ میں تو کر نہیں سکتا تھا۔ کوٹھی سے دور نکلتے ہی مجھے اپنے کپڑوں کی فکر ہو گئی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ کسی جگہ اپنے کپڑے بدل لوں مگر نور نے مجھے اس کی اجازت نہیں دی اور مجھے گھسیٹتی ہوئی تیز رفتار سے چلتی رہی۔ کافی دور ایک پان کا کھوکھا کھلا ہوا تھا۔ اس کے برابر ہی میں ایک درمیانے درجے کا ہوٹل تھا جس کے اندر پڑی ہوئی کرسیاں ایک دوسرے کے اوپر اوڑھی رکھی ہوئی تھیں البتہ ہوٹل کے باہر دو مینجمنٹ پڑی ہوئی تھیں۔ قریب ہی بگری سے لدا ٹرک کھڑا تھا اور غالباً ٹرک ڈرائیور وغیرہ ہی ان بچوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ہم تیز رفتار سے چلتے ہوئے اسی سڑک پر آ گئے۔

”نور اگر کسی نے دیکھ لیا تو کیا سوچے گا؟“

”کچھ نہیں سوچے گا۔ میں اور تم میاں بیوی ہیں، میری ماں اسپتال میں ہے۔ ابھی ابھی فون آیا تھا۔ ہمارے پاس گاڑی نہیں ہے اس لیے ٹیکسی تلاش کر رہے ہیں۔ اس کے بعد بھلا کسی کے سوچنے کی گنجائش ہی کہاں رہ جاتی ہے۔ تم اور میں ویلے ہی چرے سے پریشان لگ رہے ہیں۔“

میں اس کی ذہانت پر حیران رہ گیا۔ اس کا یہ روپ میرے لیے قطعی نیا اور حیرت انگیز تھا ورنہ اسے دیکھ کر تو یوں لگتا تھا جیسے ابھی اس نے ٹھیک سے بولنا بھی نہیں سیکھا ہے۔ یہ بہترین کہانی تھی۔ اب میں بے خوف ہو کر قدم اٹھانے لگا۔ بہت جلد ہمیں ایک ٹیکسی مل گئی۔ ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے میں نے پلٹ کر اس سڑک پر دیکھا جہاں سے ہم آئے تھے وہ سڑک سنسان پڑی تھی۔ گویا اب تک تو ہمارے فرار کی خبر نہیں ہوئی تھی اور یہ نیک فال تھی انہیں جس قدر دیر سے پتا چلتا ہمارے حق میں بہتر ہوتا۔

”کدھر صاب؟“ ٹیکسی ڈرائیور کی کھردری آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”جنال اسپتال..... جلدی.....“ مجھ سے پہلے ہی نور بول پڑی۔

”ایمر جنسی ہے میم صاب؟“ ڈرائیور نے فوراً گاڑی اشارت کر کے آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں..... جس قدر جلدی ہو سکے پہنچا دو۔“

”فکر نہ کرو میم صاب، یہ ٹیم ایسا ہے، ہم ہوائی جہاز کی طرح جائے گا۔“ اس نے

ایکسیلٹر پر دباؤ بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔ ڈرائیور باتونی معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے سانس لگا ہوا آئینہ بھی ایسی پوزیشن میں کر لیا تھا کہ میں اور نور اسے نظر آتے رہیں۔ اسٹریڈ لائنس میں اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں آئینے میں صاف نظر آ رہی تھیں۔ مجھے کچھ الجھن سی محسوس ہوئی۔

”میم صاب یہ صاب بیمار ہے کیا؟“

”نہیں، میری ماں اسپتال میں ہے، یہ میرے شوہر ہیں۔“

نور کی بات سن کر اس نے آئینے سے مجھے دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں کچھ عجیب سی بات تھی۔ شاید وہ میری مسلسل خاموشی سے مشکوک ہو گیا تھا جس لمحے مجھے یہ احساس ہوا ٹھیک اسی لمحے نور نے بھی مجھے کہنی مارتے ہوئے کہا۔ ”آپ سے زاہد نے فون پر کیا کہا تھا..... کیا ہو گیا امی کو؟“

”میرا خیال ہے کہ..... انہیں ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ زاہد بے چارا تو بری طرح بوکھلایا ہوا تھا۔ اسی لیے میں نے دیر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ خدا کرے وہ ٹھیک ہوں۔“ میں نے مناسب جواب دیا اور کن انکھیوں سے آئینے کی طرف دیکھا۔

”صاب یہ ہارٹ بھی عجیب چیز ہے، ساری زندگی تنگ کرتا ہے اور پھر..... خود ہی وفادے جاتا ہے۔“

اس کی بات سن کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ شاید اس کی وجہ اس کا مضحکہ خیز انداز تھا۔

”میرا ایک بالکل جوان دوست تھا صاب..... ہنستا کھیلتا، مسخرا پن کرتا اپنی ٹیکسی میں بیٹھا، ٹیکسی اشارت کی اور پھر جھٹکے سے گاڑی بند ہو گئی۔ ہم دوست سمجھے کہ وہ مسخرا پن کر رہا ہے۔ سر کو اسٹینرنگ پر رکھے اوندھا پڑا ہے اور ہم غریب جائے گا تو گلا چھاڑ کر قہقہہ لگائے گا اور بس..... مگر صاب صرف گاڑی بند نہیں ہوا تھا۔ اس کا اپنا گاڑی بھی بند ہو چکا تھا۔“

”اوہ..... سوینڈ.....“

”جی صاب؟“

”کچھ نہیں..... یہ سن کر افسوس ہوا۔“

”افسوس تو سب کو ہوا تھا صاب، پر کیا کرے، اس کا گاڑی کیا بند ہوا سارے گھر کا گاڑی بند ہو گیا۔ پیٹ روٹی مانگتا ہے صاب اور روٹی نہیں ملتی تو سب کچھ ختم ہو جاتا ہے، اس کا بھی سب کچھ ختم ہو گیا۔“

”کیا مطلب؟“ نور نے پوچھا۔

وہ باتیں تو کر رہا تھا مگر اس نے گاڑی کی سپیڈ کم نہیں کی تھی اور یہ بات میرے لیے اطمینان بخش تھی، اگر گاڑی کی سپیڈ کم ہوتی تو میں اسے ڈانٹ کر چپ کرا دیتا۔

”مطلب یہ میم صاب کہ اس کا ایک ماں اور ایک بہن تھا، روٹی بند ہوئی تو ماں بیمار ہو گیا، پھر مر گیا اور بہن..... وہ ہمارا پاس ہے۔ ہم نے شادی کر لیا اس کے ساتھ۔ ابھی ہمارا ایک بچہ ہے، بالکل ہمارا دوست کی شکل۔“

اس کا جملہ ختم ہوا تو اس کی ٹیکسی کی رفتار ہلکی ہو گئی۔ ”لو صاحب اسپتال آ گیا۔“

”وہاں اس گیٹ پر روکو۔“ نور نے بڑے سے کالے گیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

ٹیکسی ڈرائیور کی باتوں میں وقت اور فاصلے کا کچھ پتا نہ چلا اور ذہن سے تفکرات بھی کچھ دیر کے لیے کم ہو گئے تھے۔ میں نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے حیرت سے نوٹ کو دیکھا۔

”نہیں صاب وہاں سے یہاں تک چار روپیہ بنتا ہے۔“

”میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ میں.....“

”لے لو ڈرائیور..... ہم خوشی سے دے رہے ہیں، تم نے اتنی جلدی پہنچا دیا نا

اس لیے.....“ نور نے جلدی سے کہا۔ اس نے شاید میرے لہجے کی تلقین کو محسوس کر لیا تھا۔

میں اس کی مٹھی میں نوٹ ٹھونس کر اسپتال کے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ میرے پیچھے ہی نور بھی آ گئی۔ اسپتال کے کاؤنٹر پر بیٹھا شخص او نگہ رہا تھا۔ ایک دو آدمی اور قریبی ناچ پر بیٹھے تھے جو ہمیں دیکھ کر کچھ متحس سے ہو گئے تھے۔

میں بڑے اطمینان سے کاؤنٹر کی طرف بڑھا۔ ”اے مسٹر.....“ میں نے کاؤنٹر

بجایا۔ کاؤنٹر پر بیٹھا شخص فوراً سیدھا ہو کر رجسٹر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”یس سر!“

”ابھی تقریباً گھنٹا بھر پہلے یہاں کسی خاتون کو لایا گیا ہے، فاطمہ نام تھا۔“

”کوئی ایکسیڈنٹ کیس؟“ اس نے مستعدی سے پوچھا۔

”نہیں..... ہارٹ اٹیک.....“ نور نے فوراً جواب دیا۔

”سوری سر..... ایکسیڈنٹ کیس تو آیا ہے مگر.....“

”ممکن ہے انہیں سول اسپتال میں لے گئے ہوں۔“ نور نے مجھ سے کہا۔

”ہوں..... چلو.....“ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور سیدھا گیٹ کی طرف بڑھ

گیا۔ ہمارا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ میں کاؤنٹر پر بھی نہ جاتا اگر وہ ٹیکسی والا وہیں کھڑا نہ ہو گیا

ہوتا تو..... میں نے باہر آکر دیکھا دور دور تک کوئی ٹیکسی نہ تھی۔ گویا وہ جا چکا تھا۔ ہم

دونوں گیٹ سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہو گئے۔

”اب.....؟“

”ہمیں اسٹیشن جانا ہے، اسٹیشن یہاں سے قریب ہے۔ ٹیکسی مل جائے تو اچھا ہے مگر

تمہارے کپڑے.....“ اس نے میرے سراپے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر اچانک بولی۔ ”یہ

چادر اوڑھ لو۔“ اس طرح کافی حد تک کپڑے چھپ جائیں گے اسٹیشن پہنچ کر کپڑے بدلنا

آسان ہو گا۔ ویٹنگ روم میں جا کر کپڑے تبدیل کر لینا۔“

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا اس لیے میں نے چادر اپنے گرد

پلیٹ لی۔ کچھ ہی دیر بعد ایک ٹیکسی اسپتال کے گیٹ پر رکی، کچھ مسافر اترے اور ٹیکسی

جانے کے لیے مڑی تو میں نے اسے روک لیا۔ ہم نے اسٹیشن کا کما اور خاموشی سے بیٹھ

گئے۔

رات کافی گہری ہو چکی تھی۔ میں نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ ڈالی پونے تین

بجے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد ہم شی اسٹیشن پہنچ گئے۔ یہاں کافی رونق تھی اور بالکل نہیں لگ

رہا تھا کہ رات کے ساڑھے تین بج چکے ہیں۔ میں سیدھا ویٹنگ روم میں چلا گیا۔ نور کے

ہاتھ سے تھیلہ میں اپنے ساتھ ہی لے گیا دس منٹ بعد ہی میں اور نور اسٹیشن پر بنی سینٹ

کی بیچ پر بیٹھے تھے۔ میں نے چادر نور کو دے دی تھی کیوں کہ اب میں کپڑے تبدیل کر

چکا تھا اور سیلپینگ سوٹ اتارتے ہی مجھ میں پھیلا خوف کسی حد تک کم ہو گیا تھا۔ اب

میں خود کو زیادہ بااعتماد محسوس کر رہا تھا ورنہ اس لباس میں گھومتے ہوئے بڑا خوف محسوس

ہو رہا تھا کہ لوگ میری جانب سے مشکوک نہ ہو جائیں۔

میں نے معلومات کے کاؤنٹر پر جا کر وہ لسٹ دیکھ لی تھی جس میں گاڑیوں کی

آمدورفت کا وقت لکھا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد ہی ہمیں ایک گاڑی لاہور جانے والی مل سکتی

تھی۔ میں نے دو ٹکٹ لیے ایک تھرمس خریدی اور کچھ کھانے پینے کا سامان لے کر نور کے

پاس پہنچ گیا۔ ہم دونوں پھر اسی سینٹ کی بیچ پر بیٹھ گئے۔ میری نگاہیں اس خالی پٹری پر جبی

ہوئی تھیں جو اسٹیشن پر روشن بلبوں میں دور تک چمک رہی تھی اور جس پر وہ ٹرین آنے

والی تھی جو ہمیں اس رستے پر لے جاتی جہاں زندگی کی ساری خوشیاں موجود تھیں مگر نور

میرے لیے کسی مسئلے سے کم نہ تھی۔ میں اسے کسی حال میں بھی فاریہ کے گھر نہیں لے

جانا چاہتا تھا اور یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اسے کہاں لے جاؤں۔

بہر حال فی الوقت تو ہمیں یہاں سے نکلتا تھا جس قدر جلد ہو سکے اس جگہ کو چھوڑ

۔ ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ ان لوگوں کو ہمارے فرار کا علم ہو گیا ہو۔ مجھے یقین تھا کہ

ایسی صورت میں وہ سب سے پہلے اسٹیشن پر ہی چیک کریں گے۔ ہمیں وہاں بیٹھے ہوئے

تقریباً دس منٹ ہو گئے تھے۔ اس دور میں، میں اپنی سوچوں میں ہی غرق رہا تھا۔ نور بھی

کچھ سوچ رہی تھی شاید اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہی ہو، اچانک نور نے سختی

سے میرا بازو تھام لیا۔ میں نے گھبرا کر اسے دیکھا۔ اس کا رنگ سفید ہو رہا تھا اور نگاہیں

اسی گیٹ کی طرف تھیں جہاں سے ہم داخل ہوئے تھے اور جس جگہ لوگوں کا ایک جم غفیر

تھا۔

”وہ..... وہ آگئے..... دیکھئے..... وہ.....“

میں نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں اپنی نگاہیں دوڑائیں اور سن ہو کر رہ گیا۔ یہ

دوئی دونوں تھے جو کوٹھی کے باہر پہرہ دے رہے تھے۔ ”اب کیا ہو گا؟“ بے ساختہ میرے

منہ سے نکلا اور فوراً ہی میں نور کو کھینچتا ہوا ان سیڑھیوں کے قریب لے آیا جو اوپر بنے

پل سے ہوتی ہوئی دوسرے پلیٹ فارم پر اتر رہی تھیں۔ درمیان میں پھیلی پٹریوں میں

ایک پٹری پر ایک مال گاڑی کھڑی تھی۔ سیڑھیوں سے اس پلیٹ فارم پر اترتے ہی مجھے

محفوظ ہو جانے کا احساس ہو گیا کیوں کہ اب ہمارے اور ان دونوں کے درمیان مال گاڑی

تھی۔ میں دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ ان دونوں نے ہمیں دیکھا نہ ہو، ورنہ وہ اس

طرف بھی آسکتے تھے۔ اسی خیال کے تحت میں وہاں بھی نہیں رکا اور نور کا ہاتھ تھامے ہوئے لکڑی کے اس جنگلے کے ساتھ ساتھ دوڑتا رہا جو پڑیوں کے اختتام پر بنا ہوا تھا۔ میں اس جنگلے کی دوسری طرف نکلنا چاہتا تھا مگر جنگلے میں لگی لکڑی کی پٹیاں اتنی قریب قریب جڑی ہوئی تھیں کہ ان میں سے گزر کر دوسری طرف جانا ناممکن تھا۔ یہ غنیمت تھا کہ اس طرف کوئی نہ تھا اور گہرا اندھیرا ہمارا ساتھ دے رہا تھا گو اندھیرے میں نور کئی مرتبہ لڑکھڑا کر گرتے گرتے جی تھی۔

ہم اس جنگلے کے ساتھ ساتھ بھاگتے رہے۔ میں نے اپنا ہاتھ جنگلے کی ان پتیوں سے نکایا ہوا تھا تاکہ اگر کہیں گپ آئے تو مجھے پتا چل جائے۔ کچھ دیر تک بھاگتے رہنے کے بعد ہی مجھے احساس ہوا کہ یہاں جنگلے میں کافی گپ ہے۔ میں ٹھہر گیا۔ یہاں اندھیرا بھی اتنا نہیں تھا بلکہ دور کچی آبادی میں روشن بلب کی ہلکی ہلکی روشنی میں مجھے وہ جگہ نظر آگئی جہاں شاید درمیانی لکڑی کی پٹی ٹوٹی ہوئی تھی..... پہلے میں اور پھر نور اس خلا سے دوسری طرف آگئے۔ دوسری طرف کچھ ڈھلوان تھی پھر ایک کچی سڑک تھی اور اس سڑک سے کچھ فاصلے پر بے ترتیب کچھ پکے مکانات بنے ہوئے تھے۔ میں نے ڈھلوان سے اترنے سے پہلے اسٹیشن کی طرف دیکھا۔ اسٹیشن تو نظر نہ آیا کیوں کہ ہم اسے کافی دور چھوڑ آئے تھے البتہ ٹرین کی پڑی جو اب تک ہمارے ساتھ چل رہی تھی دور سے چمکتی نظر آ رہی تھی۔ میں صرف ان دونوں کو دیکھنا چاہتا تھا کہ انہوں نے ہمارا تعاقب تو نہیں کیا! دور دور تک کوئی ذی روح نظر نہ آیا تو مجھے کچھ اطمینان ہوا کہ ہم ایک مرتبہ پھر ان درندوں کی دسترس سے دور نکل آئے ہیں۔

ہم ڈھلوان سے اتر کر سڑک پر آگئے۔ آگے سڑک کے اس طرف بنی آبادی میں سوائے کتوں کے اور کوئی بھی نہیں جاگ رہا تھا۔ صبح کے شاید چار بج چکے تھے یا شاید پانچ بج گئے ہوں گے ظاہر ہے اس وقت کسی کے جاگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور یہ تو غریبوں کی بستی تھی، ان غریبوں کی جو یقیناً سویرے سورج نکلنے سے پہلے اٹھ کر اپنے اپنے دھندوں پر جاتے ہوں گے۔ رات کے اس پہر ہمارا یوں سڑک پر چلنا بھی مناسب نہ تھا، ممکن ہے پولیس ہی پکڑ لیتی کہ ہم کون ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔ نور میرے پیچھے پیچھے سہمی ہوئی چل رہی تھی۔

”نور..... اب کیا کریں..... تم کیا سوچ رہی ہو؟“

”میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔ ہمیں کسی ایسی جگہ پہنچ جانا چاہیے جہاں رات گزاری جا سکے ورنہ.....“

شاید وہ بھی وہی کچھ سوچ رہی تھی جو میرے ذہن میں تھا۔ عین اسی لمحے مجھے کسی گاڑی کے انجن کی سی آواز آئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا دور ایک موٹر سے گاڑی کی روشنی سڑک کے دوسری طرف پڑ رہی تھی۔ میں نے نور کا ہاتھ پکڑا اور بھاگ کر ایک کچے مکان کی دیوار کے پیچھے ہو گیا۔ روشنی اور انجن کی آواز قریب آتی گئی اور کچھ ہی دیر بعد وہ ٹرک ہمارے سامنے آگیا۔ میں نور کے ساتھ دیوار کی آڑ میں دبک گیا۔ میرا خیال تھا کہ ٹرک آگے بڑھ جائے گا مگر اس وقت میرا دل حلق میں آگیا۔ جب ٹرک عین اسی گھر کے دروازے پر رک گیا جس کی آڑ میں ہم کھڑے تھے۔

ٹرک والا اونچی آواز میں کوئی گانا گا رہا تھا مگر ٹرک سے اترتے ہی وہ خاموش ہو گیا، پھر کچھ دیر بعد ہمیں دستک کی آواز آئی۔ شاید یہ اسی ٹرک والے کا گھر تھا۔ چند لمحوں بعد ہی دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز آئی۔ ہم دونوں دم سادھے کھڑے تھے۔ اب ہوا میں خنکی بھی بڑھ گئی تھی اور مجھے کچھ سردی کا احساس ہو رہا تھا۔ نومبر کا آخری ہفتہ تھا، سردیوں کی آمد آمد تھی ظاہر ہے خنکی بڑھنا تھی۔ نور کے ہاتھ بھی ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ یہاں دور تک ایسی کوئی جگہ نہ تھی جہاں چھپ کر ہم رات گزارتے یا سردی سے بچ سکتے۔ اچانک ایک خیال نے مجھے چونکا دیا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی مگر نور نے قہمتاً میری مسکراہٹ نہیں دیکھی ہوگی۔

”نور..... آؤ.....“ میں نے سرگوشی کی۔

”کہاں.....؟“ اس نے دھیرے سے پوچھا۔

”سنو..... اس ٹرک سے بہتر کوئی دوسری جگہ نہیں، یہاں ہم محفوظ بھی رہیں گے اور سردی سے بچاؤ بھی ہو جائے گا۔“

میری بات سنتے ہی نور نے سر ہلایا اور ہم دبے پاؤں ٹرک کی طرف آگئے۔ میں نے سارا دے کر پہلے نور کو سوار کرایا پھر خود بھی ٹرک پر چڑھ گیا۔ ٹرک دونوں اطراف سے بند تھا اور یہ ہمارے لیے بہتر ہی تھا۔ اندر دو تین بوریاں اور کچھ سوکھی گھاس پڑی تھی۔

پڑے تھے۔ راستہ اب بھی سنان تھا دور دور تک کیں آبادی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اب یہاں خاموش پڑے رہنا ہی بہتر تھا۔ ویسے بھی ہم اس کے سوا کر بھی کیا سکتے تھے۔ نور کو پھر نیند آگئی مگر مجھے تو صرف یہ فکر تھی کہ ٹرک کہاں جا کر رکتا ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ہم سوتے میں پکڑے جائیں البتہ میں نے نور کو جاننے پر مجبور نہ کیا۔

نہ معلوم ہم کب تک سفر کرتے رہے، سورج کی کرنیں دھیمے دھیمے روشنی پھیلاتی رہیں، سورج اپنا سفر پورا کرتا رہا اور ٹرک چلتا رہا۔ پھر اچانک ہی کھیت شروع ہو گئے۔ یہ کھیت گئے اور مکئی کے تھے، دھقان سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی ہل لے کر اپنی زمینوں پر نکل آئے تھے۔ میں نے ان کے لباس اور وضع قطع سے اندازہ لگایا کہ ہم اندرون سندھ سفر کر رہے ہیں۔ کچھ اور آگے جانے کے بعد آبادی بھی شروع ہو گئی۔ میں نے جھانک کر دیکھا دور کسی پٹرول پمپ کی تختی روشن تھی۔ وہاں کئی ٹرک اور پک اپ کھڑی تھیں۔ میری چھٹی جس نے اسی لمحے مجھے چونکا کر دیا تھا۔ میں نے نور کو ہلایا۔ وہ اچھل پڑی۔ میں نے اشارے سے اسے اٹھ جانے کو کہا۔

اس نے اٹھ کر چاروں طرف دیکھا۔ ٹرک کی رفتار بھی دھیمی ہو گئی تھی۔ میں اور نور اپنے سامان لے کر ٹرک کے اس حصے کی طرف آگئے جہاں سے ہم باآسانی چھلانگ لگا کر اتر سکتے تھے۔ میرا خیال صحیح تھا۔ ٹرک کچے میں اتر کر رک گیا۔ یہ بڑا غنیمت تھا کہ ٹرک کے پچھلے حصے کی طرف کوئی نہ تھا اور قریب ہی گئے کے کھیت تھے۔ میں نے کان لگائے۔ میں ٹرک والے کے اترنے کا انتظار کر رہا تھا چند ہی لمحوں بعد ٹرک کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور پھر دروازہ ایک زور دار آواز کے ساتھ بند ہو گیا۔ اب مجھے صرف یہ ڈر تھا کہ ٹرک والا اس طرف، کچھ لینے نہ آئے مگر یہ ڈر تھوڑی ہی دیر بعد ختم ہو گیا کیوں کہ میں نے جھانک کر دیکھا تو ٹرک والا اس کیبن کی طرف جا رہا تھا جہاں غالباً چائے مل رہی تھی۔ کیوں کہ مٹی کے چولہے پر رکھی بڑی سی کیتلی سے بھاپ اٹھتی نظر آ رہی تھی۔ میں نے چند لمحے انتظار کیا اور اس کے بعد خود کو سنبھال کر، بڑی احتیاط سے نیچے اتر گیا۔ اس بات کا میں نے خاص خیال رکھا تھا کہ میرے کودنے سے آواز پیدا نہ ہو۔ میں نے اترتے ہی ہاتھ بڑھا کر نور کو اترنے میں مدد دی۔ اس کے اترتے ہی میں اس کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے کھیتوں کی طرف بھاگا۔ ہم بہت جلد محفوظ جگہ پہنچ گئے۔ یہ ایک کھڈ سا تھا اور

ایک طرف ٹرک کا ٹائر اور پانے وغیرہ بھی پڑے تھے۔ میں نے نور کو گھاس پر بٹھا دیا اور خود ایک بوری پر بیٹھ گیا۔ نور نے چادر سے خود کو اچھی طرح لپیٹ لیا تھا۔ میں نے اسے لیٹ جانے کو کہا۔ وہ فوراً ہی لیٹ گئی۔ وہ شاید بہت تھک گئی تھی۔ تھکا ہوا تو میں بھی بہت تھا بلکہ میں تو کافی کمزوری بھی محسوس کر رہا تھا اور میرا بدن بہت گرم ہو رہا تھا۔ شاید بخار دوبارہ چڑھ گیا تھا۔ پیاس کی وجہ سے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا تھا کہ میں نے تھرمس میں پانی اور کچھ کھانے پینے کی اشیاء اسٹیشن سے خرید لی تھیں ورنہ جانے کیا ہوتا۔ پیاس کا احساس ہوتے ہی میں نے تھیلے سے تھرمس نکال کر نور کی طرف بڑھایا۔ نور میرے ہاتھ میں تھرمس دیکھتے ہی اٹھ بیٹھی۔ اس نے غٹاٹ پانی پیا اور بے دم سی پھر گھاس پر لیٹ گئی، پھر میں نے اپنی پیاس بجھائی اور ٹائر پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ سچ کہتے ہیں کہ نیند کانٹوں پر بھی آ جاتی ہے۔ میں تو صرف تھکن اتارنے کے لیے لیٹا تھا مگر جانے کب آنکھ لگ گئی اور شاید نور بھی سو گئی تھی کیوں کہ جب میری آنکھ کھلی تو وہ سو رہی تھی۔ جاگتے ہی مجھے احساس ہو گیا کہ ٹرک رکا ہوا نہیں ہے بلکہ ہم کسی انجانی منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ میں نے گھبرا کر نور کو جگا دیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور شاید وہ چیختے ہی والی تھی کہ میں نے اس کے کھلے ہوئے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

وہ فوراً ہی سنبھل گئی۔ میں نے اشارے سے اسے خاموش رہنے کو کہا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ رات شاید ختم ہونے والی تھی کیوں کہ آسمان کے کنارے سرمئی ہو رہے تھے۔ ہم کسی پکی سڑک پر گامزن تھے۔ ٹرک والے نے ٹیپ آن کیا ہوا تھا اور کوئی سرائیکی زبان کا گانا پوری آواز سے بج رہا تھا۔ سڑک پر دور دور بجلی کے کھمبے لگے ہوئے تھے۔ دونوں جانب کوئی آبادی نہ تھی بلکہ زیادہ تر جھاڑیاں اور درخت آگے ہوئے تھے۔ فضا کی خشکی ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔ میں نے وہاں پڑی ہوئی بوریاں اپنے اور نور کے جسم پر ڈال دیں اور خاموش پڑنے رہنے کا کہہ کر خود بھی لیٹ گیا۔ اس کے سوا کچھ اور کیا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ یہ کم اطمینان کی بات نہ تھی کہ ہم اس جگہ سے دور نکل آئے تھے جہاں ٹھہرے رہنا ہمارے لیے کسی بھی لمحے عذاب بن سکتا تھا۔

نہ معلوم ہم کہاں جا رہے تھے اور ٹرک میں کتنے آدمی تھے اور اب تو دن بھی نکلنے ہی والا تھا۔ آسمان کا سرمئی پن، سرخی میں بدلتا جا رہا تھا۔ میں اور نور دونوں ہی دیکے

”اوہ بات کرائے کی نہیں، تیری بیوی کی ہے، مجھے تو نظر نہیں آرہی۔“ اس نے جھانک کر پیچھے کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ نور ٹرک کے بالکل پیچھے کھڑی تھی۔ میں نے اشارے سے اسے بلایا۔ وہ قریب چلی آئی۔

”اچھا اچھا..... ٹھیک ہے میں سکھر جاؤں گا، بڑی سڑک پر اتار دوں گا وہاں سے تمہیں تانگہ مل جائے گا۔“

شکریہ بھیا، یہی کافی ہے۔“

اسی طرف سے آ جاؤ۔“ اس نے دوسری جانب کا دروازہ کھول دیا۔ پہلے تو میں نے چاہا کہ اسے کہہ دوں کہ ہم پیچھے بیٹھ جاتے ہیں مگر یہ سوچ کر چپ ہو گیا کہ اسے شک نہ ہو جائے۔ اس کے برابر میں میں بیٹھ گیا پھر نور کو سہارا دے کر اوپر کھینچ لیا۔ ٹرک چل پڑا اور میں دل ہی دل میں ہنس دیا کہ ہم اب تک اسی ٹرک کے پیچھے حصے میں سفر کر رہے تھے اور کس قدر خوف زدہ تھے مگر اب اسی ٹرک کے اگلے حصے میں بے خوف بیٹھے ہیں۔ کراچی بہت دور رہ گیا تھا اور ویسے بھی اب مجھے مسٹر جمال وغیرہ کا ڈر نہیں تھا کیوں کہ انہیں گمان بھی نہ ہو گا کہ ہم کسی ٹرک پر سفر کر رہے ہوں گے۔ انہوں نے ہمیں اسٹیشن پر ڈھونڈا ہو گیا ممکن ہے کہ ایئر پورٹ پر اور بسوں کے اڈوں پر تلاش کیا ہو۔

ٹرک والا زیادہ باتونی نہیں تھا یا شاید نے اس نے نور کی وجہ سے زیادہ بات نہ کی اور یہ اچھا ہی ہوا، مجھے سوچنے کا کافی وقت مل گیا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ سکھر پہنچتے ہی میں لاہور فون کروں گا اور فاریہ کو یہ بتا دوں گا کہ میں پہنچنے والا ہوں اور اسے یہ بھی خبردار کر دوں گا کہ میری بجائے جمال کا وہاں پہنچنے کا پروگرام تھا اس لیے اگر آج وہ پہنچے تو وہ خبردار رہے اور اسے کوٹھی میں نہ آنے دے۔ میں نے یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ فی الحال نور کو اپنے ساتھ ہی لے جاؤں گا تاکہ فاریہ مجھے پہچان سکے اور یہ بات میں فون پر ہی بتا دوں گا۔ کہ اگر میں اکیلا آؤں تو سمجھ جائے کہ وہ میں نہیں ہوں۔

”چلو بھیا..... سکھر آ گیا ہے۔“ ٹرک ڈرائیور کی آواز نے مجھے سوچوں کے جال سے نکال لیا میں نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا ہم ایک چوڑی سڑک پر تھے اور ہمارے دائیں جانب ریل کی پٹریاں بکھری ہوئی تھیں اور بائیں جانب آنوور کشاپ بنی ہوئی تھی۔

اس کے چاروں طرف درخت آگے ہوئے تھے۔ کھڈ میں بھی کافی جھاڑیاں تھیں مگر ہم کم از کم یہاں بیٹھ کر آگے کے متعلق کوئی پروگرام تو بنا سکتے تھے۔

نور کا سانس پھولا ہوا تھا۔ ہم کچھ دیر خاموش بیٹھے سانس درست کرتے رہے، پھر میں نے پٹرول پمپ کی طرف جھانکا کسی کو ہمارے بارے میں علم نہیں ہو سکا تھا جس ٹرک میں ہم یہاں تک آئے تھے۔ وہ اب بھی وہیں کھڑا تھا۔ پھر ایک خیال کے تحت میں اٹھ کھڑا ہوا۔

”کہاں جا رہے ہیں؟“

”یہاں بیٹھے رہنا بھی تو ٹھیک نہیں ہے۔ میں یہاں سے نکل کر کوئی انتظام کرتا ہوں۔ تم ایسا کرو کہ چادر کو اچھی طرح لپیٹ کر باہر چل آؤ۔ یہاں چھپے رہنے سے کنارے کھڑے رہنا زیادہ بہتر ہے۔ ویسے بھی اب صبح ہو چکی ہے، کسی کو شک نہیں ہو سکے گا۔“ اتنا کہہ کر میں درختوں کی آڑ سے نکل کر ٹرک کے قریب پہنچ گیا۔ اسی لمحے میں نے ایک شخص کو چادر لپیٹنے ٹرک کے قریب آتے دیکھا۔ آنے والے نے ٹرک کا دروازہ کھولا تو میں سمجھ گیا کہ یہی ٹرک ڈرائیور ہے۔ وہ شخص شکل سے سیدھا سادا اور نیک آدمی لگتا تھا یعنی اس کے چہرے پر ایسا خراٹ پن نہیں تھا کہ مجھے خوف محسوس ہوتا یا میں اسے غنڈہ ٹائپ کا آدمی سمجھتا۔ اس شخص نے مجھے قریب دیکھ کر آنکھ نازی اور اچک کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

اس کے اس انداز نے میرا حوصلہ بڑھایا اور میں جلدی سے اس دروازے کے قریب چلا آیا جسے وہ بند کرنے ہی والا تھا۔ ”بھیا سنو!“

”فرماؤ شہزادے کیا بات ہے؟“

”دراصل..... میری بیوی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ میں نے جھج کر کہا۔

”بیوی.....؟ کیسی بیوی..... کون سی بیوی؟“ اس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”وہ..... وہاں کھڑی ہے، درخت کے پاس..... اسے اسپتال لے کر جانا ہے“

شہر..... اور تو کوئی سواری نہیں ملے گی اگر تم ہمیں شہر پہنچا دو تو..... میں کراہی دے

دوں گا۔“

”شکریہ بھائی۔“ یہ کہہ کر میں نے جیب سے پچاس روپے کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ”اس میں سے اپنا کرایہ کاٹ لو۔“
”نہیں صاب اس کی ضرورت نہیں، مجھے تو آنا ہی تھا اس طرف.....“
”پھر بھی کچھ.....“

”بولانا نہیں..... جاؤ بس دعا کر دینا میرے لئے۔“

میں نے پھر اس کا شکریہ ادا کیا اور ہم دونوں ٹرک سے اتر گئے۔ قریب ہی بہت سے تانگے کھڑے تھے۔ میں نے ایک تانگے والے سے ٹیلی فون کے دفتر کا پتا پوچھا اور اس سے وہاں تک پہنچانے کو کہا۔ تانگے والا راضی ہو گیا تو ہم دونوں اس میں بیٹھ گئے۔ آدھے گھنٹے کے بعد اس نے ایک منزلہ عمارت کے سامنے تانگہ روک کر بتایا کہ یہی ٹیلی فون کا آفس ہے۔ میں اسے کرایہ دے کر نیچے اتر گیا۔ نور پہلے ہی اتر چکی تھی۔

چند ہی لمحوں بعد میں فاریہ سے فون پر بات کر رہا تھا۔ فاریہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”تم آخر کیا چاہتے ہو اقبال، سوہنی کی حالت خراب ہے، ہم سب پریشان ہیں اور تم کسی صورت واپس آنے کو تیار نہیں ہو۔“

”میڈم میری بات غور سے سنئے گا۔“ اتنا کہہ کر میں نے چاروں طرف دیکھا۔ لوگ مجھ سے کافی فاصلے پر تھے۔ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”میڈم میں اب تک کسی کی قید میں تھا اور مجھے قید کرنے والا زید نامی شخص تھا۔“ پھر میں نے اسے مختصراً سب کچھ بتا دیا یہ بھی کہ جمال کا میرے روپ میں وہاں جانے کا پروگرام تھا۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ میں اپنے بالوں کو بھورا کر چکا ہوں۔ اب غالباً مجھ میں اور جمال میں کوئی فرق نہیں مگر جمال اگر وہاں آیا تو وہ اپنے بالوں کو کالا کر کے آئے گا۔ دوسری بات یہ کہ وہ تنہا ہو گا جب کہ میں تنہا نہیں ہوں۔ یہی میری پہچان ہے کہ میرے ساتھ نور ہوگی۔“

”سنو اقبال تم فوراً اتر پورٹ پہنچو..... سوری، اسٹیشن پہنچو اور کسی تیز رفتار ٹرین سے یہاں پہنچ جاؤ۔ میں تمہا سے مسائل سے نہیں نیٹ سکتی، تمہاری باتیں سن کر تو میں اور پریشان ہو گئی ہوں۔“

”میڈم اب تو پریشانی کی کوئی بات نہیں، میں یہاں سے فوراً ہی روانہ ہونے کی کوشش کرتا ہوں، بس آپ پوری احتیاط رکھئے، چوکیدار کو بتا دیجئے کہ اگر وہ اقبال کو تنہا

دیکھے تو بالکل اندر نہ آنے دے، سلطان کو بھی بتا دیجئے اور حوصلہ رکھئے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ خدا نے اب تک ہماری مدد کی ہے وہ آئندہ بھی ہماری حفاظت کرے گا۔“

یہ سب بتا کر میں نے فون بند کر دیا۔ فاریہ بے حد پریشان تھی اور اسے ہونا بھی چاہیے تھا۔ میرا اچانک وہاں سے غائب ہو جانا ہی اس کے لیے عذاب بن گیا ہو گا۔ نور اس دوران میں میرے قریب ہی کھڑی رہی۔ فون کرتے ہی ہم باہر آ گئے۔ ہم نے پھر تانگہ کیا اور اسٹیشن پہنچ گئے۔ میں نے ٹرینوں کا وقت معلوم کیا اور ٹکٹ خرید کر نور کو زنانہ ویننگ روم میں بٹھا کر خود باہر آ گیا۔ یہاں ہمیں تقریباً پون گھنٹے بعد ایک ٹرین ملنا تھی۔ میں نے یہ وقت بڑے عذاب میں کاٹا۔ ٹرین کی آمد کے ساتھ ہی اسٹیشن پر بھگدڑ مچ گئی تھی۔ میں نے زنانہ ویننگ روم سے نور کو بلایا اور مطلوبہ ڈبے میں سوار ہو گیا۔

گاڑی پندرہ منٹ تک اسٹیشن پر کھڑی رہی۔ اس دوران میری نگاہیں مسلسل اسٹیشن کا جائزہ لے رہی تھیں، ایک نامعلوم سا خوف مجھے اندر سے دبوچے ہوئے تھا کیوں کہ یہ ٹرین کراچی سے آرہی تھی۔ پندرہ منٹ بعد جب گاڑی نے وسل دی اور ریٹنگنے لگی تب جا کر مجھے سکون ہوا۔ رفتہ رفتہ گاڑی نے اسپید پکڑ لی۔ نور کھڑکی سے لگی بیٹھی تھی اور باہر تیزی سے گزرنے والے مناظر کو دیکھ رہی تھی۔ ہمارے ڈبے میں زیادہ لوگ نہ تھے۔ اس لیے میں سامنے کی برتھ پر لیٹ گیا۔ نور کو بھی میں نے اوپر برتھ پر لیٹ جانے کو کہا۔ اس طرح ہم کافی حد تک محفوظ بھی ہو گئے تھے۔ مجھے تو لیٹنے ہی نیند آ گئی تھی معلوم نہیں نور بھی سوئی یا نہیں۔

میری آنکھ کھلی تو شام ہو چکی تھی میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میرے سامنے والی برتھ خالی تھی۔ میں نے نیچے جھانک کر دیکھا نور وہاں بھی نہیں تھی۔ میں بوکھلا کر نیچے اتر آیا۔ اس کی چادر کھڑکی کے پاس ایک کونے میں رکھی تھی۔ چادر کے نیچے تھپا بھی تھا مگر نور کہاں گئی؟ میں نے آگے بڑھ کر پیچھے والی سیٹوں پر دیکھا جہاں دو عورتیں، ایک مرد اور تین بچے کھانا کھا رہے تھے۔ نور وہاں بھی نہ تھی۔ وہ مرد مجھے عجیب سی نگاہوں سے گھورنے لگا۔

”سنئے..... یہاں..... میری بیوی تھی؟“

”وہیں ہوگی مسٹر، یہاں آپ کی بیوی نہیں ہے۔“ اس نے غصے سے جواب دیا۔

میرے سوتے ہی کئی اسٹیشن آئے ہوں گے۔ ممکن ہے کہیں اتر گئی ہو۔ اسی خیال نے مجھے مزید بوکھلا دیا۔ میں تو فاریہ سے کہہ چکا تھا کہ میں تنہا نہیں ہوں۔ اب اگر تنہا گیا تو وہ مجھے جمال سمجھے گی۔ میں نے سر ہٹا لیا۔ میرے اوپر جو افتاد پڑتی ہے وہ اپنی نوعیت کی انوکھی ہوتی ہے۔ لگتا ہے جیسے میں کسی دلدل میں پھنس گیا ہوں۔ جتنا نکلنے کی کوشش کرتا ہوں، اتنا ہی اس میں دھنستا چلا جاتا ہوں۔ اس وقت تو میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اپنے بال نوچ ڈالوں۔ کس مصیبت سے تو میں وہاں سے نکل کر آیا تھا اور اب ایک نئی مصیبت میرے سر پر کھڑی تھی۔ مجھے نور سے کسی ایسی بے وقوفی کی توقع نہ تھی کہ وہ خود ہی کسی اسٹیشن پر اتر جائے گی۔ ایسے حالات میں تو اسے تنہا ہونا ہی نہیں چاہیے تھا۔ اب صرف ایک ہی بات رہ گئی تھی کہ کسی نے اسے زبردستی اتار لیا ہو، مگر کس نے؟ یہ ایک سوال تھا جس کا جواب مجھے کافی دیر گزر جانے پر بھی نہیں سوجھا میرا دم گھٹنے لگا اور میں نے گھبرا کر اپنا سر کھڑکی سے باہر نکال لیا تاکہ تازہ ہوا سے پیچھے پھڑوں کو بھر سکوں۔

میں نے جوں ہی سر باہر نکالا گھبرا کر پھر اندر کر لیا۔ مجھے یقین نہ آیا کہ لمحے کے سوویں حصے میں میری نگاہوں نے جو دیکھا ہے وہ حقیقت ہے یا میرا خوف حقیقت بن کر میرا منہ چڑا رہا ہے۔ میری ہمت نہ ہوئی کہ میں اس کی تصدیق کے لیے دوبارہ سر باہر نکال کر دیکھوں۔ پھر میں نے سامنے پڑی چادر کو سر اور چہرے پر اس طرح لپیٹ لیا جیسے پردہ کرنے والی عورتیں لپیٹی ہیں اور ڈرتے ڈرتے سر کو پھر باہر نکال کر اس جانب جھانکا۔ وہ حقیقت تھی۔ وہ ان دو میں سے ایک شخص تھا جسے میں نے جمال کی کونٹھی کے باہر دیکھا تھا اور جس نے نور سے ساتھ چلنے کی اجازت مانگی تھی۔

یہ تصدیق کرنے کے بعد میرا تو دم ہی نکل گیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ نور کو بھی وہی لوگ لے گئے ہوں گے، ممکن ہے نور نے اب تک انہیں میرے بارے میں نہ بتایا ہو۔ بہر حال اب مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا فوراً ہی کرنا تھا۔ یہ بات میں جانتا تھا کہ اب اگر میں ان لوگوں کے ہتھے چڑھ گیا تو شاید زندہ نہ بچ سکوں مگر مسئلہ یہ تھا کہ اتنی تیز رفتار ٹرین سے کودنا یا فرار ہونا بھی میرے لیے ناممکن تھا پھر بھی میں نے نور کی چادر اپنے گرد لپیٹ لی اور تھیلہ بغل میں دبا کر چوکنا ہو کے بیٹھ گیا۔ اب میری نگاہیں کھڑکی سے باہر اندھیرے میں بھٹک رہی تھیں۔ میں باہر کسی آبادی یا اسٹیشن کے آثار دیکھنے کی تمنا لیے دم سادھے بیٹھا

تھا۔ مجھے یہ تو اطمینان تھا کہ ٹرین کے بغیر وہ لوگ کبھی مجھ تک نہیں پہنچ پائیں گے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ ٹرین کی رفتار کم ہوتے ہی اسٹیشن آنے سے پہلے ہی دوسری جانب کود جاؤں گا۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک ٹرین اپنی پوری رفتار سے دوڑتی رہی تب کہیں جا کر میں نے دور سے روشنیوں کو جگمگاتے دیکھا۔ میں چوکنا ہو گیا عین اسی لمحے میں اپنے سامنے نور کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”آپ اٹھ گئے ہیں میں سمجھی تھی کہ اب لاہور جا کر ہی آپ کو قلی کے ہاتھوں اترانا پڑے گا۔“ وہ بڑی مصومیت سے بولی، وہ مجھ پر گزرنے والے عذابوں سے قطعی نادانف تھی۔

”کہاں چلی گئی تھیں تم؟“ میں نے جھپٹ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

میرے اس غیر متوقع رویے سے وہ ششدر رہ گئی۔ ”وہ..... وہاں اگلے ڈبے میں لڑکیاں لوڈو کھیل رہی تھیں، وہاں چلی گئی تھی۔ آپ تو سوئے ہوئے تھے مگر مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔“

میں اس کی مصومیت کے آگے بے بس ہو گیا۔ اس پر غصہ کرنا میری زیادتی تھی۔ بھلا اسے کیا معلوم تھا کہ میں نے یہ دو گھنٹے کس طرح گزارے ہیں اور کیا کچھ جان گیا ہوں۔ یہ احساس ہوتے ہی میں ٹھنڈا ہو گیا۔ اسے ٹرین کی رفتار کم ہونے سے پہلے ہی تمام حالات سے آگاہ کرنا ضروری تھا تاکہ وہ خود کو تیار کر سکے۔ لہذا میں نے اسے اپنے پاس بٹھا کر بتا دیا کہ ان دو پہرے داروں میں سے ایک اسی ٹرین میں موجود ہے۔ وہ یہ بات سنتے ہی فح ہو گئی۔ میں نے اسے سمجھا دیا کہ اب میرا پروگرام کیا ہے۔ کچھ لمحوں بعد ہی اسے حالات کی سنجیدگی کا احساس ہو گیا۔ اس نے خود کو بڑی جلدی سنبھال لیا مگر خوف اس کے چہرے پر جم کر رہ گیا تھا۔ شاید وہ بھی جانتی تھی کہ ان لوگوں کے ہاتھ لگ جانے کا کیا مطلب ہے۔

”نور دیکھو..... اگر ہمیں مرنا ہی ہے تو ہم جرات سے موت کا مقابلہ کرتے ہوئے مرس گے ورنہ ان لوگوں کے ہاتھوں چوہے کی موت مرجانا میں پسند نہیں کروں گا۔ ویسے بھی ہلکی رفتار میں ٹرین سے کود جانے میں کم از کم ایک فیصد تو زندہ رہ جانے کا امکان

ہے اگر ان کے ہتھے چڑھ گئے تو.....“

”نہیں سر..... میں چلتی ٹرین سے کود کر مرجانے کو ترجیح دوں گی.....“ اس نے پرعزم لہجے میں کہا۔

”شاباش، تم ہمت کرو، خدا ہماری مدد کرے گا۔“

”آپ فکر نہ کیجئے سر..... مجھے خدا پر پورا یقین ہے، وہی اب تک ہماری مدد کرتا رہا ہے اور آئندہ بھی انشاء اللہ وہ ہماری مدد کرے گا اور اگر ہماری قسمت میں موت ہے تو بھی اسے قبول کر لینا انسان کی بے بسی ہے، سو ہم بھی یہاں بے بس ہوں گے۔“

”چلو پھر اس طرف چلو۔ ہمیں دوسری طرف سے کودنا ہے، کیوں کہ اسٹیشن سیدھے ہاتھ پر آئے گا، روشنیاں بھی اس طرف زیادہ ہیں۔ ہمیں اٹلے ہاتھ والے دروازے کے قریب رہنا چاہیے۔“ یہ کہہ کر میں اور نور ٹواٹلٹ کے ساتھ بنے ہوئے دروازے کے پاس آگئے۔ ٹرین کی رفتار اب کچھ کم محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ ٹھنڈی ہوا کا تیز جھونکا ہم دونوں کو کپکپا گیا۔ پہلے میں نے سوچا کہ چادر نور کو اوڑھا دوں تاکہ وہ مجھے بے حس یا خود غرض نہ سمجھے۔ مگر یہ سوچ کر ایسا نہیں کیا کہ چادر میں لپٹ کر کودنا اس کے لیے مشکل بھی ہو سکتا اور خطرناک بھی ٹرین کی رفتار ابھی اتنی کم نہیں ہوئی تھی کہ میں کودنے کی ہمت کرتا۔

روشنیاں اب قریب آتی جا رہی تھیں۔ رفتار مزید ہلکی ہو گئی تھی۔ جس طرف ہم کھڑے تھے وہاں پٹریوں کے پتھوں بچ ایک پرانی سی عمارت بنی ہوئی تھی اور اس عمارت کی کھڑکی سے سرخ رنگ کی بتی ہلتی نظر آ رہی تھی۔ غالباً کوئی شخص سرخ رنگ کی لالین ہلا کر ٹرین کو رک جانے کا سگنل دے رہا تھا۔ یہ ہمارے لیے بہتر ہی تھا۔ ٹرین کی رفتار مزید ہلکی ہو گئی۔ اب یہ رفتار ایسی تھی کہ میں کود سکتا تھا۔ میں نے نور کو ہدایت کی کہ وہ ٹرین سے کودتے وقت اپنا منہ سامنے کی طرف رکھے یعنی اس طرف جس طرف ہماری ٹرین جا رہی ہے اور جسم کا سارا زور بھی اس طرف کو لگائے۔

نور نے سر ہلایا اور میں نے اسے بتایا کہ جس عمارت سے سرخ روشنی دکھائی جا رہی ہے اس سے کچھ پہلے ہی اسے کودنا ہے تاکہ عمارت میں موجود شخص ہمیں نہ دیکھ سکے اور اس عمارت سے ہمارا فاصلہ اتنا نہ ہو کہ پہنچنا مشکل ہو جائے کیوں کہ وہ عمارت ہمارے

چھپنے کی بہترین جگہ تھی۔ ورنہ اسٹیشن پر گاڑی ٹھہر جانے کے بعد ممکن ہے وہ لوگ ہمیں زیادہ سرگرمی سے تلاش کرتے۔

میری تمام باتوں کو نور نے سمجھ لیا تو میں کودنے کے لیے تیار ہو گیا اور پھر اس عمارت سے کوئی پچاس گز کے فاصلے پر میں نے اللہ کا نام لے کر چھلانگ لگا دی۔ زمین سے ٹکرا کر میری آنکھوں میں ستارے ناچ گئے اور سب کچھ گھومتا ہوا محسوس ہوا مگر ایسی حالت میں بھی میں قلابازیاں کھا کر سیدھا ہو گیا۔ میری نگاہیں اس دروازے پر پکی ہوئی تھیں۔ جہاں نور کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے زمین سے اٹھنے کی کوشش نہیں کی کہ کسی کی نگاہ میں نہ آ جاؤں۔ ٹرین کچھ ہی دور گئی ہو گی کہ میں نے نور کو کودتے دیکھا اور پھر جیسے اسے اندھیرے نے نگل لیا۔

ٹرین اپنی رفتار سے آگے بڑھتی رہی۔ میں نے کھڑے ہونے کی کوشش کی مگر چکرا کر بیٹھ گیا۔ میری دائیں ٹانگ کا گھٹنا درد سے پھٹ رہا تھا۔ شاید گھٹنے سے ٹرین کی پٹری ٹکرائی تھی۔ میں نے بیٹھے بیٹھے اسی طرف سر کننا شروع کر دیا۔ جس جگہ میرے اندازے کے مطابق نور نے چھلانگ لگائی تھی۔ ٹرین اب بھی دھیمی رفتار میں چلی جا رہی تھی پھر یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ وہ اسٹیشن پر رے بغیر گزرتی چلی گئی۔ غالباً یہاں رکنا اس کے ٹیڈول میں نہ تھا۔

میں نے ہمت کی اور کھڑا ہو کر اپنی ٹانگ کو جھٹکے دیے۔ گھٹنے میں اب بھی درد تھا مگر اس کی شدت میں کافی کمی ہوئی تھی۔ میں نے لنگڑا لنگڑا کر آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ اب تک میں نے نور کو اٹھتے نہیں دیکھا تھا۔ بلکہ وہ ایک گٹھڑی کی صورت میں پٹریوں پر پڑی تھی اور دور سے آتی ہوئی روشنی میں صاف نظر آ رہی تھی۔ میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔

”خدا یا وہ ٹھیک ہو۔“ میں نے دعا کی اور تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ اسے یوں پڑے دیکھ کر میں اپنی تکلیف بھول گیا تھا۔ میں اس کے قریب پہنچا تو وہ بے حس و حرکت پڑی تھی۔ میں نے اسے چیک کیا وہ زندہ تھی مگر شاید بے ہوش ہو گئی تھی۔ ظاہر ہے جب مجھ ایسا ہٹا کٹا آدمی چکرا کر رہ گیا تھا تو بھلا وہ نازک سی لڑکی یہ تکلیف کیسے برداشت کرتی۔ میں نے نور کے پاس آنے سے پہلے وہ تھملا اٹھا لیا تھا جو میرے گرتے ہی میرے

ہاتھ سے نکل کر دور جاگرا تھا۔ میں نے تھرمس میں سے پانی نور کے چہرے پر پھینکا اور اس کے منہ کو کھول کر پانی کے چند قطرے ٹپکائے۔

میں جلد از جلد یہاں سے ہٹ جانا چاہتا تھا۔ ممکن ہے کوئی ٹرین ہی اس پٹری پر آنکلتی یا اس عمارت میں موجود کوئی شخص ہمیں دیکھ لیتا۔ میں چاہتا تھا کہ جس قدر جلد ہو سکے اس عمارت کی آڑ میں ہو جائیں مگر گھٹنے کے درد کی وجہ سے میں نور کو اٹھا کر وہاں تک نہیں جاسکتا تھا۔ میں نے نور کے رخساروں کو ہتھپتھپایا اور یہ دیکھ کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی کہ نور ہوش میں آرہی تھی۔ میں نے دھیرے دھیرے اسے پکارا تو وہ پوری طرح ہوش میں آگئی۔

ہوش میں آتے ہی وہ جھٹکے سے اٹھی اور پھر چیخ کر لیٹ گئی۔ میں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ وہ عمارت اتنی زیادہ دور بھی نہ تھی۔ ممکن ہے کہ وہاں موجود شخص اس کی چیخ سن لیتا۔ ”نور..... ہمت کرو..... جلدی..... پلیرورنہ.....“

وہ فوراً ہی ساری صورت حال سمجھ گئی اور پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر میرا سہارا لیا۔ اس کی بھی ٹانگ میں چوٹ آئی تھی۔ میرے گھٹنے کا درد بھی بڑھ گیا تھا مگر ہم دونوں ایک دوسرے کا سہارا لیے دھیرے دھیرے گہرے اندھیرے کی طرف بڑھنے لگے۔ فی الحال اس عمارت تک پہنچنا ہم دونوں کے لیے ممکن نہ تھا اور لوگوں کی نگاہوں سے بچنے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ ہم گہرے اندھیرے میں گم ہو جاتے۔

تقریباً بیس منٹ بعد ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں پڑیوں کے آخری حصے میں مال گاڑی کا ایک خالی ڈبہ تھا کھڑا تھا۔ ہمیں اس خالی ڈبے کو دیکھ کر خوشی ہوئی تھی۔ باہر ٹھنڈ بھی کافی بڑھ گئی تھی اور رات بھی گہری ہو گئی تھی۔ باقی رات گزارنے کے لیے اس سے بہتر کوئی جگہ نہ تھی۔ میں نے کسی نہ کسی طرح نور کو اس میں چڑھادیا اور خود بھی ڈبے میں داخل ہو گیا۔ ڈبے میں عجیب سی بدبو پھیلی ہوئی تھی مگر باقی مصیبتیں اٹھانے سے بہتر تھا کہ ہم یہ بدبو برداشت کر لیتے۔ ڈبے میں گہرا اندھیرا تھا اور اس اندھیرے میں مجھے ایک پیچھتاوے نے دبوچ لیا تھا کہ کاش میں لائٹریا ماچس رکھ لیتا مگر ایسی کسی سچویشن کی ہمیں امید ہی نہ تھی اور جن حالات میں ہمیں وہ عمارت چھوڑنا پڑی تھی اس میں اتنا ہوش کہاں تھا کہ ماچس کا خیال آتا۔

اس گھپ اندھیرے میں اپنی یا نور کی چوٹ کا جائزہ لینا ناممکن تھا۔ میں نے نور کو لٹا کر اسے چادر اوڑھادی اور خود بھی وہیں کونے میں لیٹ گیا۔

”یہ کون سی جگہ ہے؟“ نور نے کراہ کر پوچھا۔

”معلوم نہیں..... یہ تو صبح ہی پتا چلے گا۔“

”میرے ٹخنے میں سخت تکلیف ہے سر۔“

”سوری نور..... میں اس وقت اس اندھیرے میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ خود میرا گھٹنا بھی بری طرح دکھ رہا ہے۔ کسی چلتی ٹرین سے کودنے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا۔“ وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

”آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے میں آئے دن اس تجربے سے گزرتی رہتی ہوں۔“

”میرا یہ مطلب نہیں تھا.....“

”خیر یہ کیا کم ہے کہ ہم ان لوگوں کے ہاتھ سے بچ گئے اور زندہ بھی ہیں۔“

”ہاں..... خدا بڑا کریم ہے نور، لوگ سچ کہتے ہیں کہ مارنے والے سے بچانے والا زیادہ طاقت ور ہے۔“

اس نے گہرا سانس لیا اور چپ ہو گئی۔

”نور.....!“ میں نے اسے پکارا۔

”ہوں!“

”تکلیف زیادہ تو نہیں، میرا مطلب ہے کہ برداشت کے قابل تو ہے نا!“

”ہاں..... اس تکلیف سے مرنے تو نہیں سکتی البتہ صبح تک عذاب سہنا پڑ گا۔“

”سہنا تو پڑے گا مگر تکلیف اگر زیادہ ہو تو بتا دینا۔“

”تو کیا کریں گے۔“

”زندہ رہنے کی جدوجہد۔“

”نہیں میرے خیال میں صبح تک برداشت کرنا اتنا مشکل نہیں ہو گا۔“

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں بھلا کیا جواب دے سکتا تھا۔ میں اتنا بے بس ہو گیا تھا کہ میرے لیے بلنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میرا گھٹنا ٹوٹتا جا رہا

ہے۔ یہ نوجن خطرے کی علامت تھی۔ ممکن ہے کہ گھٹنے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو مگر اس وقت تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ ہمیں ہر حال میں صبح کا انتظار کرنا تھا۔

پھر ہم دونوں خاموش پڑے رہے۔ کافی دیر گزر جانے کے بعد نور کے ہلکے ہلکے خراٹے گونجنے لگے۔ مجھے کچھ اطمینان ہو گیا کہ اس کی تکلیف کی شدت اتنی نہیں تھی کہ اسے نیند نہ آتی۔ البتہ میرا درد مجھے سونے بھی نہیں دے رہا تھا۔ ویسے بھی میں ٹرین میں اتنی دیر سویا تھا کہ چاہتا بھی تو اب نیند نہ آتی۔ میں یونی الٹی سیدھی سوچوں میں الجھا رہا اور رات گزرتی رہی۔

شاید صبح دم مجھے کچھ دیر کے لیے نیند آئی تھی۔ میرے گھٹنے کی تکلیف بھی کچھ کم ہو گئی تھی۔ آنکھ اس وقت کھلی جب ٹرین کی آواز نے مجھے نیند میں ہی اچھل جانے پر مجبور کر دیا۔ ٹرین اس قدر تیز رفتاری سے گزری کہ ہمارا ڈبا جھنجھکا گیا۔ نور بھی اٹھ بیٹھی تھی۔ برابر والی پٹری سے گزرنے والی ٹرین نے ہمیں صبح وقت پر اٹھا دیا تھا۔ آسمان پر ملکجا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ چڑیوں کی چچھاہٹ چاروں طرف گونجتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے ڈبے سے باہر جھانکا۔ دور دور تک کوئی نہ تھا۔

”نور... ہمیں اسی وقت یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“

”ہاں نکل تو جانا چاہیے مگر پاؤں کی تکلیف.....“

”تکلیف یہاں بیٹھے رہنے سے تو ختم نہیں ہو گی نا، اس کے لیے ہمیں آبادی کی طرف جانا پڑے گا اور آبادی یہاں سے کافی فاصلے پر ہے کچھ اور برداشت کر سکو تو ہم کسی ایسی جگہ پہنچ جائیں گے جہاں سے سواری مل سکے۔“

نور نے ہمت کی اور میں نے نیچے اتر کر اسے سارا دے کر اتار لیا۔ میرے گھٹنے کی تکلیف گو کچھ کم ہو گئی تھی مگر ختم نہیں ہوئی تھی۔ مجھ سے دائیں ٹانگ پر زور نہیں ڈالا جا رہا تھا پھر بھی میں نے اپنی تکلیف کا اظہار نہیں کیا، اظہار کر کے بھی کیا کر لیتا۔

ہم دونوں اسی طرف اتر گئے جہاں کچھ ڈھلوان کے بعد ایک کچا راستہ سا بنا ہوا تھا۔ ہم اس راستے پر چلتے رہے کچھ آگے چل کر راستے کے بائیں جانب ایک نہر شروع ہو گئی تھی۔ میں نے تھرمس میں اس نہر سے پانی بھر لیا اور کچھ دیر ہم اس نہر کے کنارے بیٹھ گئے۔ میں نے اور نور نے ہاتھ منہ دھویا۔ کچھ بکٹ کھائے اور پھر چلنے کو تیار ہو گئے۔

اب آسمان پر شفق پھیلی ہوئی تھی۔ سورج کی کرنیں آسمان کے کناروں سے لپٹی دھیرے دھیرے سر اٹھا رہی تھیں۔ دور کہیں سے پن چکی کی گھول گھول سنائی دے رہی تھی۔ زندگی کی ان آوازوں نے ہمیں بڑا حوصلہ دیا اور ہم ایک نئے حوصلے کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ اسی لمحے دور کہیں سے ماہیا گانے کی آواز سن کر میں اور نور دونوں ٹھٹھک کر رک گئے۔ آواز قریب آتی جا رہی تھی اور پھر ہمیں وہ بیل گاڑی بھی نظر آ گئی جو اسی طرف آ رہی تھی۔ بیل گاڑی پر گھاس لدی ہوئی تھی اور اسے چلانے والا بلند آواز سے گیت گارہا تھا۔

نور کی آنکھوں میں چمک سی بھر گئی۔ وہ بڑے اشتیاق سے اسے دیکھنے لگی۔ نہر کے کنارے لگے درختوں پر چڑیاں چچھا رہی تھیں پن چکی کی گھول گھول اور ماہیا کی لے نے عجیب سا ساں بانڈھ دیا تھا۔ گاؤں کا یہ ماحول مجھے زمانوں بعد نصیب ہوا تھا۔ میں اپنی تکلیف بھول کر اس ماحول میں کھو گیا۔ میں نے قریبی درخت سے کمر کو ٹکا لیا اور آنکھیں موند لیں۔ بند آنکھوں میں میرا اپنا گاؤں اور اس کے سب منظر واضح نظر آنے لگے۔ بس فرق صرف اتنا تھا کہ سوہنی کے گورے گورے نرم پیروں میں بندھی پاکل کی آواز میرے چاروں طرف رقص کرتی محسوس ہو رہی تھی ورنہ یہ سب آوازیں وہی تھیں جو میں نے آنکھ کھولنے کے بعد سے گاؤں سے بھاگ آنے تک سنی تھیں۔

”سر..... وہ قریب آ گیا ہے، اس سے بات کریں یہ ہمیں قریبی گاؤں تک چھوڑ دے۔“ نور نے مجھے چونکا دیا۔

میں درخت کے تنے کو چھوڑ کر راستے کے کنارے آ گیا۔ اسی لمحے اس نے ہمیں دیکھ کر گانا بند کر دیا۔ میں اس کے قریب آنے کا انتظار کرتا رہا۔ اس نے میرے قریب آ کر بیلوں کو روک لیا۔ میں نے سلام کیا اور اسے بتایا کہ ہم میاں بیوی قریبی گاؤں تک جانا چاہتے ہیں اور یہ کہ ہمارے تکلیف ہے۔

”قریبی گاؤں تو بہت دور ہے جی، تکلیف کہاں ہے؟“ اس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اصل میں ہم منہ اندھیرے نکل گئے تھے۔ راستے میں کھڈ آیا تو دیکھا ہی نہیں ”نول“ ہی گڑ پڑے،“ میرے گھٹنے میں چوٹ آئی اور میری بیوی کے ٹخنے میں۔“

بارش میں بھیگتے ہوئے کسی پناہ کی تلاش میں بھاگ رہے تھے۔ ہم دونوں میں بھاگنے کی ہمت ہوتی تو ہم بھی یہ کوشش ضرور کرتے مگر ہم دونوں ہی مجبور تھے اس لیے درخت کے تنے سے کمرٹکا کر بیٹھ گئے۔ میں نے نور کے ننھے کا جائزہ لیا۔ ننھے پر بڑا سائیل پڑا ہوا تھا اور وہ کافی سوج گیا تھا۔ میرے گھٹنے کی سوجن تو کم ہو گئی مگر تکلیف میں چلنے کی وجہ سے اضافہ ہی ہوا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے تک تیز بارش ہوتی رہی اور پھر جس طرح اچانک شروع ہوئی تھی اسی طرح اچانک بند ہو گئی اور بادل تیز ہواؤں کے زور پر اڑتے ہوئے دوسری طرف پہنچ گئے کہیں کہیں سے سورج کی کرنیں جھانکنے لگیں اور آسمان کھڑ گیا۔ یہ خوب صورت منظر بھلا شہر میں کہاں نظر آتے تھے۔ وہاں تو کثیف دھوئیں میں لپٹی فضا اور سر اٹھائے آسمان کی طرف تکتی ہوئی اونچی اونچی عمارتیں دم گھونٹنے لگتی تھیں۔ میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ میں ان کھلی اور صاف فضاؤں کو چھوڑ کر شہر جاؤں مگر فاریہ اور سوہنی کی پریشان صورتیں میری نگاہوں میں چکرانے لگتی تھیں اور میں خود کو مجبور پاتا تھا۔

فاریہ کا خیال آتے ہی میرے ذہن میں ہزاروں باتیں گھومنے لگیں۔ میں اس سے کہہ چکا تھا کہ میں فوراً پہنچنے کی کوشش کر رہا ہوں اور یہ بھی بتا چکا تھا کہ میں سفر میں ہوں۔ اس لحاظ سے تو آج مجھے لاہور پہنچ جانا چاہیے تھا۔ میں جانتا تھا کہ فاریہ کی پریشانی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جائے گی۔

اب پوری طرح سورج کی کرنیں پھیل چکی تھیں، بادل برس کر کہیں دور جا چکے تھے۔ پانی زمین میں جذب ہو چکا تھا۔ میں نے نور سے پوچھا کہ وہ خودیں چلنے کی ہمت پاتی ہے یا نہیں۔ وہ بیچاری سر ہلا کر چبوترے سے اتر آئی۔ اسی لمحے میری نگاہ زمین پر ریگتی ہوئی مٹی پر بیرونی پر پڑی، اگر میں اسے نہ دیکھ لیتا تو وہ بیچاری میرے پاؤں تلے آکر پکلی گئی ہوتی۔ میں نے جھک کر اس مٹی اور خوب صورت کیڑے کو اٹھا لیا اور اسے اپنی مٹی پر رکھ کر نور کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

”دیکھو کتنی خوب صورت ہے..... یہ بھلا شہر میں کہاں ہوں گی۔“ یہ کہہ کر میں نے سر اٹھا کر نور کو دیکھا۔ وہ سکتے کے عالم میں میری ہتھیلی پر ریگتی ہوئی بیرونی کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں، رنگ سفید ہو رہا تھا اور وہ دھیرے دھیرے

”پر تم دونوں کدھر سے آئے ہو، یہاں تو کوئی لاری بھی نہیں آتی۔“ اس کے سوال نے مجھے بوکھلا دیا۔ ہم نہ اس جگہ کے بارے میں جانتے تھے نہ قریب کسی گاؤں کا نام ہی معلوم تھا۔ ”وہ دراصل ہم بہت دور سے آرہے ہیں۔ ایک ٹرک سے آئے تھے اس نے یہاں راتے میں اتار دیا۔ پتا نہیں یہ کون سی جگہ ہے ہمیں تو لاہور جانا ہے مگر اس تکلیف کی وجہ سے چلا نہیں جا رہا۔“

”لاہور تو بہت دور ہے بادشاہو..... آگے آٹھ کوس دور چک نمبر ستاون ہے وہاں حکیم مل جائے گا۔ میں اس طرف تو نہیں جا رہا ہوں پر تمہیں ایسی جگہ اتار سکتا ہوں جہاں سے تم آسانی سے چک نمبر ستاون پہنچ جاؤ گے۔“

”شکریہ بھائی یہی کافی ہے۔“ اتنا کہہ کر میں نے نور کو سہارا دے کر بیل گاڑی میں سوار کر دیا اور خود بھی اچک کر بیٹھ گیا۔ بیل گاڑی آگے بڑھنے لگی۔ نور پچھلے حصے میں بیٹھی تھی اور میں اگلی طرف، بیل گاڑی والے کے برابر میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس کا جائزہ لیا۔ وہ بیچتیس چھتیس برس کا گھرو جوان تھا چہرے پر بلا کی معصومیت تھی مگر آنکھوں میں تیرتی چمک اس کے ذہن ہونے کا ثبوت تھی۔

ہم خاموشی سے سفر کرتے رہے۔ تقریباً گھنٹا بھر بعد ہم ایک گاؤں کے قریب پہنچ گئے۔ اس نے گاڑی روک لی۔ ”یہاں اتر جاؤ، اس کھیت کو پار کرو گے تو سامنے ہی پگڈنڈی مل جائے گی۔ گاؤں میں جا کر کسی سے بھی حکیم محمد حسین کا پتہ کر لینا۔ اچھی دوا دیتا ہے۔“

میں اس کا شکریہ ادا کر کے نیچے اتر گیا۔ نور بھی اتر چکی تھی۔ بیل گاڑی والا واپس مڑ گیا۔ میں اور نور گئے کے اس کھیت کی طرف بڑھنے لگے جو دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اچانک بوندیں پڑیں تو میں حیران ہو گیا۔ بادل اچانک ہی گھر آئے تھے اور موٹی موٹی بوندیں گرنے لگی تھیں۔ میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تقریباً دس گز کے فاصلے پر ایک گھنا درخت تھا جس کے نیچے سینٹ کا ایک چوڑا چوڑا سائنا ہوا تھا۔ میں نے نور کا ہاتھ پکڑا اور اس کے نیچے پہنچ گیا۔ پانی تو یہاں بھی ٹپک رہا تھا مگر کم تھا۔ بارش اب تیز ہو گئی تھی۔ آسمان گہرے بادلوں میں چھپ کر رہ گیا تھا۔ بارش کم ہونے کا کوئی امکان نہ تھا اور آبادی ابھی کافی دور تھی۔ کچھ ہی دیر بعد ہمیں کھیت میں کچھ اور لوگ بھی نظر آ گئے جو

چو ترے پر بیٹھ رہی تھی۔

”نور..... کیا بات ہے..... کیا ہوا نور؟“ میں نے گھبرا کر پوچھا اور بیر ہوئی زمین پر پھینک کر اس کے قریب آیا۔ ”کیا تکلیف بڑھ گئی ہے؟“

”نہیں..... یہ..... یہ بیر ہوئیاں..... ہٹا دو انہیں..... مار دو..... مار دو.....“ وہ ایک دم چیخ پڑی۔

”نور..... نور کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“

”پتا نہیں سر..... یہ بیر ہوئیاں ہمیشہ مجھے خوف زدہ کرتی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے..... جیسے..... اوہ.....“ اس نے ایک دم اپنا سر تھام لیا۔

مجھے یاد آ گیا کہ وہ اس سے پہلے بھی مجھے بتا چکی تھی کہ وہ خواب میں ان بیر ہوئیوں کو دیکھتی رہی ہے۔ ”مگر نور یہ تو بے حد خوب صورت اور بے ضرر کیڑے ہیں، تم ان سے خوف زدہ کیوں ہوں؟“

”پتا نہیں..... مگر یہ جگہ.....“ اس نے سر گھما کر چاروں طرف دیکھا۔ ”بیر ہوئیاں..... اور..... اور یہ چوترا.....“ ہاں..... ہاں میں پہلے بھی یہاں آ چکی ہوں، میں شاید اس جگہ سے واقف ہوں سر۔“ وہ ایک اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اوہ..... نور یاد کرو شاید یہاں تمہارا ماضی چھپا ہوا ہو۔ یاد کرو نور، یہ جگہ..... تم اس سے پہلے کبھی تھیں یہاں؟“

”نہیں..... میں تو ہوش سنبھالنے کے بعد ہی سے اس کوٹھی میں قید ہوں سر پھر..... یہ جگہ..... میرے ذہن میں کانٹے سے چبھ رہے ہیں، آپ شاید ٹھیک کہتے ہیں، ممکن ہے یہاں میرا ماضی چھپا ہوا ہو۔“ وہ اس طرح بول رہی تھی جیسے سوتے میٹر بول رہی ہو۔ اس کی نگاہیں اب بھی اپنے چاروں طرف چکرا رہی تھیں۔ ”میں ان پر ہوئیوں سے کیوں ڈرتی ہوں سر؟“

”کوشش کرو نور۔“

”اس نے سر تھام لیا۔“ ”نہیں یاد آتا.....“

”وہ خواب یاد کرو جو تم نے مجھے سنایا تھا۔“

”اس خواب میں بھی تو کوئی واضح بات نہیں ہوتی سر، بس یہ بیر ہوئیاں سی رہی ہیں۔“

نظر آتی تھیں اور پھر..... پھر ماں کا چہرہ سامنے آ جاتا تھا۔“

”ماں؟“ میں چونک گیا۔

”مجھ بخش کی بیوی سر..... میں ماں کی حیثیت سے اسے ہی جانتی ہوں۔“

”اوہ..... خیر چھوڑو ان باتوں کو..... جھٹک دو ذہن سے، جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا۔“ کہنے کو تو میں نے اسے یہ بات کہہ دی تھی مگر خود میرے ذہن میں بھی کانٹے سے چپنے لگے تھے۔ نہ معلوم کیا بات تھی جو مجھے عجیب سی کیفیت میں مبتلا کر رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے میرا ذہن کوئی خاص بات یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو مگر وہ کیا بات تھی، یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

”چلو نور..... ابھی ہمیں بہت سفر کرنا ہے، اس تکلیف سے جان چھڑانی ہے۔“ میں نے الجھے ہوئے ذہن کو بھول جانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

نور اٹھ گئی۔ اس کی نگاہیں اب بھی خلا میں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔ میں اس کا ہاتھ تھامے ہوئے پھر اسی پگڈنڈی کی طرف چل پڑا جو گاؤں کو جاتی تھی۔ ابھی ہم گاؤں سے کافی فاصلے پر تھے کہ ہمیں ایک بیل گاڑی مل گئی جو اسی گاؤں کو جا رہی تھی۔ میں نے اسے روک کر بیٹھ جانے کی اجازت لی، بیل گاڑی والے کو کرائے کی پیشکش بھی کی تھی مگر اس نے انکار کر دیا کیوں کہ وہ اسی گاؤں جا رہا تھا ہم دونوں بیل گاڑی میں بیٹھ گئے، بیل گاڑی والا ایک شفیق بوڑھا تھا۔ اس نے ہماری تکلیف کے بارے میں سن کر ہمیں ایک دو روز اپنے گھر ممان رہ جانے کی دعوت بھی دی اور ہمیں سیدھا حکیم کے پاس لے گیا۔ حکیم نے میرے گھٹنے اور نور کے ننھے کا اچھی طرح معائنہ کر کے دوا ملی اور چوڑی پٹی سے کس کر باندھ دیا۔ اس کے ملنے سے کافی آرام آیا تھا۔ شاید کوئی پٹھا چڑھ گیا تھا جو مساج کی وجہ سے ٹھیک ہو گیا۔ نور نے بتایا کہ اس کی تکلیف بھی کچھ کم ہے حکیم صاحب نے ہمیں دو روز کی دوا دے دی اور ہم اسی بوڑھے کے ساتھ اس کے گھر آ گئے کیوں کہ وہ بوڑھا وہیں حکیم صاحب کے گھر ہمارے ساتھ بیٹھا رہا تھا اور بہ ضد تھا کہ اس حالت میں ہمیں سفر نہیں کرنا چاہیے۔ کتنا تو وہ ٹھیک ہی تھا، یہ بات بڑی غنیمت تھی کہ ہمیں کچھ دیر آرام کرنے کے لیے چھت بھی میسر آ گئی تھی۔

میں اور نور اس کے ساتھ اس کے گھر پہنچ گئے جہاں اس کی بیوی اور ایک بیٹی کے

آئے۔ بابا مجھے لیے آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ وہ بالکل خاموش تھا مجھے اس کی خاموشی سے الجھن سی ہونے لگی تھی۔ وہ اچانک ایک مکان کے سامنے رک گیا۔ مکان کے دروازے پر لگی کنڈی میں بڑا سا تالا جھول رہا تھا۔ بوڑھے نے اپنی صدری کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چابی نکالی اور تالا کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ ”یہ میرے بھائی کا گھر ہے پتر.....“ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

میں نے چاروں طرف گھوم کر دیکھا۔ گھر میں رکھی ہر چیز بڑے قرینے سے رکھی تھی لگتا تھا جیسے ابھی کسی نے صفائی کی ہو۔

”کہاں ہے آپ کا بھائی؟“

”وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ اسے اس کے بھائی نے زہر دے کر مار دیا۔“

”کیا مطلب..... آپ کا بھائی..... اس کے بھائی نے زہر دے کر مار دیا..... میں کچھ سمجھا نہیں بابا۔“

”وہ میرا سگا بھائی نہیں تھا۔ میرا سالا تھا..... شادو کا ماموں..... میرا بچپن کا یار..... میرا جن.....“

”مگر کیوں مار دیا اس کے بھائی نے؟“

”لاچ پتر..... لاچ آدمی کو اندھا کر دیتا ہے۔ ٹھہر میں تجھے شروع سے بتاتا ہوں۔ عنایت اپنے باپ کا بڑا بیٹا تھا۔ بہت جی دار اور نیک آدمی تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی بد معاش تھا۔ جب تک اس کا باپ زندہ رہا، دنیا بھر کے عیب تھے اس میں۔ شہر میں شادی بھی کر لی مگر ماں باپ یا بھائی کو نہ بتایا مگر جیسے ہی اس کا باپ مرادہ بیوی کو لے کر گاؤں آ گیا۔ باپ ساری جائیداد بڑے بیٹے عنایت کے نام کر گیا تھا۔ اسے چھوٹے بیٹے سے نفرت تھی مگر جب امانت واپس گاؤں آیا تو عنایت نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا اسے زمین دی، مکان دیا، اس کے گھر کا خرچہ بھی دیتا تھا۔ اس کا ہر طرح سے خیال رکھتا تھا پھر بھی وہ مطمئن نہیں تھا اور عنایت کی دولت ہتھیانے کے پکڑ میں رہتا تھا۔ عنایت کا ایک بیٹا تھا اور ایک بیٹی۔ امانت جانتا تھا کہ عنایت کی موت کے بعد اسے کچھ نہ مل سکے گا اور اس کا بیٹا اس کی جائیداد کا وارث بن جائے گا، بیٹی کا رشتہ مانگا تو عنایت نے کہا کہ وہ فیصلہ بچوں کے بڑے بن جانے کے بعد کرے گا۔ ابھی امانت کا بچہ بھی چھوٹا تھا اور شانی بھی۔ مگر پتر.....

سوا کوئی اور نہ تھا۔ بوڑھے کی طرح اس کی بیوی اور بیٹی بھی ہم سے بڑی محبت کے ساتھ ملیں اور بہت جلد ہم سب آپس میں گھل مل گئے۔ کھانا کھا کر میں تو سو گیا اور شام کو اٹھا مگر نور اس کی بیٹی کے ساتھ گھومتی پھری۔ شام کو اس نے مجھے بتایا کہ وہ یہاں کے بہت لوگوں سے مل آئی ہے۔ ”سرا! یہاں کے سبھی لوگ بہت اچھے ہیں اور یہ..... یہ گاؤں، اس میں بنے مٹی کے یہ کچے گھروندے اور ان میں سے اٹھتی ہوئی سوندھی سوندھی خوشبو تو میرے سارے وجود میں بس گئی ہے۔“

”اصل میں تم نے اپنی تمام زندگی کچے پتھر کی بنی ہوئی اس کوٹھی میں گزاری ہے، جہاں انسان بھی پتھر ہی لگتے تھے۔ تم نے باہر کے لوگوں کو دیکھا ہی کب تھا نور کہ تمہیں اچھے اور برے کے معیار کا پتا چلتا۔“

”جی سر..... مگر..... کچھ ہے، کوئی ایسی بات، جو مجھے بے خود کیے ہوئے ہے۔“ اس نے خواب آلود لہجے میں جواب دیا۔

میں نے غور سے نور کو دیکھا۔ وہ بہت بدلی بدلی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ افسردگی، وہ خاموشی جو اس کی شخصیت کی پہچان بن گئی تھی کس فضاؤں میں تحلیل ہو چکی تھی اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار بھی نہیں تھے شاید اس کا نخرہ ٹھیک ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ پوچھتا، وہ بوڑھا، جسے اب میں اور نور بابا کہنے لگے تھے آ گیا۔

”ہاں پتر اب ٹھیک ہے تیرا پاؤں؟“

”جی بابا، بہت بہتر ہے، بابا آپ کو ہماری وجہ سے کافی پریشانی ہو گئی۔“

”او نہ پتر..... ایسی باتیں نہ کیا کر، تیری اور تیری بیوی کی وجہ سے اس گھر میں رونق آگئی ہے ورنہ تو یہ آگن جانے کب سے سنسان پڑا تھا۔“

”سنسان..... کیوں بابا، تیری بھی تو بیٹی ہے نا؟“

”ہاں بیٹی تو ہے پر رونق تو زمانوں پہلے ہی رخصت ہو گئی تھی۔“

”میں سمجھا نہیں بابا.....“

اسی وقت بابا کی بیٹی شادو بھی آگئی۔

”چل باہر چلتے ہیں پھر سمجھاؤں گا۔“

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ سونے سے طبیعت کی ساری کسمندی ختم ہو گئی تھی۔ ہم باہر چلے

گھر تک آگیا۔ میں نے ایک دم دروازہ کھول دیا۔ وہ سامنے کھڑی تھی۔

اس پر نگاہ پڑتے ہی مجھے یاد آگیا کہ اسے دیکھ کر مجھے یہ احساس کیوں ہوا تھا کہ میں پہلے بھی اسے کہیں دیکھ چکا ہوں۔ اس میں خان کی مشابہت تھی۔ پلکیں جھپکا کر باتیں کرنے کا انداز تو بالکل خان جیسا ہی تھا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”کک..... کیا ہوا گیا..... آپ ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟“ نور نے ہلکا کر پوچھا اور میرے ساتھ کھڑے ہوئے بابا کو دیکھنے لگی۔

”بابا..... یہ..... یہ..... یہ شانی ہے!“

”کک..... کیا؟“ اس بار بابا ہلکا گئے۔

”جی بابا..... یہ آپ کی پھڑی ہوئی شانی ہے..... خان کی بہن، آپ کی بھتیجی۔“ میں نے بڑے ڈرامائی انداز میں کہا۔

میری بات سن کر بابا اچھل پڑے۔

”تو..... تو مذاق تو نہیں کر رہا پتر..... میرا دل بہت کمزور ہو چکا ہے۔“

”نہیں بابا..... خدا کی قسم یہ مذاق نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے نور کی طرف دیکھا جو کسی مجسمے کی طرح کھڑی مجھے اور بابا کو تک رہی تھی۔ شاید وہ بھی میری بات کو مذاق ہی سمجھ رہی تھی۔ ”شانی!“ میں اس سے مخاطب ہوا۔ اسے اپنا یہ نام یقیناً اجنبی لگا ہو گا۔ پھر بھی اس نے میری طرف دیکھا۔ ”شانی یہ تمہارے چاچا ہیں..... میں نے تمہارے ماضی کو تلاش کر لیا ہے شانی..... مجھے یاد آگیا ہے کہ تم بیرہوٹیوں سے کیوں خوف زدہ تھیں۔ وہی حسین اور محلی کیڑے تو تمہیں تمہارے اپنوں سے جدا کر گئے تھے۔ خان تمہارے لیے بیرہوٹیاں تلاش کرنے گیا تھا، اسی چبوترے پر بٹھا کر اور تبھی محمد بخش کی بیوی نے تمہیں اغوا کر لیا تھا۔“ میں نے دھیرے دھیرے اسے بتایا مگر وہ یونہی ساکت کھڑی رہی۔

اس دوران میں شادو اور ماسی بھی قریب آگئیں تھیں۔ یہ سن کر کہ نور ان کی پھڑی ہوئی شانی ہے۔ ان دونوں کے چروں پر خوشی برسنے لگی تھی۔ ماسی نے لپک کر نور کو سینے سے لگا لیا۔ شادو بھی اس سے لپٹ گئی۔ بابا خوشی سے بوکھلایا بوکھلایا ادھر ادھر ناچ رہا تھا مگر نور سپاٹ چہرہ لیے کھڑی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ میری بات پر یقین نہیں کر رہی۔

قدرت نے عجیب دکھ دیا کہ وہ شانی کے ہوتے ہوئے بھی اس سے محروم ہو گیا۔ شانی ایک روز اپنے بھائی کے ساتھ گھومنے گئی تو..... پھر کبھی واپس نہ آئی۔ اسے گاؤں کے چپے چپے میں تلاش کیا گیا۔ مگر جانے اسے آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی۔

شانی کے دکھ نے عنایت کی بیوی کو بستر سے لگا دیا، تبھی عنایت نے اپنے بیٹے کے لئے میری بیٹی شادو کو مانگ لیا اور مجھ سے التجا کی کہ میں شادو کو شانی کی ماں کے پاس چھوڑ دوں۔ میں نے بچپن ہی میں اپنی شادو کا نکاح عنایت کے بیٹے سے کر دیا ورنہ برادری والے باتیں بناتے، مگر یہ ترکیب بھی عنایت کی بیوی کو نہ بچا سکی۔ وہ مبینا بھر میں ہی جان دے بیٹھی۔

عنایت پر غموں کے پہاڑ ٹوٹ گئے تھے۔ جانے اس نے بیٹی اور پھر بیوی کا صدمہ کیسے برداشت کیا مگر وقت کسی کی بڑھتی ہوئی تکلیف پر ٹھہرتا تو نہیں، گزرتا ہی چلا جاتا ہے، سو گزر گیا۔ عنایت کا بیٹا جوان ہو گیا۔ میں نے عنایت کی تنہائی کی وجہ سے شادو کو رخصت کرنے کا فیصلہ کر لیا مگر..... اسی روز معلوم ہوا کہ امانت نے اپنے بھائی اور بھتیجے کو کھانے میں زہر دے دیا ہے عنایت کا بیٹا اتفاق سے بچ گیا کیوں کہ اس نے کھانا نہیں کھایا تھا مگر عنایت کے بدن میں زہر سرایت کر گیا۔ اسے اس کا بیٹا اسپتال لے گیا مگر وہ بچ نہ سکا۔ اور پھر..... چچا کے ڈر سے بھتیجا بھی گاؤں چھوڑ کر بھاگ گیا۔

وہ میری بیٹی کا ساگ..... میری شادو کا خاوند..... جانے وہ دنیا میں ہے یا اس ظالم نے اسے بھی مروا دیا مگر..... وہ زندہ ہوتا تو ایک بار تو میرے پاس تو آتا..... مجھے خبر تو کرتا..... میری بیٹی کی مانگ تو بھرنے سے پہلے ہی اُجڑ گئی پتر، اور اسی دن سے میرے گھر میں ویرانی نے بسیرا کر لیا۔ ہمارے ہاں ویسے بھی دوسری شادی نہیں ہوتی اور پھر شادو..... خدا نہ کرے وہ پوہ ہو، مگر پھر بھی.....“

وہ بولتا رہا میرے سر میں دھماکے ہوتے رہے۔ یہ تمام کہانی میری سنی ہوئی تھی۔

”اوہ بابا..... آؤ..... جلدی!“

”کیا ہو گیا پتر؟“ وہ میرے اس طرح کہنے پر حیران ہو گیا۔

”تم آؤ بابا.....“ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

اس نے باہر آکر تالا ڈالا اور میرے ساتھ تیز قدم اٹھانے کی کوشش کرتا ہوا اپنے

ہے۔ تبھی میں نے ان سب کو اپنے گرد بٹھالیا اور انہیں اپنے محسن ”خان“ سے ملاقات کے بارے میں بتانے لگا۔

میں نے محسوس کر لیا تھا کہ خان کے ذکر پر شادو کی آنکھوں سے ویرانی ختم ہو کر ان میں دیپ جل اٹھے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسا ہونا قدرتی تھا۔ وہ تینوں ہی خان کی زندگی کے بارے میں مشکوک تھے اور آج انہیں پتا چل گیا تھا کہ وہ نہ صرف یہ کہ زندہ ہے بلکہ ٹھیک ٹھاک ہے اور ایک نہ ایک دن ضرور لوٹ کر آئے گا اور شادو جو اب تک بیواؤں کی سی زندگی گزار رہی تھی ایک دم سہاگن سہاگن سی لگنے لگی تھی۔

میں نے انہیں بتایا کہ خان نے شانی کے بچھڑنے کا قصہ سنایا تھا تو اس کی آنکھوں میں کتنی پیاس تھی۔ اس کو یقین تھا کہ اس کی بہن بھی دنیا کے کسی نہ کسی حصے میں موجود ہے اور ایک نہ ایک دن وہ اسے تلاش کر لے گا۔

مجھے خوشی اس بات کی تھی کہ میں نے خان کی بہن کو تلاش کر کے، اسے ان درندوں کی چنگل سے آزاد کر کے اور اسے اس کے اپنوں میں پہنچا کر اپنے محسن کے احسان کا بدلہ اتار دیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ میری زندگی، خان کی مرہون منت تھی، وہ اگر اس روز میری مدد نہ کرتا تو شاید میں اس کے ساتھیوں یا پولیس کی گولیوں کا نشانہ بن چکا ہوتا۔ مجھ سے خان کی تمام کہانی سننے کے بعد جب بابا نے ایک ایک بات کی تصدیق کر دی تو نور کے بے جان پتلے میں کچھ زندگی محسوس ہوئی۔ وہ اپنے چاروں طرف بیٹھے لوگوں اور مناظر کو یوں دیکھنے لگی جیسے وہ کچھ یاد کر رہی ہو۔

”نور..... اب تو تمہیں یقین آ گیا نا..... اور پتا ہے خان تم سے بہت ملتا ہے۔ تمہیں دیکھ کر مجھے کئی بار احساس ہوا تھا کہ تمہارے نقوش جانے پہچانے سے لگ رہے ہیں مگر اس وقت مجھے یاد نہیں آیا تھا اور ویسے بھی مجھے یہ گمان نہ تھا کہ تمہارا خان سے کوئی رشتہ ہو سکتا ہے اور جب تم نے بہرہوئیوں والی بات اور خواب سنایا تھا تب بھی میرے ذہن میں کچھ سرسراہٹ ہوئی تھی مگر اس وقت مجھے یہ یاد نہیں آیا تھا کہ یہ بہرہوئیوں والی کہانی میں خان سے سن چکا ہوں لیکن آج بابا نے مجھے تمہارے والدین اور بھائی کے بارے میں بتایا اور یہ بتایا کہ ان کی بھتیجی شانی کس طرح غائب ہو گئی تھی تو مجھے سب کچھ یاد آ گیا، بالکل یہی بات میں خان سے سن چکا تھا۔ مجھے خوشی ہے شانی کہ تمہیں

میں یہاں تک بحفاظت لے آیا۔ اگر خدا نخواستہ تمہیں کچھ ہو جاتا تو میں خان کو کیا جواب دیتا؟“

”وہ..... کہاں ہیں؟“ نور کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔ اس کی آنکھیں بھیگ چکی تھیں اور نچلا ہونٹ کانپ رہا تھا۔

”سوری شانی..... یہ میں نہیں جانتا مگر یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میری اس سے ملاقات ضرور ہوگی۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ پھر مجھ سے ضرور ملے گا اور اب تو میں اسے خود تلاش کروں گا۔ تم فکر نہ کرو جس خدا نے تمہیں تمہارے اپنوں میں پہنچا دیا وہ تمہارے بھائی سے بھی تمہیں ملا دے گا۔“

”پر پتہ یہ تو تو نے بتایا ہی نہیں کہ تمہیں شانی کہاں سے ملی۔ وہ کون ظالم لوگ تھے جو اس کے ماں باپ کو ایسا ناسور لگا گئے تھے اور تیری اس سے شادی کس طرح ہوئی؟“ ماسی نے پوچھا جو ابھی تک شانی کا سراپے کا ندھے پر لگائے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

پھر مجھے ان لوگوں کو نور کی ساری کہانی سنانا پڑی۔ میں نے انہیں یہ بھی بتا دیا کہ نور میری بیوی نہیں بلکہ یہ ڈھونگ ہم نے محض اس لیے رچایا تھا تاکہ لاہور پہنچنے تک کوئی ہم پر شک نہ کرے اور ہم زید کے کتوں سے بچے رہیں جو ہماری بوسو گھتے پھر رہے تھے۔ ”سوہنے ربا، تو بڑا کریم ہے..... ارے ذرا کی ذرا میں سارے دکھ دور کر دیے۔“ ماسی نے جھولی پھیلا کر کہا۔ ”اے ربا..... میرے خان کو بھی ملا دے..... میری دھی کی خوشی بھی لا دے.....“

”اری اٹھ ری شادو کی ماں..... تیل کا کپا لے لے۔ میں اگر بتی لے کر آتا ہوں۔ اپنی شانو کو اس کے گھر لے کر جائیں گے، چوکھٹ پر تیل اور پانی ڈالیں گے..... اگر بتی جلا لیں گے۔ اٹھ جاب اس گھر کی ویرانی ختم ہو جائے گی۔ میں سپارے پڑھواؤں گا اس آگن میں، لڈو بانٹوں گا پورے گاؤں میں..... مگر..... نہیں.....“ آخری جملہ کہتے کہتے اچانک وہ چپ ہو گیا۔ اس کا رنگ پیلا پڑ گیا اور چہرے پر خوف کے گہرے آثار اتر آئے۔

”کیا ہوا بابا!“ میں نے چونک کر پوچھا اور ماسی اور شادو کے چہروں پر نگاہ ڈالی۔ یوں

لگا جیسے وہ لوگ بھی بابا کی بات سن کر ایک دم خوف زدہ ہو گئے ہوں۔ ان کے چہروں پر بھی خوف پھیل گیا تھا۔

”کیا بات ہے بابا..... مجھے بتاؤ۔“ میں نے ایک دم بابا کے کاندھے پکڑ لئے۔ اس کی نگاہیں خلا میں تیرتی ہوئی میرے چہرے پر آکر ٹھہر گئیں۔

”پتھر..... اگر امانت کو پتا چل گیا کہ..... شانی..... آگئی ہے اور خان بھی زندہ ہے تو.....“

اودہ.....“ میں نے گہرا سانس لیا۔ نور کے چہرے پر ابھی تک منہ کے آثار تھے۔ اب اس کیفیت میں خوف بھی اتر آیا۔ وہ اتنی مشکلوں سے تو ظالموں کے پنجے سے آزاد ہوئی تھی اور یہاں ایک اور ظالم اس کا منتظر نکلا۔

”نہیں بابا..... تم ابھی کسی کو شانی کے بارے میں نہ بتاؤ بلکہ اسے نور کہا کرو..... جب خان آجائے گا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“

”ہاں..... یہ ٹھیک ہے بابا.....“ شادو ایک دم بول اٹھی۔

”اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں۔“ میں نے کہا۔

بات بابا اور ماسی کی سمجھ میں آگئی تھی۔ انہوں نے اپنے ارمان دبالیے تھے۔

”اچھا اب اٹھ جا، پکنے کو بھابی تولادے یا اپنی بھتیجی کو بھوکا مار دے گا۔“ ماسی نے اپنے تئیں مذاق کیا۔

”او نہ کرا ایسی گلاں..... جھلی ایسی بدفال منہ سے نہیں نکالتے۔ رب کرے میری بچی سدا جیتی رہے۔ دنیا کی خوشیاں دیکھے..... اور بھابی کیا..... میں مرغی لاتا ہوں۔“

شہر سے آئی ہے میری بچی، بھابی کیوں کھانے لگی۔“ بابا نے نور کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ اس کی آنکھوں میں نور کے لیے بے انتہا پیار تھا۔

”نہیں بابا میں بھابی کھاؤں گی.....“ نور نے دھیرے سے جواب دیا۔ نہ معلوم کیوں اس کے انداز میں اب بھی اداسی تھی۔ اب مجھے اس کی اداسی پر حیرت تھی۔ اسے تو بے حد خوش ہونا چاہیے تھا۔ وہ برسوں کے بعد قطعی اتفاقی طور پر اپنوں میں پہنچ گئی تھی۔

”شانی.....!“ میں نے اسے پکارا۔

”ہوں.....“ وہ چونک گئی۔ ”آپ تو مجھے شانی مت کہئے سر!“

”کیوں..... تمہیں اچھا نہیں لگا کہ تم اپنی شناخت ڈھونڈ چکی ہو۔ اپنوں کے درمیان ہو اور بہت جلد تم اپنے بھائی سے بھی مل سکو گی!“

”اچھا کیوں نہیں لگے گا سر مگر.....“

”مگر کیا؟“

”سر یہ اجنبیت بڑی جان لیوا چیز ہوتی ہے۔ یہ کس قدر تکلیف دہ بات ہے کہ میں جب تک نور رہی اپنے گرد اجنبیت کے لامتناہی سلسلے کو محسوس کرتی رہی اور اپنی شناخت کھو جانے کا دکھ سہتی رہی اور اب جبکہ مجھے میری شناخت مل گئی ہے تو بھی میں اپنے گرد اسی اجنبیت کو محسوس کر رہی ہوں۔ میں خود سے بحیثیت نور مانوس تھی پھر بھی خود کو تلاش کرنے کی جستجو میں لگی رہی اور اب شانی کے نام کی اجنبیت نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا ہے۔ میں اپنے اس نام یا حیثیت سے بھی انسیت محسوس نہیں کر رہی ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے دو مختلف قسم کی کیفیتیں مجھے دو حصوں میں تقسیم کر دیں گی۔“

”تم اس قدر فلسفیانہ انداز میں بھی سوچ لیتی ہو.....؟“ میں نے اس کے جملوں سے نکل کر فضاؤں میں پھیل جانے والی سنجیدگی کو ختم کرنے کے لیے ذرا شوخ لہجے میں پوچھا۔

”نہیں سر، یہ کچھ اتنا گہرا فلسفہ بھی نہیں کہ جسے بیان نہ کیا جاسکے۔ میں تو جو کچھ محسوس کر رہی ہوں وہی کہہ رہی ہوں۔ ہاں البتہ آپ یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ میں اپنی کیفیت بیان کرنے میں مہارت سے کام لے رہی ہوں۔ ممکن ہے عام طور پر لوگ اپنی کسی کیفیت کو بیان کرنے پر قادر نہیں ہوتے۔ اس لیے لوگ ان کی باتوں کو فلسفیانہ نہیں سمجھتے ہوں۔“

”شانی..... میرا مطلب ہے نور..... تم اتنی گہرائی میں جا کر نہ سوچو، تمہیں ہر حال میں ان دو شخصیتوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے، ایک شخصیت نور، قطعی تنہا ہے، جس کا کوئی تعلق نہ کسی سے ہے اور نہ ہی کسی کا تعلق اس شخصیت سے، جبکہ دوسری شخصیت کا تعلق بلکہ بڑا گہرا تعلق بہت سے لوگوں سے ہے اور ان سب معصوم لوگوں کی خوشیاں تمہاری اس دوسری شخصیت سے وابستہ ہیں۔ تمہیں اس سلسلے میں بہت

جلد فیصلہ کرنا ہے۔ میں بھی زیادہ دیر تک یہاں نہیں رک سکتا۔ تمہیں تو تمہاری منزل مل گئی مگر میری منزل ہنوز مجھ سے بہت دور ہے۔“

میرے آخری جملے پر چونک کر اس نے مجھے دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں عجیب سی بات تھی۔

”کیا..... کیا ہوا؟“

”سر..... کہیں آپ نے مجھے میری منزل دلانے کے لیے تو یہ سب..... میرا مطلب ہے کہ.....“

”نور..... تم مجھ پر شک کر رہی ہو؟“ میں اس کی بات سمجھ گیا تھا۔

”سوری سر..... مگر.....“

”میں اب اس سلسلے میں تم سے کوئی بات نہیں کروں گا جو تمہارا جی چاہے فیصلہ کر لو مگر ایک بات یاد رکھنا نور کہ میں خان کو جواب دہ ہوں۔ اگر تم نے کوئی غلط قدم اٹھایا اور میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئیں یا یہاں سے کہیں اور چلی گئیں تو..... میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔ اگر خان کو پتا چلا کہ تم مجھے ملی تھیں اور پھر.....“

”سر..... میں ایسا نہیں کروں گی مگر..... یہ اجنبیت.....“

”بے وقوفی کی باتیں نہ کرو نور، ہر نبی کیفیت اجنبی ہوتی ہے اس سے مانوس ہونا پڑتا ہے تم ان لوگوں کی خوشیوں کو ختم کرنا چاہتی ہو جو تمہیں پاکر بے حد خوش ہیں۔ سوچو اگر انہیں احساس ہو گیا کہ تم یہاں اگر خود کو اور ان کو پاکر غم زدہ ہو تو وہ کیا محسوس کریں گے۔ یہ تمہارے اپنے ہیں نور، انہیں اپنا تمہارا فرض ہے۔ تم جو زندگی گزارتی آئی ہو وہ قطعی بے حس تھی۔ اب تم زندگی کو صحیح طور پر پرکھ سکو گی۔ اسے پرکھنے کی کوشش تو کرو، اور ہاں سنو..... اب اس موضوع کو کلوز کر دو بہتر ہے۔ دیکھو شادو کتنی خوش ہے۔ خان کی زندگی نے اس کے چہرے کی ویرانی کیسے ختم کر دی ہے..... جاؤ وہ جو اب تک بیواؤں کی سی زندگی گزار رہی تھی اسے سہاگن کر دو۔ اس کے بے رنگ کپڑے اتار کر اسے رنگین لباس میں لپیٹ دو۔ اس کے ہاتھوں میں چوڑیاں اور کانوں میں موتیا کے بالے پہناؤ۔ تم اس کی ہند ہو، تمہارا قرب اسے اچھا لگے گا۔ اس کی تنہا خوشیوں میں شریک ہو کر تم خود بھی خوشی محسوس کرو گی نور، اور دوسروں کی خوشیاں، اپنی خوشیوں

سے بڑھ کر حسین ہوتی ہیں۔“

میری باتوں نے اسے رفتہ رفتہ اپنے گرد و پیش کا احساس دلا دیا۔ وہ مسکرائی اور دھیرے سے بولی۔ ”تھینک یو سر..... تھینک یو.....“

مجھے خوشی ہوئی کہ اس نے حالات کی نزاکت کو محسوس کر لیا۔ مجھے یقین تھا کہ کچھ ہی روز میں اس پر چڑھا ملع اتر جائے گا اور وہ بھی کسی تتلی کی طرح گاؤں کی نکھری نضاؤں میں گنگنائی پھرے گی۔ وہ تصنع جو شہر کی زندگی نے اس میں بھر دیا تھا بہت جلد ختم ہو جائے گا۔

نور اٹھ کر اسی کونٹری میں چلی گئی تھی جہاں کچھ دیر پہلے شادو گئی تھی۔ میں تنہا رہ گیا تو پریشان کن خیالات نے مجھے دبوچ لیا۔ فاریہ کا خیال، زید وغیرہ کا خوف، سوہنی کی پریشانی اور ایسی ہی زہریلی سوچیں مجھے پریشان کرنے لگیں۔ میں مطمئن تھا کہ نور اب محفوظ ہاتھوں میں ہے مگر مجھے بہر حال یہاں سے نکلنا تھا۔ آج ہمیں پایا کے گھر میں دوسرا دن تھا۔ میں نے ان دونوں میں اپنی داڑھی منڈوانی چھوڑ دی تھی تاکہ جب میں یہاں سے نکلوں تو زید اور جمال کے کتے مجھے نہ پہچان سکیں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ اب بھی ہم لوگوں کو تلاش کر رہے ہوں گے۔

اب مجھے یہاں سے فوراً ہی نکلنا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اگلی صبح میں لاہور کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔ جو کچھ میری قسمت میں لکھا تھا وہ تو ہر حال میں ہونا ہی تھا۔ میرے سوچنے یا پریشان ہونے سے میری قسمت تو بدل نہیں سکتی تھی اور سچی بات تو یہ تھی کہ میں نے خود کو حالات کے تیز دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔

اسی وقت پایا آ گیا۔ وہ بے حد خوش تھا۔ اس کی باپچیں کھلی ہوئی تھیں۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی ٹوکری ماسی کے حوالے کی اور دونوں ہاتھوں کو ملتا ہوا میرے قریب آ گیا۔ ”پتر..... تو نے خان کو دیکھا ہے نا..... وہ کیسا ہو گیا ہے؟“

”وہ بڑا گھرو جوان ہے بابا، بڑا نڈر، بڑا بہادر، پہاڑوں جیسا مضبوط مگر دل کا اتنا نرم ہے جیسے برف کا گلا ہو۔“

”ہاں..... ہاں میں جانتا ہوں..... وہ بالکل اپنے باپ جیسا تھا۔ اس کے باپ کی ذات میں بڑا دبذبہ تھا پتر، ہر شخص اسے دیکھ کر دبک جاتا تھا پر جب وہ بولتا تھا تو یوں

”چلو پتر اب سو جاؤ۔ رات بہت بیت چکی ہے۔“ بابا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ نور اور شادو اٹھ کر کوٹھری میں چل گئیں۔ بابا نے حسب سابق اپنا اور میرا پلنگ چھپر کے نیچے ڈال لیا اور ماسی نے موٹے کھیس ہماری پائنٹی کو رکھ دیے۔ آج ٹھنڈک کچھ بڑھ گئی تھی۔ میں کھیس اوڑھ کر لیٹ گیا۔ بابا بھی میرے برابر پڑی چارپائی پر لیٹ گیا۔ نیند میری آنکھوں سے دور تھی۔ میں نے اگلے روز کے پروگرام کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اچانک ایک خیال نے مجھے چونکا دیا۔

”بابا.....!“ میں نے چونک کر اسے مخاطب کیا۔

وہ میری بات سن کر دعائیں دیئے لگا۔ اس رات ہم نے ساتھ ہی کھانا کھایا۔ نور نے خود کو ایڈجسٹ کر لیا تھا۔ وہ بھی خوش تھی اور ان سب کی اپنائیت کو پوری طرح محسوس کر رہی تھی۔ میں نے پہلی بار اسی رات شادو کی آنکھوں میں جھلکاتے تارے دیکھے جن سے رنگین روشنی کی کرنیں سی پھوٹی محسوس ہو رہی تھیں۔ نور نے اس کی خالی کلاسیوں میں جو ٹریاں اور کانوں میں موتیا کے بالے پہنا دیئے تھے۔ بڑے بڑے پھولوں والا جینٹ کا

”ہاں پُتر..... بول‘ میں سن رہا ہوں۔“

”بابا‘ میں صبح یہاں سے شہر روانہ ہونا چاہتا ہوں۔“

”کیا..... یہ بات تُو نے پہلے کیوں نہ کہی؟“

”پہلے کب؟“

”شانی کے سامنے.....“

”نہیں بابا..... میں یہ بات اس کے سامنے نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بات یہ ہے بابا کہ

وہ مجھے کافی دنوں سے جانتی ہے اور مجھ سے کافی مانوس بھی ہے مگر آپ لوگوں سے.....

میرا مطلب ہے کہ آج ہی اسے پتا چلا ہے کہ آپ سب اس کے اپنے ہیں مگر درمیان کے

برسوں کے فاصلوں نے اپنوں کی سی اپنائیت چھین لی تھی بابا..... وہ دھیرے دھیرے ہی

آپ لوگوں کی اور اس ماحول کی عادی ہو گئی۔ مجھے ڈر تھا کہ میرے جانے کی بات سن کر وہ

ڈر جائے گی۔ ممکن ہے وہ میرے ساتھ جانے کی ضد بھی کرے جبکہ میں اسے یہیں چھوڑنا

چاہتا ہوں۔ ایسے خطرناک حالات میں اس کا باہر نکلنا ٹھیک بھی نہیں ہے اور ویسے بھی میں

اسے کہاں کہاں لیے پھروں گا۔“

”نہیں نہیں پُتر..... اسے یہیں رہنا چاہیے..... مگر..... تمہیں یوں

اچانک غائب دیکھ کر وہ پریشان تو ضرور ہو جائے گی نا!“

”ہاں مگر آہستہ آہستہ وہ آپ سب کی عادی ہو جائے گی۔“

”ٹھیک ہے پُتر..... دل تو نہیں چاہتا کہ ابھی تمہیں جانے دوں۔“

”نہیں بابا..... میں آپ کو سب کچھ بتا چکا ہوں۔ میرا لاہور پہنچنا بہت ضروری

ہے ورنہ دشمن میری غیر موجودگی میں اپنا کام کر جائے گا۔“

”یہی سوچ کر تمہیں نہیں روک رہا۔ پُتر‘ جاؤ اللہ بلی ہے۔“ اس نے گہرا سانس

لے کر کہا۔

”بابا مجھے ایک پرانا سالباں چاہیے۔ شلوار قمیض اور واسکٹ‘ ایک موٹی چادر بھی جو

مجھے راستے میں سردی سے بچا سکے۔ میں یہ سب چیزیں بازار سے اس لیے نہیں خریدنا

چاہتا کہ ان کا نیا پن دشمنوں کو چونکنا کر سکتا ہے۔“

”میں سمجھ گیا پُتر‘ تُو فکر نہ کر سو جا۔ میں یہ سب چیزیں تجھے صبح سویرے ہی دے

دوں گا اور تجھے اسٹیشن پر بھی چھوڑ آؤں گا۔ اسٹیشن یہاں سے کافی دور ہے۔“

مجھے نیند تو نہیں آئی مگر کچھ ریٹ ضرور مل گیا۔ میرا ذہن الجھا رہا۔ میں نور کو یہاں

چھوڑ دینے پر خوش بھی تھا اور افسردہ بھی بلکہ مجھے یہ پریشانی تھی کہ میں فاریہ کو بتا چکا تھا

کہ نور میرے ساتھ ہے مگر میں محض اس معمولی وجہ کی بنا پر اسے اپنے ساتھ خطرات

میں نہیں پھنسانا چاہتا تھا۔ یہ ہی بہتر تھا کہ وہ یہاں رہے۔ فاریہ کو میں ویسے بھی کسی وقت

حالات سے آگاہ کر سکتا تھا۔ بس مجھے صرف یہی ڈر تھا کہ اس دوران میں جمال وہاں نہ پہنچ

گیا ہو۔ یوں تو میں یہ بات فاریہ کو بتا چکا تھا اور وہ اس سلسلے میں محتاط بھی ہو گی مگر وہ

بہر حال ایک عورت تھی۔ بیگ صاحب تو پہلے ہی بیمار تھے اور سلطان بہادر ضرور تھا مگر

چالاک نہیں تھا جبکہ جمال اور زید کے سلسلے میں بہادر کے علاوہ چالاک کی بھی ضرورت

تھی۔ میں رات بھر یہی دعائیں مانگتا رہا کہ وہ سب جمال اور زید کے شر سے محفوظ رہیں۔

جانے کیا کیا سوچتا رہا اور رات بے آواز قدموں سے گزرتی رہی۔ احساس ہی نہ ہوا

کہ سے بیٹا جا رہا ہے۔ اتنی لمبی رات لمحوں میں گزر گئی۔ احساس اس وقت ہوا جب

بیزوں پر ہنسی چڑیوں نے دھیرے دھیرے چچھانا شروع کیا اور میری نگاہ آسمان کے سرمئی

کناروں پر ٹھہر گئی۔ چڑیوں کا شور ذرا اور بڑھا تو بابا انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھا۔ اٹھتے ہی اس

نے مجھ پر نگاہ ڈالی اور مجھے جاگتا دیکھ کر مسکرایا۔

”اٹھ گیا پُتر؟“

”سویا ہی کب تھا بابا؟“

”ہیں..... تیرا مطلب ہے کہ تورات سے جاگ رہا ہے!“

”دن اور رات کی تمیز ہی ختم ہو گئی بابا پتا ہی نہیں چلتا کہ کب دن ہوا اور کب

رات ہو گئی۔“ میں نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا اور اٹھ بیٹھا۔

”او نہ پُتر‘ یہ تُو نے اچھا نہیں کیا‘ رات کو سویلنا چاہیے تھا۔ لمبا سفر ہے جانے کیسے

گزرے؟“ وہ اپنی چادر کو جسم پر لپٹے ہوئے بولا۔

”میں جانتا ہوں بابا کہ سفر کیسا گزرے گا اور جب نیند کو آنا ہوتا ہے تو وہ آ ہی جاتی

ہے۔“

وہ بڑبڑاتا ہوا پانی کے پمپ کے پاس جا بیٹھا۔ میں بھی اس کے قریب چلا آیا۔ میں

نے پپ چلایا اور نلکے سے پانی کی دھار نکلنے لگی۔ بابا نے تشکرانہ انداز میں میری طرف دیکھا اور منہ دھونے لگا۔ منہ ہاتھ دھو کر اس نے اپنی چادر کے کونے سے صاف کیا اور پپ چلانے لگا۔ میں نے بھی کھلی کی اور منہ ہاتھ دھو کر اٹھ گیا۔

ہماری باتوں کی اور پپ چلنے کی آواز سے ماسی اٹھ گئی تھی۔ اس نے جلدی جلدی آگ جلائی اور چائے کی پتیلی اس پر چڑھا دی۔ بابا نے اسے بتا دیا کہ میں سفر پر روانہ ہونے لگا ہوں۔ یہ بات سن کر وہ بھی حیران ہو گئی۔ اس نے مجھے ایک دو روز رکنے کو بھی کہا۔ میں نے معذرت کر لی تو وہ شادو اور شانی کو اٹھانے جانے لگی۔ میں نے لپک کر اسے پکڑ لیا اور بابا نے اسے سمجھایا کہ میں نور کے سامنے نہیں جانا چاہتا کیوں کہ ممکن ہے وہ خود بھی چلنے کو تیار ہو جائے۔ بعد ماسی کی سمجھ میں بات آ گئی اور اس نے میرے لیے روغنی روٹیاں ڈالنا شروع کر دیں۔ بابا نے مجھے شلوار، قمیض، واسکٹ اور ایک موٹی چادر کے علاوہ سفید پگڑی بھی دی۔ میں نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا۔ پگڑی باندھ کر تو میری شخصیت بالکل ہی بدل گئی اور میں قطعی مطمئن ہو گیا۔ داڑھی کے بال بھی اچھے خاصے بڑھ گئے تھے جس نے میرے نقوش کو چھپا دیا تھا۔ شخصیت کی اس تبدیلی نے مجھ میں کافی حوصلہ اور خود اعتمادی بھی پیدا کر دی تھی۔ اب میرا خیال تھا کہ میں کسی سے چپے بغیر بھی سفر کر سکتا ہوں۔

کچھ دیر بعد میں ناشتا کر کے تیار ہو گیا ماسی نے سفر کے لیے روغنی روٹی اور رات کی بھاجی باندھ دی تھی۔ تھرمس میرے پاس تھا ہی۔ میں نے اس تھرمس میں گرم گرم چائے بھروالی۔ میں ایک نظر نور کو دیکھنا چاہتا تھا مگر میں نے اپنی اس خواہش کو دبایا اور بابا سے رخصت چاہی۔

”رب راکھا پتر..... خیر ناں جا..... پر پہنچنے کے بعد اپنی خیریت ضرور بھیجنا۔“ یہ کہہ کر بابا نے کانڈ کا ایک پرزہ میری طرف بڑھا دیا۔ اس کانڈ میں گاؤں کا پتا اور مکان کا نمبر لکھا ہے پتر..... چٹھی ضرور بھیجنا ورنہ ہم سب پریشان ہوں گے اور پتر..... خان کو ضرور بتانا کہ ہم سب اس کے منتظر ہیں..... اور..... وہ شادو..... شانی کا سن کر تو وہ فوراً آئے گا نا؟“

”ہاں بابا آپ پریشان نہ ہوں۔ میں خان کو ڈھونڈ کر یہاں ضرور بھیجوں گا.....“

بس آپ دعا کیجئے کہ میں ان درندوں کے ہاتھ نہ لگ جاؤں۔ منزل پر پہنچ گیا تو یہ میرا وعدہ ہے بابا کہ خان کو آپ کے اور شانی کے بارے میں ضرور بتاؤں گا۔“

”اللہ بلی پتر۔ وہ سب کارا کھا ہے۔ سب پر قادر ہے پتر مارنے والے سے بچانے والا زیادہ قریب ہوتا ہے۔“

ماسی کی پلکیں بھی بھیگ چکی تھیں۔ مجھے ان کی بے لوث محبت اور خلوص نے بڑا متاثر کیا تھا۔ میں صرف اس بات پر حیران تھا کہ شہروں کی طرف جانے والے رستے گاؤں کی اس بے لوث محبت کو اپنے ساتھ شہروں تک کیوں نہیں لے جاتے جہاں انسان انسان سے نفرت کر رہا ہے، ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہا ہے، ایک دوسرے کا حق چھین رہا ہے، جہاں نفرتوں کی بیلیں چڑھائی جاتی ہیں۔ عداوتوں کی فصلیں اگائی جاتی ہیں اور سارے موسموں میں صرف اور صرف گناہ کاٹے جاتے ہیں۔ کوئی بھی اس موسم کے بدل جانے کا تمنائی نہیں ہے۔ جہاں اونچا اور بڑا صرف اسے سمجھا جاتا ہے جس کی دیواریں اونچی ہوں، جس کی کوٹھی بڑی ہو جس کی کار لمبی ہو اور بس..... اور گاؤں کے یہ چھوٹے چھوٹے کچے مکانوں میں رہنے والے سیدھے سادے لوگ، جن کے مکانوں کی دیواریں ان کے قدوں سے ذرا سی اونچی ہوتی ہیں وہ اندر سے کتنے بڑے، کتنے اونچے اونچے اور کتنے عظیم ہوتے ہیں۔ یہ بابا اور ماسی کی عظمت اور بڑائی ہی تو تھی کہ اجنبی ہوتے ہوئے بھی ہمیں اپنے چھپرے تلے پناہ دی۔ یہ تو بعد کی بات ہے کہ نور ان کی مچھڑی ہوئی شانی نکلی ورنہ پہلے روز تو وہ اور ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔

”پتر ایک پیالہ چائے اور پیتا جا.....!“ ماسی نے کہا۔

”نہیں ماسی مجھے دیر ہو جائے گی۔ میں سویرے والی گاڑی سے لاہور پہنچنا چاہتا ہوں اور پھر..... اگر نور اٹھ گئی تو.....“

”اونہ اوئے..... چل پتر تو بچ کتا ہے۔“ بابا نے ہاتھ اٹھا کر ماسی کو منع کر دیا اور اپنے گرد چادر لپیٹ کر کھڑا ہو گیا۔

بابا نے اپنی بیل گاڑی نکالی۔ بیلوں کو گاڑی میں جوتا اور مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ماسی دروازے پر کھڑی تھی۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے خدا حافظ کہا اور بابا نے بیل گاڑی آگے بڑھا دی۔

گئی بدن میں۔ میں نے چائے کے پیے ادا کرنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا اور تبھی مجھے احساس ہوا کہ میں ایک بہت بڑی غلطی کر بیٹھا ہوں۔

میرے پاس کافی پیسے تھے۔ مجھے نور کو کچھ نہ کچھ ضرور دینا چاہیے تھا۔ معلوم نہیں بابا وغیرہ کی کیا آمدنی ہے۔ وہ کیسے گزر اوقات کرتے ہیں اور اب میں نور کو بھی ان کے پاس چھوڑے جا رہا تھا۔ مجھے اپنی بے حسی پر غصہ آیا مگر اب بھی وقت تھا۔ میں نے جیب سے رقم نکال کر اس میں سے دو ہزار روپے الگ کیے اور فیض کی اوپر والی جیب میں رکھ لیے۔ اسی وقت کھڑکی کھل گئی۔ وہاں کھڑے چاروں آدمی ٹکٹ لینے لگے۔ بابا مجھے بتا چکا تھا کہ آدھے گھنٹے بعد مجھے لاہور جانے والی ٹرین مل جائے گی۔ یہ غالباً اس نے اسٹیشن پر ہی کسی سے معلوم کیا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر ٹکٹ لیا اور کھانے کا تھیلہ اٹھا کر پتھر کی بیچ پر آ بیٹھا۔ بابا میرے ساتھ ہی تھا۔ وہ خاموش اور اداس اداس سا تھا اور جانے کن سوچوں میں گم تھا۔

میں نے اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ کچھ ہی دیر بعد زمین ہلتی ہوئی محسوس ہوئی اور ساتھ ہی ٹرین کی وسل سنائی دی۔ میں نے آواز کی سمت نگاہ ڈالی۔ دور سے ٹرین آتی نظر آگئی۔

”پتھر..... اپنا خیال رکھنا، خان کو ہماری دعائیں پہنچا دینا پتھر..... اور لوٹ کر ضرور آنا۔ ریل یہاں دیر تک نہیں رکے گی پتھر، تو جلدی سے بیٹھ جانا اور ہاں چھٹی ضرور لکھنا ورنہ شانی بھی بہت پریشان ہو جائے گی۔“

”ہاں بابا..... مجھے احساس ہے..... بابا یہ..... یہ رکھ لو بابا شانی کو ضرورت ہوگی۔“ میں نے جیب سے نوٹ نکال کر اس کی مٹھی میں دبا دیے۔

اس نے مٹھی کھول کر دیکھی۔ ”نہیں پتھر..... نہیں.....“

بابا میں تمہارا بیٹا نہیں ہوں کیا.....؟“

”وہ تو ٹھیک ہے پتھر مگر.....“

”نہیں بابا..... اگر مگر کچھ نہیں۔ اگر بیٹا نہیں سمجھتے تو پھر ٹھیک ہے..... لاؤ واپس کرو۔“

وہ جھجک گیا۔ اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ گاڑی پلیٹ فارم پر رک چکی

گاڑی میں زندگی کے آثار ریگنے لگے تھے۔ تلکے اندھیرے میں لوگ بیلوں کو بانکتے ہوئے کھیتوں کی طرف جا رہے تھے۔ گھروں کی چیمین دھواں اگل رہی تھیں اور کہیں دور سے پن چکی کی گھون گھون گونج رہی تھی۔ میں دل میں خدا کو یاد کرتا ہوا گاؤں کے ان معصوم نظاروں کو اپنی بصارت میں سمیٹ رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ نظارے اس بار مجھ سے بچھڑے تو جانے کب نصیب ہوں۔ آج کے بعد پھر دشمنیوں، نفرتوں اور عداوتوں کی ایسی سرنگ میں موج سفر ہوں گا جہاں صرف غذا بوں کے کثیف دھویں کے سوا کچھ نہ ہو گا۔ بابا بھی خاموش تھا۔ ہم بہت جلد کی سڑک پر پہنچ گئے۔ اب آسمان پر سرخی چھا گئی تھی اور کہیں کہیں گرے سرمئی بادل اڑ رہے تھے۔ ہوا میں خنکی کی وجہ سے سردی میرے رونگٹے کھڑے کر رہی تھی۔ میری ناک بالکل ٹن ہو گئی تو میں نے چادر سے آدھے چہرے کو ڈھانپ لیا۔ بابا مجھے ایسا کرتے دیکھ کر مسکرایا۔

”سری لگ رہی ہے؟“

”ہاں بابا..... عادی نہیں رہا ایسی سردی کا۔“

”بس تھوڑا سا رانستہ اور ہے۔“ اس نے مجھے تسلی دی۔

کچھ ہی دیر بعد مجھے آف وہاٹ کھر کی وہ چھوٹی سی عمارت نظر آگئی جہاں گیٹ کے پاس لکڑی کے اسٹول پر ایک آدمی بیٹھا اونگھ رہا تھا اور اس کے پیچھے وہ کھڑکی بھی نظر آ رہی تھی جہاں تین چار آدمی کھڑے تھے۔ کھڑکی بند تھی۔ میں اور بابا اتر کر اس عمارت کے گیٹ میں داخل ہو گئے۔ میں اور بابا بھی کھڑکی کے پاس ہی کھڑے ہو گئے۔ میں نے اپنی بائیں جانب دیکھا جہاں ریل کی پڑیاں پھیلی ہوئی تھیں اور آسمان پر پھیل جانے والی شفق ان پر منعکس ہو رہی تھی۔

ذرا دیر بعد ایک لڑکا چائے کی بڑی سی کیتلی اور دوسرے ہاتھ میں پیالے لیے ہمارے قریب آگیا۔ ”بابو جی! چائے؟“

”ہاں..... دو پیالے دو۔“ میں نے دونوں ہتھیلیوں کو آپس میں رگڑتے ہوئے کہا۔

اس نے جلدی سے دو پیالوں میں چائے نکال کر میری طرف بڑھا دی۔ میں نے ایک پیالہ بابا کو دیا اور دوسرا خود لے کر کھڑا ہو گیا۔ سردی میں گرم گرم چائے پی کر جان آ

تھی۔ میں نے بابا کو مزید کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا اور خدا حافظ کہہ کر ڈبے میں سوار ہو گیا۔ بابا کھڑکی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

”پتر بالے..... ہم غریب ضرور ہیں پر.....“

”بابا..... میرا دل مت دکھاؤ، تمہاری ان باتوں سے اجنبیت کا احساس ہونے لگا ہے۔ اب تک میں جس اپنائیت کی لذت میں ڈوبا ہوا تھا وہ ختم ہوتی محسوس ہو رہی ہے۔“

”اونٹیں..... تو ڈکھی نہ ہو پتر..... سفر کرتے ہوئے آدمی کو ڈکھی نہیں ہونا چاہیے ورنہ ڈکھوں کا سفر بھی لمبا ہوتا چلا جاتا ہے۔ ٹھیک ہے لے میں نے رکھ لیے۔ اب تو خوش ہو جا پتر!“ اس نے روپے اپنی واسکٹ کی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

عین اسی لمحے گاڑی نے وسل دی اور فوراً ہی ریگنے لگی۔ میں نے ہاتھ ہلایا۔ بابا کا ہاتھ ہلنے لگا اور پھر ہم ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے۔

گویا میری زندگی کا ایک اور انوکھا باب ختم ہو چکا تھا اور شاید کوئی اور نیا اور بالکل انوکھا باب کھلنے والا تھا۔ اب تو میرا جی چاہنے لگا تھا کہ اپنی آنکھیں بند کر لوں پھر جو کچھ میرے ساتھ ہوتا رہے اس کو بس سہتا رہوں خاموش اور اندھا بن کے اس لیے کہ دونوں آنکھیں استعمال کرنے کے باوجود میں ایسے گڑھوں میں گرتا رہا ہوں جن میں صرف اندھے ہی گر سکتے ہیں۔ راہ میں اچانک آ جانے والے یہ گڑھے میرے لئے وبال جان بن گئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے میں اپنی زندگی کا تمام سفر کسی دلدل میں کرتا رہا ہوں۔ یہاں سے نکلنے کی جدوجہد میں میرے اعصاب تک زخمی ہو چکے تھے مگر یہ خوف ناک دلدل ہر بار میری آس بندھا کر مجھے پھر اپنے اندر کھینچنا شروع کر دیتی تھی۔

میں نے ذہن سے خیالات کو جھٹک دیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ آسمان پر تیرنے والے بادل اب شفق رنگ ہو چکے تھے۔ سورج آگ کے گولے کی طرح آسمان سے سر نکال رہا تھا۔ میری دونوں جانب ہرے بھرے کھیت لہلہا رہے تھے اور کھیتوں میں عورتیں اور مرد اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ یہ حسین منظر بس لمحے بھر کو میری آنکھوں میں ٹھنڈک سی اتار کر پیچھے کی طرف بھاگ جاتے اور ایک نیا منظر میرے سامنے ہوتا۔ بالکل میری اپنی زندگی کی طرح۔

ٹرین کی رفتار بہت تیز ہو گئی تھی۔ باہر سے آنے والی ہوا بھی ٹھنڈی تھی۔ میں نے کھڑکی بند کر دی اور تھرمس کے ڈھکنے میں چائے نکال کر چسکیاں لینے لگا۔ اس دوران میں میں نے اپنے چاروں طرف بیٹھے لوگوں کو دیکھا جو تقریباً سبھی او نگھ رہے تھے۔ بعض تو کبل میں لپٹے پڑے خراٹے لے رہے تھے۔ شاید یہ وہ لوگ تھے جو کراچی سے آرہے تھے۔ میں نے فرداً فرداً سب کے چہروں کو بہ غور دیکھا سبھی میرے لیے اجنبی تھے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اسی لمحے میرے برابر بیٹھا آدمی جو او نگھ رہا تھا ٹرین کے جھٹکے سے میرے اوپر آگرا۔

”اوہ..... معاف کرنا پڑا.....“ وہ جلدی سے سیدھا ہو کر بولا۔

”کوئی گل نہیں بادشاہو..... جے میں سنا ہوندا تے فیر میں ڈگ جانا سی۔“ میں نے ٹھٹ پتھابی میں جواب دیا۔

”تسی کیہڑے شہر دے او؟“ وہ اب پوری طرح جاگ چکا تھا۔

”لہور دا..... تسی؟“

”اسی سایو وال دے آں۔“ اس نے فخریہ انداز میں جواب دیا۔

”شہر لہور چلے او؟“

”آہو..... ساڈی ماسی لہور ہے، تسی تے لہور دے اونا اے پتا دیجو“ میں اگے کدی لہور نہیں گیا۔ اس پتے تے میری ماسی کام کر رہی اے۔“

یہ کہہ اس نے جیب سے ایک کانڈ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ اب میں اس کی گفتگو سے الجھ گیا تھا۔ میں کچھ سوچنا چاہتا تھا مگر وہ مسلسل بولے جا رہا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے کانڈ لے کر اس پر سرسری نگاہ ڈالی اور یہ نگاہ ڈالنا ہی میرے اعصاب کو جھنجھنا گیا۔ ایڈریس فار یہ کی کوٹھی کا تھا۔

میں نے چونک کر اس نوجوان کو سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا۔ وہ تمیں پٹیتیں برس کا ہٹا کٹا جوان تھا۔ حلقے سے وہ قطعی آن پڑھ اور آن کلچر ڈکھائی دیتا تھا۔ اس کی نگاہوں میں تجسس کے ساتھ ساتھ معصومیت بھی تھی۔

”کی ہو یا؟“ اس نے اسی معصومیت سے پوچھا۔

”کچھ نہیں..... اے تے کسی وڈی کوٹھی دا پتا اے..... محلہ دی امیراں دا

اے تیری ماسی بہت امیراے؟“
 ”آہو.....“ اس نے فوراً سینہ پھیلا لیا۔ ”او میری ماسی بھی اے تے سس بھی۔“
 ماسی دی دھی میری بیوی اے۔“
 ”کی ناں اے تیری ماسی دا؟“
 ”حمیدہ..... حمیدہ ناں اے میری ماسی دا۔“

اور میں سیٹ کی پشت سے ٹک گیا۔ گہرا سانس لے کر میں نے آنکھیں موند لیں۔
 میرے اعصاب کا تناؤ کم ہو گیا ورنہ تو میں ڈر ہی گیا تھا کہ خدا جانے اب کون سا چکر چلنے والا ہے۔ وہ ماسی حمیدہ کا داماد تھا۔ مجھے یاد آ گیا کہ حمیدہ نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ اس کی ایک بیٹی ہے اور وہ کراچی میں رہتی ہے۔ میرے اعصاب سے خوف کا بھوت اترتا تو میں فریش ہو گیا۔ میں نے فوراً تھرمس میں سے چائے نکال کر اس نوجوان کی طرف بڑھائی۔
 ”پاجی ٹی کچھ آکھیا نہیں!“ اس نے کپ ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھا۔

”کی..... کی نہیں آکھیا؟“
 ”ٹی جانے او اے پتا؟“

”آہو..... میں وی.....“ میں کہتے کہتے رک گیا۔ مجھے خیال آ گیا کہ میں ابھی اس خوف ناک جال سے نکل نہیں سکا ہوں۔ مجھے ہر حال میں محتاط رہنا چاہیے۔
 ”توں فکر نہ کر پتا..... میں تینوں پچا دیاں گا۔“

یہ سن کر وہ بہت خوش ہو گیا۔ اب مجھے اس سے کچھ اپنائیت سی محسوس ہونے لگی تھی۔ میں نے اس کا نام پوچھا۔ اس کا نام رحمت علی تھا اور لوگ اسے رحمتے کہتے تھے۔ میں بھی اسے رحمتے کہنے لگا۔ اسی سے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی یعنی حمیدہ کی بیٹی کے گھر تیسرا بچہ ہونے والا ہے اور رحمتے ماسی حمیدہ کو ساتھ لے جانے کے لیے لاہور جا رہا ہے۔ اس کی ماں معذور ہے۔ اس لیے وہ ان ایام میں ان کے کام نہیں آ سکتی جبکہ اس کے باقی دونوں بچے بھی ابھی چھوٹے ہی ہیں۔ ان بچوں کی دیکھ بھال، معذور ساس کی دیکھ بھال اور پھر ایسی حالت میں اس کی بیوی تنہا کیسے سب کچھ سنبھال سکتی تھی۔ اسی لیے اس نے ماں کو لینے بھیج دیا تھا۔

اس نے تو بڑی سادگی سے اپنے لاہور آنے کی وجہ بتادی مگر میں اس خبر سے پریشان

ہو گیا تھا۔ گھر میں اتنے لوگ تھے۔ ظاہر ہے کہ کام بھی بڑھ گیا ہو گا اور پھر زاریہ کی دیکھ بھال ماسی سے بہتر کوئی دوسرا کر بھی نہیں سکتا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے کام کاج کی فکر سے زیادہ اس بات کی پریشانی تھی کہ ان حالات میں اس کو ٹھنی سے کسی کا بھی جانا بہتر نہ تھا مگر میرا خیال تھا کہ پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ کوئی گھر ہی کا آدمی بک بھی سکتا تھا۔ جس طرح مجھے نوٹوں کی اتنی موٹی گڈی دے دی گئی تھی۔ اسی طرح یہ نوٹوں کی گڈی کسی اور کو بھی دی جاسکتی تھی۔ ضروری نہیں تھا کہ وہ بھی میری طرح فاریہ سے وفاداری نبھائے۔ بہر حال میرے سوچتے رہنے سے تو کوئی فائدہ نہ تھا اس لیے میں نے اس معاملے پر سوچنا چھوڑ دیا اور رحمتے سے دوسری ہلکی پھلکی باتیں کرنے لگا۔
 بارہ بجے کے قریب میں نے اور رحمتے نے کھانا کھایا۔ رحمتے کی بیوی نے جو سالن پکا کر اسے دیا تھا وہ کھا کر ماسی حمیدہ کے ہاتھ کا مزہ آ گیا۔ ہم کھانا کھا کر کچھ دیر کے لیے لیٹ گئے۔ مجھے لیٹتے ہی نیند آ گئی کیوں کہ میں تمام رات کا جاگا ہوا تھا۔ مجھے رحمتے نے جھنجھوڑ کر اٹھایا۔

”کی ہو یا پار؟“ میں لیٹے لیٹے بڑبڑایا۔

”اٹھو پاجی لاہور آ گیا۔“ اس نے سیٹ کے نیچے سے ایک چھوٹا سا بیگ نکالتے ہوئے کہا اور میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ یہ سنتے ہی کہ ہم لاہور پہنچ گئے ہیں میں چونکا ہوا گیا۔ میں نے کھڑکی سے اسٹیشن کی طرف دیکھا۔ اسٹیشن پر ایک بڑا ہجوم تھا۔ قلی تیار کھڑے تھے، جوں ہی ہماری گاڑی کی رفتار کم ہوئی قلی بھاگ بھاگ کر ڈبوں میں سوار ہو گئے۔ میں اب بھی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ میری نگاہیں اسٹیشن پر کسی جانے پہچانے چہرے کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

جانے پہچانے چہروں سے میری مراد ہے کہ وہ لوگ جو میرے پیچھے سائے کی طرح لگے ہوئے تھے یعنی مسٹر زید اور مسٹر جمال کے کرائے کے غنڈے، مجھے کہیں ایسا کوئی چہرہ نظر نہ آیا جس کی وجہ سے میں بے حد خوش ہو گیا۔ رحمتے اپنا بیگ اٹھا کر میرے انتظار میں کھڑا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ اسٹیشن پر اتر گیا۔ ہم دونوں اس گیٹ کی طرف بڑھے جہاں سے دوسرے مسافر باہر جا رہے تھے۔ میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

”ٹکٹ!“ گیٹ پر کھڑے گیٹ کیپر نے کہا تو میں چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو

کراچی سے یہاں تک آیا ہے مگر اس دشمن کی وجہ سے وہ اسٹیشن پر ہی رک گیا ہے۔ یہ بات حمیدہ اپنی مائیکن کو بتا دے گی اور وہ یہاں آکر مجھے لے جائے گی۔“ اتنا سمجھا کر میں نے سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر رمتے کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

سو روپے دیکھ کر رمتے کی آنکھوں میں چمک بھر گئی۔ اس نے زور زور سے سر ہلا کر مجھے تسلی دی کہ وہ سب کچھ اسی طرح کرے گا جیسا میں نے کہا ہے۔

پھر میں نے رمتے کو جانے دیا اور خود روٹی کی گانٹھوں کی آڑ میں بیٹھ گیا۔ اب میں اطمینان سے یہاں سے نکلنے کے بارے میں سوچ سکتا تھا۔ رمتے کو بھیج کر میں کافی مطمئن ہو گیا۔ اب میں رات ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ اسٹیشن پر کافی رش تھا۔ اس لیے مجھے یہ اطمینان تھا کہ کوئی بھی میری طرف متوجہ نہیں ہو گا پھر بھی زیادہ دیر تک یہاں نہیں رک سکتا تھا۔ دوسری بات یہ بھی تھی کہ ضروری نہیں تھا کہ رمتے صحیح پتے پر پہنچ ہی جاتا اور اگر پہنچ بھی جاتا تو کیا ضروری تھا کہ وہ گھٹنے دو گھٹنے میں ہی پہنچ جاتا اور فاریہ گھر پر ہی ہوتی اور پھر فوراً ہی معاملے کو سمجھ کر مجھے ڈھونڈنے بھی نکل جاتی۔ گویا میں فی الحال مشکل میں تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ ٹیلی فون بوتھ بھی اس گیٹ سے باہر ہی تھا۔ ورنہ میں فاریہ کو فون کر کے اپنے پہنچ جانے کی اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ ہی اسے مسئلے کی سنگینی کا بھی احساس دلا دیتا۔

بہر حال فی الوقت میں یہ سب سوچنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے رات ہونے کا انتظار تھا۔ رات کے اندھیرے میں میرے لیے فرار ہونا زیادہ مناسب تھا۔ زیادہ دیر بیٹھے رہنا بھی میرے لیے مشکل تھا۔ ایسی صورت میں ریلوے کے عملے یا ریلوے پولیس کی نگاہوں میں بھی آ سکتا تھا۔ یہی سوچ کر میں اٹھ کھڑا ہوا اور پل کراس کر کے پلیٹ فارم نمبر دس پر چلا گیا۔ وہاں میں نے ایک ٹھیلے پر کھڑے ہو کر مرغ چھولے کھائے۔ گرم گرم پائے پی اور وہیں بیٹچ پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا تھا۔ یہاں مل اس لیے آرام سے لیٹ گیا کہ میری ہی طرح کچھ دوسرے لوگ بھی مختلف بیچنوں پر لیٹے ہوئے تھے۔

”اے باؤ.....!“ اچانک ایک بھاری آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں اچھل کر اٹھ بیٹھا۔ میرے سامنے ایک لمبا ترنگا آدمی کھڑا تھا۔ اس کا حلیہ کسی کاؤ بوائے کا سا تھا۔ میلی

گیا۔ عین اسی لمحے ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے پاس کھڑے شخص پر میری نگاہ پڑی اور میں سن ہو گیا۔ وہ انہی تینوں میں سے ایک تھا اور بڑے اطمینان سے سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ اسے یقیناً میری نگرانی کے لیے یہاں چھوڑا گیا ہو گا مگر اس وقت اس کی نگاہ دوسری جانب تھی اور یہی میرے لیے غنیمت تھا۔ میں جلدی سے رمتے کی آڑ میں ہو گیا۔ اب میرا یہاں سے باہر جانا خطرناک ہو سکتا تھا مگر گیٹ کیپر میری ہی طرف متوجہ تھا۔

میں نے ایک ہاتھ سے رمتے کو پکڑ کر پیچھے کی طرف کھینچا اور ایک کنارے ہو گیا۔ ”دیتا ہوں یار“ نہیں معلوم کہاں گیا ٹکٹ؟“ میں نے گیٹ کیپر سے کہا اور اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا۔

اس نے مشکوک نگاہوں سے میری جانب دیکھا اور پھر دوسرے مسافروں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں فوراً ہی وہاں سے کھسک گیا۔ رمتے کا ہاتھ میں نے مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ وہ بے چارہ میرے اس انداز پر کافی بوکھلایا ہوا تھا مگر منہ سے ایک لفظ بھی نہیں بولا۔ میں اسے لیے پلیٹ فارم نمبر چھ پر پہنچ گیا۔ میں کوئی ایسی جگہ تلاش کر رہا تھا جہاں سے میں اسٹیشن سے باہر نکل سکوں مگر کافی تلاش کے بعد بھی مجھے ایسی کوئی جگہ نظر نہ آئی۔

”کی ہویا باجی؟“ رمتے صبر نہ کر سکا تو بول اٹھا۔

اسی وقت ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے میرے ذہن میں کوندا اور میں رمتے کو لیے ایک ایسے حصے میں پہنچ گیا جہاں روٹی کی بڑی بڑی گانٹھیں رکھی تھیں۔

”رمتے تیرے پاس کاغذ پٹل ہے؟“

”نہ..... کی ہویا توں مینوں دس تے سنی!“

”دیکھو رمتے..... میں نے بھی اسی کوٹھی میں جانا ہے جہاں تیری ماسی حمیدہ کام کرتی ہے۔ تیری ماسی جانتی ہے مجھے..... مگر باہر میرا ایک دشمن کھڑا ہے۔ میں جیسے ہی باہر نکلوں گا وہ مجھے پکڑ لے گا۔ اب تو ہی مجھے بچا سکتا ہے۔“

”مینوں کی کرنا ہے؟“

”تو صرف اتنا کر کہ..... کسی نہ کسی طرح کوٹھی چلا جا، کسی بھی تانگے والے کو ایڈریس دکھائے گا تو وہ تجھے پہنچا دے گا۔ تو جا کر حمیدہ کو بتا دینا کہ اقبال تیرے ساتھ ہی

اور گھٹنوں پر سے گھسی ہوئی جینز، کالی چمڑے کی جیکٹ، سر پر بڑا سا ہیٹ اور جیکٹ کے اندر گردن میں پڑا ہوا سرخ قالین کا مقفر، وہ چہرے سے بڑا سخت ظالم اور سفاک محسوس ہونے کے باوجود نہ معلوم کیوں مجھے اچھا لگا۔ اس کی شخصیت میں کوئی ایسی بات تھی جو مجھے لمحوں میں متاثر کر گئی۔

”اکیلے ہو کیا؟“ اس نے میرے بیٹھ جانے کے بعد میرے برابر بیٹھے ہوئے پوچھا۔
”نہیں تم ساتھ ہو!“ میں نے مختصر جواب دیا۔

وہ بے ساختہ ہنس پڑا پھر غور سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”صورت سے تو سمجھ دار نہیں لگتے۔“

”شاید یہی خدا کی مصلحت ہے!“

وہ پھر ہنسا۔ ”کافی تیز ہو!“

”شکریہ!“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ میں بہ ظاہر مطمئن بیٹھا تھا۔ مگر میرے اندر اتھل پھٹل ہو رہی تھی۔ میں اس کی ڈرامائی ملاقات کے سلسلے میں مشکوک تھا۔ اس کی اس طرح آمد اور تعارف حاصل کرنے کے مقصد سے بھی ناواقف تھا۔ ممکن ہے وہ محض باتیں کرنے کی غرض سے آگیا ہو مگر حالات نے مجھے ہر معاملے پر شک کرنے کی عادت ڈال دی تھی۔ دوسری بات یہ تھی کہ نہ تو اس کی قومیت کا پتا چلتا تھا اور نہ ہی اس کے انداز سے کسی قسم کی غیریت محسوس ہوئی تھی جو بہر حال اچھے کی بات تھی۔
”آپ سے شاید یہ میری پہلی ملاقات ہے!“ میں نے اسے ٹٹولتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔

”مجھے جنگل کہتے ہیں!“ اس نے بڑے اخلاق سے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔

”جنگل.....! بڑا عجیب و غریب اور خوفناک نام ہے۔“ میں نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”اور آپ کی شخصیت سے میل بھی نہیں کھاتا۔ میں تو یہ سمجھا تھا کہ آپ کا نام نام ہو گا یا شاید جیکسن قسم کا کوئی نام ہو مگر.....“

”جس اخلاق سے تم بات کر رہے ہو لگتا ہے مجھے اپنا نام بدلنا ہی پڑے گا۔“ پھر اس نے چاروں طرف دیکھا اور بڑی رازداری سے بولا۔ ”یار ہم بھی تمہاری ہی کنگری کے آدمی ہیں۔ یہ غیریت چھوڑو اور سگریٹ پیو۔ میں تو بیڑی پیتا ہوں یا پائپ..... ویسے

دوستوں کے لیے سگریٹ ضرور رکھتا ہوں۔“ اتنا کہہ کر اس نے جیکٹ کی جیب سے کے ٹو کا پیکٹ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ ”اب کام کی بات کرتے ہیں استاد۔“ اس کا لہجہ اچانک ہی بدل گیا۔
”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ دوست کہ یہ اسٹیشن میرا ہے..... یہاں کا کوئی سوکھا تکا بھی میری مرضی کے بغیر نہیں لے جا سکتا۔“ اس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا..... ہاتھ کا دباؤ دوستانہ نہیں تھا۔

”میں سمجھا نہیں.....!“

”معصوم نہ بنو اور یہ بتاؤ کہ ناواں کتنا ہاتھ لگا؟“

اس کے ایک جملے ہی سے میں ساری بات سمجھ گیا۔ وہ شاید جیب کترا تھا اور مجھے بھی جیب کترا ہی سمجھ رہا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں نے فوراً جھینپنے کی اداکاری کی اور کھیس نکال کر اسے دیکھنے لگا۔

”بولو..... بولو.....!“

”ابھی تک تو کچھ ہاتھ نہیں لگا جنگل..... اب کے ٹرین آئی تو شاید کچھ بن آئے۔“ میں نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

”دیکھو دوست، میں یہاں ہر آدمی سے آدھا وصولتا ہوں تب اسے کام کرنے کی اجازت دیتا ہوں۔ منظور ہے تو.....“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

میں فوراً تیار ہو گیا۔ ”ٹھیک ہے استاد اپن کو تو دو وقت کی روٹی چاہیے بس..... اکیلے ہیں آگے پیچھے کوئی نہیں کہ زیادہ کی ہوس کریں۔“

”شاباش..... یہ ہوئی نہ کام کی بات۔ اپنی زندگی کا بھی یہی اصول ہے کہ کھاؤ اور کھانے دو۔“ وہ خوش ہو گیا۔ ”چل تجھے گلابی چائے پلاتا ہوں۔“

میں اٹھ کر اس کے ساتھ چل دیا۔ ہم سیڑھیاں اتر کر پھر اسی طرف آگئے جہاں بیرونی گیٹ تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے باہر دیکھا۔ وہ شخص اب بھی موجود تھا۔ میرا ذہن یہاں سے باہر نکلنے کی ترکیبیں سوچ رہا تھا۔ رحتے کو گئے تقریباً ڈیڑھ گھنٹا ہو چکا تھا۔ اصولاً تو اسے اب تک گھر پہنچ جانا چاہیے تھا اور اگر وہ گھر پہنچ گیا تھا تو فاریہ کو اب تک

میں آ جانا چاہیے تھا مگر مجھے فاریہ ہی نہیں اور کوئی بھی نظر نہیں آیا۔

جنگل میرے کاندھے پر ہاتھ رکھے جانے کیا کیا بول رہا تھا۔ میں نے اس کی باتوں پر بالکل دھیان نہ دیا تھا۔ اگر وہ میری طرف دیکھ کر ہنستا تھا تو میں بھی ہنس دیتا اور اگر سنجیدہ ہو جاتا تو میں بھی سنجیدگی کا مظاہرہ کرتا یوں جیسے میں اس کی تمام گفتگو سن رہا ہوں مگر میرا ذہن اپنی ہی گتھیوں میں الجھا ہوا تھا۔

ہم چائے کے اسٹال پر پہنچ گئے۔ جنگل نے چائے کا کپ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے ایک بار پھر پلٹ کر زید کے اس آدمی کو دیکھا۔ وہ اب کافی پور نظر آ رہا تھا اور چند قدم آگے بڑھ کر میز ٹیبلوں پر بیٹھ گیا تھا۔

”کیا بات ہے یار..... کیا سوچ رہا ہے؟“ جنگل نے مجھے الجھا ہوا دیکھ کر پوچھا۔

”اور ہاں تیرا نام کیا ہے؟“

”قادر نام ہے، سب مجھے کادا کتے ہیں۔“

”اچھا اچھا... بات کیا ہے؟“

”یار چھڑا ہو گیا تھا میرا کل، سلا پیچھے پڑ گیا۔“

”ابے کون... مجھے بتا..... سالے کے جڑے توڑ کر حلق میں دانت گرا دوں گا۔“

یاروں کا یار ہوں اور سچی بات تو یہ ہے کادے کہ تیرے پہ اپنا دل آ گیا ہے۔ اچھے لوگوں کی بڑی کمی ہے دنیا میں اسی لیے ان کی قدر کرتا ہوں۔ تو مجھے سامنا کرادے اس کا بس پھر تیرا کام ختم....“ وہ ایک دم جوش میں آ گیا۔

یہ بہترین موقع تھا میرے لیے اس کے بعد تو جانے کیا ہوتا اس لیے میں نے فوراً اشارہ کر کے اسے دکھا دیا کہ وہ بیٹھا ہے میرا دشمن۔

”ابے..... تو نے پہلے کیوں نہیں بتایا، تو چائے پی میں ابھی کام دکھا کر واپس آتا ہوں۔“ وہ فوراً بیرونی گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے موقع غنیمت جانا اور چائے کے پیسے دے کر خود بھی اس طرف بڑھ گیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے ہی گیٹ سے باہر آ گیا۔ اس وقت گیٹ کپیر نہیں تھا اور مسٹر زید کے آدمی کی میری جانب پشت تھی۔

میں باہر آتے ہی منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ اب مجھے اس آدمی کے علاوہ جنگل سے بھی

پتا تھا۔ چند ہی لمحوں بعد مجھے پتا چل گیا کہ ہنگامہ شروع ہو گیا ہے۔ ادھر ادھر کھڑے لوگ بھی شور سن کر ان دونوں کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ جنگل نے جاتے ہی اسے گھونوں اور لاتوں پر رکھ لیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ میں جو دم دبا کر وہاں سے بھاگتا تو میں نے سڑک پر آ کے ہی دم لیا۔ میں سیدھا ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

دوسرے ہی لمحے میں ٹیکسی میں بیٹھا فاریہ کی کوٹھی کی طرف جا رہا تھا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور میں یہ سوچ کر محظوظ ہو رہا تھا کہ جب جنگل کو پتا چلے گا کہ میں وہاں سے غائب ہوں تو اپنے بال ہی فوج ڈالے گا اور مسٹر زید کے آدمی کو بھی پٹا کر میں بے حد خوش تھا بلکہ مجھے تو افسوس یہ ہو رہا تھا کہ وہاں قریب کوئی سپاہی نظر نہیں آیا تھا ورنہ میں تو اسے ان دونوں کی طرف بھیج دیتا اور یوں وہ دونوں ہی پکڑے جاتے۔

سرحال اب میں ایک بڑے عذاب سے نکل آیا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ میں وہاں پہنچ کر کسی نئے عذاب میں مبتلا ہو جاؤں۔ اسی خیال کے تحت میں نے ایک میڈیکل اسٹور کے قریب ٹیکسی رکوالی۔

”بھیا کچھ دیر ٹھہرو گے؟“ میں نے ٹیکسی والے سے پوچھا۔

”زیادہ دیر تو نہیں لگے گی؟“ اس نے الٹا سوال کر لیا۔

”نہیں بس ایک ٹیلی فون کرنا ہے۔“

”ٹھیک ہے جی! دیری نہ کرنا بس!“ اس نے جواب دیا۔

میں اتر کر میڈیکل اسٹور پر آ گیا۔ میں نے فاریہ کی کوٹھی کا نمبر ڈائل کیا۔ نمبر ڈائل کرتے ہی میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ کچھ دیر تک دوسری طرف بیل بجتی رہی۔ میری گھبراہٹ میں بھی تیزی سے اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے بیل کو گنا شروع کر دیا۔ ایک..... دو..... تین..... چار..... اور عین اسی لمحے کسی نے ریسیور اٹھالیا۔

”ہلو جی!“ یہ آواز یقیناً ماسی میراں کی تھی۔

”ہیلو ماسی میراں؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔

”ہاں جی! میراں بول رہی ہوں۔ تم کون ہو؟“

”فارسیہ کہاں ہے؟“ میں نے اس کی بات کا جواب دیے بغیر پوچھا۔
”جی وہ تو نہیں ہیں۔“

”کہاں گئی ہیں اور کس کے ساتھ گئی ہیں؟“

”وہ جی معلوم نہیں کہاں گئی ہیں پر بالے کے ساتھ گئی ہیں۔“

”بالے کے ساتھ؟“ میں اچھل پڑا۔ میری کپٹیوں سے پسینا بہنے لگا۔ اس کا مطلب تھا کہ نہ صرف جمال یہاں پہنچ گیا ہے بلکہ اپنے پلان میں کامیاب ہو گیا ہے۔
”بالا کب آیا تھا ماسی؟“

”کل سویرے آگیا تھا..... پر تو کون ہے رے..... اور کیوں پوچھتا ہے اسے؟“

”سنو ماسی فون بند نہیں کرنا.....“ میں نے جلدی سے کہا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ فون بند نہ کر دے۔ ”سلطان ہے گھر پر؟“

”نہ جی وہ بھی نہیں ہے..... کوئی نہیں ہے گھر پر۔“

”اور..... اور سوہنی.....؟“ میں بے اختیار پوچھ بیٹھا مگر شاید نے ماسی نے سنا نہیں۔ وہ اس سے پہلے ہی فون بند کر چکی تھی۔ اس کے لہجے کی بیزاری بتا رہی تھی کہ وہ زیادہ بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہے۔ میں نے گہرا سانس لے کر فون بند کر دیا اور ایسی ٹیکسی میں آ بیٹھا۔

مجھے توقع نہیں تھی کہ مسٹر زید اور جمال اس قدر جرأت مندی کا مظاہر بھی کر سکتے ہیں۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ میں پہنچ چکا ہوتا اور ان کے ہر حربے کو ناکام بنا دیتا۔ یہ تو محض اتفاق تھا کہ ٹرین سے کودنے کی وجہ سے میں اور نور زخمی ہو گئے تھے جس کی وجہ سے ہم مسلسل سفر نہیں کر سکے اور ہمیں مجبوراً اس گاؤں میں رکتا پڑا اور نہ اگر ہم زخمی نہ ہوتے تو دوسرے روز ہی لاہور پہنچ چکے ہوتے۔ مجھے اس بات پر بھی حیرت تھی کہ جب میں فارسیہ کو بتا چکا تھا کہ نور میرے ساتھ ہوگی اور میں اپنے بال براؤن کر چکا ہوں، جمال پہنچا تو میرے گیٹ آپ میں پہنچے گا پھر آخر فارسیہ نے بحیثیت اقبال اسے کس طرح قبول کر لیا۔

بہر حال جو کچھ ہونا تھا وہ تو اب ہو چکا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ میں اب کہاں جاؤں۔ ایک ٹھکانہ اس کوٹھی کے سوا جو تھا وہ تو میں خود ہی ختم کر چکا تھا۔ سلطان کا گھر، سلطان وغیرہ کو

بھی میں وہاں سے کوٹھی بھیج چکا تھا۔

”صاحب جی کہاں جانا ہے..... گلبرگ تو آگیا۔“ ٹیکسی والے نے مجھے چونکا دیا۔

”اوہ..... سوری..... بس یہاں سائیڈ پر روک دو۔“ میں نے جواب دیا اور

جیب سے پیسے نکال کر اسے کرایہ ادا کیا، پھر دروازہ کھول کر نیچے آگیا۔

ٹیکسی آگے بڑھ گئی اور میں سنسان سڑک پر کھڑا رہ گیا۔ میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی پونے تین بجے تھے۔ میں بغیر سوچے سمجھے ایک طرف چل پڑا۔ میرا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ مجھے کسی نہ کسی طرح کوٹھی میں داخل ہونا تھا یا فارسیہ سے کسی بھی طرح بات کرنا تھی۔ میں ایک بات جانتا تھا کہ جمال فارسیہ کو تنہا نہیں چھوڑے گا۔ وہ بھی یہ بات سمجھ رہا ہو گا کہ میں لاہور پہنچتے ہی اس سے رابطے کی کوشش کروں گا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ کوٹھی کے علاوہ باہر یا فیکٹری میں بھی اسے تنہا رہنے دیتا ہو ورنہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں فیکٹری چلا جاتا۔ اب مجھے شدت سے اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ میں نے انسپکٹر تنویر کا نمبر یاد کیوں نہیں رکھا یا اس کا گھر کیوں نہیں دیکھا۔ اگر مجھے نمبر یا گھر یاد ہوتا تو اس سے بہتر کوئی ذریعہ ہی نہ تھا۔

عین اسی لمحے میرے ذہن میں روشنی سی کوند گئی۔ امید کی ایک کرن تھی جو اچانک واضح ہوتی چلی گئی۔ مجھے اچانک وہ شخص یاد آگیا جو فارسیہ کی فیکٹری میں کام کرتا تھا اور جس نے بیگ صاحب کے کالے دھندے کے سلسلے میں فارسیہ کی مدد کی تھی اور وصی صاحب کی تمام فائلیں رکھ لی تھیں۔

نہ معلوم کیا نام تھا اس کا؟ میں بہت دیر یاد کرتا رہا مگر مجھے اس کا نام یاد نہیں آیا۔ گویا امید کی یہ کرن بھی ٹٹمٹما کر بجھ گئی اس لیے کہ میں اس سے صرف فون پر ہی بات کر سکتا تھا اور فون پر نام معلوم ہوئے بغیر بات کرنا ممکن نہ تھا۔ فیکٹری جا کر ملاقات کرنے میں یہ قباحت تھی کہ ممکن ہے وہاں فارسیہ کے ساتھ جمال بھی ہو اور وہ مجھے پہچان لے۔

میں یہ سب سوچتے سوچتے کافی دور نکل آیا تھا۔ یوں ہی بے مقصد سڑک پر میں آخر کب تک پھرتا رہتا؟ اب تو مجھے بھوک بھی لگنے لگی تھی۔ اسٹیشن پر کھائے ہوئے مرغ بٹولے، ہضم ہو چکے تھے۔ ٹینشن کی وجہ سے سر بھی بھاری ہو رہا تھا اور تھکنے نے تقریباً ڈھال کر دیا تھا۔ میں چلتے چلتے اس راؤنڈ ہاؤس پر آگیا تھا جہاں چاروں طرف کافی رونق

تھی ایک طرف مارکیٹ تھی دوسری طرف ہوٹل اور چھوٹے چھوٹے اسٹیک بار بے ہوئے تھے۔ جس کے سامنے سڑک کے کنارے ٹیکسی والے قطار میں کھڑے تھے۔

میں ایک ریسٹورنٹ میں داخل ہو گیا۔ وہاں میں نے ڈٹ کر کھانا کھایا، گرم گرم کافی پی۔ ریسٹورنٹ میں داخل ہونے سے پہلے ہی میں سگریٹ خرید چکا تھا۔ لہذا فارغ ہو کر میں نے ایک سگریٹ سلاگ لیا۔ لمبے لمبے کش لینے لگا اور مسٹر زید کو ہزاروں دعائیں دیتا رہا۔ یہ انہی کی مہربانی تھی کہ میں یہاں بیٹھا تھا ورنہ اگر انہوں نے وہ رقم مجھے نہ دی ہوتی تو شاید میرے پاس چھوٹے کھانے کے بھی پیسے نہ ہوتے۔

اب شام ہو چکی تھی۔ بازار کی رونق بڑھتی جا رہی تھی۔ میں کافی دیر بعد مل ادا کر کے باہر آ گیا اور مارکیٹ میں گھومنے لگا۔ مجھے کسی نہ کسی طرح وقت گزارنا تھا۔ میں رات ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ رات ہونے کے بعد میرا ارادہ کوٹھی کی طرف جانے کا تھا۔ اندھیرے میں تو یہ ممکن تھا کہ میں وہاں چھپ کر آنے والے پر نگاہ رکھتا اور سلطان یا فاریہ کو تنہا کر ساری صورت حال سے آگاہ کرتا مگر دن کے اجالے میں یہ سب ممکن ہی نہ تھا۔ میں چاہتا تو چوکیدار کو بھی اصل بات بتا سکتا تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ میرا حلیہ اس قدر خراب ہو چکا تھا کہ وہ تو شاید قسمیں کھانے پر بھی یقین نہ کرتا اور خاص طور پر اس وقت جبکہ جمال میرے روپ میں کوٹھی میں موجود تھا۔

میں تقریباً دو گھنٹے تک مزگشت کرتا رہا پھر مغرب کے وقت میں نے ٹیکسی لی اور کوٹھی کی طرف بڑھا۔ سردیوں کا موسم تھا اس لیے چھ بجے ہی سے اندھیرا پھیلنے لگتا تھا۔ احتیاطاً میں نے ٹیکسی کرشن نگر کی طرف مڑوا دی۔ شاید قسمت یاوری کرے اور سلطان اسی طرف گیا ہوا کچھ بھی تھا اس کے یار دوست اور محلے دار تو موجود تھے۔ ممکن ہے وہاں آیا ہوا ہو یا آتا ہو۔

ایک آس تھی جو مجھے کشاں کشاں اس طرف لے جا رہی تھی۔ میں سلطان کے گھر کے پاس اتر گیا۔ ٹیکسی میں نے چھوڑ دی اور جھومتا ہوا ان اندھیری اور تنگ سیڑھیوں پر چڑھتا چلا گیا۔

سلطان کے گھر کے دروازے پر نگاہ پڑتے ہی میں خوش ہو گیا۔ کنڈی نیچے جمبول رہی تھی یعنی تالا نہیں تھا۔ میں نے کنڈی پکڑ کر ہلائی مگر کوئی نہ آیا۔ پھر میں نے زور سے

دستک دی۔ چند لمحوں بعد آہٹ ہوئی اور دروازہ کھل گیا۔ یہ وہی لڑکی تھی جو ہمیں پہلے بھی ملی تھی۔ یہ شاید پڑوس میں رہتی تھی۔ جس وقت دروازہ کھولا تھا اس وقت اس کے چہرے پر عجیب سی روشنی تھی جو مجھے دیکھتے ہی بجھ گئی۔

”کیا بات ہے، کون ہو تم؟“

”سلطان ہے؟“

اس نے بڑی افسردگی سے سرفنی میں ہلایا۔ ”نہیں جی! وہ تو نہیں ہے۔“

”کہاں گیا ہے؟“

”معلوم نہیں جی! اس کا ایک دوست آیا تھا جانے اسے کہاں لے گیا..... اس کے ساتھ جا کر تو وہ بالکل ہی بدل گیا۔ سب کو بھول گیا۔“

وہ خواب کے سے عالم میں بولتی چلی گئی۔ اس کے اندر کے سارے جذبے الفاظ میں سے جھانکنے لگے۔ وہ شاید سلطان سے پیار کرتی تھی جیسی تو اس کے چلے جانے پر اس قدر افسردہ تھی۔

”جب سے گیا ہے واپس ہی نہیں آیا کیا؟“

”نہ جی.....“ اس نے جواب دیا پھر اچانک جھجک کے پیچھے ہٹ گئی۔ شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ ایک اجنبی کے سامنے پتا نہیں کیا کیا کہہ گئی ہے۔ ”پر آپ کون ہیں جی!“

”یار ہوں اس کا..... ملنے آیا تھا۔ اچھا میں چلتا ہوں۔“

”سنو.....!“ وہ بے اختیار ہو کر بولی۔

”جی!“

”تم اسے ڈھونڈو گے کیا؟“

”ہاں کوشش تو کروں گا..... کیا کوئی کام ہے؟“

”ہاں جی.....!“ اس نے سر جھکا کر کہا پھر لمحے بھر کو چپ ہو گئی۔ ”وہ ملے تو

کہنا..... میں یاد کرتی ہوں۔“ اتنا کہہ کر اس نے جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔

میں اس کی معصومیت پر مسکرا دیا اور سیڑھیاں اتر کر گلی میں نکل آیا۔ گلی سے مین روڈ تک میں پیدل آیا۔ اب اندھیرے پھیل چکا تھا۔ میں نے پھر ٹیکسی لی اور اسے کوٹھی کا

ایڈریس بتا کر اس میں بیٹھ گیا۔ فی الحال میرے ذہن میں کوئی پلان نہیں تھا۔ میں بالکل خالی الذہن تھا یوں لگتا تھا جیسے میرے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں مفلوج ہو چکی ہیں۔ میں سیدھا سادا آدمی جسے سوچنے سمجھنے کی ضرورت ہی نہ پڑی تھی۔ ایک لگا بندھا دارہ تھا جس میں گھومنے ہی کو زندگی سمجھتا تھا۔ آج سوچوں کی ایک ایسی بھٹی میں سلگ رہا تھا جہاں سے بچ نکلنے کی آس ہی ختم ہو چکی تھی۔ آج نہ معلوم کتنے عرصے بعد میرے دل میں اس خواہش نے جنم لیا کہ کاش میں واپس اپنے گاؤں چلا جاؤں، اس پہلے والی معصوم اور سادہ سی زندگی میں مگر سوچ لینا کتنا آسان ہے! کاش میں عملی طور پر بھی وہی کچھ کر سکتا جو میں سوچ رہا تھا۔

”باؤ جی!“ ٹیکسی والے نے چونکا دیا۔ ”ہن کتھے جانا اے؟“

”ہاں..... بس بس یہاں روک دو“ میں نے جلدی سے کہا۔

اس نے ٹیکسی کنارے پر روک دی۔ میں نے اسے کرایہ ادا کیا اور ٹیکسی سے اتر گیا۔ ٹیکسی کے جانے کے بعد میں نے چاروں طرف دیکھا۔ میں قاریہ کی کوٹھی سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہی جانے پہچانے رستے، وہی رات کی رانی کی مہکتی خوشبو اور وہی گلی کے کونے پر لگی ہلکے نارنجی رنگ کی روشنی جو مجھے بے حد پسند تھی۔

میں کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ میں نے موٹی چادر کو اچھی طرح لپیٹا ہوا تھا۔ سر پر بندھی پگڑی کی وجہ سے میرا سر اور کان سرد ہوا سے محفوظ تھے۔ میں کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اگر میں چوروں کی طرح گھر میں داخل ہونے کی کوشش کرتا تو یہ میرے لیے خطرناک بھی ہو سکتا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ پھر میں بے اختیار آگے بڑھ گیا۔ میں نے سوچا کہ ممکن ہے گیٹ پر مجھے سلطان ہی مل جائے۔ ویسے یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں چوکیدار سے سلطان کے بارے میں پوچھتا اور خود کو اس کا دوست ظاہر کرتا۔ یہ طریقہ مجھے زیادہ بہتر لگا اور میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔

چند ہی لمحوں بعد میں کوٹھی کے گیٹ پر پہنچ گیا۔ گیٹ بند تھا اور سردی کی وجہ سے چوکیدار نے اپنے کمرے کی وہ کھڑکی بند کی ہوئی تھی جو باہر کی جانب کھلتی تھی۔ میں نے اس کھڑکی کے پٹ پر ہلکی سی دستک دی۔ دوسرے لمحے ہی کھڑکی کھل گئی اور چوکیدار کا

چہرہ نظر آیا۔ وہ بڑے غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

”ہاں بولو.....؟“ اس نے غرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”لالہ..... سلطان ہے؟“

”تم کون ہے؟“ اس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں سلطان کا دوست ہوں۔ اس کے گاؤں سے آیا ہوں۔“ میں نے نرم لہجے میں جواب دیا۔ ”اسے بلا دو۔“

اس نے ایک مرتبہ پھر گھور کر دیکھا اور بولا۔ ”ذرا ٹھہرو..... ہم اس کے لیے بولتا ہے۔ نام کیا بولا تم نے؟“

”نام!..... خان..... بولو خان آیا ہے۔“ فی الفور میرے ذہن میں یہی نام آیا اور میرے خیال میں یہ نام ایسا تھا کہ سلطان سنتا تھا تو دوڑا چلا آتا۔

”ہم بلاتا ہے تم ٹھہرو.....“ چوکیدار نے یہ کہہ کر کھڑکی بند کر دی۔

میں منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ سلطان میرا حلیہ دیکھ کر ہلک جائے گا۔ ظاہر ہے مجھ میں اور خان میں زمین آسمان کا فرق تھا اور اس وقت میں جس حلقے میں تھا اس میں تو وہ مجھے بہ حیثیت بالا بھی نہیں پہچان پائے گا۔ بہر حال اس طرح کم از کم میں سلطان سے بات تو کر سکتا تھا ورنہ تو باہر کھڑا رہنا یا محض سوچتے رہنا بیکار ہی تھا۔

چوکیدار کو گئے تقریباً تین چار منٹ گزر چکے تھے۔ میں نے واسٹ کی جیب سے سگریٹ نکال کر سلگا لیا اور اس کے لمبے لمبے کش لینے لگا۔ مزید چند منٹ گزرنے کے بعد ہی چوکیدار کے کمرے کی کھڑکی کھل گئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا وہاں سلطان موجود تھا۔ وہ روشنی میں تھا اور میں چند قدم پیچھے ہو کر کھڑا تھا تاکہ روشنی میرے چہرے پر نہ پڑے اور وہ فوری طور پر مجھے دیکھ کر شک نہ کرے۔ مجھے یہ خدشہ بھی تھا کہ اگر وہ مجھے نہ پہچان پایا تو کوئی خطرناک قدم بھی اٹھا سکتا ہے۔

”خان.....؟“ سلطان کی سرسراتی ہوئی آواز آئی۔

”سلطان..... باہر آ.....“ میں نے فوراً کہا۔

”کک..... کون ہے تو.....؟“ وہ چونک گیا۔ شاید وہ میری آواز سن کر چونک

گیا تھا۔ ”تو خان نہیں ہے.....“ اس نے تیز سرگوشی میں کہا۔

”سلطان..... میری بات سن.....“ میں جلدی سے روشنی میں آگیا۔ میں نے اپنا چہرہ کھڑکی سے قریب کر لیا۔ ”میں بالا ہوں..... وہ جو آیا ہے وہ بالا نہیں ہے، بلکہ جمال ہے..... وہ میرے روپ میں یہاں آیا ہے۔ تو باہر آ سلطان میں تجھے سب کچھ بتا دوں گا۔“

”بات سن ہے..... اگر تو مجھے بے وقوف سمجھ رہا ہے تو..... تو دنیا کا بے وقوف ترین آدمی ہے۔“ اتنا کہہ کر سلطان نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔

”سن سلطان..... اگر تجھے یقین نہیں آتا تو..... تو سن..... میں نے جمال وغیرہ کو یہ بتایا تھا کہ تو فارسیہ کا پرانا ملازم ہے۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ تو میرا بار ہے۔ تو اس سے بات کر کے دیکھ لے۔ تجھے مجھ پر یقین آ جائے گا۔ میں ان کی قید میں تھا۔ سلطان، میں خود نہیں گیا تھا۔ مجھے اغوا کیا گیا تھا۔ اب بھی اگر تجھے یقین نہیں آتا تو..... سارے نقصان کا ذمہ دار تو ہو گا۔ میں..... میں جا رہا ہوں۔ وہاں میں روڈ پر کھڑا رہوں گا۔ جب تجھے یقین آ جائے تو تو میرے پاس آ جانا اور سن یہ بات فارسیہ کو ضرور بتا دے کہ وہ میں نہیں جمال ہے۔ شاید وہ جانتی ہو۔ اسے کہنا کہ بالا باہر کھڑا ہے۔“ میں اتنا کہہ کر پلٹ گیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ سلطان کا ہاتھ جیب میں کیوں گیا ہے۔ شاید اس کی جیب میں پستول تھا۔

”سن.....!“ وہ ایک دم پکار اٹھا۔

میں رک گیا مگر میں نے پلٹ کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔

”ٹھہر جا..... میں ابھی آتا ہوں۔“ وہ بولا۔

میں نے گہرا سانس لے کر آنکھیں موند لیں۔ شاید اسے میری باتوں پر یقین آ گیا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ باہر آگیا۔ اس نے چوکیدار سے گیٹ بند کرنے کو کہا اور میرے قریب آگیا۔

”یہاں سے کہیں اور چل پھر بات کریں گے۔“ اس نے اجنبی لہجے میں کہا اور آگے بڑھ گیا۔ میں جو چند لمحوں پہلے خوش ہو گیا تھا وہ شاید مجھے پہچان گیا ہے پھر مجھ گیا۔ بہر حال یہ کیا کم تھا کہ وہ مجھ سے بات کرنے پر تیار ہو گیا تھا۔

میں اس کے ساتھ چلتا رہا۔ اس نے تمام راستے کوئی بات نہ کی اور اس کا ہاتھ اب

بھی کوٹ کی جیب میں تھا۔ یہ کوٹ اس نے شلوار قمیض کے اوپر پہن رکھا تھا۔ میں نے بھی راستے میں کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا اور خاموشی کے ساتھ چلتا رہا۔ ہم مین روڈ پر پہنچ گئے۔ وہاں سے کچھ دور ایک ہوٹل تھا۔ ہم اس ہوٹل کی طرف بڑھ گئے۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ کہیں سکون سے بیٹھ کر میں اسے تمام کہانی سناؤں۔ ہوٹل پہنچ کر اس نے ایک نمبل کی طرف اشارہ کیا جو بیرونی دروازے سے کافی فاصلے پر تھی اور جس کے قریب کی میزیں خالی پڑی تھیں۔

میں اسی طرف بڑھ گیا۔ سلطان نے ایک کرسی کھینچی اور اس پر بیٹھ گیا۔

”ہوں..... اب بول تیرا کیا مقصد ہے؟“

تب میں نے شروع سے آخر تک ساری کہانی سنادی۔ سلطان بڑی بے تعلقی سے کہانی سنتا رہا۔ اس کا چہرہ ساٹھا جیسے دیکھ کر مجھے خوف آ رہا تھا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اسے میری باتوں پر یقین نہیں آیا ہے۔ مجھے اس کے اس رویے پر حیرت بھی ہو رہی تھی۔ کیوں کہ میں نے اسے وہ تمام باتیں بھی بتا دیں تھیں جو میں نے جمال کو مس گائیڈ کرنے کے لیے بتائی تھیں۔

”سلطان کیا تو نے اس میں ایسی کوئی بات محسوس نہیں کی جو تجھے چونکا دیتی۔ میں نے تو اسے اپنے بارے میں بہت سی غلط باتیں بتائی تھیں۔ تاکہ تجھے اور فارسیہ کو اس پر شک ہو جائے۔ تو تو میرا پرانا یار ہے سلطان تو کیسے دھوکا کھا گیا اور کیا سوہنی بھی.....“

”بات یہ ہے بھیا کہ.....“

”بالا کہہ سلطان بالا..... خدا کی قسم میں بالا ہوں۔“ میں تڑپ اٹھا۔

”تو بالا ہی سہی مگر میں اس طرح یقین نہیں کر سکتا۔ جب تک میں فارسیہ کو سب کچھ نہ بتا دوں۔ جب سے بالا آیا ہے مجھے تو اس سے بات کرنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ میں تو بیگ صاحب کی تیمارداری میں لگا ہوا تھا۔ رہی سوہنی تو..... ظاہر ہے وہ دھوکا نہیں کھا سکتی اور اس نے ابھی تک مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے مجھے یہ اندازہ ہو تاکہ وہ شخص بالا نہیں کوئی اور ہے۔ مس فارسیہ بھی اس کے آنے کے بعد سے بہت خوش ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں تمہارے سلسلے میں کچھ نہیں کر سکوں گا۔“ اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”سلطان..... پلیز..... خدا کے واسطے مجھے پہچان سلطان۔ داڑھی بڑھ جانے سے میں اتنا تو نہیں بدلا کہ پہچانا نہ جاؤں۔ اچھا تو ایسا کر کہ مجھ سے کچھ پوچھ..... کوئی ایسی بات جس سے تیری تسلی ہو سکے۔“

”دیکھو باؤ..... بالا میرا یار تھا اور وہ مجھے بتا کر گیا تھا کہ یہاں طلسمی جال پھیلا ہوا ہے اس نے مجھے کوٹھی اور کوٹھی والوں کا خیال رکھنے کو کہا تھا۔ میں اس سے وعدہ کر چکا ہوں اور کسی کے چکر میں نہیں آؤں گا سمجھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں اس سے ابھی تک بات نہیں کر سکا ہوں مگر وہ گھر آچکا ہے۔ تم جو بھی ہو اور جو بھی چکر چلانے والے ہو یہ سوچ کر کوئی قدم اٹھانا کہ میری اور بالے کی موجودگی میں تم موت کا مزہ چکھ سکتے ہو مگر اس کوٹھی میں قدم نہیں رکھ سکتے۔“

اتنا کہہ کر وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میں اس کے پیچھے لپکا۔ ”اچھا سلطان تو ایسا کر میں بیٹھا ہوں تو اس ملاقات کے بارے میں فاریہ کو بتا دے۔ اس سے کہہ کہ وہ مجھ سے مل لے۔ بس اتنی مہربانی کرنا کہ جمال کو..... میرا مطلب ہے اس شخص کو جو میرے روپ میں وہاں موجود ہے۔ کچھ نہ بتانا مجھے یقین ہے کہ فاریہ ذہین ہے۔ وہ اب تک بہت سی باتیں نوٹ کر چکی ہو گی اور اسے یہ یقین ہو چکا ہو گا کہ وہ بالا نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے جی! میں انہیں بتا دیتا ہوں۔ تم چاہو تو یہاں انتظار کر سکتے ہو۔“ یہ کہہ کر سلطان آگے بڑھ گیا۔ میں وہیں کھڑا اسے جاتا دیکھتا رہا۔ وہ میری آنکھوں سے او جھل ہو گیا تو میں پھر ہوٹل میں چلا آیا اور شیشے کے بیرونی گیٹ کے قریب ہی ایک میز پر بیٹھ گیا۔ میں نے اشارے سے ویٹر کو بلایا اور اسے چائے کا کہہ کر شیشے سے باہر اس سڑک پر دیکھنے لگا جہاں سے سلطان گیا۔

مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ سلطان کافی ٹرینڈ ہو گیا تھا اور مجھ سے کیا ہوا وعدہ نبھا رہا تھا۔ میں نے سلطان کو کوٹھی میں چھوڑ کر کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ وہ بہادر اور ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ وفادار بھی تھا۔ گو اس نے مجھ سے بات کرتے ہوئے پوری احتیاط سے کام لیا تھا مگر پھر بھی نہ معلوم کیا بات تھی کہ سگریٹ جلاتے وقت اس کے ہاتھ کانپ گئے تھے۔ شاید وہ مجھے پہچان گیا تھا مگر فاریہ سے پوچھے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ یہ

اچھا ہی تھا۔ اس واقعے سے سلطان کا امتحان بھی ہو گیا تھا۔ وہ اس امتحان میں پورا اترتا تھا اور مجھے اس کی خوشی تھی۔

اسی وقت ویٹر گرم گرم چائے لے آیا۔ میں نے کپ میں چائے بنائی اور سگریٹ سلگا کر اس کے لمبے لمبے کش لینے لگا۔ مجھے اس لمبے ڈرامے میں ایک نقصان یہ پہنچا تھا کہ میں اب باقاعدہ سگریٹ پینے لگا تھا۔ صبح سے یہ میرا دوسرا پیکٹ تھا۔ میں اس نشے کا عادی تو نہیں ہونا چاہتا تھا مگر حالات نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔ میں نے ایک لمبا کش لے کر چائے کا کپ اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔ اسی وقت فاریہ کی گلی سے ایک کار مین روڈ پر نکلی اور اسی ہوٹل کی طرف بڑھنے لگی۔ کار کی رفتار کم تھی۔ میرا دل دھڑک اٹھا۔ وہ کار سڑک پر لگے پول کے نیچے سے گزری تو میں نے پہچان لیا کہ یہ وہی کار ہے جسے کافی عرصہ میں بھی ڈرائیو کرتا رہا ہوں۔ جس وقت مجھے اغوا کیا گیا تھا اس وقت بھی میں اسی کار پر تھا کہ سڑک پر پڑی عورت کو دیکھ کر رک گیا تھا۔

میں نے جلدی سے چائے کے لمبے لمبے گھونٹ بھر کر کپ خالی کر دیا اور سگریٹ کا آخری کش لے کر سگریٹ کو جوتے سے مسل کر کاؤنٹر کے قریب آگیا۔

میں نے کاؤنٹر پر پیسے ادا کیے اور شیشے کا دروازہ کھول کر باہر چلا آیا۔ کار اب قریب آچکی تھی۔ میں ہوٹل کی دیوار سے لگ کر اس طرح کھڑا ہو گیا کہ مجھ پر روشنی نہ پڑ سکے۔ میں ان حالات میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ جمال نے سلطان اور فاریہ کی گفتگو سن لی ہو اور مجھے دیکھنے یہاں تک چلا آیا ہو۔ اسی خطرے کے پیش نظر میں خود کو چھپا رہا تھا تاکہ اگر ایسا ہو تو میں یہاں سے فرار ہو سکوں۔

کار اس قدر دھیمی آواز میں آگے بڑھ رہی تھی کہ میرا اضطراب بڑھنے لگا۔ مجھے نہ معلوم کیوں ایسا لگنے لگا جیسے کار میں واقعی جمال ہو۔ اگر فاریہ ہوتی تو شاید اتنی کم رفتار میں یہاں تک نہ آتی بلکہ اسے تو اڑ کر یہاں پہنچنا چاہیے تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اسے ضرور پہچان گئی ہو گی۔ یہ خیال آتے ہی میں نے دیوار سے لگے مخالف سمت بڑھنا شروع کر دیا۔ میں مکمل طور پر اندھیرے میں تھا اور یہ میرے حق میں بہتر تھا۔ میں نے اپنی رفتار ذرا تیز کر دی۔ کار اب ہوٹل کے قریب پہنچ چکی تھی مگر کار ہوٹل کے دروازے کے قریب رکنے کی بجائے اس سے کچھ فاصلے پر رک گئی۔ عین اسی وقت میں دیوار کے

کنارے پر پہنچ گیا اور میں نے فوراً پیچھے کی طرف چھلانگ لگا دی۔ اب میں قطعی محفوظ تھا۔ میں نے ذرا سا سر نکال کر کار کی سمت دیکھا۔ میرا خدشہ بالکل ٹھیک تھا۔ وہ جمال تھا اور تما تھا۔ وہ کار سے نکل کر ٹھٹھا ہوا ہوٹل کی سمت بڑھ رہا تھا۔ میرا دل حلق میں دھڑکنے لگا اور میں تیزی سے پلٹ کر ہوٹل کی پچھلی سمت بھاگا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں یہاں سے بھاگ کر اپنی جان بچاؤں مگر یہ احساس بھی شدت سے ہونے لگا کہ میری آمد کا سن کر جمال کچھ بھی کر سکتا ہے۔ گویا اب فاریہ وغیرہ کی طرف سے خطرہ بڑھ گیا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے اپنی رفتار کم کر لی اور ہوٹل کی پچھلی سڑک سے ہوتا ہوا پھر اسی مین روڈ پر نکل آیا مگر اب میرے اور ہوٹل کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ میں نے دیکھا کار اب بھی وہیں کھڑی تھی۔

اس وقت ایک خیال میرے ذہن میں بجلی کی طرح کوندا اور اس خیال کے آتے ہی فاریہ کی کوشی کی طرف بھاگ پڑا مگر اس مرتبہ میں نے کوشی کی پچھلی سمت جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں کچھ ہی دیر میں کوشی کے پچھواڑے پہنچ گیا۔ میں جانتا تھا کہ یعقوب کا کرا کہاں ہے اور یعقوب کے کمرے سے کچھ فاصلے پر دیوار کے ساتھ ہی بجری کا ڈھیر بھی تھا۔ میں نے اندھیرے میں ہی اندازہ لگایا اور گندے پانی کے پائپ کے ذریعے دیوار پر چڑھتا چلا گیا۔ تھوڑی سی محنت کے بعد ہی میں دیوار کے اس پار تھا۔ میرے چھلانگ لگانے سے کافی آواز ہوئی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ یعقوب اگر اپنے کمرے میں ہوا تو یہ آواز ضرور سن چکا ہو گا اسی لیے میں فوراً ہی اس کے کمرے کی دیوار کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ کافی دیر گزر جانے کے باوجود اس کے کمرے کا دروازہ کھلا تو میں سمجھ گیا کہ یا تو وہ کچن میں ہے اور یا پھر وہ اس کوشی میں آیا ہی نہیں مگر مجھے یاد تھا کہ سلطان نے مجھے فون پر بتایا تھا کہ فاریہ یعقوب کو واپس لے آئی ہے۔

دور برآمدے میں روشن بلب کی روشنی راہداری میں اجالا کیے ہوئے تھی۔ چند قدم دور وہ کمرے تھے جن میں ہم یعنی میں، خان اور ہمارے دوسرے ساتھی پہلی بار آکر ٹھہرے تھے اور جن میں سے ایک کرا میرا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میرا کرا لاک ہو گا کیوں کہ میرے کمرے میں اندھیرا تھا۔ البتہ میرے کمرے کے برابر والا کرا روشن تھا۔ یہ غالباً سلطان کا کرا تھا۔ میں نے اس کمرے میں جانے کی کوشش نہیں کی البتہ یعقوب کے

کمرے میں جانے کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ زیادہ محفوظ جگہ تھی۔ ویسے بھی یعقوب کو سب کچھ بتا کر میں اسے اپنے اعتماد میں لے سکتا تھا۔

یہ سوچ کر میں آگے بڑھا۔ میں نے یعقوب کے کمرے کے دروازہ پر دباؤ ڈالا تو وہ کھٹکا چلا گیا گو کمرے میں اندھیرا تھا مگر کھڑکیوں سے باہر کی روشنی چھن کر اندر آرہی تھی اور یہ روشنی میرے لیے کافی تھی۔ میں الماری کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ اب مجھے یعقوب کا انتظار تھا۔ کمرے کی حالت سے پتا چلتا تھا کہ یعقوب یہیں ہے۔ ورنہ یہ کرا بھی بند ہوتا۔ میں دل میں دعائیں مانگنے لگا کہ یعقوب جلدی سے آجائے۔

دعا مانگتے ہی میری دعا قبول ہو گئی تھی کیوں کہ عین اسی لمحے مجھے باہر آہٹ محسوس ہوئی میں سمٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ذرا دیر بعد کسی نے دروازہ کھولا اور ایک دم کمرے میں روشنی ہو گئی۔ میں الماری کی آڑ میں تھا اس لیے اس کی نگاہ مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ اسے تو گمان بھی نہ ہو گا کہ میں یہاں ہو سکتا ہوں۔ وہ شاید تھکا ہوا تھا۔ آتے ہی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اب اس کی پشت میری جانب تھی۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر لپک کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تاکہ مجھے اچانک اپنے سامنے پا کر وہ چیخ نہ پڑے۔ ظاہر ہے کہ وہ مجھے اس لحظے میں تو پہچان ہی نہیں سکتا تھا۔

ایک دم منہ بند کرنے کی وجہ سے وہ تڑپ اٹھا۔ اس سے پہلے کہ وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کرتا میں نے اس کے کان کے پاس سرگوشی کی۔ ”یعقوب“ میں بالا ہوں۔ بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچا ہوں۔ تم اگر کچھ دیر میری بات سن لو تو تم مجھے پہچان لو گے۔ وہ شخص جو میرے روپ میں آیا ہے وہ بالا نہیں بلکہ جمال ہے..... بہادر کی بہن کا سسرالی رشتے دار۔ وہی جس نے سیمائ کی ماں کو قتل کیا تھا۔ اس نے مجھ سے مشابہت کی وجہ سے یہ قدم اٹھایا ہے۔ پلیز یعقوب میری پوری کہانی سن لینا پھر کوئی قدم اٹھانا۔“

میری بات سن لینے کے بعد اس نے سر ہلایا تو میں نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا اور جلدی سے آگے بڑھ کر دروازے میں کھڑی لگا دی۔ یعقوب حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں اسٹول گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا اور پھر اسے شروع سے لے کر آخر تک ساری کہانی سناتا پڑی۔

میں نے اسے بتایا کہ میں نے جمال کو اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا مگر جب

ہے۔ البتہ شیو کر لیتا ہوں۔“

”ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔ بہر حال میں جاتا ہوں اگر دیر ہو جائے تو پریشان نہ ہونا، میں سب کام نمٹا کر ہی آؤں گا۔ ویسے کھانا تو میں پکا چکا ہوں۔ حمیدہ بی بی سے کہہ دوں گا باقی کام سنبھال لیں گی۔“

”ارے ہاں..... وہ رحمتے نام کا آدمی آیا ہے یہاں۔“

”ہاں..... تم کیسے جانتے ہو؟“

تب میں نے اسے بتایا کہ اس سے میری ملاقات کیسے ہوئی تھی اور یہ بھی بتایا کہ میں نے اس کے ہاتھ فاریہ کو مسیح بھی بھیجا تھا۔

”پتا نہیں اس نے مسیح پہنچایا یا نہیں۔ میں نے تو ایسی کوئی بات محسوس نہیں کی جس سے اندازہ ہوتا کہ فاریہ کو اس نے کچھ بتایا ہے۔ ویسے کافی بے وقوف آدمی لگتا ہے۔“

”ٹھیک ہے تم جاؤ اور سنو اگر جمال موجود ہو تو احتیاط کرنا۔“

اس نے سر ہلایا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اندر سے کنڈی لگا دی۔ میرے اعصاب کا تناؤ ایک دم ختم ہو گیا تھا اور یکایک میرے بدن کا جوڑ جوڑ دکھنے لگا تھا۔ میں بے سندھ ہو کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ میں نے کمرے کی لائٹ بھی یعقوب کے جاتے ہی بند کر دی تھی البتہ ہاتھ روم کی لائٹ جلا کر دروازے کو کچھ کھلا چھوڑ دیا تھا تاکہ اس کی روشنی اندر آتی رہے۔

میں کچھ دیر تک یونہی لیٹا رہا۔ پھر میں نے اٹھ کر شیو بنایا، شیو بنا کر میں پھر لیٹ گیا۔ یعقوب کو گئے تقریباً آدھا گھنٹہ ہو چکا تھا۔ میرا دل گھبرانے لگا۔ اسے اتنی دیر کیوں ہو گئی۔ یہی خیال مجھے پریشان کر رہا تھا۔ ذہن میں برے برے خیالات آرہے تھے، میرا دل چاہا کہ خود باہر نکل کر دیکھوں مگر یہ بھی خطرناک تھا۔ میں بے چین ہو کر اٹھ بیٹھا۔

اسی وقت قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں لپک کر دروازے کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ میں نے دھیرے سے کنڈی کھول دی اور دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحوں بعد آہٹگی سے دروازہ کھل گیا۔ وہ یعقوب تھا۔ اس نے سرگوشی میں میرا نام لیا۔ اس کے ہاتھ میں کھانے کی ٹرے تھی۔ میں نے جلدی سے کنڈی لگا کر لائٹ آن کر دی۔

”اتنی دیر کیوں کر دی تم نے؟“

جمال وغیرہ نے میرا فون سنا اور سلطان کی زبانی پتہ چلا کہ فاریہ یعقوب کو لے آئی ہے تو انہوں نے پوچھا کہ یعقوب کون ہے اور کہاں گیا ہوا تھا۔ تب میں نے ان سے کہا کہ وہ بیگ صاحب سے ناراض ہو کر اپنی بیٹی کے گھر چلا گیا تھا اور فاریہ اسے منا کر لے آئی ہے۔ میری یہ بات سن کر یعقوب کی آنکھوں میں روشنی پھیل گئی۔

”اوہ..... بالے..... اب مجھے یقین آ گیا کہ تم ہی بالے ہو۔ جب مجھ سے اس شخص نے پوچھا تھا کہ تمہاری بیٹی کیسی ہے تو میں حیران ہو گیا تھا مگر اس سے پہلے کہ میں اسے جواباً کچھ کہتا، فاریہ بی بی نے مجھے آواز دے لی تھی۔ اس کے بعد مجھے اس سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔“

یہ دیکھ کر کہ یعقوب مجھے پہچان گیا ہے میری جان میں جان آ گئی۔ ”یعقوب! یہ شخص جان گیا ہے کہ میں یہاں پہنچ گیا ہوں۔ مجھے سلطان سے اس بے وقوفی کی امید نہیں تھی کہ وہ میرے منع کرنے کے باوجود اسے میرے بارے میں بتائے گا۔“

”نہیں بالے..... سلطان نے اس سے تو کوئی بات نہیں کی تھی البتہ میں نے سلطان کو فاریہ بی بی سے چپکے چپکے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ ممکن ہے جمال نے اس کی بات سن لی ہو۔“

”ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے تم جا کر دیکھو کہ وہ واپس آ گیا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں آیا تو..... تو فاریہ کو میرے بارے میں بتا دو ورنہ وہ مزید پریشان ہو جائے گی اور سنو..... کیا وہ میرے ہی کمرے میں ٹھہرا ہے؟“

”ہاں..... وہ بالکل تمہاری ہی طرح رہ رہا ہے۔ تمہارے کمرے میں، ویسے وہ کل ہی تو آیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابھی وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا ہو گا۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔ تم جاؤ یعقوب اور واپسی پر کھانے کے لیے کچھ لے آنا بہت بھوک لگی ہوئی ہے۔ نہ معلوم پریشانی میں میری بھوک کیوں بڑھ جاتی ہے۔“

وہ مسکرایا۔ ”ہاں تم مولے ہو گئے ہو، اور تمہارا حلیہ دیکھ کر تو کوئی تمہیں پہچان بھی نہیں سکتا۔ میں جاتا ہوں تم اتنی دیر میں نہا کر شیو بنا لو ورنہ واقعی فاریہ بی بی بھی تمہیں پہچانیں گی۔“

”تمہاری غیر موجودگی میں نہانا ٹھیک نہیں ہے۔ پانی گرنے کی آواز خطرناک ہو سکتی

بھی ہو سکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے بالے، تم کھانا کھا لو پھر میں برتن لے کر جاتا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”بس لے جاؤ۔“ میں نے فوراً ہی ہاتھ کھینچ لیا۔

یعقوب نے رُے اٹھائی اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ میں نے پھر لائٹ آف کر کے دروازہ بند کر لیا۔ میں بالکل چوکنا تھا اور دروازے کی آڑ میں کھڑا ہو گیا تھا کہ مبادا جمال کو کسی قسم کا شک ہو جائے اور وہ یہاں تک پہنچ جائے۔

تقریباً بیس منٹ کے بعد ہی یعقوب واپس آ گیا۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی میں نے پھر لائٹ جلادی۔ اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔

”کیا ہوا؟“

”سلطان کو بتا دیا۔ اسے یقین ہے کہ تم ہی بالے ہو اور فارسیہ کو بھی معلوم ہے مگر جمال ان دونوں کی باتیں سن چکا ہے اور اسے شک ہو گیا ہے کہ وہ باتیں تمہارے ہی بارے میں تھیں لیکن شاید اسے یقین نہیں ہے، کیوں کہ سلطان کہتا ہے کہ اس نے بہت احتیاط کی تھی۔“

”اب..... جمال کہاں ہے اور سلطان؟“

”جمال اب بھی ڈائیننگ روم میں ہے۔ وہ لوگ چائے پی رہے ہیں۔ فارسیہ اور زاریہ اس کے ساتھ ہیں۔ سلطان آدھے ایک گھنٹے بعد یہاں آئے گا۔“

یہ سن کر مجھے اطمینان ہو گیا۔ اب سلطان بھی چوکنا ہو گیا ہو گا اور فارسیہ بھی۔ ممکن ہے فارسیہ اپنے طور پر کوئی قدم اٹھائے۔ بہر حال اب حالات میرے قابو میں تھے اور میں کافی مطمئن تھا۔

یعقوب بھی اب اتنا نہیں گھبرا رہا تھا جتنا کہ پہلے گھبرایا ہوا تھا۔ یعقوب اپنے ساتھ چائے کا تھرمس بھی لایا تھا۔ وہ کیوں کہ چائے کا بہت عادی تھا اس لیے رات کو تھرمس میں چائے رکھا کرتا تھا۔ مجھے بھی چائے کی طلب محسوس ہو رہی۔ یعقوب نے مجھے چائے دی۔ میں چائے پیتا رہا اور آئندہ کے بارے میں لائحہ عمل طے کرتا رہا۔ یعقوب بھی کچھ سوچ رہا تھا۔

”وہ جمال واپس آ گیا ہے۔ وہ فارسیہ بی بی کے ساتھ بیٹھا تھا بالے..... فارسیہ بی بی بہت پریشان لگ رہی تھیں اور..... اور بالے میں نے اس کی آنکھوں میں بڑی وحشیانہ چمک دیکھی ہے۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے بالے..... کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔“ یعقوب کافی گھبرایا ہوا تھا۔

”نہیں یعقوب..... اب میں آ گیا ہوں۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔“ میں نے پُر عزم لہجے میں جواب دیا۔

”اچھا تم کھانا تو کھا لو۔“ اس نے رُے میرے سامنے رکھ دی۔

میں اور یعقوب کھانا کھانے لگے۔ اس دوران میں میرا ذہن مسلسل تیزی سے سوچ رہا تھا۔ یہ بڑی گڑبڑ ہو گئی تھی کہ اسے میری آمد کا علم ہو گیا تھا۔ یعقوب کی گھبراہٹ ٹھیک ہی تھی۔ ایسے حالات میں وہ کوئی بھی قدم اٹھا سکتا تھا۔

”سنو..... تمہارے پاس کوئی ہتھیار ہے؟“ میں نے اچانک پوچھا۔

”نہیں۔“ پہلے میرے پاس پستول تھی مگر فارسیہ بی بی کے آدمیوں نے وہ پستول لے لی تھی۔“

”ٹھیک ہے تم ایسا کرو کہ کسی نہ کسی طرح سلطان سے بات کرو۔ اسے یقین دلاؤ کہ میں ہی بالا ہوں۔“

”میرا خیال ہے کہ اب اسے یقین آ گیا ہو گا۔ ظاہر ہے کہ جب اس نے فارسیہ بی بی سے بات کی ہو گی تو فارسیہ بی بی نے اسے بتایا ہو گا کہ.....“

”خدا کرے ایسا ہی ہوا ہو، تم اسے یہاں تک لے آؤ۔“

”میں کوشش کرتا ہوں۔ اس وقت تو وہ لوگ کھانا کھا رہے ہیں۔ سلطان بیگ صاحب کے ساتھ ہے۔“

”کیا بیگ صاحب ان لوگوں کے ساتھ کھانا نہیں کھا رہے؟“

”نہیں وہ اپنے کمرے میں ہیں۔ وہ کافی بیمار ہیں بالے۔“

”تو پھر تو آسان ہے..... تم بیگ صاحب کے کمرے میں جا کر انہیں بھی بتا دو کہ.....“ میں ایک دم چیپ ہو گیا۔ ”نہیں انہیں ابھی کچھ نہ بتاؤ۔ وہ پریشان ہو جائیں گے۔ تم سلطان کو وہاں سے بلا کر بتا دو۔ ایسا کرنا بہت ضروری ہے یعقوب، ورنہ آج کچھ

میں نہیں جانتا تھا کہ اب فارسیہ کیا قدم اٹھائے مگر میری خواہش تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح انکسٹر قدیر کو اطلاع کر دے۔ وہ پھر بھی حالات کو سنبھال سکتا تھا۔ آدھا گھنٹا معلوم نہیں کس طرح گزرا۔ آدھے گھنٹے بعد باہر قدموں کی آہٹ سن کر میں ہاتھ روم میں گھس گیا۔ یہ میں نے احتیاطاً کیا تھا ورنہ مجھے یقین تھا کہ وہ سلطان ہی ہو گا۔

یعقوب پلنگ پر لیٹ گیا۔ چند لمحوں بعد دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ یعقوب نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ وہ سلطان ہی تھا۔ یعقوب کے دروازہ کھولتے ہی وہ جلدی سے اندر آ گیا۔ یعقوب نے فوراً کنڈی لگا دی۔ میں ہاتھ روم سے باہر نکل آیا۔ مجھے دیکھتے ہی سلطان مجھ سے لپٹ گیا۔

”بالے..... میرے یار..... کہاں چلا گیا تھا تو.....؟“

”ساری کہانی تو میں تجھے سنا چکا ہوں۔ تو نے اس وقت میرا یقین کیوں نہ کیا

سلطان؟“

”بس یار، میں چاہتا تھا یقین کر لوں مگر..... پتا نہیں دل ڈرتا تھا۔ سوچا میں تو آن پڑھ ہوں، جاہل ہوں، اتنی عقل نہیں میرے اندر، کوئی غلطی نہ کر بیٹھوں اس لیے فارسیہ بی بی سے پوچھ لوں اور پھر بالے..... وہ شخص تو کوئی جادوگر لگتا ہے۔ اس میں اور تجھ میں ذرا بھی فرق نہیں، بالکل تیرے جیسا ہے وہ۔ یہ تو مجھے کس جادو کی حویلی میں لے آیا ہے بالے!“

”دش..... آہستہ بول!“ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر آہستہ سے کہا۔

پھر ہم تینوں کافی دیر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ سلطان نے مجھے بتایا کہ فارسیہ کو بھی اس پر شک تھا اور جب سلطان نے میرے بارے میں بتایا تو اس نے کہا تھا۔ ”سلطان وہ سچ کہتا ہے۔“ مگر اس سے پہلے کہ سلطان اور فارسیہ مجھے دیکھنے نکلتے۔ جمال گاڑی اشارت کر کے گیٹ کی طرف بڑھ چکا تھا۔ بعد میں حمیدہ نے بتایا کہ وہ دونوں کو چپکے چپکے باتیں کرتے دیکھ چکا ہے۔ حمیدہ بھی اپنے داماد سے میرے بارے میں سن کر فارسیہ کو بتا چکی تھی۔ سلطان نے بتایا کہ فارسیہ اسی وقت سے پریشان تھی مگر غالباً وہ جلد بازی میں ایسا کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتی تھی جو پریشانی کا باعث بنتا۔

”سلطان..... فارسیہ سے کہو کہ وہ انکسٹر قدیر کو بتا دے۔“ میں نے کہا۔ ”مگر وہ ایک لمحہ بھی اسے تنہا نہیں چھوڑ رہا ہے۔ کل ہی تو وہ آیا ہے۔ کل تو فارسیہ کو گمان بھی نہ تھا کہ وہ تم نہیں ہو۔ نہ معلوم اس نے کیا کہانی اسے سنائی تھی کہ وہ بہت خوش تھی مگر رحمتے کے آنے کے بعد سے میں اسے پریشان سا محسوس کر رہا تھا۔ اس نے فیکٹری جانا چاہا تو جمال بھی کھڑا ہو گیا تھا کہ وہ بھی چلے گا۔ فارسیہ چاہتی تو اسے روک سکتی تھی مگر شاید خوف کی وجہ سے وہ خاموش ہو گئی۔ پھر وہ فیکٹری چلی گئی۔ جمال اس کے ساتھ ہی تھا مگر ایک گھنٹے کے بعد وہ واپس آ گئی۔ جیسی سے جمال اسے جو تک کی مانند چمنا ہوا ہے۔“

”ہاں..... وہ بہت چالاک ہے سلطان، میرے فرار کے بعد بھی اس کا یہاں پہنچ جانا اس کی جرأت مندی اور خطرناک ارادوں کا مظہر ہے۔ وہ تو پہلے روز ہی سے چوکننا ہو گا۔“

”بالے..... سن اگر کسی طرح اسے بے ہوش کر دیا جائے تو.....!“ سلطان اچانک بول اٹھا۔

”میرا خیال ہے کہ ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ تمہارے پاس پستول ہے؟“

”ہاں..... اور وہ اس وقت ڈرائنگ روم میں ہے۔ سن بالے..... میں کسی ہمارے اندر جاتا ہوں اور اسے پستول کی زد پر لے لیتا ہوں۔ تم دونوں بھی وہیں قریب رہنا اور پستول کی زد پر آتے ہی تم دونوں بھی اندر آ جانا۔“

میں نے یعقوب کی طرف دیکھا۔ وہ میری ہی سمت دیکھ رہا تھا۔ ”جیسا کہو“ میں تو فارسیہ بی بی پر اپنی جان قربان کر کے اس شک کو ختم کرنا چاہتا ہوں جو انہیں مجھ پر ہو گیا تھا اور بہ قول تمہارے وہ سب کچھ انہی حرامزادوں کی وجہ سے ہوا تھا۔ وہ عورت انہی کی بھیجی ہوئی تھی۔“ یعقوب نے پرجوش انداز میں کہا۔

میں اس سہنس سے تنگ آ چکا تھا اس لیے ہمت کر کے کھڑا ہو گیا۔ ہم تینوں باری باری کمرے سے باہر آ گئے۔ سب سے آگے سلطان تھا اس کے پیچھے یعقوب اور آخر میں میں۔ برآمدے میں پہنچتے ہی سلطان ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ میں اور یعقوب وہیں

دیکے رہے۔ پھر یعقوب آگے بڑھا اور بچن میں چلا گیا۔ وہاں سے اس نے دودھ کا گلاس لیا اور تیزی سے ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی مجھے فاربیہ کی چیخ سنائی دی اور میں چھلانگ لگا کر ڈرائنگ روم کی طرف بھاگا۔

اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ یعقوب اور سلطان اسے جکڑے کھڑے ہیں۔ فاربیہ مجھے دیکھتے ہی میری طرف لپکی۔ ”اقبال..... پکڑ لو اسے“۔ وہ چیخی۔ اسی وقت نہ معلوم کیسے جمال نے یعقوب کے پیٹ میں لات مار دی اور یعقوب جھٹکے سے پیچھے کی طرف گرا۔

”خبردار اگر کوئی حرکت کی تو گولی چلا دوں گا۔“ سلطان نے گرج کر کہا۔ اس نے پستول اس کی گردن پر رکھ دیا تھا اور یہی اس کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ اسے چند قدم دور ہٹ جانا چاہیے تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے اس کی غلطی کا احساس دلاتا۔ جمال نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ گھوم کر اپنا دایاں بازو چلایا اور پستول سلطان کے ہاتھ سے دور جاگرا۔ میں نے اس کے اوپر چھلانگ لگائی مگر وہ مچھلی کی طرح پھسل کر میری دسترس سے دور ہو گیا۔

مگر یعقوب نے اس سے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کیا اور اس سے پہلے کہ وہ شہلٹا پست طرف جا کر اسے بری طرح جکڑ لیا۔ فاربیہ اس سچویشن سے بری طرح گھبرا گئی تھی۔ وہ چیختی ہوئی باہر بھاگی۔ اس کی چیخ سن کر چوکیدار اپنی رانفل سیدھی کر کے ڈرائنگ روم میں گھستا چلا آیا۔ اس نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی مجھے نشانے پر لے لیا۔ اس کے نزدیک تو میں ہی اجنبی تھا۔

”خان..... یہ اقبال ہے۔“ سلطان اس کا مقصد سمجھتے ہی چیخا اور اسے پکڑ لیا۔

”مگر..... یہ تو.....“

”سنو خان یہ اقبال صاحب ہے اور یہ بہروپیا ہے جو اقبال کے روپ میں ہے اقبال نہیں ہے۔“ فاربیہ نے کہا تو وہ حیرانگی سے پلکیں جھپکانے لگا۔ شاید بات اس کی سمجھ میں ابھی تک نہیں آئی تھی مگر اس نے اپنی مالکن کے کہنے پر مجھے ضرور بخش دیا تھا۔

اتنی دیر میں سلطان اور یعقوب جمال کو پوری طرح گرفت میں لے چکے تھے۔ میں نے چوکیدار سے رسی لانے کو کہا تو وہ فاربیہ کی طرف دیکھنے لگا یوں جیسے اس سے اجازت

طلب کر رہا ہو۔

فاربیہ نے سر ہلایا تو وہ تیزی سے باہر کی طرف چلا گیا۔ چند لمحوں بعد ہی وہ رسی لیے اندر داخل ہوا۔ اس دوران میں میں بھی جمال کو جکڑ چکا تھا۔ رسی کے آتے ہی میں نے اس کے ہاتھ اور پاؤں کس کے باندھ دیے۔ فاربیہ کو جیسے ہی اس کی طرف سے اطمینان ہوا وہ فون کی طرف لپکی اور میرے اندازے کے مطابق ہی وہ چند لمحوں بعد انسپکٹر قدیر سے بات کر رہی تھی۔

”مس فاربیہ، تم لوگ بہت پچھتاؤ گے۔ اب بھی وقت ہے مجھے آزاد کر دو ورنہ انجام کی تمام تر ذمے داری تم لوگوں پر ہو گی۔“ فاربیہ کے ریسپور رکھتے ہی جمال بول اٹھا۔ ”اگر مجھے کبھی بھی انجام سے خوف محسوس ہوتا مسٹر جمال تو میں تم جیسے کتوں سے نکل لینے کی ہمت نہ کرتی۔“ فاربیہ نے نفرت سے جواب دیا۔

”ایک بار پھر سوچ لو مس فاربیہ.....“ اس نے مسکرا کر کہا۔ اس کی آنکھوں میں عیاری اور چہرے پر بڑی خمیشت مسکراہٹ تھی۔ ان دونوں چیزوں کے علاوہ اس کے لمبے کے اعتماد نے مجھے چونکا دیا تھا۔ وہ پوری طرح پھنس جانے کی باوجود جس قدر پُر اعتماد لگ رہا تھا وہ بہت عجیب سی بات تھی۔ کم از کم میرے لیے اس کا یہ انداز خطرے کی گھنٹی کی حیثیت رکھتا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اسے یقین ہو کہ عین وقت پر فرشتے آکر اسے غائب کر دیں گے یا یوں جیسے وہ اپنی مرضی سے صوفے پر بیٹھا ہو اور جب چاہے گا اٹھ کر چلا جائے گا۔ میں اس کی تمام حرکات و سکنات کا بہ غور جائزہ لے رہا تھا۔

”مسٹر جمال، تم ہمیشہ تو نہیں بچ سکتے..... ایک نہ ایک دن تو تم جیسے لوگوں کو پکڑا ہی جانا ہوتا ہے۔“

”سنیں مس فاربیہ..... ہم جیسے لوگ کبھی بھی پکڑے نہیں جاتے۔ اس لیے کہ ہم سوچے سمجھے اور پلان کیے بغیر کبھی کوئی قدم نہیں اٹھاتے۔ ہاں البتہ آپ جیسے لوگ ہمیشہ اس خوش فہمی کا شکار رہتے ہیں کہ.....“

”اے مسٹر۔“ میں نے گرج کر کہا۔ ”خاموش ہو جاؤ ورنہ ساری چرب زبانی نکال دوں گا ایک منٹ میں۔“

اس نے بڑے انداز سے میری طرف دیکھا۔ ”مسٹر اقبال..... بڑے افسوس کی

بات ہے کہ ہم نے جس میزبانی کا مظاہرہ کیا تھا آپ کے ساتھ، آپ دو ہی دن میں سب بھول گئے۔“

”اوائے شوے..... چپ کر جاو رنہ جبرائوڑ دوں گا تیرا۔“ سلطان ایک دم طیش میں آگیا۔

”سلطان..... اقبال پلیز..... یہ اس کی چال ہے۔ یہ تم لوگوں کو طیش دلا رہا ہے تاکہ تم لوگ.....“ فاریہ اچانک چپ ہو کر کچھ سننے لگی۔ ”شاید انسپکٹر قدیر آ گئے۔“ یہ کہہ کر وہ ڈرائنگ روم سے باہر جانے لگی۔ میں نے بھی اس کے ساتھ جانے کے لیے قدم اٹھایا مگر دوسرے ہی لمحے گولی چلنے کی آواز کے ساتھ ہی ڈرائنگ روم میں اندھیرا چھا گیا۔

ہم سب بیک وقت چیخ پڑے۔ میں نے دروازے کی طرف چھلانگ لگائی۔ میں فاریہ کو آنے والی افتاد سے بچانا چاہتا تھا۔ میرا اندازہ ٹھیک تھا۔ میں سیدھا فاریہ سے نکلایا اور اسے لیتا ہوا فرش پر گر گیا۔ وہ بری طرح چیخ رہی تھی۔

”چپ.....!“ میں نے سرگوشی کی اور وہ ایک دم چپ ہو گئی۔ ”صوفے کے پیچھے۔“ میں نے پھر سرگوشی کی اور وہ گھٹنوں کے بل صوفے کے پیچھے چلی گئی۔ یہ احساس ہوتے ہی کہ وہ محفوظ ہو گئی ہے میں پلٹ پڑا۔ اندھیرے میں اٹھانچ کی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں۔ شاید سلطان اور یعقوب جمال کو پکڑنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ دبی دبی کراہیں اور غرانے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں مگر میں نے اس طرف دھیان نہ دیا بلکہ بے آواز ڈرائنگ روم کے دروازے سے باہر آگیا۔ ڈرائنگ روم کے بلب پر گولی باہر سے چلائی گئی تھی اور میں یہی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کوٹھی میں وہ غدار کون ہے جو جمال کی مدد کے لیے یہاں موجود ہے۔ چونکہ ار پر شک کرنا بیکار تھا کیوں کہ گولی چلائے جانے کے وقت وہ ہونقوں کی طرح کھڑا ہم سب کو دیکھ رہا تھا اور اس کی رائفل کا رخ زمین کی طرف تھا۔ یعقوب اور سلطان میری مدد کر رہے تھے۔ وہ دونوں بھی میرے ساتھ تھے جبکہ گولی باہر سے چلائی گئی تھی۔ میں ریگستا ہوا باہر آیا تب مجھے احساس ہوا کہ پوری کوٹھی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی ہے۔ شاید کسی نے مین سوئچ آف کر دیا تھا۔ ذرا ہی دیر بعد سوہنی، ماسی میراں اور زاریہ کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ تینوں شاید اسی طرف آ رہی

تھیں۔

”واپس جاؤ..... اپنے کمرے میں واپس جاؤ۔ اندر سے کمرالاک کر لو۔ جاؤ.....“ جلدی کرو۔“ میں ایک دم چیخ پڑا۔

میری آواز سنتے ہی وہ تینوں چیختی ہوئی واپس بھاگیں۔ میں جواب دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ دھیرے دھیرے مین گیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ اسی لمحے گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور میں ساری احتیاط بالائے طاق رکھ کر پورچ کی طرف بھاگ پڑا۔ فاریہ کی کار گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی اور گیٹ چوٹ کھلا ہوا تھا۔ اسی وقت چونکدار، سلطان اور یعقوب کے ساتھ ہی فاریہ بھی بدکتی ہوئی میرے قریب پہنچ گئی۔

”اقبال..... وہ بھاگ رہا ہے..... پکڑو.....“ سلطان اور یعقوب بھی کار کے پیچھے بھاگے۔ اسی لمحے کار کی کھڑکی کے قریب ایک شعلہ سا پکا اور ساتھ ہی گولی چلنے کی آواز آئی۔

”بچو.....“ میں چیخا۔ مگر یعقوب کو ہم سب ہی گرتے دیکھ چکے تھے۔ آسمان پر گوجا ند نہیں تھا مگر پھر بھی یہاں کچھ روشنی تھی اور اسی روشنی میں ہم سب اس کی طرف لپکے۔ کار تیر کی طرح گیٹ سے نکل کر ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ میں اور فاریہ یعقوب کے پاس رک گئے مگر سلطان اور چونکدار کار کے پیچھے بھاگتے چلے گئے۔ میں جانتا تھا کہ اب یہ سب کوششیں بیکار ہیں۔

”سلطان..... مین سوئچ آن کرو۔“ میں چیخا۔ سلطان کے واپس آنے سے پہلے ہی فاریہ بھاگ کر بیڑھیوں کے پاس چلی گئی جہاں سوئچ بورڈ تھا۔ پھر دوسرے ہی لمحے کوٹھی جگمگا اٹھی۔ گولی یعقوب کے دائیں کندھے میں لگی تھی اور خون بری طرح بہہ رہا تھا۔

”ارے کیا ہوا..... کیا ہو رہا ہے یہ سب..... فاریہ..... سلطان..... کیا ہو گیا؟“ اسی وقت بیگ صاحب کی بھرائی ہوئی آواز آئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ دیوار کا سارا لیے آنکھیں پھاڑے کھڑے تھے۔ پھر اچانک ان کی نگاہ یعقوب پر پڑی۔ ”اسے کیا ہو گیا..... گولی کس نے چلائی تھی.....؟“

اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتے۔ اچانک پولیس چیپ گیٹ کے پاس آکر رکی اور انسپکٹر

قدیر اپنے دوستوں کے ساتھ بھاگتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

”ہینڈ زاپ!“ اس نے میرے قریب آتے ہی اپنے ریوالور کا رخ میری طرف کر دیا اور میں نے لمبا سانس لے کر اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔

”یہ بلا ہے قدیر۔“ فاریہ نے کہا۔

”ہیں.....؟“ اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ”پھر وہ کون تھا جو.....!“

”کون.....؟“ اس بار میں نے پوچھا۔

”وہ ابھی مجھے گلی کے کونے پر ملا تھا۔ میری جیب دیکھ کر اس نے گاڑی روک لی تھی

اور مجھے بتایا تھا کہ یہاں.....“

”اوہ..... کمال کا جرأت مند آدمی ہے۔“ فاریہ نے گہری سانس لے کر کہا۔

اتنی دیر میں سلطان وغیرہ یعقوب کو اٹھا کر ڈرائنگ روم میں لے گئے تھے ہم لوگ بھی وہیں چلے گئے۔ ہم نے سب سے پہلے یعقوب کا زخم دیکھا۔ گولی اس کے کاندھے پر لگی تھی۔

سلطان نے اپنی چادر کو پھاڑ کر اس کے زخم کو باندھ دیا تھا تاکہ خون رک سکے۔ فاریہ نے ڈاکٹر طارق کو فون کر دیا تھا۔ بیگ صاحب اب بھی ہونٹوں کی طرح آنکھیں پھاڑے بیٹھے تھے۔

حمیدہ بی بی نے انہیں سہارا دے کر صوفے پر بٹھا دیا تھا اور اب فق چہرے لیے سب کو دیکھ رہی تھی۔

”قصہ کیا ہے فاریہ؟“ انسپکٹر قدیر نے بیٹھے ہوئے پوچھا۔ وہ اس سے پہلے اپنے آدمیوں

کو جمال کے پیچھے روانہ کر چکا تھا۔

”تم بیٹھو میں سب کچھ بتاتی ہوں۔“

پھر فاریہ انسپکٹر قدیر کو جمال وغیرہ کے بارے میں بتانے لگی۔ میں اٹھ کر اس کمرے کی

طرف بڑھ گیا جہاں سوہنی، ماسی میراں اور زاریہ تھے۔ میری آواز سن کر زاریہ نے دروازہ کھول دیا اور مجھ پر نگاہ پڑتے ہی ہو کھلا گئی شاید اس لیے کہ میرے بال بھورے تھے۔

”زاریہ کیسی ہو تم؟“

”تنت..... تم کون ہو؟“

”میں اقبال ہوں زاریہ..... میں نے نرمی سے جواب دیا۔

”اقبال.....؟“

”بالے..... تو..... تو کہاں چلا گیا تھا؟“ اچانک سوہنی کی سرسراتی ہوئی آواز نالی دی۔

ماسی میراں اور زاریہ نے چونک کر سوہنی کو دیکھا۔ شاید انہیں یقین نہیں آیا تھا کہ میں ہی اقبال ہوں مگر سوہنی مجھے پہچان گئی تھی۔

”یہ لمبی داستان ہے سوہنی..... پھر سناؤں گا۔“ پھر میں زاریہ سے مخاطب ہوا۔ ”زاریہ میں ہی اقبال ہوں اور وہ جو میرے روپ میں یہاں آیا تھا وہ..... وہ جمال تھا جو فرار ہو چکا ہے۔“

”یہ گولی کس نے چلائی تھی۔ باہر خیریت ہے نا؟“

”ہاں سب خیریت ہے۔ بس یعقوب زخمی ہو گیا ہے..... گولی جمال نے ہی چلائی تھی۔“

اتنا سنتے ہی زاریہ ڈرائنگ روم کی طرف دوڑ گئی۔ ہم سب بھی اس کے پیچھے چل پڑے۔ میں سوہنی کو دیکھ کر فکر مند ہو گیا تھا۔ وہ بہت زیادہ کمزور ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کی ویرانی

بہت بڑھ گئی تھی شاید علاج اسے موافق نہیں آیا تھا یا پھر اس کا مناسب علاج ہوا ہی نہیں تھا۔ اس سلسلے میں مجھے فاریہ سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ ظاہر ہے وہ بے حد پریشان رہی ہو گی۔

ایسی صورت میں وہ کسی بھی جانب پوری توجہ نہیں دے سکتی تھی۔

ہم ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو وہاں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ڈاکٹر طارق آچکے تھے اور بڑے انہماک سے یعقوب کے زخم کو صاف کر رہے تھے۔ زاریہ، فاریہ کے کندھے سے

نکی کھڑی تھی۔ سلطان، بیگ صاحب کو سہارا دے کر ان کے کمرے میں لے جا رہا تھا۔ یعقوب پوری طرح ہوش میں تھا اور زخمی ہونے کے باوجود اس کے چہرے پر گہرا اطمینان تھا۔

شاید اس لیے کہ وہ زخمی ہو کر فاریہ اور بیگ صاحب کے شکوک و شبہات دور کر چکا تھا۔

کچھ دیر کے بعد ڈاکٹر طارق اور انسپکٹر قدیر چلے گئے۔ ہم سب وہیں ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ سلطان بھی بیگ صاحب کو ان کے کمرے میں چھوڑ کر واپس آچکا تھا۔ فاریہ نے

حمیدہ کو چائے لانے کے لیے کہا اور اس کے جاتے ہی مجھ سے پوچھا۔

اقبال..... یہ سب کیا ہے؟“

تب میں نے اغوا ہونے سے لے کر یہاں پہنچنے تک کی ساری داستان اسے سنا دی۔

میرے گرد بیٹھے ہوئے باقی سب لوگ بھی حیرت سے میری کہانی سن رہے تھے۔ میں نے کوٹھی کے تہ خانے والی بات کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ یہ ذکر میں سب کے سامنے کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ میں اس معاملے کو پہلے اپنے طور پر دیکھنا چاہتا تھا اسی لیے میں نے انیسویں صدی کو بھی یہ بات نہیں بتائی تھی۔ میں تو ابھی یہ بھی طے نہیں کر پایا تھا کہ یہاں کسی تہ خانے کی موجودگی سے فاربیہ یا بیگ صاحب واقف ہیں یا نہیں بلکہ یہ بھی ممکن تھا کہ مسٹر زید اور مسٹر جمال نے یہ ساری داستان خود ہی گھڑی ہو۔ ان کا مقصد کیا تھا یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ بہر حال میری داستان ختم ہوتے ہوتے رات بھیک گئی مگر نیند ہم میں سے کسی کو بھی نہیں آرہی تھی۔ میری باتیں ختم ہونے کے بعد فاربیہ نے مجھے بتایا کہ زاریہ اب بالکل صحت مند ہے البتہ سوہنی کی صحت گرتی جا رہی ہے حالانکہ وہ اس کے علاج پر کافی توجہ دے رہی ہے۔

”میں ٹھیک ہونے والی نہیں..... میرے اوپر پیسا اور وقت برباد نہ کرو۔“ سوہنی نے بھیگے لہجے میں جواب دیا۔

”مگر کیوں..... سوہنی کیا زاریہ کی مثال تیرے سامنے نہیں..... وہ بھی تو ٹھیک ہو گئی ہے۔“

”زاریہ کو ایسے گھاؤ کہاں لگے تھے بالے جو میرے من میں لگے ہیں۔“

”سوہنی سارے گھاؤ بھر جاتے ہیں اور اب تو میں آگیا ہوں۔ اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”ماسی..... سوہنی کو کمرے میں لے جاؤ۔ اسے دوا دے دینا، اسے آرام کی ضرورت ہے۔“ فاربیہ نے سپاٹ سے لہجے میں کہا۔

میں اس کی بات سن کر چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ فاربیہ اس لہجے میں بات کرے گی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سوہنی کی موجودگی کو پسند ہی نہیں کر رہی۔

”چلو سوہنی..... رات بہت ہو گئی ہے، صبح باتیں کریں گے۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”بیٹھ پڑ..... میں لے جاتی ہوں۔“ ماسی نے دکھ بھرے لہجے میں جواب دیا۔ فضا میں عجیب سا تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔ میں نے نگاہ اٹھا کر سب کو دیکھا۔ سلطان نے فوراً نگاہیں چرا لیں اور یعقوب کو سہارا دے کر کھڑا کر دیا۔

کچھ دیر بعد ہی کمرے میں صرف فاربیہ اور میں رہ گئے ہم دونوں کے علاوہ گنبیر خاموشی تھی جو جاتے ہوئے قدموں کی آواز کے ساتھ ہی گہری ہوتی جا رہی تھی نہ معلوم کیوں میرا دل گھبرا گیا۔ میرا جی چاہا کہ اٹھ کر کہیں بھاگ جاؤں۔ قیامت کا جس محسوس ہوا، یوں جیسے کوئی بڑا طوفان آنے والا ہو۔

”اقبال.....!“

اچانک گہری خاموشی میں فاربیہ کی آواز کسی دھماکے سے کم نہ محسوس ہوئی۔

”بس میڈم!“

”اقبال..... تم زندگی کا ہر رخ دیکھ چکے ہو، تم جانتے ہو کہ یہاں کسی شے کو ثبات نہیں، یہ بھی جانتے ہو کہ یہاں وہ کچھ نہیں ہوتا جس کی خواہش ہو۔ یہاں پستیوں سے

بلندیوں اور بلندیوں سے پستی کی طرف زندگی اور موت دونوں ہی رواں رہتی ہیں“

”میڈم..... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں..... ایسی باتوں سے آپ کا مقصد کیا ہے؟“

”اقبال.....!“ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

”میڈم..... کیا ماں کے بارے میں کوئی اطلاع.....؟“

”نہیں..... اقبال..... میں تمہیں دکھ دینا نہیں چاہتی..... مگر خدا بعض ایسے کام سوچ دیتا ہے جو نا پسندیدہ ہوتے ہیں۔“

”میڈم..... آپ کو جو کچھ کہنا ہے ایک دم کہہ دیں..... میں..... میں سب کچھ برداشت کر لوں گا..... پلیز..... یہ کیفیت میرے لیے بڑی اذیت ناک ہے۔“

”سوہنی چند روز کی مہمان ہے اقبال۔“ اتنا کہہ کر اس نے سر جھکا لیا اور میں سن بیٹھا رہ گیا۔ مجھے ایسی کسی خبر کی توقع بھی نہ تھی۔

”مجھے افسوس ہے اقبال..... کاش میں اس کے لیے کچھ کر سکتی۔“

”مگر..... وہ تو ٹھیک ہے..... اسے کچھ نہیں ہو سکتا، بس کمزوری ہی تو ہے.....“

”اس کے پیچھے ختم ہو چکے ہیں اور..... سلطان اندر ہی اندر پھیلتا جا رہا

ہے۔

”سرطان.....؟“

”ہاں اقبال“ میں نے جب اس کا مکمل چیک اپ کروایا تو پتا چلا کہ وہ کینسر کی مریضہ ہے اور یہ مرض اپنے آخری اسٹیج پر ہے۔ تب میں نے اسے اسپتال میں رکھنا مناسب نہیں سمجھا ڈاکٹر طارق بھی اس سے متفق تھے اس لیے میں اسے گھر لے آئی۔ اقبال“ میں چاہتی ہوں کہ اب تم ہم سب کو بھول کر اپنا ہر لمحہ اسے دے دو۔“

فاریہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

”کیا وہ جانتی ہے؟“

”نہیں“ ماسی میراں جانتی ہیں۔ انہیں بتانا ناگزیر ہو گیا تھا۔ تم نہیں جانتے اقبال“ سوہنی کے بارے میں علم ہو جانے کے بعد میں نے یہ لمحات کس اذیت میں گزارے ہیں۔ جمال جب تمہارے روپ میں یہاں پہنچا تو میں جان گئی تھی کہ تم نہیں ہو مگر میں نے یہ بات کسی پر ظاہر نہ ہونے دی صرف یہ سوچ کے کہ اس طرح سوہنی کچھ تو خوش ہو جائے گی۔ اس کے آخری لمحات تمہاری جدائی کے اذیت ناک احساس سے تو ختم ہو جائیں گے مگر..... وہ واقعی تم سے بے پناہ پیار کرتی ہے۔ جمال سے ملنے کے باوجود وہ خوش نہیں تھی بلکہ اس نے تو اسی رات مجھے کہا تھا کہ آپنی..... یہ بالا کتنا بدل گیا ہے۔ یہ سن کر مجھے اس کی محبت کا اندازہ ہو گیا تھا اقبال کہ وہ اپنے اور جمال کے درمیان اجنبیت کو کتنی جلدی محسوس کر گئی تھی۔“

وہ خاموش ہوئی تو مجھے احساس ہوا کہ میری خشک آنکھیں بھیگ چکی ہیں۔

”نہیں اقبال..... پلیز“ تم تو بہت دلیر ہو۔“ وہ مجھے روتا دیکھ کر ایک دم رو پڑی ”اگر تم ایسا کرو گے تو اسے پتا چل جائے گا اقبال“ اور یہ جان لینا کہ موت قریب آرہی ہے بے حد کرب ناک ہوتا ہے۔“

وہ سچ کہتی تھی۔ میرا حوصلہ ختم ہو گیا تو وہ کیا کرے گی۔ یہ سوچ کر میں نے اپنی ہتھیلیوں سے آنکھیں خشک کر لیں۔ میں اسے بچا تو نہیں سکتا تھا مگر اس کی خالی جھولی میں چند لمحوں کی خوشیاں تو ڈال سکتا تھا۔ اس کے یہاں آنے کے بعد تو میں نے سوچا تھا کہ خوب گھماؤں گا۔ راوی کا وہ کنارہ دکھاؤں گا جہاں زندگی لہروں پر رقص کرتی محسوس ہوتی ہے۔ آسمانوں کی وہ انتہا دکھاؤں گا جہاں سورج انسانوں کی ساری خباثت اور ان کے تمام گناہوں کو

اپنی جھولی میں چھپائے چپکے سے سمندروں میں اتر جاتا ہے۔ میں نے تو سوچا تھا کہ میں اس کی تمام محرومیوں کو دور کر دوں گا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ میرے قریب آ جانے کے باوجود مجھ سے دور ہوتی جا رہی ہے۔

میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

”اقبال..... اسے زندگی کا احساس دلانے کی کوشش کرنا۔“

”جی!“

”ہاں! اقبال زندگی کا بھرپور احساس شاید اس کی عمر بڑھا دے۔“

اور میں نہرہلا کر تیزی سے کمرے سے باہر نکل آیا۔ میں بے اختیار اس طرف بڑھ گیا جہاں ماسی میراں اور سوہنی موجود تھیں۔ میرے دستک دینے پر ماسی میراں نے دروازہ کھولا۔ لمحہ بھر کو میری نگاہیں ماسی میراں کی نگاہوں سے ٹکرائیں اور میرے اندر درد کی لہریں اترتی چلی گئیں۔ ماسی میراں کی بھگی پلکوں کے بیچ خاموش التجا لرز رہی تھی۔ مجھے اس کے حوصلے پر حیرت بھی ہوئی کہ وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی اکلوتی بیٹی کا ہر سانس موت کی طرف بڑھتا ہوا ایک قدم ہے، اس قدر خاموش تھی۔ میں زیادہ دیر اس کے سامنے کھڑا نہ رہ سکا اور اس بستر کی طرف بڑھ گیا جہاں لیٹی ہوئی سوہنی کی آنکھیں مجھے دیکھ کر چمک اٹھیں تھیں۔ ”خدا کرے یہ چمک ہمیشہ قائم رہے۔“ میں نے بے اختیار دل میں دعا مانگی۔

”سوہنی..... کیسی ہے تو؟“ میں نے اس کے سرہاتے بیٹھ کر اس کے ریشمی بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

”ٹھیک ہوں بالے“ میں تو اسے دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی کہ وہ تو نہیں ہے۔ اس کی آنکھوں میں تیری آنکھوں والی بات ہی نہیں تھی بالے..... خدا کا شکر ہے کہ تو واپس آ گیا۔ اگر تجھے کچھ ہو جاتا تو پھر ہم سب کیا کرتے؟“

”مجھے کچھ بھی نہیں ہوتا سوہنی“ تو میرے لیے دعا جو کرتی ہے..... کرتی ہے نا؟“

”ہاں بالے..... سن..... اب تو ماں کو لے کر آنا..... وہ تیرا انتظار کرتی تھی۔ وہ یہاں آ جائے گی تو تیرے سارے دکھ ختم ہو جائیں گے۔“ اس نے معصومیت سے کہا اور میرا جی چاہا کہ چیخ کر روؤں..... اور اسے بتا دوں کہ سوہنی میرے دکھ کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ ماں آ جائے تو بھی ختم نہیں ہوں گے اس لیے کہ پھر تو مجھ سے پھڑ جائے گی تب

کھل جانے کے بعد چین سے بیٹھ جائے گا۔ دوسری بات یہ کہ ہمیں اب کیا کرنا چاہیے۔ ابھی تک نارکوٹکس کے ڈائریکٹر نے وحی صاحب پر ہاتھ کیوں نہیں ڈالا۔ دوسری طرف بہادر کی سائش جاری ہیں اور اب یہ مسٹر زید اور جمال..... بات یہ ہے اقبال کہ ابھی تک میری سمجھ میں یہ آخری ڈراما نہیں آیا۔ بہادر کی اتنی جرأت نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ جمال کو یہاں بھیجتا بلکہ میرے خیال میں تو وہ جمال اور زید کے خلاف ہے پھر.....؟“

”میں جانتا ہوں میڈم کہ وہ کیوں آیا تھا۔“ میں نے دھیرے سے جواب دیا۔ فاریہ ذہین تھی یہ بات میں جانتا تھا کہ وہ اس بارے میں ضرور سوچے گی۔ مجھے تو اب تک اتنا وقت ہی نہیں ملا تھا کہ اسے پوری تفصیل سے بتا دوں یہ بھی میں یہ بات سب کے سامنے کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

”تم جانتے ہو.....؟“ اس نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ شاید وہ سوچ رہی تھی کہ میں نے اب تک اسے کیوں نہیں بتایا۔ ”کیوں آیا تھا وہ؟“ اس نے سوال کیا۔ ”سوہنی اب تم سو جاؤ۔“ میں نے اس کا جواب دینے کی بجائے سوہنی سے کہا۔ ”کل میں تمہیں اور ماسی کو راوی کے کنارے لے جاؤں گا اور سارا لاہور گھماؤں گا۔“

”ٹھیک ہے بالے تو جا..... میں سو جاؤں گی، اب تو مجھے چین کی نیند آئے گی۔ جاؤ جا.....“ وہ فوراً مان گئی۔

میں فاریہ کے ساتھ باہر آ گیا۔ میرے اور فاریہ کے ہاتھوں میں چائے کے کپ تھے۔ ہم برآمدے میں سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ تب میں نے اسے بتایا کہ جمال یہاں کیوں آیا تھا۔ وہ تمام باتیں سن کر حیرت زدہ ہو گئی۔

”یہاں کوئی تہ خانہ بھی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”جانتا نہیں اقبال، اگر ہے تو میں اس سے ناواقف ہوں۔ یہ تو سچ ہے کہ انکل نے یہ کوٹھی سیمان کے ٹانے خریدی تھی بلکہ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے زبردستی کوٹھی کو انکل کے ہاتھوں فروخت کیا تھا۔ وہ یہاں رہنے پر تیار نہ تھے بلکہ وہ کراچی شفٹ ہونا چاہتے تھے۔ ان دنوں یہ فیکٹری بھی نہیں تھی، انکل کا ایکسپورٹ امپورٹ کا کام تھا مگر یہ کوٹھی خرید لینے کے بعد ہمیں یہاں رک جانا پڑا اور پھر انکل نے یہ فیکٹری بنائی۔“

”معاف کیجئے گا میڈم ایک ذاتی سا سوال کروں؟“

میں تجھے کہاں سے لاؤں گا کہاں تلاش کروں گا تجھے..... میں یہ سب سوچتا رہا مگر کچھ بھی نہ کر سکا۔ میرے لیے وہاں بیٹھنا دو بھر ہو رہا تھا اور وہ یوں باتیں کیے جا رہی تھی جیسے ساری باتیں آج ہی کر لینا چاہتی ہو، جیسے صبح کبھی نہیں ہوگی، اگلا دن کبھی نہیں آئے گا۔ میں نے چاہا کہ اسے روک دوں، اسے کہوں کہ اب وہ سو جائے، کچھ دیر آرام کر لے مگر عین اسی لمحے مجھے صغریٰ یاد آگئی اور میں لرز اٹھا۔ اسے بھی تو میں نے زبردستی چپ کر دیا تھا کہ وہ آرام کر لے اور پھر وہ ایسی خاموش ہوئی کہ میرے تڑپ تڑپ کر چیخنے پر بھی آرام سے سوتی رہی۔

یہ خیال آتے ہی میرا دل لرزنے لگا۔ میں باوجود چاہنے کے وہاں سے اٹھ نہ سکا۔ وہ بولتی رہی اور میں سنتا رہا۔ جانے کتنی رات گزر گئی۔ ماسی میرا بھی اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ اچانک دروازے پر دستک کی ہلکی آواز ہوئی۔ میں نے فوراً دروازہ کھولا۔ مجھے یقین تھا کہ آنے والی فاریہ ہوگی، میرا خیال درست ثابت ہوا۔ فاریہ چائے کی ٹرائی لیے دروازے پر کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں گہری سرخی تیر رہی تھی اور ہونٹوں پر غمگین مسکراہٹ تھی۔ میں سمجھ نہیں سکا کہ اس کی آنکھوں میں سرخی نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے ہے یا رونے کی وجہ سے۔

”ارے آپ! آپ جاگ رہی ہیں، بالے! یہ سب بھی میری وجہ سے پریشان ہو گئے ہیں۔“

”ارے نہیں سوہنی..... ہم پریشان کیوں ہوتے..... تم لوگوں کی وجہ سے تو کوٹھی میں رونق ہے۔ میں خود کو اکیلا محسوس نہیں کرتی۔ دراصل نیند مجھے بھی نہیں آرہی تھی اور ذہن میں چند باتیں گردش کر رہی تھیں۔ میں نے سوچا اقبال کو یہاں بلانے کی بجائے خود ہمیں آکر پوچھ لوں۔“ اس نے چائے کی ٹرے سنٹر ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

”زاریہ سو گئی میڈم!“

”ہاں اقبال، ڈاکٹر نے اسے مکمل آرام کے لیے کہا ہے مگر وہ دن بھر آرام نہیں کرتی۔ میں نے ڈانٹ کر لٹایا ہے۔ اقبال، میں چند باتوں کی وجہ سے پریشان ہوں۔“ اس نے چائے پیالیوں میں نکالتے ہوئے جواب دیا۔

”کون سی باتیں؟“

”ایک تو یہ جمال کا یہاں آنے کا اصل مقصد کیا تھا اور کیا وہ یوں پکڑ لیے جانے اور راز

”ہاں ہاں..... کیا بات ہے؟“

”بیگ صاحب کے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی؟“

اس نے میرا سوال سن کر گہرا سانس لیا۔ ”یہ تمام دولت میرے ابو کی تھی اقبال، میرے ابو کی زمینیں تھیں، وہ سندھ کے ایک بڑے زمیندار تھے۔ اس کے علاوہ وہ فروٹ اور سبزی ایکسپورٹ بھی کرتے تھے پھر انہوں نے شوگر بنانے کا کارخانہ بھی لگا لیا تھا۔ بیگ صاحب اور میرے ابو دو ہی بھائی تھے۔ انکل نے شادی نہیں کی تھی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد وہ ابو کے پاس ہی چلے آئے تھے۔ بہر حال یہ باتیں پھر کبھی ہو سکتی ہیں فی الحال تو ہمیں اس سے خائف نہ ہو، کھوج لگانا چاہیے۔ ہو سکتا ہے اس صندوق میں واقعی بہادر کے خلاف ثبوت ہوں، اگر ایسا ہو تو یہ ہمارے کام بھی آسکتے ہیں۔“

”جی میڈم، میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ سب سے پہلے یہ خانے کا پتا چلے، ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ جمال اور زید دوبارہ یہاں آسکتے ہیں۔“

”میں چاہتی ہوں کہ سلطان اور یعقوب دونوں کو اسی کام پر لگا دوں۔“

یعقوب زخمی ہے میڈم!

”ہاں مگر زخم اتنا گہرا نہیں کہ وہ سلطان کی مدد نہ کر سکے۔“

”ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟“

”زخم دو چار دن میں بھر جائے گا۔ گولی اس کے کاندھے کو چھیلی ہوئی نکل گئی ہے، آہ آہ پار ہو جاتی تو مسئلہ تھا۔“

”میڈم! میرے خیال میں یہ کام ان دونوں پر چھوڑنے والا نہیں۔ مجھے خود یہ کام کرنا ہو گا۔“

”اقبال..... میں سمجھتی ہوں مگر سوہنی کی حالت ایسی نہیں کہ اسے نظر انداز کیا جائے۔“

”میں دن کا ہر لمحہ اسے دوں گا میڈم..... مگر یہ کام رات میں کرنے کا ہے جسے میں با آسانی کر سکتا ہوں۔“

وہ میری طرف دیکھ کر رہ گئی، وہ خود بھی جانتی تھی کہ تمہ خانہ تلاش کر کے اس صندوق کو فوری طور پر حاصل کرنا بے حد ضروری ہے۔

”میڈم..... کیا بیگ صاحب اس سے خائف ہیں؟“

”میرا خیال ہے کہ وہ بھی نہیں جانتے ہوں گے، اگر جانتے تو ضرور بتا دیتے!“ اس نے

پرسوج انداز میں جواب دیا۔

”پھر بھی ان سے ذکر کر کے دیکھیں، ممکن ہے انہیں اندازہ ہو کہ یہاں تمہ خانہ کس جگہ ہو سکا ہے۔“

”ہاں..... میرا خیال ہے کہ یہ بات ابھی کر لی جائے، گزرنے والا ہر لمحہ قیمتی ہے۔ اقبال، ایک لمحے کی قیمت کسی کی جان بھی لے سکتی ہے۔“

”وہ سو رہے ہوں گے۔“

”نہیں جاگ رہے ہیں۔ میں کچھ دیر پہلے انہی کے پاس تھی۔ انہیں چائے دینے کے بعد ہی تم لوگوں کے لیے چائے لائی تھی۔ دن بھر آرام کرنے کی وجہ سے انہیں نیند نہیں آتی۔“

”پھر ٹھیک ہے!“ میں کھڑا ہو گیا۔

میں اور فاریہ کچھ ہی دیر بعد بیگ صاحب کے پاس بیٹھے تھے۔ میں نے انہیں مسٹر زید اور مسٹر جمال کے مقاصد کے بارے میں بتایا اور بتایا کہ وہ یہاں کسی سے خانے کی تلاش میں آئے تھے۔ یہ بات سن کر مجھے لگا جیسے بیگ صاحب کا چہرہ ایک دم سفید ہو گیا ہو۔ معلوم نہیں

فاریہ نے بھی ایسا ہی محسوس کیا تھا یا نہیں، یا ممکن ہے یہ محض میرا وہم ہو۔ بہر حال سے خانے کے بارے میں سن لینے کے بعد بیگ صاحب کچھ دیر سر جھکائے خاموش بیٹھے رہے۔

”انکل! اگر ایسا کوئی صندوق یہاں موجود ہے تو وہ ہمارے لیے بہت اہم ہے، اس سے پہلے کہ وہ جمال یا زید کے ہاتھ لگے، ہمیں اسے حاصل کر لینا چاہیے۔ انکل، آپ کے خیال میں اگر یہاں کوئی تمہ خانہ ہے تو وہ کس جگہ ہو سکتا ہے؟“ فاریہ نے انہیں خاموش دیکھ کر پوچھا۔

”نہیں نہیں فاریہ..... یہاں ایسا کوئی تمہ خانہ نہیں ہو سکتا۔ جمال اور زید کا خیال غلط ہو سکتا ہے۔ وہ لوگ محض ہمیں پریشان کرنے کے لیے ایسا کہہ رہے ہیں۔ یہاں آنے سے ان کا مقصد کچھ اور ہو گا۔“

ان کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی جو تیر کی طرح میرے دل و دماغ میں گھسی چلی گئی۔ مجھے بڑی شدت سے اس غلطی کا احساس ہوا کہ سے خانے کا ذکر بیگ صاحب کے سامنے کیا گیا۔

باہر نکل آئے۔

کمرے سے باہر آتے ہی فاریہ پھٹ پڑی۔ ”اقبال یہ کیا طریقہ ہے..... تم خود ہی تو اس سلسلے میں اتنے سنجیدہ تھے، کیا میں یہ سمجھوں کہ تم نے جو کمائی جمال اور زید کے بارے میں مجھے سنائی تھی وہ سراسر جھوٹ پر مبنی تھی؟“

”نہیں میڈم..... وہ کمائی سراسر سچ پر مبنی ہے۔“

”پھر..... پھر انکل کے سامنے تمہیں کیا ہو گیا تھا؟“

”آئیے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“ میں نے اس کی بات کا جواب دیے بغیر کہا اور آگے بڑھ گیا۔

ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے۔ ”ہاں اب بولو..... کبھی کبھی تمہارا رویہ میرے لیے ناقابل فہم ہو جاتا ہے۔“ اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”سوری میڈم، مگر کبھی کبھی ایسا رویہ اختیار کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ میڈم آپ کافی مضبوط اعصاب کی مالک ہیں مجھے امید ہے کہ اب کوئی بھی حادثہ آپ کے اعصاب کو شل کرنے میں ناکام رہے گا اور آپ نارمل ہر معاملے کو سوچ سکیں گی۔“

”میں..... میں سمجھی نہیں اقبال..... تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”میڈم میرے خیال میں، بلکہ مجھے یقین ہے کہ یہاں نہ صرف تمہارا وجود ہے بلکہ اس تمہارے خاندان میں صندوق کی موجودگی سے بیگ صاحب واقف ہیں۔“

”کیا کہہ رہے ہو تم؟“ وہ تقریباً اچھل پڑی۔

تب اس بات کا یقین دلانے کے لیے مجھے کافی محنت کرنا پڑی مگر میں ناکام نہیں رہا۔ وہ اس بات پر تیار ہو گئی کہ وہ بھی میری طرح بیگ صاحب پر یہی ظاہر کرے گی کہ تمہارے خاندان والی بات کو زید اور جمال کی چال سے زیادہ اہمیت نہیں دے رہی ہے۔ دوسری طرف ہم رات کے اندھیرے میں اس تمہارے خاندان کی تلاش کریں گے۔ فاریہ کے راضی ہوتے ہی میں اس سلطان کی طرف چلا گیا۔ رات کیوں کہ کافی گزر چکی تھی اس لیے وہ سوچ کا تھا۔ یہ اندازہ میں نے کمرے میں اندھیرا دیکھ کر لگایا تھا مگر اسے جگانا بہت ضروری تھا، یہ کام ایسا نہیں تھا کہ اسے بلا جاتا۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ پہلی ہی دستک پر اس نے دروازہ کھول دیا۔ مجھے اس وقت دروازے پر دیکھ کر وہ کچھ حیران ہوا۔

بیگ صاحب تو خود مشکوک ہو چکے تھے۔ ہیروئن کے مذموم کاروبار میں ان کی شرکت بہر حال ان کی مرضی اور پلاننگ سے ہوئی ہوگی۔ میرا جی چاہا کہ میں اٹھ کر باہر چلا جاؤں مگر میں ایسا نہ کر سکا۔

”ایسا ہو بھی تو سکتا ہے انکل..... آپ ذہن پر زور دیں، کوٹھی خریدتے وقت کوئی ایسی بات جو آپ نے محسوس کی ہو۔ ممکن ہے سیمائ کے نانا نے اس بارے میں کوئی اشارہ کیا ہو۔“

”اوہ فاریہ! تم بھی ان لوگوں کی طرح پاگل ہو گئی ہو۔ ایسی کوئی بات نہیں، پھر تمہارے ہاتھ صاف ہیں تم اتنا کیوں گھبراتی ہو۔“ بیگ صاحب نے چڑچڑے انداز میں جواب دیا پھر فوراً ہی خود کو سنبھال کر نارمل انداز میں بولے۔ ”فاریہ، مینا تم ان چکر میں نہ پڑو۔ ایسی کوئی بھی بات نہیں ہے، یہ ایک عام سی کوٹھی ہے اور اس میں کوئی تمہارا خانہ نہیں ہے، اگر ہوتا تو مجھے اس کا علم ضرور ہوتا۔“

”مگر انکل.....!“

”بیگ صاحب ٹھیک کہتے ہیں میڈم۔“ میں نے جلدی سے فاریہ کی بات کاٹ کر کہا۔ وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔ ”اگر یہاں کوئی تمہارا خانہ ہوتا تو وہ بیگ صاحب سے چھپا ہوا نہ ہوتا۔“

”ہاں..... ہاں، اور کیا، تم ہی اس کو سمجھاؤ اقبال یہ جو کچھ سن لیتی ہے اس کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔“

”مگر.....“ فاریہ نے مجھ سے کچھ کہنا چاہا۔

”میڈم وہ بہت چال باز لوگ ہیں، ہمیں الجھائے رکھنے کے لیے یہ نئی کمائی ڈال دی۔ آپ فکر نہ کریں میں انشاء اللہ ان کی ہر چال کو ناکام بنا دوں گا۔“

”اور کیا..... تمہیں اقبال پر بھروسہ رکھنا چاہیے بیٹا۔“ بیگ صاحب میری باتوں سے بہت خوش ہو گئے تھے۔ ان کے چہرے پر اچانک ہلاکت آ گئی تھی اور ہمیں سے میرا شک پختہ ہو گیا۔ وہ بیگ صاحب جو تمہارے خاندان کا سن کر سفید ہو گئے تھے، یہ دیکھ کر مطمئن ہو گئے کہ میں ان کی باتوں میں آ گیا ہوں۔ اب یہی بہتر تھا کہ میں ان پر یہی ثابت بھی کرتا ہوں میں نے فاریہ کو سمجھا بچھا کر وہاں سے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ ہم دونوں بیگ صاحب کو خدا حافظ کہہ کر

”بالے..... کیا کوئی اور مصیبت آگئی۔“ اس کے لہجے میں ناراضگی تھی۔ وہ ناراض ہونے میں حق بہ جانب بھی تھا۔ بے چارہ اچھا خاصا سکون سے زندگی گزار رہا تھا کہ میں اس طلسمی حویلی میں لے آیا جہاں قدم قدم پر نرا سرایت اور سہنس کے سوا کچھ نہ تھا۔ ”ہاں سلطان..... بیٹھ میں تجھے بتاتا ہوں۔“

یار بالے، میں کہتا ہوں سوہنی اور ماسی میراں کو لے کر میرے ساتھ میرے گاؤں چل، اس عذاب زندگی سے جان چھوٹ جائے گی۔ تو نے خواہ مخواہ دوسروں کی بلا اپنے گلے میں ڈال رکھی ہے۔ نہ خود سکون سے رہتا ہے اور نہ کسی اور کو رہنے دیتا ہے۔

”سلطان..... میں نے تجھے یہاں لانے سے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ یہاں کیا چکر چل رہے ہیں اور میں..... میں تو ظالموں کے خلاف جہاد کر رہا ہوں تو نے اپنی مرضی سے اس جہاد میں شرکت کی ہے اب اگر تو یہاں نہیں رہنا چاہتا تو..... تیری مرضی ہے، میں تجھے نہیں روکوں گا۔“

”اچھا کس کام سے آیا تھا؟“ سلطان نے میری بات کا جواب دیے بغیر کہا۔ میں جانتا تھا کہ وہ پل میں بدل جاتا ہے جو کچھ دل میں آتا ہے کہہ ڈالتا ہے اور پھر پہلے جیسا ہو جاتا ہے۔ تب میں نے اسے اپنے مقصد کے بارے میں بتایا جسے سن کر وہ بھی پریشان ہو گیا۔

”ہاں یار اس طرح تو وہ لوگ ہمارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ تو ایسا کر صندوق ہاتھ میں آتے ہی اسے پولیس کے حوالے کر دے اور اپنا بوریا بستر سمیٹ کر گاؤں چل۔“

”صندوق تو اس وقت ہاتھ آئے گا جب تمہ خانے کا رستہ پتا چلے گا۔“

”تو تمہ خانے کا پتا کرنا کیا مشکل ہے۔ اب یہ حویلی اتنی بڑی تو نہیں کہ دو بٹے کٹے آدی اس کی تلاشی نہ لے سکیں۔“

”میں اس تلاش کی ابتدا ابھی سے کرنا چاہتا ہوں سلطان، مگر ایک بات کا خیال رکھنا اس تلاش کے بارے میں صرف فاریہ یامیں اور تو ہی جانتے ہیں اور کسی کو پتا بھی نہیں چلنا چاہیے کہ ہم راتوں کو کیا کر رہے ہیں، سمجھ گیا نا؟“

”ایک تو میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ بڑے گھروں میں رہنے والے لوگ ایک دوسرے سے جھوٹ کیوں بولتے ہیں، ایک دوسرے سے اتنی باتیں چھپاتے کیوں ہیں؟“

”اب تو فلسفے میں نہ پڑ، یہ باتیں تیری سمجھ میں نہیں آنے والی، تو ایسا کر کہ.....“

میں سے ابتدا کر دے۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ پہلے اپنے کمرے کے فرش کو ٹھونک بجا کر دیکھ، ممکن ہے رستہ یہیں سے ہو!“

”خدا تیری زبان مبارک کرے، لہجہ دھندے سے بچ جائیں گے۔“ اس نے آستین کو اوپر کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد میں اور سلطان دونوں گھٹنوں کے بل زمین پر ریگ رہے تھے، ہم نے فرش کو بجا بجا کر دیکھا، الماری کے نیچے، ہاتھ روم میں مگر ہمیں تمہ خانے کے آثار نظر نہیں آئے بالآخر ہم تھک کر بیٹھ گئے۔

”یار بالے..... یہ کام تو آسان نہیں لگتا۔“

اور میں بے اختیار ہنس پڑا۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے وہ کہہ رہا تھا کہ حویلی اتنی بڑی تو نہیں کہ ہم دونوں تمہ خانہ تلاش نہ کر سکیں اور اب صرف اپنے ہی کمرے کا فرش ٹٹولنے کے بعد اسے یہ کام مشکل لگنے لگا تھا۔

”اچھا چل میرے ساتھ فاریہ کے پاس!“ میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا تو وہ بھی اٹھ گیا۔

”وہ جاگ رہی ہیں؟“

”ہاں!“ میں نے مختصر جواب دیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ ہمارے دائیں جانب یعقوب کا کمرہ تھا۔ اس کے کمرے میں اندھیرا تھا، غالباً وہ سو چکا تھا۔ ہم اس کے کمرے کے سامنے سے گزر کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئے۔

”بالے! یہ فاریہ عجیب قسم کی عورت ہے۔ رات دن محنت کرتی ہے، جاگتی ہے، سب کا خیال رکھتی ہے پھر بھی تھکتی نہیں.....“

”اس کی اسی اچھائی نے تو مجھے اتنا متاثر کیا ہے۔ اتنی پریشانیوں میں رہنے کے باوجود اسے یہ خبر ہوتی ہے کہ کون بیمار ہے، کس نے کھانا نہیں کھایا اور کون رات بھر نہیں سویا۔“

میں نے جواب دیا۔ ہم ڈرائنگ روم کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اس لیے سلطان خاموش رہا۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازے پر ہلکی دستک دی۔ جواب میں فاریہ نے اندر آ جانے کو کہا۔ ہم

دونوں اندر داخل ہو گئے۔

وہ میرے ہی انتظار میں تھی۔ ہمیں دیکھ کر اس نے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
”میڈم، مجھے کچھ دیر پہلے ایک خیال آیا ہے۔“ میں نے کہا۔
”کیا؟“

”اس معاملے میں ہمیں کسی پر بھی اعتماد نہیں کرنا چاہیے، محض اس لیے کہ معاملہ نازک ہے، ذرا سی بے پروائی بھی خطرناک ہو سکتی ہے، میرا مطلب یہ تھا کہ تمہ خانے کی تاشی میں یعقوب کو شامل کرنا ضروری نہیں، میں اور سلطان کافی ہیں۔“

”جیسا تم مناسب سمجھو اقبال، میرا ذہن تو مفلوج ہو کر رہ گیا ہے۔ بہر حال میرے خیال میں اس کی ابتدا میرے کمرے سے ہونا چاہیے تمام کمرے دیکھ لینے کے بعد کوٹھی کے احاطے کو دیکھا جائے۔ ویسے اگر یہاں کوئی تہ خانے ہے تو اس کا راستہ عمارت کے اندرونی حصے ہی میں ہونا چاہیے، تمہارا کیا خیال ہے؟“
”ٹھیک رہتی ہیں آپ، ویسے ابتدا تو ہم کر چکے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ وہ چونک گئی۔

میڈم میں نے اور سلطان نے آپ کے پاس آنے سے پہلے ہی سلطان کے کمرے کے فرش کو خوب ٹھونک بجا کر دیکھ لیا تھا۔ ویسے میں سب سے پہلے بیگ صاحب کے کمرے کو چیک کرنا چاہتا ہوں۔“

میری بات پر وہ ایک بار پھر چونک اٹھی۔ شاید وہ میرا مطلب سمجھ چکی تھی۔ میں کیوں کہ بیگ صاحب پر پہلے ہی اپنا شک ظاہر کر چکا تھا اس لیے یہ اصولی سی بات تھی کہ اگر وہ جانتے ہیں کہ تمہ خانہ کہاں ہے اور یہ کہ اس میں ایسی دستاویزات بھی ہیں جن کا تعلق کسی بھی طرح ہمار اور بیگ صاحب سے ہے تو یہ یقینی بات تھی کہ وہ اس جگہ کی حفاظت خود کرتے رہے ہوں، ایسی صورت میں اس بات کا امکان زیادہ تھا کہ اس تمہ خانے کا راستہ ان کے کمرے سے ہو کر گزرتا ہو۔

”انکل کا کمرہ.....“ وہ یوں بڑبڑائی جیسے خواب کی حالت میں ہو۔ اس کی نگاہیں خلا میں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔ ”اوہ..... اقبال، ہمیں..... ہمیں زاریہ کے کمرے کو چیک کرنا ہو گا۔“

”زاریہ کے کمرے کو..... مگر کیوں؟“

”وہی کمرہ پہلے انکل کے تصرف میں تھا۔ زاریہ نے بڑی ضد کر کے اس کمرے کو حاصل کیا تھا۔ میرے خیال میں اس کوٹھی میں آنے کے بعد سے زاریہ کو کمرہ دینے تک یعنی اب سے صرف سال بھر پہلے تک وہی کمرہ انکل کا تھا۔“ وہ انتہائی اضطراب میں بول رہی تھی۔
یوں لگ رہا تھا جیسے اسے بھی یقین ہو کہ تمہ خانہ اسی کمرے میں ہو گا۔
”مگر زاریہ نے وہ کمرہ کیوں لیا تھا؟“

”میں نے تمہیں بتایا تھا کہ زاریہ پڑھائی کی وجہ سے ہوٹل میں رہتی تھی۔ پچھلے برس جب اس کی نشے کی عادت کا پتا چلا تو میں اسے یہاں لے آئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ پابندی اور علاج کے بعد اپنی یہ عادت چھوڑ دے گی۔ یہاں آنے کے بعد جب اس نے دیکھا کہ انکل کے کمرے کی ایک کھڑکی اور ایک دروازہ باہر کی جانب بھی کھلتا ہے یعنی اس حصے کی جانب جہاں کوٹھی سے باہر جانے کا پچھلا دروازہ بھی ہے تو اس نے ضد شروع کر دی کہ اسے انکل والا کمرہ دیا جائے۔ اس وقت میں بھی نہیں سمجھی تھی کہ وہ ایسا کیوں چاہتی ہے مگر ایک روز جب میں نے اس کی ایک دوست کو سب سے چھپ کر اندر آتے دیکھا تو میں سمجھ گئی کہ زاریہ نے ایسا کیوں کیا ہے۔ اسی روز میں نے کوٹھی کے پچھلے گیٹ کے علاوہ زاریہ کے کمرے کا وہ دروازہ بھی لاک کر دیا تھا۔ مجھے یاد ہے اقبال! کہ انکل نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ زاریہ اپنی ضد سے باز آجائے مگر وہ تو نشے کے لیے پاگل ہو رہی تھی مجبوراً انکل کو اس کی ضد کے آگے جھکنا پڑا تھا۔ مجھے سو فی صد یقین ہے اقبال کہ.....“

”اگر ایسا ہے میڈم تو آپ کا یہ یقین درست ہے، ہم سب سے پہلے اسی کمرے کو چیک کریں گے۔“

”ٹھیک ہے چلو..... زاریہ تو بے خبر سوچکی ہو گی۔“ فاریہ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”اور بیگ صاحب کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟“

وہ ٹھٹھک کر رک گئی۔ ”آں..... تمہارا خیال ہے کہ.....“

”جی..... مجھے یقین ہے میڈم۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو.....“ اس نے پُرسوج انداز میں کہا۔ ”میں انہیں چیک کروں!“

اس نے پوچھا۔

”آپ ٹھہریں میں دیکھتا ہوں۔“ میں نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ سلطان نے بھی قدم بڑھایا تھا مگر میں نے اسے وہیں رکنے کو کہا اور خود تیزی سے باہر آ گیا۔

بیگ صاحب کے کمرے کی طرف جانے کے لیے مجھے پہلے اس راہداری سے گزرنا تھا جس میں یعقوب اور ماسی میراں کے کمرے تھے، پہلے وہ کمرہ آتا تھا جس میں ماسی اور سوہنی تھیں پھر ایک کمرہ اور تھا جو غالباً خالی تھا۔ پھر فاریہ کا کمرہ تھا اور انتہائی کونے میں زاریہ کا کمرہ تھا۔ زاریہ کے کمرے کے بالکل سامنے والا کمرہ بیگ صاحب کا تھا۔ میں نے دور ہی سے دیکھ لیا تھا کہ بیگ صاحب کے کمرے میں اندھیرا ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ سوچکے ہوں گے۔ ہم سے غلطی ہو چکی تھی کہ ہم تمہارے خانے کا ذکر ان سے کر چکے تھے۔

میں بڑی احتیاط سے چل رہا تھا تاکہ میرے قدموں کی آہٹ نہ ہو۔ میں دبے پاؤں ان کے کمرے کی کھڑکی کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ کھڑکی میں باریک جالی کے پردے پڑے تھے اس لیے مجھے اندر کا منظر دیکھنے میں دشواری نہ ہوئی۔ وہ نہ صرف یہ کہ جاگ رہے تھے بلکہ حیرت انگیز طور پر چاق و چوبند تھے اور کسی مضطرب شیر کی طرح ٹہل رہے تھے۔ ان کی حالت دیکھ کر میرا یہ شک یقین میں بدل گیا کہ بیگ صاحب اس تمہارے خانے سے واقف بھی ہیں بلکہ عین ممکن تھا کہ اس تمہارے خانے میں محفوظ دستاویزات میں ان کے خلاف بھی کچھ ہو۔

ان حالات میں ہمارا کام پہلے سے دشوار ہو گیا تھا کیوں کہ اب ہمیں صرف جمال اور زید کا خطرہ ہی نہیں تھا بلکہ بیگ صاحب ہمارے لیے زیادہ بڑا خطرہ ثابت ہو سکتے تھے۔ زید اور جمال کو تو شاید دستاویزات کی تلاش میں دشواری ہوتی مگر بیگ صاحب کا معاملہ بالکل مختلف تھا۔ میں پریشان صرف اس بات سے تھا کہ فاریہ کو یہ یقین ہو جانے کے بعد کس قدر پریشانی ہو گی کہ بیگ صاحب کی حیثیت اب جمال، زید اور بہادر سے مختلف نہیں رہی۔

میں وہیں دبا کھڑا رہا۔ میری نگاہیں اب بھی کھڑکی پر جمی ہوئی تھیں جہاں سے بیگ صاحب صاف نظر آ رہے تھے۔ اچانک وہ ٹٹلتے ٹٹلتے رک گئے۔ انہوں نے ایک نظریہ دنی دروازے پر ڈالی پھر آگے بڑھے۔ میں چونکا ہوا گیا۔ میرا خیال تھا کہ اب وہ باہر آجائیں گے مگر یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ انہوں نے دروازے کو لاک کیا اور پھر پلٹ کر اپنے بیڈ کے قریب آ گئے۔ ان کے چہرے پر عجیب وحشت کے سے آثار تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ شدید

اضطراب میں ہوں اور فیصلہ نہ کر پا رہے ہوں کہ اب انہیں کیا کرنا چاہیے۔

میں چند لمحوں وہیں کھڑا رہا۔ پھر میں نے واپس جانے کا فیصلہ کیا اور پلٹنے ہی والا تھا کہ انہیں بیڈ کے نیچے جھانکتے دیکھ کر وہیں تھم گیا۔ اب وہ بیڈ کے قریب کارپٹ پر بیٹھ گئے تھے۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ تمہارے خانے کا راستہ یہیں موجود ہے اور شاید وہ تمہارے خانے میں ہی جانا چاہتے ہیں۔ میں اب بالکل الرٹ تھا اور ان کے تمہارے خانے میں چلے جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ مگر کافی دیر انتظار کے بعد بھی وہ وہیں بیٹھے بیڈ کے نیچے کچھ ٹٹولتے رہے، وہ کیا چیز دیکھ رہے تھے، میری نگاہوں سے او جھل تھا کیوں کہ ان کی پشت میری طرف تھی۔ میں حیران تھا کہ وہ آخر وہاں کیا کر رہے ہیں؟ تقریباً پانچ چھ منٹ گزر جانے کے بعد وہ اٹھے تو ان کے ہاتھ میں چمڑے کا ایک تھیلیا سا تھا۔ غالباً اس تھیلے کو انہوں نے کارپٹ کے نیچے چھپایا ہوا تھا۔

وہ کچھ دیر اسے لیے کھڑے رہے پھر انہوں نے وہ تھیلیا اپنے بیڈ کے گدے کے نیچے رکھ لیا۔

عین اسی لمحے میں اچھل پڑا۔ کسی نے میری پشت پر ہاتھ رکھ دیا تھا، پلٹ کر دیکھا تو فاریہ تھی۔ وہ شاید اتنی دیر گزر جانے پر پریشان ہو کر مجھے دیکھنے آئی تھی۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس نے سر ہلایا اور کچھ آگے بڑھ کر کھڑکی سے اندر جھانکنے لگی۔ میں نے دیکھا کہ بیگ صاحب بستر پر لیٹ چکے تھے، ہلکے نیلے رنگ کے بلب کی روشنی میں ان کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔

”کیا بات ہے؟“..... فاریہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سرگوشی میں پوچھا۔ ظاہر ہے اس نے کچھ دیکھا ہی کب تھا۔

میں نے اسے واپس چلنے کا اشارہ کیا اور اسی طرح دبے پاؤں ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ فاریہ میرے پیچھے تھی۔ ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئے۔ میں نے دروازے کو اندر سے لاک کر دیا۔ میری اس حرکت کو فاریہ نے بڑے غور سے دیکھا، اس کے چہرے پر الجھن کے آثار تھے جبکہ سلطان کسی صورت کی طرح بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی۔

”کیا بات ہے اقبال، تمہیں وہاں اتنی دیر کیوں ہوئی؟“

فاربیہ کے پوچھنے پر میں نے اسے وہ سب کچھ بتا دیا جو میں نے کچھ دیر پہلے دیکھا تھا۔
”تمہارے خیال میں وہ کیا ہو سکتا ہے؟“

”ممکن ہے یہ وہی دستاویزات ہوں جن کی تلاش میں جمال یہاں تک پہنچا تھا۔“

”اگر یہ وہی دستاویزات ہیں تو پھر تمہ خاں میں رکھے اس صندوق میں کیا ہے؟ جب دستاویزات ایک چھوٹے سے تھیلے میں آسکتی ہیں اس کے لیے صندوق کی کیا ضرورت ہے اقبال..... یہ تمہ خاں اور صندوق والی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔“

”میڈم جو کچھ بھی ہے بہت جلد سامنے آجائے گا۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں سوچنا چاہیے۔“

”نہیں میرے خیال میں تو اب ناشتا کر لینا چاہیے۔“ سلطان نے بھونڈے انداز میں طنز کیا۔

میں نے وال کلاک پر نظر ڈالی، وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا، صبح کے چار بج کر بائیس منٹ ہو رہے تھے۔

”ٹھیک ہے اقبال، تم بھی تو بہت تھکے ہوئے ہو گے۔ جاؤ سو جاؤ، صبح دیکھا جائے گا۔“ فاربیہ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا اور میں اور سلطان اسے خدا حافظ کہہ کر اپنے کمروں کی طرف چل پڑے۔

اگلی صبح میری آنکھ بہت دیر بعد کھلی، کسی نے مجھے اٹھایا نہیں تھا، شاید اسی لیے کہ فاربیہ نے منع کر دیا ہو گا، وہ جانتی تھی کہ میں نے کراچی سے لاہور تک کا سفر کن اذیتوں اور عذابوں سے طے کیا ہے۔ مجھے تو یہاں پہنچ کر بھی چین نہیں ملا تھا اور پھر ساری رات ہی آنکھوں میں کٹ گئی تھی۔ بہر حال میں نے اٹھتے ہی ہاتھ روم کا رخ کیا اور جی بھر کر نہایا۔ واٹر ہی تو رات ہی صاف کر چکا تھا۔ نہادھو کر میں آدھے گھنٹے میں تیار ہو گیا۔ دن کے سوا گیارہ بج چکے تھے۔ مجھے بھوک تو بالکل نہیں تھی البتہ چائے کی شدید طلب تھی۔ میں سیدھا کچن کی طرف بڑھ گیا۔ حمیدہ بی بی وہاں موجود تھی۔

”حمیدہ بی بی تمہارا داماد کہاں ہے؟“ اسے دیکھ کر مجھے رحتے یاد آ گیا۔

”جی وہ اپنے چاچا کے گھر چلا گیا تھا۔“

”اس کا چاچا بھی یہاں رہتا ہے؟“

”جی ہاں پر وہ اس کا پتا نہیں جانتا تھا۔ اس کا چاچا یہاں پوسٹ آفس میں کام کرتا ہے۔ میں نے اسے یہاں نہیں روکا بلکہ اس کے چاچا کو فون کر کے بلا لیا تھا۔ وہ اسی کے ساتھ چلا گیا۔“

”اچھا ایک کپ چائے تو دو۔“

”جی چائے تو میں ڈائٹنگ روم میں رکھ آئی ہوں۔ فاربیہ بی بی بھی ابھی اٹھی ہیں۔ آپ وہیں ناشتا کر لیں۔“

”ٹھیک ہے.....“ میں ڈائٹنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں فاربیہ کے علاوہ بیگ صاحب بھی موجود تھے۔ وہ مجھ دیکھ کر کھل اٹھے۔

”آؤ بیٹا کیا حال ہے؟“

”ٹھیک ہوں بیگ صاحب، آپ سنا ئے۔“ میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
”بیٹا تم ہماری وجہ سے بڑی پریشانیوں میں گھر گئے ہو۔ پتا نہیں تمہاری ماں کا کیا حال ہے کچھ اس کی خبر نہ لی ہے یا نہیں؟“

ان کے جملے کے آخری حصے نے مجھے ہی نہیں فاربیہ کو بھی چونکا دیا تھا صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ مجھے ماں کی یاد دلا کر یہ احساس دلانا چاہ رہے ہیں کہ اب مجھے اسی کی فکر کرنا چاہیے، دوسرے معنوں میں مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔

”وہ..... خیریت سے ہیں بیگ صاحب..... مجھے اطلاع مل چکی ہے۔ ممکن ہے وہ بھی جلد یہاں پہنچ جائیں۔“ میں نے جھوٹ بولا۔ اس کے سوا میرے پاس کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

”ہوں..... گویا فاربیہ کو ایک کمر اور تیار کرنا چاہیے۔“

ان کا یہ طنز زہر میں بجھے تیر کی طرح میرے سینے میں پیوست ہو گیا مگر اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا فاربیہ بول اٹھی۔

”نہیں انکل، اقبال کا فلیٹ موجود ہے، اسے تو میں نے ہم سب کی حفاظت کے خیال سے روک رکھا تھا۔ ویسے آج آپ کچھ عجیب سی باتیں نہیں کر رہے ہیں۔“

”نہیں میرا مطلب یہ تھا بیٹا کہ اقبال کی اپنی زندگی بھی تو ہے، یہ بے چارہ ہم لوگوں کی خاطر کہاں تک خود کو خطرے میں ڈالے رہے گا، میں تو چاہتا تھا کہ یہ کیس معقول کام وغیرہ

کر کے اپنا گھر بسائے ماں کو لے کر آئے، زندگی کی رنگینیوں کو محسوس کرے بالکل اسی طرح جس طرح اس کی عمر کے دوسرے لوگ محسوس کرتے ہیں۔ یہ زیادتی ہے بیٹا کہ ہم نے اسے یہاں محصور کر رکھا ہے، محض اس لیے کہ یہ ہماری بد قسمتی سے لڑتا رہے۔“

”انکل معاف کیجئے گا، شاید آپ بھول گئے کہ یہ معقول جاب پر ہی ہے اور اسے ملازم رکھنے والے آپ ہی ہیں، ہاں یہ الگ بات ہے کہ میں نے اس عارضی جاب کو مستقل کر دیا ہے اور کچھ مزید ذمے داریاں بھی اس پر ڈال دی ہیں لیکن ان ذمے داریوں کا معقول معاوضہ بھی دوں گی۔ بہر حال اقبال اب میری ذمے داری ہے آپ اس معاملے میں خود کو پریشان نہ کریں۔ آپ کی صحت پہلے ہی ٹھیک نہیں ہے۔“ فاریہ کے لہجے میں ناگواری کا تاثر واضح تھا۔

میں اس وقت خود کو عجیب احمق تصور کر رہا تھا۔ بیگ صاحب کے رویے نے میرے احساسات کو زبردست ٹھیس پہنچائی تھی۔ جی تو چاہتا تھا ابھی اسی وقت سوہنی اور ماسی میرا اور سلطان کو لے کر اس کوٹھی سے نکل جاؤں، مگر فاریہ کی آنکھوں میں تیرتی التجائے میرے قدم تھام لیے تھے۔ میں نے بہت جلد خود کو اس جذباتی کیفیت سے نجات دلا دی اور اپنی اس غیرت کو تھپک کر سلا دیا جس نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا لیکن ایک بات میرے دل و دماغ میں بیٹھ گئی کہ اب مجھے جلد از جلد اس چکر کو ختم کر کے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ بیگ صاحب سے میری تمام ہمدردیاں تو اسی وقت ختم ہو گئی تھیں جب میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ تمہ خانے کے راز سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ وہ فاریہ کے چچا ہونے کے باوجود اسے نقصان پہنچا رہے ہیں۔ مجھے یہ یقین ہو چکا تھا کہ بہادر کے ساتھ ہی بیگ صاحب بھی فاریہ اور زاریہ سے کسی ایسی بات کا انتقام لے رہے ہیں جس سے فاریہ اور زاریہ دونوں نادان واقف ہیں۔

ہم نے بو جھل فضا میں ناشتا کیا اور وہاں سے اٹھ گئے۔ بیگ صاحب غالباً اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔ میں فاریہ سے اجازت لے کر سوہنی کے کمرے کی طرف چلا گیا اور فاریہ وہیں بیٹھی کچھ سوچتی رہ گئی۔ سوہنی کی آنکھیں چمک رہی تھیں، اس کے چہرے پر صحت مندی کے آثار تھے جسے دیکھ کر مجھے بے حد اطمینان ہوا تھا۔ ماسی بھی آج کچھ خوش نظر آ رہی تھی۔ شاید سوہنی کی سنبھلی ہوئی حالت دیکھ کر خوش تھی۔

”بالے..... آج مجھے گھمانے لے چلے گا نا؟“ سوہنی نے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں..... تم ٹھیک تو ہونا؟“ میں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں بالے، اب میں اچھی ہو گئی ہوں۔ تو بھتا..... کب لے کے چلے گا؟“

”بس تیار ہو جاؤ، چلتے ہیں۔“

میری بات سن کر وہ یوں بستر سے اچھل کر کھڑی ہوئی کہ میں اور ماسی میراں دھک سے رہ گئے۔ اس کے اچھلنے سے اس کے گورے پیروں میں پڑی پائل کی چھنکار پورے کمرے میں پھیل گئی۔ پائل کی اس چھنکار نے گویا مجھے کسی اور ہی دنیا میں پہنچا دیا۔ کچھ دیر پہلے کی کیفیت اور طبیعت کا بو جھل پن بھاپ بن کر غائب ہو گیا اور میں نے خود کو زندگی سے بہت قریب محسوس کیا۔

”بالے..... زاریہ کو بھی لے لیں اور آپنی کو بھی۔“

”ٹھیک ہے اگر تم چاہتی ہو تو ان سے پوچھ لو۔“ میں نے اسے اجازت دے دی تو وہ فوراً ہی کمرے سے باہر چلی گئی۔

میں قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میری نگاہیں ماسی میراں کی خاموش نگاہوں سے ٹکرائیں تو میرے بدن میں سنسنی سی پھیل گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے ماسی کی آنکھوں سے سردی لہریں اٹھ کر میرے وجود میں داخل ہو رہی ہوں۔

”ماسی..... میں نے دھیرے سے اسے پکارا۔“

”ہوں.....“ وہ چونک اٹھی۔ ”ہاں پتہ..... تجھے تو پتا چل گیا ہو گا نا کہ..... کہ میری سوہنی.....“

”بس ماسی..... میں تڑپ کر آگے بڑھا اور اس کے لرزتے ہوئے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔“ ماسی آگے کچھ نہ کہنا..... کچھ بھی نہیں ماسی..... اگر اس نے سن لیا تو وہ پہلے ہی.....“

”میں جانتی ہوں پتہ، اسی لیے تو سینے پر ہل رکھ لی ہے، تو آیا ہے تو اس کے چہرے پر رونق لگتی ہے پتہ..... رب کرے یہ رونق یونہی رہے..... رب کرے پتہ.....“

”ماسی..... شاید وہ آ رہی ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا ماسی، تو صبر کر.....“

میں نے جلدی سے کہا کیوں کہ میں آتے ہوئے قدموں کی آہٹ سن رہا تھا۔

”میرا خیال صحیح تھا وہ سوہنی اور زاریہ تھیں۔ میں نے زاریہ کو غور سے دیکھا۔ وہ تو

ماشاء اللہ کافی صحت مند ہو گئی تھی۔ بالکل نہیں لگتا تھا کہ یہ وہی زاریہ ہے جسے میں نے پہلے دیکھا تھا۔

”میں نے سنا ہے کہ آج آپ ہم سب کو گھمانے پھرانے، تفریح کرانے لے جا رہے ہیں!“ وہ چمکی۔

”غلط سنا آپ نے، میں صرف گھمانے لے جا رہا ہوں، باقی سارے کام آپ خود ہی کر لیجئے گا۔“

میری بات پر سوہنی اور زاریہ دونوں ہنس پڑیں۔ اسی وقت فاریہ کمرے میں داخل ہوئی، اس کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی۔ میں اسے دیکھتے ہی مودب ہو گیا۔ اس وقت اس کی شخصیت میں وہی رعب اور دبہہ تھا جسے میں نے شروع میں محسوس کیا تھا۔

”اقبال، تم بڑی دین لے جانا۔ میں نے فیکٹری سے منگوائی ہے۔“

”میڈم آپ نہیں چلیں گی؟“

”کیا انکل کو یہاں تنہا چھوڑنا عقل مندی ہے؟“ اس نے الٹا مجھ سے سوال کر لیا۔

”اوہ..... آئی سی..... آئی ایم سوری میڈم میں بھول گیا تھا۔“

”کوئی بات نہیں..... تم فکر نہ کرو میں اور سلطان یہاں رہیں گے۔“ اس نے فوراً ہی جواب دیا۔

”نہ پتہ تو بھی چلی جا..... سلطان تو ہے ان کے پاس۔“ ماسی نے کہا۔

”نہیں ماسی..... میں تھکی ہوئی بھی بہت ہوں۔ اس طرح کچھ دیر آرام بھی کر لوں گی۔“

”میڈم ٹھیک کہتی ہیں ماسی! چلیں۔“ میں نے جلدی سے کہا اور کھڑا ہو گیا۔

سوہنی اور زاریہ پہلے ہی تیار تھیں۔ ہم چند منٹ بعد ہی کوٹھی سے نکل گئے۔ حمیدہ بی بی نے فاریہ کی ہدایت پر گاڑی میں ضرورت کی ہر چیز رکھ دی تھی، کھانا، پانی کا کور، برتن، فروٹ ہر چیز تھی۔ میں ان لوگوں کو لے کر نکل تو گیا تھا مگر ذہن الجھا ہوا تھا میں خود محسوس کر رہا تھا کہ میں کسی کے ساتھ انصاف نہیں کر رہا ہوں، نہ سوہنی کے ساتھ نہ فاریہ کے ساتھ۔ سوہنی کے ساتھ تھا تو مجھے فاریہ اور اس کی پریشانیاں ستا رہی تھیں اور فاریہ کے ساتھ ہوتا تھا تو سوہنی کی یاد تروتپاتی تھی۔

اس روز میں سوہنی کو گھمانے اور اسے دنیا دکھانے لگا تھا۔ وہ بے حد خوش تھی اور اسے دیکھ کر میں بھی خوش تھا مگر ذہنی الجھنیں پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھیں۔ ہم سارا دن گھومتے رہے۔ راوی کے کنارے ایک گھنے پیڑ تلے ہم نے کھانا کھایا۔ میں سوہنی سے بہت سی حسین اور پیار بھری باتیں کرنا چاہتا تھا مگر ماسی میراں اور زاریہ کی موجودگی میں یہ ممکن نہ تھا۔ بس اسے خوش دیکھ کر خوش ہوتا رہا۔ سورج نے مغرب کی طرف ڈوبنا چاہا تو میں نے گاڑی کا رخ گھر کی طرف موڑ لیا۔ اب میرے سر پر پھر تمہ خانہ سوار ہو گیا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ آج اس کام کو انجام تک پہنچا کر ہی دم لوں گا۔ ویسے آج مجھے جمال وغیرہ کی طرف سے بھی خطرہ تھا۔ اسے پورا ایک دن مل چکا تھا۔ اب تک اس نے کوئی نہ کوئی پلاننگ کر لی ہو گی۔ اسی خیال نے مجھے پریشان کیا ہوا تھا۔

میں گھر پہنچا تو فاریہ حسب توقع بیگ صاحب کے کمرے میں تھی۔ سلطان مجھے باہر ہی مل گیا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے آنکھ سے اشارہ کیا۔ میں نے سوہنی وغیرہ کو اندر جانے کو کہا۔ وہ لوگ اندر داخل ہو گئے تو میں سلطان کے پاس آ گیا۔

”ہوں..... خیریت؟“

”ہاں بالے، باقی سب تو خیر ہے پر دیکھ لے میں نے کہا تھا کہ تُو جاو گروں میں پھنس گیا ہے۔ مجھے پہلے روز ہی سے یہ سب کچھ ٹھیک نہیں لگا تھا مگر تُو نے میری بات نہیں مانی تھی الٹا ہم سب کو یہاں لا کر پھنسا دیا ہے۔“

”بات کیا ہے سلطان، مجھے صاف صاف معاملے کی بات بتا!“ میں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

”معاملے کی بات یہ ہے بیٹا کہ تیرے بیگ صاحب ہم سب کے یہاں اکٹھا ہونے پر ناراض ہیں۔ فاریہ سے جھگڑا ہوا ہے ان کا۔“

”ٹھیک ہے تُو ایسا کر کہ..... اپنا سامان باندھ لے، میں سوہنی اور ماسی میراں کو تیار کرواتا ہوں۔ تُو ان دونوں کو لے کر اپنے گھر چلا جا۔“

”تُو بھی چل بالے..... تُو یہاں کب تک ذلیل ہوتا رہے گا، ان لوگوں کے لیے تُو نے اپنی جان جو کھوں میں ڈال دی پر ان لوگوں نے تجھے کیا بدلہ دیا۔“

”ہاں..... میں بھی چلوں گا۔“ میں نے پُر عزم انداز میں جواب دیا۔ سلطان میرے

گئے۔ فاریہ کا چہرہ تو بالکل ہی پیلا ہو گیا۔ ”یہ..... یہ سب کیا ہے اقبال؟“
 ”کیا آپ لوگ جا رہے ہیں؟“ میرے جواب دینے سے قبل ہی زاریہ بول اٹھی۔
 ”ہاں زاریہ، ہم لوگ جا رہے ہیں۔ کوئی غلطی ہو تو معاف کر دینا۔“ میں نے جواب دیا۔
 ”اقبال..... کیا بے وقوفی ہے؟“ فاریہ نے ناراض لہجے میں پوچھا۔

”نہیں میڈم..... بے وقوفی نہیں بلکہ عقل مندی ہے۔ اب سے پہلے میں جو کچھ کرتا رہا وہ مستینا بے وقوفی تھی..... بیک صاحب نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ میں بھلا چند روپوں کے لیے اپنی اور اپنے خاندان کی زندگیاں کیوں خطرے میں ڈالوں۔ جو احسانات آپ لوگوں نے مجھ پر کئے ہیں میں نے حتی المکان اتارنے کی کوشش بھی کی ہے، مگر میں یہاں تمام زندگی تو بیٹھا نہیں رہ سکتا۔ نہ معلوم میری ماں کس حال میں ہو گی۔ میں اب اس کی جدائی برداشت کرنے کو تیار نہیں، میں..... میں گاؤں جا رہا ہوں، اسے وہاں سے لے کر آؤں گا پھر..... ایک نئی زندگی کا آغاز کروں گا میڈم..... اور مجھے امید ہے کہ آپ مجھے میری نئی زندگی گزارنے پر مبارک باد دیں گی۔“

”اقبال.....!“ فاریہ رو ہانسی ہو گئی۔ ”اقبال“ یہ بھی ٹھیک ہی ہے کہ تم بھلا ہم لوگوں کے لیے کیوں خطرات سے کھیلو گے، تمہاری اپنی زندگی ہے..... اپنی دنیا ہے، اس دنیا میں ابھی ایسے لوگ ہیں جو تمہیں چاہتے ہیں، تمہاری زندگی کے لیے دعا گو ہیں..... میں..... میں بھی دعا کروں گی۔ جاؤ..... اور ہم سب کو بھول جانا..... ہمارا تم سے کوئی بھی تو رشتہ نہیں.....“ یہ کہتے کہتے وہ رو پڑی مگر پھر فوراً ہی اس نے خود کو سنبھال لیا۔ ”آخری بار ہمارے ساتھ چائے پیتے جاؤ۔“ اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ میں نے اس کی اس خواہش کا احترام کیا اور ہم ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ فاریہ نے حمیدہ کو بلا کر چائے کے لیے کہا۔

اس کی حالت دیکھ کر میرا دل خون ہو رہا تھا مگر میری تمام تر توجہ بیک صاحب کے چہرے پر تھی جس پر اس وقت کافی اطمینان پھیلا ہوا تھا۔ ماسی میراں میرے رویے پر حیران بھی تھی اور دکھی بھی، سلطان کے بارے میں، میں کچھ اندازہ نہیں کر پا رہا تھا کہ وہ خوش ہے یا غمگین، کچھ دیر بعد حمیدہ چائے لے آئی، اس کا چہرہ بھی سوالیہ بنا ہوا تھا مگر لب کھولنے کی ہمت نہیں

تھی کہ سب کی موجودگی میں کچھ پوچھتی۔ وہ چائے رکھ کر حیران حیران سی چلی گئی۔ ہم سب نے گہری خاموشی کے درمیان چائے پی۔ چائے ختم ہوتے ہی میں کھڑا ہو گیا۔
 ”چلو میں تم لوگوں کو چھوڑ آؤں۔“ فاریہ نے بچھے ہوئے لہجے میں کہا۔
 ”تھینک یو میڈم..... ہم چلے جائیں گے۔“ میں نے جواب دیا۔
 ”اقبال..... یہ میری خواہش ہے۔“

”سوری میڈم.....!“ میں نے اس کی جانب دیکھ کر بغیر کما اور تیزی سے ڈرائنگ روم سے آ گیا۔

”اقبال.....“ بیک صاحب مجھے پکارتے ہوئے باہر آ گئے۔ ”فاریہ پہنچا دے گی بیٹا۔“

”نہیں بیک صاحب، ہم چلے جائیں گے۔“

پھر میں رکا نہیں۔ سیدھا کوشی سے باہر آ گیا۔ میرے پیچھے سلطان، ماسی اور سوہنی تھے میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا کہ مجھ میں پلٹ کر دیکھنے کی تاب بھی نہ تھی۔ ہم کوشی سے باہر آنے کے بعد مین روڈ کی طرف چلے پڑے۔ مین روڈ پر ہمیں ٹیکسی مل گئی۔ میں نے ٹیکسی والے کو کرشن نگر کا پتا بتایا اور پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ محض آدھ گھنٹے کے بعد ہم سلطان کے گھر پہنچ گئے۔ اس وقت رات کے تقریباً آٹھ بجے تھے۔ سلطان نے کھانے کا بندوبست کیا، ماسی میراں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی اور نہ ہی سوہنی مجھ سے کچھ بولی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ دونوں مجھ سے ناراض ہیں۔ میں نے بھی صفائی پیش کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ ویسے میں بھی آئندہ کے بارے میں کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ اس لیے بستر پر آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔

مجھے جو کچھ کرنا تھا آج ہی رات کرنا تھا۔ آج کی رات بے حد اہم تھی۔ اب گھر میں بیک صاحب کے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا اس لیے وہ ان اہم دستاویزات کو وہاں سے ہٹا سکتے تھے کیوں کہ وہ بھی یہ بات خوب سمجھتے تھے کہ جمال اور زید ان دستاویزات کو حاصل کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔ مجھ سے تو ان کی جان ان کے تئیں چھوٹ گئی تھی مگر جمال اور زید تو مجھ سے بھی بڑا خطرہ تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ فاریہ اب بھی ان کی نگرانی کر پائے گی یا نہیں۔ مجھے اس سے کسی بے وقوفی کی امید تو نہیں تھی مگر ممکن تھا میرے اس طرح چلے آنے پر وہ جذباتی ہو جائے اور بیک صاحب کی مصروفیت پر نظر نہ رکھ سکے۔

میں چلتے ہوئے یعقوب سے بھی نہیں مل سکا تھا۔ جس کا مجھے بعد میں احساس ہوا،
بہر حال جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا۔

وقت گزر رہی نہیں رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے پوری کائنات ختم گئی ہو، کوئی آواز، کوئی آہٹ
اور کوئی حرکت نہ تھی۔ سوہنی چپ چاپ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ ماسی میراں پلنگ پر
آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی اور سلطان گھر سے باہر جا چکا تھا۔ میرا دل گھبرانے لگا۔ میں اٹھ کر
باہر چلا آیا۔ سیڑھیاں اتر کر میں گلی میں نکل آیا تو مجھے کچھ زندگی کا احساس ہوا۔ بازار میں اچھی
خاصی رونق تھی۔ ٹریفک چل رہا تھا اور گلی میں بچے بھاگ رہے تھے۔

میں ٹھلٹا ہوا بازار میں آگیا۔ میرے اندر اتنا سناٹا تھا کہ باہر کا شور بھی اسے ختم کرنے
میں ناکام ہو گیا تھا۔ بالکل ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کوئی خاموش فلم دیکھ رہا ہوں یا میری
سماعت ختم ہو چکی ہو کہ مجھے لوگوں کے ہلنے ہوئے ہونٹ دکھائی دے رہے تھے مگر آواز نہیں
آ رہی تھی۔ میں خواب کی سی کیفیت میں چلتا چلا گیا۔

”جی سر“؟ اچانک ایک آواز گونجی اور مجھے ہوش آگیا۔

”جی!“ میں نے حیران ہو کر کہا۔

”فون کرنا ہے آپ کو؟“ سامنے کھڑے نوجوان نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ میں نے
چونک کر اپنے گرد نگاہ ڈالی۔ میں پی سی او میں کھڑا تھا۔ سامنے کاؤنٹر پر تین فون رکھے تھے جن
میں سے دو پر بات ہو رہی تھی۔

”جی..... جی ہاں..... تھینک یو“۔ میں نے بوکھلا کر جواب دیا اور فون اپنی
جانب سرکا لیا۔ میں نے نمبر ڈائل کیا اور ریسیور کو کان سے لگا لیا۔

”ہیلو!“ دوسری جانب سے فاریہ کی بھرائی ہوئی آواز سن کر میں سناٹے میں رہ گیا۔ میں
نے لاشعوری طور پر فاریہ کا نمبر ڈائل کیا تھا۔

”ہیلو.....“ میرے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔

وہ شاید مجھے پہچان نہیں پائی تھی۔ ”ہیلو..... کون؟“ اس نے پوچھا۔

”نام نہیں لیجئے گا میڈم!“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”میں اقبال ہوں“ آپ کے قریب
کوئی اور تو نہیں؟“

”نہیں..... تم بولو۔“ مجھے پہچانتے ہی اس کا لہجہ بدل گیا۔

”میڈم..... یہ سب بہت ضروری تھا۔ آپ سمجھ رہی ہیں نا؟ آپ نظر رکھئے گا“ میں
آپ سے دور نہیں ہوں میڈم..... میں رات کو آؤں گا۔ بارہ بجے کے بعد، پچھلا دروازہ
کھلا رکھئے گا۔“

”اوہ..... تھینک یو..... تھینک یو ویری مچ.....“

”او کے خدا حافظ“۔ میں نے فوراً ہی کہا اور ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

فاریہ کو فون کر کے میرا جی ہلکا ہو گیا اور وہ جو طبیعت پر ایک بو جھل پن تھا وہ بھی ختم ہو
گیا۔ اب میں خود کو چاق و چوبند محسوس کر رہا تھا۔ میں پھر بازار میں نکل آیا..... اب وہ
پہلے والی کیفیت ختم ہو چکی تھی، میرے چاروں طرف آوازیں تھیں، شور تھا اور میں خود کو
کسی خاموش فلم میں نہیں بلکہ جاگتے انسانوں کے درمیان محسوس کر رہا تھا۔ میں نے گھڑی پر
نگاہ ڈالی پونے دس بجے تھے۔ میں نے بازار سے کچھ فروٹ خرید اور گھر کی طرف چل پڑا۔
گھر میں وہی ویرانی اور خاموشی طاری تھی۔ میرے پیچھے پر ماسی میراں اٹھ کر بیٹھ گئی۔
”روٹی کھالے پتر“ سلطان کب سے انتظار کر رہا ہے۔“

”ہاں ماسی..... اب تو بھوک بھی بہت لگی ہے۔“ میں نے کہا اور پھر دیوار سے نکلی
سوہنی کو مخاطب کیا۔ ”سوہنی تجھے کیوں پسند ہیں نا..... دیکھ میں تیرے لیے کیوں لایا ہوں اور
پکڑے بھی ہیں۔“ میرا خیال تھا کہ میرے لہجے کی تبدیلی گھر میں پھیلی ویرانی اور خاموشی کو
توڑ دے گی مگر یہ محض خام خیالی تھی۔ ماسی چپ چاپ کچن میں چلی گئی اور سوہنی نے لہجہ بھر کو
پلیکس اٹھا کر دیکھا تھا اور بس..... اتنا ہوا کہ اس کی آنکھوں میں بھری تمام کی تمام اداسی
میرے وجود میں اتر گئی۔

میں جھلا اٹھا۔ ”کیا مصیبت ہے؟ تم لوگوں کے چہروں پر بارہ کیوں بچ رہے ہیں؟ مجھے
کس بات کی سزا دے رہے ہو تم لوگ؟“ میرے ایک دم چیخ پڑنے پر سوہنی نے گھبرا کر
آنکھیں کھول دیں اور ماسی میراں لپک کر کمرے میں چلی آئی اس کے پیچھے سلطان بھی تھا۔
”کیا ہو گیا بالے؟“ سلطان نے پوچھا۔

”کچھ نہیں..... یار“ وہاں تھا تو مصیبت میں تھا یہاں آگیا ہوں تو ان دونوں کی
صورتیں یوں لگی ہوئی ہیں جیسے..... جیسے میں مر گیا ہوں۔“

”رب نہ کرے بالے۔“ سوہنی اور ماسی بے اختیار بول اٹھیں۔

”پھر..... پھر کیا ہو گیا، کیوں تم دونوں چپ ہو، کیا قیامت آگئی؟“ میں نے غصے سے پوچھا۔

”کچھ نہیں پتر..... اب دیکھو نا..... پانی گزرتا ہے تو جگہ گیلی ہو جاتی ہے، کچھ دیر بعد ہی تو سوکھتی ہے نا۔“

”اچھا اب بس کربالے.....“ سلطان نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔ ”تیرے اوپر تو آسیب کا سایہ ہو گیا۔“

میں خاموش ہو گیا اس وقت میرا دل غمگین ہوا تھا اس لیے میں نے زیادہ بات کرنا مناسب نہیں سمجھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ دونوں کیوں اداس ہیں مگر انہیں اپنے پروگرام کے بارے میں بتانے کا کوئی فائدہ بھی نہ تھا۔ مجھے خاموش دیکھ کر ماسی دوبارہ کچن میں چلی گئی کچھ دیر بعد واپس آئی تو اس کے ہاتھوں میں کھانے کے برتن تھے۔ سوہنی نے فرش پر دسترخوان بچھا دیا تھا۔ میں اور سلطان ہاتھ دھو کر وہاں بیٹھ گئے۔

کھانے کے دوران خاموشی رہی۔ میں مسلسل آئندہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اب مجھے یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ فاریہ نہ صرف یہ کہ مطمئن ہو گئی ہوگی بلکہ وہ بیگ صاحب پر نگاہ بھی رکھے گی۔ مجھے یقین تھا کہ فاریہ میرا تمام پروگرام سمجھ گئی ہوگی۔ کھانے کے بعد ہم نے چائے پی، چائے پینے کے دوران سوہنی نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے اس طرح فاریہ وغیرہ کو کیوں چھوڑ دیا تب میں نے اسے بتایا کہ بیگ صاحب کو ہم سب کا وہاں رہنا پسند نہیں تھا اس لیے مجھے وہ جگہ چھوڑنا پڑی البتہ میں فاریہ سے ناراض نہیں ہوں اور یہ کہ وہ جب چاہیں اس سے ملنے جاسکتی ہیں۔

میری بات سن کر وہ خوش ہو گئی اور میں نے ان دونوں کے چہرے کے تاثرات کو واضح طور پر بدلتے محسوس کیا اب میں کچھ ہلکا ہو گیا تھا۔ میں نے سلطان کو اپنے رات کے پروگرام کے بارے میں بتایا تو وہ ہونٹوں کی طرح مجھے دیکھتا رہا۔

”یعنی تو اس چکر سے نکلے گا نہیں؟“

”سلطان تو سمجھتا کیوں نہیں، میں نمک حرام نہیں ہوں کہ اس تنہا عورت کو یوں چھوڑ

دوں۔“

”نہ تو وہ تنہا کب ہے، اتنے تو گرگے پالے ہوئے ہیں اس نے۔ وہ جو توتہا رہا تھا کہ شہر

سے باہر ایک قلعہ ہے اور وہاں اس کے وفادار رہتے ہیں۔“

”ہاں سلطان وہ اس کے وفادار ہیں مگر میں نہیں جانتا کہ وہ سب اب کہاں ہیں اور فاریہ ان کو درمیان میں کیوں نہیں لارہی، یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے میں اس سلسلے میں اس سے کچھ نہیں کہہ سکتا اور دوسری بات یہ کہ مجھے تو خود کو دیکھنا ہے کہ میں اس کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ تو صرف مجھے اتنا بتا کہ میرا ساتھ دے گا یا نہیں؟“

”اچھا یار تو کتنا ہے تو ٹھیک ہے مگر کہے دیتا ہوں کہ یہ چکر تجھے برباد کر دے گا۔ تجھے تو اب صرف اور صرف سوہنی کا خیال کرنا چاہیے اقبال..... ڈاکٹر اس سے مایوس ہو چکے ہیں۔“

”مگر میں مایوس نہیں ہوں سلطان، مجھے خدا پر پورا بھروسہ ہے، وہ مجھ سے میری آخری خوش نہیں چھینے گا۔“

”رب تیری زبان مبارک کرے یار، چل اب کچھ دیر آرام کر لیں پھر تو رات کالی ہی کرنی ہے“ اس نے جہاں لیتے ہوئے کہا۔

وہ سچ کہہ رہا تھا۔ نہ معلوم رات کو کیا پیمائش ہو۔ یہ سوچ کر میں کچھ دیر کے لیے لیٹ گیا۔ ماسی اور سوہنی سونے کے لیے لیٹ چکی تھیں۔ سلطان میرے پلنگ پر ترچھا ہو کر لیٹ گیا۔ میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی رات کے پونے گیارہ بج چکے تھے ابھی ایک گھنٹا باقی تھا میں آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔

وقت بہت دھیمی رفتار سے گزر رہا تھا لمحہ لمحہ میرے سینے کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک نامعلوم سا خوف مجھے مضطرب کر رہا تھا میں زیادہ دیر لیٹ نہ سکا تو گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ میرے اٹھنے کی وجہ سے سلطان بھی اٹھ بیٹھا۔

”ہاں..... کیا ٹائم ہوا ہے؟“

”ٹائم تو کافی ہے سلطان مگر یہ تو بتا ہم اتنی رات کو وہاں تک جائیں گے کیسے؟“

”ابے ہاں..... یہ تو خیال ہی نہیں رہا۔ اچھا ٹھیک ہے تو انتظار کر میں منیر سے سوزوکی لے کر آتا ہوں۔“ اس نے جوتے پہنتے ہوئے کہا۔

میں نے اس سے کچھ نہیں پوچھا کہ وہ کس منیر کے پاس جا رہا ہے اور کہاں سے سوزوکی لائے گا مجھے تو یہ سن کر کافی اطمینان ہو گیا تھا کہ وہ گاڑی کا بندوبست کرنے جا رہا ہے۔ اس کے

پڑھے۔ ہم دونوں دیوار کے سائے میں چل رہے تھے جہاں اندھیرا گہرا تھا۔ پانچ منٹ بعد ہی ہم کو بھی کے پچھلے گیٹ کے قریب پہنچ گئے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ گیٹ اندر سے بند تھا۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ یا تو فاریہ کو موقع ہی نہیں ملا تھا یا پھر اس کے گیٹ کھول دینے کے بعد کسی نے پھر اسے بند کر دیا تھا۔ اگر ایسا ہی تھا تو یہ بات ہمارے لیے کافی خطرناک تھی۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ خود فاریہ بھی کسی کی نگاہوں میں تھی۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ ہم اندر کیسے داخل ہوں۔ دیوار کو دنا ہمارے لیے مشکل نہیں تھا مگر عین ممکن تھا کہ ہم اندر کودتے ہی دھرے جائیں۔ اس صورت حال نے مجھے پریشان کر دیا۔ میں سلطان کا ہاتھ پکڑ کر گاڑی کی طرف آگیا۔

”کیا ہو گیا؟“ اس نے پوچھا۔

میں نے ساری بات بتادی۔

”دیکھ پالے خطرہ مول لیا ہے تو وقت ضائع نہ کر، وقت ضائع کرنا خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے فاریہ خطرے میں ہو۔“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس کی بات سنتے ہی میں پھر کو بھی کی طرف چل پڑا۔ سلطان میرے ساتھ تھا۔ ہم اس جانب آگئے جہاں سے یعقوب کا کمر قریب تھا اور یہاں سے میں ایک بار پہلے بھی دیوار کو در اندر داخل ہو چکا تھا کیوں کہ کو بھی کے اندر دیوار کے قریب بجری کا ڈھیر تھا اور وہاں سے کودنا آسان تھا۔ میں نے پہلے سلطان کو سارا دے کر دیوار پر چڑھایا اور اس کے دوسری طرف کود جانے کے دو منٹ بعد میں بھی کسی نہ کسی طرح دیوار پر چڑھ گیا۔ اس کوشش میں میرے گھٹنے اور ہتھیلیاں زخمی ہو گئیں۔ دیوار سے میں نے بجری پر چھلانگ لگا دی۔ سلطان وہیں ایک کونے میں دبکا بیٹھا تھا اور اس کی نگاہیں اس راہداری پر تھیں جس کے آخر میں کچن تھا اور کچن کے سامنے جلنے والے بلب سے پھیلی ہوئی روشنی یہاں تک پہنچ رہی تھی۔

میں اور سلطان کچھ دیر وہیں دیکے رہے پھر میں دبے پاؤں یعقوب کے کمرے کی طرف بڑھا۔ اس کے دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ کمرے میں اندھیرا تھا مگر باہر سے آنے والی روشنی میں یعقوب کا خالی پلنگ صاف نظر آ رہا تھا۔ مجھے اس وقت اسے بستر پر نہ دیکھ

جانے کے بعد میں بھی ماسی سے دروازہ بند کر لینے کو کہہ کر نیچے چلا آیا۔ میں نے ماسی سے کہہ دیا تھا کہ میری یا سلطان کی آوازیں سن کر ہی دروازہ کھولے ورنہ بند ہی رکھے۔

میں نیچے آکر سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ گلی سنان تھی مگر گلی کے کونے پر پان کا کھوکھا کھلا ہوا تھا اور محلے کے کچھ نوجوان وہاں بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ مجھے دور تک سلطان نظر نہ آیا۔ ہوا میں خنکی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ ڈالی گیارہ بج کر پندرہ منٹ ہو رہے تھے۔ سلطان کو گئے تقریباً بیس منٹ ہو گئے تھے میں کھڑا ہو گیا۔ اب تک سلطان کو آجانا چاہیے تھے۔ میں نے فاریہ کو پچھلا گیٹ کھلا رکھنے کے لیے کہا تھا۔ وہ بارہ بجے گیٹ کھول دے گی اور میرا انتظار کرے گی جبکہ ہمیں اس کو بھی تک پہنچنے کے لیے بھی تقریباً آدھا گھنٹا چاہیے تھا۔

مجھے زیادہ پریشان نہیں ہونا پڑا اس لیے کہ عین اسی وقت دائیں جانب سے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔ وہ سلطان ہی تھا جو سوزو کی پک آپ لے کر آیا تھا۔ یہ بہت کھٹار سی گاڑی تھی مگر اس وقت تو یہ بھی بڑی غنیمت تھی۔ اس نے میرے قریب گاڑی روکی اور دروازہ کھول دیا۔ میں فوراً بیٹھ گیا۔

”وقت کم ہے سلطان جلدی کرو۔“

”سڑکیں سنان ہیں، ہم بیس منٹ میں پہنچ جائیں گے۔“ سلطان نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”تیرے پاس پستول ہے؟“ اس نے اچانک پوچھا۔

”ہاں..... میں نے اسے بڑی احتیاط سے رکھا ہوا تھا۔ ساتھ لایا ہوں، حالات کوئی بھی رخ اختیار کر سکتے ہیں سلطان، ہمیں ہر قسم کے حالات کے لئے تیار رہنا ہے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے بالے، مگر میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں، میں گاڑی کا پانا پکڑ لوں گا، تو میری فکر نہ کرنا۔“

”ہوں..... میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔“

سڑکیں واقعی سنان تھیں، کبھی کبھی کوئی ایکڑ کا گاڑی ہمارے قریب سے گزر جاتی تھی۔ سلطان کافی تیز رفتاری سے گاڑی چلا رہا تھا۔ ہم بائیں منٹ بعد ہی فاریہ کی کو بھی کے قریب پہنچ گئے۔ میں نے گاڑی کافی فاصلے پر روک لی تھی۔ میں کو بھی تک پیدل ہی جانا چاہتا تھا۔ سلطان نے گاڑی اندھیرے میں روک دی۔ میں اور سلطان گاڑی سے اتر کر کو بھی کی طرف

میں کسی نے پشت کی جانب سے مجھ پر حملہ کیا، کوئی وزنی چیز سر پر ماری تھی۔ میں بے ہوش ہو گئی۔ اس کے بعد جب آنکھ کھلی تو یہاں اس حالت میں پڑی ہوئی تھی۔ کسی اور کی موجودگی کو میں نے محسوس تو کیا تھا مگر میں یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ یعقوب ہے۔“ فاریہ نے اپنے پیروں میں الجھی ہوئی رستی کو کھولتے ہوئے بتایا۔ اس دوران میں، میں یعقوب کو رسیوں سے آزاد کرا چکا تھا۔

”یہ کتنی دیر کی بات ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”جانتا نہیں..... کچھ اندازہ نہیں ہے کہ میں کتنی دیر بے ہوش رہی۔“

”اچھا سنو یعقوب، تم چوکیدار کو الارٹ کر کے اپنے کمرے کی طرف سے کوٹھی کے پچھلے حصے کی جانب چلے جاؤ اور نظر رکھو اس طرف سے کوئی بھاگنے نہ پائے اور ہاں میں نے بیٹ صاحب کے کمرے کی طرف سلطان کو بھیجا ہے۔“ میری بات سنتے ہی یعقوب دبے پاؤں باہر نکل گیا۔

”آئیے میڈم.....“ میں نے آگے بڑھتے ہوئے سرگوشی کی۔

”سنو اقبال، میں قدیر کو فون کروں!“

”نہیں..... یہ وقت مناسب نہیں ہے اور نہ معلوم وہ کتنی دیر میں یہاں پہنچے۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

پھر ہم دونوں دبے قدموں زاریہ کے کمرے کی طرف بڑھے۔ میں بیگ صاحب کو بھی چیک کرنا چاہتا تھا اس لیے دیوار کی اس جانب تھا جس طرف بیگ صاحب کا کمرہ تھا۔ ہم چند ہی لمحوں بعد بیگ صاحب کے کمرے کی کھڑکی کے پاس پہنچ گئے میں نے اندر جھانکا اور اندر کا منظر دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ فرش پر سلطان بے حس و حرکت پڑا تھا اور بیگ صاحب اس کے ہاتھ باندھ رہے تھے۔ یہ منظر شاید فاریہ نے بھی دیکھ لیا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی حرکت کرتی میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”شش.....“ میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اسے لیے ہوئے دبے پاؤں زاریہ کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اندر ٹائٹ بلب جل رہا تھا۔ زاریہ بے خبر سو رہی تھی۔ میں نے فاریہ کو ہاتھ روم میں جانے کا اشارہ کیا اور خود کمرے سے باہر چلا آیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ بیگ صاحب کیا کرتے والے ہیں۔ توقع تو یہی تھی کہ وہ زاریہ کے کمرے کی طرف

کر سخت حیرت ہوئی اور خاص طور پر اس لیے کہ وہ زخمی تھا۔ میں فوراً ہی پلٹ کر سلطان کے پاس آ گیا جو یعقوب کے کمرے کی دیوار سے لگا دور نظر آنے والے برآمدے کو دیکھ رہا تھا۔

یعقوب کے بارے میں سن کر وہ بھی حیران ہوا۔ میں نے اسے دوسری جانب سے جلا کا اشارہ کیا اور خود اس برآمدے کی طرف بڑھ گیا جہاں ڈرائنگ روم کا بیرونی دروازہ تھا۔

برآمدے کے کونے پر پہنچ کر میں دیوار کی آڑ میں چھپا رہا۔ میں نے جھانک کر پہلا چاروں طرف دیکھا۔ دور تک کوئی نہ تھا چوکیدار بھی شاید اپنی کوٹھری میں تھا کیوں کہ اس کے کوٹھری نما کمرے کا دروازہ بند تھا۔ میں بہت دیر تک لان کے اندھیرے کونوں کو گھورتا رہا

مبادا وہاں کوئی چھپا ہوا ہو۔ جب مجھے کسی قسم کی کوئی آہستہ یا حرکت محسوس نہ ہوئی تب میں نے اللہ کا نام لے کر قدم آگے بڑھایا اور دیوار کے ساتھ دبے پاؤں چلتا ہوا ڈرائنگ روم کے دروازے کے قریب آ گیا۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ لاک تھا۔ میں کھڑکی کی جانب بڑھا کھڑکی

بھی بند تھی مگر ذرا سی زور آزمائی کے بعد میں کھڑکی کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔ کھڑکی کے ساتھ ہی صوفہ تھا۔ میں کھڑکی سے اندر داخل ہوا۔ صوفے پاؤں رکھنے کے بعد جب میں نے

دوسرا پاؤں زمین پر رکھنا چاہا تو میں کسی چیز سے ٹکرا کر منہ کے بل گر پڑا۔ گرتے ہی میں نے اپنے قریب عجیب سی آوازیں محسوس کیں۔ کمرے میں گہرا اندھیرے ہونے کی وجہ سے کچھ

دکھائی نہیں دے رہا۔ میں ہاتھوں سے ٹٹولتا ہوا آگے بڑھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ میں کس چیز سے ٹکرایا تھا۔ جلد ہی میں نے اسے پالیا۔ وہ کوئی انسانی جسم تھا جو رسیوں سے بری طرح جکڑا

ہوا تھا۔ میرے ہاتھ لگانے پر وہ کسمسایا۔ میں نے فوراً جب سے ماچس نکال کر تیلی جلائی اور اس کی روشنی میں یعقوب اور فاریہ کو جکڑا دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ ان دونوں کے منہ پر ٹیپ

لگے ہوئے تھے اور ہاتھ پاؤں رستی سے جکڑے ہوئے تھے۔

وہ دونوں ہوش میں تھے۔ روشنی ہوتے ہی دونوں نے دیکھا۔ ان دونوں کے چہرے پر خوشی پھیل گئی۔ میں نے جلدی سے پہلے فاریہ اور یعقوب کے ہونٹوں پر لگے ٹیپ ہٹائے۔

”اقبال جلدی کرو..... ورنہ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔“ ٹیپ ہٹتے ہی فاریہ نے سرگوشی کی۔

”یہ کس نے کیا تھا؟“ میں نے اس کے ہاتھ پیروں کی رستیاں کھولتے ہوئے پوچھا۔

”میں نہیں جانتی، کھانا کھانے کے بعد میں کچھ دیر لان میں ٹھہرنے لگی تھی۔ اس دوران

کیس، الماریاں اور بستر وغیرہ رکھے نظر آ گئے۔

یہ یقین ہونے کے بعد کہ کمرے میں کوئی موجود نہیں مجھے سخت حیرت ہوئی کیوں کہ چند لمحے پہلے میں اپنی آنکھوں سے بیگ صاحب کو اندر داخل ہوتے دیکھ چکا تھا۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ تمہ خانے کا رستہ سو فی صد یہیں موجود ہے۔ میں نے ہمت کر کے ماچس کی تیلی جلائی۔ روشنی ہوتے ہی میرے اس خیال کی تصدیق ہو گئی کہ کمرہ اسٹور روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ اسٹور کے طور پر استعمال ہونے والے اس کمرے میں کارپٹ بچھا ہوا تھا اور اس وقت ایک کونے سے کارپٹ اٹھا ہوا تھا جہاں سے لکڑی کا ایک تختہ اٹھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میں تیزی سے اس تختے کی طرف بڑھا میرا خیال صحیح تھا۔ قریب جاتے ہی مجھے وہ خلا نظر آ گیا جہاں سے سیڑھیاں نیچے کی طرف جارہی تھیں۔ اندر کہیں در سے ہلکی روشنی آتی محسوس ہو رہی تھی۔ سیڑھیاں لکڑی کی تھیں۔ میں نے بڑی احتیاط سے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا۔ سیڑھیاں خاصی مضبوط تھیں اس لیے کسی قسم کی آواز پیدا نہ ہوئی جس سے میری کچھ ہمت بڑھی اور میں آہستہ آہستہ نیچے اترتا چلا گیا مگر آخری سیڑھی سے کچھ پہلے ہی رک گیا۔ اب مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ روشنی میرے دائیں جانب تھی۔ یہ سیڑھیاں کمرے کے پتھوں نیچے نہیں تھیں بلکہ درمیان میں سے بل کھا کر اس طرح اترتی تھیں جہاں دیوار میں نصب الماری تھی گویا جب میں کمرے میں اترتا تو میرا دیکھ لیا جانا ممکن نہ تھا کیونکہ میں اس دیوار کی آڑ میں ہوتا جہاں الماری بنی ہوئی تھی۔ یہ اطمینان ہو جانے کے بعد کہ میں کمرے میں اترنے کے بعد بھی بیگ صاحب کی نگاہوں سے اوچھل رہا ہوں، میں نیچے اتر گیا۔

اب پورا کمرہ میرے سامنے تھا۔ سوائے اس حصے کے جہاں روشنی ہو رہی تھی اور جہاں بیگ صاحب (غالباً) موجود تھے۔ یہ کمرہ بے حد خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے میں کسی اعلیٰ عہدے دار کے آفس میں کھڑا ہوں۔ سامنے کی طرف بہترین صوفہ اور سینٹرل ٹیبل رکھی تھی۔ فرش پر گرے سرخ رنگ کا دبیز قالین تھا۔ دیواروں پر ہلکا نیلا رنگ کیا گیا تھا۔ ڈیکوریشن کی جتنی بھی چیزیں تھیں یہ سب سرخ رنگ کی تھیں مثلاً گل دان، ٹیبل لیمپ کا شید، دیوار پر لگی تصویروں میں بھی رنگوں کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ میں نے ایک طائرانہ نگاہ پورے کمرے میں ڈالی اور جھانک کر اس سمت دیکھا جہاں بیگ صاحب کی موجودگی متوقع

آئیں گے مگر یہ ضروری بھی نہیں تھا کہ فاریہ کا اندازہ درست ثابت ہو، اسی لیے میں انہیں اپنی آنکھ سے اوچھل نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ سلطان سے وابستہ امیدیں تو اب ختم ہو چکی تھیں۔ لے دے کے اب یعقوب ہی رہ گیا تھا۔

میں نے جیسے ہی راہداری میں قدم رکھا بیگ صاحب کو کمرے سے نکلتا دیکھا، میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ستون کی آڑ میں ہو گیا ورنہ میرا دیکھ لیا جانا یقینی تھا۔ بیگ صاحب زاریہ کے کمرے کی طرف آنے کی بجائے اس کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے جسے میں نے ہمیشہ بند دیکھا تھا۔ یہ کمرہ زاریہ کے کمرے کے برابر والا تھا اور بیگ صاحب کے کمرے کی کھڑکی اسی کمرے کے دروازے کے عین سامنے تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ کس کا کمرہ ہے اور کیوں بند ہے، ایسے حالات پیدا ہی نہیں ہوئے تھے کہ فاریہ سے اس بند کمرے کے بارے میں پوچھتا۔

میں اسی ستون کی آڑ میں کھڑا بیگ صاحب کو دیکھ رہا تھا جو بڑے چوکنے انداز میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے دبے پاؤں اس طرف بڑھ رہے تھے۔ دروازے کے قریب پہنچ کر انہوں نے سیلنگ گائون کی جیب سے غالباً چابی نکالی اور لاک کھول لیا۔ دوسرے لمحے ہی وہ دروازہ بند ہو گیا۔ میں تیزی سے دروازے کی طرف لپکا۔ میں نے دروازے سے اپنا کان لگا دیا۔ اندر سے کچھ دیر آہٹ آتی رہی پھر سناٹا چھا گیا۔ میں کافی دیر تک وہیں کھڑا رہا۔ مسئلہ یہ تھا کہ اس کمرے کی ایک کھڑکی تھی تو مگر اندر سے بند تھی ورنہ میں اندر دیکھنے کی کوشش ضرور کرتا۔ کچھ دیر انتظار کے بعد میں نے دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ فوراً ہی مجھے احساس ہو گیا کہ دروازہ لاک نہیں ہے۔ ظاہر ہے بیگ صاحب، یعقوب اور فاریہ کی طرف سے مطمئن تھے، میرے بارے میں انہیں گمان بھی نہ ہو گا۔ جمال اور زید کی طرف سے غالباً انہیں فکر تھی جس کی وجہ سے وہ اتنی احتیاط سے کام لے رہے تھے۔

میں نے دھیرے سے دروازہ کھولا اندر گرا اندھیرا تھا۔ میں بغیر آہٹ پیدا کئے اندر داخل ہو گیا۔ اندر داخل ہونے سے پہلے میں پستول نکال چکا تھا۔ دروازہ میں نے پھر بند کر دیا۔ چند لمحے میں آہٹ لینے کی کوشش کرتا رہا مگر یوں لگتا تھا جیسے کمرے میں کوئی موجود نہیں۔ اب میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی کچھ عادی ہو گئیں تو مجھے احساس ہوا کہ یہ کمرہ اسٹور روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا کیونکہ جلد ہی مجھے تلے اوپر رکھی کچھ کرسیاں، اپنی

تھی۔ وہ ایک بڑی سی ٹیبل کے پیچھے رکھی موونگ چیئر پر بیٹھے ایک فائل دیکھ رہے تھے۔ وہ فائل انہوں نے کہاں سے نکالی تھی یہ میں نہ جان سکا۔ میرا خیال تھا کہ یہ فائل انہوں نے یقیناً اسی صندوق میں سے نکالی ہوگی جس کی تلاش جمال اور زید کو بھی تھی مگر مجھے پورے کمرے میں کہیں کوئی ایسا صندوق نظر نہ آیا۔

بیگ صاحب مجھ سے کافی فاصلے پر تھے اور ان کا چہرہ بالکل سامنے تھا یعنی اگر میں دیوار کی آڑ سے باہر آتا تو فوراً ان کی نگاہوں میں آجاتا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں، میں ابھی کشمکش میں تھا کہ اچانک بیگ صاحب کھڑے ہو گئے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے انہیں اچانک کوئی بات یاد آگئی ہو۔ وہ سیدھے سیڑھیوں کی طرف آ رہے تھے۔ میں گھبرا کر پیچھے ہٹا اور اندھیرے میں دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے سانس تک روک لی۔ بیگ صاحب شاید بہت جلدی میں تھے۔ وہ ادھر ادھر دیکھے بغیر سیڑھیاں چڑھتے چلے گئے۔ میں بال بال بچ گیا اور نہ دیکھ لیا جانتی تھا۔ ان کے تہ خانے سے باہر جاتے ہی میں سیڑھیوں کی طرف لپکا اور اوپر چڑھتا چلا گیا مگر میں نے تہ خانے سے باہر جانے کی کوشش نہیں کی بلکہ کچھ پہلے ہی ٹھہر گیا۔ اوپر سے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی پھر میں نے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ گویا بیگ صاحب اوپر کے کمرے سے باہر جا چکے تھے۔ یہ جانتے ہی میں نے سیڑھیوں کے اختتام پر بنا ہوا لکڑی کا تختہ بند کر لیا۔ اب تہ خانے کا راستہ بند ہو چکا تھا۔ میں نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ وہ اندر سے بھی لاک ہو سکتا ہے۔

میں نے دروازے کو لاک کر دیا اور اطمینان سے واپس تہ خانے میں اتر گیا بلکہ اسے تہ خانہ کہنا زیادتی تھی۔ وہ ایک خوب صورت آفس تھا۔ اب میں نے اس کمرے کی ہر چیز کو غور سے دیکھنا شروع کیا۔ اس بڑی سی آفس ٹیبل کے دائیں اور بائیں جانب لوہے کی بڑی بڑی الماریاں تھیں۔ میں نے انہیں چیک کیا، وہ سب لاک تھیں۔ میں حیران تھا کہ آخر میں ان اہم دستاویزات کو کہاں تلاش کروں صندوق نام کی کوئی چیز یہاں نہیں تھی۔ دیوار میں نصب لکڑی کی الماری بھی لاک تھی، البتہ ٹیبل کی درازیں کھلی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک ایک کر کے تمام درازیں کھول ڈالیں۔ آخری دراز کھلتے ہی میں چونک گیا۔ دراز میں بہت سی چابیاں رکھی تھیں۔ جو یقیناً الماریوں کی ہوں گی۔ میں نے تمام چابیاں اٹھا کر جیب میں ڈال لیں۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ میں ایک ایک الماری کھول کر چیک کرتا۔ میں چاہتا تھا کہ بیگ

صاحب کے آنے سے پہلے مطلوبہ صندوق تلاش کر لوں۔

بیگ صاحب کو گئے ہوئے تقریباً تین چار منٹ ہو چکے تھے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ فی الحال مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے اور میں بیگ صاحب کے چلے جانے کے بعد یہاں دوبارہ آ کر اطمینان سے ہر چیز چیک کروں گا مگر یہ بھی خطرہ تھا کہ بیگ صاحب وہ دستاویزات اپنے ساتھ نہ لے جائیں، میرا ذہن کام نہیں کر رہا تھا اگر میں یہیں چھپا رہتا تو بھی میرے لیے خطرہ تھا۔ میں یہاں قید بھی ہو سکتا تھا۔ اگر بیگ صاحب کو شبہ ہو جاتا کہ میں یہاں ہوں تو وہ مجھے یہیں قید کر کے جاسکتے تھے فاریہ کو پتا بھی نہ چلتا کہ میں کہاں گیا۔ اس خیال کے آتے ہی میں سیڑھیوں کی طرف لپکا مگر سیڑھیوں تک جانے سے پہلے میں نے وہ فائل اپنے کوٹ میں چھپالی تھی جس کا بیگ صاحب کچھ دیر پہلے بڑے انہماک سے مطالعہ کر رہے تھے۔

میں بغیر کسی پریشانی کے تہ خانے سے باہر آیا۔ بیگ صاحب ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ کمرے کا وہ دروازہ لاک تھا جو راہداری میں کھلتا تھا، گویا میں اس کمرے میں قید ہو گیا تھا۔ اب مجھے بیگ صاحب کا انتظار تھا۔ میں نے تہ خانے کے اس تختے کو کھلا چھوڑ دیا تھا کیوں کہ بیگ صاحب اسے کھلا چھوڑ کر گئے تھے جس سے پتا چلتا تھا کہ وہ واپس آئیں گے۔ اب انہیں گئے تقریباً سات منٹ ہو چکے تھے۔ میں ایک الماری کے پیچھے چھپا ان کے آنے کا انتظار کرتا رہا۔ دس منٹ بعد مجھے دروازے کے لاک میں چابی گھومنے کی آواز سنائی دی اور دوسرے ہی لمحے بیگ صاحب اندر داخل ہوئے۔ ان کا چہرہ پیلا ہو رہا تھا۔ چہرے پر پھیلا خوف پہلی ہی نگاہ میں محسوس ہو رہا تھا اس سے پہلے کہ میں کچھ اور سوچتا بیگ صاحب کے پیچھے مجھے جمال کا چہرہ نظر آیا۔ اب وہ دونوں کمرے میں آچکے تھے۔ جمال کے ہاتھ میں پستول تھا۔ جس کا رخ بیگ صاحب کی طرف تھا۔ اب صورت حال واضح ہو گئی تھی۔ جمال کو دیکھ کر مجھے اس بات کی خوشی ہوئی کہ میں نے چابیاں اور وہ فائل غائب کر دی تھی ورنہ اگر چابیاں اس کے ہاتھ لگ جاتیں تو گویا سب کچھ ختم ہو جاتا پھر بھی مجھے اس صندوق کی فکر تھی جس کی اسے تلاش ہوگی۔

”آگے بڑھو بڑے میاں؟“ کمرے میں جمال کی آواز گونج اٹھی۔ اس نے پیچھے سے بیگ صاحب کو دھکا دے کر کہا تھا۔

بیگ صاحب سمجھ ہوئے آگے بڑھے۔ وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے تہ خانے کے

کھلے ہوئے حصے کے قریب پہنچ گئے۔ جمال نے کمرے کا دروازہ بھیڑ دیا تھا اور یہ میرے حق میں بہتر تھا اگر وہ دروازہ لاک کر دیتا تو میرا سامنے آنا ناگزیر ہو جاتا۔

ان دونوں کے نہ خانے میں اترتے ہی میں دبے پاؤں کمرے سے باہر آگیا اور پھر میں نے زاریہ کے کمرے کی طرف دوڑ لگا دی۔ میں چاہتا تھا کہ اس کمرے کو لاک کر دیا جائے تاکہ جمال اور بیگ صاحب وہاں سے نہ نکل سکیں اور چابی میرے پاس نہیں تھی بلکہ بیگ صاحب کے پاس تھی۔ ایکسٹرا چابی کے بارے میں فاریہ ہی جانتی ہوگی۔ میں ابھی زاریہ کے کمرے کے قریب ہی پہنچا تھا کہ فاریہ کمرے سے نکلتی نظر آئی۔ میں نے لپک کر اس کا بازو پکڑا اور دوبارہ کمرے میں لے گیا۔

”تھک..... کیا ہو گیا اتنی دیر کیوں ہوئی؟“ اس نے گھبرا کر پوچھا۔

تب میں نے اسے ساری بات بتائی اور اس سے پوچھا کہ اس کمرے کی ایکسٹرا چابی کہاں ہے؟ یہ سنتے ہی وہ اپنے کمرے کی طرف بھاگی میں اس کمرے کے دروازے پر الرٹ کھڑا ہو گیا تاکہ اگر یہ لوگ باہر آئیں تو میں انہیں قابو کر سکوں چند لمحوں بعد ہی فاریہ چابی لے کر آ گئی۔ میں نے دروازہ لاک کر دیا اور فاریہ سے کہا کہ وہ انسپکٹر قدیر کو فون کر کے بلا لے۔ فاریہ نے انسپکٹر قدیر کو فون کر دیا۔ میں یعقوب کی طرف سے پریشان تھا مگر فاریہ نے بتایا کہ وہ سلطان کو لے کر اپنے کمرے میں گیا ہے۔ سلطان کے سر پرچوٹ آئی تھی یہ سن کر میں اور فاریہ یعقوب کی طرف چل پڑے۔

سلطان اور یعقوب دونوں ہی مل گئے۔ سلطان نے بتایا کہ وہ بیگ صاحب کے کمرے کی کھڑکی سے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک کسی نے پشت پر سے اس پر حملہ کر دیا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ زخم اتنا گہرا نہیں تھا مگر میں نے اسے وہیں لیٹے رہنے کی ہدایت کی کچھ ہی دیر بعد چوکیدار نے آکر بتایا کہ انسپکٹر قدیر آئے ہیں۔ میں اوز فاریہ دونوں گیٹ کی طرف دوڑے۔ انسپکٹر قدیر اپنے ساتھ کافی سپاہی لے کر آیا تھا۔ مجھ سے تفصیل سننے کے بعد وہ اس کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کے سپاہی بھی اس کے ساتھ تھے۔

چند لمحوں بعد وہ سب واپس آئے تو جمال کے ہاتھوں میں ہتھکڑی تھی اور بیگ صاحب کا سر جکھنچا ہوا تھا۔ انسپکٹر قدیر اپنی معمول کی کارروائی کرنے کے بعد جمال کو لے کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے یعقوب سے کہا وہ بیگ صاحب کو ان کے کمرے میں لے جائے۔

بیگ صاحب نے میری زبان سے یہ حکم سننے کے بعد ایک لفظ بھی نہ کہا اور اٹھ کھڑے ہو گئے۔

”ایک منٹ بیگ صاحب“ میں نے کہا اور اپنے کوٹ میں چھپائی ہوئی فائل نکال لی۔ فائل پر نگاہ پڑتے ہی بیگ صاحب کے چہرے پر دہشت پھیل گئی۔ مگر ان سے کچھ بولا نہیں گیا۔

”بیگ صاحب مجھے افسوس ہے کہ میں اس معاملے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔ خدا کی قسم، اگر میرا باپ بھی ہوتا تو میں اس کی مدد کرنے سے انکار کر دیتا۔“ اتنا کہہ کر میں نے یعقوب کو اشارہ کیا اور وہ بیگ صاحب کو لے کر ڈرائنگ روم سے باہر چلا گیا۔ میں نے یعقوب سے کہہ دیا تھا کہ وہ بیگ صاحب کے کمرے کا دروازہ لاک کر کے آئے۔

ان کے جانے کے بعد میں اور فاریہ اس کمرے کی طرف بڑھ گئے جہاں سے تمہ خانے کا رستہ تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم اس تمہ خانے کی الماریوں کی تلاشی لے رہے تھے۔ میں نے اس فائل کا مطالعہ بھی کیا اور یہاں مجھے وہ صندوق بھی مل گیا جس کی مجھے تلاش تھی مگر یہ ویسا صندوق نہیں تھا جیسا میں سمجھ رہا تھا بلکہ یہ بریف کیس سے کچھ بڑا ایک منقش صندوق تھا جس کا لاک عجیب و غریب قسم کا تھا مگر مجھے لاک کھولنے میں محنت نہیں کرنا پڑی کیوں کہ وہ پہلے سے کھلا ہوا تھا۔ غالباً بیگ صاحب اسے کھول چکے تھے اور جو فائل میں نے ٹیبل سے اٹھائی تھی وہ وہی فائل تھی جو یقیناً اس صندوق میں بند تھی۔

اس فائل میں بیگ صاحب کے علاوہ بہادر، جمال اور زید کے کالے کرتوتوں کے سارے ثبوت موجود تھے۔ یہ اتنا کچھ تھا کہ اس کے بعد کسی اور چیز کی قطعاً کوئی ضرورت نہ تھی۔ الماری میں موجود کچھ فائلوں کے مطالعے سے یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ بیگ صاحب نے فاریہ اور زاریہ کی تمام جائیداد اپنے نام کروالی ہے اور وہ جب چاہتے انہیں گھر سے نکال سکتے تھے۔ مگر شاید اپنے مذموم کاروبار کی وجہ سے انہوں نے ان دونوں کی آڑ لے رکھی تھی۔

ان دستاویزات کا سرسری مطالعہ کر کے خود انسپکٹر قدیر بھی حیران رہ گیا۔ اسے بھی یہ جان کر حیرت ہوئی تھی کہ بیگ صاحب نے کس قدر چالاکی سے خود کو سلطانی گواہ کی حیثیت دے لی تھی اور تمام تر الزامات وصی صاحب کے سر تھوپ دیے تھے۔ یہ بات تو ٹھیک تھی کہ وصی صاحب، بیگ صاحب کے ساتھ ملے ہوئے تھے مگر وہ صرف کام کی نگرانی کرتے تھے

”اقبال کیا ہوا؟“ وہ چیخی۔

اس کے اس سوال نے مجھے چونکا دیا اور میں بے اختیار انسپکٹر قدیر کی طرف دوڑا اور اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں جو خیال آیا وہ بہت خوفناک تھا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ انسپکٹر قدیر، بیگ صاحب کے کمرے کی طرف بھاگا تھا۔ میں فاریہ اور چوکیدار، تقریباً ساتھ ہی بیگ صاحب کے کمرے تک پہنچے تھے دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں سیدھا اندر داخل ہو گیا۔ میرے ذہن میں جو خیال آیا تھا وہ صحیح تھا۔ سامنے ہی بیگ صاحب فرش پر بکھرے پڑے تھے۔ ان کی کینٹی سے خون بہہ رہا تھا۔ فاریہ چیخ کر آگے بڑھی مگر انسپکٹر قدیر نے اسے روک لیا۔

یعقوب منہ دے لے حیران کھڑا تھا۔ گولی چلنے کی آواز نے سلطان کو ہی نہیں زاریہ کو بھی یہاں تک آنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ذرا سی دیر میں ہی کھرام مچ گیا۔ زاریہ جو بیگ صاحب کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ خود فاریہ کی حالت بھی بہت خراب تھی۔ کچھ بھی تھا اس نے ایسا تو کبھی نہ چاہا ہو گا، وہی کیا، میں نے بھی ایسا نہیں سوچا تھا میں یہ ضرور چاہتا تھا کہ انہیں ان کے کیے کی سزا ملے مگر جو سزا انہوں نے اپنے لیے چنی تھی وہ بہت ہیبت ناک تھی۔

اس وقت انسپکٹر قدیر اور اس کے مزید دو آدمیوں کی موجودگی نے ہم سب کو بڑی پریشانی سے بچالیا تھا ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ اس خودکشی کو قتل سمجھا جاتا۔ انسپکٹر نے قانونی کارروائی کرنے کے بعد لاش اٹھوا کر پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی۔ اس کارروائی میں صبح ہو گئی۔ فاریہ، زاریہ کو سنبھال رہی تھی مگر وہ تو یوں چل چل کر رو رہی تھی جیسے کسی نے اس کی ماں کو اس سے جدا کر دیا ہو۔ بے چاری یہ کہاں جانتی تھی کہ جس شخص کے لیے وہ تڑپ رہی ہے اس نے ان دونوں بہنوں کو ایسی جگہ پہنچا دیا تھا کہ اگر وہ چاہتا تو انہیں انہی کی کوٹھی سے دھکے دے کر نکال دیتا اور وہ کوڑی کوڑی کی محتاج ہو جاتیں۔ یہ سب نہ جانتا اس کے لیے بہتر ہی تھا۔ پیار نہ سہی، پیار کا احساس ہی انسان کو جینے کا کتنا حوصلہ دیتا ہے، یہ تو میں ہی جانتا تھا۔

اگلی صبح سلطان نے جا کر ماسی اور سوہنی کو اس حادثے کے بارے میں بتایا تو وہ دونوں اس کے ساتھ ہی کوٹھی آ گئیں۔ سوہنی کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ یہ میں اسے دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر سفیدی چھائی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں وحشت تھی اور کوئی ایسی

ورنہ کرتا دھرتا خود بیگ صاحب ہی تھے۔ اس فائل میں اور بہت سے نام تھے جن کا تعلق کسٹم اور پولیس سے تھا اور جو لوگ ہیروئن کی سپلائی میں ان اسمگلروں کی معاونت کرتے تھے۔

انسپکٹر قدیر اتنا بڑا کسٹم مل جانے پر بے حد مسرور بھی تھا مگر پرانی جان پہچان کی وجہ سے بیگ صاحب کی گرفتاری پر ملول بھی، مگر ظاہر ہے کہ یہ اس کی ڈیوٹی تھی اور پھر فاریہ خود یہ چاہتی تھی کہ وہ ہیروئن کے اسمگلروں کو گرفتار کر دے، اب یہ اس کی بد قسمتی تھی کہ ان اسمگلروں کی فہرست میں بیگ صاحب کا نام بھی شامل تھا اور بہر حال یہ ممکن نہیں تھا کہ باقی سب کو تو پکڑوا دیا جائے مگر بیگ صاحب کو چھوڑ دیا جائے۔

”فاریہ..... بیگ صاحب کی گرفتاری ناگزیر ہو چکی ہے۔“ انسپکٹر قدیر نے دھیمے لہجے میں کہا۔ اس کے انداز میں افسردگی تھی۔

”میں جانتی ہوں قدیر..... مگر مجھے اس بات پر کوئی صدمہ نہیں بلکہ میں خوش ہوں کہ ملک دشمن عناصر کو گرفتار کرواتے ہوئے میں نے اپنے ذاتی مفاد یا اقربا پوری کو خود پر اثر انداز نہیں ہونے دیا۔“ اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز بھرا رہی تھی مگر اس نے خود پر قابو رکھا تھا۔ اس کے چہرے سے کسی کمزوری کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

”آئی ایم سوری فاریہ، یہ ناپسندیدہ کام مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی کرنا پڑے گا۔“ یہ کہتے ہوئے انسپکٹر قدیر کھڑا ہو گیا۔ میں اور فاریہ بھی اس کے ساتھ ہی باہر آ گئے۔ وہ پہلے پورچ کی طرف گیا۔ چند لمحوں بعد جب وہ لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ہتھکڑیاں تھیں۔ میں نے دیکھا کہ ہتھکڑیوں پر نگاہ پڑتے ہی فاریہ نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ شاید اس میں دیکھنے کی تاب نہیں تھی۔

انسپکٹر قدیر نے لمحہ بھر کو فاریہ کی طرف دیکھا، ٹھنکا اور پھر تیزی سے بیگ صاحب کے کمرے کے دروازے کی طرف چل دیا۔ ابھی ہم بیگ صاحب کے کمرے سے چند قدم کے فاصلے پر ہی تھے کہ اچانک گولی چلنے کی آواز نے ہمیں اچھلنے پر مجبور کر دیا۔ آواز اتنے قریب سے آئی تھی کہ میرے کانوں میں سیٹیاں بجنے لگیں۔ میں بوکھلا کر پلٹا اور اس طرف بھاگا جدھر میں نے فاریہ کو چھوڑا تھا مگر وہ ہماری ہی طرف بھاگتی ہوئی آ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر بھی ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اس کے پیچھے چوکیدار اپنی بدوق سنبھالے چلا آ رہا تھا۔

بات تھی جس نے مجھے بے چین کر دیا تھا۔ مجھے اس کی بد نصیبی پر رونا آیا کہ میری تمنا کرنے کی اسے کیسی کڑی سزا مل رہی ہے کہ میں اس کے قریب ہوتے ہوئے بھی اس کی دسترس سے دور ہوں۔ اس کے لیے کچھ بھی تو نہیں کر پایا تھا مگر اب میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں سوہنی کو مرنے نہیں دوں گا۔ اپنا لمحہ اور پیار کا قطرہ قطرہ اس کی نذر کر دوں گا۔ آج میرا سب سے بڑا مشن پورا ہو چکا تھا میں نے فاریہ کا قرض اتار دیا تھا۔ ان تمام لوگوں کو کیفر کردار تک پہنچا دیا تھا جو فاریہ اور زاریہ ہی کے نہیں پوری قوم کے دشمن تھے۔ اب مجھ پر سوہنی کا قرض باقی تھا یا ماں اور صغرا کا اور..... اور میرے باپ کا جو میری آزادی کی خواہش کی پاداش میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ سوہنی کا علاج کروا کے میں سیدھا گاؤں جاؤں گا اور راجو اور چوہدری کو ایسا سبق دوں گا کہ ان کی نسلیں بھی یاد رکھیں گی اور زندگی بھر معصوم لوگوں کو غلام کرنے کی جرأت نہیں کر سکیں گی۔

وہ تمام دن عجیب افرا تفری میں گزر گیا۔ مغرب سے کچھ پہلے پولیس نے بیگ صاحب کی لاش واپس کی، اسی وقت قدیر نے بتایا کہ بہادر، زید اور وصی صاحب کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور فاریہ کی فیکٹری سیل کر دی گئی ہے۔ اس وقت یہ انکشاف بھی ہوا کہ عذرا، جس کا میرے اغوا کے بعد سے کچھ پتا نہ تھا، بہادر کی قید میں تھی۔ انکسٹر قدیر کے ہمراہ وہ بھی آئی تھی۔ اس نے بتایا کہ بہادر کو علم ہو گیا تھا کہ وہ اصل میں فاریہ کی ساتھی ہے اس نے اسی وقت اسے قید کر دیا تھا۔ مجھے شرمندگی تھی کہ میں اسے بالکل بھول چکا تھا۔ قصور میرا نہ تھا بلکہ حالات کچھ اس انداز میں پیش آتے رہے کہ میں الجھ کر رہ گیا۔ ویسے میں نے واپس آنے کے بعد فاریہ سے اس کے بارے میں پوچھا تو تھا مگر اس نے بتایا کہ عذرا کا کچھ پتا نہیں ہے۔ وہ اس کے گھر میں بھی گئی تھی مگر پتا چلا تھا کہ گھر بند ہے اور وہاں سے وہ لوگ کہیں اور جا چکے ہیں تب وہ سمجھی کہ شاید عذرا خود ہی ان لوگوں کو لے کر کہیں چلی گئی ہے مگر عذرا نے بتایا کہ وہ خود حیران ہے کہ وہ عورت کہاں گئی جسے وہ ماں کہتی تھی۔ بہر حال کیوں کہ عذرا کا اس سے کوئی رشتہ نہیں تھا اس لیے اسے یہ سن کر کچھ بھی دکھ نہیں ہوا کہ وہ لوگ نہیں ہیں۔

فاریہ نے عذرا کو اپنے ساتھ رہنے کی آفر کی جسے اس نے قبول کر لیا تھا۔ سلطان کے سر کا زخم بھر گیا تھا وہ تین روز تک خاموش رہا مگر تیسرے روز ہی اس نے کہہ دیا کہ وہ اپنے گھر جا رہا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ فاریہ اب کسی حال میں بھی سوہنی وغیرہ کو کہیں نہیں جانے دے گی۔ وہ

میرے روکنے کے باوجود نہ رکا اور تیسرے دن رات کو اپنے گھر چلا گیا۔ ہم لوگوں کو فاریہ نے نہیں جانے دیا۔ اسی رات سوہنی کی حالت مزید بگڑ گئی۔ ڈاکٹر طارق جو بیگ صاحب کی وفات پر بھی موجود تھے اس کی طرف سے بہت پریشان تھے۔ فاریہ نے انہیں فون کر کے بلایا تھا۔ انہوں نے سوہنی کا معائنہ کیا، کچھ دوائیں دیں اور پریشان پریشان سے باہر آ گئے، میں ان کے پیچھے چلا آیا۔ انہوں نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ ”مسٹر اقبال، سوہنی کو بالکل تھانہ چھوڑیے گا۔“

”ڈاکٹر، کیا سوہنی کا مرض لاعلاج ہے؟“

”ہاں مسٹر اقبال، کم از کم اب ہم اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ دھیرے دھیرے گھرے اندھیروں کی طرف بڑھ رہی ہے۔“ انہوں نے غمگین لہجے میں کہا۔

”نہیں ڈاکٹر..... کچھ تو ہو سکتا ہو گا..... اس نے تو ابھی کچھ بھی نہیں دیکھا..... وہ تو گاؤں کی آزاد اور صاف ستھری فضاؤں میں رہی ہے، اسے ایسا کوئی مرض نہیں ہو سکتا۔“

”اس مرض کا تعلق آب و ہوا سے نہیں ہے مسٹر اقبال، یہ خوفناک مرض کہیں بھی رہنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ آپ..... آپ ان کے لیے دعا کریں اور انہیں تھانہ چھوڑیں ایسا نہ ہو کہ گزرنے والا کوئی لمحہ آپ کے لیے بچھتاوے چھوڑ جائے۔“

میں نے کہنا چاہا کہ وہ اسے بچالیں مگر وہ رکے نہیں۔ اپنا بیگ اٹھا کر پورچ کی طرف چلے گئے۔ ان کی باتوں کی بازگشت مجھے اپنے وجود میں گونجتی محسوس ہوئی اور میں پلٹ کر سوہنی کے کمرے کی طرف بھاگا۔

فاریہ اور زاریہ بھی وہیں موجود تھیں۔ ماسی میراں کی قوت برداشت ختم ہو چکی تھی۔ وہ سوہنی کے سر ہانے بیٹھی، منہ پر دوپٹہ ڈالے بری طرح رو رہی تھی۔

”ماسی!“ میں نے دھیرے سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”ہائے بالے میں کیا کروں..... ارے میری زندگی بھر کی پونجی لٹ جائے گی۔ میں کیسے جیوں گی بالے..... میں نے کیا گناہ کیا ہے رہا..... میری سوہنی کو بچالے.....“

”ماسی..... صبر کر ماسی خدا ضرور رحم کرے گا۔“ میں نے آنسوؤں کو حلق میں اتارتے ہوئے کہا اور خود سوہنی کے قریب بیٹھ گیا۔

وہ ہوش میں نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ غشی میں ہو۔ کبھی کبھی وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں

جانے کب اور کس لمحے یہ کانٹا بھی ٹوٹ جاتا۔ میرا جی تو چاہتا تھا کہ اسے سب کچھ بتا دوں کہ میں کیا محسوس کر رہا ہوں مگر صرف یہ سوچ کر چپ ہو جاتا تھا کہ اسے اب یہ سب بتا کر کیا کروں گا۔

کافی دن گزر گئے۔ شاید دس دن یا شاید اس سے بھی زیادہ، فاریہ دھیرے دھیرے مجھے میری سوچوں کے حصار سے باہر لے آئی مگر مجھ میں زندگی کی ترنگ پیدا نہ کر سکی، ہاں اس کی ان کوششوں سے اتنا ہو گیا کہ مجھے وہ تمام کچھ جو سوہنی کی موت کے بعد سے دھندلا نظر آ رہا تھا، اب واضح اور صاف دکھائی دینے لگا گو میری اب کوئی منزل نہ تھی مگر اب میرے سامنے ایک راستہ ضرور تھا۔ وہ راستہ جو میرے ماضی کو جاتا تھا۔ ہاں وہ راستہ جس کے اختتام پر میری پاگل ماں اب بھی میرا اور صغرا کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ راستہ جو میرے وجود میں دہکتی آگ کی تپش سے مجھے جھلسائے دیتا تھا۔

شر کے ان عذابوں سے جان چھوٹی تو میرے وجود میں لگائے گئے وہ زخم ہرے ہو گئے جن کی پاداش میں میں اپنا سب کچھ گنوا چکا تھا اپنا معصوم اور خوب صورت ماضی، اپنا پیار، اپنا باپ پھر اپنی ماں اور بہن، مجھے ان زخموں کا قرض چکانا تھا۔ اپنے ہر جہا ہونے والے رشتے کا حساب لینا تھا اور جب یہ احساس شدت اختیار کر گیا تو میں نے خود پر قابو پا لیا۔ مجھے ابھی زندہ رہنا تھا۔

پھر ایک روز میں نے فاریہ کو بتا دیا کہ میں گاؤں جا رہا ہوں وہ یہ سن کر چپ رہ گئی۔ ایک گہرا سناٹا چھا گیا اس پر۔

”اقبال میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔“

”مگر میں اکیلا جانا چاہتا ہوں۔“

”نہیں اقبال..... تمہارے وجود میں دہکتی آگ کی تپش مجھے محسوس ہو رہی ہے..... تم..... تم پتا نہیں کیا کرو گے، دیکھو اقبال اب تمہارے پاس جو کچھ بچا ہے اسچہ اپنے انتقام کی آگ میں نہ جلا ڈالنا۔ تم چوہدری سے نہیں بھڑنا بس ماں کو لے کر چلے آنا۔ اگر تم یہ وعدہ کرو گے تو..... میں تمہیں اکیلا جانے دوں گی ورنہ..... میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔“

”سوری میڈم، میں اپنے معاملات کو اپنے طور پر طے کرنا چاہتا ہوں۔ ویسے بھی میڈم

ہے جتنا عورتوں کو ہوتا ہے پر..... عورتیں دھاڑیں مار مار کر رولیتی ہیں، تم بھی روؤ اقبال، یہ حق تو تمہیں بھی ہے نا؟“ وہ روتی جا رہی تھی اور بولتی جا رہی تھی۔ میں واقعی برداشت نہ کر پایا اور رو دیا ہم دونوں جانے کتنی دیر یوں بیٹھے روتے رہے۔

وہ سچ کہتی تھی، رونے سے دل کا بوجھ کم ہو گیا تھا اور پھر چوتھے دن کو ٹھی سے ایک اور جنازہ نکلا، میری محبت کا، میرے ارمانوں کا جنازہ، میری تمناؤں کا جنازہ اور پھریوں ہوا جیسے میرے تمام احساسات بھی سوہنی کے ساتھ دفن ہو گئے۔ میں نے خود کو پتھر کا سا محسوس کیا، بے حس اور سرد مہر، بس میری آنکھیں تھیں جو سب کچھ دیکھ رہی تھیں یا میرے کان تھے جو سب کچھ سن رہے تھے مگر محسوس کچھ بھی نہیں ہو رہا تھا میں بالکل کسی روبوٹ کی طرح ضروریات نمٹا رہا تھا۔ اب نہ فاریہ کی تاسف بھری نگاہیں دیکھ کر کچھ احساس ہوتا تھا اور نہ ماسی کی آنکھوں سے بہتے آنسو ہی وجود میں نمی پیدا کرتے تھے۔ زاریہ بے چاری تو اب تک بیگ صاحب کی موت پر آنسو بہا رہی تھی کہ اب سوہنی کی بے وقت موت نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اتنے تھوڑے سے دن میں ہی اسے سوہنی سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ تمام وقت اسی کے ساتھ لگی رہتی تھی۔ وہ یہ تو نہیں جانتی تھی کہ سوہنی میرے لیے کیا تھی مگر پھر بھی وہ میرے سینے سے لگ کر گھنٹوں روتی رہی تھی۔

میرے پاس تو دلاسا دینے کو بھی الفاظ نہ تھے میرے پاس تو کچھ بھی نہ تھا۔ سبھی کچھ تو سوہنی اپنے ساتھ لے گئی تھی..... میں پتھر بنا اسے روتا بلکتا دیکھتا رہا اور بس..... سوہنی کیا گئی کائنات کی تمام رعنائیاں، تمام رنگ اور زندگی دینے والا ہر احساس ختم ہو گیا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں نے سوہنی کو کھو دینے کے بعد کس طرح دن گزارے مگر دن گزرتے چلے گئے۔ فاریہ اور زاریہ تو خود پر قابو پا گئیں مگر ماسی کی سانسوں میں تو صرف سسکیاں بھر کر رہ گئی تھیں۔ اس کی نگاہیں غلاؤں میں بھٹکا کرتیں اور وہ پوری کوٹھی میں بھٹکی ہوئی روح کی طرح تیرتی پھرتی پھر جب کبھی کبھی اسے ہوش آتا اور مجھ پر نگاہ پڑتی تو چونک اٹھتی۔ اسے جیسے ایک دم احساس ہو جاتا کہ میں سوہنی کا پیار اور اس کی تمنا تھا۔ وہ میری بلائیں لیتی اور کہتی..... ”بالے، وہ تجھے بہت پیار کرتی تھی بالے..... کاش تُو اسے اپنا لیتا۔“

تب میرا کلیجہ کٹ جاتا۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ ماسی یہی تو وہ آرزو تھی جس نے مجھے زندہ رہنے کا حوصلہ بخشا ہوا تھا۔ اب تو میری سانس صرف ایک کانٹے میں الجھی ڈور تھی کہ

میرے خیال میں اب میری یہاں ضرورت نہیں ہے، آپ مجھے آزاد کر دیجئے۔“
”اقبال.....“ وہ تڑپ اٹھی۔ ”کیسی باتیں کر رہے ہو تم..... میں نے تمہیں پابند تو نہیں کیا ہے۔“

”آپ نے نہیں میرے حالات نے اس حصار میں قید کر دیا تھا میڈم مگر اب میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں، میرا خیال ہے کہ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اب میں اپنے آپ میں واپس جانا چاہتا ہوں۔ پلیز..... آپ کہہ دیجئے کہ اب سے میرا آپ کا کوئی ناتا نہیں، مجھ پر اب کوئی قرض نہیں، میں آزاد ہوں..... بالکل آزاد، آپ کے اس طرح کہہ دینے سے میری روح کی بے چینی ختم ہو جائے گی۔ میں اپنے مشن پر سکون سے جاسکوں گا۔“

”اقبال اگر تم یہاں خود کو قیدی سمجھتے ہو تو..... ٹھیک ہے۔ تم آزاد ہو، تم اپنا میرا کوئی ناتا نہیں رکھنا چاہتے تو تم مالک ہو مرضی کے، مجھے تمہیں مجبور کرنے کا کوئی حق بھی نہیں..... مگر اقبال..... میں تمہاری زندگی چاہتی ہوں.....“

”میں اس بارے میں نہیں سوچتا، میرے سامنے صرف اور صرف چوہدری اور اس کے بیٹے راجو کی موت ناچ رہی ہے، میں ان دونوں سے اپنے گھر کے بکھیر دیے جانے کا بدلہ لینا چاہتا ہوں اور اگر اس میں مجھے اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑے تو میں سمجھوں گا کہ میں جیت گیا، میں مرجاؤں گا مگر انہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ یہ قسم میں نے اپنی بہن کی لاش پر کھائی تھی میڈم..... جسے پورا کرنا ہی میری زندگی ہے اور بس، مجھے اجازت دیجئے اور میری غلطیوں کو معاف کر دیجئے گا۔“

”اقبال.....“ اس نے کچھ کہنا چاہا۔

”نہیں میڈم..... بس اب کچھ اور نہ کہئے گا۔“

”اوکے اقبال.....“ وش یو گڈ لک۔“ اس نے بھرائی آواز میں کہا اور میں اس کے پاس سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔

اگلے روز جب میں نے سلطان کو بتایا کہ میں گاؤں جا رہا ہوں تو وہ چونک اٹھا۔ اس کے چہرے پر ایک سایہ سالہا گیا۔ ”تو اکیلا جائے گا؟“

”ہاں سلطان، میں اکیلا جاؤں گا۔“

”نہیں بالے، میں تمہیں اکیلا نہیں جانے دوں گا۔ میں..... میں چلوں گا تیرے

ساتھ۔“

”نہیں دوست، تو نے اب تک جو کچھ میرے لیے کیا وہ بہت ہے، میں اپنے انتقام کی آگ میں تجھے نہیں جلنے دوں گا۔“

”مجھ سے مار کھانے والی باتیں نہ کر بالے..... بس میں نے جو کہہ دیا کہ میں ساتھ جاؤں گا اور سن، ہم یہاں سے راجہ کے ڈیرے پر چلیں گے۔ راجہ نے بھی تو وعدہ کیا تھا نا؟“
”ہاں تجھے بتا ہے کہ راجہ کہاں ہے؟“

”ہاں، اب سردیاں بڑھ گئی ہیں نا، راجہ نے سب کچھ چھوڑ دیا ہو گا وہ اب ساری سردیاں اپنے ڈیرے پر گزارے گا۔ ہم پہلے وہاں چلیں گے۔“

”پھر تو وہاں خان بھی ہو گا! میں نے کہا۔“

”ہاں..... وہاں خان بھی ہو گا۔“

تب میں خوش ہو گیا کہ ابھی نور یعنی شانی کا وہ پیغام میرے سینے پر بوجھ بنا ہوا تھا جو اس نے اپنے بھائی خان کو پہنچانے کے لیے مجھے دیا تھا۔ شانی کا معصوم مگر ٹمگین چہرہ اور شادو کی آنکھوں میں بھری ویرانی میری آنکھوں کے سامنے ناچ گئی۔ اس طرح میں خان کو بتا سکتا تھا کہ اس کی شانی اور شادو اس کا انتظار کر رہی ہیں۔

”ٹھیک ہے سلطان، تو چل میرے ساتھ۔“

”کب چلنا ہے؟“

”آج..... ابھی..... اسی وقت چل۔“

”جھلا ہوا ہے کیا، ماسی میراں کا کیا ہو گا۔“

”وہ یہیں رہے گی۔“ اچانک فاریہ کی آواز آئی۔ میں اور سلطان دونوں ہی چونک گئے۔ ”ہاں سلطان، اقبال نے ہم سے ناتا ختم کیا ہے مگر ماسی نے نہیں، ماسی کو میں کہیں بھی نہیں جانے دوں گی۔“

میں نے سر جھکا لیا۔ سلطان بھی خاموش رہا۔ فاریہ کچھ دیر کھڑی مجھے دیکھتی رہی۔ اس کی نگاہوں میں عجیب سی بات تھی جس نے میرے سارے بدن میں سنسنی پھیلا دی اور میں نے گہرا کرنگاہیں جھکا لیں۔ وہ جس خاموشی سے آئی تھی اسی خاموشی سے پلٹ گئی۔

اگلے روز ہم نے ضروری سامان ساتھ لیا اور سب کو خدا حافظ کہہ کر نکل آئے۔ فاریہ

بس چپ چاپ ہمیں دیکھتی رہی، منہ سے کچھ بھی نہ بولی مگر اس کی آنکھیں کچھ کہہ رہی تھیں۔ میں اس سے نگاہیں نہ ملا سکا اور کوٹھی سے باہر چلا آیا۔ سلطان نے مجھے بتایا تھا کہ ہمیں زیادہ تر پیدل سفر کرنا ہے مگر یہ سفر ساہیوال کے بعد ایک چھوٹے سے گاؤں سے شروع ہو گا۔ ہم بس اڈے پر پہنچ گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد بس میں سفر کر رہے تھے۔ گو میرا دل بہت گھبراہٹا تھا یوں لگتا تھا جیسے میں اپنے سارے خواب، ساری آرزوئیں اور ساری خوشیاں پیچھے کیوں چھوڑے جا رہا ہوں مگر میں خود پر قابو کیے رہا۔ میں جانتا تھا کہ جس سفر پر میں روانہ ہو رہا ہوں وہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔ مجھے اپنے واپس آنے کی نہ توقع تھی اور نہ خواہش، خواہش تھی تو بس اتنی کہ اس حویلی کو چھونک ڈالوں، جس کے یکنوں نے میرے ہنستے ہنستے گھر کو اجاڑ دیا۔ وہ گھر جہاں ہتھکوں میں لٹکے ننھے ننھے موتیوں کی چمک تھی یا پیروں میں بندھی ان پازیبوں کی چھکار جس کی ہر آواز میرے پیار کی گواہی بن کر میرے آنگن سے ہوتی ہوئی دور دور تک پھیل جاتی تھی۔

وہ گھر جہاں مجھے ماں کا پیار، باپ کی شفقت اور بہن کی محبت نصیب تھی میں اپنے اس گھر کی تباہی کا بدلہ لینا چاہتا تھا، چاہے بدلے کی اس آگ میں خود بھی جل کر بھسم ہو جاؤں۔ میں سوچتا رہا اور بس آگے ہی آگے جانے والے لمبے رستے کو تیزی سے روندتی بڑھتی چلی گئی۔ ہم گھر سے نکلے تو سویرا تھا مگر اب سورج سروں پر پہنچ چکا تھا اور دھوپ کی گرم نہایت بدل کر بھلی لگ رہی تھی۔ راستے میں ایک چھوٹے سے ہوٹل کے پاس بس والے نے بس روک دی۔ میں اور سلطان بھی نیچے اتر آئے ہم نے منہ ہاتھ دھویا سلطان نے ٹفن میں سے کھانا نکالا جو فاریہ نے جانے کب اسے دے دیا تھا۔ ہم نے ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کر کھانا کھایا، ہوٹل سے چائے منگوا کر پی اور دوبارہ بس میں آ بیٹھے۔

سفر پھر شروع ہو گیا مجھے اوگھ آگئی تھی۔ سلطان نے مجھے اٹھایا۔ ”بس تیار ہو جا۔ آگے اترنا ہے۔“ اس نے اپنا تھیلا کندھے پر لٹکاتے ہوئے کہا۔

میں بھی اترنے کے لیے تیار ہو گیا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا یہ ایک سرسبز علاقہ تھا۔ سڑک کے دونوں جانب اونچے اونچے درخت تھے۔ دور دور تک آبادی نہ تھی۔ مجھے حیرانگی ہوئی کہ سلطان کہاں اترنے کو کہہ رہا ہے مگر میں منہ سے کچھ نہ بولا۔

تقریباً بیس منٹ کے سفر کے بعد ہم ایک ایسی سڑک پر پہنچ گئے جس کے دائیں جانب

دور تک سروسوں کے کھیت تھے۔ سلطان نے بس وہیں رکوالی اور ہم دونوں اتر گئے۔ ”یہاں تو کہیں آبادی نہیں ہے؟“ میں نے سلطان سے پوچھا۔

”ہمیں آبادی میں نہیں جانا یا..... ہم راجہ کے ڈیرے پر جا رہے ہیں۔ وہ آبادی میں نہیں ویرانی میں رہتا ہے۔“ سلطان نے بیزار لہجے میں جواب دیا۔ ”تو چپ چاپ چلتا رہ۔“

پھر میں کچھ نہ بولا وہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ جب مجھے کچھ معلوم نہ تھا تو بولنے کی کیا ضرورت تھی۔ سلطان کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ اب ہم سروسوں کے ایک کھیت کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ چلتے چلتے گھٹنا بھر ہو گیا مگر کھیت شیطان کی آنت کی طرح لمبا ہوتا جا رہا تھا۔ میری پنڈلیوں میں اینٹھن سی ہونے لگی۔ اب مجھے اتنا پیدل چلنے کی عادت ہی کب رہی تھی۔ شہری زندگی نے جہاں مجھے بہت کچھ دیا تھا وہاں مجھ سے بہت کچھ چھین بھی لیا تھا۔ ورنہ میں تو میلوں بغیر تھکے چل لیتا تھا۔ مجھے ابا کا جملہ یاد آ گیا کہ بیٹا جتنا اپنے پیروں پر چلے گا اتنا ہی زیادہ جئے گا اور یہ پیر ہمیشہ طاقتور رہیں گے۔ ورنہ بڑھاپے میں دو سروس کا محتاج ہونا پڑے گا اور محتاج کی زندگی سے تو موت بہتر ہے۔ ابا کے اس پہلے نے مجھ میں بہت پیدا کی اور میں نے اپنی رفتار تیز کر دی کچھ ہی دیر بعد جب کھیت ختم ہوا تو میں اپنے سامنے بکھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے گھروندے دیکھ کر حیران ہو گیا۔ اب ہم ایک ایسی پگڈنڈی پر جا رہے تھے جو سیدھی گاؤں کی طرف جا رہی تھی۔ سورج آہستہ آہستہ مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ ہم بہتی کے ان گھروندوں کے درمیان پہنچ گئے اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ بابا جی کا گاؤں تھا۔ وہی گاؤں جہاں سے ہم پہلے بھی گزرے تھے اور جہاں میں نے ریشماں کی آنکھوں میں راجہ کے لیے بہت سے دیپ جلے دیکھے تھے۔ مگر راجہ نے اسے نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔ مجھے حیرت صرف یہ تھی کہ جب ہم پہلے یہاں آئے تھے تو وہ تمام راستہ تو بڑا پتھر پلا تھا میں نے سلطان سے پوچھا تو وہ ہنس دیا۔

”شہر چھوڑتے ہی تیری عقل نے بھی ساتھ چھوڑ دیا ہے کیا؟“

”نہیں یہ بات نہیں.....“ میں جھینپ گیا۔

”بے وقوف، وہ پرلی طرف کا راستہ تھا۔“

میں نے اس وقت واقعی خود کو بے وقوف محسوس کیا۔ چند لمحوں بعد سلطان ایک

دروازے پر رک گیا۔ اس نے دستک دی۔ دروازہ کھولنے والی ریشماں ہی تھی۔ اس نے سر سے پاؤں تک مجھے دیکھا پھر مسکرائی۔ ”تو بھی راجہ کا بچن ہے نا؟“

”جی!“ میں نے سر ہلایا۔

”اندر آ جاؤ“ سلطان ٹوکیا ہے، کہاں تھا اتنے روز؟“ اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

”اری کون ہے..... کبھی پلٹ کر نہیں بتاتی کہ کون ہے..... بس بولنا شروع کر دیتی ہے۔“ اندر سے بھرائی ہوئی آواز آئی۔

”راجہ کے ساتھی ہیں بابا.....“ وہ پلٹ کر زور سے بولی۔

”اوہ..... کون؟“

اتنی دیر میں ہم اندر داخل ہو چکے تھے۔ سامنے چھپر تلے، رضائی میں لپٹا بوڑھا بابا آنکھیں چندھیا کر ہمیں دیکھ رہا تھا۔

”میں ہو بابا جی، سلطان!“

سلطان اور میں اس کے قریب پڑی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ اس نے سلطان کو پہچان لیا۔ البتہ میرے بارے میں سلطان نے اسے یاد دلایا کہ میں کچھلی باران لوگوں کے ساتھ آیا تھا۔ ہمیں بیٹھے ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اچانک آندھی آگئی اور ہواؤں کے جھکڑوں کے ساتھ ہی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ ریشماں بھاگ کر چھپر تلے آگئی مگر لمحہ بھر میں ہی بارش سب کچھ بھگو گئی۔

ہم نے جلدی سے بابا جی کی چارپائی دونوں طرف سے پکڑی اور اندر کوٹھری میں لے آئے۔ ریشماں اتنی دیر میں دوسری چارپائی بھی اندر اٹھالائی۔ ٹھنڈی ہوائ نے میرے بدن میں کپکپی دوڑا دی تھی۔ اب اندھیرا ہو گیا تھا۔ ریشماں نے تیل کے استور چائے کی دیگچی چڑھا دی اور خود وہیں بیٹھ گئی۔

”بیٹا ایسے موسم میں تم لوگوں کو وہاں پہنچنا مشکل ہو جائے گا۔ ویسے بھی راجہ نے کہا تھا کہ ابھی اس طرف کوئی نہ آئے۔ اس نے ریشماں کو بھی منع کر دیا ورنہ وہ تو روز کھانا لے کر جاتی تھی۔“

”مگر کیوں بابا..... خیریت تو ہے نا؟“ سلطان نے تشویش ناک لہجے میں پوچھا۔

”آں..... ہاں..... کچھ بتایا تو نہیں تھا پر..... ٹھہر میں ریشماں سے پوچھتا ہوں۔“ یہ کہہ کر بابا نے ریشماں کو آواز دی۔

”جی بابا!“

”راجہ نے تجھے کیا کہا تھا ریشم؟“

”اس نے کہا تھا کہ مجھے کھانے کی ضرورت نہیں ہے اب ادھر نہ آنا اور سن کسی کو بھی نہ آنے دینا کوئی پوچھے تو کچھ نہ بتانا..... اور بس.....“ ریشماں نے راجہ کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔

”کوئی پوچھے تو کچھ نہ بتانا.....!“ سلطان زیر لب بڑبڑایا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ.....“

اس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ اچانک دروازہ دھڑدھڑا اٹھا۔ آواز اتنی زور کی تھی کہ ہم سب ہی اچھل پڑے۔

”کک..... کون؟“ ریشماں نے سسے ہوئے انداز میں پوچھا۔

”ٹھہر ریشم“ میں دیکھتا ہوں۔“ سلطان نے جلدی سے کہا اور ریشم سہم کر رک گئی۔ سلطان دروازے کی طرف بڑھا..... میری نگاہیں اس کے تعاقب میں تھیں۔ چھپر تلے سے نکلتے ہی وہ بارش کے پانی میں شرابور ہو گیا تھا۔ اس نے پوچھا..... ”کون ہے؟“

”دروازہ کھولو۔“ باہر سے گرج دار آواز آئی۔ اور سلطان نے دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی ریشماں کی چیخ گونج اٹھی۔

میں اور سلطان دونوں دروازے کی طرف لپکے۔ پولیس کی وردی میں ملبوس وہ لمبا چوڑا جوان مجھے دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی نظر آگیا۔ اس لمحے آسمان پر چمکنے والی بجلی میں مجھے دروازے کے قریب کھڑی پولیس جیپ بھی دکھائی دے گئی اور تبھی مجھے وہ طوفانی رات بھی یاد آگئی جس کی سیاہی میں آج تک اپنے پسو میں لپیٹے بھر رہا تھا۔ وہ رات جس رات پولیس میرے دروازے پر آئی تھی۔ ایسی ہی طوفانی رات تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پہلے میں بھولا بھالا بلا تھا جو قانون کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں جانتا تھا، مجبور تھا، مجھ پر چوری کا الزام تھا اور چوہدری میرا ایسا دشمن تھا جس کی طاقت سے ٹکر لینا میرے بس میں نہ تھا مگر آج میں اقبال تھا، میرے وجود کا بھولا پن مجھ میں بھڑکتے شعلوں نے جلا کر خاکستر کر دیا تھا اور آج میں قانون۔

کی تمام حدود سے واقف تھا۔

”ریشماں تیرا ہی نام ہے؟“ انسپکٹر کی گرجدار آواز سنائی دی۔

اس سے پہلے کہ ریشماں کوئی جواب دیتی، میں دروازے تک پہنچ گیا۔ میں نے لرزتی کانپتی ریشماں کو پیچھے کر دیا اور خود سینہ تان کر انسپکٹر کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ”جی فرمائیے انسپکٹر صاحب، کیسے زحمت کی؟“ میں نے بڑے پرسکون اور ٹھہرے ہوئے مگر مضبوط لہجے میں پوچھا۔

اسے شاید توقع نہیں تھی کہ یہاں اس سے اس قدر مضبوط لہجے میں گفتگو کرنے والا بھی مل سکتا ہے۔ اس نے مجھے سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا اور میری بات کا جواب دینے کی بجائے ریشماں سے مخاطب ہوا۔ ”یہ کون ہے؟“

”جی..... یہ.....!“ ریشماں روٹھائی ہوئی تھی۔

”میں اس کی خالہ کا بیٹا ہوں۔“ میں نے فوراً تیز لہجے میں جواب دیا۔ ”آپ کیا چاہتے ہیں اس سے؟“

”ہمیں اطلاع ملی ہے کہ راجہ یہاں آیا ہوا ہے۔“ اس نے میرے کاندھے سے اوپر اندر کی جانب جھانکتے ہوئے کہا۔

”اوہ نہ پتہ..... وہ یہاں نہیں آیا، کسی نے دشمنی میں تجھ سے کہہ دیا ہو گا۔“ میرے بولنے سے پہلے ہی بوڑھا بول اٹھا۔ جو کسی وقت ہمارے قریب آکھڑا ہوا تھا۔

”دیکھو باباجی..... میں تو بڑا لحاظ کرتا ہوں تمہارا، مگر تم جانتے ہو خان زادہ کیسا آدمی ہے، اوپر تک پہنچ جاتا ہے اور پھر میری نیندیں حرام ہو جاتی ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ میرے علاقے سے گزرے، اور اسے میرے ہاتھوں نقصان پہنچے۔“

”ہاں پتہ میں جانتا ہوں خان زادہ کو پر یہ سچ ہے کہ وہ یہاں نہیں آیا اگر آتا تو میں خود ہی اسے روانہ کر دیتا، اس کا نقصان تو گاؤں کا کوئی فرد بھی نہیں چاہتا، وہ تو فرشتہ ہے پتہ.....“

”ٹھیک ہے باباجی، ویسے ایک بات بتا دوں، میری نظریں بہت تیز ہیں اور مجھ پر اوپر سے بڑا دباؤ ہے، وہ نظر آگیا تو میں مجبور ہو جاؤں گا۔“ اس نے ذرا دھیمے لہجے میں کہا۔

میں ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سے حیران تھا۔ میں تو سمجھا تھا کہ پولیس آئی ہے، کوئی ہنگامہ ہو گا پھر راجہ کا نام سن کر تو میرا دم ہی نکل گیا تھا کہ پولیس کو علم ہو گیا کہ

ریشماں اور اس کا باپ راجہ کے بارے میں جانتے ہیں اور اب وہ ان دونوں کو گرفتار کر لے گی یا کم از کم ان پر تشدد کر کے راجہ کا پتا معلوم کرنے کی کوشش کرے گی مگر یہاں تو عجیب پراسرار سی گفتگو شروع ہو گئی تھی۔

”وہ یہاں نہیں آئے گا پتہ..... تو بے فکر رہ!“ باباجی نے بڑے رازدارانہ انداز میں جواب دیا۔

”اس کے حق میں یہی بہتر بھی ہے ورنہ.....“ انسپکٹر نے بھرپور نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے اونچی آواز میں کہا اور پلٹ کر جیب میں جا بیٹھا چند لمحوں بعد جیب اشارت ہوئی اور آگے بڑھ گئی۔

ہم سب جو بارش میں شرابور ہو چکے تھے دروازہ بند کر کے اندر چلے آئے۔

”مجھے یہی ڈر تھا..... یہی ڈر تھا مجھے.....“ باباجی زیر لب بولے۔

”کیا بات ہے بابا..... میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔“ میں نے بابا کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”پتہ خان زادہ ایک بلا کا نام ہے، آسیب ہے وہ جس نے اس گاؤں کی آزاد فضا کو دھیرے دھیرے ٹکٹا شروع کر دیا ہے۔ اس ہندو سادھو کے بعد یہ گاؤں آزاد ہو گیا تھا عذابوں سے مگر یہ خان زادہ..... خدا اسے غارت کرے، نہ معلوم اس گاؤں کو کس کی نظر لگ گئی ہے۔“

”میں اب بھی نہیں سمجھا بابا، اس سے پہلے جب ہم آئے تھے تو.....“

”نہیں اس وقت تو یہاں چین کا راج تھا پتہ، اس عذاب کو یہاں نازل ہوئے چند مہینے ہی گزرے ہیں۔ وہ نہ معلوم کہاں سے آگیا ہے مگر آتے ہی اس نے اپنی چوہدر راہٹ دکھانا شروع کر دی ہے۔ گاؤں کے سیدھے سادے لوگوں کو ورغلا کر ایک دوسرے کے خلاف نفرت بھردی ہے ان کے دلوں میں۔ اسے راجہ کے بارے میں پتا چل گیا کہ وہ ڈاکو ہونے کے باوجود یہاں ہر دل عزیز ہے بس..... پورے گاؤں میں پہرے لگا دیے اپنے آدمیوں کے، وہ نہیں چاہتا کہ وہ اس گاؤں میں آئے اور لوگوں کو پھر کسی مشکل میں پھنسا دیکھے، وہ جانتا ہے کہ راجہ کسی کی بد معاشی برداشت کر ہی نہیں سکتا۔ بڑے اثر و رسوخ والا ہے، اوپر تک پہنچ ہے اس کی، اسے پتا چل گیا ہو گا کہ ریشماں اس کے ٹھکانے سے واقف ہے اسی لئے پولیس

بھج دی یہاں مگر یہ جو سپاہی آیا تھا نا یہ بھی احسان مند ہے اس کا۔“

بات کچھ میری سمجھ میں آگئی تھی۔ ”باباجی! اگر ایسا ہے تو پھر خان زادہ کو بھی معلوم ہو گا کہ یہ سپاہی راجہ کا احسان مند ہے اور اگر اب تک نہیں معلوم ہوا تو جلد ہی معلوم ہو جائے گا“ ایسی صورت میں تو خطرہ اور بڑھ سکتا ہے۔ ممکن ہے وہ آپ لوگوں کو پریشان کرنے کے لئے کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرے۔“

”ہاں پتر..... وہ کر سکتا ہے، سب کچھ کر سکتا ہے پر کیا کریں، خدا پر بھروسہ کر کے بیٹھے ہیں وہی کچھ بہتری کی راہ نکالے گا۔“ اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”چھوڑ پتر تو کچھ آرام کر لے پھر رات کو ریشماں تجھے راجہ تک پہنچا دے گی۔“

”بابا..... ریشماں واپس کیسے آئے گی؟“

”میری فکر نہ کر بابو..... مجھے کچھ نہیں ہوتا۔“ ریشماں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور چارپائیوں پر کھیس بچھانے لگی۔

میرا ذہن الجھ گیا تھا۔ مجھے خطرے کی بو محسوس ہو رہی تھی مگر بابا اور ریشماں دونوں ہی پرسکون تھے۔ بارش تیز ہو چکی تھی۔ میں نے سلطان سے پوچھا کہ ہم راجہ تک کیسے پہنچیں گے؟“

”کچھ بھیگنا ہی تو پڑے گا“ اس تک پہنچنے کے لئے ان حالات میں یہ بہترین وقت ہے۔ کسی کو گمان بھی نہ ہو گا کہ ریشماں ایسے موسم میں اس کے ٹھکانے تک جاسکتی ہے۔“ سلطان نے جواب دیا۔

میرا جی چاہا کہ میں اسے بتاؤں خطرہ دھیرے دھیرے بڑھتا محسوس ہو رہا ہے مگر یہ بھی سچ تھا کہ یہ احساس ہونے کے باوجود میں اس کی وضاحت نہیں کر سکتا تھا۔ میں یہاں کے حالات سے ناواقف تھا اور نہیں جانتا تھا کہ میں کس قسم کے خطرے کی بو محسوس کر رہا ہوں۔ میں سلطان سے کچھ کہے بغیر لیٹ گیا۔ میں نے ذہن کو خالی کر دینا چاہا مگر اس میں ناکام رہا کوئی چیز تھی جو میرے دماغ میں ریگتی اور سرسراتی محسوس ہو رہی تھی۔

رات دھیرے دھیرے گہری ہوتی جا رہی تھی۔ ریشماں نے کمروں کی دیواروں میں بنے طاقوں میں دیے جلا دیے تھے اور خود شاید کھانا پکانے میں مصروف تھی کیونکہ مسلسل برتنوں کی آوازوں کے ساتھ ہی مٹی کے کچے توتے کی سوندھی سوندھی خوشبو مجھے بھوک کا احساس

دلارہی تھی۔ میرا خیال ٹھیک تھا۔ وہ کچھ ہی دیر بعد فرش پر پچھی درہی پر کھانا رکھ رہی تھی۔ ”آؤ باؤ روٹی کھاؤ۔“

میں اور سلطان دونوں اٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد ہم کھانے سے فارغ ہو گئے تو ریشماں نے کپڑے میں لپٹی روٹیاں اور ٹفن ٹائپ کے ایک ڈبے میں سالن ڈال کر ان دونوں کو ایک ٹوکری میں رکھا اور اپنی چادر اوڑھ کر کھڑی ہو گئی۔ ”چلو“ ان لوگوں کو بھی بھوک لگی ہو گی۔“ میں نے حیرت سے ریشماں کی طرف دیکھا۔ وہ کتنی بہادر لڑکی تھی۔ اتنی رات گئے وہ روزانہ اکیلے جاتی تھی اور آج تو موسم بھی خطرناک تھا۔ جاتے ہوئے تو ہم لوگ ساتھ ہوتے مگر آنا تو اسے تنہا ہی تھا پھر بھی وہ کتنی ہشاش بشاش تھی۔ اس کے چہرے پر کس خوف کا نام بھی نہ تھا۔

”بابا دروازہ بند کرلو۔ میں آؤں گی تو پہلے پچھلی دیوار بجائوں گی پھر دروازہ“ ایسا نہ ہو تو درمت کھولنا ورنہ وہ لوگ جان جائیں گے کہ میں گھر میں نہیں ہوں۔ سوتے بنے رہنا۔ ٹھیک ہے نا.....؟“ اس نے بابا کو ایسے سمجھایا جیسے وہ کوئی ننھا بچہ ہو۔

”ٹھیک ہے ریشم مگر..... تو جلدی آجانا“ پتر دیر ہو جاتی ہے تو میرا دل گھبرانے لگتا ہے اور آج تو جانے کیوں گھبراہٹ ہو رہی ہے۔“

”میں جلدی آ جاؤں گی۔“

”بابا..... آپ فکر نہ کریں۔ میں ریشماں کے ساتھ ہی واپس آ جاؤں گا۔ ایسے حالات میں اور اتنی رات گئے تنہا نہیں آنا چاہئے۔“

”ہاں..... ہاں پتر! یہ ٹھیک ہے، اس طرح مجھے اطمینان رہے گا اور تو کوئی بات نہیں“ ریشماں پہلے بھی اکیلی گئی آئی ہے مگر وہ خان زادہ آج نہیں ہے..... گاؤں میں“ اور وہ اچھا آدمی نہیں ہے پتر۔“

”آپ فکر نہ کریں میں واپس آؤں گا۔“

بابا نے دروازہ بند کر لیا۔ ہم چند لمبے دروازے پر کھڑے رہے۔ ریشماں چاروں طرف کا جائزہ لے رہی تھی۔ پھر اس نے ہمیں پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور اپنے مکان کی آڑ میں پچھلی طرف بڑھنے لگی۔ بارش کی تیزی میں کی آگئی تھی مگر پھر وہ اب بھی پڑ رہی تھی۔ باہر اندھیرا زیادہ گہرا نہیں تھا۔ ہم بہ آسانی چلتے ہوئے کافی دور نکل آئے۔ ریشماں نے ایسا راستہ اختیار کیا

تھا جو بل کھاتا ہوا سرسوں کے کھیتوں کی طرف جاتا تھا۔ ہم کچھ دیر تو کچے گھروندوں کے درمیان سے گزرتے رہے پھر جلد ہی ہم کھلے حصے میں نکل آئے جہاں جگہ جگہ جھاڑیاں تھیں جن سے بچتے بچاتے ہم کھیتوں میں داخل ہو گئے۔ یہ کھیتوں کے درمیان سے گزرنے والا پتلا سارا راستہ تھا۔ اب ہمارے دیکھ لئے جانے کا خطرہ ٹل چکا تھا۔ ہم نے رفتار تیز کر دی۔ میرا خیال تھا کہ ہمیں کھیتوں کی دوسری طرف جانا ہے جہاں سے گزر کر میں اور سلطان اس گاؤں پہنچے تھے مگر تقریباً کھیتوں کے درمیان میں پہنچتے ہی ریشماں نے راستہ تبدیل کر لیا۔ آدھے گھنٹے کے بعد ہم کھیتوں سے باہر نکل آئے اور وہاں سے ڈھلوان شروع ہو گئی۔ ڈھلوانی علاقہ بارش کی وجہ سے بہت خطرناک ہو گیا تھا۔ مجھے اور سلطان کو سنبھل سنبھل کر چلنا پڑ رہا تھا مگر ریشماں یوں چل رہی تھی جیسے کسی پگڈنڈی پر چل رہی ہو ڈھلوان کے بعد ہی جنگل شروع ہو گیا۔ ہم جنگل میں داخل ہو گئے جنگل میں داخل ہوتے ہی ریشماں نے ہم دونوں کو روک دیا۔

”تم دونوں یہاں رکو۔“

”مگر.....!“ میں نے کہنا چاہا۔

”وہ اندھیرے میں تم دونوں کو میرے ساتھ دیکھ کر سوچ سکتے ہیں کہ تم دونوں مجھے زبردستی یہاں تک لائے ہو اور ان لوگوں کے دشمن ہو۔ تم یہاں رکو میں جا کر انہیں بتا دوں گی کہ تم دونوں راجہ سے ملنے آئے ہو۔“

”ریشم صحیح کہتی ہے بالے۔“ سلطان کا جواب سن کر میں خاموش ہو گیا۔

ریشماں ہمیں وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔ میں اور سلطان درخت کے نیچے تنے سے لگ کر کھڑے ہو گئے۔ پھوار اب تیز ہو گئی تھی، کبھی کبھی چپکنے والی بجلی لمحہ بھر کو اجالا سا پھیلا کر غائب ہو جاتی تھی۔ اس لمحے بھر کے اجالے میں سارا ماحول عجیب ہیبت ناک سا محسوس ہوتا تھا۔

”یہ لڑکی ہے یا چھلاوہ؟“ میں نے سلطان سے کہا۔

وہ ہنس دیا۔ ”کافی جی دار ہے۔ ویسے راجہ سے تعلق رکھنے والی لڑکی کو جی دار ہی ہونا

چاہئے۔“

”کیا مطلب! کیا وہ اور راجہ.....“

”نہیں راجہ نہیں مگر وہ تو راجہ پر جان دیتی ہے نا، خوب جانتی ہے کہ اسے ڈرپوک لوگ پسند نہیں ہیں۔ ویسے محبت بڑی جرأت پیدا کر دیتی ہے بالے..... یہاں اتنی دوز رات کو اکیلا آنا اور پھر واپس بھی جانا اور وہ بھی ایک لڑکی کے لئے بڑا خوفناک کام ہے۔“

اس سے پہلے کہ میں جواب دیتا ہمیں آہٹ محسوس ہوئی۔ کوئی ہماری طرف آ رہا تھا۔ میں اور سلطان چوکنے ہو گئے۔ میں نے درخت کی آڑ لے لی اور سلطان زمین پر بیٹھ گیا۔ وہ جو بھی تھا اب قریب آچکا تھا۔ میں ساکت کھڑا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ راجہ کے ساتھیوں میں سے ایک ہو گا کیونکہ وہ اسی طرف سے آیا تھا جس طرف ریشماں گئی تھی۔

”سلطان.....!“ ایک سرگوشی ابھری۔

سلطان کھڑا ہو گیا۔ میں بھی درخت کی آڑ سے نکل آیا۔

”کون.....؟“ سلطان نے پوچھا۔

”دادو۔“ جواب ملا۔

میرے لئے یہ نام اجنبی تھا۔ سلطان آگے بڑھ کر اس سے لپٹ گیا۔ وہ ہمیں لئے ہوئے آگے بڑھا۔ تقریباً دس منٹ چلتے رہنے کے بعد ہم گھاس پھوس سے بنے ہوئے ایک جھونپڑے میں داخل ہو گئے۔ باہر سے اس جھونپڑے پر اتنی جھاڑیاں اور کانٹے ڈالے گئے تھے کہ کوئی دیکھنے والا یہ محسوس ہی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ کوئی پناہ گاہ بھی ہو سکتی ہے۔

اندرا داخل ہوتے ہی میری نگاہ گھاس پھوس کے اس بستر پر پڑی جس پر راجہ لیٹا ہوا تھا اور اس کے قریب ہی ریشماں پریشان کھڑی تھی۔

”سردار.....“ سلطان راجہ کو دیکھتے ہی آگے بڑھا اور اس کے ہاتھ آنکھوں پر لگا کر

چوم لئے۔ راجہ نے بڑی محبت سے اسے تھپ تھپایا۔ پھر میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔

”کیسا ہے تو..... کیا نام ہے تیرا.....“ بالابالا ہے نا؟“

”جی سردار، آپ کی مہربانی ہے سردار ورنہ میں جیتا نہ ہوتا، یہ زندگی آپ کی دین

ہے۔“ میں نے بھی اس کے ہاتھوں کو چومتے ہوئے جواب دیا۔

”نہیں اوئے..... یہ کفر کی باتیں ہیں.....“ تو تو بالکل شہریوں والے انداز میں

باتیں کر رہا ہے۔“

”سردار آپ کو بخار ہے!“ میں نے اس کے گرم ہاتھوں اور جلتی ہوئی آنکھوں سے

محسوس کر کے کہا۔

”بس ایسے ہی، موسم کی وجہ سے ہو گیا۔ بارش تھم گئی کیا؟“

”نہیں تھی تو نہیں البتہ ہلکی ضرور ہو گئی ہے۔“ میرے بولنے سے پہلے دادو نے جواب

دیا۔

”بیٹھو تم لوگ۔“ اس نے ہمیں اشارہ کیا پھر دادو سے مخاطب ہوا۔ ”دادو تو اس رضیہ

سلطانہ کو گھر چھوڑ آ۔“ اس کا اشارہ ریشماں کی طرف تھا۔

رضیہ سلطانہ کے نام پر مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی۔ ریشماں نے مجھے گھور کر دیکھا۔

”یہ نہ کہا کر مجھے!“ اس نے غصے میں کہا۔

”تجھے کیوں برا لگتا ہے؟“ راجہ شرارت کے موڈ میں تھا۔ مجھے اس وقت وہ بہت اچھا

اور بہت مختلف سالگاہ۔ وہ ہر وقت غصے میں رہنے والا اور مسلسل آنچ دینے والا راجہ جیسے وقت

کی دھند میں کہیں کھو گیا تھا میں نے اسے کبھی اتنا ملائم اور اتنا خوش نہیں دیکھا تھا۔ یہ حقیقت

ہے کہ مجھے وہ اس موڈ میں بے حد اچھا لگا۔

”ہاں برا لگتا ہے میں ریشم ہوں اور بس.....“ ریشم نے منہ پھلا کر جواب دیا۔

”حکایتیں تو تیری رضیہ سلطانہ والی ہیں۔ کتنی مرتبہ کہا ہے تجھ سے کہ یوں اکیلی اس

گھنے جنگل میں رات گئے منہ اٹھا کر نہ آجایا کر۔“

”انہیں لے کر آئی تھی۔“ اس نے ہم دونوں کی طرف اشارہ کیا۔

”آج.....“ مگر بندرہ روز سے تو ہر روز کسی نہ کسی بہانے آ جاتی ہے۔“

”تم بیمار ہو۔“ اس نے معصومیت سے کہا۔ اس کے لہجے میں بے پناہ محبت موجزن

تھی۔ لمحہ بھر کو جھونپڑے میں سناٹا چھا گیا۔ ریشماں کی محبت بھری تشویش کو سہمی نے محسوس کیا

تھا حتیٰ کہ راجہ بھی اسے حیرت سے دیکھنے لگا مگر جلد ہی اس نے نگاہیں چرائیں۔

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے..... دادو اسے چھوڑ آ۔“

”وہ..... راجہ..... انکسٹر آیا تھا۔ کتنا تھا خان زادہ دباؤ ڈال رہا ہے۔ راجہ تو

یہاں سے چلا جاوے وہ تجھے گرفتار کر لیں گے۔“

لمحہ بھر پہلے شبنم محسوس ہونے والا راجہ، اچانک شعلہ بن کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ”وہ

کتنا..... مجھے گرفتار کرائے گا..... اس سے کہہ دینا ریشم کہ راجہ کسی ایسی چیز کا نام

نہیں جسے آسانی سے قابو کیا جاسکے اور یہ بھی کہہ دینا کہ موت راجہ کی صورت میں تجھ سے

قریب آچکی ہے۔ میں اس کے گرد آگ کا وہ حصار بنادوں گا کہ اس کا وجود لمحہ لمحہ آج سے

پگھل کر اس کی ہڈیوں سے الگ ہو جائے گا۔“

راجہ کا لہجہ نفرت انگیز تھا۔ ریشم سہم کر کونے میں جا کھڑی ہوئی۔ راجہ کی آنکھیں

سرخ ہو چکی تھیں۔ وہ غصے میں کانپ رہا تھا۔

”سردار یہ خان زادہ کون ہے، مجھے اس کا ٹھکانہ بتادیں اور پھر آپ آرام کریں۔“ میں

نے دھیرے سے کہا۔

”نہیں اوئے..... راجہ اپنا شکار خود کھیلتا ہے۔“ وہ غرا کر پلٹا۔

”میرے اوپر قرض ہے سردار، میں یہ بوجھ اتارنا چاہتا ہوں۔“

”نہیں بالے تجھ پر اتنا بوجھ نہیں ہے جتنا مجھ پر ہے۔ سات لاشوں کا بوجھ ہے مجھ پر

بالے..... سات لاشوں کا۔ خان زادہ کے جسم کے سات ٹکڑے کروں گا میں، پھر ان

ٹکڑوں کو ایک ایک کر کے آگ میں ڈالوں گا۔“

”راجہ ایسی باتیں نہ کر، ایسی باتیں نہ کر راجہ.....“ ریشماں رو پڑی۔

ریشماں کے آنسوؤں نے جیسے راجہ کے وجود میں بھڑکنے والی آگ کو بجھا دیا۔ وہ بستر پر

ڈھے گیا۔ ”تو..... گئی کیوں نہیں؟“

”میں..... نہیں جاؤں گی میں، تیرے ساتھ ہی مروں گی۔ مجھے بھی جلا ڈالنا آگ

میں، جس آگ میں میں جل رہی ہوں وہ تو نہ جینے دیتی ہے اور نہ مرنے.....“ وہ دوڑ کر

راجہ کے پیروں کے قریب بیٹھ گئی۔

”پگلی جا چلی جا..... تیرا بوڑھا باپ تیری راہ دیکھ رہا ہو گا اور سن جب تک خطرہ ہے

اس طرف نہ آنا..... مجھے کچھ نہیں ہو گا۔“ آخری جملہ اس نے یوں کہا جیسے ریشماں کی

محبت نے اسے ہر دیا ہو۔

وہ جانا تو نہیں چاہتی تھی مگر ہم سب نے اسے مجبور کر کے بھیج دیا۔ میں نے اس سے

وعدہ کیا تھا کہ راجہ کو کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ یہ وعدہ میں نے اپنے آپ سے بھی کیا تھا میری

تو تمام محبتیں ختم ہو چکی تھیں مگر میں ریشماں کی محبت کو ختم نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ میرے

یقین دلائے پر ریشماں چلی گئی۔ یہاں آنے سے پہلے میرا ارادہ تھا کہ میں ریشماں کی حفاظت کی

خان زادہ ہے بالے۔ خان زادہ نے بھی اسی لڑکی سے محبت کی تھی جسے راجہ کی محبت نے پارس بنا دیا تھا۔ وہ اس لڑکی کو حاصل نہ کر سکا تو اس نے راجہ کے بھرے گھر کو آگ لگا دی جس میں اس کی ماں، بہن، بھائی، باپ اور راجہ کی محبت، اس کی بیوی بھی جل مری تھی بالے..... اور ظلم تو یہ کہ وہ ماں بننے والی تھی۔ راجہ دن اور رات آنے والے ننھے فرشتے کے خواب دیکھا کرتا تھا مگر وہ فرشتہ دنیا میں آنے سے پہلے ہی زندہ درگور کر دیا گیا۔ بس اسی روز

سے راجہ ایک شعلے میں تبدیل ہو گیا۔ اس نے خان زادہ کی حویلی کو آگ لگا دی..... اس کے کھیت کھلیان اور مویشی جلا ڈالے مگر جانے خان زادہ کیسے بچ گیا۔ راجہ تو سمجھا تھا کہ وہ بھی جل مرا ہو گا مگر..... جانے کیسے ہوا یہ کہ وہ بچ گیا۔ تجھے بیگ صاحب کے پاس چھوڑنے کے بعد ہم لوگ کراچی چلے گئے تھے۔ وہاں راجہ کو کوئی کام تھا، وہیں ایک روز اچانک راجہ اور خان زادہ کا آمناسمانا ہو گیا مگر وہ ایسی جگہ تھی کہ وہ لوگ ایک دوسرے کو کچھ نہ کہہ سکے لیکن اس روز کے بعد راجہ کا سکھ چین ختم ہو گیا۔ راجہ کراچی سے سیدھا اپنے گاؤں پہنچ گیا۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ خان زادہ اب گاؤں میں نہیں رہتا مگر یہ بھی معلوم ہوا کہ اس نے اپنے آدمی راجہ کے پیچھے لگا دیے ہیں۔ وہ اثر و رسوخ والا آدمی ہے۔ شاید اس کے آدمیوں نے ہی راجہ کی یہاں موجودگی کے بارے میں اسے اطلاع دی ہوگی۔ یہ گاؤں خان زادہ کے چچا کی جاگیر تھا مگر یہ بات بہت پرانی ہے اب تو وہاں ایسا کوئی بھی نہیں تھا کہ جو دعویٰ کرتا مگر خان زادہ نے اپنا گاؤں چھوڑنے کے بعد یہاں آکر پرانی حویلی کو آباد کر دیا اور دھیرے دھیرے اپنے پاؤں جمائے۔ یہ سب ہمیں یہاں آکر پتا چلا تھا۔ راجہ کے خوف سے وہ حویلی میں چھپا بیٹھا ہے، اس نے محافظوں کی ایک ٹیم پال رکھی ہے مگر راجہ کہتا ہے کہ وہ جب تک خان زادہ کو جلا کر ختم نہیں کر دے گا یہاں سے نہیں جائے گا۔ خان خاموش ہوا تو دور تک گہری خاموشی چھا گئی، بس بارش اور ہوا کی آواز تھی جو چاروں طرف گونج رہی تھی۔

”مگر ایسی حالت میں یہاں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں ہے خان۔“ پھر میں نے بتایا کہ کس طرح رہنشاں کے گھر انسپکٹر آیا تھا۔ وہ یہ سن کر پریشان ہو گیا۔

”مگر سردار کچھ سننے کو تیار نہیں۔ وہ نہیں مانے گا۔ میں اسے خوب جانتا ہوں۔“ خان نے گہری سانس لے کر جواب دیا۔ ”ہمارا تو کچھ نہیں ہے دوست، ہم تو تنہا ہیں، جان بھی دے کر اسے بچانے کی کوشش کر سکتے ہیں مگر وہ تو خان زادہ کو اپنے ہاتھوں سے مارنا چاہتا ہے۔“

وجہ سے اس کے ساتھ ہی واپس جاؤں گا مگر جب میں نے دیکھا کہ دادو اسے گھرتک چھوڑنے جا رہا ہے تو میں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور خود وہیں رہ گیا۔

راجہ کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ اس کا بخار بڑھتا جا رہا تھا۔ اس پر غشی طاری ہو رہی تھی۔ میں نے سلطان سے کہا وہ ٹھنڈا پانی لادے۔ وہ پانی لے آیا تو میں نے رومال پانی میں بھگو کر راجہ کے ماتھے پر رکھ دیا۔

”سلطان، خان وغیرہ نظر نہیں آرہے۔“ میں نے سلطان سے پوچھا۔
”خان، سردار کے لئے دوا لینے گیا ہے۔ دلاور اور کریم باہر پہرہ دے رہے ہیں، باقی لوگ نامعلوم کہاں ہیں۔ مجھے دادو نے انہی لوگوں کے بارے میں بتایا ہے۔“ سلطان نے جواب دیا۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ میں پانی سے بھیگا رومال رکھتا رہا۔ کافی دیر بعد راجہ کا بخار کچھ کم ہوا۔ اسی لمحے کریم کے ساتھ خان جھونپڑے میں داخل ہوا اور مجھے اور سلطان کو دیکھ کر حیران ہو گیا۔ ”تم لوگ کب آئے؟“
”کافی دیر ہو گئی۔ تم دوا لائے ہو؟“ سلطان نے پوچھا۔

”ہاں..... کیسا ہے سردار؟“ اس نے سوئے ہوئے راجہ کی طرف دیکھا اور تھیلے میں سے کچھ ٹیبلٹس نکال کر میری طرف بڑھا دیں۔ میں نے پیٹا ڈول کی گولی نکال لی مگر راجہ بے خبر سو رہا تھا۔ میں نے اسے نیند سے جگانا مناسب نہ سمجھا اس کے لئے آرام بھی اتنا ہی ضروری تھا جتنا کہ دوا۔

سردی بڑھی گئی تھی۔ تیز ہوا کے ساتھ بارش بھی تیز ہو گئی تھی۔ میں نے اپنی چادر بھی راجہ کو اوڑھا دی۔ کریم نے اینٹوں کے درمیان بنے ہوئے چھوٹے سے گڑھے میں کچھ لکڑیاں ڈال کر آگ جلا دی اور میں، سلطان اور خان آگ کے گرد بیٹھ گئے۔ کریم واپس باہر چلا گیا۔ تب میں نے خان سے خان زادہ کے بارے میں پوچھا کہ وہ کون ہے اور کیوں راجہ کے پیچھے پڑا ہوا ہے اور یہ کہ راجہ کی اس سے کیا دشمنی ہے؟

”یہ لمبی داستان ہے بالے۔ یوں سمجھ لے کہ یہی خان زادہ ہے جس نے راجہ کو ایک بھیاںک روپ میں قید کر دیا تھا وہ سیدھا سادا راجہ جسے صرف اور صرف محبت کی تلاش تھی اور جس نے اپنی محبت کو حاصل بھی کر لیا تھا اسے نفرت کی بھٹی میں جلا کر ڈال دینا والا یہی

اس نے خود کو تنہا کہا تو مجھے یاد آیا کہ میں تو اپنے سینے میں اس کے لئے خوشخبری چھپائے بیٹھا ہوں۔

”اور وہ..... شادو.....“ میں نے ایک دم کہا تو وہ اچھل پڑا۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

”کک..... کیا کہا تو نے؟“

میں مسکرایا۔ ”ہاں خان..... تیرا انتظار کرنے والے تو بہت ہیں خان، چاچا.....“

چاچی، شادو..... اور سب سے بڑھ کر شانی.....“

”شانی.....!“ اس کے ہونٹوں سے سرسراہٹ ہوئی آواز نکلی۔ ”وہ تو..... جانے کہاں ہوگی۔“ وہ خواب کے عالم میں بولا پھر چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

”خان..... میرے دوست تیری بہن، تیری شادو اور چاچا، چاچی کے ساتھ مل کر تیری راہ تک رہی ہے۔“

وہ بے قراری سے آگے بڑھا اور اس نے میرے دونوں شانے تھام لئے۔ ”بالے ٹوکیا کہہ رہا ہے..... تو سچ کہہ رہا ہے نا؟ مگر تو ان سب کو کیسے جانتا ہے اور..... شانی..... شانی.....“

تب میں نے اسے شروع سے آخر تک ساری داستان سنا دی۔ خان کی حالت خراب ہو رہی تھی کبھی تو لگتا تھا جیسے وہ رونے والا ہو اور کبھی وہ قہقہہ مار کر ہنس دیتا تھا۔

”خان“ میں تیری شانی سے وعدہ کر آیا ہوں کہ تجھے بہت جلد وہاں بھیجوں گا۔ پلیز خان ایسا نہ کرنا کہ وہ سب مجھے وعدہ خلاف سمجھ لیں۔ وہ سب تیرا انتظار کر رہے ہیں۔“ میں نے کہا تو وہ مجھ سے پلٹ گیا۔

”میں..... میں جاؤں گا بالے..... تو نہیں جانتا بالے کہ شانی کو کھو دینے کی غلطی نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا تھا۔ میں نے ہمیشہ خود کو مجرم سمجھا کہ وہ میری وجہ سے کھو گئی، میں تیرا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا بالے..... کبھی نہیں۔“

ایک بوجھ تھا جو اتر گیا۔ خان یہ سب سن لینے کے بعد ایسا مگن ہوا کہ وہیں پتھر پر سر ٹکا کر لیٹ گیا۔ پھر میں نے اس کے چہرے پر ہزاروں رنگ اترتے دیکھے اور میں خود بھی قریب ہی آنکھیں موند کر لیٹ گیا۔ میں اس وقت خود کو بہت تنہا، اکیلا اور خالی خالی محسوس کر رہا

تھا۔ میرے اندر، میرے ارد گرد کوئی بھی نہ تھا، میرے سارے رنگ جیسے حالات کی دھوپ نے اڑا دیے ہوں۔ میرے سامنے صرف ایک منظر تھا، وہ اندھیرا اور قبر نما کرا، جہاں فرش پر میرے باپ کی سرد لاش پڑی تھی اور میری ماں کے حلق سے نکلنے والی عجیب عجیب آوازیں تھیں جنہوں نے مجھے جکڑ رکھا تھا۔ یہ آخری بوجھ تھا جسے میں جلد از جلد اتارنا چاہتا تھا۔ راجو اور چوہدری کے بھیانک چہرے اور ان کی درندہ آنکھوں میں تیرتی خباثت کی چمک تھی جو اندھے راستوں میں مجھے کشاں کشاں اپنی طرف بلا رہی تھی۔ اب مجھ میں اور ان میں بہت کم فاصلہ تھا۔ میرے وہ تمام جذبے جو ناتمام تھے، رہ رہ کر ماں کی پرسکون آغوش کی خواہش کو شدید کر رہے تھے۔ میں نے خود پر طاری ہو جانے والے اقبال کو کھڑچ کر پھینک دیا تھا۔ میں وہی بالا بن جانا چاہتا تھا جسے لوٹا گیا تھا اور جو اپنے لٹ جانے پر انتقام لینا چاہتا تھا اور نہ یہ اقبال تو قدم قدم پر مجھے روک رہا تھا۔ کبھی انسانیت کا واسطہ دے کر اور کبھی تہذیب کو آڑے لا کر اور وہ بالا جو مجھ میں کہیں بہت اندر پڑا سسک رہا تھا۔ مجھے اندر سے دلوچے ہوئے تھا اور اس کے تیز نوکیلے پنچے میرے وجود میں خراشیں سی ڈال رہے تھے۔ دلوچے جانے کی یہ کیفیت بہت اذیت ناک تھی، ان تمام اذیتوں سے زیادہ وحشت ناک جنہیں اب تک میں سہتا آیا تھا۔ میں اس راجو کو زندہ چھوڑ دینے کو گناہ تصور کرتا تھا جس نے میری بہن صغرا کے پھول سے بدن کو لورنگ کیا تھا۔ وہ راجو جس نے میرے باپ کو موت کی نیند سلا دیا تھا اور سب سے بڑھ کر میری محبت کو لوٹ لیا تھا۔ وہ سوہنی جو محض میرا خواب دیکھنے کی سزا میں لوٹی گئی اور اسے مجھ سے جدا کر دیا گیا۔ میرے ہنستے ہستے گھر کو اجاڑ دینے والا راجو اور اس کی موت ہی میری منزل تھی۔ مجھے اندھی رات کے غار میں اتارنے والا راجو میرے دل و دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برس رہا تھا اور میں سکون چاہتا تھا ایسا سکون کہ کوئی آواز ہو نہ تصور نہ کوئی جذبہ اور نہ کوئی احساس۔ بس میں ہوں، میں ہوں اور بس میں ہوں یا میری ماں کی محبت بھری آغوش۔ یہ میرا آخری خواب تھا اور جس کی تعبیر حاصل کرنے کا میں نے تہیہ کر لیا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اب اس خواب کی تعبیر اپنی قسمت کو بھی نہیں چھینے دوں گا۔

میں عذاب سوچوں میں گھرا رہا اور وقت جانے کب اور کیسے گزرتا چلا گیا۔ اچانک میں نے آہٹ محسوس کی۔ گردن پھیر کر دیکھا تو راجہ کو چاق و بند کھڑا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ کہیں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے اپنے سرہانے سے ریو اور نکال کر نیچے میں اڑسا۔ وہ

شاید نہیں جانتا تھا کہ میں جاگ رہا ہوں۔ میں نے بھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیا اور دھیرے سے اپنا بازو آنکھوں پر اس طرح رکھ لیا جیسے میں سو رہا ہوں مگر میں ایک جھری سے اسے بہ غور دیکھ رہا تھا۔ سلطان اور خان دونوں بے خبر سو رہے تھے۔ راجہ نے جھونپڑے سے نکلتے وقت ایک نگاہ ہم تینوں پر ڈالی اور دبے پاؤں باہر چلا گیا۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کہاں گیا ہے اور اس کا کیا ارادہ ہے اور یہ بھی کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میں کچھ دیر انتظار کرتا رہا پھر بے چین ہو گیا تو میں نے خان کو جگا کر اسے ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ مجھے ڈر تھا کہ راجہ گاؤں کی طرف نہ نکل جائے جہاں پولیس اس کی گھات میں بیٹھی ہے۔ خان میری پوری بات سننے سے پہلے ہی معاملے کو سمجھ گیا اور باہر کی طرف بھاگا۔ میں اس کے پیچھے لپکا۔ سلطان بھی اٹھ گیا تھا وہ بھی میرے ساتھ ہی باہر آگیا۔ باہر گھور اندھیرا تھا اور بارش اب بھی ہو رہی تھی۔ سخت سردی تھی جو راجہ کے لئے بہت خطرناک بھی ہو سکتی تھی کیونکہ اسے سخت بخار تھا۔ میں اور سلطان گہرے اندھیرے میں آگے بڑھنے لگے۔ ابھی ہم زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ ہمیں خان کی آواز سنائی دی جو ہمیں پکار رہا تھا۔ ہم آواز کی سمت بڑھے آسمان پر چمکنے والی بجلی کی چمک ہمیں راستہ دکھا رہی تھی۔ اسی چمک میں ہمیں خان بھی نظر آگیا جو زمین پر جھکا ہوا تھا۔

”بالے..... اٹھاؤ اسے.....“

”کون ہے؟“

”سردار!“

تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ زمین پر پڑے راجہ پر جھکا ہوا تھا۔ ہم نے راجہ کو اٹھا کر جھونپڑے میں پہنچایا۔ وہ بری طرح بخار میں پھنک رہا تھا۔

”نہیں..... مجھے چھوڑ دو..... میں خان زادہ کو..... جلاؤ لوں گا۔“ وہ غشی کے عالم میں بڑبڑایا۔

”تم ٹھیک تو ہو جاؤ سردار“ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس کتے کی لاش تمہارے قدموں میں لاکر ڈال دوں گا۔“ خان نے اس کے کندھے کو تھپتھپایا۔

”نہیں..... اس کتے کو میں خود ماروں گا..... بہت جان ہے مجھ میں..... میں نے اس سے وعدہ کیا تھا خان، جب اس نے میری بانہوں میں دم توڑا تھا تو اس کی آنکھوں میں

بھرے سب خواب خون آلود تھے خان، اسے بچے کی بہت تمنا تھی، خدا نے ہمیں بچہ دیا تھا خان، مگر اس کتے نے ہمیں اس کی صورت دیکھے بغیر ہی ہم سے چھین لیا، وہ بچہ میرا اور زیو کا خواب تھا، آرزو تھا ہماری، ابھی تو میں نے زیو کو جی بھر کر پیار بھی نہیں کیا تھا خان..... ابھی تو بہت سی باتیں تھیں جو ان کی رہ گئیں..... نہیں خان..... وہ میرے حلق کا کاٹا ہے، میں اسے تباہ کر دوں گا.....“ وہ بولے جا رہا تھا اور ہم سب کی آنکھیں بھگی چکی تھیں۔ اسے کچھ ہوش نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے مجھے اس وقت وہ بہت معصوم لگا۔ اس کی شخصیت کا وہ مضبوط خول جو اس نے خود پر چڑھا رکھا تھا ٹوٹ چکا تھا اور اس کے اندر سے جو راجہ نکلا تھا وہ بہت بے بس، بہت دکھی اور بہت مجبور تھا، آنسوؤں میں بھیگا ہوا ایک بے بس انسان۔ اس کے اس روپ نے مجھے تڑپا کے رکھ دیا تھا۔

”ہاں سردار..... میں جانتا ہوں۔ میں جانتا ہوں سردار کہ تو بہت دکھی ہے.....“ خان بے اختیار رو دیا۔

میں اٹھ کر جھونپڑے سے باہر آگیا۔ راجہ کا دکھ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا یا شاید میرے اپنے اندر بھرے دکھ باہر آنے کو بے چین ہو رہے تھے، میں باہر آکر بے ساختہ رو دیا اور اتنا رویا کہ میرے جی کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ بارش اب ختم چکی تھی اور آسمان کے کنارے سرمئی ہونے لگے تھے۔ میرا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ میں اندر جاؤں۔ میں باہر ہی ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ سلطان اور خان دونوں راجہ کے پاس تھے۔ دادا ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ اب مجھے اس کی طرف سے تشویش ہونے لگی تھی۔ معلوم نہیں راجہ نے اسے واپس آنے کو کہا بھی تھا یا نہیں۔ راجہ کی ایسی حالت نہیں تھی کہ میں اس سے کچھ پوچھتا۔ دھیرے دھیرے میرے اندر بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کچھ ہو گیا ہے یا جیسے کچھ ہونے والا ہے یہ کیفیت میرے لئے نئی نہیں تھی۔ اب سے پہلے بھی میں اس کیفیت کو محسوس کر چکا تھا، آپ اسے میری چھٹی جس کہہ سکتے ہیں اس لئے کہ ایسا محسوس کرنے کے بعد واقعی کچھ نہ کچھ ہوا ضرور تھا۔ یہ بے چینی اور بڑھی تو میں گھبرا کر جھونپڑے میں چلا آیا۔

اندر حالات کافی بدلے ہوئے تھے۔ راجہ دیوار کے قریب پڑے پتھر سے کمر ٹیک کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں مگنا تھا اور گے سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ دوسری طرف سلطان اور خان بیٹھے ہوئے تھے۔ آگ جلی ہوئی تھی اور سلطان چائے گوں میں سے نکال رہا تھا۔ راجہ

اس وقت کافی بہتر حالت میں تھا البتہ اس کی آنکھوں کے سرخ ڈورے کچھ اور گہرے ہو رہے تھے۔

”اب آپ کیسے ہیں سردار؟“ میں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”ٹھیک ہوں بالے۔ زندگی میں پہلی بار بیمار ہوا ہوں۔ شاید ٹوٹ چکا تھا اس لئے..... جب انسان خود کو بہت زیادہ مضبوط اور بے حس سمجھ رہا ہوتا ہے تو..... دراصل وہ اور کمزور اور حساس ہو چکا ہوتا ہے اور اپنی اس کمزوری کو پوری طرح سمجھ بھی رہا ہوتا ہے تبھی وہ خود پر بے حسی اور مضبوطی کا خول چڑھا لیتا ہے مگر جب وہ مصنوعی خول اس پر ضرورت سے زیادہ دباؤ ڈال دیتا ہے تو وہ بکھر جاتا ہے اور مضبوطی کے اس کے خول کے بعد بکھر جانا بڑا تباہ کن ہوتا ہے۔ میری باتیں سمجھ رہا ہے نا تو.....؟ یہ خول تو بھی اتار دے۔ خود کو ہلکا پھلکا کر دے جو کچھ کرنا چاہتا ہے کر گزر..... جتنا برداشت کرے گا اتنا ہی کمزور ہوتا چلا جائے گا..... جیسے..... جیسے میں.....“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس نے خود پر جتنا جبر کیا تھا اتنا ہی بکھر چکا تھا۔ جس راجہ سے میں پہلی بار ملا تھا اس راجہ میں اور آج کے نڈھال اور تھکے تھکے راجہ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

میں جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ اچانک باہر آہٹ ہوئی۔ میں اور خان اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ اس لئے کہ آہٹ کے ساتھ ہی ایک نسوانی دبی دبی چیخ سنائی دی تھی۔ چیخ کی آواز شاید راجہ نے بھی سن لی تھی۔ وہ ایک ہی پھلانگ میں جھونپڑے کے دروازے پر پہنچ گیا مگر اس سے پہلے کہ ہم جھونپڑے سے باہر نکلتے، ریشماں بھاگتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور قلابازی کھا کر فرش پر لڑھک گئی۔ ابھی ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا کہ ایک لمبا تڑنگ آدمی جھونپڑے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالتور تھا۔

”راجہ.....“ ٹوکب تک مجھ سے بھاگتا۔ آج میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ اس نے غزا کر کہا۔

”اچھا ہوا خان زادے کہ تو خود ہی چل کر یہاں آگیا۔ تیری تلاش میں بھٹکتے بھٹکتے تو میری قوت برداشت بھی جواب دیتی جا رہی تھی۔“ راجہ نے اطمینان سے جا ب دیا۔

”تجھ سے دشمنی شروع کرانے والی بھی عورت تھی راجہ، وہ عورت جو تیری محبت میں

پاگل ہو چکی تھی اور تجھے انجام تک پہنچانے والی بھی عورت ہے۔ یہ عورت جو تیری محبت میں پاگل ہے۔ ویسے میں اس کا شکر گزار ہوں کہ اسی کی وجہ سے تیرے ٹھکانے تک پہنچ گیا، اور وہ تیرا محافظ کتابتہ جو اسے پہنچانے گیا تھا باہر لاش کی صورت میں پڑا ہے۔ ویسے اس کے جسم پر اتنی گولیاں لگی ہیں کہ شاید تو اسے پہچان بھی نہ پائے گا۔“ اس نے انتہائی سفاکی سے جواب دیا۔

ریشماں گھسٹتی ہوئی دیوار تک پہنچ گئی تھی اور اب دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی بانجھوں سے خون بہہ رہا تھا۔ کلائی زخمی تھی اور رخسار پر انگلیوں کے نشان بنے ہوئے تھے مگر نہ تو اس کی آنکھوں میں خوف تھا اور نہ ہی اس کے چہرے پر ملال بلکہ وہ خان زادے کو اس طرح گھور رہی تھی جیسے ابھی اس پر چھلانگ لگا کر اس کی نکتہ بوٹی کر ڈالے گی۔

خان زادہ اکیلا تو نہیں آیا ہو گا اس کے ساتھی یقیناً باہر موجود ہوں گے مگر جھونپڑے میں وہ تنہا ہی داخل ہوا تھا اور یہ ہمارے لئے بہتر تھا اس لئے کہ میں اس کے انتہائی بائیں جانب تھا۔ خان اور سلطان دائیں جانب کھڑے تھے اور راجہ اس کے بالکل سامنے تھا۔ میں نے خان اور سلطان کی طرف دیکھا۔ مجھے لگا جیسے خان نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے اشارہ کیا ہو مگر وہ کیا چاہتا تھا یہ میں سمجھ نہیں سکا۔ بہر حال میں نے اپنے کوٹ کے اندر سے ریوالتور کی موجودگی کو محسوس کیا اور غیر محسوس انداز میں اپنا ہاتھ بغل میں پڑی اس پٹی پر رکھ لیا جس میں ریوالتور تھا۔ چند لمحوں بعد ریوالتور میرے ہاتھ میں تھا مگر میں نے کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ حالات کس کروٹ بیٹھتے ہیں اور یہ کہ راجہ کا اگلا قدم کیا ہو گا۔ خان بھی شاید بالکل تیار تھا اس لئے کہ اس کے جڑے ایک دم بھیج گئے تھے اور اس کا ہاتھ چادر کے اندر تھا جو نمی میری نگاہیں اس سے ملیں اس نے پلکیں جھپکا کر مجھے اطمینان دلادیا۔

”خان زادے، یہ تیرے حساب میں آنکھوں لاش ہے۔“ راجہ نے غیر محسوس انداز میں پیچھے سرکتے ہوئے کہا۔ وہ شاید خان زادہ کی توجہ ہٹانا چاہتا تھا۔

”نہیں راجہ..... کوئی چالاکی نہیں۔“ وہ ایک دم چوکنہ ہو گیا اور اس نے اپنے ریوالتور والے ہاتھ کو حرکت دی۔ اس کے ریوالتور کا رخ راجہ کے سر کی طرف تھا۔ ”میں

میں اتر گیا۔ میں پاگل ہو گیا۔ مجھے صغرا اور سوہنی دونوں یاد آئیں۔ میں غصے میں پلٹا اور پوری قوت سے خان زادہ کی کمر پر لات ماری۔ وہ بری طرح قلابازیاں کھاتا ہوا دور جاگرا۔ سلطان اور راجہ چیخ کر کھڑے ہو گئے۔

”نہیں بالے.....“ راجہ زور سے چیخا۔ ”ہاتھ نہ لگانا اسے..... یہ..... یہ میرا شکار ہے۔“ پھر اس نے ایک نظر ریشمال پر ڈالی جو دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکی تھی۔ خان کی آنکھوں میں بھی خون اخرا ہوا تھا۔ سلطان کی حالت بھی کچھ مختلف نہ تھی مگر راجہ کی وجہ سے ہم سب بے بس تھے۔

راجہ کے چہرے پر عجیب زلزلے کی سی کیفیت طاری تھی۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے، ہونٹ بھنچے ہوئے تھے اور وہ دھیرے دھیرے خان زادے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

خان زادہ نے پیچھے سرکنے کی کوشش کی مگر خان نے ایک زور دار لات اس کی کمر پر ماردی اور وہ کراہ کراہ کر اوندھ گیا۔ راجہ اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ راجہ نے اس کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لئے۔ خان زادہ کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ وہ گھٹکیاں لگا کر راجہ تو جیسے اندھا ہو چکا تھا۔ اس نے خان زادہ پر گھونسوں اور لاتوں کی بارش کر دی۔

کچھ ہی دیر بعد خان زادہ بے ہوش ہو گیا۔ اس کا چہرہ جگہ جگہ سے پھٹ چکا تھا۔ ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔

”خان! آگ میں لکڑیاں اور ڈال دے۔ یہ آگ تو اسے جلانے کو کافی نہیں ہے۔“ راجہ کی سرسراہٹ ہوئی آواز گونجی اور میں نے اس کے لہجے میں بلا کی سفاکی محسوس کی۔ یہ اتنی تھی کہ میری ریزہ کی ہڈی میں سرد لہری دوڑ گئی۔

خان نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور کونے میں رکھی لکڑیاں آگ میں ڈال دیں۔ ذرا دیر بعد ہی آگ بھڑک اٹھی۔

”اس کو ہوش میں لاؤ تاکہ یہ خود کو جلتا ہوا دیکھ سکے اور محسوس کر سکے، اسے پتا چلے کہ زندہ جلنے کی اذیت کیسی ہوتی ہے۔“

سلطان نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے پر پانی ڈالا اور پانی کے چند قطرے اس کے خون آلود ہونٹوں پر بھی پڑ گئے چند منٹ بعد ہی وہ کسمایا اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے

چہرے پر بے پناہ خوف پھیل گیا۔ بھڑکنے والی آگ سے اٹھتے ہوئے شعلوں کے سائے پورے جھوپڑے میں لرز رہے تھے اور لکڑیاں کے پختے کی میت ناک آوازیں روٹ گئے کھڑے کر رہی تھیں۔

”نن..... نہیں..... راجہ.....“ وہ ہلکایا۔

”شش..... خاموش.....“ راجہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا۔ ”یہ آوازیں سن رہا ہے تو..... یہ آوازیں اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہیں۔ یہ لکڑی پختے کی آوازیں، کچھ ہی دیر بعد تیری ہڈیاں بھی اسی طرح پختے کی خان زادے..... اور وہ آوازیں مجھے بڑا سکون دیں گی پھر میں سکون سے مر سکوں گا۔ آج میرا انتقام پورا ہو جائے گا خان زادے، تو نے یہاں تک آکر مجھ پر احسان کیا ہے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے مگر خوفناک لہجے میں بول رہا تھا۔

اچانک دروازے پر کریم داد نمودار ہوا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

”کیا بات ہے؟“ میں نے قریب جا کر پوچھا۔

”وہ سردار..... باہر جنگل کے چاروں طرف پولیس گھیرا ڈال رہی ہے۔“

میں، سلطان اور خان یہ بات سن کر اچھل پڑے مگر راجہ اسی طرح پُر سکون انداز میں بیٹھا رہا اور اس کی نگاہیں بدستور خان زادے پر جمی رہیں جو یہ خبر سن کر خوش ہو گیا تھا۔

”خان یہ ریوالور مجھے دے دو۔“ راجہ نے ہاتھ بڑھایا تو خان نے اسے ریوالور دے دیا۔ راجہ نے ریوالور کا رخ خان زادہ کے پیٹ کی طرف کیا اور گولی چلا دی۔ خان زادہ کی چیخ گونجی اور سانے کو چیرتی چلی گئی۔

”میں تیرے پیٹ میں گولی اس لئے مار رہا ہوں خان زادے کہ تو بھاگنے کی کوشش نہ کرے اور مرے بھی نہیں تجھے تو جل کر مرنے سے نا..... یہ موت تو نے خود ہی اپنے لئے چن لی تھی خان زادے.....“ اتنا کہہ کر راجہ کھڑا ہو گیا مگر اس نے اپنا پیر خان زادے کی کھوپڑی پر رکھ کر دبا دیا تھا۔ اب خان زادے کا چہرہ راجہ کے بوٹ تلے بے بس تھا۔

”خان، تم سب لوگ پیچھے حصے سے نکل سکتے ہو۔ پولیس ابھی صرف گھیرا ڈالنے کی کوشش کر رہی ہے مگر تم اس راتے سے واقف ہو جہاں اس کی رسائی ممکن نہیں پولیس کو یہاں تک پہنچنے میں بھی ابھی گھنٹا بھر لگے گا اور وقت تم لوگوں کے لئے کافی ہے۔

جاؤ.....“

”مگر سردار آپ..... میں نے کہنا چاہا۔

”جاؤ.....“ وہ گرجا۔

”نہیں سردار ہم یہاں آپ کو چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔“ اس بار خان اور کریم بیک

وقت بول اٹھے۔

”یہ میرا حکم ہے خان، میرا آخری حکم ماننے سے انکار کر دو گے؟“

”مگر سردار.....“

”چلے جاؤ خان، وقت ضائع کرنے سے تم لوگوں کو نقصان ہو گا۔ مجھے..... مجھے اب

کہیں نہیں جانا خان۔ زبیر کے بعد ریشماں بھی چلی گئی۔ میں اسے یہاں چھوڑ کر کہیں بھی نہیں

جاؤں گا اور ابھی تو مجھے ان شعلوں کو بھڑکانا ہے خان کے جسم کے ٹکڑے ڈال کر شعلوں کا

رقص دیکھنا ہے۔ جاؤ چلے جاؤ ورنہ.....“ وہ غصے میں چیخا اور اس نے ریو اور کارنم

لوگوں کی طرف کر دیا۔

ہم میں سے کوئی بھی اسے اس طرح تنہا چھوڑنے کو تیار نہیں تھا مگر راجہ تو جیسے پاگل ہی

ہو گیا تھا، میں اس کی ذہنی کیفیت کو سمجھ رہا تھا مگر مشکل یہ تھی کہ جب تک وہ اپنی کیفیت سے

چھٹکارا پا تا پولیس ہم تک پہنچ جاتی اور پھر ہم سب ہی دھر لئے جاتے۔ بالآخر ہم لوگ مجبور

ہو گئے اور جھونپڑے سے باہر چلے آئے۔ ہمیں دور ہی سے پولیس کی ٹارچوں کی روشنیاں نظر

آگئی تھیں۔

”اسی طرف.....!“ خان نے سرگوشی کی اور پلٹ کر ایک جانب دوڑ لگا دی۔

ہم سب اس کے پیچھے تھے۔ ابھی ہمیں زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ خان زادہ کی کرب

ناک چیخوں سے جنگل گونج اٹھا، ساتھ ہی راجہ کے قہقہوں کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ خان

زادہ کی چیخوں میں اتنا کرب تھا کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے مگر ہم رکے نہیں اس لئے کہ

یہ آوازیں پولیس والوں نے بھی سن لی ہوں گی۔ مجھے یقین تھا کہ راجہ گرفتار ہونے سے نہیں

بچ سکے گا۔ ہم تیز قدموں سے آگے بڑھتے رہے۔ ہم جھونپڑے سے کافی دور نکل آئے تھے مگر

پھر بھی گوبشت جلنے کی کراہیت انگیز بدو نے ایک بار پھر لرزادیا۔ ہم سب کے قدم ہتھم گئے۔

”وہ..... وہ پاگل ہو گیا۔“ میں بڑبڑایا۔

”اب وہ پکڑا جائے گا خان!“ کریم کی سرگوشی میں بلا کا خوف تھا۔

اسی وقت گولی چلنے کی آواز آئی اور پھر گہرا سناٹا چھا گیا۔

”وہ پکڑا نہیں جائے گا۔ وہ..... وہ مر گیا۔“ خان نے نڈھال لہجے میں جواب دیا۔

سب کو سانپ سو گھ گیا۔ میں جانتا تھا کہ خان صحیح کہہ رہا ہے، راجہ خود کو پولیس کے حوالے

نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے آخری لمحے میں اس کی آنکھوں میں جم جانے والے عزم کو دیکھ لیا تھا

اور شاید خان بھی جان چکا تھا کہ وہ کیا کرے گا۔

”یہاں ٹھہرنا خطرناک ہے بالے، بہت جلد پولیس جان جائے گی کہ ہم فرار ہو چکے ہیں۔

یہاں کچھ دور ایک پہاڑ ہے، زیادہ اونچا نہیں ہے، ہم اگر اس پہاڑ کے پار اتر گئے تو یہاں کی

پولیس سے محفوظ ہو جائیں گے اور اس علاقے سے دور نکل جانا بھی آسان ہو جائے گا کیونکہ

پہاڑ کے قریب سے ریل کی پٹری گزرتی ہے، ہم کسی نہ کسی طرح ٹرین پر چڑھ سکتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے چلو!“

ہم تقریباً گھنٹا بھر کے بعد ہی اس پہاڑ تک پہنچ گئے۔ اب صبح کا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ ہمیں

سورج نکلنے سے پہلے ہی پہاڑ کی دوسری طرف اترنا تھا ورنہ ممکن تھا ہم پولیس کی نظروں میں

آجاتے۔ پہاڑ واقعی زیادہ اونچا نہیں تھا، تھوڑی سی محنت کے بعد ہم دوسری طرف اتر گئے

تھکن سے بری حالت ہو چکی تھی اس لئے چلنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ سخت پیاس کی وجہ

سے حلق خشک ہو گیا تھا۔ پہاڑ سے نیچے اترتے ہی میں زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ مجھے کر دیکھ کریم،

دلاور، سلطان اور خان بھی بیٹھ گئے۔

سب خاموش تھے، سب کی آنکھوں میں اداسی تھی۔ راجہ کی جدائی اور اس کی عجیب

و غریب موت نے سب کے ہونٹوں پر مر لگا دی تھی۔ وہ شخص، جس کے ایک اشارے پر اتنے

بست سے جوان اپنی جان لٹانے کو تیار رہتے تھے، اس وقت بے گور کفن تنہا اس جھونپڑے

میں پڑا ہو گا۔ اس کی میت کو کندھا دینے والوں میں اس کا ایک بھی وفادار ساتھی نہیں ہو گا

بلکہ اس کی لاش لاوارث لاشوں کے درمیان ڈال دی جائے گی۔ یہ احساس ہی میرے لئے

اذیت ناک تھا۔ میں جتنا اسے بھلانے کی کوشش کر رہا تھا اتنا ہی میرا ذہن اس کی یاد میں جکڑتا

جا رہا تھا۔

میں نے اپنے باقی ساتھیوں کے چروں پر نگاہ ڈالی۔ وہ سب ہی خلاؤں میں گھور رہے

تھے۔ میں جانتا تھا کہ راجہ کا چہرہ ان سب کے تصورات پر چھایا ہوا ہو گا۔ وہ سب بھی اسی کے بارے میں سوچ رہے ہوں گے۔ ایک گھنٹا آرام کرنے کے بعد ہم پھر چل پڑے۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ریل کی پٹری پر اس وقت ایک مال گاڑی کھڑی تھی۔ خان کے اشارے پر ہم سب اس کی طرف بڑھے۔ خان نے ڈرائیور سے کہا کہ ہماری گاڑی کو ایک حادثہ پیش آگیا تھا جس کی وجہ سے وہ ناکارہ ہو گئی ہے اور ہم سب میلوں کا سفر پیدل طے کر کے یہاں تک پہنچے ہیں اور راستوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اس لئے وہ ہماری مدد کرے۔ ڈرائیور شریف آدمی تھا۔ اس نے ہم پر ترس کھایا اور ہمیں اگلے اسٹیشن تک پہنچا دینے کا وعدہ کیا۔ اس نے ہمیں پانی بھی پلایا اور یوں ہم دو گھنٹے کے تھکا دینے والے سفر کے بعد ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر اتر گئے۔

یہ نور آباد نامی گاؤں تھا۔ بڑا خوبصورت اور سرسبز علاقہ تھا۔ اسٹیشن گو ویران تھا مگر باہر ایک دو دکانیں تھیں اور ایک ٹھیلے پر مرغ چھو لے بک رہے تھے۔ ٹھیلے والا ٹھیلے کے نیچے لیٹا ستارہ تھا۔ ہم چاروں کو اپنی جانب آتا دیکھ کر وہ جلدی سے ٹھیلے کے نیچے سے نکل آیا۔ ہم نے پیٹ بھر کر مرغ چھو لے کھائے۔ پیٹ بھر جانے کے بعد ہمارے ہوش ٹھکانے آ گئے تھے۔ میرا توجہ چاہ رہا تھا کہ میں وہیں کہیں پڑ کر سو جاؤں مگر ایسا بہت مشکل تھا۔

”بالے.....“ خان نے بیڑی سلگاتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔

”ہوں!“

”اب تیرا کیا پروگرام ہے؟“

”خان..... میں..... میں اپنے گاؤں جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے پھر ہم پہلے تیرے گاؤں چلتے ہیں..... تجھے بھی تو حساب چکنا کرنا ہے

نا؟“

”نہیں خان..... تجھے اپنے گاؤں جانا ہے۔ شانی تیرا انتظار کر رہی ہو گی۔“ پھر میں

کریم، دلاور اور سلطان سے مخاطب ہوا۔ ”اور تم لوگ..... جہاں چاہو جاسکتے ہو۔“

”بالے..... ہم راجہ کو کھو چکے ہیں، اب تجھے نہیں کھونا چاہتے۔“ خان نے

دھیرے سے کہا۔

”خان، راجہ وہ مرکز تھا کہ جس کی وجہ سے ہم سب ایک تھے، مگر اب، جب وہ مرکزی

نہیں رہا تو پھر، اور ویسے بھی ہم بھلا ساتھ رہ کر کیا کریں گے، میرا مشورہ ہے خان کہ اب تم لوگوں کو ایک نئے سرے سے زندگی گزارنا چاہئے۔ زندگی جنگلوں میں نہیں ہوتی خان، یہ گھروں کے آنگنوں میں ہوتی ہے، جہاں بہت سے چہرے، بہت سی آوازیں انسان کو اس کی موجودگی کا احساس دلاتی ہیں، اسے رشتوں کا احساس دلاتی ہیں۔ جذبوں سے روشناس کراتی ہیں، انسان جذبوں اور رشتوں ہی کا تو نام ہے خان، جب تم اپنے گاؤں جاؤ گے تو تمہیں معلوم ہو گا کہ زندگی کسے کہتے ہیں، اور کریم..... دلاور، میں نہیں جانتا کہ تم لوگوں کا انتظار کرنے والے کہاں ہیں مگر یہ ضرور جانتا ہوں کہ وہ کہیں نہ کہیں آج بھی تمہارے منتظر ہوں گے۔ جاؤ کریم زندگی کی طرف لوٹ جاؤ۔“ میں نے تھکے ہوئے اور کھوکھلے لہجے میں کہا، اس لئے کہ میں جو انہیں زندگی کی طرف لوٹ جانے کو کہہ رہا تھا خود موت کے راستے کا انتخاب کر چکا تھا۔ صرف اس لئے کہ اب دنیا کے کسی کوئی بھی میرا منتظر نہیں تھا اور دنیا میں تنہا ہونا کیسا اذیت ناک ہوتا ہے اس کا احساس مجھے راجہ کی کیفیت نے دلا دیا تھا۔ میں بھی وہی کر رہا تھا جو راجہ کر چکا تھا۔

خان مجھے تنہا چھوڑنے کو تیار نہ تھا مگر میرے بہت اصرار پر اور قسمیں دینے پر وہ گاؤں جانے پر تیار ہو گیا۔ کریم اور دلاور بھی جانے کو تیار ہو گئے مگر سلطان خاموش تھا اور پھر ہم سب جدا ہو گئے۔ خان مجھ سے جدا ہوتے بہت اداں تھا، اس نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں اس کے گاؤں ضرور آؤں گا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں اگر زندہ ہوا تو ضرور آؤں گا خان نے مجھے تنبیہ کی تھی کہ میں تمہارا جو اور چوہدری سے بھڑنے کی کوشش نہ کروں بلکہ وہ جب گھر والوں سے مل کر آئے گا تو ہم ساتھ ہی گاؤں جائیں گے بلکہ اس نے تو جگہ بھی طے کر لی کہ ہم اسی گاؤں میں، اسی اسٹیشن پر دوبارہ ملیں گے۔ میں خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا اور اسے جھوٹی تسلی بھی دی کہ میں تنہا کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا۔ اسے تو یقین آگیا مگر سلطان مجھے جس انداز میں دیکھ رہا تھا اس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ میرے ارادوں سے خوب واقف ہے۔

خان، کریم اور دلاور چلے گئے۔ اب دوپہر ہو چکی تھی۔ میں نے اور سلطان نے گاؤں کے ایک چھوٹے سے ہوٹل پر کھانا کھایا۔ سلطان کی گہری خاموشی اور اس کی چپھتی ہوئی نگاہیں مجھے پریشان کر رہی تھیں۔ وہ سائے کی طرح میرے ساتھ تھا اور اس نے اب تک

جانے کی بات نہیں کی تھی۔ میں شام ہونے سے پہلے پہلے اپنے گاؤں پہنچ جانا چاہتا تھا اس لئے اس کی طرف سے پریشان تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس طرح میرا سایہ بنا رہے اور خود کو بھی موت کے اس جال میں پھنسا دے جو صرف میرا انتظار کر رہی ہے۔

میں جانتا تھا کہ اس کے گھر کے برابر میں رہنے والی وہ معصوم سی صورت کی لڑکی اس کی منتظر ہوگی جو مجھ سے اس لئے ناراض تھی کہ میرے وہاں پہنچنے کے بعد سلطان اس سے دور ہو گیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کی حسین آنکھوں میں جلنے والے دیے بجھ جائیں۔

”سلطان.....“ تنگ آکر میں نے اسے مخاطب کیا۔

”ہوں!“

”سلطان اب تو بھی چلا جا۔ یہاں سے تجھے لاہور کے لئے لاری مل جائے گی۔“

”میں جانتا ہوں۔“ اس نے گہری نگاہوں سے مجھے دیکھ کر جواب دیا۔ ”میں جانتا ہوں

کہ یہاں سے لاہور جانے والی لاری مل جائے گی مگر میں لاہور نہیں جا رہا۔“

”کیوں..... پھر کہاں جائے گا؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”تیرے ساتھ.....“ اس نے پرسکون انداز میں جواب دیا۔

”مگر میں تمہیں ساتھ نہیں لے جانا چاہتا۔“

”میں تیرے چاہنے یا نہ چاہنے کا پابند نہیں ہوں جو میرا جی چاہے گا میں وہی کروں گا۔“

”یہ کیا بات ہوئی، میں نہیں چاہتا کہ..... کہ تو میرے ساتھ رہے تو کیا زبردستی

ہے؟“

”بالے..... مجھ سے بحث کرنا بیکار ہے، میں تیرے ارادوں سے واقف ہوں اور

تجھے اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔“ اس نے مضبوط لہجے میں کہا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔

”مگر میرا ہے کون..... تجھے کیا حق ہے کہ تو..... دیکھ سلطان تجھے چلا جانا چاہئے“

وہ لڑکی اچھی لڑکی ہے، میں چاہتا ہوں کہ جب میں ماں کو لاہور لے کر پہنچوں تو..... وہ

تیرے گھر پہ ہو، میرا اور ماں کا استقبال کرنے کے لئے..... میں نے اسے ہلانا چاہا۔

”مگر میں چاہتا ہوں کہ تو اور ماں اس لڑکی کا استقبال کرنے کے لئے میرے گھر موجود

ہوں اور اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ہم ساتھ ہی گاؤں جائیں اور وہاں سے ماں کو لے کر

لاہور چلے جائیں۔“

”سلطان تو میری بات مانتا کیوں نہیں..... میں تجھ سے کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتا“

پھر تو کیوں میرے پیچھے پڑا ہے؟“ میں غصے میں چیخ اٹھا۔

”اس لئے کہ میں اپنی مرضی کا مالک ہوں۔ میں نے تجھ سے کہا کہ مجھ سے بحث نہ کر“

خواہ مخواہ تھک جائے گا۔“ اس نے اسی اطمینان سے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر بے پرواہی

کے ساتھ عزم بھی تھا۔ آنکھوں میں سرد مہری تھی جس نے مجھے یہ احساس دلایا تھا کہ واقعی

اس سے اس موضوع پر بحث بالکل بیکار ہے۔ ویسے اس کے رویے نے جہاں مجھے غصہ دلایا

تھا وہاں اس کی قدر بھی میرے دل میں بڑھادی تھی۔ اس نے آج تک بڑے وقت میں میرا

ساتھ دیا تھا اور وہ اب بھی میرا ساتھ چھوڑنے پر تیار نہ تھا کہ اس کا ساتھ میری بہت سی

مشکلیں آسان کر دے گا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ میں ماں کو اس کے ساتھ شہر روانہ کر سکتا تھا

پھر میں آسانی سے راجو اور چوہدری سے انتقام لے سکتا تھا۔ اس خیال نے مجھے کافی ہلکا پھلکا

کر دیا اور میں خاموش ہو گیا۔

میں نے اسی رات گاؤں جانے کا فیصلہ کر لیا تھا اب میرے یہاں وہاں بھٹکنے کا جواز بھی

نہیں تھا۔ میں اپنے انتقامی جذبوں کے بوجھ تلے کچلا ہوا تھا۔ میں اس بوجھ سے آزاد ہونا چاہتا

تھا۔ ہم اسی رات گاؤں کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ لاری ہمیں آسانی سے مل گئی تھی اور یہ

آخری لاری تھی جو ہمارے گاؤں کے قریب سے گزر کر آگے جاتی تھی۔ گو اس سڑک سے

میرے گاؤں کا فاصلہ کافی تھا مگر میں مزید انتظار نہیں کرنا چاہتا تھا اور ویسے بھی رات گئے میرا

وہاں جانا، دن میں جانے سے بہتر تھا۔ حالانکہ میرا حلیہ اب کافی بدل چکا تھا مگر پھر بھی وہ میرا

گاؤں تھا، وہاں کے رہنے والے مجھے بچپن سے دیکھتے آئے تھے ان کا مجھے پہچان لینا کوئی تعجب

خیز امر نہیں تھا بلکہ مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ مجھے ہر روپ میں پہچان لیں گے۔ سلطان مجھے بتا

چکا تھا کہ گاؤں والے مجھے مردہ سمجھ چکے ہیں۔ چوہدری نے سب کو یقین دلایا ہے کہ بالا

پولیس مقابلے میں مارا گیا۔ سوائے غلام رسول سپاہی کے سبھی نے اس بات پر یقین کر لیا تھا۔

اب میرا پروگرام بھی یہی تھا کہ میں اندھیری رات میں غلام رسول سپاہی کے گھر تک آسانی

سے پہنچ جاؤں گا۔ اس سے مجھے گاؤں کے حالات بھی معلوم ہو جائیں گے اور وہاں میں اپنی

ماں سے بھی مل لوں گا۔

سفر بڑا تھکا دینے والا تھا، پرانی اور کھٹارا لاری یوں چل رہی تھی جیسے صدیوں چلتی ہی

رہے گی۔ مجھے نہ نیند آرہی تھی، نہ بھوک اور نہ ہی پیاس لگی تھی بس ایک عجیب و غریب سی کیفیت طاری تھی جسے نہ خوشی کہا جاسکتا تھا اور نہ غم، شاید یہ اتنے برس بعد اپنے گاؤں جانے مگر گاؤں میں کچھ نہ پانے کی حقیقت اور اس کا تکلیف دہ احساس تھا۔ ہاں میرے وجود پر جو ایک جذبہ بہت واضح تھا وہ نفرت کا جذبہ تھا جس نے میرے دماغ کو بری طرح جکڑ رکھا تھا۔

بس اونچے نیچے اور کچے راستوں پر سفر کرتی رہی، دونوں جانب گھور اندھیرے میں کبھی کبھی کوئی منظر نظر بھی آتا تو وہ اتنا مبہم ہوتا کہ کوئی تاثر چھوڑے بغیر گزر جاتا تھا۔ سلطان خاموش بیٹھا تھا۔ میں بھی کچھ نہ بولا بس آنکھیں بند کئے سوچتا رہا کہ جب میں اپنی ماں سے ملوں گا تو کیا وہ مجھے پہچان لے گی؟ وہ جو ہوش و خرد سے بے گانہ ہو چکی ہے اور اگر اس نے مجھے پہچان لیا اور صغرا کے بارے میں سوال کیا تو میں اسے کیا جواب دوں گا میرے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا۔

بس کے تمام مسافر اونگھ رہے تھے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور سر کو سیٹ کی پشت سے نکالیا۔ رات کے دو بج چکے تھے اور میرے اندازے کے مطابق ابھی گھنٹے بھر کا سفر باقی تھا۔ یہ گھنٹا ایک صدی بن کر گزرا۔ اب میں چونکا بیٹھا تھا کیونکہ مجھے گاؤں سے کافی پہلے اترنا تھا۔ میری نگاہیں کھڑکی سے باہر لگی ہوئی تھیں۔ یہ بس جس سڑک پر سے گزر رہی تھی۔ وہ سڑک اس پہاڑی کے دامن میں تھی جہاں سے میں پہلی بار فرار ہوا تھا اور جہاں صغرا گولی کا شکار ہو کر مجھ سے جدا ہوئی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد میں نے مطلوبہ جگہ پر بس رکوالی اور سلطان کے ساتھ نیچے اتر آیا۔ بس آگے بڑھ گئی۔ سلطان نے حیرت سے چاروں دیکھا پھر بولا۔ ”یہ تو کہاں اتر گیا؟“

”یہاں سے تقریباً دس کلومیٹر کے فاصلے پر میرا گاؤں ہے۔“ میں نے گہری سانس لے کر جواب دیا۔

”مگر یہاں اترنے کی کیا ضرورت تھی؟“ اس نے برا سامنہ بنایا۔

”اس لئے کہ یہ بس میرے گاؤں نہیں جاتی بلکہ یہ اسی سڑک پر سفر کرتی ہوئی آگے چلی جاتی ہے اور میرا گاؤں اس طرف ہے۔“ میں نے ہاتھ سے دائیں جانب اشارہ کیا۔

وہ کچھ بڑبڑایا مگر آواز اتنی کم تھی کہ سنائی نہیں دیا اور کچھ میں نے دھیان نہیں دیا۔ میں اب فضاؤں میں بسی اپنائیت کو پوری طرح محسوس کر رہا تھا۔ ماضی کے لمحات آنکھوں میں

گھوم رہے تھے مگر کرب کی کیفیت بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس لئے کہ میری پشت پر وہ پہاڑی تھی جس پر میں صغرا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہوا تھا اور میرے سامنے جنگل کا وہ حصہ تھا جہاں ان درندوں نے میری بہن کو قید کر کے اس پر زیادتی کی کوشش کی تھی۔

”کدھر جانا ہے؟ مجھے تو یہاں سے راستے کا پتا ہی نہیں چل رہا۔“ سلطان کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”ہاں..... یہاں سے تمہیں پتا نہیں چلے گا۔ چلو ہمیں یہ جنگل کراس کرنا ہے۔“ میں نے دھیرے سے جواب دیا اور سڑک کراسی ٹھکڑے جنگل کی طرف بڑھا۔ راستے میں میں نے سلطان کو بتایا کہ اسی جنگل میں وہ چھوٹا سا مکان ہے جہاں راجو اور اس کے ساتھیوں نے صغرا کو قید کیا تھا اور پیچھے والی پہاڑی پر اس نے میری بانہوں میں جان دی تھی۔ اب ہم اسی طرف بڑھ رہے تھے جہاں وہ مکان تھا۔ میں چیک کرنا چاہتا تھا کہ کیا وہ اب بھی راجو کا عیش کدہ ہے یا ویران ہو چکا تھا۔

جنگل بہت گھنا نہیں تھا آدھے گھنٹے کے بعد ہی ہم اس جگہ پہنچ گئے۔ مکان پر نیارنگ و روغن ہو چکا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ مکان اب بھی راجو وغیرہ کے استعمال میں ہے۔ دروازے پر تالا پڑا تھا۔ میں نے تالا ہاتھ میں پکڑ کر زوردار جھکا دیا۔ وہ اچھا خاصا مضبوط تالا تھا مگر نہ معلوم مجھ میں اتنی طاقت کہاں سے آگئی کہ تالا دوسرے جھٹکے ہی میں میرے ہاتھ میں آگیا۔ میں نے ایک نگاہ سلطان پر ڈالی وہ مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ حیرت تو خود مجھے بھی تھی مگر میں نے اپنی حیرت کو چھپا لیا اور تالے کو کنڈی سے نکال کر دور پھینک دیا۔

اندر داخل ہوئے تو یوں محسوس ہوا جیسے ابھی ابھی کوئی وہاں سے اٹھ کر گیا ہے۔ توقع کے مطابق وہاں شراب کی بوتلیں، گلاس، سگریٹ کے خالی پیکٹ اور کھانے پینے کی کچھ چیزیں پڑی تھیں۔

”ہالے..... یہاں کوئی تھا؟ ممکن ہے وہ زیادہ دور نہ گیا ہوا اور واپس آجائے۔“ سلطان نے سرگوشی کی۔

”ہوں.....“ میں نے سر ہلا کر اس کے خیال کی تائید کی اور اسے دروازے پر ٹھہرنے کا اشارہ کر کے خود اندر چلا گیا۔ ایک کمر اندر بھی تھا جسے بیڈ روم کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ یہاں بھی عیاشی کے تمام لوازمات موجود تھے۔ میرا خون کھول اٹھا۔ راجو اب بھی

جانے کس کس کی بیٹی اور کس کس کی بہن کو لوٹ رہا تھا۔ ”راجو اب میں تجھے اس قابل نہیں چھوڑوں گا کہ تو.....“ میں زیر لب بڑبڑایا۔

بہر حال اس وقت اس مکان میں کوئی بھی نہ تھا۔ البتہ سلطان کا خیال صحیح ثابت ہو سکتا تھا کہ وہ لوگ ممکن ہے واپس آجائیں۔ اسی خدشے کے پیش نظر میں وہاں دیر تک نہیں رکا اور ہم دونوں باہر آگئے۔ سلطان نے اس اندھیرے میں بھی تلا تلاش کر لیا پھر تالے کو کھنڈی میں اٹکا کہ ہم وہاں سے ہٹ گئے۔ تقریباً پندرہ بیس منٹ بعد ہی ہم گاؤں میں داخل ہو رہے تھے۔ پورا گاؤں سویا ہوا تھا۔ کبھی کبھی کسی کتے کے بھونکنے کی آواز گہری خاموشی کو چیر جاتی تھی۔ میں بیان نہیں کر سکتا اس وقت میری کیا کیفیت تھی میں جس طرح رات کے اندھیرے میں اس گاؤں سے فرار ہوا تھا اسی طرح گاؤں میں داخل ہو رہا تھا۔ یہاں کا چپہ چپہ میرا جانا بوجھا تھا اس لئے اپنے گھر تک پہنچنے میں مجھے کوئی دشواری نہ ہوئی۔ دروازے پر تالا دیکھ کر میرا دل دھڑک اٹھا۔ میں ٹھٹھک گیا۔ سلطان نے بھی حیرت سے پہلے دروازے کو پھر مجھے دیکھا۔

میں نے آگے بڑھ کر دھیرے سے دروازے کو دھکا دیا، وہ کھلتا چلا گیا اور دروازے کے چرچرانے کی آواز دور تک پھیلتی چلی گئی۔ اندر گہرا اندھیرا تھا میں نے ڈرتے ڈرتے اندر قدم رکھ دیا۔ بے پناہ تمنائی نے مجھے ہولا دیا تھا۔ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ میرا گھر ہے، میرا گھر جہاں زندگی کی تمام رنگینیاں اپنی تمام تر معصومیت کے ساتھ جھوماکرتی تھیں۔ رقص کیا کرتی تھیں۔ ابا کی آوازیں، اماں کے لہجے کا دھیمپاں اور صفرا کی ہنسی کی آوازیں گونجا کرتی تھیں۔ وہاں گہری چپ کاراج تھا اور تمنائی چنگاڑوں کی طرح چھت سے لٹکتی محسوس ہوتی تھی۔

میں چند قدم آگے بڑھا تو کسی چیز سے ٹکرا گیا۔ وہ لالین تھی جس کے لڑھکنے کی آواز سے میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا تھا۔ میں نے لپک کر لالین اٹھالی۔ اسے ہلا کر دیکھا تو اس میں تیل موجود تھا۔ میں نے جلدی سے جیب سے ماچس نکالی اور لالین جلائی۔ لالین جلتے ہی ہمارے سائے ہماری پشت کی جانب لے ہو کر دیواروں تک پھیل گئے اور بھڑکتے تھرکتے شعلے کی نو آنگن میں عجیب عجیب سے سائے بنانے لگی۔ آنگن میں ابا کی لالٹنی، اماں کی چادر اور میرے بستر پر لگنے والی دری پڑی تھی۔ یہ تمام چیزیں گرد آلود تھیں۔ میں لالین لئے کوٹھری جانب بڑھا۔ سلطان بھی میرے پیچھے تھا۔ میں جیسے ہی کوٹھری میں داخل ہوا اچھل

پڑا۔ سانسے بچھی چٹائی پر اماں کوٹھری بنی پڑی تھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھے ہوئے تھے اور سر کو گھٹنوں کے درمیان چھپایا ہوا تھا۔ پہلی نظر میں وہ مجھے بے جان لگی تھی۔

”اماں.....“ میں تمام احتیاط بلائے طاق رکھ کر چیخ اٹھا اور اس کی طرف لپکا۔

”ہش.....“ چپ کر..... اس نے سن لیا تو وہ آجائے گا، اور صفرا کو بھی ایسے ہی لے جائے گا جیسے غلام رسول کی بیوی کو لے گیا ہے۔“ وہ ایک دم بول اٹھی۔ اس کی ویران آنکھوں میں بلا کا خوف اور وحشت تھی۔ اس نے مجھے نہیں پہچانا تھا۔ اس کے بالوں میں مٹی بھری تھی کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے اور ہاتھوں کی پشت پر خراشیں سی پڑی تھیں۔

میں بے اختیار رو دیا۔ ”اماں.....“ دیکھ میں آیا ہوں..... میں ہوں اماں، تیرا بالا..... تیرا اپنا بالا ہوں اماں، میرا گلا گھونٹ دے، مجھے جان سے مار دے انہاں، مجھ ایسے بزدل کا مر جانا ہی بہتر ہے کہ جو نہ باپ کو بچا سکا نہ بہن کو اور..... اور تجھے بھی زندہ درگور کر دیا۔“ میں اس کے پیروں کو پکڑ کر بیٹھ گیا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے مگر اماں تو خوفزدہ نگاہوں سے دروازوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”بالے.....“ تو نے سنا نہیں ماں نے کیا کہا ہے؟“ سلطان نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ ”بالے ہوش میں آ..... خود کو سنبھال اور ماں کی بات دھیان سے سن، شاید وہ غلام رسول کی بیوی کو بھی لے گئے ہیں۔“

سلطان کی بات سن کر میں اچھل پڑا۔ میں نے واقعی اماں کی بات پر دھیان نہیں دیا تھا۔ میں تو اسے دیکھ کر پاگل ہو گیا تھا۔ ”اماں..... کیا کہہ رہی تھی تو..... کون لے گیا غلام رسول کی بیوی کو.....“ میں نے اماں کو دونوں کندھوں سے پکڑ لیا۔

”چپ کر جا رہے.....“ ورنہ وہ میری بچی کو لے جائے گا۔ پہلے بھی لے گیا تھا نا..... بڑی مشکل سے لائی تھی میں اسے، نہ لاتی تو مار دیتا۔ پہلے بھی مار دیا تھا۔“ وہ سرگوشی میں بول رہی تھی۔ یوں جیسے واقعی اسے ڈر ہو کہ کوئی سن لے گا۔

”اماں..... کون لے گیا اسے؟“ سلطان نے قریب آکر سرگوشی میں پوچھا۔

”وہ لے گیا ہے.....“ راجو..... اس نے آنچل سے منہ کو باندھ دیا تھا۔ غلام رسول کو پتا ہی نہ چلا۔ میں..... میں یہاں آگئی۔ یہاں صفرا اکیلی تھی نا اس لئے..... ورنہ وہ اسے بھی لے جاتے۔“

لمحے اس کی نگاہ سلطان پر پڑی۔ اس نے پلٹ کر پھر مجھے سرہانے کھڑا دیکھا۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ بات سمجھ چکا ہے۔ وہ جان گیا ہے کہ سلطان کے ساتھ میں ہی ہوں۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا اور جھپٹ کر مجھے سینے سے لگالیا۔ ”بب..... بالے..... تو.....“

اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ روح فرسا خبر اسے کیسے سناؤں کہ راجو نام کا درندہ اس کی ناموس کو اٹھا کر لے گیا ہے اس کی نگاہ اپنی بیوی کے شکن آلود بستر پر پڑی۔ ”سیکنہ.....“

سیکنہ..... ”اس نے آواز دی مگر جانے کیوں اس کے چہرے پر خوف سا پھیل گیا تھا۔ اس نے میری اور سلطان کی طرف دیکھا، ہم دونوں کے چہروں پر سنگین خاموشی نے اسے بوکھلا دیا۔ وہ ایزدیوں کے بل پورے گھر میں ناچ گیا۔ وہ مسلسل سیکنہ کو آوازیں دے رہا تھا۔

”چپ کر جا غلام رسول.....“ درندہ وہ تجھے بھی لے جائیں گے۔“ اماں کی سرگوشی نے فضا میں درد سا پھیلا دیا۔

”وقت نہیں ہے غلام رسول، وہ سیکنہ کو لے گئے ہیں۔ خود کو سنبھال اور کوئی ہتھیار لے لے۔“ سلطان نے اسے شانوں سے پکڑ کر کہا۔

اس کے منہ سے دبی دبی چیخ نکلی جسے اس نے فوراً ہی دبایا۔ دوسرے لمحے ہی اس کے چہرے پر سختی اتر آئی۔ آنکھوں میں شدید نفرت نے جال سا بن دیا۔ وہ بھاگا ہوا کوٹھری میں چلا گیا جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ریو اور تھا۔

وقت واقعی بہت گزر چکا تھا۔ ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں تھا وہ لوگ کتنی دیر پہلے اسے اٹھا کر لے گئے ہیں۔ میں نے اماں کو وہیں رکنے کو کہا اور اسے جھوٹی تسلی دی کہ میں صغرا کو لینے جا رہا ہوں اور پھر ہم تیزی سے باہر آگئے۔ نہ معلوم کیوں مجھے یقین تھا کہ راجو سیکنہ کو لے کر اسی جنگل والے مکان میں جائے گا۔ میں اسی طرف کو بھاگا۔ راستے میں سلطان نے غلام رسول کو بھی بتا دیا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ غلام رسول پر جیسے چپ سی لگ گئی تھی۔ اس کی خاموشی خوفناک تھی اور میں جانتا تھا کہ اس خوفناک خاموشی کے بعد کیا ہوتا ہے۔

میرا کلیجہ پھٹ گیا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اماں کی حالت پر چیخ چیخ کر روؤں مگر یہ وقت رونے کا نہیں تھا..... غلام رسول میرا محسن تھا۔ وہ اس کی بیوی کو لے گیا تھا مجھے ہر حال میں اسے بچانا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اسے لے کر کہاں جائے گا۔ میں تو بچپن سے راجو کے ساتھ رہا تھا، اس کی نس نس سے واقف تھا۔ میں فوراً ہی کھڑا ہو گیا۔ ”سلطان تو یہاں اماں کے پاس رک میں غلام رسول کے گھر جاتا ہوں۔“

”نہیں“ میں بھی چلوں گا۔ اماں کو غلام رسول کے گھر چھوڑ دیں گے۔“ وہ یہ کہتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

میں نے اس نازک وقت میں اس سے الجھنے کی کوشش نہیں کی اور دروازے کی طرف پلکا۔ سلطان اماں کو بڑی مشکل سے اٹھا سکا، اسے کہنا پڑا کہ صغرا، غلام رسول کے گھر اکیلی ہے۔ اسے اس کی حفاظت کے لئے وہیں رہنا چاہئے۔ تب کہیں جا کر وہ اٹھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ راستے میں اماں کوئی گریز کرے اور کسی کی آنکھ کھل جائے۔ اسی وجہ سے میں اسے ساتھ نہیں لے جانا چاہتا تھا مگر اماں پر طاری خوف نے اسے بولنے ہی نہ دیا۔ وہ راستے بھر ہم سے زیادہ محتاط رہی۔ غلام رسول کے گھر کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ میں دبے پاؤں اندر داخل ہوا۔

اماں نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ غلام رسول کے خرائے گھر میں گونج رہے تھے اور وہ بے خبر پڑا سو رہا تھا۔ میں اسے جگائے بغیر اس کو ٹھری نما کمرے میں داخل ہو گیا جہاں دروازے کے کمنڈے پر لالٹین لٹکی ہوئی تھی اور جو اس مکان کا واحد کمرہ تھا۔ توقع کے مطابق دو چار پائیاں پڑی تھیں جن میں سے ایک بستر تو ٹھیک تھا مگر دوسرے پلنگ پر سمٹی ہوئی چادر اور تکیے کی حالت سے پتا چلتا تھا کہ اس بستر پر یا تو کوئی ترپا ہے یا شدید مزاحمت کی وجہ سے بستر شکن آلود ہوا ہے۔ مجھے اماں کی بات کا یقین ہو گیا تو میں غلام رسول کے بستر کے قریب آگیا۔ سلطان اماں کو لئے اندر داخل ہوا تو میں نے اسے اندر سے دروازہ بند کرنے کا اشارہ کیا۔ اس نے دروازہ بند کر کے کمنڈی لگالی۔

میں نے دھیرے سے غلام رسول کا کندھا ہلایا۔ پہلے تو اس پر کوئی اثر نہ ہوا مگر دوسری مرتبہ ہلانے پر اس نے کسمکے آنکھیں کھول دیں۔ ”کون ہے..... کیا ہے؟“ پھر وہ مجھے سرہانے کھڑا دیکھ کر اچھل پڑا۔ ”کک..... کون ہو تم؟“ وہ ہکلیا۔ مگر دوسرے ہی

تھا۔ تمہارا جو کو مار دینے سے میرے جذبہ انتقام کو تسلی نہ ہوتی، میں تو چوہدری کو بھی کتے کی موت مارنا چاہتا تھا۔ اس کے گھر کو آگ لگا دینا چاہتا تھا۔ اس کے کھیت کھلیاں اور مویشی جلا دینا چاہتا تھا تب کہیں جا کر مجھے سکون حاصل ہوتا۔

ہم کسی نہ کسی طرح چھپتے چھپاتے اس مکان تک پہنچ گئے ہمارا اندازہ صحیح تھا۔ مکان سے چند گز کے فاصلے پر چوہدری کی چپ کھڑی تھی۔ مکان کی کھڑکیاں بند تھیں مگر ان کے شیشوں اور جھریوں سے روشنی جھانک رہی تھی ہم دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھتے۔ میں نے غلام رسول کو سمجھا دیا تھا کہ راجو پر گولی نہ چلائے۔ میں اسے اپنے ہاتھوں سے اذیت دے کر مارنے کی قسم کھا چکا ہوں۔ اس نے یہ بات سن کر بے بسی سے مجھے دیکھا اور پلٹ کر دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ اندر سے کسی عورت کے پیچنے کی آواز نے ہمیں لرزادیا۔ چیخ ایسی کرب ناک تھی کہ جیسے اسے ذبح کیا جا رہا ہو۔ چیخ سن کر غلام رسول بے قابو ہو گیا۔ اس نے مجھے دھکا دیا اور لالت مار کر دروازہ کھول دیا۔

وہ چار آدمی تھے۔ ایک آدمی سکینہ کے دونوں ہاتھ پکڑے اسے بے بس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سکینہ کی حالت ایسی تھی کہ مجھ سے دیکھا نہ گیا، اسے لوٹ لیا گیا تھا بلکہ اس پر بری طرح تشدد کیا گیا تھا۔ وہ چاروں ہمیں دیکھ کر اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ اسی لمحے غلام رسول کے ریوالتور سے نکلی ہوئی گولی نے اس آدمی کو ڈھیر کر دیا جو سکینہ کو پکڑے ہوئے تھا۔

”کوئی حرکت نہ کرے ورنہ.....“ میں نے گرج کر کہا۔

”بت..... تم کون ہو؟“ راجو کی خوف زدہ آواز نکلی۔ اس کے دونوں ساتھیوں نے گھبرا کر ہاتھ اٹھا دیئے۔

”تمہاری موت.....“ میں نے آگے بڑھ کر پستول کی نال اس کی کٹیٹی پر رکھ دی۔

اس لمحے گولی چلنے کی آواز نے ہم سب کو اچھلنے پر مجبور کر دیا۔ میں خود بھی گھبرا گیا تھا کہ کہیں گولی میرے پستول سے تو نہیں نکلی مگر ساتھ ہی گونجنے والی نسوانی چیخ نے مجھ پر سکتہ طاری کر دیا۔

غلام رسول کے ریوالتور کی نال سے دھواں نکل رہا تھا اور وہ بت بنا سکینہ کو تنگ رہا تھا۔ جو مریچکی تھی۔

”یہ..... یہ تو نے کیا کیا غلام رسول؟“ سلطان نے اسے جھنجھوڑ دیا۔

”اس نے..... منہ پھیر لیا تھا سلطان..... وہ اس قابل نہیں رہی کہ..... مجھ سے نگاہ ملا سکتی، اس کا زندہ رہنا بیکار تھا..... اس کا میرے سوا دنیا میں کوئی تھا ہی نہیں اور اب..... وہ..... تئیرے بعد کہاں جاتی..... وہ مرنا چاہتی تھی سلطان..... اس نے مجھ سے التجا کی تھی.....“ وہ ایسے بول رہا تھا جیسے خواب میں بول رہا ہو۔ راجو کے دونوں ساتھیوں کے رنگ پیلے پڑ چکے تھے۔ میرا جی تو چاہا کہ اسی وقت ساری گولیاں راجو کی کھوپڑی میں اتار دوں مگر میں اسے آسان موت نہیں دینا چاہتا تھا۔

راجو خوف سے آنکھیں بند کئے ہوئے تھا اور اس کے دونوں ساتھی کھڑے گھگیا رہے تھے۔

”یہ..... سکینہ..... درندہ.....“ غلام رسول، راجو کو گھورتا ہوا آگے بڑھا۔

”غلام رسول..... گولی مت چلانا.....“ میں چیخا۔

سلطان اس کے پیچھے لپکا مگر اسی وقت ایک دھماکا ہوا راجو اور اس کے ساتھیوں کے منہ سے چیخیں نکل گئیں اور راجو کے برابر میں کھڑا ہوا شخص سینہ پکڑے ہوئے فرش پر گر رہا تھا۔

گیا۔ راجو اور اس کا دوسرا ساتھی میرے قدموں میں گر گئے وہ کتوں کی طرح مجھ سے اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہے تھے۔ راجو اب تک مجھے نہیں پہچانا تھا ورنہ وہ مجھے نام لے کر مخاطب کرتا۔ میں اسے ہانا چاہتا تھا کہ میں کون ہوں مگر غلام رسول پاگل ہو چکا تھا۔ وہ مجھے موقع نہیں دے رہا تھا۔ اس نے صرف چند منٹ میں تین زندگیوں کو ختم کر دیا تھا۔

سلطان نے اسے پکڑ کر ریوالتور چھیننا چاہا۔

”خبردار، میرے قریب نہ آنا ورنہ میں.....“ اس نے غرا کر ریوالتور کا رخ سلطان کی جانب کر دیا۔

غلام رسول..... تو نے وعدہ کیا تھا!..... میں چیخا

”ہاں..... میں نے وعدہ کیا تھا..... مجھے یاد ہے اپنا وعدہ بالے.....؟“ وہ

ذابیدہ لہجے میں بولا مگر اب اس کی نگاہیں راجو کے تیسرے ساتھی کے چہرے پر جم گئی تھیں۔

یہ سب تیرے مجرم بھی تو ہیں بالے.....“

”بالے.....!“ راجو کے منہ سے سسکاری نکلی۔ وہ سر اٹھا کر مجھے دیکھ رہا تھا۔

”ہاں بالہ.....“ میں نے اس کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ کر کھڑا کر دیا۔ ”تیری موت“

تیرے خاندان کی موت راجو..... تیری وجہ سے جتنے بھی قتل ہوئے ہیں میں تجھ سے ہر قتل کا بدلہ لوں گا۔ میں قانون ہوں..... میں عدالت ہوں..... میں جج ہوں، گواہ ہوں، وکیل بھی میں ہوں راجو، آج تجھے تیرے سارے جرائم کی سزا ملے گی۔“

”بالے..... مم..... مجھے معاف..... میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں..... میں..... میں تجھے سب کچھ دے دوں گا..... مجھے مت مارنا بالے.....“ وہ ہاتھ جوڑ کر گھٹیلانے لگا۔

”سب کچھ دے دے گا؟ سب کچھ.....؟ صفرا..... ابا..... اماں..... سوہنی..... میرے گھر کی رونقیں، میری خوشیاں..... یہ..... یہ سیکھنے بھی، اسے بھی زندگی دے دے گا تو؟“

”نہیں بالے، یہ موت تو دے سکتا ہے مگر.....“ غلام رسول کی سر اسرتی ہوئی آواز نکلی، پھر وہ راجو سے مخاطب ہوا۔ ”راجو اب میری باری ہے چھوٹے چوہدری، تو نے گاؤں کی ہر لڑکی کی معصومیت چھین لی، اب تجھ سے تیری زندگی چھین جائے گی راجو، پھر بھی قرض ادا تو نہیں ہوتا، ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ میں تیری بہن کو اٹھا کر یہاں لاتا اور تیرے سامنے اس کے بدن کی بوٹی بوٹی کاٹ کر تیرے آگے پھینکنا مگر کیا کروں کہ میں انسان ہوں ایسا سوچ بھی لوں تو کلیجہ پھٹنے لگتا ہے، تیری طرح کتابو تا تو یہ کر گزرتا۔“

”نہیں غلام رسول، مجھے معاف کر دے، میں..... میں اسے نہیں لایا تھا۔“ اس نے گھٹکیا کر سیکھنے کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ لوگ لائے تھے۔“ اس نے اپنے ساتھیوں پر الزام لگایا۔

”میں..... میں نہیں لایا۔“ راجو کے دوست نے روتے ہوئے کہا جواب بھی خود کو راجو کے پیچھے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس کی آواز سننے ہی غلام رسول نے ریو اور والا ہاتھ سیدھا کیا اور گولی چلا دی۔ وہ ایک دل خراش چیخ کے ساتھ سامنے رکھی نیبل پر اوندھ گیا۔ راجو بری طرح رونے لگا تھا۔

”غلام رسول.....“ میں پھر چیخا، مجھے خدشہ تھا کہ وہ راجو کو بھی مار دے گا۔ سلطان نے اس کے دونوں بازو پیچھے سے پکڑنے چاہے مگر وہ مچھلی کی طرح اس کی گرفت سے نکل گیا اور اس نے چیخ کر اسے قریب آنے سے منع کیا۔

”مجھے بچالو..... بچالو مجھے، یہ مار دے گا۔“ راجو نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ”نہیں چوہدری، میں بالے سے وعدہ کر چکا ہوں، میں تجھے نہیں ماروں گا۔ تجھے مردہ دیکھنے کی شاید مجھے حسرت ہی رہ جائے۔“

میں نے سلطان کو آنکھ سے اشارہ کیا کہ وہ پیچھے سے اسے قابو کرنے کی کوشش کرے۔ سلطان غیر محسوس انداز میں اس کی پشت کی جانب سرکنے لگا۔ میں نے اسے باتوں میں لگانا چاہا مگر لحوں میں وہ سب کچھ ہو گیا جس کا کسی کو گمان بھی نہ تھا۔ غلام رسول نے ریو اور کی نال کپٹی پر رکھ کر ٹرانسنگر بادیاتھا۔ خون کا فوارہ اُچھلا اور وہ زمین پر ڈھیر ہوتا چلا گیا۔

ہم سب کے منہ سے بیک وقت چیخ نکلی اور پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ سلطان اس کی طرف لپکا، اس نے نبض دیکھی دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کرنے لگا مگر اب سب کچھ بیکار تھا۔ میں جانتا تھا کہ غلام رسول جیسا غیرت مند آدمی اب زندہ رہ بھی نہیں سکتا تھا۔ اب اس چھوٹے سے کمرے میں پانچ لاشیں پڑی تھیں۔ پورے کمرے کے فرش پر خون بہہ رہا تھا۔ راجو کی حالت بری تھی۔ سلطان پر بھی سکتہ طاری تھا حالت تو میری بھی..... بہت بری تھی، خون دیکھ کر میرا جی متلا رہا تھا مگر حالات ایسے نہیں تھے کہ میں بھی ہوش کھو بیٹھتا۔ اب تو مجھے راجو کی طرف سے خطرہ ہو گیا تھا۔ وہ جان بچانے کے لئے کچھ بھی کر سکتا تھا اس لئے میں نے اپنی نگاہیں اس کے زرد چہرے پر جمادیں۔ وہ آنکھیں موندے جھوم رہا تھا اور پھر وہ بھی کسی لاش ہی کی طرح ڈھیر ہو گیا۔ وہ شاید بے ہوش ہو چکا تھا اور یہ بہتر ہی ہوا تھا ورنہ اسے قابو کرنے میں مشکل بھی پیش آ سکتی تھی۔ سلطان ابھی تک دم بہ خود کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے مخاطب کیا تو وہ چونک اٹھا۔

”سلطان، کوئی رستی تلاش کرو۔“

”کک..... کیوں؟“ وہ اس انداز میں بولا جیسے کسی نے اسے سوتے سے جگا کر کچھ کہا

یو۔

”اسے باندھوں گا، یہ بے ہوش ہو چکا ہے۔“

تب وہ ہوش میں آ گیا۔ اس نے لاشوں کو ایک نظر دیکھا اور پھر کمرے سے باہر نکل گیا۔ بند لحوں بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں نائیلون کی ڈوری تھی۔ میں نے راجو کے ہاتھ وں باندھے اور اسے کندھوں پر ڈال لیا۔ ”چلو!“ میں نے سلطان سے کہا جو قریب بیٹھا

خلاؤں میں گھور رہا تھا۔

”کک..... کہاں؟“ وہ چونکا۔

”میں نے تجھ سے کہا تھا کہ میرے ساتھ نہ آ۔“ میں نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

میری بات سن کر اس نے خود کو فوراً ہی نارمل کر لیا۔ ”میں نے پوچھا ہے کہاں جانا

ہے؟ یہاں کوئی ٹھکانہ ہے تیرے پاس؟“

”میں اسے اسی غار میں لے جاؤں گا جس غار میں تم لوگوں سے ملاقات ہوئی تھی۔

یہاں ایک وہی محفوظ جگہ ہے مگر تو وہاں نہیں رہے گا بلکہ تجھے واپس گاؤں آنا ہو گا۔“

”کیوں.....؟“

”تو یہاں سے ماں کو لے کر دوسرے گاؤں جائے گا وہاں ماسی میراں کا بھائی رہتا ہے۔

ماں کو اس کے پاس چھوڑ کر تو چاہے شہر چلے جانا۔“

”مجھ سے بکو اس نہ کرنا۔ میں یہاں واپس آؤں گا۔“ اس نے غصے سے جواب دیا۔

”اچھا اب یہاں سے تو چل، سویرا ہونے لگا ہے، روشنی ہو گئی تو ہم کسی کی نظروں میں

بھی آسکتے ہیں۔“

ہم دونوں باہر نکلے آسمان کے کنارے سرمئی ہو گئے تھے، ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور

پن چکی کی گھول گھول گونج رہی تھی۔ گویا لوگ جاگنے لگے تھے۔ میں اور سلطان تیز قدموں

سے پہاڑ کی طرف چل دیئے جو یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ راجو بہت بھاری تھا، میری

سانس پھول رہی تھی۔ پسینہ گدی پر ریگ رہا تھا مگر میں جانتا تھا کہ اگر میں نے رفتار ہلکی کی تو

مصیبت میں پڑ سکتا ہوں، میں روشنی ہونے سے پہلے پہلے غار تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ تقریباً

آدھے گھنٹے بعد ہی ہم غار تک پہنچ گئے۔ غار میں داخل ہونے سے پہلے ہی میری نگاہ اس جگہ

پر پڑی جہاں میں نے صفرا کی قبر بنائی تھی مگر وہاں اب ایک گڑھا تھا اور بس۔ اس گڑھے پر نگاہ

پڑتے ہی نفرت اور غصے کی لہر نے مجھ میں آگ سی لگا دی۔ دکھ سے میری آنکھیں دھندلا گئیں

اور میں نے راجو کو زمین پر پٹخ دیا۔ اس کے منہ سے کراہ نکلی وہ تڑپا اور ہوش میں آ گیا۔

”راجو، کتے، یہ دیکھ..... یہ میری بہن کی قبر تھی، یہاں اس کا مردہ جسم دفن تھا مگر تو

نے اور تیرے باپ نے اس کے مردہ جسم کو بھی نہیں بخشا، اب میں تجھے اس قبر میں زندہ

دفن کر دوں گا۔“

”نن..... نہیں۔“

”حرام زادے..... میں تیری بوئیاں کاٹ کاٹ کر تیرے باپ کو بھیجوں گا۔ اسے

یہاں بلواؤں گا، اس کے سامنے تیرے زندہ جسم کو اس قبر میں اتاروں گا کتے! تیرے گھناؤنے

جرائم کی سزا ایسی دوں گا کہ تیری نسلیں رہتی دنیا تک حکمرانی سے توبہ کر لیں گی۔“ یہ کتے

ہوئے میں نے دو تین لائیں اس کی پسلیوں میں ماریں۔ وہ بلبللا کر چیخنے لگا تھا۔

”یہاں تجھے بچانے والا کوئی نہیں ہے درندے.....“ میں نے ایک زوردار لالت

اس کی کمر پر دے ماری۔

”پپ..... پانی..... پانی.....“ وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بڑبڑایا۔ اس کی

آنکھیں چڑھ گئی تھیں اور رنگ بالکل سفید ہو رہا تھا۔

سلطان نے میری طرف دیکھا۔

”اسے پانی پلا دو سلطان، اسے مرنے نہیں دینا ہے۔“ میں نے اپنی پیشانی سے پسینا

پونچھتے ہوئے کہا۔

وہ سر ہلا کر باہر نکل گیا تو مجھے خیال آیا کہ ہمارے ساتھ پانی یا کھانے کی کوئی چیز بھی نہیں

اور ابھی یہاں معلوم نہیں کب تک رہنا پڑے، ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ سلطان ایک بالٹی

میں پانی لے آیا۔ مجھے حیرت ہوئی تب سلطان نے بتایا کہ بالٹی اور کچھ دوسرا سامان یہاں موجود

ہے جسے راجہ وغیرہ نے ایک گڑھا کھود کر اس میں چھپا دیا تھا اور اس گڑھے پر گھاس پھونس

ڈال دی تھی۔ وہ ایسی تمام جگہوں پر جہاں اسے کبھی قیام کرنا پڑا تھا، ایسا انتظام رکھتا تھا کہ کسی

وقت ضرورت پڑنے پر وہ ٹھکانہ استعمال کیا جاسکے۔ بہر حال میں نے سلطان سے کہہ دیا کہ وہ

فوری طور پر گاؤں واپس جائے اور اس سے پہلے کہ راجو کی عیاش گاہ پر ہونے والے ہنگامے

کی اطلاع کسی کو ملے کچھ کھانے پینے کی چیزیں اور غلام رسول کے گھر سے کمل وغیرہ لے

آئے۔ میں نے اسے کہا تھا کہ وہ ماں کو بھی یہاں لے آئے تاکہ یہاں سے فرار ہوتے ہوئے

وہ دوبارہ گاؤں میں نہ رہ جائے۔ میرا ارادہ یہی تھا کہ ضرورت کا سامان منگوانے کے بعد اسے

سلطان کے چک نمبر ستاون بھیج دوں گا جہاں ماسی میراں کا بھائی رہتا تھا

سلطان نے راجو کو پانی پلایا اور خود گاؤں چلا گیا۔ میں نے راجو کو غار کے ایک تاریک

کونے میں ڈال دیا اور خود گھوم پھر کر غار کا جائزہ لیا۔ لگتا تھا جیسے ہمارے اور راجہ کے فرار کے

”ہاں..... ہاں..... یہ ہی تو ہے.....“ ماں دھیرے سے اس کے قریب بیٹھ گئی۔ ”یہ راجو ہے، بالے..... یہ راجو ہے۔“ وہ ایک دم چیخ اٹھی، لگتا تھا جیسے اسے ایک دم ہوش آگیا ہو۔ وہ پلٹی۔ اس نے قریب پڑا پتھر اٹھایا اور اس سے پہلے کہ میں یا سلطان اسے پکڑتے، اس نے پتھر سے راجو کا منہ پکڑ دیا۔ راجو کی دلخراش چیخوں سے پورا غار چیخ اٹھا۔ میں نے اور سلطان نے اپنی پوری طاقت لگا دی تب اماں کو گھسیٹ کر دور لاسکے، نہ معلوم اس کمزور سی عورت میں کہاں سے اتنی طاقت آگئی تھی۔

راجو بری طرح زخمی ہو چکا تھا۔ اس کے ہونٹ پھٹ چکے تھے اور ان سے خون بہہ رہا تھا، ناک کے دونوں نھتوں میں بھی خون بھر گیا تھا۔

”مار دے اسے..... مار دے ورنہ یہ صغرا کو اٹھا کر لے جائے گا۔ مار دے اسے!“ اماں پل کر چیخی، وہ ہماری گرفت سے نکلنے کے لئے زور لگا رہی تھی۔

”اماں، صغرا مر چکی ہے۔ مر چکی ہے وہ، ایک ایسی آس کیوں لگائے بیٹھی ہے جسے کبھی پورا نہیں ہوتا۔ اماں ہوش میں آ.....“ میں چیخا اور اس کے سینے سے لگ کر رو دیا۔

تب اسے سکتہ سا ہو گیا۔ وہ ایک دم نڈھال ہو گئی۔ اس نے اپنی بے نور اور ویران آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ ”وہ مر چکی ہے؟“ اس کی سرگوشی گونجی۔

”ہاں اماں وہ مر چکی ہے۔ وہ کبھی واپس نہیں آئے گی، اور..... سوہنی بھی مر چکی ہے، بابا بھی مر چکا ہے اماں..... بس تیرا یہ بدنصیب بیٹا زندہ ہے صرف اس لئے کہ ان کتوں سے اپنے باپ، اپنی بہن اور سوہنی کا انتقام لے سکے۔ اماں اگر تو ہوش میں نہ آئی..... تو میں کیا کروں گا، میرا تو اب تیرے سوا کوئی بھی نہیں ہے کوئی بھی نہیں اماں۔“

اس نے دھیرے سے میرا سراپہ سینے سے لگا لیا۔ ”تو بالا ہے نا..... تو میرا بیٹا ہے۔ تو تو زندہ ہے نا؟“

اور میں خوشی سے جھوم اٹھا۔ اس نے پہلی بار مجھے مخاطب کیا تھا، زمانوں بعد میں نے اماں کے منہ سے اپنا نام سنا تھا، میں نے اسے خوب پیار کیا اس کے بکھرے ہوئے سفید بالوں کو سمیٹا اور اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں بھر کر دیکھتا رہا اس کے چہرے کی وہ نرمی، وہ ممتا کی چمک ماند پڑ چکی تھی اور اس کی جگہ دکھوں کا گہرا سایہ تھا جس نے اس کے چہرے کو ہی نہیں بلکہ اس کے پورے جسم کو لپیٹ رکھا تھا۔ وہ بھی مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔

بعد پولیس نے وہاں چھاپہ مارا کیونکہ جگہ جگہ فرش پر چائے کے گئے ٹوٹے پڑے تھے ایک کینٹلی بھی پڑی تھی اور لگتا تھا جیسے اسے کسی نے ٹھوکا ماری ہو۔ وہ ایک طرف سے پکچی ہوئی تھی۔ میں نے اسے اٹھالیا اور ایک پتھر سے اسے ٹھونک ٹھونک کر قابل استعمال بنالیا۔ مجھے یقین تھا کہ سلطان ضرورت کی چیزوں میں چائے کا سامان اور سگریٹ بھی لائے گا۔ مجھے چائے اور سگریٹ کی شدت سے طلب ہو رہی تھی۔ البتہ بھوک کا احساس جیسے ختم ہو گیا تھا۔ تھکن کی وجہ سے میرے بدن کا جو بڑبڑدہ رہا تھا اور پھر راجو جیسے گیندے کو اٹھا کر لانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اب وہ غار کے اندھے کونے میں خاموش پڑا تھا۔ میں نے بکھری ہوئی گھاس جمع کر کے بستر بنایا اور اس پر لیٹ گیا۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ہی سلطان آگیا۔ ماں اس کے ساتھ تھی مگر وہ بہت سہمی ہوئی تھی۔ سلطان نے مضبوطی سے اس کا بازو پکڑا ہوا تھا جسے وہ مسلسل چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ سلطان کے دوسرے ہاتھ میں ایک بڑی نوکری اور کندھے پر کمبل اور کھیس تھا۔

”پکڑ اسے بڑی مشکل سے یہاں لایا ہوں اور غلام رسول کے گھر سے جو بھی سامان ملا لے آیا ہوں۔ اس کے ساتھ بازار جانا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔“

میں نے لپک کر ماں کو تھام لیا۔ ”اماں..... اماں دیکھ مجھے، میں بالا ہوں، تیرا بیٹا بالا..... مجھے پہچان اماں ورنہ..... ورنہ میں مر جاؤں گا۔“ میں رو دیا۔

اماں کے چہرے سے خوف کچھ کم ہو گیا۔ وہ مجھے غور سے دیکھنے لگی۔ ”مگر بالا تو صغرا کو لینے گیا ہے۔ آجائے گا وہ۔ دیکھ لینا تو، وہ ضرور آئے گا۔ بڑا جی دار ہے وہ، وہ آئے گا تو پوری بستی کو آگ لگا دے گا۔“

”ہاں اماں..... میں..... میں پوری بستی کو آگ لگا دوں گا، میں بالا ہوں اماں، میں صغرا کو تو واپس نہیں لا سکتا اماں مگر ان درندوں کو میں تباہ کر دوں گا جنھوں نے تجھ سے تیری خوشیاں چھین لیں۔ آ..... ادھر آ اماں، دیکھ، یہ ہے وہ درندہ جس نے تجھ سے تیرا سہاگ چھین لیا تھا جس نے تیری پھول سی بیٹی کو مٹی کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا تھا اماں، اور جس نے مجھ کو ردبر کر دیا تھا۔ میں اسے زندہ دفن کر دوں گا، میں ایسا انتقام لوں گا کہ دنیا یاد کرے گی۔“

وہ بڑے غور سے راجو کو دیکھ رہی تھی جو غور زدہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

اچانک اس کی نگاہوں میں بچان کی روشنی پھیل گئی۔ ”بالے!“ اس کے لرزے ہونٹوں سے سسکاری نکلی اور وہ چیخ مار کر مجھ سے لپٹ گئی۔ ”بالے“ بالے میں تجھے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئی تھی بالے، میرا سب کچھ اجڑ گیا پتھر..... سب کچھ ختم ہو گیا۔ تو کہاں چلا گیا تھا..... کیوں چھوڑ گیا تھا مجھے۔“ وہ مسلسل دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی، میں نے اسے چپ کرانے کی کوشش نہیں کی، یہ درد اس میں جانے کب سے بھرا تھا اس کا نکل جانا ہی بہتر تھا۔ وہ جانے کتنی دیر تک روتی رہی، اور اس کے بہتے ہوئے آنسو میرے وجود میں چنگاریاں بن کر گرتے محسوس ہوتے رہے۔

کافی دیر کے بعد اس کا جی ہلکا ہوا تو میں نے سلطان سے پوچھا کہ اب اس کا کیا پروگرام ہے۔ یہ سن کر اس نے کہا کہ میں اس کے بارے میں اماں سے مشورہ کروں۔ بات صحیح بھی تھی اب اماں سوچنے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کے قابل تھی۔ میں نے جب اسے اپنے پروگرام کے بارے میں بتایا تو اس نے مجھے چھوڑ کر کہیں بھی جانے سے انکار کر دیا، وہ مجھ سے جدا ہونے پر میرے ساتھ مرجانے کو ترجیح دیتی تھی۔ میں سنگین انجام کے بارے میں جانتے ہوئے بھی مجبور ہو گیا۔ اب دن چڑھ آیا تھا۔ سلطان نے ایک کونے میں بنے گڑھے میں لکڑیاں ڈال کر آگ جلائی اور کیتلی میں پانی رکھ دیا۔ پھر وہ کہیں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد دوبارہ غار میں داخل ہوا تو اس کے ہاتھ میں تین بڑے گتے یہ گتے پہلے بھی دیکھ چکا تھا اس وقت جب میں پہلی بار اسی غار میں راجہ وغیرہ سے ملا تھا۔

ہم نے چائے پی ساتھ پاپے کھائے جو سلطان غلام رسول کے گھر سے لایا تھا۔ اس دوران میں سوچتا رہا کہ اب میں چوہدری کو کس طرح حویلی سے باہر لاؤں۔ پہلے تو میرا خیال تھا کہ میں راجہ کے بدن کے ٹکڑے کاٹ کر اسے بھیجوں اور اسے چوہے کے بل سے نکلنے پر مجبور کروں گا مگر یہ خطرناک ہو سکتا تھا۔ یہ کام میں سلطان سے نہیں کرانا چاہتا تھا یہ کام میں خود کرنا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ بہت جلد انہیں راجہ کے اغوا اور اس کے مکان پر ہونے والے قتل کا پتا چل جائے گا۔ میں چاہتا تھا کہ میں اس کی بے چینی اور اس کے کرب کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں مگر کیسے؟ میں کافی دیر تک یہی سوچتا رہا۔ اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ میں ماں کی طرف پلٹا جو بڑے پیار سے مجھے تک رہی تھی۔

”اماں..... کیا تو پہلی نگاہ میں مجھے بچان گئی تھی؟“

”آں..... نہیں، اگر تو مجھے نہیں بتاتا تو شاید.....“

”کیوں..... مجھ میں ایسی کیا تبدیلی آئی ہے؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔

”تو..... تو بہت صحت مند ہو گیا ہے پتھر، لمبا چوڑا لگنے لگا ہے۔ پہلے تیرا چہرہ پتلا سا تھا

مگر اب، اب چوڑا ہو گیا ہے پھر یہ تیری داڑھی..... اور حلیہ..... کپڑے.....“

”گویا اگر میں گاؤں جاؤں تو لوگ مجھے بالے کی حیثیت سے نہیں پہچانیں گے؟“

”نہیں پتھر انہیں تو گمان بھی نہ ہو گا کہ بالا دوبارہ دنیا میں آ سکتا ہے۔ چوہدری نے گاؤں

والوں کو بتایا تھا کہ بالا پولیس مقابلے میں مارا گیا ہے۔ حوالدار نے بھی چوہدری کو یہی بتایا تھا۔“

”اوہ یہ تو بہت اچھا ہوا۔“

”تو کیا چاہتا ہے بالے!“ اس نے پرتشیش انداز میں میری طرف دیکھا۔

”میں گاؤں جانا چاہتا ہوں، میں چوہدری کے کرب کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں

اماں، میں اسے پاگل کتوں کی طرح اپنے بیٹے کی تلاش میں گھومتا دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”نہیں بالے..... نہیں وہ اگر پہچان گیا یا اسے شک ہو گیا تو.....“

”نہیں اماں ایسا نہیں ہو گا۔“ میں نے کھڑے ہوتے جواب دیا۔ ”تو کچھ دیر بعد دیکھنا

مجھے بچانے کی بھی نہیں۔“ میں نے کہا اور اپنا تھپلا اٹھا کر غار سے باہر نکل آیا۔

اس تھپلے میں میں نے ایک پیٹ شرت اور سوئیٹر بھی رکھ لیا تھا جو اس وقت میرے

کام آ سکتا تھا۔ یہ شرکی نشانی تھی۔ میں نے کپڑے بدلے اور جب دوبارہ غار میں داخل ہوا تو

ماں دیکھ کر مجھے اچھل پڑی۔

”بب..... بالے تو تو کوئی افسر لگ رہا ہے۔“

”میں نے کہا تھا نا کہ.....“

”مگر بالے، تیرا جانا خطرناک ہو سکتا ہے، تیرا اجنبی ہونا بھی انہیں شک میں ڈال سکتا

ہے۔ خاص طور پر ان حالات میں کہ راجہ کی عیاش گاہ پر اس وقت پانچ لاشیں پڑی ہیں جو کچھ

دیر بعد دریافت ہو جائیں گی اور وہ لوگ گاؤں کی ناگہ بندی بھی کر سکتے ہیں۔ تو اپنے اس پلان

کو ذہن سے نکال دے۔ اس کو مار کر اس کی لاش بھی وہیں پھینک دے اور یہاں سے نکل

چل ورنہ کسی مصیبت میں پھنس جائے گا۔“ سلطان نے میری بات کاٹ کر کہا۔

”سلطان! میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ میں خطرات سے کھیلنے جا رہا ہوں، تو اپنا راستہ لے

سکے گا؟“ اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

”سلطان“ میں اس سے بھی زیادہ کر سکتا ہوں، اگر تو میری جگہ ہوتا اور وہ سب کچھ تیرے ساتھ ہوا ہوتا تو میرے ساتھ ہوا ہے تو تو مجھ سے بڑا درندہ بن چکا ہوتا۔“

اس نے کوئی جواب نہ دیا بس تھوک نکل کر غار کی طرف پلٹ گیا۔ میں بھی دبے پاؤں اندر داخل ہوا، میں نہیں چاہتا تھا کہ اماں جاگ جائے، وہ عورت تھی اور عورت کا دل کمزور ہوتا ہے، ممکن ہے مجھے وہ سب نہ کرنے دیتی جو میں کرنے والا تھا۔ میں اور سلطان اس اندھیرے کرنے کی طرف بڑھے۔ راجو ہوش میں تھا مگر بھوک پیاس اور زخموں کی وجہ سے بری طرح نڈھال تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں التجا لہرائی، لمحہ بھر کو میرا دل ڈولا، مجھ میں چھپی انسانیت نے پلکیں جھپکیں مگر میں نے فوراً ہی راجو کی دونوں کپٹیاں اپنے انگوٹھے سے دبا دیں۔ ایسا کرنے سے پہلے میں نے اپنی آنکھیں موند لی تھیں۔ وہ بہت جلد بے ہوش ہو گیا۔ میں نے اسے پلٹ کر اس کے بندھے ہوئے ہاتھ کھولے، اس کی نبض چیک..... کی جو ہلکی رفتار سے چل رہی تھی۔ پھر میں نے اپنے تھیلے میں سے تیز دھار والا چھرا نکالا، جو میں اپنے ساتھ لایا تھا۔

سلطان خاموشی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں اس سے نگاہیں چرا رہا تھا۔ میں نے راجو کا وہ ہاتھ سامنے فرش پر رکھ دیا جس میں اس نے سونے کی موٹی سی انگوٹھی پہنی ہوئی تھی اور پھر سلطان کو اشارہ کیا، سلطان نے اپنے کاندھے سے چادر اتار کر اسے لپیٹا اور راجو کے منہ پر رکھ کر اس پر اپنا ہاتھ ہما دیا اور پھر..... وہ لمحہ بھر کو تڑپا اور دوسرے ہی لمحے اس کی دو انگلیاں ہاتھ سے الگ ہو گئیں۔ میں پسینے میں نہا چکا تھا۔ میں نے جلدی سے اس کے ہاتھ اور کٹی ہوئی انگلیوں پر مٹی ڈال دی۔ سلطان نے فوراً ہی اپنی چادر سے ایک پٹی پھاڑ دی اور راجو کے زخمی ہاتھ پر کس کے باندھ دی۔

یقین کیجئے ایسا کرتے ہوئے میں اندر سے لرز گیا تھا مگر انتقام کا جذبہ بڑا خوفناک اور خونی ہوتا ہے یہ انسان کو پاگل کر دیتا ہے اور میں بھی پاگل ہو چکا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد میں نے اس کی دونوں انگلیوں کو ایک کپڑے میں لپیٹا، پھر پوتھین بیگ میں باندھا اور اپنی پینٹ کی جیب میں چھپا لیا۔ اماں ابھی تک بے خبر سوئی ہوئی تھی۔ سلطان کا چہرہ ساٹ تھا۔ میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور اپنی چادر سے پسینے کو صاف کرنے لگا۔

اب بھی وقت ہے تو اماں کو لے کر شہر چلا جا، میں اپنے سینے کی آگ بجھا کر وہاں پہنچ جاؤں گا۔“ میں نے غصے میں جواب دیا۔

”بالے!“ وہ غرایا۔ ”اب میں اماں کا لحاظ بھی نہیں کروں گا جڑا توڑ دوں گا تیرا۔ اسے بھول جا کہ میں تجھے یہاں اکیلا چھوڑ جاؤں گا یا تو تو بھی میرے ساتھ شہر چلے گیا پھر بھی تیرے ساتھ مروں گا سمجھاؤ؟“

”نہ پتہ ایسا نہ کر.....“ اماں نے سلطان سے کہا اور پلٹ کر مجھ سے مخاطب ہوئی۔

”بالے یہ تیرا یہ پتہ اور میں تیری ماں ہوں ہم میں کوئی بھی تجھے تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ جیسا تیرا جی چاہے کر، میں تیرے ساتھ ہوں پتہ اللہ بلی ہے اگر تو واپس نہ آیا تو..... تو میں اس کتے کی لاش گھسیٹی ہوئی حویلی تک لے جاؤں گی۔ انتقام تو مجھے بھی لینا ہے چوہدری سے۔“

اماں کی بات سن کر میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ سلطان کچھ بڑبڑایا تو تھا مگر میری سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ بہر حال میں طے کر چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مجھے رات کا انتظار تھا۔ دن میں یہاں سے جانا اور پھر یہیں آنا دشوار تھا اس لئے میں اطمینان سے بیٹھ گیا۔ راجو یا تو بے ہوش تھا یا پھر خوف کی وجہ سے گم صم ہو چکا تھا۔

سلطان جو سامان لایا تھا اس میں کدو کی بھانجی اور روٹیاں بھی تھیں۔ اماں نے بھانجی گرم کی اور ہم تینوں نے مل کر کھانا کھایا۔ اماں نے مجھے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلایا تھا اور میں بے حد خوش تھا مجھے یقین نہیں تھا کہ اب ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ میں اماں کے ہاتھوں سے کھانا کھاؤں گا۔ اس کے دیئے ہوئے نوالے کے ساتھ مجھ میں اطمینان اور بے پایاں خوشی اتر رہی تھی مگر اس کے ساتھ نہ معلوم دل کے کسی گوشے میں یہ خوف بھی کلبلا رہا تھا کہ شاید اماں کے ہاتھوں سے یہ نوالے میرے آخری نوالے ہوں۔ میں جو کچھ کرنے کا عزم کئے ہوئے تھا اس کا انجام صرف اور صرف موت تھی۔ سلطان میری بات سمجھ نہیں رہا تھا، میں چاہتا تھا کہ میں ہر صورت میں اماں کو یہاں سے ہٹا دوں تاکہ موت کا یہ جال اسے اپنی پلیٹ میں نہ لے سکے مگر اماں اور سلطان کی ضد نے مجھے بے بس کر دیا تھا۔

دن عذاب بن کر گزرا۔ سرشام اماں کو نیند آگئی، میں اسی پل کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے سلطان کو اشارہ کیا اور غار سے باہر نکل آیا۔ سلطان میرے پیچھے باہر آگیا تو میں نے اسے بتایا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ میری پوری بات سن کر وہ ہکا بکا رہ گیا۔ ”بالے..... کیا..... یہ تو کر

اچانک سلطان اٹھا اس نے مگ میں پانی بھرا اور راجو کے خشک ہونٹوں پر پکڑنے لگا مگر وہ اب بھی بے ہوش تھا۔ میں نے سلطان کو منع نہیں کیا مگر میں اٹھ کر غار سے باہر آ گیا۔

پرندے شور مچاتے ہوئے گھروں کو واپس آ رہے تھے۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ دور گاؤں میں جلنے والے چراغوں کی روشنی یہاں نظر آرہی تھی۔ میرا سارا دھیان اس طرف تھا جہاں راجو کی عیاش گاہ تھی۔ میرا خیال تھا کہ اب تک وہاں ہونے والے قتل کی اطلاع پولیس کو ہو چکی ہوگی مگر وہاں مجھے ایسے کوئی آثار محسوس نہیں ہوئے شاید اس لئے کہ وہاں سے یہاں تک کافی فاصلہ تھا اور درمیان میں جھاڑیاں اور اونچے نیچے درخت بھی تھے اور اس کے بعد گئے کے کھیتوں کا سلسلہ بھی کافی طویل تھا۔ میں کچھ اور اندھیرے کا منتظر تھا اور میں اس طرف سے گاؤں میں داخل ہونا چاہتا تھا جس طرف نہر تھی اور نہر کی دوسری سمت تقریباً بیس کلومیٹر پر چک نمبر ستاون تھا۔ اس سمت سے جانے میں یہ فائدہ تھا کہ اگر کوئی دیکھ بھی لیتا تو یہی سمجھتا کہ میں چک نمبر ستاون سے آ رہا ہوں کیونکہ نہر کے ساتھ ایک کچی سڑک بھی تھی جہاں سے لاریاں گزرتی تھیں جو چک ستاون سے آتی تھیں۔

میں باہر ہی ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ تقریباً گھنٹے بعد ہی ملگجا اندھیرا پھیل گیا۔ تب میں نے اندر جا کر سلطان کو بتایا کہ میں جا رہا ہوں پھر اس کا جواب سنے بغیر بڑی احتیاط سے پہاڑی سے اترنے لگا۔ پون گھنٹے بعد ہی میں شہر کے پاس والی سڑک پر پہنچ گیا۔ میں نے یہاں تک پہنچنے کے لئے وہ راستہ اختیار کیا تھا جہاں راستے میں کہیں کوئی پن چکی یا کھیت نہیں آتا تھا ورنہ میں کسی کی نظر میں آ سکتا تھا۔ اب تک مجھے راستے میں کوئی نہیں ملا تھا جس وجہ سے میں کافی پر اعتماد ہو کر گاؤں میں داخل ہوا۔ میں نے اپنی چال ڈھال کو بالکل بدل لیا تھا۔ میں کسی ایسے اجنبی کا کردار ادا کر رہا تھا جو پہلی بار گاؤں میں آیا ہو۔ آتے ہی میں نے اپنا تھیلہ بھی کندھے پر ڈال لیا تھا جس میں صرف ایک جوڑا کپڑوں کا تھا اور ایک جوڑی چپل تھے۔ ٹوٹھ برش اور پیسٹ تھا۔ پندرہ بیس منٹ بعد ہی میں ایک ہوٹل پر پہنچ گیا۔ یہ ہوٹل پہلے کریم داد کا تھا جسے میں چاچا کریم کہا کرتا تھا مگر اس وقت چاچا کریم داد کی جگہ ایک اور موٹا سا شخص بیٹھا تھا جو میرے لئے اجنبی تھا اور یہ میرے حق میں بہتر تھا۔ ہوٹل میں کافی رش تھا۔ تھکے ماندے لوگ ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ کچھ لوگ حقہ پی رہے تھے اور کچھ چائے اور کچھ لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ میں نے دور ہی سے محسوس کر لیا تھا کہ لوگ بڑے خوش و خروش باتیں کر

رہے ہیں۔ میں ایک ایسے بیچ پر جا بیٹھا جس کے قریب ہی ایک پلنگ پر ماما حسین اور دلی داد بیٹھے تھے۔ دلی داد، کریم چاچا کا بیٹا تھا اور ماما حسین چوہدری کا خاص آدمی تھا اور ان کے گرد بہت سے لوگ جمع تھے جو خاموشی سے ماما حسین کی باتیں سن رہے تھے۔ قریب جا کر پتا چلا کہ راجو کے اغوا اور اس کے ساتھیوں کے قتل کی اطلاع پھیل چکی ہے پولیس نے لاشیں اٹھالی ہیں اور راجو کے اغوا کا ذمہ دار راجو کو ٹھہرایا جا رہا ہے جو اب سے پہلے بھی اس گاؤں میں ڈاکے کی غرض سے آیا تھا اور پولیس کے بروقت اقدام کی وجہ سے اسے بھاگنا پڑا تھا، لوگ بڑے جوش و خروش سے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ وہیں سے پتا چلا کہ چوہدری تو جوان بیٹے کے اغوا کی خبر سن کر بستر سے لگ گیا ہے۔ حویلی میں کھرام مچا ہوا ہے اور پولیس بڑی شدت سے ڈاکوؤں کو پکڑ دینے کی تیاریوں میں مصروف ہے۔

غلام رسول سپاہی اور اس کی بیوی کی وہاں موجودگی اور قتل کی وجہ سے لوگوں میں غصہ بھی پایا جا رہا تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ سکینہ کو راجو اور اس کے ساتھی اٹھا کر لے گئے اور بعد میں غلام رسول نے ان سب کو مار دیا مگر راجو کو کون لے گیا یہ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بہر حال وہاں جب تک میں کھانا کھاتا اور چائے پیتا رہا۔ مجھے تمام حالات کا پتا چلتا رہا۔ میں نے وہاں سے اپنے لئے سگریٹ خریدے پھر بازار کی طرف چل دیا۔ میں نے بازار سے کھانے پینے کی کافی چیزیں خریدیں، مزید سگریٹ خریدے، چائے کی پتی اور خشک دودھ بھی لیا پھر میں گھومتا پھرتا حویلی کی طرف دیا۔ حویلی کے باہر کافی لوگ جمع تھے۔ چند پولیس کے جوان بھی نظر آ رہے تھے۔ میں قریبی مسجد میں چلا گیا۔ جہاں میں نے نماز پڑھی، خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی اور باہر چلا آیا۔ مسجد کے دروازے پر ہی مجھے بلوئل گیا بلو چوہدری کا خدمت گار تھا جو ہر لمحہ اس کے ساتھ ساتھ رہتا تھا، چوہدری کا حقہ بھرنا اور اسے ساتھ ساتھ لئے پھرنا اس کا کام تھا۔ میرے کام کے لئے اس سے بہتر کوئی نہیں تھا۔ اس لئے میں نے اسے روک کر پوچھا کہ یہاں کیا ہو گیا ہے اور حویلی کے باہر اتنے لوگ کیوں جمع ہیں۔ اس سے باتیں کرنے کا ایک مقصد بھی یہ تھا کہ وہ مجھے پہچانتا ہے یا نہیں۔

اس نے مجھے بالکل نہیں پہچانا بلکہ مجھے بابو جی کہہ کر مخاطب کرتا رہا اور اس نے مجھے تفصیل سے بتایا کہ کیا ہو گیا ہے۔ ”اوہ تو اس کا مطلب ہے کہ چوہدری صاحب سے ملنا مشکل ہے؟“ میں نے بڑے شائستہ انداز میں کہا۔

”ہاں جی، وہ تو لگتا ہے بس اب اٹھ نہیں پائیں گے۔ دھلے ہوئے کپڑے کی طرح ہو گئے ہیں وہ“ ڈاکٹر بیٹھا ہے ان کے کمرے میں اور کسی کو نہیں ملنے دیتا۔“

”اوہ یہ تو بہت غلط ہو گیا۔ میں تو شہر سے ان کے ایک دوست کا خط لایا تھا ان کے لئے..... خیر اب کیا ہو سکتا ہے!“

”نہیں جی آپ خط مجھے دے دیں میں موقع دیکھ کر دے دوں گا۔“

”اگر مجھے کانفڈ اور پنسل مل جائے تو..... یہ لویہ پیسے لے کر کہیں سے مجھے کانفڈ اور پنسل لا دو۔“ میں نے سو کانوٹ نکال کر اسے دیا۔ ”اور ہاں باقی پیسے تم رکھ لینا۔“

میرے دوسرے جملے نے اس میں بجلی بھری۔ اس کی بانجھیں کھل گئیں اور وہ سر ہلا کر چھلاوے کی طرح غائب ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ واپس آئے گا۔ وہ بہت جلد واپس آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں دو تین کانفڈ اور پنسل تھیں۔ میں مسجد کے باہر لگے پول کے نیچے بیٹھ گیا۔ میں نے چوہدری کو لکھا کہ جس طرح راجو کی یہ دو انگلیاں اس تک پہنچی ہیں انشاء اللہ اس کا بیٹا ٹکڑوں کی شکل میں اسے پورا واپس مل جائے گا۔ نیچے میں نے اپنا نام نہیں لکھا تھا بلکہ لکھ دیا تھا کہ تمہارا پرانا نمک خوار جسے تم نے خود نمک حرام بننے پر مجبور کیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اگر عقل مند ہو گا تو سمجھ جائے گا کہ وہ نمک حرام کون ہے۔ میں نے وہ خط اسی پیکٹ میں رکھا جس میں راجو کی کئی ہوئی انگلیاں تھیں اور ایک انگلی میں اس کی انگوٹھی بھی تھی تاکہ اسے بیٹے کی انگلیوں کو پہچاننے میں دشواری نہ ہو۔

میں نے وہ پوٹھین بیک اچھی طرح لپیٹا، اس پر ربر بیلٹ چڑھائی اور اسے بیلو کے حوالے کر دیا۔ وہ کسی سعادت مند بچے کی طرح میرے سامنے بیٹھا تھا میں نے اسے سگریٹ دی جسے اسے نے تھوڑی سی پس و پیش کے بعد لے لیا پھر میں نے جیب سے پچاس کانوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“

”جی بیلو جی۔“ اس نے پچاس کے نوٹ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں بیلو..... دیکھو یہ جو پیکٹ ہے نا اس میں چوہدری صاحب کے لئے بہت خاص چیز ہے۔ ان کے دوست نے شہر سے بھیجی ہے اور مجھ سے کہا تھا کہ چوہدری کو اکیلے میں دینا۔ اب میں تو ان سے مل نہیں سکتا، مجھے شہر واپس جانا ہے، آخری لاری سے میں واپس لاہور

جاؤں گا۔ تم مجھے بہت کام کے آدمی لگتے ہو، تم اسے اپنے پاس چھپا لو اور کسی وقت چیک سے انہیں دے دینا کہ شہر سے کوئی آدمی لایا تھا۔

دیکھ میں تم پر بھروسہ کر رہا ہوں دو چار روز کے بعد میں واپس آؤں گا۔ ٹھیک ہے نا..... اور ہاں تمہیں شہر سے کوئی چیز چاہئے ہو تو بتا دو..... تم اچھے آدمی ہو تمہارے لئے کچھ نہ کچھ ضرور لاؤں گا۔“

میری باتوں نے اس کا نقشہ بدل دیا۔ وہ خوشی سے پھولانہ سار ہاتھ پچاس کانوٹ لیتے ہوئے تو اس نے میرا ہاتھ چوم لیا۔ میں جانتا تھا کہ چوہدری اپنے غلاموں کو پیٹ بھر کر روٹی بھی نہیں دیتا ہے تبھی وہ اتنے بہت سے پیسے پا کر بے حد خوش تھا۔

”آپ فکر نہ کریں باؤ جی میں ایسے دوں گا کہ چوہدری کے فرشتوں کو بھی پتا نہیں چلے گا“ وہ..... باؤ جی اگلے ماہ میری سگائی ہے، ریشم کا کپڑا لا دو تو دعائیں دوں گا..... بالوں میں لگانے والا پھول بھی لانا، جیسا وہ..... صبیحہ فلموں میں لگاتی ہے نا ویسا، رانی کو بہت پسند ہے.....“ اس نے شرماتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے لا دوں گا، بس تم خیال رکھنا، کسی اور کے ہاتھ نہ لگے ٹھیک ہے نا؟“

”ہاں جی فکر ہی نہ کرو۔“ اس نے تھیلے کے پیکٹ کو اپنے کرتے کے نیچے صدری کی جیب میں رکھتے ہوئے کہا اور میں اس سے اجازت لے کر چل پڑا پھر میں گلیوں گلیوں گھومتا ہوا، چھپتا چھپاتا گئے کے کھیتوں کے کناروں سے ہوتا ہوا پہاڑی کی جانب چل پڑا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد میں اسی غار تک پہنچ گیا اماں اور سلطان میرا شدت سے انتظار کر رہے تھے۔ راجو کو نہ صرف یہ کہ ہوش آچکا تھا بلکہ اسے بھی پتا چل چکا تھا کہ وہ اپنی دو انگلیوں سے محروم ہو چکا ہے اور وہ اس وقت بلک بلک کر رو رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے چیخنا شروع کر دیا۔

”مار دو مجھے..... گولی مار دو مگر یوں تڑپا تڑپا کر تو نہ مارو.....“

”گولی مار دوں..... یہ دو انگلیاں تو میں نے اس جرم میں کاٹی ہیں چھوٹے چوہدری کہ تم نے اور تمہارے باپ نے مجھ پر جھوٹی چوری کا الزام لگایا تھا۔ ابھی تو میں اپنے اوپر تشدد کا بدلہ لوں گا پھر..... صغرا کو اٹھالے جانے کا، میری ماں اور میرے باپ کو دھمکانے کا، پھر صغرا کے پاکیزہ بدن کو اپنے ناپاک ہاتھوں سے چھونے کا، پھر اسے گولی مارنے کا، پھر میرے باپ کو قتل کرنے کا، ماں کو رسیوں سے جکڑنے کا، صغرا کی لاش کو نکالنے، اسے بازار میں پھرنے،

کر کہیں نہیں جاؤں گی۔“

”اماں..... سلطان ٹھیک کتا ہے، تو نہیں ہوگی تو میں آسانی سے فرار ہو کر تجھ تک پہنچ سکتا ہوں ورنہ تیری موجودگی میرے پیروں میں بیڑیاں ڈال دے گی۔“ میں نے اماں کو سمجھایا۔

”نہیں بالے..... میں نہیں جاؤں گی، میں اب ایک پل کو تجھے نہیں چھوڑوں گی بالے، تو اپنی ہی طرح میری موت کی پروا بھی نہ کر بالے، ہم مر گئے تو بھی یہ سکون لے کر مرس گے کہ ہم نے انسانوں کو دردندوں سے بچالیا ہے۔ وہ میرا گاؤں ہے بالے، میرے لوگ ہیں اور ان کتوں نے میرے لوگوں پر بڑے ظلم کئے ہیں، انہیں مار دینا ثواب ہے اور یہ ثواب میں ضرور کمائوں گی خواہ اس میں میری جان ہی چلی جائے۔“

اس کا انداز فیصلہ کن تھا اس لئے بحث بیکار تھی، وہ ٹھیک ہی کہتی تھی میرے بعد وہ تنہا کیسے جائے گی۔ ”تجھے بدمرگ لگی ہے پتر؟“ اماں نے میری پیشانی چومتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں اماں.....!“ میں نے صرف اس لئے کہا کہ اس طرح اماں بھی کھانا کھالے گی۔ میری بات سن کر اماں نے میز الایا ہوا سامان نکالا۔ کچھ دیر بعد ہم کھانا کھا رہے تھے۔

اب اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا میں کھانا کھا کر لیٹ گیا اور سوچنے لگا کہ جب چوہدری کو راجو کی انگلیاں ملی ہوں گی تو کیسا کرام مچا ہو گا۔ یہ خیال میرے لئے بذالذات آمیز تھا۔ بہر حال مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ پولیس راجہ کے شے میں یہاں تک نہ پہنچ جائے۔ سلطان نے غلام رسول کی پستول لے لی تھی اس لئے اب میرے اور اس کے دونوں کے پاس ہتھیار تھے میں نے اپنی پستول نکال کر چیک کی۔ سلطان نے بتایا کہ غلام رسول کی پستول میں صرف ایک گولی ہے جبکہ میرے پاس کافی گولیاں تھیں۔

اماں نے راجو کو بھی کھانا کھلادیا۔ اس کے دونوں ہاتھ کھول دیئے تھے مگر پاؤں اسی طرح بندھے ہوئے تھے۔ ایک ہاتھ تو زخمی تھا اس نے کسی نہ کسی طرح کھانا کھالیا ظاہر ہے اسے سارا دن ہو گیا تھا۔ وہ بھوک اور پیاس سے پاگل ہو رہا تھا میں نے اماں کے معاملے میں دخل نہیں دیا حالانکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے کچھ کھانے کے دوں

اندر باہر گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا البتہ کبھی کبھی راجو کے کراہنے کی آواز گونج اٹھتی تھی۔ اچانک اماں نے سوہنی اور ماسی میراں کے بارے میں پوچھ لیا اور وہ جاننا چاہتی تھی کہ میں

اس کی بے حرمتی کرنے کا اور ماں کو پاگل کرنے کا بھی اور ہاں..... مجھے در بدر کی ٹھوکریں کھلانے کا بدلہ، غلام رسول کے بھائی بھادج اور پھر سکینہ کو اٹھانے کا اور..... اور سوہنی کو برباد کرنے کا اسے ہیروئن جیسے نشے کی عادت ڈالنے کا، اس کی موت کا..... اور..... اور..... سوچ راجو ابھی تیرے بدن کے کتنے ٹکڑے ہونے باقی ہیں تیری دو انگلیاں اس وقت تیرے باپ کے ہاتھ میں ہوں گی اسے تجھ سے بہت پیار تھا، اسی لئے میں نے اسے تیری انگلیاں بھجوا دی ہیں راجو، اس وقت وہ بہت خوش ہو گا چوم رہا ہو گا تیری ان خون آلود انگلیوں کو..... چوم رہا ہو گا۔“ یہ کہتے کہتے میرے منہ سے ایک بھیانک تقہم ابل پڑا جو خود مجھے بھی بڑا خوفناک اور اجنبی لگا، یوں جیسے میں، میں نہ رہا ہوں بلکہ کسی خونخوار دردندے میں بدل گیا ہوں۔

اماں اور سلطان مجھے حیرت سے تک رہے تھے۔ راجو خوف سے چپ ہو گیا تھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ لالین کی روشنی میں اس کا چہرہ بڑا خوفناک لگ رہا تھا، شاید مجھ سے بھی زیادہ خوف نے اس کے چہرے کے نقوش بدل دیئے تھے۔

”بالے..... بالے..... پانی پی لے..... خود کو سنبھال بالے.....“ سلطان نے میرے قریب آ کر سرگوشی کی اور پانی کا گلب میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ میں نے ایک ہی گھونٹ میں گم خالی کر دیا اور نڈھال سا گھاس کے بستری گر گیا۔ اماں میرے چہرے سے پسینا پونچھنے لگی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے شاید وہ بھی اپنے بیٹے کی اس دردنگی پر خوفزدہ تھی۔ میرے اندر ایک جنگ جاری تھی۔ میرا ضمیر مجھے کچوکے لگا رہا تھا مگر انتقام کے شعلے لپک لپک کر میرے وجود کو چاٹ رہے تھے۔

میں جانے کتنی دیر تک یونہی پڑا رہا۔ راجو کی سسکیاں غار میں گونج رہی تھیں، وہ بری طرح کراہ رہا تھا اور سلطان ایک کونے میں خاموش بیٹھا مجھے تک رہا تھا۔

”اماں..... تم چلو، میں تمہیں چک نمبر ستاون چھوڑ آتا ہوں۔“ اچانک اس نے کہا۔

”نہیں سلطان..... میں جانتی ہوں تو کس خوف کی وجہ سے یہ کہہ رہا ہے پتر..... بلا میرا آخری سہارا ہے اس کے بغیر تو میں جی بھی نہ سکوں گی، اور..... اور مجھے معلوم ہے کہ اب کیا ہو گا۔ میں یہیں اس کے پاس مرنا چاہتی ہوں پتر..... مگر اسے چھوڑ

”تم کسی طرح بھی بچ نہیں سکتے، تم جو کوئی بھی ہو ہاتھ اٹھا کر سامنے آ جاؤ۔“ جو ابا کہا گیا۔
 ”میں جو کوئی نہیں..... بالا ہوں وہی بالا جس پر چوہدری نے چوری کا جھوٹا مقدمہ
 بنایا تھا، وہی بالا جس کی بہن کو پہلے اغوا کیا گیا پھر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، وہی بالا جس کے
 باپ کو قتل کر دیا گیا۔ میں مرنے یا گرفتار ہونے سے نہیں ڈرتا انپکٹر، مگر میں مرنے سے پہلے
 راجو کو موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔ اگر اس کی زندگی چاہتے ہو تو اس کے باپ کو یہاں بھیجو،
 وہ مجھ سے اپنے بیٹے کی زندگی کی بھیک مانگے، میری ماں کے قدموں میں گر کر معافی مانگے تب
 میں راجو کو بھی چھوڑ دوں گا اور خود کو بھی پولیس کے حوالے کر دوں گا۔“

”بالے..... تم ایسا نہیں کرو گے، میں انپکٹر قادر ہوں..... تم جانتے ہو مجھے
 خود کو ہمارے حوالے کر دو، میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں رعایت دوں گا۔“
 ”مجھے چوہدری کے سوا کچھ نہیں چاہئے انپکٹر اور مت بھولو کہ میرے پاس مینے بھر کا
 راشن اور اتنا ہی اسلحہ موجود ہے، میں مرتے دم تک لڑوں گا مگر پھر تمہیں راجو زندہ نہ مل سکے
 گا۔“ میں نے جھوٹ بولا۔ نہ میرے پاس اتنا راشن تھا نہ اسلحہ اور سلطان کی طرف سے مجھے
 بے حد فکر تھی کیونکہ اس کے پستول میں صرف ایک گولی تھی۔

”نہیں..... نہیں بالے پتر مجھے معاف کر دے پتر.....“ اچانک چوہدری کی
 آواز آئی۔ ”اسے چھوڑ دے بالے، ورنہ اس کی ماں اس کے غم میں مرجائے گی۔“
 ”میرے سامنے آؤ چوہدری.....“ میں نے چیخ کر کہا۔ مجھے چوہدری کی آواز سن کر
 بے پایاں خوشی ہوئی تھی۔ مجھے قطعی امید نہ تھی کہ وہ یہاں ہو گا۔

کچھ دیر کو سناٹا چھا گیا۔ میں نے اماں کو اندر جانے کو کہا اور سمجھایا کہ وہ راجو کا خیال
 رکھے بلکہ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دے اور اس کے ہاتھوں پر بندھی پٹی کو چیک کرے،
 ایسا نہ ہو کہ وہ خود کو آزاد کرالے، یقیناً پولیس کی موجودگی سے اس کے حوصلے بلند ہو گئے
 ہوں گے۔ شکر ہے کہ اماں کی سمجھ میں بات آ گئی اور وہ جھکی جھکی دوبارہ غار میں داخل ہو گئی۔
 سناٹے میں مجھے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ لوگ دائرہ تنگ کر
 رہے ہیں۔ اب میرا گرفتار ہونا یا مرجانا یقینی ہو گیا تھا۔ اس لئے میں گھٹنوں کے بل چلتا ہوا غار
 میں داخل ہوا۔ میں نے راجو کو بڑی بے دردی سے گھسیٹا اور اسے اسی طرح گھسیٹا ہوا باہر
 لے آیا۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا اس لئے وہ غوں غاں کی آوازیں نکالنے کے سوا کچھ

اتنے عرصے کہاں رہا۔ میں نے دھیرے دھیرے اسے تمام داستان سنا دی۔ سوہنی کے
 بارے میں سن کر اس کی آنکھوں میں نفرت کے شعلے نکلنے محسوس ہوئے۔ ”اسے.....
 اسے مار دے“ ”ہاں، مار دوں گا اماں، مگر ایک دم نہیں..... آہستہ آہستہ.....“ ”بالے
 اس حرامزادے کو جان سے مار دے۔“ وہ چیخ اٹھی۔

”ہاں، ماروں گا اماں، مگر ایک دم نہیں..... آہستہ آہستہ.....“
 ”تُو نے..... تُو نے ٹھیک کیا ہے اس کے ساتھ..... ورنہ میں تو سوچ رہی تھی
 کہ تُو ظالم ہو گیا ہے۔ ٹھیک کیا ہے تُو نے اب میں اس کے ٹکڑے کروں گی۔“ وہ راجو کی
 طرف پلکنے لگی۔

میں نے اور سلطان نے اسے پکڑ لیا۔ ”اماں..... صبر کرو۔“ ابھی میں نے اتنا ہی کہا
 تھا کہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ باہر سے آہٹ آئی تھی یوں جیسے کوئی کسی چیز سے ٹکرایا ہو۔ آواز
 اتنی واضح تھی کہ میرے علاوہ سلطان اور اماں بھی اچھل کر کھڑے ہو گئے تھے۔ سلطان نے
 ریو اور کارن غار کے دہانے کی طرف کر دیا۔ میں نے بھی اپنا پستول نکال لیا اور دے پاؤں غار
 کے دہانے کی طرف سرکنے لگا۔

باہر نکلتے ہی ہمیں گڑ بڑ کا احساس ہو گیا تھا۔ میں چھلانگ لگا کر ایک بڑے پتھر کی آڑ میں
 ہو گیا۔ اسی وقت گولی چلی اور میرے بہت قریب سے سنسناتی ہوئی نکل گئی۔ اس وقت تک
 سلطان بھی پوزیشن لے چکا تھا۔ اماں گھبرا کر باہر نکلی تو مجھے چیخ کر اسے اندر جانے کو کہنا پڑا جس
 کے فوراً بعد ہی دوسری گولی چلی، میری آواز سے انہوں نے سمت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اماں اندر
 جانے کی بجائے چیختی ہوئی میرے قریب آ گئی۔

تم چاروں طرف سے گھیر لئے گئے ہو، خود کو پولیس کے حوالے کر دو ورنہ.....“
 کافی فاصلے سے کسی کے چیخنے کی آواز آئی۔

اور مجھے..... یوں لگا جیسے میں ہار گیا ہوں، جیسے میرے بدن سے میری روح دھیرے
 دھیرے نکل رہی ہو۔ میں گرفتار ہونے یا مرنے سے نہیں ڈرتا تھا بلکہ مجھے دکھ اس بات کا تھا
 کہ میں چوہدری سے بدلہ نہیں لے سکا۔ بہر حال میں نے خود کو سنبھالا۔

”کسی نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو میں راجو کو جان سے مار دوں گا اگر راجو کی جان
 عزیز ہے تو چوہدری کو میرے پاس بھیجو۔“ میں نے بلند آواز میں کہا۔

نہ کر سکا۔ میں اسے لئے ہوئے پھر اسی پتھر کے پیچھے آچھپا۔ اماں بھی میرے ساتھ ہی تھی جبکہ سلطان مجھ سے کچھ فاصلے پر پتھروں اور جھاڑیوں کے پیچھے چھپا بیٹھا تھا اور اس کی نگاہیں اس سمت جمی ہوئی تھیں جہاں کچھ دیر پہلے اس انسپکٹر کی آواز آئی تھی۔

”چوہدری میں تین تک گنوں گا اور پھر راجو کو گولی مار دوں گا۔“ میں نے چیخ کر کہا مگر کوئی جواب نہ ملا تو کوئی جواب نہ ملا تو مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔ ”ایک!“ میں نے بلند آواز میں کہا اور راجو کے منہ سے کپڑا نکال دیا۔ کپڑا منہ سے نکالتے ہی وہ چیخ اٹھا اور میں یہی چاہتا تھا۔

”بابا..... بابا مجھے بچالو۔“

”دو.....!“

”نہیں..... نہیں بالے..... راجو.....“ چوہدری کے چیخنے کی آواز آئی اور میں چونکنا ہو کر بیٹھ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد چوہدری گرتے پڑتے میرے سامنے آگیا۔ ”بالے..... اسے مت مارنا..... میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں بالے.....“ وہ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔ ہمارے اور چوہدری کے درمیان تقریباً بیس پچیس قدم کا فاصلہ تھا۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ چوہدری کو اس حالت میں دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہو رہی تھی۔ اس کے سر پر نہ اونچا شملہ تھا، نہ چہرے پر دبدبہ، نہ مونچھیں اونچی تھیں نہ آنکھوں میں رعونت تھی۔ میں خوش تھا اسے یوں اپنے سامنے بیٹھا دیکھ کر، مگر میری خوشی اس وقت ختم ہو گئی جب اس کے پیچھے ہی انسپکٹر ریو اور تانے آکھڑا ہوا۔

”خبردار انسپکٹر!“ میں نے فوراً راجو کی کپٹی پر پستول کی نال رکھ دی۔ ”اگر قدم آگے بڑھایا تو..... اپنے ساتھیوں سے کہو کہ وہ دور چلے جائیں۔“

”نہیں انسپکٹر نہیں..... چلے جاؤ تم لوگ میں..... میں..... میں خود بالے کو منالوں گا۔ یہ بہت اچھا ہے انسپکٹر۔“ چوہدری نے مجھے مکھن لگانے کی کوشش کی اس کا خیال تھا کہ میں اس کی باتوں میں آجاؤں گا۔ اس نے مجھے زندگی کے علاوہ دولت کا بھی لالچ دیا۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے سزا سے بچالے گا۔ مجھے اور میری ماں کو دنیا کی ہر چیز دے گا تاکہ میں سکھ کی زندگی گزار سکوں۔

”بالے.....“ اچانک سلطان چیخا اور ساتھ ہی اس نے گولی چلا دی۔

میں اچھل پڑا اور اسی وقت میری پشت پر کسی کے چیخنے کی اور پھر کسی کے گرنے کی آواز آئی۔ غالباً وہ کوئی سپاہی تھا جو پشت سے مجھ پر وار کرنا چاہتا تھا۔ وہ شاید مرا نہیں تھا اس لئے کہ دوسری گولی چلنے کی آواز کے ساتھ ہی اماں کی دلخراش چیخ گونجی اور میرے وجود میں انگارے بھر گئے۔ میں نے اماں کے سینے سے اچلتے ہوا خون دیکھا اور پاگل ہو گیا۔ پھر میں نے اندھا دھند گولیاں چلاتا شروع کر دیں۔ میرے پستول کی پہلی گولی راجو کی کھوپڑی میں اور دوسری چوہدری کے سینے میں اتر گئی تھی پھر مجھے یاد نہیں کہ کیا ہوا؟ سلطان کب مر گیا اور میں کیسے گرفتار ہو گیا۔ بس اتنا یاد ہے کہ اچانک قیامت سی آگئی تھی۔ پورا جنگل گولیوں کی آوازیوں سے گونج اٹھا تھا اور بس.....

جب مجھے ہوش آیا تو کچھ بھی نہ تھا۔ نہ ماں تھی اور نہ سلطان، میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں، میں لاک آپ میں بند تھا اور تھانے میں افراتفری مچی ہوئی تھی مگر میں مطمئن تھا۔ میں نے اپنا بدلہ لے لیا تھا اب مجھے کسی بات کی پروا نہیں تھی، میرے زندہ رہنے کے لئے تو اب کچھ بچا بھی نہ تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ میں اس وقت خود کو بے حد ہلکا محسوس کر رہا تھا۔ آپ کو شاید یہ سن کر حیرت ہو کہ میں لاک آپ میں ٹھنڈے فرش پر لیٹ کر ایسا بے عمدہ سر کیا کہ مجھے گھٹنوں پتا بھی نہ چلا۔

بس مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ اس بار میرے قریب کوئی نہ آیا۔ نہ کسی نے مجھ پر تشدد کرنے کی کوشش کی۔ وہ سب مجھ سے بے حد خوفزدہ تھے۔ مجھے اگلے روز ہی کوٹ لکھیت جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ راجو اور چوہدری کے قتل کے علاوہ مجھ پر غلام رسول، اس کی بیوی اور راجو کے تین ساتھیوں کے قتل کے الزامات بھی عائد کئے گئے، میں نے کسی بات سے انکار نہیں کیا، اس لئے کہ میں اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ میں مرنا چاہتا تھا اور بس۔

میں جانتا ہوں کہ مجھے پھانسی کی سزا ہو گی اور مجھے زندہ رہنا ہی کب ہے، کون ہے جس کے لئے زندگی کی تمنا کروں۔ بس ایک اطمینان سا ہے کہ اندھی رات کا یہ خوفناک سفر ختم ہونے ہی والا ہے۔ ہاں کبھی کبھی، جب میرے ساتھیوں کی ملاقاتیں آتی ہیں تو مجھے بہت سے لوگ یاد آتے ہیں۔

ابھی کچھ دیر پہلے رند نے مجھ سے پوچھا تھا کہ یار تیری نہیں آتی تو میں ہنس دیا تھا۔

”میرا کوئی نہیں ہے دوست..... ملاقاتیں تو ان کی آتی ہیں جن کا کوئی کہوتا ہے۔“
 ”چار سو سنتالیس تمہاری ملاقات آئی ہے۔“ یہ آواز میرے لئے کسی دھماکے سے کم نہیں تھی۔

”میری.....؟“ میں نے حیرت سے سپاہی سے پوچھا۔ رند نے مجھے حیرت سے دیکھا۔

”ہاں.....“ وہ جواب دیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

ہم سب ایک قطار کی شکل میں اس پنجرے نما کمرے میں پہنچ گئے جسے ملاقات کا کمرہ کہا جاتا تھا۔ میں حیران تھا کہ مجھ سے ملنے کون آیا ہے، میرا تو کوئی بھی نہیں بچا اور پھر میں باریک جالی کے دوسری طرف فاریہ کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں واپس پلٹ آیا۔ اب اس سے مل کر کیا کروں گا۔ اس کے چہرے پر میں نے جس کیفیت کو محسوس کیا ہے اگر یہ کیفیت پہلے محسوس کر لیتا تو شاید.....

وہ جانے کس دل سے واپس گئی ہوگی۔ جانے اس نے کیا کیا سوچا ہوگا۔ جانے وہ کتنی روئی ہوگی مگر میں بھلا کیا کر سکتا ہوں۔ ایک ایسا شخص جو خود اپنی موت کا منتظر ہو بھلا دوسرے کے لئے کیا کر سکتا ہے، میں اس سے مل کر کیا کرتا، کیا کرتا.....؟

اب میں ہوں اور یہ کال کوٹھری..... جہاں ہر لمحہ، ہر بل موت کی چاپ گونجتی رہتی ہے، موت دھیرے دھیرے میری طرف بڑھ رہی ہے۔ ممکن ہے جب آپ میری لکھی ہوئی یہ داستان پڑھ رہے ہوں تب تک میں اپنا یہ اندھا سفر طے کر چکا ہوں۔ میرے لئے مغفرت کی دعا ضرور کیجئے گا، خدا کی قسم میں برا نہیں تھا، اب بھی نہیں ہوں مگر..... مجھے قاتل بنا دیا گیا۔ جانے اور کتنے لوگ ہوں گے جنہیں چوہدریوں اور وڈیروں نے قاتل اور لیرا بنایا ہوگا۔ کاش ایسا نہ ہوا کرے..... کاش ایک انسان دوسرے انسان کی معصومیت کو قتل کر کے اسے درندہ نہ بنایا کرے، اگر میری یہ تمنا یہ دعا پوری ہو گئی تو میں سمجھوں گا کہ میری بہن کا، میرے باپ کا، میری ماں اور دوسرے دوست سلطان کا خون رائیگاں نہیں گیا۔ کاش مجھے موت سے پہلے یہ مژدہ سنا دیا جائے کہ ہمارے معاشرے کا وہ فرسودہ اور بے رحمانہ نظام ختم ہو گیا۔ کاش!“